

Abbas  
.i\Bismillah.jj  
not found.  
File E:\Syed  
Abbas Ali\Arz e  
Nasher.jpg not  
found.

انسان دنیا کی بہترین مخلوق ہے اور اس کو دنیا میں بہترین صلاحیتوں اور قوتوں کے ساتھ بقیہ تمام مخلوق پر برتری دی گئی ہے۔ یہ انسان کی فضیلت ہی ہے کہ دنیا کی ساری مخلوق اس کی خدمت پر شب و روز مامور ہے۔ اس قیمتی مخلوق کی فلاح کا دار و مدار اللہ تعالیٰ کی رضا میں ہے اور اللہ پاک جل شانہ کی رضا و خوشنودی دین اسلام پر زندگی گزارنے میں ہے ہر وہ شخص کامیاب ہے جس کی زندگی دین اسلام پر گزر جائے چونکہ اسلام دین فطرت ہے قرآن اور احادیث میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں راہنمائی کی گئی ہے۔ جس نے بھی ان احکامات کی روشنی میں اپنی زندگی کو ان اخلاق سے سنوارا اس کی اپنی دنیاوی زندگی بھی اچھی گزر جاتی ہے اور وہ معاشرے کے لئے بھی مفید ثابت ہوتا ہے اور ان اخلاق کی برکت سے دنیا میں امن، سکون و چین آ جاتا ہے اور آخرت میں اس کا انعام جنت میں من چاہی زندگی کی صورت میں ملتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی ان اخلاق سے محروم رہ جاتا ہے تو اس کی اپنی دنیاوی زندگی بھی پریشانیوں میں گزرتی ہے اور اس کے ان برے اخلاق کا اثر پورے معاشرے میں بے چینی پیدا کرتا ہے اور امن و سکون کو تباہ و برباد کرتا ہے اور آخرت میں بھی ایسے شخص کا ٹھکانا جہنم ہے۔

آج پوری دنیا میں بے چینی ہے دل، گھر، محلے، ممالک الغرض پوری دنیا میں بے چینی کی فضا ہے دلوں میں چونکہ حب الہی کی جگہ حب جاہ اور حب مال، صداقت کی جگہ جھوٹ اور فریب، حیا کی جگہ بے حیائی، امانت داری کی جگہ بے ایمانی، صبر اور شکر کی جگہ بے صبری اور ناشکری، شجاعت کی جگہ بزدلی، آپس میں الفت و محبت کی جگہ کینہ، حسد اور بغض اور عجز و انکساری کی جگہ تکبر اور غرور نے لی ہے۔ اس وقت پوری دنیا اسی کی لپیٹ میں ہے اور خلق خدا اس سے نجات کی تلاش میں ہے۔

زیر نظر کتاب ”ایمانی صفات“ جو کہ زیر طبع کتاب ”جواہر الاسلام“ کا ایک جز ہے اور اس میں ایک صحیح مسلمان سے مطلوب ان تمام اخلاق ﴿صِبْغَةَ اللہِ وَمِنْ احْسَنِ مِنَ اللہِ صِبْغَةً﴾ کی طرف نشاندہی کی گئی ہے

## اخلاق کا بیان!

- ۱ حسنِ اخلاق دین کا دوسرا نام ہے!
- ۲ حسنِ خلق اور اچھے اخلاق کسے کہتے ہیں!
- ۴ حسنِ خلق کے آثار اور ثمرات!
- ۵ اخلاق کے فضائل!
- ۷ اسلام کی اخلاقی تعلیم اور آج کل مسلمانوں کی غفلت!
- ۸ اچھے اخلاق کا سرچشمہ!
- ۹ انسان بھی خلافت الہی کے منصب کی قابلیت رکھتا ہے!
- ۱۱ اچھے اخلاق اور اس کا علاج!
- ۱۲ اچھے اخلاق اور اس کا علاج!
- ۱۶ تصوف کیا ہے؟
- ۱۷ تصوف کے بارے میں غلط فہمی اور مغالطوں کے شکار ہونے والے!
- ۷۱ شریعت و طریقت!
- ۱۸ تصوف و طریقت قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں!
- ۲۱ تقویٰ اور تزکیہ کب حاصل ہوتا ہے؟
- ۲۱ دل صحیح معنوں میں کب درست ہوتا ہے؟
- ۲۲ تزکیہ و احسان کا دوسرا نام تصوف ہے!
- ۲۵ تصوف کی اصطلاح اور غلط فہمیوں کا ازالہ!
- ۲۸ اصطلاحات سے حقیقت اور وسائل سے مقصد کی طرف!
- ۳۴ تصوف اور حق پرست!
- ۳۴ تصوف پر ابتدائی غور اور تجربہ!

## تصوف اور اس کے اعمال و اشغال کے متعلق میرے چند یقین!

- ۴۱ (۱) تصوف کا مقصد اور اُس کی حقیقت!
- ۵۳ تصوف اور اُس کے اعمال و اشغال کے متعلق بعض شبہات!
- ۵۸ تصوف اور اُس کے اعمال و اشغال کے متعلق بعض شکوک و شبہات کا جواب!
- تصوف اور شیخین!
- ۷۳ تصوف اور اتباع سنت!
- ۷۶ فنِ تصوف کی اہمیت!
- ۸۵ تصوف و احسان کے طالبوں کو چند ابتدائی مشورے!
- ۸۹ گناہ اور توبہ و استغفار کا بیان!
- ۹۰ برے سے برے لوگ بھی گناہ کو گناہ اور برا سمجھتے ہیں!
- ۹۱ انسان کے اندر بدی کا میلان اور قوت کیوں رکھی گئی ہے؟
- ۹۱ اللہ تعالیٰ کا قرب اور روحانی ترقی خواہشات کی قربانی سے کیسے حاصل ہوتی ہے؟
- ۹۱ جنت کی لذتیں، راحتیں قربانی پر ملتی ہیں!
- ۹۲ دنیا اور آخرت کی بربادیوں اور پریشانیوں کی وجہ!
- ۹۳ مصائب اور پریشانیوں کا علاج!
- ۹۵ نیک اعمال کے باوجود بعض لوگ بہت زیادہ پریشان حال کیوں ہوتے ہیں؟
- ۹۵ گناہ کیا ہے؟
- ۹۵ گناہوں اور نافرمانیوں کی تفصیل!
- ۹۷ گناہ کا ارادہ بھی گناہ ہے!
- ۹۸ دل میں گناہوں کی تدابیر بنانا اور خیال سے گناہ کرنا بھی ناجائز اور گناہ ہے!
- ۹۹ غیر اختیاری خیالات پر گرفت نہیں!
- ۹۹ وسوسہ کو برا سمجھنا ایمان کی علامت ہے!

- ۱۰۰ وسوس کا علاج!
- ۱۰۱ گناہوں کے وسوسوں کو کشتہ بنائیے!
- ۱۰۲ گناہوں کا تریاق توبہ واستغفار ہے!
- ۱۰۳ توبہ کے معنی ومطلب!
- ۱۰۳ توبہ کی حقیقت!
- ۱۰۴ توبہ کے صحیح ہونے کی شرائط!
- ۱۰۵ پختہ عزم کے بارے میں مایوس نہ ہو!
- ۱۰۵ آئندہ گناہ کے اندیشے کی وجہ سے توبہ کو مؤخر نہ کریں!
- ۱۰۵ استغفار کے معنی ومطلب!
- ۱۰۶ استغفار توبہ کے مقابلے میں عام ہے!
- ۱۰۷ مسلمان، مرنے والے دوسرے مسلمان بھائیوں اور رشتہ داروں کیلئے بھی دعاء مغفرت کریں!
- ۱۰۸ مسلمانوں کیلئے استغفار کرنے کا ثواب!
- ۱۰۸ گناہوں کا چھوڑنا فرض عین ہے!
- ۱۰۸ توبہ اور استغفار کی اقسام!
- ۱۰۹ تمام لوگوں کو توبہ واستغفار کرنا چاہئے!
- ۱۱۰ توبہ میں جلدی کرو ورنہ.....!
- ۱۱۰ جہالت کی تفصیل!
- ۱۱۱ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام اور انبیاء علیہم السلام کی معصومیت!
- ۱۱۲ جہالت کی بنیاد پر گناہ کا مطلب!
- ۱۱۲ جلدی توبہ کر لینے کا مطلب!
- ۱۱۳ جو لوگ دیر سے توبہ کریں ان کا حکم!
- ۱۱۴ توبہ کا طریقہ!
- ۱۱۴ گناہگاروں کے لئے خوشخبری!



- ۱۱۵ توبہ واستغفار کے فضائل و فوائد!
- ۱۱۵ توبہ واستغفار ترقی کا ذریعہ ہے!
- ۱۱۶ توبہ واستغفار صرف زبانی چیز نہیں!
- ۱۱۶ توبہ کرنے والے اللہ کے محبوب ہوتے ہیں!
- ۱۲۱ سچی توبہ فرض عین ہے اور سچی توبہ کرنے والوں کے لئے آخرت میں جنت ہے!
- ۱۲۱ توبہ کرنے والا گناہوں سے ایسے پاک ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں!
- ۱۲۲ توبہ جلدی کرنی چاہئے اور توبہ دل کا صیقل ہے!
- ۱۲۲ سچی توبہ واستغفار کرنے والوں کے لئے دنیوی فائدے!
- ۱۲۳ توبہ واستغفار کے سبب رحمت کی بارشیں!
- ۱۲۴ باغات اور خوشحالی!
- ۱۲۴ مال اور اولاد کی ترقی!
- ۱۲۴ روحانی، جسمانی اور سیاسی قوت!
- ۱۲۴ عزت و شرف والی اچھی اور خوشحال زندگی!
- ۱۲۴ سامان زندگی کی دو اقسام ہیں!
- ۱۲۵ تمام تر مسائل اور مشکلات کا حل!
- ۱۲۵ مختلف اقسام کے پریشان حال لوگوں کی پریشانیوں کا ایک ہی جواب!
- ۱۲۶ توبہ واستغفار میں ہر مصیبت و پریشانی کا علاج ہے!
- ۱۲۶ توبہ واستغفار کن الفاظ کے ساتھ کرنا چاہئے!
- ۱۲۷ صرف الفاظ کے پڑھنے سے توبہ قبول نہ ہوگی اور توبہ واستغفار کا حق ادا نہ ہوگا!
- ۱۲۷ توبہ واستغفار کے منقول الفاظ!
- ۱۲۷ توبہ کرنے کے مختصر الفاظ!
- ۱۲۸ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا استغفار!
- ۱۲۸ سید الاستغفار!

- ۱۲۹ معافی مانگنے کے آسان سے آسان مختصر الفاظ!
- ۱۲۹ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی توبہ واستغفار کے الفاظ!
- ۱۳۰ حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے استغفار کے الفاظ!
- تقویٰ کا بیان!
- ۱۳۱ تقویٰ کے معنی!
- ۱۳۱ تقویٰ کے اجزاء!
- ۱۳۱ تقویٰ درست ایمان کا پھل اور نتیجہ ہوتا ہے!
- ۱۳۱ خوف ورجاء کسے کہتے ہیں اور یہ کیسے پیدا ہوتا ہے!
- ۱۳۲ خوف الہی کی نوعیت اور رجاء!
- ۱۳۲ نا اُمیدی، کفر اور صلاحیتوں کی تباہی کا ذریعہ ہے!
- ۱۳۳ اُمید بھی ضرورہ چیز سے بچنے کا سبب بنتا ہے!
- ۱۳۴ خوف ورجاء کے بعد عمل و پرہیز کے لئے صحیح نیت اور اخلاص کا نمبر آتا ہے!
- ۱۳۴ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور ہر گناہ سے پرہیز!
- ۱۳۴ تقویٰ کا خلاصہ!
- ۱۳۵ تقویٰ اور قرآن مجید اور احادیثِ رسول ﷺ!
- ۱۳۶ نجات کے لئے مجرد دعوائے ایمان کافی نہیں!
- ۱۳۶ تقویٰ کا مرکز دل ہی ہے!
- ۱۳۷ شعائر اللہ کی تعظیم تو حید میں داخل ہے!
- ۱۳۹ تقویٰ کا جوہر یا عشق الہی!
- ۱۴۰ خوف ورجاء اور تقویٰ کے درجات علم و معرفت کے مطابق!
- ۱۴۰ خوف یا تقویٰ کے درجات کے اقسام کی ایک مثال!
- ۱۴۱ تقویٰ کے محرکات یا خوف کی اقسام اور وجوہات!
- ۱۴۱ (۱) دنیا کی وجہ سے ڈرنا اور بچنا!

- ۱۴۲ (۲) لوگوں سے حیا کی وجہ سے برے کاموں سے ڈرنا اور ان سے احتیاط کرنا!
- ۱۴۲ (۳) باطل سے ڈرنا اور اس سے بچنا اور اس کے مقابلے میں حق کو اختیار کرنا!
- ۱۴۳ (۴) دنیا و آخرت کے عذاب سے ڈرنا اور نیچنے کی کوشش کرنا!
- ۱۴۳ (۵) ہر اس عمل سے بچنا جو اس کی آخرت کی ترقی میں رکاوٹ ڈال دے!
- ۱۴۳ (۶) اللہ تعالیٰ کی ناشکری سے ڈرنا اور پرہیز کرنا!
- ۱۴۴ (۷) اللہ تعالیٰ سے حیا کہ وہ دیکھ رہا ہے اس لئے اس کی نافرمانی سے رکنا اور بچنا!
- ۱۴۴ (۸) اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال سے خوف!
- ۱۴۴ (۹) محبوب حقیقی کی ناراضگی سے ڈرنا اور اس سے بچنا!
- ۱۴۴ (۱۰) اللہ تعالیٰ کے قرب میں زیادہ سے زیادہ کوشش!
- ۱۴۵ تقویٰ کے درجات!
- ۱۴۵ تقویٰ کیا ہے؟
- ۱۴۹ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو تقویٰ کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے!
- ۱۵۲ تقویٰ کے درجات اور نام نہاد متقین اور پرہیزگاریاں!
- ۱۵۲ تقویٰ دل کی ایک صفت ہے!
- ۱۵۳ تقویٰ کے ثمرات، حق اور نیکی کو قبول کرنے والا متقی ہوتا ہے!
- ایمان و یقین والا متقی اور پرہیزگار اللہ تعالیٰ کے نام لگی ہوئی چیزوں سے محبت رکھتا ہے اور اس کی تعظیم و احترام کرتا ہے!
- ۱۵۴ جو حق اور سچ لائے اور جو حق کی تصدیق کرے یہی لوگ پرہیزگار ہیں!
- ۱۵۵ متقی اور پرہیزگار صبر کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کی تمام تعلیمات پر استقامت سے چلنے والا ہوتا ہے!
- ۱۵۵ متقی، عفو و درگزر کرنے والا ہوتا ہے!
- ۱۵۵ ہر حال میں عدل و انصاف پر قائم رہنا تقویٰ کی علامت ہے!
- ۱۵۵ (۷) سود اور ناجائز مال کے حصول سے بچنا اور تقویٰ!
- ۱۵۶ (۸) مخلوق پر ترس کھانا اور صلہ رحمی اور تقویٰ!

- ۱۵۷ متقی اور پرہیزگار متوکل ہوتا ہے!
- ۱۵۷ متقی نیک کاموں میں تعاون کرے گا!
- ظالم کا ہاتھ روکنا اور مسلمانوں کے مابین صلح کرانا
- ۱۵۷ ان کے باہمی تعلقات درست کرنا تقویٰ کی علامت ہے!
- ۱۵۸ متقی اور پرہیزگار غیبت اور لوگوں کے مذاق اڑانے وغیرہ سے پرہیز کرتا ہے!
- متقی اور پرہیزگار مجاہد، باطل سے جنگ کرنے والا ہوتا ہے
- ۱۵۸ اور کفر سے جنگ کے لئے تیاری کرنے والا ہوگا!
- ۱۵۹ پورے دین اسلام پر صدق و اخلاص کے ساتھ عمل کرنے والا متقی اور پرہیزگار ہوتا ہے!
- ۱۶۰ تقویٰ کی اہمیت اور اس کے فضائل!
- اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف اسی عمل کی قدر ہے جو تقویٰ سے پیدا ہو چکا ہو
- ۱۶۰ اور اس کے برگ و بار تقویٰ سے لگے ہوں!
- ۱۶۱ متقی لوگ ہی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں!
- ۱۶۱ اللہ تعالیٰ متقی اور پرہیزگار کے ساتھ ہے!
- ۱۶۲ متقی اور پرہیزگار ہی اللہ تعالیٰ کا دوست اور ولی ہوتا ہے!
- ۱۶۲ ولایت عامہ اور ولایت خاصہ!
- دنیا کا سکون اور قلبی راحت اور مصائب سے نجات اور برکت والی روزی بھی متقی
- ۱۶۲ اور پرہیزگار لوگوں کے لئے مقدر ہوتی ہے!
- ۱۶۳ آخری جیت اور انجام خیر اور آخرت کی خوشیاں صرف متقی لوگوں کے لئے مقدر ہیں!
- ۱۶۵ متقی اور پرہیزگار فرست والا ہوتا ہے!
- ۱۶۶ متقی مؤمن کی نگاہ!
- ۱۶۷ تقویٰ کو کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے؟

اخلاص نیت کا بیان!

- ۱۶۹ بری نیت سے درست عمل بھی فساد برپا کرے گا!
- ۱۷۰ ٹھیک نیت کے ساتھ برا عمل بھی سخت خطرناک ہے!
- نیت بھی ٹھیک ہے اور عمل بھی درست، لیکن اگر اللہ تعالیٰ
- ۱۷۱ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں تو یہ عمل آخرت کے لحاظ سے بیکار ہے!
- ۱۷۲ نیت اور عمل کے صلاح و فساد کا خلاصہ!
- ۱۷۳ آجکل ظاہری نیک اعمال کے باوجود فساد کی وجہ نیتوں کا فساد ہے!
- اخلاص یا خالص نیت کا بیان!
- ۱۷۳ ہر عمل کی مختلف نیتیں ہو سکتی ہیں!
- ۱۷۵ قرآن مجید میں اخلاص کے فضائل اور ریاکاری کی مذمت!
- ۱۷۶ اخلاص والا اپنا عمل آخرت کی کھیتی میں ڈال دیتا ہے!
- نیک کر کے احسان جتلا نیا کسی پہلو سے نیکی کی وجہ سے
- ۱۷۸ کسی کی دل آزاری کرنا ریاکاری کے مترادف ہے!
- ۱۸۰ اخلاص کی برکت اور قیمت!
- ۱۸۱ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف اخلاص والا عمل قبول ہے!
- ۱۸۱ اخلاص اور ریاکاری کے متعلق چند احادیث!
- ۱۸۲ اخلاص کے بغیر بڑے سے بڑا کام بھی بے قیمت اور مردود ہے!
- ۱۸۳ تین عظیم کام اور عظیم شخصیتیں
- ۱۸۴ ایک غلط فہمی کا ازالہ!
- ۱۸۵ اللہ تعالیٰ دلوں کو اور اعمال کے اندر روح اور اخلاص کو دیکھتا ہے!
- ۱۸۶ اخلاص کی قیمت اور بے اخلاصی کی بربادی!
- ۱۸۶ اخلاص کے ساتھ ایک کھجور کا ثواب!
- ۱۸۸ ریا شرک اصغر یا شرک خفی ہے!
- ۱۸۸ شرک اصغر (یعنی چھوٹا شرک) کیا ہوتا ہے؟

- ۱۸۸ ریا کاری کی مذمت!
- ۱۹۰ ریا کی تعریف اور اس کا بیان!
- ۱۹۱ ریا کاری کی بڑی دو قسمیں کفر و نفاق اور شرکِ اصغر یا شرکِ خفی!
- ۱۹۳ شرکِ اصغر اور شرکِ خفی کی اقسام!
- ۱۹۴ ریا کاری کے وسوسے سے اعمال نہ چھوڑیں، یہ بھی شیطان کا ایک داؤ ہوتا ہے!
- ۱۹۵ اعمالِ صالحہ کی وجہ سے خود بخود مشہور ہو جانا بھی ریا نہیں!
- ۱۹۷ اخلاص اس وقت ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت ہو اور بے اخلاصی کا علاج!
- ۱۹۹ اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے حاصل ہو!
- ۱۹۹ نیت کو خالص کرنے کیلئے چند تجاویز!
- ۲۰۰ چند چیزیں ریا کاری اور بے اخلاصی میں شامل نہیں!
- ۲۰۰ اخلاص نیت کیا ہے، اس کا خلاصہ!
- ۲۰۱ اخلاص کی علامتیں!
- جو نیک کام لوگوں کے سامنے جس انداز میں کرے
- ۲۰۱ اسی کام کو علیحدگی اور خلوت میں بھی اسی طرح کرے!
- ۲۰۲ دینی اور نیک کاموں کا نتیجہ دنیا میں نہ ڈھونڈنا!
- ۲۰۲ مخلص اپنے نیک کاموں کی تشبیہ نہیں کرتا!
- ۲۰۳ اخلاص کی علامت اجتماعی کاموں میں!
- ۲۰۳ ایک مخلص انسان دینی امور میں بہت لالچی ہوتا ہے!
- ۲۰۳ آجکل اکثر دینی کام کر نیوالوں کا حال!
- ۲۰۴ مخلص احسان جتانے والا اور ستانے والا نہیں ہوتا!
- ۲۰۴ مخلص دوسروں کے نیک کاموں سے خوش ہوتا ہے!
- ۲۰۵ مخلص دینی اور نیک کام کر کے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے!
- ۲۰۵ جو شخص اپنے آپ کو مخلص سمجھتا ہے وہ مخلص نہیں!

- ۲۰۶ مخل داعی حق خلوت اور تنہائی کے ذکر و مناجات کے لئے بے چین رہتا ہے!  
تکبر و غرور کا بیان!
- ۲۰۸ تکبر کے معنی!
- ۲۰۸ تکبر کے درجات اور اس کا پہلا درجہ!
- ۲۰۸ ہٹ دھرمی سے حق سے ٹکرانے والے کون لوگ ہوتے ہیں؟
- ۲۰۹ تکبر کا دوسرا درجہ!
- ۲۰۹ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس اور تکبر!
- ۲۱۱ تکبر کی مذمت اور اس کے دنیاوی اور اخروی نقصانات!
- ۲۱۱ متکبر اللہ تعالیٰ کا حریف بنتا ہے!
- ۲۱۳ تکبر شرک ہے!
- ۲۱۳ جس دل میں تکبر موجود ہو اس کو ہدایت نہیں ملتی!
- ۲۱۳ مغرور کے دل پر اللہ تعالیٰ کی مہر لگ جاتی ہے!
- ۲۱۳ مغرور شیطان مردود کا بھائی ہے!
- ۲۱۴ مغرور لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم اور اللہ تعالیٰ کو مغضوب ہوتے ہیں!
- ۲۱۴ مغرور اور متکبر کا ٹھکانا جہنم ہے!
- ۲۱۵ ہر متکبر جہنم میں ہوگا!
- ۲۱۶ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا!
- ۲۱۶ متکبر اور مغرور کو اللہ تعالیٰ دنیا میں خزیروں سے بھی زیادہ ذلیل کرے گا!
- ۲۱۷ متکبر اور مغرور کی روزِ محشر میں ذلت!
- ۲۱۷ غریب متکبر کے بارے میں وعید!
- ۲۱۹ متکبرانہ اعمال اور کردار کا بیان!
- ۲۱۹ تکبر و غرور سے پیدا ہونے والے برے اخلاق!
- ۲۱۹ متکبر اور مغرور شخص حقوق میں دھاندلی کرے گا!

- ۲۲۱ مغروروں اور متکبروں کی چند مزید خصوصیات!
- ۲۲۲ بخل کسے کہتے ہیں؟ اور بخل کا سبب!
- ۲۲۳ دوسروں کو بخل سکھانے کا مطلب اور وہ ایسا کیوں کرتا ہے!
- ۲۲۳ اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام کو چھپانے کا مطلب!
- ۲۲۴ متکبر اور مغرور لوگ نمائش کی جگہوں میں خوب خرچ کرتے ہیں!
- ۲۲۴ مغرور اور متکبر کا حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہیں ہوتا!
- ۲۲۴ اکڑ کر چلنا اور مغروروں کا سارویہ!
- ۲۲۵ لوگوں سے بے رخی کی ممانعت!
- ۲۲۶ درمیانی اور تواضع کی چال کی ہدایت اور حکم!
- ۲۲۷ اپنی آواز کو پست رکھیں!
- ۲۲۸ نبی کریم ﷺ کی رفتار کا بیان!
- ۲۲۸ نبی کریم ﷺ لوگوں کے ساتھ کس طرح ملتے تھے؟
- ۲۲۹ حسب نسب پر فخر کرنا تکبر ہے!
- ۲۳۰ کسی کا مزاق اڑانا، طعنہ وغیرہ جیسے امور جذبہ غرور سے پیدا ہوتے ہیں!
- ۲۳۱ شرافت و عزت کا معیار!
- ۲۳۲ تکبر کی علامتیں!
- ۲۳۳ تنبیہ!
- ۲۳۴ تکبر کا علاج!
- ۲۳۵ عجب اور خود بینی کا بیان!
- ۲۳۵ عجب اور خود بینی تھوڑی دیر کے لئے بھی ہو تب بھی زیادہ نقصان دہ ہے!
- ۲۳۵ اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد کرو تو سرخرو اور کامیاب ہو گے!
- ۲۳۶ جب آدمی کے اندر عجب و خود بینی پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے غفلت طاری ہوتی ہے!
- ۲۳۶ اور عجب کثرت اسباب سے بھی پیدا ہوتا ہے!



- ۲۳۶ عجب کی ہلاکت!
- ۲۳۷ ظاہر پر ہیزگاری کی وجہ سے آدمی کا عجب و ناز میں مبتلا ہونا!
- ۲۳۸ عجب کے نقصانات کا خلاصہ!
- ۲۳۹ عجب کا علاج!
- ۲۳۹ تواضع کا بیان!
- ۲۳۹ تواضع کے معنی و مطلب!
- ۲۳۹ تواضع آدمی کے اندر کب آجاتی ہے!
- ۲۳۹ اللہ تعالیٰ کے بندے متواضع ہوتے ہیں!
- ۲۴۲ تواضع اور چاپلوسی و نوائے اور احساس کمتری میں فرق!
- ۲۴۲ چاپلوسی کیا ہے؟
- ۲۴۲ چاپلوسی کی مثالیں!
- ۲۴۳ احساس کمتری کسے کہتے ہیں؟
- ۲۴۳ تواضع اور تواضع کے دکھاوے میں فرق!
- ۲۴۴ متواضع شخص کا متواضعانہ کردار!
- ۲۴۴ تواضع اور انکساری کی علامتیں!
- ۲۴۵ تواضع کے فضائل!
- ۲۴۶ تواضع اختیار کرنے والوں کے جنت میں عالی مقامات!
- ۲۴۶ تواضع رفعت و بلندی کا ذریعہ ہے!

### دنیا کی محبت کا بیان!

- ۲۴۸ دنیا کی محبت کیا چیز ہے؟
- ۲۴۸ دنیا کی چیزوں سے کس درجہ میں محبت ہونی چاہئے؟
- ۲۴۹ زہد کسے کہتے ہیں؟

- ۲۴۹ دنیا کا کاروبار نہ کرنا وغیرہ زہد نہیں!
- ۲۵۰ زہد کی اساس اور بنیاد!
- ۲۵۱ اصل زہد کیا ہے؟
- ۲۵۲ زہد کی علامتیں!
- ۲۵۳ قناعت کسے کہتے ہیں؟
- ۲۵۴ قناعت کی علامتیں!
- ۲۵۴ زہد و قناعت کا اندرونی عمل!
- ۲۵۵ زہد میں افراط و تفریط!
- ۲۵۵ رہبانیت کیا ہے؟
- ۲۵۵ رہبانیت کی ابتداء!
- ۲۵۶ رہبانیت میں مزید تشدد اور غلو!
- ۲۵۸ اسلام فطری دین ہے اس میں نصاریٰ کی طرح رہبانیت و درویشی کی گنجائش نہیں!
- ۲۵۹ ناجائز رہبانیت کی ممانعت قرآن مجید کی رو سے!
- ۲۶۰ رہبانیت کی ممانعت رسول اللہ ﷺ کے عمل اور ارشاد کی رو سے!
- ۲۶۵ وقتی طور پر خلوت اور عزلت نشینی اور نقلی عبادات!
- ۲۶۶ روحانی ترقی اور خلوت و عزلت نشینی!
- ۲۷۱ روحانی ترقی اور خلوت و عزلت نشینی!
- ۲۷۳ اسلام سادگی بے تکلفی اور زہد و قناعت کی تعلیم دیتا ہے!
- ۲۷۴ کھانے پینے زینت وغیرہ میں اسراف ممنوع ہے!
- ۲۸۰ دین و دنیا کا فرق!
- ۲۸۰ ایک تنبیہ!
- ۲۸۱ دنیا دار اور دین دار کی علامات کیا ہیں؟
- ۲۸۲ دنیا کی محبت کا خلاصہ!

- ۲۸۲ دنیا کی محبت بدترین خصلت اور تمام برائیوں کی جڑ ہے!
- ۲۸۴ حق و باطل کا معیار نہ مال و متاع اور دنیا کی فراوانی ہے نہ تنگی!
- جو مال و اولاد یا جو چیز بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل یا اس کی یاد میں رکاوٹ ڈال دے تو وہ دنیا ہے اور دنیا مذموم اور ملعون ہے!
- ۲۸۷ اچھے اور برے مال و متاع کی پہچان!
- ۲۸۹ آخرت کی فکر کرو!
- ۲۹۰ انسان کیوں دنیا کو آخرت پر مقدم کرتا ہے!
- ۲۹۱ فکر آخرت کیسے پیدا ہو؟
- ۲۹۲ مال و متاع کی محبت کی علامتیں!
- ۲۹۳ حب الدنیا کی مذمت اور زہد و قناعت کی اہمیت و فضیلت!
- ۲۹۴ میری امت کا فتنہ مال ہے اس بارے میں احادیث مبارکہ!
- ۲۹۹ مال خود سے ناپاک اور عیب کی چیز نہیں!
- ۳۰۰ صحابہ کرام ؓ کے زمانہ میں فتوحات!
- ۳۰۱ اللہ تعالیٰ کی بندگی سے قلبی غنی حاصل ہوتا ہے!
- ۳۰۲ جو شخص دنیا سے محبت رکھتا ہے وہ اپنی آخرت کو تباہ و برباد کرتا ہے!
- ۳۰۹ حضرت لقمان علیہ السلام کی نصیحت!
- ۳۱۱ دنیا حضرات اولیاء کرام کی نظر میں!
- ۳۱۱ دنیا کی محبت حضرات انبیاء علیہم السلام کی نظر میں!
- ۳۲۱ حرص کی مذمت اور زہد و قناعت کی فضیلت!
- ۳۱۵ اللہ تعالیٰ سے حق حیا کرنا کیا ہے؟
- ۳۱۷ دنیا کی حرص کا علاج موت کی یاد ہے!
- ۳۱۸ زاهد اللہ تعالیٰ کو بھی محبوب ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی!
- ۳۲۰ علم ضائع کرنے والی چیزیں!
- ۳۲۲

- ۳۲۳ حضور اقدس کی طرز زندگی !
- ۳۲۵ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمرؓ کی طرز زندگی !
- ۳۲۶ کم روزی اور اس پر قناعت حاصل کرنے کے لئے پانچ باتوں کا اہتمام !
- ۳۲۸ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ناز و نعم میں لگنے والے نہیں ہوتے !
- ۳۲۹ غنا، دل کا ہے نہ کہ مال و دولت کی کثرت !
- ۳۳۰ دنیا کی چیزوں میں اپنے سے کم پر نظر رکھو تو قناعت اور شکرگزاری نصیب ہو جائیگی !
- ۳۳۲ ہوشیار لوگ کون ہیں ؟
- ۳۳۷ مال و متاع کی محبت کا علاج !
- ۳۳۷ جاہ کی محبت !
- ۳۳۸ حب جاہ کی علامت !
- ۳۳۹ حب جاہ کا علاج !
- ۳۳۹ سوال اور طمع کا بیان !
- ۳۳۹ طمع و سوال اور مومن کی شان !
- ۳۴۳ حرص و لالچ بہت بری ہیں !
- ۳۴۴ سوال کا حکم !
- ۳۴۵ سوال کی صورتیں !
- ۳۴۶ بھیک مانگنا کیا ہے ؟
- ۳۴۶ سوال کی جائز صورتیں اور اس کی حدود !
- ۳۴۷ جس سے مانگا جائے اس کے لئے احکام !
- ۳۴۷ آج کل کی غفلت !
- ۳۴۹ لوگوں سے طمع کرنا کیا ہوتا ہے اور ہدیہ کو قبول کرنا چاہئے !
- ۳۵۰ طمع کا علاج !
- ۳۵۱ زہد و قناعت کے فوائد کا خلاصہ !

۳۵۱

زہد و قناعت کے فوائد!

## حسد کا بیان!

۳۵۲

حسد کے معنی!

۳۵۳

غبطہ اور رشک!

۳۵۵

دنیاوی امور میں بھی زیادہ رشک نہیں ہونا چاہئے!

۳۵۵

حسد کا حکم!

۳۵۵

حسد کے درجات!

۳۵۶

حسد کے اسباب!

۳۵۹

اسبابِ حسد کا خلاصہ!

۳۶۰

ظلم و فسق کے خاتمے کیلئے ظالم و فاسق سے نعمت کے زوال کی خواہش حسد نہیں!

۳۶۰

پیغمبر کی بددعا اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا اعلان و ترجمان ہوتی ہے!

۳۶۲

ظلم و فسق مٹانے کی علامات!

۳۶۲

دنیا و آخرت میں حسد کی تباہیاں!

۳۶۲

پہلا حاسد شیطان اور حسد کی وجہ سے اپنے بھائی کو قتل کرنے والا قابیل ہے!

۳۶۳

حاسد اپنی نیکیاں محسود کے کھاتے میں ڈالتا رہتا ہے!

۳۶۳

حاسد کا یا تو تقدیر پر کامل ایمان نہیں، یا پھر وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر معترض ہوتا ہے!

۳۶۳

حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے!

۳۶۴

حاسد بالآخر ملعون ہو جاتا ہے!

۳۶۴

حسد دین کا صفایا کرتا ہے!

۳۶۴

صحابہ کرامؓ بغض اور حسد جیسی بیماریوں سے پاک تھے!

۳۶۵

حسد کا علاج!

۳۶۵

حسد کی تباہیوں اور فانی دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی فکر کریں!

۳۶۶

حسد میں کیا فائدہ ہے؟

- ۳۶۶ دنیاوی لحاظ سے ہمیشہ کمتر لوگوں کو مد نظر رکھو!
- ۳۶۶ حسد کے تقاضوں کو پورا نہ کریں!
- ۳۶۷ حسد کے تقاضوں کو پورا کرنے اور نہ کرنے کے لحاظ سے حسد کے درجات!
- ۳۶۸ محسود کی ترقی کیلئے دعائیں کریں!
- ۳۶۸ اندرونی بیماریوں کے علاج کا آسان طریقہ!

### توکل کا بیان!

- ۳۷۰ ظاہری اسباب کی حیثیت!
- ۳۷۰ ظاہر پرستوں کا عقیدہ!
- ۳۷۱ توکل کے فضائل و فوائد!
- ۳۷۲ توکل ایمان اور اسلام کے لئے شرط ہے!
- ۳۷۳ متوکل اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے!
- ۳۷۳ متوکل بلا حساب و کتاب جنت میں جائیگا!
- ۳۷۳ اللہ تعالیٰ جل شانہ متوکل کی دنیا و آخرت کے ہر کام میں ہر حالت میں کافی ہے!
- ۳۷۴ توکل ہر پریشانی کا علاج ہے!
- ۳۷۴ توکل دل کی حالت کا نام ہے!
- ۳۷۵ توکل کی صورتیں اور شکلیں!
- ۳۷۵ توکل کی پہلی شکل، اللہ تعالیٰ کی باتوں یعنی اس کی تعلیمات اور وعدوں وغیرہ پر مکمل بھروسہ اور عمل!
- ۳۷۶ ایمان والوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کے لئے دنیا کی مصیبتیں کیوں جھیلیں!
- ۳۷۷ توکل کی پہلی صورت کے متعلق قرآن مجید کی چند آیات!
- توکل کی دوسری صورت یا قسم، کہ اسباب کے بجائے مالک اور ان کے بنانے والے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہو!
- ۳۸۰ اسباب کو اختیار کرنا اور چیز ہے اور اسباب پر بھروسہ کرنا بالکل دوسری چیز ہے!
- ۳۸۱ جو تے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو بھی اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہئے!

- ۳۸۲ توکل کی دوسری قسم کے متعلق قرآن مجید کی چند آیات اور چند احادیث شریفہ!
- ۳۸۳ توکل کے متعلق افراط و تفریط!
- ۳۸۴ بدفالی اور شریک و ناجائز دم کی مذمت و ممانعت!
- ۳۸۵ نیک فال امید دلاتی ہے اور مستحب ہے!
- ۳۸۶ اسباب نہ ہوں یا نہ رہیں تو اللہ تعالیٰ بلا مقررہ اسباب کے دوسرے ذرائع سے روزی پہنچا دیتا ہے!
- ۳۸۷ تدبیر اور اسباب کو اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں، مزید دلائل!
- ۳۹۰ وہ دم جائز ہے جس میں شریک الفاظ نہ ہوں اور ٹھیک مقصد کیلئے ہو!
- ۳۹۱ اسباب و تدبیر کو چھوڑنے کو توکل کہنا جہالت اور کم ہمتی ہے!
- اگر کوئی ترک اسباب کو توکل تو نہیں کہتا لیکن کسی وجہ سے
- ۳۹۲ اسباب معاش کو ترک کر دے تو قابل ملامت نہیں!
- ۳۹۳ اسباب کے متعلق علمی توکل فرض ہے!
- ۳۹۳ ترک اسباب توکل کے منافی نہ ہونے کے پس پردہ اسباب کی بندگی!
- ۳۹۵ کون سا توکل فرض ہے؟
- ۳۹۵ عملی توکل میں فرض، واجب وغیرہ!
- ۳۹۷ توکل کا خلاصہ!
- ۳۹۷ متوکل اور غیر متوکل میں فرق!
- ۳۹۸ توکل کے ثمرات اور علامات!
- ۳۹۹ توکل کا اعلیٰ مقام یا رضا بالقضاء!
- ۳۹۹ رضا بالقضاء کا مقام اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت کا نتیجہ ہوتا ہے!
- ۳۹۹ مقام رضا میں بندے کی حالت!
- ۴۰۰ رضا بالقضاء کا مقام اور قرآن مجید اور احادیث!
- ۴۰۱ جس کو رضا بالقضاء کا مقام نصیب ہو جائے، وہ نیک بخت ہے!

## صبر کا بیان!

- ۴۰۴ دین حق اور صبر!
- ۴۰۴ صبر کی نعمت مخلوق میں انسان اور جن کو حاصل ہو سکتی ہے!
- ۴۰۵ خواہشات اور جذبات کو کنٹرول کرنے کی مثالیں!
- ۴۰۶ صبر کی شاخوں کے مختلف نام!
- ۴۰۷ صحت، مال و ثروت وغیرہ پر ”صبر“ ضبط نفس!
- ۴۰۸ فرائض و احکامات پر صبر!
- ۴۰۹ کار خیر پر دوام اللہ تعالیٰ کو پسند اور محبوب ہے!
- ۴۱۰ شجاعت یعنی حق کی خاطر تکلیفوں پر صبر اور میدان جنگ میں صبر و استقامت اختیار کرنا!
- ۴۱۱ حلم یعنی غیظ و غضب کے حالات پر صبر درگزر کرنے کی فضیلت!
- ۴۱۲ غصے دلانے والے کام پر غصہ آنا برا نہیں بلکہ آپ سے باہر باہر ہو جانا اور بے جا استعمال برا ہے!
- ۴۱۲ غصہ پی جانے والے کا دل سکون و ایمان سے بھر جاتا ہے!
- ۴۱۲ غصہ کو پی جانے والا روحانی اور اعصابی پہلوان ہوتا ہے!
- ۴۱۳ اعصابی کمزوری کا علاج غصہ پی جانے کی مشق میں ہے!
- ۴۱۳ غصہ پی جانے کا گھونٹ سب سے افضل ہے!
- ۴۱۳ غصہ پی جانے والے شخص کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے عذاب سے بچائے گا!
- ۴۱۴ قیامت کے دن غصہ پی جانے والے کا اعزاز!
- ۴۱۴ غصہ قوت ہے اور حلیم شخص طاقتور ہوتا ہے!
- ۴۱۴ حلم کے معنی!
- ۴۱۴ حلم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے!
- ۴۱۵ بندوں میں حلم اور بردباری کی صفت اور اس کی فضیلت!
- ۴۱۶ غصہ عبادت کو بے مزہ، زندگی کو بے چین اور ایمان کو خراب و برباد کر دیتا ہے!
- ۴۱۶ غصہ کے وقت انسان گویا شیطان کی مٹھی میں ہوتا ہے اور اس کا علاج!



- ۴۱۹ غصے کی ضرورت اور اس کی حدود!
- ۴۱۹ غصہ کی برائی کب ظاہر ہوتی ہے!
- ۴۲۰ اللہ تعالیٰ کے لئے بغض اور کینہ اور آج کل!
- ۴۲۰ مصائب پر صبر کرنا!
- ۴۲۱ مصائب پر صبر کی فضیلت!
- ۴۲۲ رنج و غم کا پہنچنا گناہوں کو دھو ڈالتا ہے!
- ۴۲۲ کون سی تکلیف و مصیبت باعثِ رحمت ہے؟
- ۴۲۳ اولاد کے انتقال پر صبر کرنے کا اجر و ثواب!
- ۴۲۳ فقر و بیماری اور دوسری مصیبتیں اور پریشانیاں گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہیں!
- ۴۲۴ بینائی سے محرومی پر صبر کا بدلہ جنت ہے!
- ۴۲۴ بیماری پر صبر کی فضیلت!
- ۴۲۵ مصیبتوں اور تکلیفوں پر صبر کرنے میں دنیوی فائدے!
- ۴۲۷ جزع فزع کی ممانعت اور مذمت!
- ۴۲۷ مصیبت کے وقت بلا جزع فزع کے رونا ممنوع نہیں!
- ۴۲۹ صابرین یعنی صبر کرنے والے کون لوگ ہیں؟
- ۴۳۰ دنیا و آخرت میں صبر و استقامت کے فضائل و فوائد!
- ۴۳۱ فرشتے جنت میں صابرین کا استقبال کریں گے!
- ۴۳۱ آخری حیات حق پر صبر و استقامت والوں کو ہوتی ہے!
- شجاع بہادر یعنی جنگ اور خطرات کے مقابلے میں
- ۴۳۲ صبر و استقامت والے لوگ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں!
- ۴۳۳ صبر عزم کی بلندی اور بہت بڑی ہمت کا کام ہے!
- ۴۳۴ شجاعت اور بہادری کیا ہے؟
- ۴۳۵ بے خوفی کا نام شجاعت نہیں!

- ۴۳۵ ظلم اور بے رحمی کا نام بہادری نہیں!
- ۴۳۶ صابر متقی ہوتا ہے!
- ۴۳۷ مشکلات اور مصائب سے نجات کا حل!
- ۴۳۸ موت کے بعد دوسری زندگی ہر انسان کو ملتی ہے لیکن....!
- ۴۳۸ ایمان کے لئے آزمائش ضروری ہے!
- ۴۳۹ آزمائش کے فوائد!
- ۴۴۰ آزمائشیں تمہاری ترقی کے لئے ہیں گھبراؤ نہیں!
- ۴۴۰ مؤمن کے قول کی حیثیت!
- ۴۴۱ صابرین پر اللہ تعالیٰ کی شاباشیں برکتیں اور رحمتیں برستی رہتی ہیں!
- ۴۴۱ علم اور دنیا کی امامت صبر پر ملتی ہے!
- ۴۴۲ حق کی خاطر صبر کرنے کا صلہ جنت ہے!
- ۴۴۳ صبر کرنے والوں کو بے حد و حساب اجر ملے گا!
- ۴۴۴ صبر کون کر سکتا ہے؟
- ۴۴۵ انسان جس چیز کو اپنا نصب العین بناتا ہے تو اس کیلئے استقامت کو اختیار کرتا ہے!
- ۴۴۵ صبر، عجز اور رونے کا نام نہیں!
- ۴۴۶ ایمانی زندگی اور صبر!
- ۴۴۶ صبر کا حصول، نفس کو کچلے بغیر حقیقی معنوں میں صابر ہونا ناممکن ہے!
- ۴۴۶ نفس کو قابو کرنے یا کچلنے کا طریقہ!
- ۴۴۷ تواضع اور انکساری اور بے نفسی کا تجربہ خاص حالات میں ہوتا ہے!
- ۴۴۷ بے نفسی اور صبر کا بڑا تجربہ جماعتی اور تنظیمی زندگی میں ہوتا ہے!
- ۴۴۸ طاقتور اور جنت کے مستحق لوگ!
- ۴۴۸ بے پناہ قوت والی جماعت!
- ۴۴۹ جماعتی صبر کا بیان!

- ۴۴۹ دین حق کو دنیا کے سانچے میں ڈھالنا جماعتی بے صبری ہے!
- ۴۴۹ دنیوی مفادات وغیرہ کی چند مثالیں!
- ۴۵۰ عوام میں مقبول تحریک کے لئے ضروری نہیں کہ وہ حق بھی ہو!
- ۴۵۰ اسلام میں زندگی کا مادہ پرستانہ نقشہ توڑنا پڑتا ہے!
- ۴۵۱ احیائے اسلام کے نام پر اٹھائی گئی تحریکات کا حال!
- ۴۵۱ کامیابی کا راز صبر و استقامت میں ہے!
- ۴۵۱ معقول تعداد میں افراد کی اصلاح سے پہلے قومی اصلاح بے صبری ہے!
- ۴۵۲ اقدامات میں صبر اور عاجلانہ اقدام سے پرہیز کیا جائے اور جلد بازی کیا ہے؟
- ۴۵۲ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہ طور پر وقت سے پہلے حاضر ہونا!
- ۴۵۳ غزوہ اُحد میں قبل از وقت گھائی چھوڑنے کا انجام!
- ۴۵۴ راہ حق میں غلطی سے عاجلانہ اقدام ہو تو گھبرائیں نہیں!
- ۴۵۵ مسلمانوں کی افواج اور ان کی عسکری تنظیمیں اغیار کے کام آتی ہیں!
- ۴۵۵ اغیار کی امداد کو زہر قاتل سمجھو!
- ۴۵۶ بہت سی عسکری تنظیمیں خود اپنی جماعت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہیں!
- ۴۵۶ رحم اور ترس و مہربانی کا بیان!
- ۴۵۷ رحم کیا ہے؟
- ۴۵۷ اسلام اور رحم دلی!
- ۴۵۸ قرآن مجید، حدیث شریف میں رحم دلی اور مہربانی کی ترغیب و فضیلت اور سنگدلی کے بدنتائج!
- ۴۶۴ رحم و ہمدردی کی فضیلت اور بے رحمی اور سنگدلی کے متعلق چند احادیث!
- ۴۶۵ مخلوق پر رحم اور اسکی خدمت کا جذبہ بہت ہی اعلیٰ ہے!
- ۴۶۵ رحم کے آثار و پھل یا علامات!
- ۴۶۶ اللہ تعالیٰ کی صحیح اور کامل بندگی کب ہوگی؟
- ۴۶۷ رحم اور خدمت گزاری کے فوائد!

- ۴۶۷ رحم کی صورت میں دوسروں پر ظلم!
- ۴۶۸ سانپ، بچھو وغیرہ کو مارنا یا خالموں کا ہاتھ ظلم سے روکنا بھی مخلوق پر رحم ہی ہے!
- ۴۶۹ مہربانی کی تعلیم اور مسلمانوں کی اکثریت!
- ۴۶۹ بے رحمی اور سنگدلی کا علاج!
- ۴۷۰ کسی پر شفقت اور اسکی خدمت کے شرائط و آداب!
- سچائی اور امانتداری کا بیان!
- ۴۷۲ صدق کسے کہتے ہیں؟
- ۴۷۲ جھوٹ کسے کہتے ہیں؟
- ۴۷۲ امانت داری کسے کہتے ہیں اور خیانت کسے؟
- ۴۷۲ وعدہ اور عہد و پیمان کسے کہتے ہیں؟
- ۴۷۲ جھوٹ اور خیانت کی تفصیل اور اس کی مذمت!
- ۴۷۴ جھوٹ کی اقسام اور صورتیں!
- ۴۷۵ زبانی اور بے ضرر جھوٹ کی مذمت اور بدبو و نجاست!
- ۴۷۶ جھوٹ بولنا سخت خیانت ہے!
- ۴۷۶ بلا تحقیق سنی سنائی بات پھیلانا بھی جھوٹ ہے!
- ۴۷۷ جھوٹی گواہی کی مذمت!
- ۴۷۷ جھوٹی قسمیں کھانا!
- ۴۷۸ بہتان اور کسی پر جھوٹ باندھ کر تہمت لگانے کی مذمت!
- ۴۷۹ بہتان اور تہمت کا پھیلانا بھی ممنوع ہے!
- ۴۸۰ جھوٹا وعدہ یا وعدہ خلافی!
- ۴۸۲ عہد اور معاہدہ کیا ہوتا ہے؟
- ۴۸۲ معاہدہ اور وعدہ میں فرق!
- ۴۸۲ وعدہ خلافی اور عہد شکنی کا عذاب!

- ۴۸۳ قیامت کے دن عہد شکن لوگوں کی عظیم رسوائی!
- ۴۸۴ بدعہدی نفاق پیدا کرتی ہے!
- ۴۸۴ ایفائے عہد اور وعدہ کی عملی تعلیم!
- ۴۸۵ وعدہ پورا کرنا واجب ہے بشرطیکہ خلاف شریعت نہ ہو!
- ۴۸۵ امانت کی ضد خیانت کا بیان!
- ۴۸۶ امانت کیا ہے اور خیانت کیا؟
- ۴۸۷ ادائے امانت کا حکم!
- ۴۸۸ بدن اور اعضاء و جوارح میں خیانت!
- ۴۹۰ خیانت کی بعض باریک قسمیں!
- ۴۹۰ اپنی عقل و فکر سے صحیح اور خیر خواہانہ مشورہ دینا امانت ہے!
- ۴۹۰ مؤذن ایک ذمہ دار شخص امین ہے اور امانت اس کے سپرد کی جاتی ہے!
- ۴۹۱ جب کوئی ایسی بات آپ سے کہدے جس کو وہ دوسروں سے چھپانا چاہتا ہے وہ بھی امانت ہے!
- ۴۹۱ مجلس کی باتیں بھی امانت ہوتی ہیں!
- ۴۹۲ قرآن مجید و حدیث میں اجتماعی اموال اور حقوق میں خیانت کی سزا!
- جس مال سے مسلمانوں کے حقوق وابستہ ہوں اس میں
- ۴۹۴ ناجائز تصرف کرنے والے شہید کا عبرتناک واقعہ!
- ۴۹۵ اجتماعی مال میں خیانت کرنے والے آگ کے سزاوار ہوں گے!
- ۴۹۵ خائن قیامت میں رسوا ہوگا!
- ۴۹۶ جس کے اندر صفت امانت نہیں اس میں ایمان نہیں!
- ۴۹۶ ایمان کے منافی کوئی خیانت ہے؟
- ۴۹۷ جس کام میں بھی امانتداری اور ذمہ داری ہوگی اس میں برکت ہوگی!
- ۴۹۸ امانتداری بقدر ذمہ داری!
- ۴۹۸ بدعہدی بددیانتی وغیرہ سب جھوٹ کی مختلف صورتیں ہیں!

- ۴۹۹ اتفاق طور پر اگر کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس کو اس غلطی کا عادی نہیں کہا جاسکتا!
- ۴۹۹ صداقت اور سچائی کی تفصیل!
- ۴۹۹ صداقت اور سچائی کی صورتیں!
- ۴۹۹ زبان کی سچائی!
- ۵۰۰ عمل کی سچائی!
- ۵۰۱ اللہ تعالیٰ کے لئے تکلف سے عمل کرنا کار ثواب ہے اور سچائی کا طالب ہے لیکن یہ سچائی نہیں!
- ۵۰۱ نیت و ارادہ کی سچائی!
- ۵۰۲ غیبت اور چغلی اور کسی کو مصیبت میں مبتلا کرنا سچائی نہیں بلکہ بد نیتی ظلم اور سچائی کے منافی ہے!
- ۵۰۲ کس مجبوری کے تحت توریہ وغیرہ کیا جاسکتا ہے؟
- ۵۰۳ توریہ کی ایک مثال!
- ۵۰۳ شرعی مجبوری کے وقت اگر مصلحت کے لئے کچھ کہنا پڑے تو بھی سچ بولنے کی کوشش کریں!
- ۵۰۵ ارادہ اور عزم کی سچائی اور تکمیل عزم کی سچائی!
- ۵۰۷ طلب کی سچائی!
- ۵۰۷ صداقت کا خلاصہ!
- ۵۰۷ قرآن مجید اور صداقت!
- ۵۰۸ پورے دین اسلام پر سچائی کے ساتھ عمل کرنے والا سچا ہے!
- ۵۰۸ صادق کون ہوتا ہے؟
- ۵۰۹ صدیق کون ہوتا ہے؟
- ۵۰۹ صداقت اور سچائی کے فضائل!
- ۵۱۰ سچائی پر جنت کی ضمانت!
- ۵۱۱ سچا بہترین شخص ہوتا ہے!
- ۵۱۱ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کے نزدیک بدترین اور مبغوض ترین چیز جھوٹ تھی!
- ۵۱۲ خوش طبعی میں بھی جھوٹ سے پرہیز کرو!

- ۵۱۲ صداقت جنت میں پہنچانی والی چیز ہے!
- ۵۱۲ صداقت اور سچائی بلند درجات پر پہنچانے والی چیز ہے!
- ۵۱۳ بچوں کے ساتھ رہنے کی تاکید!
- ۵۱۳ مقام صدیقیت کی فضیلت!
- ۵۱۴ نیکی اور بس سچائی کو اپنے اوپر لازم کرو اسی میں دنیا و آخرت کی بڑائی اور بھلائی ہے!
- ۵۱۴ سچائی نیکی کا میلان اور جھوٹ برائی کا میلان پیدا کرتی ہے!
- ۵۱۴ علاج جھوٹ اور صدق!
- ۵۱۵ بس سچائی کو اختیار کرنا ہی شرافت انسانی اور راہ نجات ہے!
- انفاق کا بیان!
- ۵۱۶ اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی مخلوق کی نفع رسانی کے واسطے اپنی کمائی اور قوتوں کو خرچ کرنا!
- اللہ تعالیٰ کیلئے اس کی مخلوق کی نفع رسانی کے واسطے اپنی کمائی
- ۵۱۶ اور قوتوں کو خرچ کرنے کے فضائل و فوائد!
- ۵۱۶ انسانی نفس کی بیماریوں اور تزکیہ نفس میں انفاق کا کردار!
- ۵۱۷ اسلام عام رحمہ کی تعلیم دیتا ہے!
- ۵۱۷ انفاق اور قرآنی آیات!
- ۵۱۸ سچی وفاداری اور سچی نیکوکاری!
- ۵۱۸ سچی بندگی کرنے والا لوگوں کے حقوق کو حسن خوبی کے ساتھ ادا کرتا ہے!
- ۵۲۰ ادائے حقوق میں کوتاہی کا سبب!
- ۵۲۰ بخل کیا ہے؟ اور اترانے والوں کے اوصاف!
- ۵۲۱ اللہ تعالیٰ کے لئے خرچ کرنے والے پر نہ خوف ہوگا اور نہ غم!
- ۵۲۲ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کس قدر خرچ کرنا چاہئے؟
- ۵۲۲ اشتراکیت سے متاثرہ لوگوں کا جذبہ!
- ۵۲۳ انسان کا بخل آخرت میں اس کے گلے کا ہار عذاب بنے گا!

## انفاق اور احادیث الرسول ﷺ!

- ۵۲۴ انفاق اور صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا!
- ۵۲۴ حلال مال کا صدقہ مسلسل بڑھتا رہتا ہے!
- ۵۲۵ مسکینوں کی ضروریات پورا کرنے کا حکم!
- ۵۲۶ صدقہ میں مصائب کا علاج اور دنیا و آخرت کی کامیابی ہے!
- ۵۲۶ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات اور حقوق بھی ہیں!
- ۵۲۷ خرچ کرنے والوں کے لئے فرشتوں کی دعائیں!
- ۵۲۷ اللہ تعالیٰ کے لئے خرچ کرنے والوں کے لئے خاص انعام!
- ۵۲۸ ضرورت سے زائد مال خرچ کرنے کا حکم!
- ۵۲۹ صدقہ ہر مسلمان پر لازم ہے!
- ۵۳۰ بخل، معاشرہ کے فساد و خونریزی اور تباہی کا سبب ہے!
- ۵۳۱ اصلاح اور بگاڑ کی ابتداء!
- ۵۳۱ بخل ایمان کی ضد ہے!
- ۵۳۲ بخیل جنت میں داخل نہیں ہوگا!
- ۵۳۳ سخی اور بخیل کی دنیا اور آخرت!
- ۵۳۳ مخلوق الہی پر رحم اور اسکے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت!
- ۵۳۳ بہترین انسان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کرے!
- ۵۳۴ بد بخت کا دل رحم و شفقت کے جذبہ سے خالی ہوتا ہے!
- ۵۳۴ تم زمین والوں پر رحم کرو، اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے گا!
- ۵۳۵ جو شخص اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر رحم نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے!
- ۵۳۵ مومنوں اور مسلمانوں کی باہمی خیر خواہی و ہمدردی و معاونت!
- ۵۳۵ ہر مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے!
- ۵۳۶ باہمی تعاون اخوت کی روح اور جان ہے!



- ۵۳۶ مومن ایک دوسرے کا معاون اور دوست ہوتا ہے!
- ۵۳۶ سارے مومن ایک دوسرے کی مدد کے ذریعے ناقابلِ تسخیر طاقت بن سکتے ہیں!
- ۵۳۷ مومنین ایک بدن کی طرح ہوتے ہیں!
- ۵۳۸ مسلمان دوسرے مسلمان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا!
- ۵۳۸ مسلمان بھائی کی تذلیل و تحقیر نہ کرو!
- ۵۳۹ ہمسایہ اور پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو!
- ۵۳۹ پڑوسی کو ایذا اور تکلیف پہنچانے والا یا اس کی خبر گیری نہ کرنے والا مومن نہیں!
- ۵۴۰ کسی کو اپنے مومن بھائی کی غیبت جائز نہیں!
- ۵۴۱ مومن بھائی میں کوئی عجیب دیکھو تو اس کو چھپاؤ!
- ۵۴۱ مظلوم کی فریاد رسی اور اس کی مدد کرو!
- ۵۴۲ ظالم کی مدد ایمان کے منافی ہے!
- ۵۴۲ یتیم کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت!
- ۵۴۳ بیوہ عورت اور مسکین کی خدمت کا ثواب!
- ۵۴۴ یتیموں، مسکینوں اور بے کسوں کی امداد اور اخلاص!
- زبان کی حفاظت کا بیان!
- ۵۴۵ زبان کی حفاظت!
- ۵۴۵ زبان کی استقامت!
- ۵۴۶ زبان کی پیما کی آدمی کو جہنم میں ڈال دیتی ہے!
- ۵۴۶ زبان اور شرمگاہ کے فتنے اور شر سے بچنے والا جنتی ہے!
- ۵۴۶ زبان اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے کو نبی کریم ﷺ کی طرف سے جنت کی بشارت!
- ۵۴۶ خاموشی میں نجات ہے!
- ۵۴۷ زبان کے فتنے سے بچو!
- ۵۴۷ خاموشی اور خوش خلقی کی فضیلت!

- ۵۴۷ خاموشی کی عادت اختیار کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے!
- ۵۴۸ نرم مزاجی اور نرم خوئی کا بیان!
- ۵۴۸ نرم خوئی کی فضیلت!
- ۵۴۹ نرمی پر جو کچھ ملتا ہے وہ سختی پر نہیں ملتا!
- ۵۴۹ نرمی ہر چیز میں حسن اور زینت پیدا کر دیتی ہے!
- ۵۵۰ سنگدل اور درشت خو، نیکی سے محروم رہتا ہے!
- ۵۵۰ دنیا و آخرت کی خیر حاصل کیجئے اور محرومی سے بچئے!
- ۵۵۱ خوش کلامی کا حکم اور خوش کلامی کیا ہے؟
- ۵۵۱ بد کلامی شیطان کا کام ہے!
- ۵۵۲ قیامت کے روز بدترین آدمی بخش گواور بدگو ہوگا!
- ۵۵۲ نرم اور میٹھی بات صدقہ ہے!
- ۵۵۲ مومن لعن طعن کرنے والا اور بدگو نہیں ہوتا!
- ۵۵۳ آپس کی گالی گلوچ کا سارا گناہ گالی کی ابتداء کرنے والے پر ہوتا ہے!
- ۵۵۳ جو شخص قابل لعنت نہ ہو اس پر لعنت کرنا خود اپنے آپ کو مبتلائے لعنت کرنا ہے!
- ۵۵۳ بخش گوئی کی مذمت!
- ۵۵۴ نرم مزاج اور نرم خو، شخص کی فضیلت!
- ۵۵۴ عار دلانے والے کے بارے میں وعید!
- ۵۵۴ زبان کی لغزش نہایت خطرناک ہے!
- ۵۵۵ زبان کے قابو کرنے کا علاج و طریقہ!
- ۵۵۵ چغلی کی مذمت!
- ۵۵۶ چغلی کھانا اور لوگوں کے درمیان نفاق اور دشمنی پیدا کرنا دین کو ختم کرتا ہے!
- ۵۵۶ چغل خوروں کی باتوں کو ناقابل اعتبار قرار دیا جائے!

## اللہ تعالیٰ کی محبت کا بیان!

- ۵۵۸ مومن کا حقیقی محبوب صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے!
- ۵۵۹ محبت وعداوت متعدی صفات ہیں!
- ۵۵۹ اللہ تعالیٰ سے خالص محبت رکھنے والا کون ہے؟
- ۵۶۰ کسی جذبہ کو پیدا کرنے کے لئے ایک اصولی بات!
- ۵۶۰ اللہ تعالیٰ کی محبت کے آثار و علامات!
- ۵۶۲ تمام شعائر اللہ اور اللہ تعالیٰ کے نام سے لگی ہوئی چیزوں، خصوصاً رسول اللہ ﷺ کی توہین کفر ہے!
- ۵۶۲ توحید کے نام پر توہین کرنے والے!
- ۵۶۲ اللہ تعالیٰ کی صفات میں شرکت پیدا ہونا محال ہے!
- ۵۶۸ قبر اور برزخ کی زندگی اور اس میں درجات!
- ۵۷۰ قبر میں انبیاء علیہم السلام کی ممتاز حیات ایک مسلمہ حقیقت ہے!
- ۵۷۱ برزخی زندگی کو دنیا پر قیاس نہ کیا جائے اور یہ شرعی مسائل کا حل نہیں!
- ۵۷۲ تجربہ شہاد ہے کہ بعض لوگوں کے اجسام مرنے کے بعد صحیح و سالم رہ جاتے ہیں!
- ۵۷۲ اس کے متعلق چند واقعات!
- ۵۷۶ پرانی قبر نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا!
- ۵۷۶ دوسروں کی حفاظتِ جسم پر انبیاء علیہم السلام کی حیات اور جسم مبارک کو قیاس نہیں کیا جاسکتا!
- ۵۷۷ حضور اقدس ﷺ کی شان!
- ۵۷۹ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بے باک اور شتر بے مہار زبان کی غلطی!
- ۵۸۰ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی محبت بھی لازمی ہے!
- ۵۸۱ صحابی کون ہوتا ہے؟
- ۵۸۱ موجودہ زمانے میں سلف و صالحین اور صحابیت کے خلاف زہر پھیلانے والے کون ہیں؟
- ۵۸۲ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی عظمت و شان گھٹانے کا ایک خمیٹ قدم صحابیت کو داغ دار کرنا ہے!
- ۵۸۳ عبد اللہ بن سبا یہودی کی سازش اور یہودیوں کی تحریکِ سبائی!

- ۵۸۵ یہود اور عبداللہ بن سبا کی سازش اور اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم!
- ۵۸۶ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن و حدیث کی نظر میں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل!
- ۵۸۷ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں ایمان و تقویٰ تھا اور وہ کفر و معصیت سے سخت بیزار تھے!
- ۵۸۸ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان و تقویٰ کا صرف ایک واقعہ جو بظاہر تقویٰ کے خلاف معلوم ہوتا ہے!
- ۵۹۰ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اللہ راضی ہے اور سب کے سب جنتی ہیں!
- ۵۹۱ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنتی اور بخشے بخشائے گئے ہیں اور ان سے اللہ تعالیٰ راضی ہے!
- ۵۹۲ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی باہمی شفقت و محبت اور ان کا کردار اور ان سے جلنے والے کافر لوگوں کا بیان!
- ۵۹۳ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اللہ تعالیٰ کے لئے محبت اور اسی کی خاطر بغض،  
صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کرنے کی وجہ سے ہے!
- ۵۹۴ صحابیت اور صحابہ میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہم  
اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں اور نواسے بھی شامل ہیں!
- ۵۹۴ جب اللہ تعالیٰ کی محبت آجائے گی تو اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم اور اہل بیت رضی اللہ عنہم  
اور اہل بیت رضی اللہ عنہم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے اور یہی علاج بتایا!
- ۵۹۵ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اللہ تعالیٰ خوش ہیں ان کو جنت ملے گی اور ان کے ایمان و محبت کو وقتی ماننا  
اللہ تعالیٰ سے (العیاذ باللہ) بھول چوک کے صادر ہونے کا ماننا ہے جو کہ عظیم کفر ہے!
- ۵۹۹ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان، عقائد اور عمل امت کے لئے نمونہ ہیں اور معیارِ حق ہیں!
- ۶۰۰ اجماع امت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے راستہ کی مخالفت!
- ۶۰۰ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معیارِ حق ہونے کا مطلب!
- ۶۰۱ خلفائے راشدین کے طریقوں کی اتباع کا حکم!
- ۶۰۱ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد تابعین اور ان کے بعد تبع تابعین امت مسلمہ کے بہترین لوگ ہیں!
- ۶۰۲ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہنے والا ملعون ہے!
- ۶۰۳ صحابیت کا ناشکر اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہنے والا مسلمان نہیں ہو سکتا!

- ۶۰۴ صحابہ کرام ﷺ کا تقدس و تقویٰ وغیرہ یقین سے ثابت یقینی ہے جس کے مقابلے میں تاریخ جھوٹی روایات کی کوئی حیثیت نہیں!
- ۶۰۵ صحابہ کرام ﷺ کے بارے میں عقیدہ!
- ۶۰۶ تمام صحابی ﷺ وصفِ صحابیت میں برابر ہیں!
- ۶۰۷ صحابہ کرام ﷺ کے باہمی مشاجرات کے متعلق!
- ۶۰۷ سچے اور جنتی گروہ اور فرقے و جماعت کی پہچان!
- ۶۰۸ صحابہ کرام ﷺ کے متعلق آخری بات!
- ۶۰۸ صحابہ کرام ﷺ کی رسول اللہ ﷺ سے محبت!
- ۶۱۲ تبرک بآثار الصالحین کا بیان!
- ۶۱۳ نشانیاں اور تبرکات کس وقت بابرکت اور رحمتِ الہی کا ذریعہ بنتے ہیں!
- ۶۱۳ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نیلوکاروں پر اترتی ہیں!
- ۶۱۵ اللہ تعالیٰ بعض مقامات کو مبارک و مقدس بناتا ہے!
- ۶۱۵ مبارک و مقدس مقامات، اوقات اور انسانوں کا ذکر قرآن مجید میں!
- ۶۱۷ بعض انسان، مقامات اور اوقات لوگوں کے لئے خیر و برکت کا ذریعہ ہوتے ہیں!
- ۶۱۷ مقامِ ابراہیم علیہ السلام!
- ۶۱۷ صحابہ کرام ﷺ کے دلوں میں نبی کریم ﷺ کی جائے نماز کی اہمیت!
- حضرت عمر فاروق ﷺ نے اس مبارک درخت کو کیوں کاٹا
- ۶۱۹ جس کے نیچے بیعتِ رضوان جیسا مبارک عمل وجود میں آیا تھا!
- ۶۲۲ سلف صالحین کی چھوڑی ہوئی چیزیں اور قرآن مجید!
- ۶۲۳ صحابہ کرام ﷺ کے نزدیک نبی کریم ﷺ کا نیزہ اور انگوٹھی کی قدر و قیمت!
- ۶۲۴ ان چیزوں کی قدر و قیمت جن پر حضور ﷺ کے ہونٹ مبارک لگے تھے!
- ۶۲۵ نبی کریم ﷺ کا جبہ مبارک!
- ۶۲۵ نبی کریم ﷺ کا پسینہ مبارک!

- ۶۲۵ نبی کریم ﷺ کے خون مبارک کو زمین پر نہ گرنے دینا!
- ۶۲۸ نبی کریم ﷺ کے بدن مبارک اور منہ مبارک سے لگے ہوئے پانی کی قدر و قیمت!
- ۶۲۸ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کے تھوک کو بھی زمین پر نہیں گرنے نہیں دیتے تھے!
- ۶۲۸ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نبی کریم ﷺ سے محبت و عقیدت کی ایک جامع روایت!
- ۶۲۸ نبی کریم ﷺ کے موئے (یعنی بال) ناخن مبارک کا بطور تبرک رکھنا!
- ۶۳۰ سلف صالحین کی یادگاروں اور تبرکات کے بارے میں نصوص کا خلاصہ!
- ۶۳۱ یہودیوں اور دشمنان اسلام کے حربے!
- ۶۳۲ تبرکات اور محبت و عقیدت کے نام پر شرک سے بچنے!
- ۶۳۲ یادگاروں کے دیکھنے اور تبرکات سے فائدہ کیسے حاصل ہوتا ہے!
- ۶۳۳ تبرکات کے بارے میں چند ہدایات!
- ۶۳۴ (۱) تبرکات میں از خود کوئی نفع نہیں!
- ۶۳۴ (۲) تبرکات اور یادگاروں پر عرس نہ کریں!
- ۶۳۴ (۳) یادگاروں اور تبرکات کی زیارت میں شرعی حدود سے تجاوز نہ کریں!
- ۶۳۵ (۴) یادگاروں اور مبارک مقامات کی زیارت کو حج کا جز نہ قرار دیا جائے!
- ۶۳۵ (۵) یادگاروں میں نماز اور نوافل کو ضروری قرار نہ دیا جائے!
- ۶۳۵ (۶) یادگاروں کی زیارت نہ کرنے والوں پر نکیر نہ کریں!
- ۶۳۵ (۷) تبرکات کو نمائش اور کمائی کا ذریعہ نہ بنایا جائے!
- ۶۳۵ اللہ تعالیٰ کی محبت و عظمت کی علامت؛ شعائر اللہ کی تعظیم اور ان سے محبت ہے!
- ۶۳۷ عدل و انصاف!
- ۶۳۹ توحید عدل و قسط پر مبنی عقیدہ ہے اور شرک عدل سے ہٹی ہوئی بات اور ظلم عظیم ہے!
- ۶۴۰ اللہ تعالیٰ کو عدل پسند ہے!
- ۶۴۱ آیت شہادت کی تفسیر!
- ۶۴۶ انسان کے لئے ضروری ہے کہ عدل و قسط کے ساتھ پوری زندگی گزارے!

۶۴۷	ظلم بغیر اثر کیے نہیں رہتا!
۶۴۷	انسان کو عدل اختیار کرنے کا حکم!
۶۴۸	انسان اپنی پوری زندگی میں عدل کو کیسے قائم کر سکتا ہے؟
۶۴۸	انسان کے زندگی کو افراط و تفریط سے بچانے والا قانون میزان شریعت!
۶۵۰	عدل و اعتدال کے چند اہم اجزاء یہ ہیں!
۶۵۱	عدل اور راہِ اعتدال سے ہٹانے والی چیزیں!

☆.....☆.....☆

www.daruleeman.com

کہ کس طرح ان اخلاق کو اپنا کر ہر شخص اپنے آپ کو روحانی اور جسمانی بیماریوں سے بھی نکال سکتا ہے اور ساتھ ساتھ اس کی محنت کر کے پورے عالم کو بے سکونی، بے چینی اور بد امنی سے نکال کر دوبارہ سکون چین اور امن میں بدل سکتا ہے اور یہی انسانی زندگی کا مقصد بھی ہے۔

الحمد للہ مصنف کتاب حضرت والا حضرت مفتی سید مختار الدین شاہ صاحب دامت برکاتہم العالیہ عرصہ دراز سے اسی مقصد کے لئے مصروف عمل ہیں کہ لوگوں کی انفرادی اصلاح ہو اور ساتھ ساتھ پورے عالم میں بھی اس پیغام کو عام کیا جائے ان ہی کاوشوں کی ایک کڑی حضرت والا کی کتاب ”جواہر الاسلام“ ہے۔ جس کے بقیہ مضامین عنقریب یکجا شائع ہونے والے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت والا کی دیگر تصانیف جو کہ شائع ہو چکی ہیں اور کئی زیر طبع ہیں ان کاوشوں کی عکاسی کرتی ہیں۔

اور اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کا لکھنا، مطالعہ اور اس پر عمل ہمارے لئے دونوں جہانوں میں کامیابی کا ذریعہ بنائے اور اس کی طباعت میں ”حضرت والا“ اور تمام معاونین کی خدمت کا یہ سلسلہ تا قیامت صدقہ جاریہ کی صورت میں برقرار رہے اور ان کاوشوں میں ترقی عطا فرمائے۔ آمین

ہر امکانی کوشش کے باوجود طباعت کے دوران کوئی غلطی رہ گئی ہو اور وہ دوران مطالعہ آپ کے علم میں آئے تو آپ سے گزارش ہے کہ اس کی نشاندہی کر دیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس غلطی کو دور کیا جاسکے۔ آپ کا یہ تعاون ان شاء اللہ باعث اجر ہوگا۔ والسلام

دعاؤں کا طالب عبدالسلام عفی عنہ

۲۳-۰۵-۱۴۳۳

۱۵-۰۴-۱۰۱۲

برائے اطلاع # ۳۰۴۰۶۶۶-۰۳۲۱

۰۳۲۱ - ۲۴۴۰۰۰۱



نام کتاب..... ایمانی صفات  
مصنف..... حضرت مولانا مفتی سید مختار الدین شاہ صاحب مدظلہ  
طبع..... 2012ء  
تعداد..... 1100  
مطبع..... القادر پرنٹنگ پریس 021-32722272

### ملنے کے پتے

جامعہ زکریا دارالایمان، کربوعہ شریف کوہاٹ۔

فون نمبر: 0925-662313

دارالایمان، ایمان منزل، مکان نمبر B-375، بلاک 10، فیڈرل بی ایریا کراچی۔

فون نمبر: 0321-3040666

مکتبہ انوار القرآن، محلہ جنگی، قصہ خوانی بازار، پشاور۔

ضیاء الرحمن فون نمبر: 0300-5722681

جامعہ زکریا للعلوم الاسلامیہ، ولی آباد، بیرون کوہاٹی گیٹ، پشاور سٹی۔

شبیر احمد خان فون نمبر: 03005902003

دارالایمان والتقویٰ، سورانی، بنوں۔ مولانا ذبیح اللہ۔

فون نمبر: 0928630062، 0331-2441353



## اخلاق کا بیان!

حسنِ اخلاق دین کا دوسرا نام ہے!

حسنِ خلق اور اچھے و کریمانہ اخلاق دین اسلام کا دوسرا نام ہے اور دین اسلام کی ہر تعلیم اور ہر حکم کی بنیاد اخلاق پر ہوتی ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا تعلق رکھنا اور شرک سے بیزاری کا اظہار ایک کریمانہ خلق اور شکر ہے، پھر جس طرح توحید الہی کا عقیدہ رکھنا ایک حقیقت کو ماننا ہے اسی طرح اس حقیقت کو تسلیم کرنا اور ماننا بھی ایک اخلاقی امر ہے، اس سے انکار کرنا حقیقت سے انکار اور بد اخلاقی ہے، نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اسی حقیقت کو مانیں اور اس پر یقین رکھیں کہ خالق کائنات اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں بے مثل اور کیلتا ہے تو ایسی صورت میں وہ اللہ تعالیٰ کے اس حق کو بھی پورا کر کے شکر گزاری کا مظاہرہ کر رہا ہے اور جو شخص توحید کا منکر ہے وہ حقیقت سے اعراض کر کے ناشکری اور بد خلقی میں مبتلا ہے نیز وہ اللہ تعالیٰ کے اس حق کے اعتبار سے جو بندہ ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتا ہے وہ اس میں حق تلفی کا ارتکاب کر کے بے وفائی اور ناشکری جیسی بد اخلاقیوں میں مبتلا ہے، یہی حال دوسری تعلیمات و ہدایات، اسلامی عقائد، فرائض، واجبات اور احکامات کا بھی ہے کہ ان کو بجالانے والا شکر گزاری، اپنے خالق کے ساتھ وفاداری اور فرمانبرداری کا ثبوت فراہم کر کے کریمانہ اخلاق پر فائز ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی تعلیمات و ہدایات سے منہ موڑ لیتا ہے تو وہ شخص گنہگار ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے خالق و مالک سے بے وفائی، ناشکری اور نافرمانی وغیرہ جیسی بد اخلاقیوں کے جرم میں مبتلا ہے، لہذا جو شخص جس قدر اچھے اخلاق کا مالک ہوگا وہ اسی قدر دین اسلام کی تعلیمات پر سختی سے عمل کرتا ہوگا اور وہ دین اسلام میں اسی قدر بلند ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (سورہ قلم: ۴)

”بلاشبہ آپ عظیم الشان اخلاق کریمانہ پر ہیں۔“

آپ ﷺ نے فرمایا:

(إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ)

”میں تو اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں۔“

بہر حال حسنِ اخلاق دین کا دوسرا نام ہے البتہ حسنِ خلق کو تین بڑے بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔  
(۱) حقوق: یعنی ہر شخص پر اللہ تعالیٰ کے اور اس کی مخلوق یعنی انسانوں، حیوانوں بلکہ بے جان چیزوں کے جو حقوق و فرائض عائد ہوتے ہیں ان کو پورا کرنا پھر یہی حقوق ہیں جو حقوق اللہ اور حقوق العباد بہت سی قسموں میں مثلاً عقائد، عبادات، معاملات وغیرہ وغیرہ پر منقسم ہیں۔

(۲) آداب: کاموں کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے کرنا اس کو آداب کہتے ہیں جیسے اُٹھنے، بیٹھنے اور کھانے، پینے پہننے، چلنے اور پھرنے وغیرہ کے آداب۔

(۳) اخلاق: انسان کا ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی اس کو فضائل الاخلاق کہتے ہیں اور اس کے مقابل کو رذائل یا برے اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے یہی وہ قسم ہے جس کو عام اصطلاح میں اخلاق کہتے ہیں۔

### حسنِ خلق اور اچھے اخلاق کسے کہتے ہیں!

”حسنِ خلق“ انسان کے اندر اس مادہ اور قوتِ راسخہ کو کہتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اعمالِ صالحہ اور عمدہ کام مسلسل آسانی اور سہولت کے ساتھ کر سکتا ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ جس کی وجہ سے افعالِ جمیلہ اور اچھے کام مسلسل خود بخود بلا تکلف اس سے صادر ہو جاتے ہیں، ”خلق“ کی اس تعریف سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ اگر کسی سے اچھے کام کا صدور مسلسل اور بار بار نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھار اچھے عمل کا صدور ہوتا ہے تو یہ ”حسنِ خلق“ نہیں کہلا سکتا، اسی طرح اگر کوئی اچھا اور عمدہ کام تنگ دلی سے بار بار اور مسلسل کرتا ہو تو اس کو بھی اس وقت ”حسنِ خلق“ نہیں کہا جائے گا جب تک وہ اس کی طبیعتِ ثانیہ نہ بن جائے اور خود بخود بلا تکلف وہ اس سے صادر نہ ہونے لگیں۔

مذکورہ بالا ”حسنِ خلق“ کی تعریف سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ کسی اچھے اور خوبصورت فعل کا کرنا الگ چیز ہے اور کسی اخلاقی مادہ اور جذبہ سے اس کا سرزد ہونا دوسری چیز ہے، اگرچہ برے اخلاق سے برے افعال تو پھوٹتے ہیں اور اعمالِ صالحہ، افعالِ حمیدہ، خوب سیرتی اور اچھے اخلاق کے نتائج اور ثمرات تو ہوئے ہیں لیکن ظاہری افعالِ اخلاق نہیں بلکہ اخلاق وہ باطنی استعداد، تحریکی مادے اور قوتیں ہیں جن سے افعال اور اعمال پھوٹتے ہیں، جیسے انسان کے اندر قوتِ باصرہ، یعنی دیکھنے کی قوت موجود ہے، اسی قوت کو دیکھنے کی قوت یا استعداد تو کہہ سکتے ہیں لیکن یہی قوت دیکھنا نہیں، کبھی ایسا ہوگا کہ استعداد موجود ہوگی لیکن آنکھیں جو دیکھنے کا آلہ اور ذریعہ ہیں ان میں نقص کی وجہ سے نہیں دیکھ سکے گا، وہ رکاوٹ اور نقص دور ہوگا تو وہی انسان پھر دیکھنے لگے گا اور اگر دیکھنے کی وہ قوت

اور استعداد ہی ختم ہو جائے تو پھر آنکھوں کی صحت اور درستی کے باوجود انسان دیکھنے سے محروم ہو جائے گا، یا اس کی مثال یوں سمجھئے کہ برقی قوت سے پنکھے چلتے ہیں، بلب روشن ہوتے ہیں، ہیٹر گرم ہو کر آگ کا کام دیتے ہیں، فریج میں برف بنتی ہے۔ لیکن یہ روشن ہونا، پنکھے کا چلنا، آگ اور برف بجلی یعنی برقی قوت نہیں، بجلی موجود ہوتی ہے لیکن بلب میں نقص کی وجہ سے بلب سے روشنی نہیں ہوگی، فریج میں خرابی ہے تو اس میں برف نہیں بنے گی، غرض برقی قوت موجود ہے لیکن بلب، پنکھے اور مشینیں وغیرہ اس لئے نہیں چلتے کہ ان میں نقص ہے یا پنکھے اور مشینیں وغیرہ سرے سے موجود ہی نہیں اور اگر بجلی اور برقی قوت ہی نہیں تو پنکھے، مشینیں وغیرہ صحیح ہونے کے باوجود نہیں چلیں گی یہ اور بات ہے کہ ان چیزوں کو برقی قوت کے علاوہ دوسری قوتوں سے حاصل کیا جائے، مثلاً روشنی، گیس سے حاصل کی لیکن ایسی صورت میں اس روشنی کے وجود کو برقی قوت کی وجہ سے نہیں مانا جائے گا، اسی طرح اخلاق بھی اس تخم اور استعداد کا نام ہے جس سے ہر بھلائی پھوٹی ہے صرف بھلا کام کرنا خوش خلقی نہیں، مثلاً مادہ سخاوت سے دینے اور دوسروں کے کام آنے کا عمل پھوٹتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ کوئی کسی کو کوئی چیز دے تو وہ سخی بھی ہوگا اس سے اتنا تو ضرور معلوم ہوا کہ اس نے سخاوت کا ایک عمل کیا۔ کیا کوئی شخص کسی کا مال چرا کر یا ڈاکہ ڈال کر لے جائے اور اس مظلوم کو علم ہو جائے کہ میرا مال اس ظالم نے فلاں جگہ چھپا رکھا ہے تو مظلوم شخص جا کر صرف اپنا مال چرا کر یا لوٹ کر گھر لے آئے ظاہر ہے یہاں چوری یا لوٹ کا فعل تو پایا گیا لیکن ظلم نہ پایا گیا تو یہ بد خلقی نہیں، یہی قتل کا حال ہے۔ ایک ظالم قتل کرتا ہے اور ایک عادل شخص اس ظالم کو قصاص میں قتل کر دیتا ہے چونکہ پہلے شخص کے قتل کا منشاء ظلم ہے وہ تو ظالم ہے لیکن دوسرے شخص کا قتل کرنا قصاص اور عدل کی وجہ سے ہے اس لئے یہ دوسرا قتل بد خلقی میں شمار نہیں، لہذا قتل، چوری، لوٹ کھسوٹ، ڈاکہ زنی وغیرہ جیسے برے افعال بد اخلاقی کے اور عفو و درگزر کا معاملہ کرنا، مال و دولت کو نیکی کی جگہوں پر خرچ کرنا وغیرہ جیسے اچھے افعال خوش اخلاقی کے آثار ضرور ہیں لیکن کوئی اچھا یا برا فعل خوش خلقی یا بد خلقی نہیں، دراصل اخلاق تو ان اصولوں کو کہتے ہیں جو انسان کے دل میں ہو اور اخلاقی اعمال ان سے خود بخود پھوٹتے ہوں، اچھے اعمال بھی صرف وہی ہوتے ہیں جو نیک مادہ اور نیک منشاء اور منبع سے پھوٹتے ہیں، یہی وہ اعمال ہوتے ہیں جو تھوڑا ہونے کے باوجود بہت زیادہ اجر و ثواب رکھتے ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اس نے یہ عمل مادہ سخاوت کی بجائے کسی دوسری قوت کے زیر اثر کیا ہو، مثلاً اس کی منشاء لالچ ہو کہ اس شخص کو کچھ دوں گا یا اس کے بچوں کو کچھ دوں گا تو وہ مجھے اس کے بدلے اس سے زیادہ دے گا یا اس کا یہ عمل حب جاہ سے پھوٹا ہو اور کبھی ایسا ہوگا کہ مادہ سخاوت تو موجود ہوگا لیکن اس مادہ اور تخم کے ظاہر ہونے کے اسباب مہیا نہ ہوں گے، مثلاً خرچ کرنے

کا موقع ہے لیکن اس کے پاس کچھ مال نہیں ہے۔ یا مثلاً صبر ایک خلق ہے جس سے ضبط نفس کے افعال، تسلیم و رضاء ظاہر ہوتے ہیں لیکن کسی جگہ ضبط نفس سے خلق صبر پر حکم نہیں لگایا جاسکتا، غرض اگر افعال کا کوئی تحریکی مادہ نہ ہو تو فعل سرزد نہیں ہو سکتا، افعال کا منشاء اور سرچشمہ درحقیقت دل ہے صبر، شکر، شجاعت، مروت، حیاء، غنا وغیرہ نیک خلقی کے مادے ہیں جن کا تعلق دل سے ہے اور افعال ان کے آثار اور نتائج ہیں۔

اسی طرح برے افعال برے اخلاق کے نتائج ضرور ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بظاہر ہر برا کام بد اخلاقی ہوگی، مثلاً ظلم ایک برا ختم ہے جس سے قتل، لوٹ کھسوٹ اور چوری وغیرہ جیسے برے افعال پھوٹتے ہیں اب ایک آدمی کسی کا مال چراتا ہے یا لوٹ لیتا ہے تو یہ ظلم کا اثر اور نتیجہ ضرور ہے لیکن ایک شخص چوری اور لوٹ بھی کرے لیکن اس کے اس عمل کا منشاء ظلم کے بجائے عدل ہو، اس کی مثال یوں سمجھو کہ کوئی ظالم شخص کس کا مال چرا کر یا ڈاکہ ڈال کر لے جائے اور اس مظلوم کو علم ہو جائے کہ میرا مال اس ظالم نے فلاں جگہ چھپا رکھا ہے تو مظلوم شخص جا کر صرف اپنا ہی مال چرا کر یا لوٹ کر گھر لے آئے ظاہر ہے یہاں چوری یا لوٹ کا فعل تو پایا گیا لیکن ظلم نہ پایا گیا تو یہ بد خلقی نہیں یہی قتل کا حال ہے ایک ظالم بھی قتل کرتا ہے اور ایک عادل شخص اس ظالم کو قصاص میں قتل کر دیتا ہے چونکہ پہلے شخص کے قتل کا منشاء ظلم ہے وہ تو ظالم ہے لیکن دوسرے شخص کا قتل کرنا قصاص اور عدل کی وجہ سے ہے اس لئے یہ دوسرا قتل بد خلقی میں شمار نہیں لہذا قتل، چوری، لوٹ کھسوٹ ڈاکہ زنی وغیرہ جیسے برے افعال بد اخلاقی کے اور عفو درگزر کا معاملہ کرنا، مال و دولت کو نیکی کی جگہوں پر خرچ کرنا، وغیرہ جیسے اچھے افعال خوش اخلاقی کے آثار ضرور ہیں لیکن کوئی اچھا یا برا فعل خوش خلقی یا بد خلقی نہیں دراصل اخلاق تو ان اصولوں کو کہتے ہیں جو انسان کے دل میں ہو اور اخلاقی اعمال ان سے خود بخود پھوٹتے ہوں اور اچھے اعمال بھی صرف وہی ہوتے ہیں جو نیک مادہ اور نیک منشاء اور منبع سے پھوٹتے ہیں اور یہی وہ اعمال ہوتے ہیں جو تھوڑا ہونے کے باوجود بہت زیادہ اجر و ثواب رکھتے ہیں۔

### حسن خلق کے آثار اور ثمرات!

خلاصہ یہ ہوا کہ ”حسن خلق“ انسان کی ایک نفسیاتی کیفیت ہے جو باطنی امور کے ساتھ تعلق رکھتی ہے لیکن کسی انسان میں اس خصلت کا وجود، اس کے آثار ہی کے ذریعہ ظاہر ہو سکتا ہے اور باطن کی اس روشنی کا عکس اس کی ظاہری علامات ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً جس شخص کے دل میں رحم ہے تو اس کی یہ مہربانی کسی وقت اور کسی شخص کے ساتھ مخصوص نہ ہوگی بلکہ قابل رحم اور قابل شفقت مخلوق کو دیکھ کر خود بخود بلا تکلف اس سے رحم اور شفقت کا عمل ظہور پذیر ہو جائے گا اور اگر کوئی شخص اتفاقاً عطا و بخشش اور مہربانی کا کام کرتا ہے اور وہ اس کا خوگر نہ ہو تو اس

وقت عطاء بخشش اور مہربانی کا کام اگرچہ نیک نیتی سے ہو تو قابل تحسین اور ثواب کا عمل تو ہے لیکن اس کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ شخص رحم دل یا سخی اور کریم النفس ہے، اخلاق کی فضیلت اور اہمیت کو جان لیجئے کہ اس کو ظاہری اور قانونی احکامات پر برتری حاصل ہے کیونکہ اخلاق سے ہمارے عقائد، عبادات کی کیفیت اور ہمارے ظاہری اعمال کی داخلی صورت متعین ہوتی ہے اور اس پر ہی آخرت میں فیصلہ ہوگا کہ ظاہر پر یہی وجہ ہے کہ ایک شخص منافق ہونے کے باوجود اس دنیا میں مسلمان بلکہ بزرگوں میں شمار ہو سکتا ہے مگر قیامت میں باطن پر فیصلہ ہونے کی وجہ سے جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں جائے گا۔

### اخلاق کے فضائل!

مذکورہ بحث سے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ انسان کے اعمال بھی اس وقت صالح اور پاکیزہ ہوتے ہیں جب اس کے اخلاق بھی نیک اور پاکیزہ ہوں اس لئے یہ کہنا درست ہے کہ اعمال صالحہ، اخلاق حسنہ اور نیک جذبات کے پھل، پھول اور شاخیں ہیں اور جس شخص کے جس قدر اخلاق پاکیزہ ہوں گے اس قدر اس کے اعمال وزنی اور پاکیزہ ہوں گے۔

(۱) چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”بلاشبہ ایک بندہ باوجود عبادت میں کمزور ہونے کے اپنے اچھے اخلاق کی وجہ سے آخرت کے بلند درجات اور منازل علیا کو حاصل کر لیتا ہے اور ایک بندہ عابد ہونے کے باوجود بد خلقی کی وجہ سے جہنم میں جاتا ہے۔“ (مجمع الزوائد: ج ۸ ص ۲۵)

(۲) اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(خيارُكم أحسنکم اخلاقاً) (بخاری و مسلم)

”تم میں سے سب سے اچھے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔“

(۳) اور ایک حدیث شریف میں آپ ﷺ نے فرمایا:

(أحب عباد الله أحسنهم اخلاقاً) (طبرانی)

”اللہ تعالیٰ کے بندوں میں اللہ تعالیٰ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔“

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ:

”ایمان والوں میں زیادہ ایمان والے وہ لوگ ہیں جو اخلاق میں زیادہ اچھے ہیں۔“ (ابوداؤد)

(۵) اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”مسلمان اپنے اچھے اخلاق کے باعث اس شخص کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو ہمیشہ رات کو عبادت میں جاگتا ہے اور دن بھر روزہ رکھتا ہے۔“ (ابوداؤد)

(۶) حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”قیامت کے روز مومن کے میزان میں اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی اور کوئی چیز نہیں ہوگی اور اللہ تعالیٰ فحش بات کرنے والے بد زبان سے بغض رکھتا ہے۔“ (ابوداؤد، ترمذی، مشکوٰۃ)

(۷) اور ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ:

(خیر ما عطی الناس خلق حسن)

لوگوں کو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) جو چیزیں عطا ہوئیں ان میں سب سے بہتر چیز اچھے اخلاق ہیں۔ (نسائی اور احمد وغیرہ)

(۸) نیز اسلام میں اخلاق کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نماز میں جو دعائیں مانگتے تھے اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا۔

(وَاهْدِنِي لِحَسَنِ الْاَخْلَاقِ لِأَنَّهُ لَا يَهْدِي لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّي سَيِّئَاتِهَا لَا يَصْرِفُ عَنِّي سَيِّئَاتِهَا إِلَّا أَنْتَ)

”اور اے اللہ! تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی طرف رہنمائی کر تیرے سوا کوئی بہترین اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور برے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو کوئی نہیں پھیر سکتا مگر تو۔“ (مسلم)

خلاصہ یہ ہوا کہ خوش خلقی کو دین میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہے اس کی بدولت انسان زندگی میں قلبی سکون اور خوش گواری کے ساتھ رہے گا اور دوسرے لوگوں کے لئے اس کا وجود رحمت اور چین کا باعث ہوگا اور آخرت میں بھی فلاح و نجات پائے گا اس کے برعکس بد اخلاقی انسان کی زندگی کو لطف و مسرت سے محروم کر دیتی ہے اور جن جن سے اس کا واسطہ اور تعلق ہوتا ہے ان کی زندگیاں بھی بد مزہ اور تلخ ہوں گی۔ دنیا کے بعد جس طرح خوش خلقی کا پھل اور انجام ارحم الراحمین کی رضا اور جنت ہے تو اس کے برعکس بد اخلاقی کا انجام اور اس کی سزا واحد قہار کا غضب اور جہنم کا سخت اور رسوا کن عذاب ہے۔



### اسلام کی اخلاقی تعلیم اور آج کل مسلمانوں کی غفلت!

اس میں شک نہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اخلاق کی تفصیلی تعلیم سے جس قدر دنیا کو علماً و عملاً آشنا کیا ہے اخلاق کا علمی اور عملی اور عرفانی نظام قائم کر کے عمل کی تدبیریں بتلائیں۔ دین اسلام کے پاکیزہ اخلاق اور ان سے پیدا شدہ اعمال ایسے ہیں کہ جن کا نمونہ بن کر رسول اللہ ﷺ دنیا میں تشریف لائے اور اپنے صحابہ کو تربیت دے کر ان کو ایسے حسین اخلاق پر ڈالا جس کی وجہ سے جاہلیت اور بد اخلاقی میں ڈوبے ہوئے عرب سرکشوں میں اسلام کی روح دوڑ گئی، پھر یہ لوگ جہاں بھی گئے وہاں چند آدمیوں نے ملکوں اور قوموں کو اپنی اخلاقی تلوار سے فتح کر لیا چین میں دس سے کم صحابہ تاجروں کی حیثیت سے گئے وہاں آج کروڑوں مسلمان موجود ہیں۔ لیکن دین اسلام میں اخلاق اور صفائی معاملات اور حسن معاشرت کی بہت بڑی اہمیت کے باوجود آج کا مسلمان اس سے غافل ہے بلکہ مسلمانوں میں دینداروں کی اکثریت کا بھی یہ حال ہے کہ عبادات جیسے روزہ، نماز وغیرہ کی اہمیت تو کسی درجہ میں محسوس کرتے ہیں مگر اخلاق اور اسی طرح معاملات اور معاشرت کے متعلق شریعت کے جو احکام ہیں ان کی اہمیت کو وہ محسوس نہیں کرتے اور ان میں بہت سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اخلاق، معاملات کی صفائی، معاشرت اور اس کے بارے میں آنے والے احکامات کی پابندی صرف بزرگ اور کامل بننے کے لئے ضروری ہے اور نجات کے لئے تو صرف نماز، روزہ وغیرہ عبادات کافی ہیں حالانکہ ایسا نہیں بلکہ دوزخ سے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے کے لئے جس طرح نماز و روزہ ضروری ہے اسی طرح برے اخلاق سے بچے رہنا اور اچھے اخلاق کا اپنانا بھی ضروری ہے، قرآن مجید اور احادیث میں جس طرح نماز، روزہ وغیرہ عبادات کی تاکید فرمائی گئی ہے اسی طرح اچھے اخلاق کی بھی تاکید فرمائی گئی ہے اور جس طرح نماز و روزہ وغیرہ میں سستی کرنے والوں کو عذاب سے ڈرایا گیا ہے اسی طرح برے اخلاق پر بھی عذاب جہنم کی وعید سنائی گئی ہے مثلاً بخل یعنی مال کی ایسی محبت اور اس سے ایسا لگاؤ اور دلی تعلق جو خرچ کے موقعوں پر خرچ کرنے میں رکاوٹ بنے ایک اخلاقی برائی ہے اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا أَنْتَهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرٌ لَّهِمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَهُمْ سَيُطَوَّقُونَ

مَا يَبْخُلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ﴾ (سورہ آل عمران: ۱۸۰)

یعنی ”اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو اپنے فضل سے نوازا (یعنی مال دولت وغیرہ) اور وہ اس میں بخل کرتے ہیں (یعنی جہاں خرچ کرنا چاہئے وہاں خرچ نہیں کرتے) وہ ہرگز اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ (بخل کرنا) ان کے حق



میں کوئی اچھی چیز ہے بلکہ یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے، قیامت کے دن یہی چیز جس کے خرچ کرنے میں وہ بخل کرتے ہیں (عذاب بن کر) ان کے گلے کا طوق بنایا جائے گا۔“ (سورہ آل عمران: ۱۸۰)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے تکبر جو اخلاقی برائی ہے کے متعلق فرمایا ہے:

”جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جاسکے گا۔“ (مسلم)

الغرض اخلاق کی اصلاح کا معاملہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ صرف بزرگ مسلمان ہونے کے لئے ہو بلکہ دوزخ سے بچنے کے لئے جس طرح نماز، روزہ وغیرہ کی ضرورت ہے اسی طرح برے اخلاق کو چھوڑنا اور اچھے اخلاق کو اپنانا بھی ضروری ہے۔

### اچھے اخلاق کا سرچشمہ!

اچھے اخلاق کا منبع دراصل اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفات ہیں اور اخلاق حسنہ جو بھی مخلوق میں نظر آ رہی ہیں وہ درحقیقت اللہ کی صفات کمال کی تجلیات اور کرشمے ہیں حدیث میں ہے کہ:

(حسن الخلق خلق الله الاعظم)

”حسن خلق اللہ تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔“

لہذا بس صرف وہی اخلاق اچھے اور کریمانہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے عکس اور تجلیاں ہیں اور جو اللہ تعالیٰ کی صفات سے منافی ہیں بس وہی رذائل اور برے اخلاق ہیں، البتہ یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کچھ صفات ایسی بھی ہیں جو اس کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کا تصور بھی دوسرے میں نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ اس کا بے مثل اور واحد و یکتا ہونا، خالق ہونا۔ نیز اللہ تعالیٰ کی بعض ایسی جلالی صفات بھی ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کو زیبا ہیں جیسا کہ اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ۔ اس قسم کی صفات کا بندہ میں کمال یہ ہے کہ ان کے مقابل کی صفاتیں بندہ میں پیدا ہوں مثلاً کبرائی کے مقابلہ میں بندہ میں تواضع اور خاکساری کا ہونا جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ اچھے اخلاق دراصل اللہ کی صفات کمال کی تجلیاں ہیں تو اب یہاں یہ بھی سمجھئے کہ انسان ان کو نایب ہونے کی حیثیت سے اپنی استعداد کے مطابق حاصل کر سکتا ہے مثلاً ”رحم“ ایک خلق ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے اس وجہ سے وہ رحم ورجم ہے پھر بندہ کو بھی اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ وہ بھی اپنے اندر اسی صفت رحم کو اپنی استعداد کے مطابق پیدا کرنے کی کوشش کرے اور ہر قابل رحم مخلوق کے ساتھ رحم کا معاملہ کرے، اس کی خطا کو معاف کر کے درگزر کرنا اور دوسروں کے عیوب کو چھپانا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور بندہ کو بھی حکم ہے کہ وہ اپنے اندر یہ صفت پیدا کرے علیٰ ہذا القیاس

ہلم، جود و کرم، سخاوت، حاجت مندوں کی مدد کرنا، عدل و انصاف کرنا یہ سب اچھے اخلاق اللہ کی ذاتی صفات ہیں اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ وہ بندگی کی حیثیت اپنی استعداد کے مطابق اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ اخلاق الہی کو اپنے اندر پیدا کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان مقام الوہیت پر فائز ہو جائے یہ چیز نہ مطلوب ہے نہ ممکن، مقصود یہ ہے کہ انسان حیوانیت کی سطح سے بلند ہو جائے اور حضرت حق کے مبداء فیض سے اخذ و استفادہ کی مسلسل کوشش کرتا رہے، اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہیں انسان کو بھی چاہئے کہ علم و حکمت کے موتیوں سے اپنے دامن کو بھرنے کی کوشش کرے، اللہ تعالیٰ رؤف و رحیم ہیں انسان بھی اپنے اندر جذبہ رافت و رحمت پیدا کرے، اللہ تعالیٰ غنی و کریم ہیں انسان بھی اپنی طاقت کے مطابق غنی و کرم کے اوصاف سے متصف ہو، اللہ تعالیٰ صبور و حلیم ہیں انسان بھی مقدور بھر حلیم و صبر سے کام لے، اللہ تعالیٰ جبار و متکبر ہیں اور انسان پر اس کا اثر یہ ہونا چاہئے کہ وہ عام طور پر متواضع اور منکسر المزاج ہو، اللہ تعالیٰ جبار و متکبر ہیں اور انسان پر اس کا اثر یہ ہونا چاہئے کہ وہ عام طور پر بد اعمال قسم کے لوگوں سے مرعوب و متاثر نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی صفت یہ ہے کہ وہ بڑا زبردست اور انتہائی سخت گیر ہے انسان کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندگی میں بڑھا ہوا ہو اور اس کی نافرمانی نہ کرے نیز یہ کہ وہ بھی کفار و مشرکین کے لئے بڑا شدید اور مفسدین کی راہ روکنے والا ہو، اللہ تعالیٰ شکر کی قدر کرنے والا اور خطا کاروں کو معاف کرنے والے ہیں انسان کا بھی کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ حسن سلوک کرنے والوں کا قدردان ہو اور معذرت چاہنے والوں سے درگزر کرے، اللہ تعالیٰ کبھی راہ راست سے انحراف نہیں فرماتے انسان کا بھی فرض ہے کہ وہ ہمیشہ راہ مستقیم اور راہ حق پر قائم رہے، اللہ تعالیٰ کی ہر صفت شان کمال رکھتی ہے اور وہ ذات ہر عیب سے پاک اور ہر نقص سے منزہ ہے، لہذا انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ بھی اپنی استطاعت اور اپنے دائرہ کے اندر زندگی کو نقائص اور عیوب سے پاک کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

انسان بھی خلافت الہی کے منصب کی قابلیت رکھتا ہے!

کیونکہ انسان ہی اللہ تعالیٰ کی ایسی مخلوق ہے جس کے لئے دنیا بنائی اور سجائی گئی ہے پس یہی اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہو سکتا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ (بقرہ: آیت ۳۰)

”میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔“

اور اللہ تعالیٰ نے انسان ہی کو اس قابل بنایا ہے اور اسی کو یہ صلاحیت عطا فرمائی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات

کاملہ کی تجلی کو قبول کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ انسان کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ (سورۃ التین: ۴)

”بلاشبہ ہم نے انسان کو بہترین انداز پر پیدا کیا۔“

اور حضور اقدس ﷺ فرماتے ہیں کہ:

(إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ آدَمَ عَلَى صُورَتِهِ)

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔“ (صحیح البخاری: کتاب الاستیذان .

والمسلم: کتاب البر والصلۃ)

اسی طرح متعدد حدیثوں میں اس بات کی تعلیم موجود ہے کہ کسی بندے کو چہرہ پر نہ مارو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے

آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔ (دیکھئے بخاری: کتاب العتق و صحیح مسلم: کتاب البر والصلۃ)

ان حدیثوں کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ (العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ کی کوئی جسمانی شکل و صورت ہے اور انسان

اس کی تصویر یا نقل ہے اللہ تعالیٰ کی تو شان یہ ہے کہ: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾

بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کی ایک دھندلی سی جھلک دکھائی دے رہی

ہے جیسا کہ علم، ارادہ، قدرت و اختیار، سماعت و بصارت، رحم و سخاوت وغیرہ وغیرہ انسان سے ظاہر ہوتے رہتے

ہیں پھر چونکہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کے چہرہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس سے اس کی شخصیت کی پہچان

ہوتی ہے اور اکثر حواس ظاہری اسی میں سے دکھائی دے رہے ہیں جیسا کہ دیکھنا، سننا، سونگھنا وغیرہ اسی طرح دوسری

خوبیاں حسن وغیرہ بھی اسی میں سے ظاہر ہو رہی ہیں۔ غرض یہ کہ یہاں صورت سے مراد جسمانی صورت نہیں بلکہ

اس سے مراد معنوی صورت ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صفات کاملہ کا مظہر بنایا ہے اور

اس میں نائب ہونے کے حیثیت سے یہ استعداد اور صلاحیت رکھ دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنی خداداد

صلاحیت اور ظرف کے مطابق قبول کر کے اپنے اندر اچھے اخلاق پیدا کرے اور جس شخص میں اس کی محنت، کوشش

اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جس قدر صفات کمال کا یا یوں کہہ دیجئے کہ اچھے اخلاق زیادہ اور قوت کے ساتھ

ظاہر ہو رہے ہوں تو وہ اتنا ہی نیابت اور خلافت الہی کے منصب کا زیادہ مستحق ہے اور دین فطرت کا یہی وہ رنگ

ہے کہ جس پر جس قدر یہ چڑھ جائے وہ اسی قدر اللہ تعالیٰ کی صفات کے رنگ میں رنگ جائے گا اور وہ اسی قدر دنیا

و آخرت میں فلاح و بہبود پائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عِبْدُونَ﴾

”اللہ تعالیٰ کا رنگ اور اللہ تعالیٰ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم تو اسی (ایک اللہ) کی بندگی کرتے

ہیں۔“ (بقرہ: آیت ۱۳۸)

اور قرآن مجید کی اسی آیت کریمہ کا مضمون رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں یوں ملتا ہے کہ:

(تَخْلُقُوا بِاخْلَاقِ اللَّهِ)

”اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرو۔“

اور ترمذی کی ایک حدیث میں ان صفات اور اخلاق کے سرچشموں کا کچھ بیان آیا ہے اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے ننانوے نام ہیں جس نے ان کو ضبط کیا اور محفوظ کیا وہ جنت میں جائے گا، پھر اس کے بعد اسی حدیث شریف میں ننانوے صفات کا ذکر کیا ہے قرآن مجید نے ان کو اسمائے حسنیٰ کے لقب سے یاد کیا ہے، یہی وہ پاکیزہ اخلاق خداوندی ہیں جنہیں حاصل کرنے کے لئے حضور اقدس ﷺ نے امت کو حکم فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اپنے اندر پیدا کرو۔

غرض یہی صفات کاملہ وہ اخلاق ہیں جن سے مخلوق کی اخلاقی تکمیل کے لئے خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے اور یہی وہ اخلاق ہیں جن سے انسان سعادت اور مرتبہ خلافت پر پہنچتا ہے کیونکہ منیب کے اوصاف نائب میں جب جڑ پکڑ لیتے ہیں تب ہی نائب منیب کا نمائندہ اور اس کی طرف سے کارفرما بنتا ہے مثلاً انجینئر کی نیابت انجینئر، مدرس اور معلم کی نیابت مدرس اور معلم، ترکھان کی نیابت ترکھان ہی کرے گا ورنہ اپنے علم و ہنر سے بیگانے اور جاہل کو کون اپنا خلیفہ بناتا ہے، خلاصہ یہ کہ نیک اخلاق کا منبع اور سرچشمہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذاتی صفات ہیں جو بندوں کے حق میں عارضی اور عکس کی حیثیت رکھتی ہیں اور جو بندوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف انابت و رجوع اور اللہ تعالیٰ کے فیضان سے ان کے اندر ان کی خداداد استعداد کے بقدر پیدا ہوتی رہتی ہیں اور جو شخص جس قدر اللہ تعالیٰ کی طرف انابت اور رجوع کرتا ہے تو اسی حد تک اس کے ظرف اور استعداد کے مطابق اس کی طرف اخلاقی کمالات بہہ نکلیں گے اور کوئی جس قدر خواہشات نفس میں پڑ کر اللہ تعالیٰ سے دور رہے گا اخلاق حسنہ سے اتنا ہی محروم رہے گا۔

اچھے اخلاق اور اس کا علاج!

جس طرح انسان کے جسم کی ترکیب اور اس کے اعضاء میں اعتدال اور توازن سے اس کی ظاہری صورت

اچھی اور حسین ہو جاتی ہے اور جس قدر ظاہری اعضاء ہاتھ، پاؤں وغیرہ اور گوشت پوست میں اعتدال و توازن ہو اسی قدر انسان خوبصورت ہوتا ہے، اسی طرح انسان کے اندرونی قوت جیسے قوت شہوت اور قوت غضب وغیرہ کے اعتدال و توازن سے انسان خوش اخلاق اور نیک سیرت بنتا ہے اور جس قدر اندرونی قوتوں میں اعتدال و توازن ہوگا اسی قدر اخلاق اچھے پیدا ہوں گے، پس جس طرح ظاہری صورتیں اور شکلیں ہیں کوئی زیادہ خوبصورت کوئی کم خوبصورت، اسی طرح اندرونی قوتوں کے اعتدال میں کمی و بیشی کی وجہ سے لوگوں کی سیرتیں متفاوت ہیں کوئی زیادہ نیک سیرت، کوئی کم اور تمام دنیا کے اولین، آخرین میں سب سے زیادہ بااخلاق اور خوب سیرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے: ﴿إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (سورہ قلم: ۴) یعنی ”آپ عظیم الشان اخلاق پر پیدا ہوئے۔“ اس کے بعد جس شخص کو حضور اقدس ﷺ کے اخلاق سے جس قدر مناسبت ہوگی اسی کو اسی قدر خوب سیرت اور خوش اخلاق کہیں گے اور جس مسلمان کو جس قدر اخلاق میں کمال حاصل ہوگا، اسی قدر اس کو دنیا و آخرت کی سعادت حاصل ہوگی اب رہی یہ بات کہ اچھے عادات کیسے آئیں گے؟ تو اس کے متعلق چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

### اچھے اخلاق کیسے آئیں گے!

(۱) اول یہ کہ اخلاق کا علم حاصل کرے کیونکہ بغیر علم کے انسان افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے مثلاً صبر ایک خلق ہے جس کے دو کنارے ہیں، ایک انتہائی بے صبری اور دوسرا کنارہ سخت دلی اور بے فکری ہے، تو جس طرح مصیبت کے وقت گریبان پھاڑنے، بال نوچنے والے کو صابر نہیں بلکہ بے صبر کہا جاتا ہے، اسی طرح اگر کسی پر بہت سی مصیبتیں آئیں اور اس پر اس غم کا اثر ہی نہ ہو مثلاً کوئی رشتہ دار فوت ہو جائے اس کی آنکھ سے آنسو ہی نہ نکلے نہ اس کی طبیعت پر اثر ہو اور دل میں بھی غم تک نہ آئے تو ایسے شخص کو بھی صابر نہیں کہا جاتا بلکہ ایسے شخص کو سخت دل، بے رحم، سرد مہر اور ظالم کہا جاتا ہے تو جس طرح وہ صبر نہیں، اسی طرح یہ بھی صبر نہیں، صبر درمیان میں ہے کہ اثر تو لے مگر حدود کے اندر رہے آپے سے باہر نہ ہو، اسے صابر کہیں گے اور حدود جب تک معلوم نہ ہوں تو صبر نہیں کر سکے گا۔

اسی طرح تواضع ایک اچھا خلق ہے اس کا ایک کنارہ تو تکبر ہے کہ آدمی بڑا بول بولے اکر کر چلے وغیرہ اور دوسرا کنارہ ذلت نفس ہے کہ ہر کس و نا کس کے آگے جھکتا پھرے تو یہ بھی تواضع نہیں اور وہ بھی تواضع نہیں، دونوں کنارے ایک دوسرے کی ضد ہیں، درمیان میں تواضع ہے کہ وقار بھی رہے اور تکبر بھی نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے لئے اللہ کے سامنے جھکے کسی ولی اللہ کی تعظیم اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کرے، اگر کوئی کسی کی تعظیم اس کی خوشامد کے لئے

کرتا ہے تو وہ تو واضح نہیں ہوگی بلکہ تملق اور چا پلوسی ہوگی اب کسی ولی اللہ کی تعظیم کرنے کی حدود کیا ہیں اس کے لئے بھی تعلیم کی ضرورت ہے کہ کہیں تعظیم اور احترام میں شرعی حدود سے نکل نہ جائے تو یہاں نہ تکبر جائز ہے نہ ذلت نفس اور نہ شعائر اللہ کی تعظیم میں مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کرنا جائز ہے اور جب تک یہ ساری حدود معلوم نہ ہوں اس وقت تک ایک آدمی خلق تو اضع کو صحیح طور پر نہیں اپنا سکتا، اسی طرح عفو و درگزر ایک خلق ہے اس کا ایک کنارہ تو یہ ہے کہ کسی کا قصور معاف ہی نہ کرے اور دوسرا کنارہ یہ ہے کہ کوئی حاکم عادی مجرم اور ظلم پیشہ بدمعاش سے جتنی اور سزا کا مستحق اور سزاؤں کے بغیر اس کا علاج نہیں ہو سکتا وہ اس کے ساتھ بھی نرمی کرے اور اس کو معاف کرتا رہے، تو یہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی اور مدد انت ہوگی نہ کہ خوش خلقی بلکہ یہی عفو و درگزر جب اپنی حد بندی کے خط سے آگے بڑھ جاتا ہے، تو عفو و درگزر نہیں رہتا بزدلی اور بے ہمتی بن جاتا ہے شجاعت انسانی سیرت کا سب سے بڑا وصف ہے لیکن یہی وصف جب اپنی حد سے گزر جائے تو نہ صرف اس کا حکم ہی بدل جاتا ہے بلکہ وہ شجاعت کی بجائے قہر و غضب اور ظلم و تشدد بن جاتا ہے۔

عرض یہ ہے کہ اخلاق کے لئے پہلی ضرورت اس کی تعلیم ہے تاکہ اس کی شرعی حدود معلوم کی جائیں اور پھر اس کو اپنے اندر لانے کی مشق کی جائے۔

(۲) اپنے برے اخلاق کو دوسروں سے معلوم کریں اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنے نفس کی حالت میں اکثر دھوکا ہو جاتا ہے کہ بد خلق شخص بھی آپ کے آپ کو خوش اخلاق اور خوب سیرت سمجھنے لگتا ہے، چنانچہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ انسان کو غصہ آ جاتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے واسطے غصہ آیا جو خوش خلقی کا ثمرہ ہے یا مثلاً اپنی عبادات اور حالات کو لوگوں پر ظاہر کرتا رہتا ہے اور نفس یہ دھوکا دے کر مطمئن کر دیتا ہے کہ تم نے تو اس غرض سے اس کا اظہار کیا تاکہ اور لوگوں کو بھی اس نیک کام کے کرنے میں رغبت ہو جائے اسی طرح یہ نفس بڑے بڑے دھوکے دیا کرتا ہے اور اپنی بد اخلاقیوں کو نیک اخلاق کے رنگوں میں پیش کر کے بد اخلاقیوں میں مبتلا رکھتا ہے اپنی بد اخلاقیوں سے خبر گیری کے لئے چار طریقے ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ یا تو کسی مرشد کی خدمت میں بیٹھا کریں تاکہ وہ آپ کو آپ کی بد اخلاقیوں پر خبردار کر کے اس کا علاج بھی بتلایا کرے یا کسی مہربان اور صاف گو دوست کو اپنے اوپر اپنا نگہبان بنائیں جو ٹھیک ٹھیک آپ کے عیوب بلام و کاست بیان کر سکے، تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے حق میں دشمن کی بات سنیں کیونکہ دشمن کی نظر ہمیشہ عیب پر جاتی ہے اگرچہ وہ دشمنی کی وجہ سے آپ کے عیب میں تو مبالغہ کر سکتا ہے لیکن اس میں آپ اپنے عیب کو تلاش کر سکتے ہیں چوتھا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی دوسرے شخص میں کوئی عیب نظر



آئے تو اس کام سے خود بچیں اور اپنے اوپر گمان یہ کریں کہ ایسا میں بھی ہوں اور پھر اس کا علاج شروع کریں۔

(۳) اچھے اخلاق پیدا کرنے کا ایک طریقہ ضد اور اپنے نفس کی مخالفت ہے غصہ کا علاج بتکلف بردباری کو اختیار کرنا ہے بخل کا علاج بتکلف خرچ کرنا ہے اسی طرح جو شخص بتکلف نیک کاموں کی عادت ڈالے گا اس میں اچھے اخلاق پیدا ہو جائیں گے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب کوئی شخص تکلف سے کسی چیز کی عادت ڈالتا ہے تو وہ بالآخر اس کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے مثلاً ابتداءً لڑکا تعلیم اور مکتب سے بھاگتا ہے لیکن والدین زبردستی اس کو بھیج دیتے ہیں پھر اس کی عادت بن جاتی ہے حتیٰ کہ بڑا ہو کر اسے علم میں مزا آنے لگتا ہے اور پھر وہ اس سے چھوٹ نہیں سکتا یا مثلاً اگر کوئی لکھنا سیکھتا ہے تو ابتداءً خوب غور و فکر کے ساتھ محنت و مشقت سے لکھے گا وہ غلط ملط لکیریں کھینچے گا لیکن ایک وقت آتا ہے کہ پھر وہ بلا تکلف لکھتا ہے اور صاف ستھرا بھی لکھتا ہے غرض یہ کہ تکلف (ایسے بتکلف نیک اعمال اور خوش خلقی کرنے کی وجہ سے اجر بھی ملے گا جبکہ نیت اللہ تعالیٰ کے لئے ہو بلکہ ایک حدیث کی رو سے مشقت اٹھا کر عمل پر دو گنا اجر ملتا ہے) سے نیک کام کرتے رہیں مثلاً دل نہیں چاہے گا پھر بھی فقراء پر مال خرچ کرتے رہیں اسی طرح نیک کاموں کو بتکلف کرتے رہیں حتیٰ کہ نیک اعمال کی عادت پڑ جائے اسی طرح کرنے سے بالآخر دل میں اچھے اخلاق جڑ پکڑ جائیں گے اور پھر بلا تکلف اچھے اور نیک افعال بدن سے بہہ نکلیں گے۔

(۴) روزانہ نفس کا محاسبہ کر لیا کریں اس کا طریقہ یہ ہے کہ روزانہ عشاء کی نماز کے بعد سونے سے قبل دس پندرہ منٹ یا کم و بیش وقت مقرر کر لیں اور اس میں یہ سوچا کریں کہ آج میں نے کتنی بھلائیاں کی ہیں اور کتنی برائیاں اور بد اخلاقیاں کی ہیں، آج کس کو فائدہ پہنچایا کس غرض سے پہنچایا اللہ کی رضا مقصود تھی یا ریا و شہرت وغیرہ، آج کتنی سخاوت کی، کس کس کی غیبت کی اور کس کی چغلی کھائی ہے غرض جو بھی کہا ہے اور جو بھی عمل کیا ہے اس کو یاد کیجئے تو جتنی نیکیاں ہوں ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ اے اللہ میں نیکی کرنے کے قابل اور اہل نہیں تھا یہ تو تیرا ہی فضل و کرم ہے آپ نے مجھ سے نیکی کرا دی آپ ہی نے میرے دل میں نیکی کرنے کا ارادہ پیدا فرمایا آپ ہی نے کرنے کی توفیق دی اور جتنی برائیاں کی ہیں خواہ ظاہری ہوں (جیسے غیبت، چغلی، جھوٹ بولنا، چوری وغیرہ) یا باطنی ہوں (جیسے کم نیتی، حسد، ریا وغیرہ) ان برائیوں پر دل سے نادم ہو کر توبہ کریں اور ان لوگوں سے معافی مانگ لیا کریں جن کی غیبت کی ہے اور جن جن کا حق مارا ہے، ان کو ان کا حق واپس کر دیں یا ان سے معاف کروالیں۔

(۵) کبھی بھی قصداً کسی گناہ کو معمولی سمجھ کر اختیار نہ کریں اور نہ کبھی کسی نیکی کو معمولی سمجھ کر چھوڑیں، کیونکہ خیر اور شر کے جدا جدا دوسلے ہیں اور ان دونوں میں ایک کڑی اپنی دوسری کڑی سے متصل ہے پہلے پہل انسان کے

ہاتھ خیر، شرکی ادنیٰ اور معمولی سی کڑی آتی ہے پھر اس کی وجہ سے بعد والی کڑی کی استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور اسی طرح بتدریج انسان خیر یا شر کے اعلیٰ اور انتہائی درجہ پر پہنچ کر جنت یا دوزخ کا مستحق بن جاتا ہے لہذا کسی خیر یا شر کو معمولی نہ سمجھنا چاہئے اور جب کوئی معمولی سی غلطی ہو جائے فوراً توبہ کر کے اپنے دامن کا داغ گناہ دھو لینا چاہئے اور کسی کار خیر کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے اس سے آپ کو اعلیٰ سے اعلیٰ خیر کی طرف توفیق ملتی جائیگی۔

(۶) صحبت بھی اثر رکھتی ہے اچھی صحبت سے اچھے اخلاق پیدا ہو سکتے ہیں کیونکہ انسان جس ماحول اور جس معاشرہ میں رہتا ہے اور جس کے ساتھ محبت اور الفت رکھتا ہے اس کی نقل کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شخص کے حالات سے آپ بے خبر ہیں تو جن لوگوں کے ساتھ وہ شخص اٹھتا بیٹھتا ہے اور جن کے ساتھ وہ خوش ہو کر رہتا ہے ان کے حالات معلوم کریں تو اس شخص کو تقریباً اسی طرح پائیں گے یہ ایک حقیقت ہے کہ صحبت سے اخلاق پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے بہادروں کی صحبت بزدلوں کے دلوں میں شجاعت پیدا کر سکتی ہے سخی کی صحبت سے سخاوت، یہی حال دوسری صفات کا ہے کہ صحبت اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتی اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔“ (توبہ: آیت ۱۱۹)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَثَلُ الْجَلِيسِ الصَّالِحِ وَالسُّوءِ كَحَامِلِ الْمِسْكِ أَمَّا يَحْذِيكَ وَأَمَّا أَنْ تُبْنَاعَ مِنْهُ وَأَمَّا تَجِدَ مِنْهُ رِيحاً طَيِّبَةً وَأَمَّا الْكَبِيرُ أَمَّا يُحْرِقُ ثِيَابَكَ وَأَمَّا أَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيحاً خَبِيثَةً)

”صالح نیک ہمنشین کی مثال مشک رکھنے والے (عطار) اور برے (ہمنشین کی مثال) دھونکنے والے (لوہار) کی سی ہے پس مشک رکھنے والا یا تمہیں مشک (مفت) دے دے گا یا تم اس سے خرید لو گے اور یا (اگر مشک کسی صورت میں آپ کے ہاتھ نہیں لگتا تو کم از کم) اس کی خوشبو تو (ضرور) تمہیں حاصل ہو جائیگی۔ اور دھونکنے والا یا تو تمہارے کپڑے جلا دے گا یا (کم از کم) تمہیں اس سے (دھواں اور گرم ہوا اور) بدبو تو ملے گی۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

غرض یہ کہ صحبت اور محبت کے آثار بہت زود اثر ہوا کرتے ہیں اور اس کی اہمیت عقل کی رو سے بھی اور قرآن و سنت کی رو سے بھی بالکل واضح ہے تو جب صحبت کی اہمیت معلوم ہوگئی تو یاد رکھیں کہ تحریر و تقریر، ریڈیو، ٹیلی ویژن حتیٰ کہ مختلف جانوروں سے محبت اور ان کے پالنے کے اور ان پر سواری کے مختلف اثرات ہوا کرتے ہیں اور تحریر، تقریر



کے حسن کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے جذبات اور اخلاق کیا ہیں۔  
یہاں یہ بھی یاد رکھئے کہ تحریر و تقریر کے حسن اور رنگ و روغن کو نہیں دیکھا جائے گا بلکہ تحریر اور تقریر کنندہ کے جذبات اخلاق اور اس کے میلانات اس کی تحریر و تقریر میں منتقل ہوتے رہتے ہیں لہذا نیک صالح لوگوں کی کتابوں، ان کی باتوں ان کے اٹھنے بیٹھنے اور ان کی ذات سے محبت رکھنے سے اچھے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

(۷) دین اور نیک اخلاق حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ صحبت ہے، کیونکہ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے اس لئے جب نیک اخلاق والے کی صحبت میسر ہو خواہ کسی عالم ربانی کی صحبت ہو یا کسی سچے اہل اللہ کی صحبت ہو اس کی صحبت میں رہا کریں، بلکہ سب سے سہل اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ تصوف کو اختیار کر لیا جائے کیونکہ تصوف اخلاق کی اقسام اور ان کے درجات اور مراتب ان کے آثار اور ان کے حاصل کرنے کے ذرائع و اسباب۔ غرض اس اخلاقی نظام کی تفصیل کا مستقل فن ہے جسے تزکیہ نفس اور تزکیہ اخلاق بھی کہا جاتا ہے اور اس فن کے ماہرین اور حاملین وہ ہیں جو اخلاقی، روحانی بیماریوں کی ترکیب، مقدار اور تفصیل کو اچھی طرح جانتے ہیں ایسے لوگوں کو صوفیا کہتے ہیں اگر کوئی آدمی اخلاق کا اعلیٰ درجہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے سب سے سہل طریقہ یہ ہے کہ خود کو کسی باشرع صوفی اور شیخ کامل کے سپرد کر دے پھر وہ جو طریقہ اصلاح اخلاق کے لئے بتایا کرے اس پر عمل کیا کرے تو ان شاء اللہ تعالیٰ آسانی سے اخلاق درست ہو جائیں گے اس کا ذاتی کردار باکمال ہو جائے گا اور وہ ایسا ہی بن جائے گا جیسے کہ ایک مؤمن کے شایان شان ہے وہ پاکباز، نیک چلن، دیانتدار، امانتدار، سخی، شجاع، عادل، رحم دل، صابر، سچا، سچائی کی تصدیق کرنے والا، متوکل، برداشت کرنے والا، عفو و درگزر کرنے والا اور اسی طرح اور دوسرے اخلاق نیک کا حامل ہو جائے گا، وہ بے جا غیظ و غضب اور دوسری نفسانی خواہشات کو ضبط میں رکھنے پر قادر ہوگا، تکبر سے پاک ہوگا فساد، عیب جوئی، بدامنی اور کسی کا مذاق اڑانے اور توہین وغیرہ جیسی برائیوں سے بے نیاز ہوگا اور اس کے ظاہری اعمال بھی خوب صورت ہوں گے اور اس کا باطن اس سے بھی زیادہ خوش جمال اور باعث زینت ہوگا نیز وہ ایسا بھی ہوگا کہ اس کے باطن میں کسی طرح یہ خیال نہیں آتا کہ وہ صاحب تقویٰ اور بزرگ ہے کیونکہ یہ خیال اگر کسی کو آتا ہے تو یہی خیال دعویٰ تقویٰ کا لباس تار تار کر کے اس کے مدعی کو تکبر کے خار زار میں برہنہ چھوڑ دیتا ہے۔ بعض خاص خاص نیک اخلاق جیسے صبر و شکر وغیرہ کو اعمال میں ملاحظہ کیجئے۔

### تصوف کیا ہے؟

اوپر کے بیان میں تصوف کا ذکر ہوا ہے کہ تصوف کو اختیار کیا جائے۔ تصوف کیا ہے؟ تو تصوف وہ علم اور

طریقہ ہے جس کے ذریعے انسان کا اللہ تعالیٰ سے صحیح اور مضبوط تعلق بن جاتا ہے اور جس کی وجہ سے انسان سے رذائل یعنی برے اخلاق دور ہو جاتے ہیں اور ایمانی صفات اور اخلاق حسنہ سے آراستہ ہو جاتا ہے اس لئے اس علم کو علم الاخلاق بھی کہا جاتا ہے اور اس کا قرآنی نام ”تزکیہ نفس“ ہے اور اس کو حدیث میں ”احسان“ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

### تصوف کے بارے میں غلط فہمی اور مغالطوں کے شکار ہونے والے!

عوام بلکہ بعض خواص بھی تصوف اور بیعت کی غرض و مقصد کے سمجھنے میں بہت دھوکہ کھاتے ہیں اور اس باب میں طرح طرح کے مغالطوں اور غلط فہمیوں کے شکار ہیں اور بہت سے غیر ضروری اور غیر متعلق چیزوں کو تصوف کے اجزاء بنا لیتے ہیں۔ مثلاً کشف و کرامات اور تصرفات کو تصوف کے لئے لازم قرار دیتے ہیں کوئی تعویذات گندوں جھاڑ پھونک کا نام تصوف رکھتے ہیں، کوئی خاص خاص رسموں اور عادتوں کو تصوف سمجھ بیٹھے ہیں، کوئی فلسفی یا فلسفی مزاج تصوف سے مراد وحدۃ الوجود یا وحدۃ المشہود کے نظریات لیتا ہے، کوئی تصوف کی راہ کو اس لئے اختیار کر لیتا ہے کہ بیعت کے بعد قیامت میں شیخ اور پیر اس کے بخشوانے کا ذمہ دار ہے اور کوئی اس راہ کو دنیاوی ترقیات مثلاً روزگار کی ترقی منصب کی ترقی اور عزت کی ترقی حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے کوئی اس کو صرف اس لئے اختیار کرتا ہے کہ اس سے باطنی کیفیات اور کشف و کرامات حاصل ہو جاتے ہیں غرض یہ تمام چیزیں نہ تو تصوف کے جز ہیں نہ اس کے لئے ضروری ہیں اور نہ ہی یہ اس میں شامل ہیں ان میں سے بعض چیزیں تو قطعاً باطل اور تصوف سے بالکل الگ ہیں بلکہ بعض نے تو تصوف کو ایک ایسا راز بنا رکھا ہے جو صرف سینہ بسینہ چلا آ رہا ہے اور وہ اس کو شریعت کے مقابل اور ضد گمان کر لیتے ہیں حالانکہ یہ بھی سراسر غلط اور باطل ہے۔

### شریعت و طریقت!

اب سوال یہ ہے کہ تصوف و طریقت کیا ہیں اور اس کی غرض و غایت کیا ہے تو اس کا جواب قدرے تفصیل سے پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے تمام احکام اور طریقے و ہدایات جن کا انسان مکلف ہے خواہ وہ ظاہری اعمال سے تعلق رکھتے ہوں یا باطنی اعمال سے دین اور شریعت کہلاتے ہیں اور متقدمین یعنی اسلام کے پہلے بزرگوں کی اصطلاح میں ”فقتہ“ کا لفظ بھی انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے چنانچہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ کی یہ تعریف منقول ہے:

(مَعْرِفَةُ النَّفْسِ مَالَهَا وَمَا عَلَيْهَا)

”یعنی نفس کا اپنے متعلق نفع و نقصان کی چیزوں کو پہچانا۔“

مطلب یہ ہے کہ نفس کا اپنے متعلق ان احکامات اور ہدایات کو پہچانا خواہ وہ اس کے ظاہر سے متعلق ہوں یا باطن سے متعلق ہوں جو اس کے لئے باعث ثواب یا باعث عذاب ہیں اور اس پر وبال جان بن جاتے ہیں۔ پھر متاخرین یعنی اسلام کے پہلے بزرگوں کے بعد آنے والے بزرگان دین نے اس فقہ اور شریعت کو ہماری آسانی کے لئے دو حصوں میں تقسیم کیا دین و فقہ کے جن اعمال کا تعلق ظاہر سے اس کا نام فقہ اور شریعت رکھا اور دین و شریعت یا فقہ کے باطنی جز کا نام تصوف پڑ گیا باطنی اعمال کے طریقوں کو طریقت کہا گیا اور قرآن مجید اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں دین و شریعت کی دونوں اقسام کے لئے ہدایات و تعلیمات موجود ہیں ظاہری اعضاء سے تعلق رکھنے والی تعلیمات و احکامات بھی اور باطن سے تعلق رکھنے والے احکامات و تعلیمات بھی۔

تصوف و طریقت قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں!

چنانچہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ظاہری اعمال کا حکم فرمایا ہے کہ:

﴿وَأَقِمُّوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾

”اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔“

اس طرح اللہ تعالیٰ نے صبر و شکر کا حکم بھی فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَبِرُوا﴾

”اے ایمان والو! صبر کرو۔“

﴿فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ﴾

”پس تم مجھے یاد رکھو میں تم کو یاد رکھوں گا اور تم میرا شکر کرو (اور احسان مانو) اور میری (نعمتوں کی) ناقدری

(بقرہ: آیت ۱۵۱)

اور) ناشکری مت کرو۔“

غرض یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے نماز روزہ زکوٰۃ حج حلال کمائی اور حلال کھانے اور ہر حق دار کے حق ادا کرنے کا حکم فرمایا اور شر کے افعال زنا، چوری، سود، سٹہ، رشوت، جھوٹ، غیبت وغیرہ سے منع فرمایا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے عقائد حقہ اختیار کرنے اور نماز میں خشوع اور اچھے کام میں اخلاص و للہیت رحم اور امانتداری، صداقت، صبر و شکر توکل، رضاء بالقضاء، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت وغیرہ جیسے باطنی

امور کا حکم فرمایا ہے اور عقائد باطلہ، بے صبری، ناشکری، ریا، تکبر، عجب، حسد، خیانت وغیرہ سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾

”اور جو ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے والے ہیں۔“ (بقرہ: آیت ۱۶۵)

نیز اللہ تعالیٰ کی ارشاد ہے:

﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ ۭ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسْكَنٌ تَرْضَوْنَهَا أَحَبُّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾

”کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے (بیٹیاں وغیرہ) اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے خاندان اور وہ مال جو تم نے (اپنے ہاتھوں سے) کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو یہ سب تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (عذاب) بھیج دے اور اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو راستہ نہیں دیتا۔“ (توبہ: آیت ۲۴)

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ شدید محبت کا حکم اور جو لوگ ایسی محبت سے خالی ہوں ان کے لئے عذاب کی دھمکی ہے، اللہ تعالیٰ نجات یافتہ لوگوں کے بیان میں فرماتے ہیں کہ:

﴿إِنَّ الَّذِينَ هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ﴾

”بے شک جو لوگ اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے ہیں۔“ (مؤمنون: آیت ۵۷)

اس آیت کریمہ میں خوف اور خشیت الہی کو نجات کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے نیز اللہ تعالیٰ مؤمنین کی صفات میں فرماتے ہیں کہ:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ﴾

”سچے ایمان والے بس وہی لوگ ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جائے تو

ان کے دل دہل جائیں۔“ (انفال: آیت ۲)

اس آیت کریمہ میں خوف و خشیت الہی اور اس کے ذکر اور حکم سے دل لرز جانا اور دہل جانا ایمان کا ثمرہ

اور صفت لازمہ بتایا گیا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا﴾

”بے شک کامیاب ہو گیا جس نے نفس کو (پاک صاف کر کے) سنوارا اور ناکام و نامراد ہوا جس نے اس کو آلودہ کیا۔“ (سورۃ الشمس: ۹-۱۰)

اس آیت کریمہ میں فلاح اور کامیابی کو نفس کو برے اخلاق سے پاک کرنے اور اچھے و نیک اخلاق سے آراستہ کرنے پر منحصر کر دیا اور بتایا کہ جس نے اپنے نفس کو برے اخلاق اور گناہوں سے آلودہ کیا وہ ناکام و نامراد ہوا۔ نیز اللہ تعالیٰ نے ایک سے زیادہ مقامات پر تزکیہ نفس پر زور دیا ہے اور اس تزکیہ کی متعدد مقامات پر خود منصب رسالت کا اہم مقصد قرار دیا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾

”اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں سناتا ہے اور ان کا تزکیہ (یعنی ان کو برے عقائد اور برے اخلاق سے پاک کر کے نیک اخلاق سے آراستہ) کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔“ (ال عمران: آیت ۱۶۴)

اس آیت پر غور فرمائیے کہ تزکیہ انبیاء علیہم السلام اور خاص کر رسول کریم ﷺ کا اہم کام اور مقصد نبوت تھا جب کہ اس کی وضاحت خود نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشاد میں یوں فرمائی ہے کہ:

(إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ)

”میں تو اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں۔“

اور نبی کریم ﷺ کے اخلاق کیسے تھے ان کی وضاحت قرآن مجید نے ان الفاظ میں کی ہے:

﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾

”اور بے شک آپ عظیم الشان اخلاق (کریمانہ) پر ہیں۔“ (سورۃ القلم: آیت ۴)

نیز تقویٰ جو پورے دین کا جوہر اور خلاصہ ہے اس کا تعلق بھی دراصل باطن ہی سے ہے جیسا کہ اس کا مفصل بیان تقویٰ میں آئے گا یہاں صرف اس کے متعلق نبی کریم ﷺ کا ایک ارشاد نقل کرتا ہوں وہ یہ کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

(التَّقْوَىٰ هُنَا وَأَشَارَ إِلَى الصَّدْرِ)

”تقویٰ یہاں ہے اور آپ ﷺ نے سینے کی طرف اشارہ فرمایا۔“ (مسلم ومشکوٰۃ)

**تقویٰ اور تزکیہ کب حاصل ہوتا ہے؟**

اور حقیقی معنوں میں تقویٰ اور تزکیہ نفس اور بلند اخلاق اس وقت نصیب ہوتے ہیں جبکہ علم دین بھی ہو اور انسان کا دل بھی درست ہو جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

(الْإِنِّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةٌ إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ الْاَوْهَى الْقَلْبُ)

”سن لو بے شک آدمی کے بدن میں ایک گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو جاتا ہے تو تمام بدن درست ہو جاتا ہے (اور اس سے خود بخود درست اعمال صادر ہونے لگتے ہیں) اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو تمام بدن فاسد اور برباد ہو جاتا ہے سن لو وہ دل ہے۔“

یہی درست دل ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ﴾

”جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد مگر وہ جو اللہ تعالیٰ کے پاس قلب سلیم لے کر آئے۔“ (شعراء:

آیت ۸۸-۸۹)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اصل قیمت قلب سلیم کی ہے اور اس سے مراد صحیح اور پاک دل ہے جو شرک نفاق اور کبر و حسد اور بغض وغیرہ جیسے رذیل جذبات سے پاک اور نیک اخلاق سے آراستہ ہو۔

**دل صحیح معنوں میں کب درست ہوتا ہے؟**

اور دل اس وقت صحیح معنوں میں درست ہوتا ہے جب اس کو یقین و محبت اور اللہ تعالیٰ کا صحیح اور قوی تعلق نصیب ہو جائے جیسا کہ اس کی وضاحت حدیث جبریل علیہ السلام میں موجود ہے، جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ سے احسان کے متعلق دریافت کیا کہ احسان کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا:

(الْإِحْسَانُ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ)

”احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اس طرح کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو پس تم اگر اس کو نہیں دیکھ سکتے

تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔“ (بخاری و مسلم و مشکوٰۃ)

اس حدیث میں ایمان و اسلام اور احسان کے بارے میں سوال کیا گیا جس سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ عقائد ضرور یہ اور اعمال ظاہرہ کے علاوہ ایک تیسری چیز بھی ہے جس کا نام احسان ہے اور یہی چیز عقائد اور اعمال کے لئے بمنزلہ روح کے ہے۔ حدیث کے اس ٹکڑے کا مطلب یہی ہے مقام احسان یہ ہے کہ بندہ کی یہ حالت ہو جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی اس طرح کرے اور اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کا ایسا ادب اور لحاظ رکھے اور اس سے ایسا ڈرے کہ گویا اللہ تعالیٰ اس کی نظروں کے سامنے ہے اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے کیونکہ بندہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو واقعہً نہیں دیکھ سکتا لیکن اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کے وہ حاضر ناظر ہے اور بندہ کو ہر وقت دیکھتا رہتا ہے لہذا بندہ کو ہر وقت اور اپنے ہر کام میں اس کا ایسا ادب و لحاظ کرنا چاہئے کہ گویا اللہ تعالیٰ اس کی نگاہ کے سامنے ہے اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ بندہ کو حقیقت کا یقین اور اللہ تعالیٰ کی سچی محبت اور اس کا صحیح وقوی تعلق نصیب ہو جائے اور وہ اس کے دل پر اس طرح چھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی گویا ہر وقت اس کے سامنے رہتی ہے۔ یاد رہے کہ عبادت سے مراد صرف نماز ہی نہیں بلکہ اس کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے کیونکہ حدیث میں ”تَعْبُدُ“ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی مطلق عبادت اور بندگی کے ہیں اور اسی حدیث کی ایک روایت میں بجائے ”تَعْبُدُ“ کی جگہ ”تَخْشَى“ کا لفظ بھی آیا ہے یعنی ”الاحسانُ اَنْ تَخْشَى اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ“ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے اس طرح ڈرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اس حدیث کی ایک روایت میں اس موقع پر یہ الفاظ بھی آئے ہیں کہ ”الاحسانُ اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰهِ كَأَنَّكَ تَرَاهُ“ احسان یہ ہے کہ تم ہر کام اللہ تعالیٰ کے لئے اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔

غرض یہ کہ اس کا مطلب یہی ہے کہ احسان کا تعلق صرف نماز سے نہیں بلکہ انسان کی پوری زندگی سے ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر عبادت و بندگی اس کے ہر حکم و ہدایت کی اطاعت و فرمانبرداری اس طرح کی جائے اور اس کی گرفت سے اس طرح ڈرا جائے کہ گویا وہ ہمارے سامنے ہے اور وہ ہمارے ہر ارادے ہر خیال اور ہماری ہر حرکت و سکون اور ہر قول و فعل کو دیکھ رہا ہے خلاصہ یہ کہ دل اور اخلاق اس وقت درست ہو سکتے ہیں جب بندے کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت کے علاوہ صحیح و مضبوط تعلق بھی پیدا ہو۔

تزکیہ و احسان کا دوسرا نام تصوف ہے!

مذکورہ بالا بیان تصوف کی ضرورت کی وضاحت کے لئے کافی ہے اس سے معلوم ہوا کہ تزکیہ و احسان اور



تصفیہٗ الاخلاق کا نام ہی تصوف ہے یہ دین کا بہت ہی اہم اور ضروری شعبہ ہے اور یہ ظاہری اعمال کے لئے بمنزلہ روح کے ہے۔ اس کے بارے میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ:

”تصوف میرے اکابر کا اہم ترین مشغلہ ہے وہ۔“

در کیف جام شریعت در کفِ سندانِ عشق

ہر سوسنا کے نداند جام و سندانِ باختن

کے سچے مصداق تھے یہ حضرات ایک جانب فقہ اور علوم ظاہریہ میں اگر ائمہ مجتہدین اور ائمہ حدیث کے حقیقی جانشین اور سچے متبع تھے تو دوسری جانب تصوف کے ائمہ جنید رحمۃ اللہ علیہ شبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے قدم بقدم، ان اکابر نے تصوف کو فقہ و حدیث کے ماتحت چلایا اور اپنے قول و فعل سے بتلایا کہ یہ مبارک فن حقیقت میں قرآن، حدیث ہی کا ایک شعبہ ہے اور جو رسوم و بدعات اس مبارک فن میں بعد زمانہ سے بڑھ گئی تھیں اُس کو چھانٹ دیا تصوف کو بعض ناواقفوں نے ظاہر شریعت کا مخالف نہیں تو علیحدہ ضرور بنا دیا یہ غلو ہے یا جہل حقیقی تصوف کو جس کا دوسرا نام احسان ہے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضور اقدس ﷺ سے اس کی حقیقت لوگوں کے سامنے دریافت کر کے یہ واضح کر دیا کہ یہ شریعت کی روح اور مغز ہے اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سوال پر کہ احسان کیا چیز ہے؟ سید الکونین ﷺ کے اس پاک ارشاد نے:

(ان تعبد اللہ کأنک تراہ ....)

”تو اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسی کرے گویا تو اُس کو دیکھ رہا ہے۔“

احسان کے معنی اور تصوف کی حقیقت واضح کر دی۔ عنوانات تو اس کے جو بھی اختیار کئے جائیں لیکن مرجع

سب کا یہی حقیقت ہے۔ (اکابر کا سلوک و احسان: ص ۱۸ تا ۱۷)

حضرت شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

غرض تصوف ایک عظیم الشان چیز تھی جس کی تعریف علماء تصوف نے یہ فرمائی ہے کہ ہو علم ..... وہ ایسا علم ہے کہ جس کے ذریعہ سے نفوس کا تزکیہ اخلاق کا تصفیہ اور ظاہر و باطن کی تعمیر کے احوال پہچانے جاتے ہیں جس کی غرض ابدی سعادت کی تحصیل ہے اب آپ خود غور فرمائیے کہ اس میں سے کونسی چیز غلط ہے؟ نفس کا تزکیہ غلط ہے یا اخلاق تصفیہ برا ہے؟ ظاہر و باطن کی تعمیر لغو ہے؟ یا سعادت ابدیہ کی تحصیل بیکار ہے؟ اسی طرح تقویم اخلاق تہذیب نفس۔ نیز نفس کو اعمال دین کا خوگر بنانا اور شریعت کو نفس کے حق میں وجدان بنالینا ان امور میں کونسی شے



مقاصد شرع کے خلاف ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک شے کتاب و سنت کے عین مطابق اور رسول اللہ ﷺ کے منشاء کو پورا کرنے والی ہے۔

غرض جس تصوف کے اثبات کے قائل ہیں وہ وہی ہے جس کو اصطلاح شرع میں احسان کہتے ہیں یا جس کو علم الاخلاق کہا جاتا ہے یا تعمیر ظاہر و باطن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ ایک منظم با اصول چیز ہے اس میں مریدین کے لئے بھی شرائط ہیں اور شیخ کے لئے بھی اصول و آداب ہیں جن کی رعایت کرنے کے بعد اس کو شریعت کا مغز اور دین کا لب لباب کہنا بجا ہے اور جب ان شرائط و آداب کا لحاظ نہ کیا جائے بلکہ غیر تصوف کو تصوف قرار دیا جائے تو پھر وہ طریق ہی نہیں جو ہمارا موضوع بحث ہے اس لئے کہ ان کی خرابیوں اور ان پر عمل کرنے کی وجہ سے سالک میں جو خرابیاں پیدا ہوں اس کا ذمہ دار کسی طرح حقیقی تصوف اور اصل طریق کو نہیں قرار دیا جاسکتا اب اگر آپ کو تصوف سے محض اس بناء پر چڑا اور انکار ہے کہ اس کا نام محدث ہے تو.... آپ اس کو احسان سے تعبیر کر لیجئے، علم الاخلاق اس کا نام رکھ لیجئے اور جو شخص کہ اس سے متصف ہو اُس کو محسن اور مقرب متقی اور مخلص کہہ لیجئے اور احسان و محسن اور متقی و مخلص کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ حدیث شریف میں بھی اس کا ذکر آیا ہوا ہے۔ (اکابر کا سلوک و احسان: صفحہ نمبر ۲۱ تا ۲۲)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ و نور اللہ مرقدہ قہیمات الہیہ میں فرماتے ہیں کہ (اصل کتاب میں صرف عربی عبارت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے) حضور اقدس ﷺ نے جس چیز کی دعوت دی اُن میں سب سے مہتمم بالشان اُمور تین ہیں۔

(۱) تصحیح عقائد جس کا ذمہ علماء اُمت کے اہل اصول نے اُٹھایا ہے۔ اللہ جل شانہ ان کی مساعی کو قبول فرمائے۔

(۲) دوسری چیز اعمال کا صحیح طور پر ادا کرنا اور سنت کے موافق ان سب کو ادا کرنا۔ اس فن کو اُمت کے فقہاء نے اپنے ذمہ لیا جن کی کوششوں سے اللہ جل شانہ نے بہت سے لوگوں کو ہدایت فرمائی اور گمراہ فرقوں کے اعمال کو راہ راست پر لائے۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے احسان کا بیان فرمایا ہے اور آیات و احادیث سے اس کو مبرہن فرمایا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ تصحیح اخلاص و احسان کو جو اس دین کی اصل ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پسند فرمایا ہے۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے آیات، احادیث اخلاص و احسان کو تحریر فرما کر تحریر فرمایا کہ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہ تیسرا جزو شریعت کے مقاصد کا سب سے وقیع فن ہے اور بہت

گہرا ہے جملہ شرائع کے مقابلہ میں جو بمنزلہ روح کے ہے بدن کے مقابلہ میں اور اس فن کا تکفل صوفیاء نے کیا ہے کہ انہوں نے خود ہدایت پائی اور دوسروں کو ہدایت فرمائی۔ خود سیراب ہوئے اور دوسروں کو سیراب کیا اور انتہائی سعادت کے ساتھ کامیاب ہوئے۔ (اکابر کا سلوک واحسان: ص ۲۲ تا ۱۳)

### تصوف کی اصطلاح اور غلط فہمیوں کا ازالہ!

تصوف کے باب میں جو نزاع پیدا ہوا ہے اس پر بحث کرتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی فرماتے ہیں کہ:

”الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ“

مذہب، اخلاقیات، تعلیم و تربیت، اصلاح و تجدید اور علوم و فنون سب کی تاریخ میں دو مرحلے بڑے سخت پیش آتے ہیں اور ان سے ان میں سے کسی کو بھی مفر نہیں۔

ایک جب کہ وسائل مقاصد بن جاتے ہیں، دوسرے جب اصطلاحات حقائق کے لئے حجاب ہو جاتے ہیں۔ وسائل اور اصطلاحات دونوں نہایت ضروری اور بالکل قدرتی اور طبعی چیزیں ہیں جن کے بغیر ان مقاصد عالیہ کی تبلیغ و ترویج اور تشریح و تفہیم عام طور پر ممکن نہیں ہوتی، لیکن وسائل ہوں یا اصطلاحات، مقاصد و حقائق کے لئے ان کا درجہ خادم و معاون کا ہے۔ ان کو وقتی طور پر ایک ضرورت کی تکمیل کے لئے اختیار کیا جاتا ہے اور بعض اوقات ان پر مقاصد و حقائق ہی کی طرح زور دیا جاتا ہے اور ان کا مطالبہ کیا جاتا ہے، لیکن ان میں سے ہر فن کا مجتہد جب ضروری سمجھتا ہے ان سے نہ صرف استغناء اختیار کرتا ہے بلکہ بعض اوقات بطور علاج ان کے ترک کا بھی حکم دیتا ہے۔ وہ ان کا محکوم ہونے کے بجائے ان کا حاکم ہوتا ہے۔ وہ اس کا بھی لحاظ رکھتا ہے کہ وہ اس تناسب سے آگے نہ بڑھنے پائیں کہ بجائے مفید ہونے کے مضر اور موصل الی المطلوب ہونے کے بجائے سد راہ اور طریق راہزن ثابت ہوں۔

لیکن اس تاریخی حقیقت کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ان مقاصد عالیہ کو یہ ابتلاہ بار بار پیش آیا ہے کہ وسائل مقاصد بن گئے اور اصطلاحات نے حقائق پر ایسے دبیز پردے ڈال دیے کہ وہ نہ صرف یہ کہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے بلکہ ان سے تلخ تجربوں اور غلطیوں کی بناء پر جوان اصطلاحات کے علمبرداروں سے سرزد ہوئیں ایسی شدید غلط فہمیاں پیدا ہوئیں کہ حق گو اور سلیم الفطرت انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو ان مقاصد اور حقائق ہی سے ایسی

وحشت اور بے زاری پیدا ہو گئی کہ ان کو ان مقاصد کے حصول اور تکمیل اور ان حقائق کی قدر و اعتراف پر آمادہ کرنا ایک نہایت دشوار کام بن گیا۔ جب ان کے سامنے ان مقاصد کی تحصیل کی ضرورت پر تقریر کی جاتی یا ان کو ان کے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی تو وسائل کے وہ پہاڑ ان کے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے جن کے بارے میں خام اور غیر محقق داعیوں نے سخت مبالغہ اور غلو سے کام لیا تھا اور ہر شخص سے ان کے بارے میں بیجا اصرار کیا تھا اور وہ انہیں میں اس طرح الجھ کر رہ گئے تھے کہ مقصد ہی بالکل فراموش اور نظر انداز ہو گیا تھا۔ اسی طرح جب ان حقائق کی دعوت دی گئی جن کے بارے میں دو (۲) رائے نہیں ہو سکتیں اور جو بدہیات میں داخل ہیں تو وہ اصطلاحات ان کے لئے حجاب بن گئے جن کے بارے میں نہ صرف یہ کہ اختلاف کی گنجائش تھی بلکہ وہ خاص ماحول مخصوص حالات اور عام طور پر بہت بعد کے زمانہ میں ان حقائق کو ذہن کے قریب کرنے کے لئے اور خاص مصالح کے ماتحت وضع کئے گئے تھے۔ ان حقائق کے ابتدائی علمبردار اور جن کی زندگی ان حقائق کی سچی تصویر تھی ان اصطلاحات سے نا آشنا تھے انہوں نے ان حقائق کو سمجھانے اور ذہن نشین کرانے کے لئے دوسرے ہی الفاظ، طریقے اور اسالیب استعمال کئے تھے صرف ونحو، قواعد زبان علوم و بلاغت سے لے کر حقیقت و معرفت، اصلاح باطن، تزکیہ نفس تک جس کی تاریخ دیکھی جائے اور اس فن کے متقدمین اور متاخرین ان کے محکوم محققین حقائق کے داعی و مبلغ اور غیر محقق پیرو اصطلاحات کے پرستار اور ان کے اسیر و گرفتار ہیں۔ یہ مقاصد عالیہ دینیات اور اخلاقیات اور علوم و فنون کا ایک ایسا المیہ اور ان کے طالبین کے لئے امتحان و آزمائش کا ایسا مرحلہ ہے جو ہر دور میں پیش آیا ہے۔

تصوف کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ جہاں تک اس کے مقصد و حقیقت کا تعلق ہے وہ ایک متفق علیہ اور بدیہی حقیقت ہے لیکن اس کو انہیں دو چیزوں نے نقصان پہنچایا کہ ایک وسائل کے بارے میں غلو اور افراط سے کام لینا دوسرے اصطلاح پر غیر ضروری حد تک زور دینا اور اس پر بیجا اصرار کرنا۔ اگر کسی سے پوچھا جائے کہ اخلاص و اخلاق ضروری ہیں یا نہیں۔ یقین کا پیدا ہونا مطلوب ہے، یا نہیں۔ فضائل سے آراستہ ہونا اور رذائل سے پاک ہونا، حسد، کبر، ریا، بغض اور کینہ، حب مال، حب جاہ اور دوسرے اخلاق ذمیمہ سے نجات پانا نفس امارہ کی شدید گرفت سے خلاصی پانا کسی درجہ میں ضروری یا مستحسن ہے یا نہیں۔ نماز میں خشوع و خضوع، دعاء میں تضرع و ابہتال کی کیفیت، محاسبہ نفس کی عادت اور سب سے بڑھ کر اللہ و رسول ﷺ کی محبت، حسی حلاوت و لذت کا حصول یا کم سے کم اس پر شوق و اہتمام صفائی معاملات، صدق و امانت اور حقوق العباد کی اہمیت اور فکر نفس پر قابو رکھنا غصہ میں

آپے سے باہر نہ ہونا کسی درجہ میں مطلوب ہے یا نہیں تو ہر سلیم الفطرت انسان اور خاص طور پر وہ مسلمان جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی نہیں ہے یہی جواب دے گا کہ یہ چیزیں نہ صرف مستحسن بلکہ شرعاً مطلوب ہیں اور سارا قرآن اور حدیث کے دفتر اس کی ترغیب و تاکید سے بھرے ہوئے ہیں لیکن اگر کہا جائے کہ انہی صفات کے حصول کا ذریعہ وہ طریق عمل ہے جس کو بعد کی صدیوں میں تصوف کے نام سے پکارا جانے لگا تو اس کے سنتے ہی بعض لوگوں کی پیشانی پر شکن پڑ جائیں گے، اس لئے کہ اس اصطلاح سے اُن کو وحشت اور اس کے بعض پر خود غلط علمبرداروں اور دعوے داروں کے متعلق ان کے تجربات نہایت تلخ ہیں، ان کے حافظہ میں اس وقت وہ واقعات اُبھر آتے ہیں جو ان کو معاملہ کرنے پر یا اُن کو قریب سے دیکھنے پر اُن کے ساتھ پیش آئے۔ لیکن یہ صرف تصوف ہی نہیں ہر علم و فن ہر اصلاحی دعوت اور ہر نیک مقصد کا حال یہ ہے کہ اُس کے حاملین و عاملین میں اور اُس کے داعیوں اور دعوے داروں میں اصلی و مصنوعی، محقق و غیر محقق، پختہ و خام، یہاں تک کہ صادق و منافق پائے جاتے ہیں اور ان دونوں نمونوں کی موجودگی سے کوئی حقیقت پسند انسان بھی اس ضرورت کا منکر اور سرے سے اس فن کا مخالف نہیں بن جاتا۔ دنیاوی شعبوں کا حال بھی یہی ہے کہ تجارت ہو یا زراعت، صنعت ہو یا ہنر، ہر ایک میں کامل و ناقص اور رہبر و ہرن دونوں پائے جاتے ہیں، لیکن دین و دنیا کا نظام اسی طرح چل رہا ہے کہ آدمی اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور ناقصوں یا مدعیوں کی وجہ سے اس دولت سے محرومی اور اس مقصد سے دست برداری اختیار نہیں کرتا اور کسی اصطلاح سے عدم اتفاق کی وجہ سے وہ اصل حقیقت کو نہیں ٹھکراتا۔ شاعر نے صحیح کہا ہے:

الفاظ کے پیچوں میں الجھتے نہیں دانا

غواص کو مطلب ہے گہر سے کہ صدف سے

تصوف کے سلسلہ میں دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک وہ جو تمام اجزاء کو علیحدہ علیحدہ تسلیم کرتا ہے لیکن جب اس کے مجموعہ کو کوئی نام دیدیا جاتا ہے تو وہ اس سے انکار کر دیتا ہے، ہم نے اوپر جن مقاصد و صفات کا ذکر کیا ہے وہ تقریباً سب لوگوں کو علیحدہ علیحدہ تسلیم ہیں لیکن جب کہا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے (کسی وجہ سے) اس کے مجموعہ کا نام تصوف رکھ دیا ہے تو فوراً تیوری پر بل پڑ جاتے ہیں اور وہ کہنے لگتے ہیں کہ ہم تصوف کو نہیں مانتے اور تصوف نے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ اور دوسرا گروہ وہ ہے کہ اگر کوئی اسی حقیقت کا نام بدل کر پیش کرے اُس کو قبول کر لیتا ہے مثلاً کہا جائے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس کا نام تزکیہ حدیث کی اصطلاح میں احسان اور بعض علماء کی اصطلاح میں فقہ باطن ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اس سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں اور یہ سب چیزیں منصوص ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تک لکھی ہوئی ساری کتابوں میں نہ ترمیم ہو سکتی ہے اور نہ زبان خلق کو جو نقارہ خدا کہی گئی ہے روکا جاسکتا ہے۔ ورنہ اگر ہمارے اختیار کی بات ہوتی تو ہم اس کو تزکیہ و احسان کے لفظ سے یاد کرتے اور تصوف کا لفظ ہی استعمال نہ کرتے، لیکن اب اس کا معروف نام یہی پڑ گیا ہے اور یہ کسی فن کی خصوصیت نہیں، علوم و فنون کی ساری تاریخ اسی طرح کی مروجہ اصطلاحات سے پر ہے۔ محققین فن نے ہمیشہ مقاصد پر زور دیا اور وسائل کو وسائل ہی کی حد تک رکھا اسی طرح انہوں نے بڑی جرأت اور بلند آہنگی سے ان چیزوں کا انکار کیا جو اس کے روح و مغز اور اصل مقاصد سے نہ صرف خارج بلکہ ان کے منافی اور اکثر اوقات ان کے لئے مضرت ثابت ہوتی ہیں۔ تاریخ اسلام میں کوئی ایسا دور نہیں گزرا کہ اس فن کے داعیوں، معلموں اور اہل تحقیق نے مغز و پوست، حقائق و اشکال اور مقاصد و رسوم میں فرق نہ کیا ہو۔

پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ سے لے کر مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سب نے قشر و لباب مقصود و غیر مقصود میں پوری وضاحت کے ساتھ امتیاز پر زور دیا اور ان رسوم و عادات کی اس شدت سے تردید کی جو غیر مسلموں کے اختلاط یا صوفیاء خام کے اثر سے داخل ہو گئی تھیں اور ان کو تصوف اور طریقت کا جز سمجھ لیا گیا تھا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی فتوح الغیب ہو یا غنیۃ الطالبین۔ یا شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی عوارف المعارف، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی صراط مستقیم۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی مکتوبات یا مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت السالک و قصد السبیل، ہر جگہ یہ مضامین بکثرت ملیں گے کہ انہوں نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دیا۔ (اکابر کا سلوک و احسان ص ۱۲۷)

### اصطلاحات سے حقیقت اور وسائل سے مقصد کی طرف!

حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی مدظلہ العالی اپنی کتاب ”تزکیہ و احسان یا تصوف و احسان“ میں فرماتے ہیں کہ: ”اصطلاحات اور مروجہ الفاظ و عنوانات نے بعض اوقات حقائق کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے اور ان کو بڑا نقصان پہنچایا ہے دنیا کے ہر علم و فن، زبان و ادب اور دین و مذہب میں اس زیادتی کی ایک طویل روداد ہے، ان اصطلاحات سے بسا اوقات ایک نیا تصور پیدا ہو گیا ہے، اس کے متعلق نئے نئے قسم کے سوالات اور اعتراضات پیدا ہو گئے، اختلاف و تنازعہ کا ایک لامتناہی سلسلہ اٹھ کھڑا ہوا، مختلف مذاہب اور مکتب خیال وجود میں آئے دلائل

اور منطق کی محفلیں آراستہ ہوئیں، افکار و خیالات میں تضاد ہوا اور لوگ مختلف گروہوں اور جماعتوں میں بٹ گئے۔ اگر ہم ان نئی اصطلاحات اور عرفی ناموں کو ترک کر کے عہد ماضی کی طرف واپس ہوں، جب ان تھاق کے لئے بہت سادہ اور عام فہم الفاظ مستعمل تھے اور بڑی سہولت کے ساتھ ان کیفیات اور معانی کی ترجمانی کی جاتی تھی اور ان الفاظ کو اختیار کر لیں جو ہمارے اسلاف کے یہاں رائج تھے، تو یہ مسئلہ اسی وقت حل ہو جائے گا اور تمام جماعتوں میں صلح ہو جائے گی۔ انہیں اصطلاحات میں ایک اصطلاح ”تصوف“ ہے جو لوگوں میں بہت رائج ہے، اس سلسلہ میں طرح طرح کے سوال کھڑے ہوئے اور بحثوں کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو گیا، سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوا کہ اس لفظ کی حقیقت و مراد کیا ہے؟ اس کا مأخذ و منبع کیا ہے، آیا وہ ”صوف“ سے ماخوذ ہے یا ”صفاء“ سے ”صفو“ سے نکلا ہے، یا ”صفہ“ سے؟ یا وہ ایک یونانی لفظ صوفیاء سے لیا گیا ہے جس کے معنی حکمت بتائے جاتے ہیں۔ آخر یہ لفظ کہاں سے برآمد کیا گیا اور کس طرح اس کا رواج ہوا، جبکہ نہ قرآن و حدیث میں اس کا وجود ملتا ہے اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے اقوال میں نہ خیر القرون میں اس کا سراغ ملتا ہے اور ہر ایسی چیز جس کا حال اور جس کی یہ تاریخ ہو بدعت کہلانے کی مستحق ہے، غرض کہ اس طرح تصوف کے حامیوں اور مخالفوں میں ایک قلمی اور لسانی معرکہ برپا ہو گیا اور اس کے نتیجے میں ایک مستقل کتب خانہ وجود میں آیا جس کا سرسری جائزہ لینا بھی مشکل ہے۔

اگر ہم اس اصطلاح کو ترک کر کے (جس سے ہم دوسری صدی میں روشناس ہوئے ہیں) قرآن و حدیث اور عہد صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین کی طرف رجوع کریں اور کتاب و سنت کا اس نقطہ نظر سے مطالعہ کریں، تو ہمیں نظر آئے گا کہ قرآن دین کے ایک شعبہ اور نبوت کے ایک اہم رکن کی طرف خصوصیت سے توجہ دلاتا ہے اور اس کو ”تزکیہ“ سے تعبیر کرتا ہے اور ان چار ارکان میں اس کو شامل کرتا ہے، جن کی تکمیل حضور ﷺ کے منصب نبوت سے متعلق اور مقاصد بعثت میں شامل تھی۔

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

وَأَنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ﴾

”وہی ہے جس نے اٹھایا امیوں میں ایک رسول انہیں میں سے، پڑھ کر سناتا ہے ان کو اس کی آیتیں اور ان کو سنوارتا ہے، اور سکھلاتا ہے، کتاب اور دانائی اور اس سے پہلے وہ پڑے ہوئے تھے صریح بھول میں۔“ (سورہ جمعہ: ۲)

تزکیہ سے مراد یہ ہے کہ انسانی نفوس کو اعلیٰ اخلاق سے آراستہ اور رذائل سے پاک و صاف کیا جائے، مختصر الفاظ میں تزکیہ کی وہ شکل جس کے شاندار نمونے اور مثالیں ہم کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی میں نظر آتی ہیں اور ان کے



اخلاص اور اخلاق کی آئینہ دار ہیں، وہ تزکیہ جس کے نتیجے میں ایسا صالح پاکیزہ اور مثالی معاشرہ وجود میں آیا، جس کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ عاجز ہے اور ایسی معدلت شعرا اور حق پرست حکومت قائم ہوئی، جس کی مثال روئے زمین پر کہیں اور نہ مل سکی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ زبان نبوت اسلام و ایمان کے ساتھ ایک خاص درجہ اور مرتبہ کا ذکر کرتی ہے اور اس کو احسان سے تعبیر کرتی ہے، جس سے مراد یقین و استحضار کی وہ کیفیت ہے جس کے لئے ہر صاحب ایمان کو کوشاں ہونا چاہئے اور جس کا شوق ہر مرد مومن کے دل میں موجزن ہونا چاہئے، رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ احسان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا ”تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو، اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تم کو دیکھ رہا۔“ (بخاری و مسلم)

جب ہم شریعت اسلامی اور رسول اللہ ﷺ کے اقوال و احوال پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو حصوں پر منقسم تھے، ایک کا تعلق افعال و حرکات اور امور محسوسہ سے تھا مثلاً قیام و قعود، رکوع و سجود، تلاوت و تسبیح، اذکار و ادعیہ، احکام و مناسک، فن حدیث نے اس کی روایت اور تدوین کی خدمت انجام دی، علم فقہ نے اس سے مسائل و جزئیات استخراج کرنے کا بیڑا اٹھایا اور محدثین اور فقہاء امت نے (اللہ تعالیٰ ان کو اس کا عظیم کا بہترین صلہ عطا فرمائے) دین کو اس طرح محفوظ کر دیا کہ امت کے لئے اس پر عمل پیرا ہونا آسان ہو گیا۔

دوسری قسم وہ ہے، جس کا تعلق ان باطنی کیفیات سے ہے جو ان افعال و حرکات کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں اور جو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں قیام و قعود رکوع و سجود، ذکر و دعاء و غلط و نصیحت، گھر کے ماحول، میدان جہاد غرض ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہیں، ان کیفیات کی تعبیر ہم اخلاص و احتساب، صبر و توکل، زہد و استغناء، ایثار و سخاوت، ادب و حیاء خشوع و خضوع، انابت و تضرع، دعاء کے وقت دل شکستگی، دنیا پر آخرت کو ترجیح، رضائے الہی اور دیدار کا شوق اور اس طرح کی اور دوسری باطنی کیفیات اور ایمانی اخلاق سے کر سکتے ہیں، جن کی حیثیت جسم انسانی میں روح کی اور ظاہر میں باطن کی ہے، پھر ان عنوانات کے تحت اور بہت سی جزئیات اور آداب و احکام ہیں، جنہوں نے اس کو ایک مستقل علم اور علیحدہ فقہ کا درجہ دے دیا ہے، چنانچہ اگر اس علم کو جو اول الذکر کی شرح و تفسیر سے متعلق ہے، فقہ ظاہر کہا جاسکتا ہے، تو وہ علم جو ان کیفیات کی تشریح کرتا اور ان کے حصول کے لئے رہنمائی کرتا ہے ”فقہ باطن“ قرار دیا جاسکتا ہے۔

زیادہ مناسب تو یہ تھا کہ ہم اس علم کو جس کا کام تزکیہ نفوس اور تہذیب اخلاق ہے اور جو نفس انسانی کو فضائل

شرعیہ سے آراستہ اور نفسانی و اخلاقی رذائل سے پاک و صاف کرتا ہے اور کمال ایمان و درجہ احسان، اخلاق نبوی کی پیروی روحانی و باطنی کیفیات میں رسول اللہ ﷺ کی اتباع و تقلید کی دعوت دیتا ہے ”تزکیہ“ یا ”احسان“ ہی کے نام سے یاد کرتے یا کم از کم فقہ باطن ہی کہتے، اگر ایسا ہوتا تو شاید اختلاف و نزاع کی نوبت ہی نہ آتی اور سارا جھگڑا ختم ہو جاتا اور دونوں فریق جن کو محض اصطلاح نے ایک دوسرے سے برسر نزاع کر رکھا ہے، مصالحت پر آمادہ ہو جاتے۔ احسان اور فقہ باطن سب علمی و شرعی حقائق اور دین کے مسلمہ اصول ہیں، جو کتاب و سنت سے ثابت ہیں، اگر اہل تصوف اس مقصد کے حصول کے لئے (جس کو ہم تزکیہ و احسان سے تعبیر کرتے ہیں) کسی خاص اور متعین راستے یا شکل پر اصرار نہ کرتے (اس لئے کہ زمان و مکان اور نسلوں کے مزاج ماحول کے ساتھ اصلاح و تربیت کے طریقے اور ان کے نصاب بھی بدلتے رہتے ہیں) اور وسیلہ کے بجائے مقصد پر زور دیتے تو اس مسئلہ میں آج سب یک زبان ہوتے اور اختلاف کا سرے سے رشتہ ہی باقی نہ رہتا، سب دین کے اس شعبہ اور اسلام کے اس رکن کا جس کو ہم تزکیہ یا احسان یا فقہ باطن کہتے ہیں، صاف اقرار کرتے اور اس بات کو بلا تاویل قبول کرتے کہ وہ شریعت کی روح دین کا لب لباب اور زندگی کی بنیادی ضرورت ہے اور یہ کہ جب تک اس شعبہ کی طرف کما حقہ توجہ نہ کی جائے، اس وقت تک کمال دین حاصل نہیں ہو سکتا اور اجتماعی زندگی کی بھی اصلاح نہیں ہو سکتی اور نہ صحیح معنی میں زندگی کا لطف آ سکتا ہے۔

اس صورت حال سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اس اصطلاح ”تصوف“ نے دین کی کتنی عظیم، کتنی روشن اور کتنی اہم حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے اور بہت سے لوگوں کی راہ میں اس حقیقت کے حصول میں مانع بن گیا ہے، بلکہ بہت سے لوگ تو ہمت ہی ہار بیٹھے اور اس کا خیال ہی ترک کر دیا، لیکن اس کی بہت سے وجوہ اور تاریخی اسباب ہیں، جن کا ذکر اس موقع پر کرنا مشکل ہے، بہر حال واقعات ہمیشہ انسان کی خواہش کے تابع نہیں ہوتے، اب ہم کو فراخ دلی کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہئے اور قیود و اصطلاحات اور خواہشات اور تعصبات سے آزاد ہو کر سوچنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ ہم ایک دینی حقیقت سے (جو شریعت کے مسلمات میں سے ہے اور کتاب و سنت اس کی دعوت دیتی ہے اور انسانی معاشرہ کو بھی اس کی شدید احتیاج ہے) محض ایک نئی اصطلاح اور ایک مروج نام کی وجہ سے گریز کرنے لگیں۔

اس کے علاوہ دوسری چیز جس نے اس دینی حقیقت کو اور زیادہ غبار آلود کر دیا، وہ پیشہ ور اور جاہ طلب ”حقیقت فروش“ اور الحاد شعار اور فاسد عقیدہ نام نہاد صوفی ہیں، جنہوں نے دین میں تحریف کرنے، مسلمانوں



کو گمراہ کرنے، معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، آزادی و بے قیدی کی تبلیغ کرنے کے لئے تصوف کو آلہ کار بنایا اور اس کے محافظ اور علمبردار بن کر لوگوں کے سامنے آئے، نتیجہ یہ ہوا کہ اہل غیرت اور اہل حمیت مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان سے بدظن ہو گئی، کچھ غیر محقق صوفی ایسے تھے جو اس شعبہ کی روح اور اس کے حقیقی مقاصد سے نا آشنا تھے، وہ مقصد اور وسیلہ میں تمیز نہ کر سکے، بعض اوقات انہوں نے وسائل پر تو بہت اصرار کیا اور مقاصد کو نظر انداز کر دیا اور اس شعبہ یا اس فن میں ایسی چیزیں داخل کیں، جن کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس کو فن کی روح اور فن کا کمال قرار دیا بلکہ مقصود و مطلوب سمجھ بیٹھے، غرض کہ اس طرح انہوں نے مسئلہ کو اور پیچیدہ بنا دیا اور نزاع کو مختصر کرنے کے بجائے اور طول دے دیا، انہوں نے ان چیزوں کو جن کا مکلف ہر مسلمان ہے اور جو دین کی روح اور زندگی کی ضرورت ہیں، معمرہ فلسفہ اور رہبانیت بنا کر پیش کیا، جن کی ہمت صرف وہی شخص کر سکتا تھا، جو ترک دنیا اور مادی اسباب سے کنارہ کشی کا فیصلہ کر چکا ہو اور دنیا کی ساری نعمتوں سے دستبردار ہونا چاہتا ہو، ظاہر ہے کہ ایسے لوگ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں بہت کم ہیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ یہ نہ دین کا مطالبہ تھا، نہ رسول کی سنت نہ تخلیق انسانی کی حکمت۔

اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ہر دور اور ہر ملک میں ایسے لوگ بھی پیدا کئے جو دین کو مبالغہ کرنے والوں کی تحریف، باطل پرستوں کی غلط بیانیوں اور جاہلوں کی تاویلات سے پاک و صاف اور عجبت اور فلسفہ سے محفوظ کرتے رہے، بغیر کسی تاویل یا تحریف کے خالص تزکیہ کی دعوت دیتے رہے، جس کا نام احسان اور فقہ باطن ہے، انہوں نے ہر زمانہ میں اس ”طب نبوی“ کی تجدید کا فرض انجام دیا، وہ امت اسلامیہ میں نئی روح اور نیا ایمان پیدا کرتے رہے، بندوں کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاشرہ کا تعلق اخلاق کے ساتھ، علماء کا تعلق للہیت اور اخلاص کے ساتھ استوار کرتے رہے ایک طرف وہ عوام میں خواہش نفس، دنیا پرستی اور مال و اولاد کے فتنہ کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کرتے رہے، دوسری طرف انہوں نے خواص میں وہ ایمان و یقین اور روحانی قوت پیدا کی جس نے بادشاہوں کے انعامات اور تازیانے دونوں کا مقابلہ کیا اور ان کے وعدوں اور ان کی تعزیروں کا مقابلہ کرنے، جابر بادشاہوں اور حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق کہنے، امراء اور بادشاہوں کا احتساب کرنے اور مادی مظاہر کی بے وقعتی اور کفاف پر قناعت کی طاقت و صلاحیت پیدا کرتے رہے۔

ہر زمانہ میں ایسی طاقت ور شخصیتوں اور جامع کمالات داعیوں کی ضرورت رہی ہے جو مسلمانوں میں تلاوت آیات، تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس کا کام کریں۔

وہ انقطاع نبوت کے بعد رسول اللہ ﷺ کی نیابت کا فرض انجام دیں اور امت اسلامیہ کا رشتہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جوڑیں اور اس میثاق و عہد کی تجدید کریں جو کلمہ اور ایمان کے ذریعہ ہر مسلمان نے کیا ہے اور اطاعت و فرمانبرداری، نفس اور شیطان کی مخالفت، اپنے معاملات میں خدا اور رسول کی عدالت سے فیصلہ کرانے، طاغوت کے انکار اور اللہ کی راہ میں مجاہدہ اور اس عہد کی تجدید کو اپنا شعار بنائیں جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کیا تھا۔ (تزکیہ و احسان)

تزکیہ یا تصوف کی ضرورت و اہمیت پر زور دیتے ہوئے اس مضمون کے آخر میں فرماتے ہیں کہ ذرا ان ملکوں کی طرف نظر ڈالئے جہاں دعوت الی اللہ، روحانیت اور سچی خدا پرستی اور تزکیہ نفس کا کام عرصہ سے بند ہے، اور ایسے داعی اور علماء کی تعداد (جو انسانوں کا رشتہ خدائے تعالیٰ سے استوار کریں اور ان کی اصلاح باطن کی طرف متوجہ ہوں) مغربی تہذیب کے اثر یا مغرب کے قرب یا اور دوسرے اسباب کی بناء پر بہت کم ہو گئی ہے، وہاں آپ ایک ایسا خلا پائیں گے، ایک مہیب اور طویل خلا، جس کو نہ وسعت علم اور تبحر علمی سے پُر کیا جاسکتا ہے، نہ ذہانت اور عالی دماغی سے، نہ ادب عالیہ سے، نہ عربی زبان و ادب سے گہرے ربط اور نسبی تعلق سے، نہ آزادی و حریت سے یہ ایک ایسا روحانی و اخلاقی مسئلہ ہے جس کا کوئی حل نہیں۔ اعلیٰ طبقہ کے لوگ اور عوام تیز اور ہمہ گیر مادیت، دولت کی اندھی محبت اور دوسرے اجتماعی اور اخلاقی امراض کا شکار ہیں، تعلیم یافتہ اور ذہین لوگ، (مذہبی تعلیم و ثقافت ہو یا مادی) عہدہ و منصب، حسد اور بخل، تکبر اور انانیت، شہرت کی خواہش، نفاق اور مداہنت، مادہ اور طاقت سے مرعوبیت، جیسے باطنی امراض میں گرفتار ہیں، جہاں تک اجتماعی و سیاسی تحریکات کا سوال ہے، ان کو خود غرضی، تربیت کے فقدان اور لیڈروں کی کمزوری نے خراب کر دیا ہے، رہ گئے ادارے تو ان کو اختلافات، احساس ذمہ داری کی کمی، دنیا طلبی اور تنخواہوں میں اضافہ کے عشق نے بیکار کر دیا ہے اور وہ صرف اسی کام کے ہو کر رہ گئے ہیں۔

جہاں تک علماء کا تعلق ہے ان کے وقار اور عزت کو مظاہر پرستی اور ظاہر داری، فقر سے ضرورت سے زائد اور بیجا خوف، آرام طلبی اور عیش پسندی نے بگاڑ دیا اور ان سب چیزوں کا علاج اس تزکیہ نبوی کے علاوہ جس کا ذکر قرآن میں ہے اور جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد ہے اور اس ”ربانیت“ میں جو علماء سے مطلوب ہے اور کہیں نہیں ﴿وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ﴾ میں تزکیہ کی کسی خاص لگی بندھی اور متعین شکل پر زور نہیں دیتا، جس کا رواج عام ہوا اور جس کا نام آخری دور میں تصوف پڑا، نہ میں تصوف کے حاملین میں سے سب کو ہر طرح کی غلط روی و غلط فہمی سے برا سمجھتا ہوں! اور نہ ان کو معصوم قرار دیتا ہوں، لیکن یہ

ضروری ہے کہ اس خلا کو جو ہماری زندگی اور ہمارے معاشرہ میں واقع ہو گیا ہے، جلد پر کیا جائے اور تزکیہ و احسان اور فتنہ باطن کو پھر سے تازہ کیا جائے، جس طرح ہمارے اسلاف نے اس کو اپنے اپنے زمانہ میں تازہ کیا تھا اور یہ سب منہاج نبوت اور کتاب اور سنت کی روشنی میں ہو، بہر حال ہر دور میں اور ہر جگہ جہاں مسلمان بستے ہوں، یہ کام ضروری ہے، اس لئے کہ حقیقت میں یہ خلا ایک عظیم ہے اور ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کے اثرات اور نتائج بہت دور رس ہیں۔ اپنے اپنے دور میں اس ذمہ داری کو ادا کرنے والوں اور اس خدمت کے انجام دینے والوں پر تنقید کرنے والوں سے ایک عربی شاعر کی زبان میں کہنا چاہتا ہوں۔

اقلوا علیہم لا ابا لأبیکم

من اللوم أو سئوا المكان الذی سئوا

ان اللہ کے بندوں پر ملامت بہت ہو چکی، مسئلہ یہ ہے کہ کیا ان کی جگہ لینے والا اور درد کا مداوا کر نیوالا کوئی ہے (تزکیہ و احسان: ج ۱۳ تا ۲۵۔ تزکیہ و احسان یا تصوف سلوک مجلس نشریات اسلام ۱/ کے ناظم آباد نمبر انزاد برف خانہ کراچی نمبر ۱۸)

### تصوف اور حق پرست!

جن لوگوں کی فطرت مسخ نہ ہوئی ہو اور وہ حق کے متلاشی ہوں انہوں نے جب بھی دین کے اس شعبے کا غور و فکر سے مطالعہ کیا تو وہ نہ صرف اس کے قائل ہوئے بلکہ انہوں نے اس کو اپنایا اور اختیار کیا اس سلسلہ میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی داستان اور بیان کو پڑھ لیجئے۔ وہ اپنی داستان یوں لکھتے ہیں۔

### تصوف پر ابتدائی غور اور تجربہ!

۱۳۶۱ھ کے اواخر یا ۱۳۶۲ھ کے اوائل میں بعض ایسے حالات سے میں دوچار ہوا کہ چند دن کسی ایسی جگہ رہنے کی میں نے ضرورت محسوس کی، جہاں دل و دماغ افکار و کمروہات سے محفوظ رہیں اور قلب کو کچھ سکون و اطمینان حاصل ہو۔ اس مقصد کے لئے میری نظر انتخاب اس زمانے کے ایک صاحب ارشاد بزرگ کی خانقاہ پر پڑی جو آبادی اور آبادیوں کے شور و شغب سے الگ تھلگ جنگل میں واقع ہے۔ اور منظر بھی سرسبز و شاداب ہے۔ بہر حال میں وہاں پہنچ گیا۔

غالباً پہلا ہی دن تھا، مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر وہ محترم بزرگ خانقاہ کے صحن میں ایک پلنگ پر تشریف

فرماتا تھا، ازراہ شفقت و کرم مجھے بھی اپنے ساتھ ہی بٹھالیا تھا۔ یاد آتا ہے کوئی تیسرا شخص اُس وقت وہاں نہیں تھا۔ قریب ہی خانقاہ کی سہ دری میں چند ذکر ”لفی اثبات“ کا اور بعض اُن میں سے ”اسم ذات“ کا ذکر کر رہے تھے۔ یہ سب اچھے خاصے جہر کے ساتھ ذکر کرتے تھے اور مشائخ سلوک کے تجویز کئے ہوئے خاص طریقوں سے قلب پر ضرب لگاتے تھے۔ اللہ کے ذکر میں جہر و ضرب کا یہ طریقہ اُس وقت میرے لئے صرف نامانوس ہی نہ تھا بلکہ کسی درجہ میں گویا ناقابل برداشت تھا، چنانچہ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ادب و احترام کے ساتھ عرض کیا:

”حضرت! ساری عمر دین کے بارے میں جو کچھ پڑھا ہے اور کتابوں میں دیکھا ہے اُس سے یہ سمجھا ہوا ہے کہ اصل دین صرف وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے اور جس کی تعلیم آپ ﷺ نے صحابہ کرام ﷺ کو دی اور پھر صحابہ کرام ﷺ سے بعد والوں نے سیکھا اور صحیح نقل و روایت کے ذریعے جو اُن سے ہم تک پہنچا۔ اور یہ حضرات ذکرین جس طرح جہری اور ضربی ذکر کر رہے ہیں، جہاں تک اپنا علم ہے، نہ تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام ﷺ کو یہ تعلیم فرمایا تھا۔ نہ صحابہ کرام ﷺ نے تابعین سے اس طریقے پر ذکر کرایا اور نہ تابعین نے اپنے بعد والوں کو یہی یہ طریقہ بتلایا تھا۔ اس لئے ذکر کے اس طریقے کے بارے میں مجھے خلجان ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اگر میرا یہ خلجان کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہے تو اس کی تصحیح ہو جائے۔“

اُن بزرگ نے توقع کے خلاف میرے اس سوال کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے ایک عجیب انداز میں فرمایا:

”مولوی صاحب! یہ بے چارے جو یہاں میرے پاس آتے ہیں، یہ کسی اور کام کے نہیں ہوتے۔ بس اسی کام کے ہوتے ہیں اور اسی کے واسطے آتے ہیں، اس لئے میں اُن کو یہ ہی بتلا دیتا ہوں، آپ جو کام کرتے ہیں (یعنی تقریر و تحریر سے دین کی خدمت) یہ بہت بڑا کام ہے۔ آپ تو یہی کرتے رہیں اور اس چکر میں نہ پڑیں۔“

ظاہر ہے کہ یہ میرے سوال کا جواب نہ تھا۔ لیکن اُن بزرگ نے مری بات کے جواب میں اتنا ہی فرمایا اور مجھے کچھ اور عرض کرنے اور اپنے اصل سوال کی طرف مکرر توجہ دلانے کی مہلت دیئے بغیر ہندوستانی مسلمانوں کے بعض اجتماعی مسائل اور اُن کے مستقبل پر گفتگو کا ایک نیا سلسلہ شروع فرما دیا جو میرے لئے بھی دلچسپ تھا۔ اُن کا یہ رویہ دیکھ کر پھر سے اپنے سوال کو اٹھانا میں نے بھی مناسب نہ سمجھا اور عشاء کے قریب یہ مجلس ختم ہو گئی۔

اگلے دن مغرب کے بعد پھر یہی ہوا کہ ذکرین نے اسی دھن کے ساتھ اپنا اپنا ذکر شروع کیا۔ مجھ سے پھر نہ رہا گیا اور میں نے کل کا اپنا سوال پھر یاد دلایا۔ لیکن آج بھی اُن بزرگ نے وہی کل والا رویہ اختیار فرمایا کہ میری بات کو بالکل نظر انداز فرما کر ہندوستانی مسلمانوں کی غالباً ماضی اور حال کی مختلف تحریکوں پر گفتگو کا ایک لمبا سلسلہ

شروع فرمادیا اور میرا سوال پھر رہ گیا۔ اُن بزرگ کے اس رویہ سے الحمد للہ میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوا کہ چونکہ میرے سوال کا کوئی جواب ان کے پاس ہے نہیں، اس لئے یہ اس سے پہلو تہی کر رہے ہیں، بلکہ مجھے یہ خیال ہوا کہ غالباً میرے سوال کو ایک اہل اور طالب صادق کا سوال نہیں سمجھا گیا ہے۔ بلکہ ایک مبتلائے زعم و کبر کا اعتراض سمجھ کر اس کو اس طرح نظر انداز فرمایا جا رہا ہے۔

بامدعی مگوئید اسرارِ عشق و مستی

بگذرید تا بمیر در رنج خود پرستی

اور اس میں شبہ نہیں کہ اُس وقت اس سوال سے اپنی تشفی (جہاں تک اب یاد ہے) مقصود بھی نہ تھی، بلکہ نیت

کچھ اور ہی تھی۔

خانقاہ کے جس حجرے میں میرے سونے کا انتظام تھا، نمازِ عشاء وغیرہ سے فارغ ہو کر میں اُس میں جا کر لیٹ گیا اور تصوف کے اس قسم کے اعمال و اشغال پر بطور خود ہی غور کرنے لگا۔ اس غور و فکر میں خود ہی سائل تھا اور خود ہی مجیب۔ یاد آتا ہے کہ اس ذہنی بحث مباحثہ میں دیر تک نیند نہیں آئی۔ میں چاہتا تھا کہ ذہن اس مسئلہ میں بالکل یکسو ہو جائے، اگر میرے سوچنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے تو اُس کی تصحیح ہو جائے اور اگر میں ٹھیک طور پر سمجھ رہا ہوں تو پھر اس بارے میں مجھے ایسا یقین و اطمینان حاصل ہو جائے کہ میں پوری قوت سے ان چیزوں کا روز انکار کروں اور ان باتوں کے باطل ہونے پر ایک سچے حق پرست کی طرح اصرار کروں۔

اسی غور و خوض میں دیر کے بعد میرا ذہن ایک دفعہ اس طرف منتقل ہوا کہ تصوف کے ان خاص اعمال و اشغال کو (مثلاً ذکر و مراقبہ کے ان مخصوص طریقوں کو جو مشائخ کے تجویز کئے ہوئے ہیں اپنی قیود کے ساتھ سنت سے ثابت نہیں ہیں) میرا بدعت اور نادرست سمجھنا اگر صحیح ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسماعیل شہید اور ان سے بھی پہلے ان جیسے بہت سے حضرات کو مجدد یا مصلح نہیں، بلکہ بدعات کا حامی اور بدعات کا رواج دینے والا ماننا پڑے گا۔ کیونکہ ان حضرات نے صرف اتنا ہی نہیں کہ کسی مصلحت یا وقت کے تقاضے سے ان چیزوں کے بارے میں تسامح اور تساہل ہی برتا ہو، بلکہ ان کی تعلیم سے اُن کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور ساری عمر اپنے پاس آنے والے طالبین کو انہوں نے ان ہی طریقوں سے ذکر و شغل کرا کے ان کا سلوک طے کرایا ہے، بلکہ ان حضرات میں سے اکثر کی

۱۔ صوفیوں کو ان کے ایک بڑے اُستاد (حاف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ) کا مشورہ بھی یہی ہے۔  
زندگی میں جس قدر یہ پہلو نمایاں ہے اُن کی کتابوں کے پڑھنے والے اور حالات کے جاننے والے جانتے ہیں کہ  
غالباً کوئی دوسرا پہلو اتنا نمایاں نہیں ہے۔

ذہن کے اس طرف منتقل ہونے کے بعد دل نے یہ فیصلہ تو جلد ہی کر لیا کہ مجھ جیسے کم فہم اور ناقص العلم کا کسی  
مسئلہ کے سمجھنے میں غلطی کرنا زیادہ ممکن اور زیادہ قرین قیاس ہے، بہ نسبت اس کے کہ امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ  
اللہ علیہ اور حضرت شاہ ولی اللہ و شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر علم و دین کی طرف غلطی کو منسوب کیا جائے۔  
اور وہ بھی ایک ایسے فن سے متعلق مسئلہ میں جس کے ساتھ ہمارا تعلق تو صرف نظری ہے اور ان حضرات کا عمر بھر اس  
کے ساتھ گہرا عملی تعلق رہا ہے۔

دل نے اپنے خلاف یہ فیصلہ جلدی اور آسانی سے اس لئے کر لیا کہ ان حضرات کی تصانیف کے مطالعہ اور ان  
کے شخصی حالات اور اصلاحی و تجدیدی خدمات سے کچھ واقفیت کی وجہ سے ان کے رسوخ فی العلم، تفقہ فی الدین اور  
عند اللہ مقبولیت کا میں پہلے ہی سے پوری طرح قائل تھا اور میرا دل کسی طرح یہ قبول نہیں کر سکتا کہ یہ سب حضرات  
(اپنے اپنے زمانہ میں اسرار دین کے عارف اور اُمت کے مجدد ہونے کے باوجود) چند بدعتوں کو قرب خداوندی  
کا ذریعہ سمجھ کر خود بھی ساری عمر اُن میں مبتلا رہے اور اللہ کے ہزاروں بندوں کو بھی ان میں مبتلا کرتے رہے۔ بے  
شک مجدد نبی کی طرح معصوم اور صاحب وحی تو نہیں ہوتا۔ لیکن وہ بدعات کا داعی اور مروج بھی نہیں ہو سکتا۔ خاص  
کر دین کے جس شعبہ میں اس کو دوسرے سب شعبوں سے زیادہ اہمیت ہو اور وہ اس کا خاص داعی ہو اور اسی کے  
ذریعہ اصلاح و تجدید کا کام کر رہا ہو۔ اس میں اگر وہ بدعت وغیرہ میں امتیاز نہ کر سکے گا تو یقیناً وہ اصلاح سے زیادہ  
فساد کا اور ہدایت سے زیادہ ضلالت کا باعث ہوگا۔ بہر حال یہ چند خیالی نکتے تھے جن پر پہنچ کر میرے ذہن کی  
الچھن کچھ کم ہوئی اور میں نے مان لیا کہ غالباً مجھ سے ہی اس مسئلہ کے سمجھنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے اب مجھے اپنی  
غلطی ہی کو پکڑنے اور پالینے کی کوشش کرنا چاہئے۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر میں نے اس غور و فکر  
کا سلسلہ اس وقت ختم کر کے سو جانے کا ارادہ کر لیا اور سو گیا۔

جن بزرگ کی خانقاہ کا یہ قصہ ہے اُن کا معمول ہے کہ روزانہ نماز فجر کے بعد چند میل ٹہلتے ہیں۔ اُس دن یہ  
عاجز بھی ساتھ ہولیا اور رات کے اپنے ذہنی بحث و مباحثہ اور اُس کے نتیجہ کا ذکر کیا اور عرض کیا:  
”میرے دل و دماغ نے یہ تو مان لیا ہے کہ تصوف کے ان اعمال و اشغال کے بارے میں جواب تک میں

نے سمجھا ہے غالباً وہ صحیح نہیں ہے اور اس میں کوئی غلط فہمی مجھے ہو رہی ہے، لیکن ابھی تک میں اُس غلطی کو پکڑ نہیں سکا ہوں، چونکہ طبیعت طالب علمانہ پائی ہے اس لئے چاہتا ہوں کہ یہ گرہ بھی کھل جائے اور جو خلش باقی ہے وہ بھی نکل جائے۔“

موصوف میری یہ بات سن کر مسکرائے اور فرمایا:

”مولوی صاحب! آپ کو یہی تو شبہ ہے کہ یہ چیزیں بدعت ہیں؟ یہ بتلائیے کہ بدعت کی تعریف کیا ہے؟“  
میں نے عرض کیا: ”بدعت کی تعریف تو علماء کرام نے کئی طرح سے کی ہے، لیکن جو زیادہ منطقی اور محقق معلوم ہوتی ہے وہ یہی سیدھی سی تعریف ہے کہ دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ جس کے لئے شریعت میں کوئی دلیل نہ ہو۔“  
فرمایا: ”ہاں ٹھیک ہے، لیکن یہ بتلائیے کہ اگر دین میں کوئی چیز مقصود اور مامور بہ ہو اور اللہ و رسول نے اس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہو، لیکن کسی وقت زمانہ کے حالات بدل جانے سے وہ اُس طریقے سے حاصل نہ کی جاسکتی ہو، جس طریقے سے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں حاصل ہو جایا کرتی تھی، بلکہ اُس کے واسطے کوئی اور طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کیا اس نئے طریقے کے استعمال کو بھی آپ ”دین میں اضافہ“ اور ”بدعت“ کہیں گے؟ (پھر اپنے بمقصد کو اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا) مثلاً دین سیکھنا سکھانا ضروری ہے۔ اور دین میں اس کا نہایت ہی تاکید حکم ہے اور آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں اس کے لئے صرف صحبت کافی ہو جاتی تھی، تعلیم کے لئے کوئی مستقل انتظام نہیں تھا۔ نہ مدرسے تھے، نہ کتابیں تھیں، لیکن بعد میں حالات ایسے ہو گئے کہ صحبت اس مقصد کے لئے کافی نہیں رہی، بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی بھی ضرورت پڑ گئی، تو اللہ تعالیٰ کے بندوں نے کتابیں لکھیں اور مدرسے قائم کئے اور اس کے بعد سے دین کی تعلیم و تعلم کا سارا سلسلہ اسی سے چلا اور اب تک اسی سے قائم ہے۔ تو کیا تعلیم و تعلم کے طریقے اس تبدیلی کو بھی ”دین میں اضافہ“ اور بدعت کہا جائے گا؟

میں نے عرض کیا:

”نہیں!“ دین میں اضافہ“ جب ہوتا ہے، جبکہ مقصود اور امر شرعی بنا کر کیا جائے۔ لیکن اگر کسی دینی مقصد کے حاصل کرنے کے لئے قدیمی طریقے کے ناکافی ہو جانے کی وجہ سے کوئی نیا جائز طریقہ اختیار کر لیا جائے تو اس کو ”دین میں اضافہ“ نہیں کہا جائے گا اور نہ وہ بدعت ہوگا۔“

فرمایا: ”بس سلوک کے جن اعمال و اشغال پر آپ کو بدعت ہونے کا شبہ ہے، اُن سب کی نوعیت بھی یہی



ہے، ان میں سے کوئی چیز بھی مقصد سمجھ کر نہیں کی جاتی، بلکہ یہ سب نفس کے تزکیہ اور تخلیہ کے لئے کرایا جاتا ہے، جو دین میں مقصود اور مامور بہ ہے۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ہر وقت اُس کا اور اُس کی رضا کا دھیان، فکر رہنا اور اس کی طرف سے کسی وقت بھی غافل نہ ہونا، یہ کیفیتیں دین میں مطلوب ہیں اور قرآن وحدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بغیر ایمان اور اسلام کامل ہی نہیں ہوتا۔ (کتاب وسنت کی جن نصوص سے یہ بات معلوم ہوتی ہے اُن میں سے چند آئندہ اوراق میں ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں گے۔) لیکن رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دین کے لئے تعلیم و تربیت کی طرح یہ ایمانی کیفیتیں بھی آپ کی صحبت ہی سے حاصل ہو جاتی تھیں اور حضور ﷺ کے فیضانِ صحبت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبتوں میں بھی یہ تاثیر تھی۔ لیکن بعد میں ماحول کے زیادہ بگڑ جانے اور استعدادوں کے ناقص ہو جانے کی وجہ سے اس مقصد کے لئے کاملین کی صحبت بھی کافی نہیں رہی، تو دین، کے اس شعبہ کے اماموں نے ان کیفیات، کے حاصل کرنے کے لئے صحبت کے ساتھ ”ذکر و فکر کی کثرت“ کا اضافہ کیا اور تجربہ سے یہ تجویز صحیح ثابت ہوئی۔

اسی طرح بعض مشائخ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے احوال کا تجربہ کر کے اُن کے نفس کو توڑنے اور شہوات کو مغلوب کرنے اور طبیعت میں لہیت پیدا کرنے کے لئے اُن کے واسطے خاص خاص قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کئے۔ اسی طرح ذکر کی تاثیر بڑھانے کے لئے اور طبیعت میں رقت اور یکسوئی پیدا کرنے کے لئے ضرب کا طریقہ نکالا ہے، تو اُن میں سے کسی چیز کو بھی مقصود اور مامور بہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ سب کچھ علاج اور تدبیر کے طور پر کیا جاتا ہے اور اسی لئے مقصد حاصل ہو جانے کے بعد یہ سب چیزیں چھڑادی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ائمہ طریق اپنے اپنے زمانے کے حالات اور اپنے تجربوں کے مطابق ان چیزوں میں رد و بدل اور کمی بیشی بھی کرتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے رہتے ہیں، بلکہ ایک ہی شیخ کبھی کبھی مختلف طالبوں کے لئے ان کے خاص حالات اور ان کی استعداد کے مطابق الگ الگ اعمال اور اشغال تجویز کر دیتا ہے اور بعض ایسی اعلیٰ استعداد والے بھی ہوتے ہیں جنہیں اس طرح کوئی ذکر شغل کرانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ ان کو یوں ہی نصیب فرما دیتا ہے۔ اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان سب چیزوں کو صرف علاج اور تدبیر کے طور پر ضرورتاً کیا اور کرایا جاتا ہے۔

ان بزرگ کی اس تقریر اور توضیح سے میرا وہ ذہنی خلجان تو دور ہو گیا لیکن ایک نئی پیاس یہ پیدا ہو گئی کہ یہ جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کو خود آزا کے دیکھا جائے اور اپنے ذاتی تجربے سے قلبی اطمینان اور مزید یقین حاصل کیا جائے۔



لیکن میرے حالات اور مشاغل میں اس کی گنجائش نہیں تھی کہ اس تجربے کے لئے میں کوئی بڑا اور مستقل وقت دے سکوں۔ اس لئے میں نے بے تکلف اور صفائی سے عرض کیا:

”اگر یہ ذکر شغل ان مقاصد کے لئے کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ یہ چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں تو پھر تو میں بھی اس کا محتاج ہوں، لیکن میں زیادہ وقت نہیں دے سکتا، کیونکہ دین کے جن دوسرے کاموں سے کچھ تعلق کر رکھا ہے۔ اُن کو بھی میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔“

فرمایا ”مولوی صاحب! تصوف دین کے کام چھڑانے کے لئے نہیں ہے بلکہ اس سے تو دین کے کاموں میں قوت آتی ہے اور جان پڑتی ہے، لیکن کیا عرض کیا جائے اللہ کی مشیت ہے، جن کو اللہ نے دین کے کاموں کے قابل بنایا ہے وہ اب ادھر توجہ ہی نہیں کرتے، حالانکہ اگر تھوڑی سی توجہ بھی وہ ادھر دے دیں تو دیکھیں کہ ان کے کاموں میں کتنی قوت آتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے باوا صاحب نے اور بعد میں حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہمارے اس ملک میں دین کی جو خدمتیں انجام دیں اور جو کچھ کر دکھایا (جن کا سوواں اور ہزاروں حصہ بھی ہماری بڑی بڑی انجمنیں اور جماعتیں نہیں کر سکتی رہی ہیں) اُس میں ان کے اخلاص اور قلب کی اُس طاقت کو خاص دخل تھا جو تصوف کے راستے سے پیدا کی گئی تھی۔ لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس طرف صرف وہی بے چارے آتے ہیں جو بس اللہ اللہ کرنے کے کام کے ہی ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں استعدادیں مختلف رکھی ہیں۔ ناقص استعداد کا آدمی اعلیٰ استعداد والوں کا کام نہیں کر سکتا۔“

پھر اسی سلسلہ میں فرمایا:

”خدا معلوم لوگ تصوف کو کیا سمجھتے ہیں، تصوف تو بس صرف اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور جو کام عشق کی طاقت سے اور اخلاص کی برکت سے ہو سکتا ہے، وہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا، تو دراصل تصوف ضروری نہیں ہے، بلکہ عشق اور اخلاص پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اگر کسی کو اس کے حاصل کرنے کا اس سے بھی آسان اور مختصر کوئی اور راستہ معلوم ہو جائے تو مبارک ہے، وہ اسی راستے سے حاصل کر لے اور ہم کو بھی بتلا دے، ہم تو اسی راستہ کو جانتے ہیں جس کا اللہ کے ہزاروں صادق بندوں نے سینکڑوں برس سے تجربہ کیا ہے، جن میں سینکڑوں وہ تھے جو دین کے اس شعبہ کے مجتہد بھی تھے اور صاحب الہام بھی تھے۔“ (دیکھئے تصوف کیا ہے؟ ص ۲۲ تا ۲۴)

آگے چل کر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ تصوف اور اس کے اعمال اور اشغال کے متعلق لکھتے

ہیں کہ:

## تصوف اور اس کے اعمال و اشغال کے متعلق میرے چند یقین!

### (۱) تصوف کا مقصد اور اُس کی حقیقت!

الحمد للہ کہ اب اس باب میں کسی طرح کا کوئی شک و شبہ نہیں رہا کہ تصوف اور اُس کے اعمال و اشغال کا اصل مقصد دین کی تکمیل اور خصوصاً ان کیفیات اور ملکات کی تحصیل کے سوا کچھ نہیں ہے جن کو کتاب و سنت ہی میں کمال ایمان و اسلام کی ضروری شرط قرار دیا گیا ہے۔ چونکہ اس بارے میں بہت سے حضرات کے ذہنوں میں الجھنیں ہیں، اس لئے جو کچھ اس سلسلہ میں، میں نے سمجھا ہے اس کو ذرا تفصیل سے عرض کرتا ہوں وباللہ التوفیق۔

قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور دین کی تکمیل کے لئے عقائد اور اعمال کی صحت کے علاوہ انسان کے قلب اور باطن میں کچھ خاص کیفیات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مثلاً محبت کے بارے میں سورہ بقرہ کی ایک آیت میں ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾

”اور جو ایمان والے ہیں ان کو سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہوتی ہے۔“ (سورہ بقرہ: ۱۶۵)

اور حدیث صحیح میں ہے۔

(ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ)

یعنی ”ایمان کی حلاوت اس کو حاصل ہوگی جس میں تین چیزیں موجود ہوں اُن میں سے اول یہ کہ اللہ و رسول ﷺ کی محبت اُس کو تمام ماسوا سے زیادہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی آدمی سے اُس کو محبت ہو تو وہ بھی اللہ ہی کے واسطے ہو اور تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد کفر کی طرف جانا اُس کے لئے اتنا ناگوار اور تکلیف دہ ہو جتنا کہ آگ میں ڈالا جانا۔“

اور سورہ انفال کے پہلے رکوع میں ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ

رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾

”سچے ایمان والے بس وہی لوگ ہیں جن کا یہ حال ہے کہ جب اُن کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جائے تو اُن کے

دلوں میں خوف کی کیفیت پیدا ہو جب اُن کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو اُن کے نورِ ایمان میں زیادتی ہو اور اپنے پروردگار پر وہ بھروسہ رکھتے ہوں۔“ (سورۃ انفال: ۲)

اور سورۃ مومنوں میں اللہ کے اچھے اور کامیاب بندوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ ۝ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ يُسْرِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ ۚ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ ۝﴾

”بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کی ہیبت سے خوفزدہ رہتے ہیں اور جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے ہیں اور وہ جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں اور نیکی کے کاموں میں اپنا مال خرچ کرتے وقت (اور اسی طرح دوسرے نیک کاموں میں) ان کے دل خائف رہتے ہیں کہ ان کو اللہ کے حضور میں لوٹ کے جانا ہے (نہ معلوم ان کے یہ عمل قبول ہوں یا نہ ہوں) وہی لوگ بھلائیوں کی طرف تیز گامی کرتے ہیں اور وہی ان کے لئے دوڑ کر بڑھنے والے ہیں۔“ (المؤمنون: ۶۱-۵۷)

اور سورۃ زمر میں اور شاد فرمایا گیا ہے:

﴿تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ ۝﴾

”اس سے ان لوگوں کے بدن کاپنے لگتے ہیں اور روئنے لگے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور پھر ان کا ظاہر و باطن نرم ہو کر اللہ کی یاد کی طرف جھک جاتا ہے۔“ (زمر: ۲۳)

اور سورۃ آل عمران میں ارشاد ہے:

﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ ۝﴾

”وہ لوگ جن کا یہ حال ہے کہ اللہ کو (ہر وقت اور ہر حالت میں) یاد کرتے اور یاد رکھتے ہیں، کھڑے بیٹھے اور بستروں پر لیٹے ہوئے بھی۔“ (آل عمران)

اور سورۃ ”مزل“ میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبْتَئِلِ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝﴾

”اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے یکسو ہو کر اسی کی طرف متوجہ رہو۔“ (مزل: ۸)

ان آیتوں میں جن اوصاف و کیفیات کو اہل ایمان کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے اور جن کا ان سے مطالبہ

کیا گیا ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہو۔

(۲) اُن کے دل کی یہ حالت ہو کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو اس میں خوف اور لرزش کی کیفیت

پیدا ہو جائے۔

(۳) اُن کے سامنے جب آیات الہی کی تلاوت کی جائے تو اُن کے نور ایمان میں اضافہ ہو۔

(۴) اللہ پر توکل اور بھروسہ رکھتے ہوں اور یہ توکل اور اعتماد علی اللہ ہی اُن کی زندگی کا سب سے بڑا

سہارا ہو۔

(۵) وہ ہر دم اللہ کی ہیبت سے خوفزدہ رہتے ہوں۔

(۶) اللہ کا خوف اُن پر اتنا غالب ہو کہ نیکی کرتے وقت بھی ان کے دل ڈرتے ہوں کہ معلوم نہیں ہماری یہ نیکی

قابل قبول بھی ہوگی یا نہیں۔

(۷) قرآن مجید کی تلاوت یا اُس کی آیتیں سننے سے اُن کے جسم کا نپ جاتے ہوں اور اُن کا ظاہر و باطن اللہ

تعالیٰ کی طرف اور اُس کی یاد کی طرف جھک جاتا ہو۔

(۸) وہ ہر وقت اور ہر حالت میں اللہ کو یاد رکھتے ہوں اور کسی حال میں بھی اس سے غافل نہ ہوتے ہوں۔

(۹) ہر طرف سے منقطع ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہونا ان کا حال ہو۔

اور قرآن مجید کے علاوہ حدیث کے مستند ذخیرہ میں بھی اس سے زیادہ صفائی اور صراحت کے ساتھ اس قسم

کے احوال و کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:

(مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ وَأَبْغَضَ لِلَّهِ وَأَعْطَى لِلَّهِ وَمَنَعَ لِلَّهِ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ)

”جس شخص کا یہ حال ہو کہ وہ اللہ ہی کے لئے محبت کرے (جس سے محبت رکھے) اور اللہ ہی کے لئے بغض

رکھے (جس سے بغض کرے) اور اللہ ہی کے لئے دے (جس کو جو کچھ بھی دے) اور کسی کو کچھ دینے سے اللہ کی

رضاہی کے لئے روکے (جس کو بھی دینے سے ہاتھ روکے) تو اُس نے اپنا ایمان کامل کر لیا۔ (مشکوٰۃ شریف)

اسی طرح مشہور حدیث جبریل میں ایمان اور اسلام کی تکمیل کا نام احسان بتلایا گیا ہے اور اس کی حقیقت یہ بیان کی

گئی ہے:

(أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ) (بخاری و مسلم) وفى رواية أَنْ تَخْشَى اللَّهَ

مَكَانَ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ )

”احسان کا مقام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اور بندگی اس طرح کرو یا اس سے ہر دم اس طرح ڈرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگرچہ تم اس کو نہیں دیکھتے ہو، پروہ تم کو (ہر جگہ اور ہر آن) دیکھتا ہے۔ (فتح الباری) پہلی حدیث میں ”اخلاص“ کا ذکر ہے اور دوسری حدیث میں ”احسان“ کا اور یہ دونوں ان ہی احوال و کیفیات میں سے ہیں جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔

دین میں ان احوال و کیفیات کی اس قدر اہمیت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے حصول اور ان میں ترقی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائیں فرماتے تھے۔ اس سلسلہ کی یہ چند دعائیں اس عاجز کے نزدیک خاص طور سے غور اور توجہ کے لائق ہیں۔

(اللَّهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِي وَأَهْلِي وَمِنْ الْمَاءِ الْبَارِدِ)

”اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ تیری محبت مجھے اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال سے اور (سخت پیاس کے وقت) ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب ہو۔“

(اللَّهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ أَحَبَّ لَأَشْيَاءِ إِلَيَّ كُلِّهَا وَخَشْيَتِكَ اخَوْفَ الْأَشْيَاءِ عِنْدِي وَاقْطَعْ عَنِّي حَاجَاتِ

الدُّنْيَا بِالشُّوْقِ إِلَى لِقَائِكَ وَإِذَا اقْرَرْتَ أَعْيُنَ أَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ دُنْيَاهُمْ فَاقْرَرْ عَيْنِي مِنْ عِبَادَتِكَ )

”اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ ہر قابل محبت چیز سے زیادہ تیری محبت مجھے محبوب ہو اور ڈرنے کی ہر چیز سے زیادہ مجھے تیرا ڈر اور خوف ہو اور ملاقات کا شوق میرے دل پر ایسا غالب کر کہ دنیا کی ساری حاجتیں مجھ سے کٹ جائیں اور جس دن دنیا والوں کو ان کی چاہتی دنیا دے کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی کرے تو میری آنکھیں اپنی عبادت سے ٹھنڈی کر اور اپنی عبادت کے ذریعہ دل میں سکون اور ٹھنڈک پیدا کر۔“

(اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي اخْشَاكَ كَأَنِّي أَرَاكَ أَبَدًا حَتَّى الْقَائِلَ . . . .)

”اے اللہ! مجھے ایسا کر دے کہ میں اس طرح تجھ سے ڈروں گویا ہر وقت تجھے دیکھ رہا ہوں۔ یہاں تک کہ

اسی حال میں تجھ سے جا ملوں۔“

(اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ إِيمَانًا يَأْشُرُ قَلْبِي وَيَقِينًا صَادِقًا حَتَّى أَعْلَمَ أَنَّهُ لَا يَصِيبُنِي إِلَّا مَا كَتَبَ لِي

وَرِضًا مِّنَ الْمَعِيشَةِ بِمَا قَسَمْتَ لِي)

”اے اللہ! میں تجھ سے وہ ایمان مانگتا ہوں جو میرے دل میں پیوست ہو جائے اور وہ سچا یقین مانگتا ہوں

جس کے بعد میرے دل کو اس بات کا یقین اور قطعی علم حاصل ہو جائے کہ مجھ پر صرف وہی حالت آسکتی ہے اور آئینگی جو تو نے میرے لئے لکھ دی ہے (یعنی یہ علم میرے دل کا حال ہو جائے) اور اس دنیا میں جس قسم کا گزارہ تو نے میرے لئے مقرر اور مقدر کر دیا ہے میں اس پر اپنے دل کی رضا تجھ سے مانگتا ہوں۔“

(اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ التَّوْفِیْقَ لِمَحَابَبِكَ مِنَ الْاَعْمَالِ وَصَدَقِ التَّوَكُّلِ عَلَیْكَ وَحَسَنَ ظَنِّ بِكَ)  
”اے اللہ جو اعمال تجھے پسند ہیں میں ان کی توفیق تجھ سے مانگتا ہوں اور سچے توکل کا تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیرے ساتھ حسن ظن کی تجھ سے ہی استدعا کرتا ہوں۔“

(اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ نَفْسًا بِكَ مَطْمَئِنَّةٌ تَوْمَنَ بِلِقَائِكَ وَتَرْضٰی لِقَضَائِكَ وَتَقْنَعُ بِعَطَائِكَ)  
”اے اللہ! میں تجھ سے ایسا نفس مانگتا ہوں جسکو تجھ ہی سے اطمینان اور انس حاصل ہو، جسے تیری ملاقات پر سچا ایمان اور یقین نصیب ہو جو تیری قضاء و قدر پر راضی ہو اور جو تیری دین (عطاء) پر قانع ہو۔“

(اللّٰهُمَّ افْتَحْ مَسَامِعَ قَلْبِیْ لِذِكْرِكَ)  
”اے اللہ! میرے دل کے کان اپنے ذکر کے لئے کھول دے۔“  
(اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ قُلُوْبًا وَّاهَةً مَّخْبِتَةً مُّثْبِتَةً فِی سَبِیْلِكَ)  
”اے اللہ! میں تجھ سے ایسے قلوب کا سوال کرتا ہوں جو درد آشنا ہوں، ٹوٹے ہوئے ہوں اور تیری طرف رجوع کرنے والے ہوں۔“

(اللّٰهُمَّ اجْعَلْ وَسَاوِسَ قَلْبِیْ خَشِیْتِكَ وَذِكْرَكَ وَاجْعَلْ هَمَّتِیْ وَهَوٰی فِیْمَا تَحِبُّ وَتَرْضٰی)  
”اے اللہ! میرے دل میں خطرے اور خیالات بھی بس تیرے خوف اور تیری یاد ہی کے آئیں اور میری تمام تر توجہ اور چاہت اُن ہی چیزوں کی طرف ہو جو تجھے محبوب ہوں اور جن سے تو راضی ہو۔“  
(اللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَّاعْطِنِیْ نُوْرًا وَّاجْعَلْنِیْ نُوْرًا)  
”اے اللہ! میرے قلب میں نور بھر دے اور مجھے نور عطا فرما دے اور مجھے سراپا نور بنا دے۔“

یہ سب دعائیں (اور اس قسم کی بیسیوں دعائیں) کتب حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہیں۔ آپ خود بھی یہ دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتے تھے اور امت کو ان دعاؤں کی تعلیم و تلقین بھی فرماتے تھے۔

ان دعاؤں میں جن چیزوں کا سوال اللہ تعالیٰ سے کیا گیا ہے، وہ سب انسان کے باطن اور قلب کی خاص کیفیات ہیں۔ مثلاً ہر چیز سے زیادہ اللہ کی محبت، ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا خوف، اللہ سے شوق ملاقات

کا ایسا غلبہ کہ دنیا کی ضروریات اور خواہشات فراموش یا فنا ہو جائیں۔ عبادت میں آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکون ملنا، اللہ تعالیٰ سے ہر دم اس طرح ڈرنا کہ گویا وہ اپنے جلال و جبروت کے ساتھ ہماری نگاہ کے سامنے ہے، یقین صادق، رضا بالقضاء، توکل علی اللہ، حسن ظن باللہ، نفس کا اللہ تعالیٰ سے مطمئن اور مانوس ہونا اور اُس کی عطا پر قانع ہونا۔ ذکر اللہ سے قلب کا اثر لینا۔ اُس کا درد آشنا اور ٹوٹا ہوا اور جھکا ہوا ہونا۔ اللہ سے قلب کا تعلق اس درجہ ہو جانا کہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کا خوف و سادس اور خطرات کی جگہ بھی لے لے اور بندہ کا جی صرف انہی چیزوں کو چاہے جو اللہ کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہیں۔ نور سے قلب کا معمور ہو جانا۔

ظاہر ہے کہ ان چیزوں کا تعلق نہ عقائد کے باب سے ہے، نہ اعمال کے باب سے بلکہ یہ سب قلبی کیفیات اور احوال ہیں اور دین میں ان کی اتنی اہمیت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے ان کا سوال کرتے ہیں۔

پس تصوف دراصل اس قسم کی چیزوں کی تحصیل کا ذریعہ ہے اور اس کے خاص اعمال و اشغال (مثلاً صحبت شیخ اور کثرت ذکر و فکر) کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ ان کیفیات کے پیدا کرنے کی تدبیریں ہیں۔ ایسی تدبیریں جن کی تصدیق تجربہ کرتا ہے اور صاف ذہن رکھنے والے لوگوں کے لئے اُن کی نفسیاتی اور عقلی توجیہ بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔ (عقلی توجیہ کے لئے ”صراطِ مستقیم“ (مرتبہ شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ) کے چند ابتدائی اور اراق کا مطالعہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ کسی درجہ میں کافی ہوگا۔)

یہاں یہ عرض کر دینا بھی غالباً ناظرین کے لئے مفید ہوگا کہ مندرجہ بالا آیات و احادیث اور دعاؤں سے جن قلبی کیفیات کا دین میں مطلوب و مقصود ہونا معلوم ہو چکا ہے۔ اُن میں سے چند کیفیات مثلاً عشق اور یقین اور قلب کی رقت اور سوز و گداز یہ تو اصل و بنیاد کا درجہ رکھتی ہیں اور باقی زیادہ تر کیفیات اُن کے نتائج اور لوازم ہیں۔ اس لئے تصوف کے ان اعمال و اشغال کے ذریعہ براہ راست صرف ان بنیادی کیفیات ہی کو قلب میں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جس کے بعد باقی چیزیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ ہے کہ وہ اصولی نظریہ جس پر تصوف کی بنیاد ہے اور جس کی بناء پر اس کو دین کا تکمیلی شعبہ بھی سمجھا جاتا ہے۔

یہ عاجز بلا کسی انکسار کے عرض کرتا ہے کہ اپنی کم ہمتی اور لا اُبالی پن اور کچھ خاص حالات کی وجہ سے چونکہ میں اس سلسلہ کے تجربہ کی طرف پوری توجہ نہیں دے سکا۔ اس لئے خود تو ان کیفیات سے خالی اور محروم ہی ہوں، لیکن جو تھوڑی سی اور برائے نام توجہ کی جاسکی اور اس راہ کے بعض اکابرین کی خدمت میں کبھی کبھی حاضری کی جو توفیق اس سلسلے میں ملتی رہی اسی سے الحمد للہ یہ یقین اور اطمینان حاصل ہو گیا کہ تصوف اور اس کے اعمال و اشغال کی غرض



و غایت اور اُن کی حقیقت کے متعلق اُن بزرگ نے جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ صحیح ہے۔

(۲) اور دل و دماغ نے یہ بھی مان لیا کہ تصوف کے ذریعہ جن قلبی کیفیات اور ملکات کی تحصیل کی کوشش کی جاتی ہے، دین کی تکمیل اور ایمانی حلاوت کا حصول ان پر موقوف ہے۔

(۳) اس کا بھی یقین حاصل ہوا کہ تصوف ایمان و اسلام کی تکمیل کے علاوہ ایک خاص قسم کی روح اور طاقت پیدا کرنے کا بھی ذریعہ ہے اور اگر صلاحیت اور طبیعت کو مناسبت ہو تو یقین اور اعتماد، ہمت و عزیمت، صبر و توکل اور ماسوی اللہ سے بے خوفی جیسے اوصاف (جو طاقت کا سرچشمہ ہیں) تصوف کے ذریعے ان کو پیدا کیا جاسکتا ہے اور اُبھارا جاسکتا ہے۔ اسی لئے تصوف کو اپنانے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا سب سے بڑا حق میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے اُن بندوں کو ہے جو بے دینی کی اس دنیا میں انبیاء علیہم السلام کے طرز اور طریقے پر کسی بڑی اصلاحی تبدیلی کے لئے مصروف جدوجہد ہیں اور مادہ پرستی کی فضا کو خدا پرستی کی فضا سے بدلنا چاہتے ہیں۔

(۴) تصوف سے دوری اور بے خبری کے دور میں میری یہ رائے تھی کہ تصوف کا قالب ہم کو بدل دینا چاہئے اور اُس کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے ایک سانچے میں اس کو ڈھال دینا چاہئے۔ لیکن بعد میں جب تصوف اور اُس کے حاملین سے کچھ قرب پیدا ہوا تو معلوم ہوا کہ صورت اور قالب میں ترمیم اور تبدیل کا عمل برابر جاری ہے اور خود ہماری اس صدی میں بھی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے اپنے تجربہ اور اجتہاد سے اس میں بہت کچھ تجدید و ترمیم کی ہے اور زمانہ حاضر کے تقاضے کے مطابق اس کو بہت مختصر اور سائنٹیفک کر دیا ہے اور اب بھی یہ راہ کھلی ہوئی ہے اور بلاشبہ سلوک میں تجدید کے اس سلسلہ کو برابر جاری رہنا چاہئے لیکن اس کا اب پورا پورا یقین ہو گیا کہ یہ کام صرف وہی حضرات کر سکتے ہیں جو اس فن کے امام اور خود اس سمندر کے شناور ہوں، ورنہ اگر اس خدمت کی ذمہ داری میرے جیسے حضرات نے لے لی جنہوں نے نہ اس شعبہ کی تکمیل کی ہے اور نہ اُس کے ساتھ اُن کا گہرا عملی تعلق رہا ہے تو اس کا بڑا امکان ہے کہ اخلاص اور ذہانت کے باوجود تصوف میں ان کی اصلاح و ترمیم اسی قسم کی ہو جیسی کسی روایتی بڑھیا نے شاہی بازی کی مرمت کی تھی۔

(۵) تصوف اور اہل تصوف سے قریب ہونے کے بعد جن چند باتوں کا یقین ہوا۔ اُن میں سے ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا ہی پڑھا لکھا اور کیسا ہی ذہین فطین ہو۔ تصوف سے صحیح واقفیت حاصل کرنے



اور اس کے مالہ و ماعلیہ کو علی وجہ البصیرت جاننے کے لئے اس کو بھی اس کی ضرورت ہے کہ تصوف کی حامل کسی شخصیت کی صحبت اور خدمت میں اس کا کچھ وقت گزرے اور اس شعبہ کا عملی تجربہ حاصل کرنے پر بھی وہ زندگی کے کچھ دن صرف کرے، اس کے بغیر تصوف کو پوری طرح سمجھا اور جانا نہیں جاسکتا۔

جن صاحب ارشاد بزرگ کی خانقاہ میں اپنی حاضری کا ذکر گزشتہ صفحات میں راقم سطور کر چکا ہے۔ ایک موقع پر میرے ہی ایک سوال کے جواب میں موصوف نے اس حقیقت کو ان لفظوں میں ادا فرمایا تھا:

”گھر کے اندر کی چیزوں کا پورا علم تو گھر میں داخل ہو کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔“

الغرض تھوڑے سے ہی تجربے سے ارباب تصوف و سلوک کے اس مشہور مقولہ کی تصدیق حاصل ہو گئی کہ ”من لم یندق لم یدر“ یعنی لذت اس سے نہ شناسی بخدا تانہ چشی۔ کچھ دن ہوئے ایک بڑے اچھے ذی علم اور ذہین صاحب قلم دوست کی ایک تحریر کے مطالعہ کا اتفاق ہوا تھا جس میں انہوں نے تصوف پر اظہار خیال کیا تھا۔ کم از کم ناچیز کو تو ایسا کچھ محسوس ہوا کہ کوئی بڑا ذہین بچہ کسی ایسے موضوع پر اظہار خیال کر رہا ہے جسکے مبادی سے بھی واقفیت حاصل کرنے کا اس کو موقع نہیں ملا ہے، مگر پھر بھی اس کی ذہانت قابل داد ہے۔

(۶) تصوف اور اُس کے بعض حلقوں کے اس چند روزہ ہی قرب و تعلق سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ جس طرح دین کے دوسرے شعبے کی طرف اچھی صلاحیتیں رکھنے والے افراد فی زمانہ بہت کم متوجہ ہوتے ہیں۔ مثلاً دیکھا جا رہا ہے کہ علم دین کے طالبوں اور علی ہذا دین کی دعوت و خدمت کی طرف توجہ کرنے والوں میں بہت بڑی تعداد آج کل اُن ہی بے چاروں کی ہوتی ہے جو صلاحیتوں کے لحاظ سے بہت ادنیٰ اور پست درجہ کے ہوتے ہیں۔ بالکل یہی، بلکہ شاید دین کے دوسرے شعبوں سے زیادہ افسوسناک اور اہتر حال اس لحاظ سے دین کے اس شعبہ (تصوف) کا بھی ہے۔ اس وقت اُن ”خانقاہوں“ سے بحث نہیں، جو دراصل دھوکہ فریب کی دکانیں ہیں اور جہاں اولیاء اللہ کے نام پر شرک و بدعت کا کاروبار ہوتا ہے اور نہ یہاں اُن نااہل موروثی سجادہ نشینوں اور پیشہ ور پیروں، صوفیوں کا ذکر ہے جو تصوف کے نام اور بزرگوں کی نسبت کی تجارت کرتے ہیں، بلکہ جو واقعی مشائخ حق اور صاحب ارشاد ہیں۔ اُن کے پاس بھی جو طالب بن کر اب آتے ہیں۔ دیکھا جاتا ہے کہ (شاذ و نادر مثالوں کو مستثنیٰ کر کے) دل و دماغ کی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ بے چارے عموماً نیچی ہی سطح کے ہوتے ہیں اور اگرچہ اپنے اخلاص اور اپنی صادق طلب اور محنت سے ان میں سے بھی بہت سے اس شعبہ کی کچھ برکتیں ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ وہ بے چارے خانقاہی فیضان و تربیت کا ایسا نمونہ تو نہیں بن سکتے ہیں جن کا حال اور

قال خانقاہیت کی بدنامی اور تصوف و روحانیت بیزاری کے اس دور میں دین کے اس شعبہ کی اہمیت اور افادیت تسلیم کرنے پر لوگوں کو مجبور کر دے۔

اصولی بات ہے کہ جو کام جتنا زیادہ بلند اور لطیف و نازک ہو اُس کے کرنے والے بھی اُسی درجہ کے ہونے چاہئیں۔ موجودہ دور میں تصوف کی ناکامی اور بدنامی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ جو اس کے اہل ہیں وہ توجہ نہیں کرتے اور جو بے چارے توجہ کرتے ہیں عموماً ان کی صلاحیتیں معمولی ہوتی ہیں لیکن دنیا اُن ہی کو پھل سمجھ کر اصل درخت کے متعلق رائے قائم کرتی ہے۔

(۷) اس موقع پر ایک چیز خود مشائخ کرام کے متعلق بھی ناظرین سے بلا تکلف عرض کرنا ضروری ہے: جس طرح دنیا میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو کامیاب وکیل ہو، وہ اچھا ڈاکٹر بھی ہو اور جو بالغ النظر فلسفی ہو وہ سیاسیات یا معاشیات کا ماہر بھی ہو اور جو ماہر فن انجینئر ہو وہ اچھا ادیب اور شاعر بھی ہو۔ بعینہ یہی حال دین کے مختلف شعبوں کا بھی ہے، بالکل ضروری نہیں ہے کہ جو شخص وسیع النظر عالم اور بلند پایہ محدث یا فقیہ ہو وہ تصوف میں بھی خاص دستگاہ رکھتا ہو یا جو صاحب قلب صوفی اور عارف ہو۔ وہ اسلامی قانون کا ماہر بھی ہو اور عہد حاضر کے اہم مسائل کے بارہ میں دینی نقطہ نظر سے صحیح رائے قائم کرنے والی مجتہدانہ فکر و بصیرت بھی رکھتا ہو۔ بلکہ حقائق اور واقعات کی اس دنیا میں پہلے بھی اکثر ایسا ہی ہوا ہے اور ہمارے اس زمانہ میں تو تقریباً ۹۵، ۹۰ فیصد ایسا ہی ہے کہ جو کسی ایک شعبہ میں ماہر اور کامل ہوتا ہے وہ دوسرے شعبوں میں اکثر خام ہی ہوتا ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں ایسے لوگ اکثر مایوس و محروم ہی رہتے ہیں جو صرف کسی ایسے ہی شخص سے استفادہ کرنا چاہتے ہوں جو اُن کے مفروضہ معیار کے مطابق ہر جہت سے کامل مکمل ہو۔

یاد آتا ہے راقم سطور نے اپنے ایک محترم دوست سے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ایک دفعہ عرض کیا تھا: ”آپ ماضی اور حال کے متعدد ایسے حضرات سے یقیناً واقف ہیں جن کی زندگی آپ کی نظر میں دین اور تقویٰ کا کوئی اچھا اور قابل تقلید نمونہ نہیں ہے اور بالخصوص اخلاص و احسان اور توکل و تسلیم جیسی اعلیٰ ایمانی صفات و کیفیات میں آپ کے نزدیک ان حضرات کا کوئی بھی خاص یا عام مقام نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود اُن کا علم و فکر اور ان کی خداداد ذہانت اور بصیرت آپ کے خیال میں قابل استفادہ ہے اور ہم آپ ان کی چیزوں سے برابر استفادہ کرتے ہیں اور اُن لوگوں کو غلطی پر سمجھتے ہیں جو صرف اُن کی علمی اور تحقیقی کوششوں سے اس لئے فائدہ نہیں اٹھاتے کہ وہ اُن کی نیک خواہش کے مطابق کوئی بڑے بزرگ اور صوفی قسم کے آدمی نہیں ہیں۔ اسی طرح ہم اللہ

کے کچھ بندوں کو ایسا پاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی میں تصوف اور سلوک پر زیادہ توجہ دی اوکسی شیخ کامل کی رہنمائی اور نگرانی میں اپنے وقت اور اپنی قوتوں کا بڑا حصہ اس شعبہ کی تحصیل اور تکمیل پر صرف کیا اور اس لئے اس میں انہیں اختصاص اور امتیاز کا مقام حاصل ہو گیا۔ لیکن کسی دوسرے شعبے میں مثلاً علم و فکر ہی میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہیں کوئی خاص بلندی حاصل نہیں ہے اور اس لئے دین کی بعض ضرورتوں کو جن کو ہم بہت اہم سمجھتے ہیں، وہ اچھی طرح محسوس بھی نہیں کرتے اور ملت کے مشکل اور اہم اجتماعی مسائل میں وہ بہتر رہنمائی نہیں کر سکتے یا فرض کیجئے کہ مطالعہ یا غور و توجہ کی کمی کی وجہ سے وہ وقت کے بہت سے اہم معاملات کو صحیح طور پر سمجھتے بھی نہیں تو ان خامیوں کو دیکھ کر اُن کے اس کمال کی بھی نفی کرنا جو واقع میں اُن کو حاصل ہے اور اپنی احتیاج کے باوجود اس شعبہ میں بھی اُن سے ہمارا استفادہ نہ کرنا اُن ہی لوگوں کی جیسی عامیانہ غلطی ہے جن کو تنگ نظری اور تاریک خیالی کا مریض سمجھا جاتا ہے۔“

اس میں شک نہیں کہ جی تو اپنا بھی بہی چاہتا ہے اور اچھا بھلا آدمی یہی چاہے گا کہ جو شیخ خانقاہ اور عارف حق آگاہ ہو وہ بلند پایہ مفسر و محدث اور بالغ النظر فقہ و مجتہد بھی ہو، بلکہ ساتھ ہی ملت کی قیادت اور امامت کبریٰ کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی بھی پوری صلاحیتیں رکھتا ہو اور اسی طرح جو اچھی نظر و فکر رکھنے والا عالم دین ہو وہ اسلامی شریعت و قانون میں مہارت رکھنے کے علاوہ اُمت کی قیادت اور حکومت کے نظام کو چلانے کی اعلیٰ صلاحیت بھی رکھتا ہو اور مزید برآں اپنے قلب و باطن کے لحاظ سے اپنے دور کا جنید و بایزید بھی ہو۔ لیکن یہ تو صرف ہمارے جی کی چاہت اور ایک خوشگوار تمنا ہوئی۔ اور یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں وہ خیالات اور تمناؤں کی دنیا نہیں ہے۔ بلکہ حقائق و واقعات کی دنیا ہے اور عملی آدمی کو اپنا طرز عمل واقعات ہی کی اس دنیا کو سامنے رکھ کر متعین کرنا چاہئے۔ جن صاحب خانقاہ بزرگ کی خدمت میں اپنی حاضری کا ذکر راقم سطور نے گزشتہ صفحات میں کیا ہے، اُن ہی کی زبان سے کئی بار یہ حکیمانہ ارشاد سنا ہے:

”یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ کسی ایک ہی دکان پر سب سودے اچھے مل سکیں، اس لئے جو سودا جس دکان پر اچھا ملے اس کے لئے آدمی کو اسی دکان پر جانا چاہئے۔“

یہاں تک جو کچھ عرض کیا اُس میں راقم کا روئے سخن تصوف کے مخلص ناقدین اور منکرین کی طرف تھا۔ اب اپنے تجربہ ہی کے چند نتیجے اور چند تاثرات تصوف کے حاملوں اور حامیوں سے بھی عرض کرنے ہیں۔

(۸) تصوف کے مقصد اور اس کی حیثیت کے متعلق جو کچھ پہلے عرض کیا ہے اگرچہ خود اپنے کو بھلا اللہ اس میں

شک نہیں رہا ہے کہ اصلیت وہی ہے۔ لیکن بعض مشائخ حق اور ان کی خانقاہوں سے طلب اور عقیدت کا تعلق رکھنے والوں میں بھی بہت سے ایسے لوگ ملتے ہیں جن کا ذہن اس بارے میں صاف نہیں ہوتا اور وہ طرح طرح کی غلط خیالیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً تصوف کے جن اعمال و اشغال کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ بعض کیفیات پیدا کرنے کا وہ ذریعہ اور وسیلہ ہیں۔ خانقاہی حلقوں میں بکثرت ایسے لوگ ملتے ہیں، جو ان اعمال و اشغال ہی کو گویا اصل سلوک سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ان اعمال و اشغال اذکار کے بعض وہ آثار جن کے متعلق تمام مشائخ محققین یہ فرماتے ہیں:

”ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرح کے اوہام و خیالات ہیں۔“

تصوف کے ہمارے حلقوں میں تعلق رکھنے والے بہت سے حضرات ان ہی کی طلب میں الجھے ہوئے ملتے ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سی غلطیاں اور الجھنیں ہیں جن میں خانقاہی طالبین بکثرت مبتلا ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بعض بزرگ ذہنوں کی صفائی کی طرف پوری توجہ نہیں فرماتے، حالانکہ یہ بڑے اہم درجے کی ضرورت ہے اور اس ناچیز کا خیال ہے کہ سلوک و طریقت کے جن حلقوں میں پہلے کبھی گمراہیوں نے جگہ پائی ہے، وہ بعض ایسے بزرگوں کی اسی قسم کی بے توجہی کا نتیجہ ہے، جو خود ہمارے نزدیک ان گمراہیوں میں مبتلا نہ تھے۔ تصوف کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ مشائخ اگر پوری طرح چوکے نہ رہیں اور اپنے طالبین اور معتقدین کے ذہنوں کی صفائی اور خیالات کی اصلاح کی فکر نہ رکھیں تو شیطان کی گمراہ کرنے والی کوششیں اس حلقے میں بڑی آسانی سے کامیاب ہو سکتی ہیں۔ بہر حال ہمارے بزرگوں کو اس خطرے سے غفلت نہیں برتنی چاہئے اور اذہان و خیالات کی صفائی اور اصلاح کو ذکر و شغل سے بھی مقدم سمجھنا چاہئے۔

(۹) ائمہ تصوف امام ربانی اور حضرت شاہ ولی اللہ وغیرہ نے اس پر بڑا زور دیا ہے کہ طالب کو پہلے ضروری عقائد کی تصحیح اور بقدر ضرورت علم دین حاصل کرنا چاہئے اور اس کوشش کے فرائض میں گردانا ہے کہ وہ اگر طالب اور مرید میں یہ کمی دیکھے تو اس کو اس طرف متوجہ کرے۔ لیکن بعض مشائخ کے یہاں اس ذمہ داری کا احساس اور اس کے عملی اہتمام میں بہت کمی دیکھنے میں آئی۔ بہت سے بیچارے سیدھے سادے ایسے بندے ان کی خدمت میں بیعت کے لئے آتے ہیں جن کی باتوں سے اور جن کے ظاہری حال سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان بے چاروں کو دین کی وہ ضروری اور بنیادی باتیں بھی معلوم نہیں جو ہر مسلمان کو معلوم ہونا چاہئیں اور بہت واضح اندازہ اس بات کا ہوتا ہے کہ غالباً ان کو صحیح نماز پڑھنا بھی نہ آتا ہوگا۔ لیکن کبھی کبھی دیکھا گیا ہے کہ ایسوں کو بھی مشائخ کے عام

طریقہ پر تجدید ایمان اور توبہ کرا کے بس بیعت کر لیا گیا اور پڑھنے کے لئے کوئی تسبیح اُن کو بتادی گئی اور بقدر ضرورت دین سیکھنے کی طرف نہ کوئی توجہ دلائی گئی اور نہ اس کا کوئی انتظام فرمایا گیا۔ حالانکہ ان حضرات کے لئے یہ بہت آسان ہے کہ ایسے جو لوگ بھی اُن کے پاس آئیں اُن کو دو، چار دن کے لئے روک کر اُن کی ضروری تعلیم (عقائد اور نماز کی تصحیح وغیرہ) کسی خادم کے سپرد کر دی جائے۔ جیسا کہ نئے آنے والوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا دستور تھا۔

ممکن ہے کہ ان بزرگوں کی اس بے توجہی کا سبب یہ ہو کہ ان آنے والوں کی اس درجہ جہالت اور دین کی بنیادی چیزوں سے بھی اتنی ناواقفیت کا ان حضرات کو اندازہ نہ ہوتا ہو، لیکن عرض یہی کرنا ہے کہ اس طرف ان حضرات کی توجہ کا مبذول نہ ہونا اور اس پہلو پر نظر نہ کرنا۔ ان کے ذمہ دارانہ منصب کے شایان شان نہیں۔

(۱۰) تصوف کی تاریخ پر جن حضرات کی نظر ہے اُن سے یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ مختلف زمانوں میں اس راہ سے کیسی کیسی گمراہیاں اُمت میں داخل ہوئی ہیں اور آج بھی اپنے آپ کو تصوف و صوفیاء کی طرف منسوب کرنے والوں میں کتنی بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کے تصورات اور اعمال، اسلام اور توحید کی نسبت کفر اور شرک سے زیادہ قریب ہیں۔ اللہ نے جنہیں واقفیت اور بصیرت دی ہے وہ جانتے ہیں کہ خانقاہی حلقوں میں اس قسم کی گمراہیاں زیادہ تر بزرگوں کے ساتھ عقیدت اور خوش اعتقادی میں غلو اور تعظیم میں افراط سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے شریعت و سنت کے حامل اور اپنی دینی ذمہ داریوں کو محسوس کرنے والے مشائخ حق کا یہ خاص الخاص فریضہ ہے کہ وہ اپنے سے تعلق و محبت رکھنے والوں کو اعتقادی اور عملی غلو اور افراط کی اس بیماری سے محفوظ رکھنے کی طرف ہمیشہ پوری بیداری کے ساتھ متوجہ رہیں اور اس معاملہ میں ہرگز تساہل سے کام نہ لیں۔ رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہمارے بزرگوں کے سامنے رہنا چاہئے۔

حدیث میں ہے کہ ایک دفعہ کسی صحابی کی زبان سے نکل گیا ”ماشاء اللہ و شئت“ (یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں) حضور ﷺ نے اُن کو سخت تنبیہ کی اور فرمایا:

(جَعَلْتَنِي لِلَّهِ نِدَابِلَ مَا شَاءَ اللَّهُ وَحْدَهُ)

”تو نے مجھے اللہ کے برابر بنادیا، بلکہ یہ کہو کہ ”جو تمہارا خدا چاہے۔“

ایسے ہی ایک اور موقع پر بعض صحابہ کو تنبیہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(لَا يَسْتَهْوِيَنَّكُمْ الشَّيْطَانُ أَمَا مُحَمَّدٌ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ، عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ مَا حَبَّ أَنْ تَرْفَعُونِي فَوْقَ

منزلتی الّٰہی انزلّٰہی اللّٰہ

”لوگو! تمہیں شیطان گمراہ نہ کرے اور تم اس کے بہکائے بہک نہ جاؤ میں عبد اللہ کا بیٹا محمد ہوں۔ اللہ کا بندہ اور بس اُس کا رسول ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے اس درجہ سے اوپر اٹھاؤ جہاں خدا نے مجھے رکھا ہے۔“

اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی نظر کتنی باریک بین تھی اور آپ کس قدر محتاط تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے جو صحاح میں مروی ہے کہ جس روز آپ ﷺ کے صاحبزادے ”ابراہیم“ (علی ابیہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی وفات ہوئی۔ اتفاق سے اُسی روز سورج گرہن ہو گیا اور آپ کو شبہ ہوا کہ لوگ کہیں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ سورج کو یہ گہن بیت نبوی ﷺ کے اس حادثہ کی وجہ سے لگا ہے، تو آپ ﷺ نے اسی وقت اعلان کرا کے لوگوں کو مسجد جمع کرایا اور اللہ کی حمد و ثنا کے بعد اعلان فرمایا:

(إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آيَاتَانِ مِنَ آيَاتِ اللَّهِ لَا يَنْكَسِفَانِ لِمُوتٍ أَحَدٍ وَلَا لِحَيَاتِهِ....) ”چاند اور سورج اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت و حیات سے اُن کو گرہن نہیں لگتا (بلکہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے حساب کے مطابق اور اُس کے حکم سے ایسا ہوتا ہے۔)“

چونکہ اُمت کے تمام طبقوں میں صرف مشائخ ہی کا طبقہ ایسا ہے جن کے ساتھ عقیدت میں لوگوں کو اس قسم کا غلو ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے، اس لئے ان حضرات کا یہ خاص الخاص فریضہ ہے کہ اس بارے میں اپنی ذمہ داری اور مسؤلیت ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔

### تصوف اور اُس کے اعمال و اشغال کے متعلق بعض شبہات!

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے جب ”الفرقان“ کے صفحات میں یہ شائع ہوا تو بعض دوستوں کی طرف سے کچھ سوالات اس سلسلہ میں کئے گئے اور الفرقان ہی میں اس عاجز نے اُن کے جوابات دیئے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن جوابات کو بھی اس کتابچہ کا جزو بنادیا جائے۔“ (مؤلف)

(۱) ایک صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

”تصوف کی جو اہمیت آپ کے اس مقالہ سے ظاہر ہوتی ہے اگر واقعہً اس کی اتنی ہی اہمیت ہے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق اور اس کے اعمال و اشغال سے متعلق صریح احکام کیوں نہیں دیئے؟ یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی چیز دین میں اس قدر ضروری ہو کہ ایمان و اسلام کی تکمیل اُس پر موقوف ہو اور رسول اللہ ﷺ نے امت کو اس کی تعلیم نہ دی ہو۔“



معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحب نے میرے مقالہ کو بالکل غور سے نہیں پڑھا میں نے اس میں جو کچھ لکھا ہے اُس کا تو حال ہی یہ ہے کہ تصوف کا جو مقصود ہے اور جو اس کی غایت اور غرض ہے (یعنی اللہ کی محبت و خشیت اور یقین و استحضار اور اخلاص و احسان جیسی کیفیات کا حاصل کرنا) سو اس کو تو دین میں اہمیت ہے اور یقیناً ایمان و اسلام کی تکمیل اس پر موقوف ہے اور بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے پوری صراحت اور وضاحت کے ساتھ اُمت کو اس کی تعلیم اور ترغیب دی ہے۔ کتاب و سنت کے جو نصوص اس سلسلہ میں پہلے لکھے جا چکے ہیں، وہ اس کے ثبوت کے لئے کافی سے زائد ہیں۔ رہے اس کے خاص اعمال و اشغال (مثلاً اذکار و مراقبات وغیرہ) تو میں یہ صراحت سے لکھ چکا ہوں کہ یہ اس کے صرف وسائل اور ذرائع ہیں اور اس قسم کے ذرائع اور وسائل کے متعلق نبوی ﷺ طریق تعلیم اور اصول تشریع کا تقاضا یہی ہے کہ ان کی تصریح اور تعیین نہ کی جائے، تاکہ ہر زمانہ کے حالات کے مطابق جو جائز ذرائع اور وسائل مناسب سمجھے جائیں انہیں اختیار کیا جاسکے اور اس میں تصوف کو کوئی خصوصیت نہیں، بلکہ دین کے دوسرے شعبوں کا حال بھی یہی ہے۔

غور فرمایا جائے دین کا سیکھنا سکھانا دین کے بنیادی فرائض میں سے ہے، لیکن کتاب و سنت میں اس کے طریقے کی بھی کوئی تعیین نہیں کی گئی۔

اسی طرح قرآن مجید کی حفاظت اور اشاعت اُمت کا کتنا اہم فریضہ ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کے متعلق بھی یہ نہیں بتلایا کہ تم اس کے لئے فلاں فلاں طریقے اختیار کرنا، حتیٰ کہ جب عہد صدیقی ﷺ میں پیامہ کی جنگ میں چار سو حافظ قرآن صحابہؓ شہید ہو گئے، تو سب سے پہلے حضرت عمرؓ کو یہ خیال ہوا کہ سینوں میں محفوظ کرنے کے علاوہ ہمیں قرآن کو سفینوں میں محفوظ کرنے کا بھی انتظام کرنا چاہئے اور اس سلسلہ میں خاص اہتمام اور ذمہ داری سے ایک سرکاری نسخہ بھی تیار ہونا چاہئے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی یہ تجویز حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سامنے پیش کی حضرت صدیقؓ کو ابتداءً اس کے ماننے میں تامل ہوا اور انہوں نے یہی فرمایا کہ جس چیز کو رسول اللہ ﷺ نے نہ تو خود کیا اور نہ ہمیں اس کا حکم دیا۔ اس کو ہم کیوں کریں۔ لیکن حضرت عمرؓ کے دلائل سے بالآخر وہ مطمئن ہو گئے اور پھر ان ہی کے حکم سے حضرت زید بن ثابتؓ انصاریؓ کی خاص نگرانی میں یہ کام انجام پایا۔

پھر حضرت عثمانؓ نے اس سلسلہ میں ایک اور قدم اٹھایا کہ اپنے خاص اہتمام سے اور اپنی نگرانی میں اس مصحف کی نقلیں کرا کر تمام بلاد اسلامیہ میں روانہ کیں اور اُس وقت سے لے کر اب تک قرآن مجید کی حفاظت و اشاعت، تعلیم و تبلیغ اور ترجمہ و تفسیر کے سلسلہ میں خدمت قرآن کے کتنے ہی نئے نئے قدم اٹھائے جا چکے ہیں۔

پس یہ خیال کہ جو چیز دین میں اہم ہو اس کے ذرائع اور وسائل کی تصریح اور تعین بھی کتاب وسنت میں ہونی چاہئے اور اُمت کی قیامت تک کی دینی ضروریات کے متعلق تفصیلی اور جزئی ہدایات ہمیں تصریح اور تعین کے ساتھ کتاب وسنت میں ملنی چاہئیں۔ بہت ہی سطحی قسم کا مغالطہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کے طریق تعلیم اور اصول تشریح سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔

(۲) ایک صاحب نے دریافت کیا ہے کہ:

”اللہ تعالیٰ کی محبت وخشیت اور اخلاص واحسان وغیرہ ایمانی کیفیات پیدا کرنے کے لئے تصوف میں جن اعمال واشغال (مثلاً صحبت شیخ اور اذکار و مراقبات وغیرہ) پر زور دیا جاتا ہے، کیا کتاب وسنت میں کہیں اس کا اشارہ ملتا ہے کہ ان چیزوں سے یہ کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں؟“

اس کے جواب میں عرض ہے کہ اگرچہ واقعہ یہی ہے کہ اس عاجز کے نزدیک صحبت اور ذکر و فکر کا قلب پر اثر انداز ہونا کتاب وسنت سے اشارہ ہی نہیں بلکہ صراحۃً بھی معلوم اور ثابت ہے۔ ۱۔

لیکن اگر بالفرض کتاب وسنت میں اس کا کوئی اشارہ نہ بھی ہو تب بھی اصل مدعا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جب اسلام کی تیرہ سو سال کی تاریخ میں اللہ کے لاکھوں صالح بندے اپنا یہ تجربہ بیان کر رہے ہیں کہ ان اعمال صالح سے یہ کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں تو ان کی اس تاثیر اور افادیت کو ہمیں مان لینا چاہئے۔ میرے جن دوست نے یہ سوال کیا ہے وہ ”صالح لٹریچر“ کے ذریعہ اصلاح پر بہت یقین رکھتے ہیں (مجھے بھی اس سے انکار نہیں ہے) لیکن وہ سوچیں، کیا کبھی اُن کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ اُن کے ”صالح لٹریچر“ کی اس تاثیر کے متعلق کوئی اشارہ کتاب وسنت میں موجود ہے؟ میرا خیال ہے کہ اُن کے دل میں کبھی بھی یہ سوال پیدا نہ ہوا ہوگا، کیونکہ وہ اپنے ذاتی

علم و تجربے سے اور اپنے جیسے بہت سے لوگوں کے تجربے سے اس بارے میں مطمئن ہیں۔ عجیب بات ہے کہ اپنی ۱۔ حدیث میں ہے کہ حضرت حنظلہ صحابی اور حضرت صدیق اکبر ۱؎ اپنا حال یہ پاتے جب تک حضور ۱؎ کی صحبت اور مجلس میں رہتے، دل کی یہ کیفیت رہتی کہ ایک لمحہ کے لئے بھی غفلت نہ ہوتی اور عیب گویا معلوم ہو جاتا لیکن جب اپنے گھروں پر ہوتے یہ کیفیت نہ ہوتی اور حضرت عبداللہ بن عباس ۱؎ سے مروی ہے کہ حضور ۱؎ کو قبر میں دفن کر کے ہم نے مٹی سے ہاتھ جھاڑے، ہی تھے کہ ہمیں اپنے قلوب بدلے ہوئے نظر آئے، یعنی حضور ۱؎ کے اس عالم سے عالم برزخ میں منتقل ہو جانے سے ہمارے قلوب کی حالت میں فرق محسوس ہوا۔ ان دونوں روایتوں سے صحبت کا قلبی کیفیات میں مؤثر ہونا صاف طور سے معلوم ہوتا ہے اور ذکر کی تاثیر کے لئے قرآن مجید کی آیت ﴿وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾ صریح شاہد ہے، جس سیاق میں یہ



آیت وارد ہے اس پر غور فرمایا جائے اور فکر و مراقبہ بھی ذکر ہی کی ایک خاص اور زیادہ گہری شکل ہے۔ چیزوں اور اپنے تجربوں کے ساتھ تو ہمارا طرز عمل یہ ہے، لیکن حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ، سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ، مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ، شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، سید احمد شہید جیسے ہزاروں بندگان خدا کا اجماعی و اتفاقی تجربہ بھی ہمارے لئے موجب اطمینان نہیں۔

(۳) ایک صاحب نے ذکر میں جہر اور ضرب سے اپنا سخت طبعی انقباض ظاہر کیا ہے اور یہ خیال ظاہر

فرمایا ہے کہ:

”اس میں ریاکاری کا شبہ ہوتا ہے اور آج کل کے اکثر سنجیدہ حضرات اس کو ریاکاری ہی سمجھتے ہیں۔“

جہری اور ضربی ذکر سے طبعی انقباض تو ایک ذوقی اور طبعی چیز ہے، اس لیے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی حاجت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طبیعتیں اور ان کے ذوق بہت مختلف بنائے ہیں، بعض طبیعتیں وہ بھی ہیں، جنہیں جہری اور ضربی ذکر سے ہی انس اور سکون حاصل ہوتا ہے۔ اسی لئے مشائخ محققین طبیعتوں کے رخ اور ان کی مناسبتوں کو دیکھ کر جہری یا سری ذکر، دوسرے اشغال ان کے لئے تجویز کرتے ہیں، لیکن ذکر بالجہر کے بارے میں ریاکاری کا جو شبہ ظاہر کیا گیا ہے یہ میرے نزدیک بالکل بے سوچنی سچی بات ہے اس زمانے میں جبکہ بقول انہی صاحب کے سنجیدہ آدمی ذکر بالجہر کو ریاکاری سمجھتے ہیں۔ اپنا اندازہ یہی ہے کہ کسی کو بالجہر ذکر کرتا دیکھ کر لوگ اس کے معتقد نہیں ہوتے، بلکہ بہت سے آدمی تو اس کو کم عقل یا مکار اور ریاکار سمجھتے ہیں۔ پس ایسی حالت میں جہری ذکر میں ریاکاری کا امکان فی زمانہ بہت کم ہے۔ بلکہ اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ آج کل کے ماحول میں ذکر بالجہر اکثر ریا شکنی کا ذریعہ ہو جاتا ہے اور دفع خطرات و وساوس میں ذکر بالجہر کی تاثیر اہل تجربہ کے نزدیک بالکل مسلم ہے۔

اس سلسلہ میں اتنی بات یہاں اور قابل ذکر ہے کہ ذکر میں جہر اور ضرب کے جو طریقے تصوف کے بعض سلاسل میں معمول ہیں۔ فن طب اور علم النفس کی روشنی میں ان کی افادیت اور تاثیر بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ یہ عاجز تو تصوف کے اکثر اشغال کے متعلق یہی سمجھتا ہے کہ بعض کیفیات اور تاثرات اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے یہ سب ایک طرح کی طبی اور نفسیاتی تدبیریں ہیں۔

اور اس لئے ان کو اہمیت دینا نہ صرف یہ کہ غیر صحیح ہے بلکہ اصل مقصد کے لئے مضر بھی ہے پھر یہ بھی ضروری

نہیں کہ ان چیزوں میں ہر ایک کا ادراک یکساں ہی ہو، بلکہ بعض اکابر سے سنا کہ اللہ کے بہت سے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو سلوک کی راہ میں اللہ تعالیٰ کی عنایت و توفیق سے بہت تیزی سے ترقی کرتے ہیں اور سلوک و تصوف کا جو اصل مقصد ہے وہ اُن کو بفضلہ تعالیٰ نصیب ہو جاتا ہے اور آخر تک انہیں کسی لطیفہ اور کسی مقام کا بھی ادراک اور احساس نہیں ہوتا۔

اس عاجز کو اس دور کے جن اکابر سلوک سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ اُن سب کو اس پر متفق پایا کہ خاص کر اس زمانے کے لئے یہی اجمالی سلوک زیادہ مناسب ہے اور محققین نے تصریح فرمائی ہے کہ صحابہ کرام ؓ کا سلوک بھی اجمالی ہی تھا۔

(۵) ایک صاحب نے فرمایا:

”ہم بہت سے آدمیوں کو دیکھتے ہیں کہ برسوں خانقاہوں میں رہنے اور وہاں ذکر شغل کرنے کے باوجود اُن میں وہ چیزیں پیدا نہیں ہوتیں جن کے لئے تصوف اور خانقاہیت کی ضرورت بتلائی جاتی ہے۔“

بلاشبہ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے، لیکن انصاف فرمایا جائے یہ حال اب صرف خانقاہوں ہی کا نہیں ہے، بلکہ ہمارے دینی مدرسوں اور دوسرے تمام دینی و اصلاحی سلسلوں کا حال بھی اس وقت یہی ہے کہ سینکڑوں میں دس بیس مشکل سے نکلتے ہیں، تو کیا ان سب کو غلط اور فضول قرار دے کر ایک دم ختم کر دینا صحیح طرز عمل ہو سکتا ہے؟ صحیح طریق کار ان حالات میں یہ ہے کہ ہر سلسلہ اور ہر ادارہ کو زیادہ مفید اور کارآمد بنانے کی ہر ممکن کوشش اور تدبیر کی جائے اور اس میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا جائے۔ لیکن نتائج میں کمی اور نقص دیکھ کر اس کو سرے سے ختم کر دینے اور فضول قرار دینے کا فیصلہ نہ کیا جائے۔ جن ناسازگار حالات میں اور جس انتہائی درجہ کے فاسد اور سخت مادہ پرستانہ ماحول میں ہمارے ان دینی اداروں کو کام کرنا پڑ رہا ہے اُن میں دس پانچ فیصد کامیابی بھی ہرگز نا کامی نہیں ہے۔

(۶) ایک صاحب نے فرمایا:

”صوفیوں کے طرز عمل سے جو کچھ ہم نے سمجھا ہے وہ تو یہ ہے کہ تصوف دراصل ”رہبانیت“ اور گوشہ نشینی کا نام ہے اور اس کی تائید کرنا دراصل اسلام میں رہبانیت کو داخل کرنا ہے۔“

میرے نزدیک یہ بھی اُن ہی باتوں میں سے ہے جو اس سلسلہ میں بے سوچے سمجھے کی جاتی ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں دراصل خود ان کے دل میں تصوف کے غلط معنی بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ اپنی اسی غلط فہمی کی بنا پر صوفی صرف اُن ہی لوگوں کو سمجھتے ہیں جو رہبانیت پسند اور گوشہ گیر ہیں اور پھر اپنے

اسی تصور کی بنیاد پر وہ یہ کہتے ہیں کہ تصوف رہبانیت کا نام ہے اور ہر صوفی ”راہب“ ہی ہوتا ہے۔ اگر یہ حضرات خود اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے اور تصوف کے لئے رہبانیت اور گوشہ گیری کو ضروری نہ سمجھتے، تو اس دور میں بھی ایسے بہت سے بندگان خدا دیکھ سکتے تھے جو بجز اللہ سچے صوفی بھی ہیں اور مرد میدان بھی۔ مگر بات وہی ہے کہ جو گوشہ گیر نہ ہو، یہ بے چارے اپنی کم نگاہی سے اُس کو صوفی مان ہی نہیں سکتے۔ اس کا علاج تو خود اپنے علم اور تصور کی تصحیح سے ہی ہو سکتا ہے۔ (تصوف کیا ہے: ص ۲۳۳-۵۹۳)

تصوف اور اس کے اعمال و اشغال کے متعلق بعض شکوک و شبہات کے جوابات حضرت مولانا محمد ادریس صاحب ندوی نے بھی دیئے ہیں ان کو بھی پڑھ لیجئے۔

**تصوف اور اُس کے اعمال و اشغال کے متعلق بعض شکوک و شبہات کا جواب!**

تصوف اور اُس کے اعمال و اشغال کے متعلق جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں اُن کی حسب ذیل دو بڑی قسمیں بیان کی جاسکتی ہیں۔

(۱) پہلی قسم ان شکوک و شبہات کی ہے جو رسمی خانقاہوں اور رسمی سجادہ نشینوں کو دیکھ کر یا اُن کے افواہ سُن کر پیدا ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ جس شخص کو کتاب و سنت کی ادنیٰ واقفیت بھی ہے وہ معمول غور و فکر کے بعد سمجھ لے گا کہ یہ سب فریب ہے۔ اور حقیقت اس سے بہت دور ہے۔

(۲) دوسری قسم ان شکوک و شبہات کی ہے جو علمی طور پر پیش آتے ہیں، اس قسم کے شبہات زیادہ تر اُن لوگوں کے دماغوں میں پیدا ہوتے ہیں جن کو نہ محققین صوفیاء کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا ہے اور نہ اپنے زمانہ کے محققین سے سابقہ پڑا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف فلسفہ اشراق، جدید افلاطونی الہیات اور ہندو جگ سے ماخوذ ہے حالانکہ امر واقعہ یہ نہیں ہے۔

فلسفہ اشراق اور ہندو لوگوں میں چند ریاضتوں اور مجاہدوں کے سوا کیا ہے؟ وہ انہی مجاہدوں اور محنتوں کو مقصود حقیقی جانتے ہیں اور اس کے برعکس ہمارے صوفیاء اُن ریاضتوں اور مجاہدوں کو جن کے ساتھ اتباع شریعت نہ ہو کوئی وقعت نہیں دیتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرماتے ہیں:

”وہ ریاضتیں اور مجاہدے جو تقلید سنت سے الگ ہو کر اختیار کئے جائیں، معتبر نہیں ہیں، اس لئے کہ جوگی اور ہندوستان کے براہمہ اور یونان کے فلاسفہ بھی ان کو اختیار کرتے ہیں اور یہ ریاضتیں ان کی گمراہی میں اضافہ کے سوا اور کچھ نہیں کرتی ہیں۔“ (جلد اول مکتوب دو صد و بست و یکم ”۲۷۱“)

مرشد العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر کی کے ایک کرامت نام کے چند الفاظ غور سے سننے کے قابل ہیں:

”اور بعض جہلاء جو کہہ دیتے ہیں کہ شریعت اور ہے اور طریقت اور ہے، محض اُن کی کم فہمی ہے، طریقت بے شریعت خدا کے گھر مقبول نہیں، صفائی قلب کفار کو بھی حاصل ہوتی ہے۔ قلب کا حال مثل آئینہ کے ہے، آئینہ زنگ آلودہ ہے تو پیشاب سے بھی صاف ہو جاتا ہے اور گلاب سے بھی صاف ہو جاتا ہے، لیکن فرق نجاست اور طہارت کا ہے۔ ولی اللہ کو پہچاننے کے لئے اتباع سنت کسوٹی ہے، جو تبع سنت ہے وہ اللہ کا دوست ہے اور اگر مبتدع ہے تو محض بے ہودہ ہے، خرق عادات تو دجال سے بھی ہوں گے۔“ (رجوم المذنبین: ۱۲۹)

تصوف کی مشہور و متداول کتابیں سامنے رکھے مثلاً کتاب اللع، تعرف رسالہ قشیریہ، عوارف، فتوح الغیب، احیاء العلوم، مدارج السالکین، ان کتابوں کے صرف ابواب پر نظر ڈال لیجئے۔ اور فیصلہ کیجئے کہ ان کتابوں میں توحید اور اُس کے احوال، اتباع سنت، عبادات کی خشوع و خضوع کے ساتھ ادائیگی، معاملات کی صفائی اور تصفیہ اخلاق کے سوا کیا ہے؟

بلاشبہ تصوف کی بعض کتابوں میں کچھ ایسے مضامین بھی آئے ہیں جن سے بعض طبائع کو وحشت ہو سکتی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ مضامین تصوف کے اصول و مقاصد سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اگر کسی کا فہم اُن کو نہیں قبول کرتا ہے تو اُن کو چھوڑ دے، اسی طرح اگر خلاف شریعت کوئی بات نظر آئے، تو اُن کی وہی حیثیت سمجھئے جو کتب تفسیر میں اسرائیلیات، یا کتب احادیث میں موضوعات کی ہے۔ اب اسرائیلیات یا موضوعات کی وجہ سے کتب تفسیر و احادیث سے تو قطع نظر نہیں کی جاسکتی ہے۔ جس طرح محققین کتب تفسیر و حدیث میں اغلاط کی تصحیح کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح محققین صوفیاء بھی اپنے فن میں صحیح کو سقیم سے اور درست کو غلط سے الگ کرتے رہے ہیں۔ کوئی وسیع النظر اس سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔

مثال کے طور پر مولانا اسماعیل شہید کی ”صراط مستقیم“ ہی کو دیکھئے کہ اس میں اسی قسم کی بدعات پر متنبہ کرنے کے لئے پورا ایک باب موجود ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات جلد سوم میں شیخ روز بہان بقلی کی کتاب ”تبیین غلطات المتصوفہ“ کا ذکر موجود ہے جو اسی عنوان پر ہے۔ (مکتوب ہشادونہم)

تصوف اور اُس کے اعمال و اشغال کے متعلق شکوک و شبہات کے حل کا آسان طریقہ یہ ہے کہ خود محققین صوفیاء سے تصوف اور اس کے اعمال و اشغال کی حقیقت اور مقصد کو سن لیا جائے اور پھر غور کیا جائے کہ شریعت

تصوف کے مقصد سے کیا کچھ کرنا چاہتی ہے؟ اور کیا تصوف شریعت پر اخلاص کے ساتھ عمل کے سوا اور کوئی چیز ہے؟

تصوف کی مستند اور مشہور کتاب احیاء العلوم کی شرح ”اتحاف السادة المتقين“ (ص ۳۹) میں ہے:  
 ”بس تصوف کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ ریاضتوں مجاہدوں سے علم و یقین تک پہنچا جائے۔“  
 حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ حاجی محمد لاہوری کو تحریر فرماتے ہیں:

شریعت کے تین حصے ہیں: علم، عمل، اخلاص، جب تک یہ تینوں اجزاء متحقق نہ ہوں، شریعت متحقق نہیں ہوتی۔ جب شریعت متحقق ہو جاتی ہے، حق تعالیٰ کی رضا حاصل ہو جاتی ہے جو کہ تمام دنیاوی اور اخروی سعادتوں سے بالاتر ہے۔ طریقت و حقیقت جس سے کہ صوفیاء ممتاز ہوئے ہیں۔ دونوں (شریعت کے تیسرے حصے) یعنی اخلاص کی تکمیل میں شریعت کے خادم ہیں۔ پس ان دونوں (یعنی طریقت و حقیقت) کی تحصیل صرف شریعت کی تکمیل کے لئے کی جاتی ہے۔ احوال و مواجید اور علوم و معارف جو انشاء راہ میں حاصل ہوتے ہیں وہ مقاصد میں سے نہیں ہیں۔ ان سب سے گزر کر مقام رضا تک پہنچنا چاہئے جو کہ سلوک کا آخری مقام ہے۔ اس لئے طریقت و حقیقت کی منزلوں کو طے کرنے کا مقصد تحصیل اخلاص کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اخلاص ہی سے مقام رضا حاصل ہوتا ہے، کوتاہ اندیش احوال و مواجید کو مقصود اور مشاہدات و تجلیات کو مطلوب جانتے ہیں اور کمالات شریعت سے محروم ہیں۔ بلا شبہ مقام اخلاص کا حصول اور مرتبہ رضا تک وصول ان احوال و مواجید کو طے کرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی حیثیت مقصود حقیقی کے معاون کی ہے۔ یہ بات اس فقیر پر بہ صدقہ حبیب خدا (ﷺ) اس راہ میں دس برس گزارنے کے بعد واضح ہوئی ہے۔ (جلد اول مکتوب سہ و ششم)

مکتوب چہلم میں صراحت سے ارشاد فرماتے ہیں:

مخدومنا! منازل سلوک طے کرنے اور مقامات جذب قطع کرنے کے بعد یہی معلوم ہوا کہ اس سیر و سلوک کا مقصد مقام اخلاص کی تحصیل ہے۔ (جلد اول)  
 مقصود و صدوہ و فتم (جلد اول) میں ارشاد ہے:

”طریق صوفیاء کے سلوک کا مقصد صرف یہ ہے کہ معتقدات شرعیہ کا یقین بڑھے، نیز احکام فقہیہ کے اداء میں آسانی ہو۔“

”انتباه فی سلاسل اولیاء اللہ“ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اور مقصود صوفیاء کے طریقہ علیہ کا مشاہدہ حق کا حصول ہے۔“ ”کانک تراہ“ اور اس حضور کا نام انہوں نے مشاہدہ بالقلب رکھا ہے۔“ (انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ: ۴۹)

”القول الجمیل“ میں ہے:

”مشائخ کے تمام طریقوں کا مرجع یہ ہے کہ ایک ہیئت نفسانیہ حاصل ہو جائے، جس کو وہ نسبت کہتے ہیں، اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ارتباط و انتساب ہے اور اس کو سکیزہ اور نور بھی کہتے ہیں۔“  
اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

”جب بندہ طاعات، طہارات اور اذکار پر مداومت کرتا ہے تو نفس ناطقہ میں ایک صفت قائم ہو جاتی ہے اور اس توجہ کا ملکہ راسخ پیدا ہو جاتا ہے۔“ (القول الجمیل)

حضرت شاہ مولانا اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ ”صراط مستقیم“ میں تحریر فرماتے ہیں:  
”جاننا چاہئے کہ اولیاء اللہ کے ہر طریقہ میں مجاہدات، ریاضات اذکار، اشغال اور مراقبات مقرر ہیں۔ ان امور میں سے ہر ایک طالب کے اندر ایک اثر پیدا کرتا ہے، جس کے سبب سے طالب کو عالم قدس سے ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی کو صوفیاء کی اصطلاح میں نسبت کہتے ہیں۔“ (صراط مستقیم: ص ۱۶۵)

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی جامع کمالات ہستی ابھی قریبی زمانے میں گزری ہے۔ اُن کے ارشادات عالیہ بھی سن لیجئے۔ وہ فرماتے ہیں:

”پس ہستی مطلق کو ہر دم خیال میں پرورش کرنا اور بلا کیف حاضر و موجود جان کر حیا و شرم کے ساتھ بندہ (کا) مطیع رہنا مقصدِ اصلی ہے اور یہی احسان ہے باقی زوائد۔“ (مکاتیب رشیدیہ: ص ۲۰)

”سنو کہ سلوک صحابہ و تابعین میں تحصیل احسان اور اپنا بندہ ناچیز و بے اختیار ہونا اور ”من کل الوجوہ“ ذاتِ غنی کا محتاج اور اس کردگار بے نیازِ محسن عباد کا حضور ہوتا تھا، بندگی در بندگی، عجز و در عجز، توکل در توکل، ہمت اطاعت و جان و مال بازی فی رضا المولیٰ اس کا ثمرہ تھا۔“ (ص ۲۰)

”اصل الاصول اور اصل مقصود و مامور سلوک صحابہ کرام ﷺ ہے۔ اس میں بحث بندگی سے اور ایمان بالغیب کے کالمُشاہد (یعنی ایمان بالغیب، دیکھ کر ایمان لانے کی طرح) ہو جانے سے اور حسن اخلاق سے ہے۔“ (ص ۳۲)

”مقصد جملہ اشغالات و مطلب و منتہی جملہ مراقبات کا وہ حضورِ قلب بے کیف ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو

نصیب فرمایا، نسبت صحابہ کرام ﷺ یہ ہی حضور تھا۔“ (ص ۴۵)

”برادر! یہ تمام شریعت کا علم اور طریقت کا طریقہ نور یقین کی تحصیل کے واسطے ہے اور انجام و منتہی سب کا یہی تو ہے کہ جس کا مسلمان سرسری طور سے علم رکھتے ہیں۔ وہ یقین حق یقین، مثل مشاہدہ کے ہو جائے، یہ سب طرق کی انتہا ہے۔“ (ص ۸۰)

”اور وہ کیفیت کہ اپنے آپ کو روبرو مالک معبود کے جانے اور شرم و حیاطاری ہو جائے، اس کا نام حضور اور یادداشت ہے، اس کو لسانِ شرع میں احسان کہتے ہیں اور یہی نسبت معتبرہ ہے کہ مسلسل چلی آتی ہے۔“ (ص ۹۵)

سطور بالا میں محققین صوفیاء کے چند اشارات پیش کئے گئے ہیں، ورنہ اس مفہوم کے دفتر کے دفتر تیار ہو سکتے ہیں۔ بہر حال یہ چیز تو ظاہر ہوگئی کہ تصوف تحصیلِ اخلاص و یقین کے سوا اور دوسری کوئی چیز نہیں ہے اور اخلاص و یقین کے مطالبہ سے قرآن مجید اور احادیثِ نبویہ (ﷺ) کے دفاتر بھرے پڑے ہیں۔

اب تصوف کے اعمال و اشغال یعنی اس اخلاص و یقین کی تحصیل کے ذرائع و وسائل کا مسئلہ باقی رہا، تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ حضرات صحابہ کرام ﷺ کو حضرت نبی کریم ﷺ کے فیضِ صحبت کی وجہ سے ان وسائل و ذرائع کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی جو بعد کے لوگوں کو پیش آئی۔ وہاں نبوت کا آفتاب عالم تاب موجود تھا۔ وہ شمع و فانوس کی فکر میں کیوں پڑتے؟

حضرت مجددِ رحمۃ اللہ علیہ نے خوب ارشاد فرمایا:

”بدن کے قرب کا دلوں کے قرب پر بڑا اثر پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کوئی ولی صحابی ﷺ کے مرتبے کو نہیں پہنچتا ہے۔“ (مکتوبات: جلد اول ص ۲۰۵)

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ”ارشاد الطالبین“ میں ارشاد فرماتے ہیں:

”اس بات پر اجماع ہے کہ صحابہ ﷺ غیر صحابہ سے افضل ہیں، حالانکہ علم و عمل میں صحابہ ﷺ اور غیر صحابہ مشارکت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ صحابہ ﷺ نے راہِ خدا تعالیٰ میں جو نصف صاع جو خرچ فرمایا ہے اگر دوسرا اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو دونوں برابر نہیں۔ یہ فرق ان باطنی کمالات کی بناء پر ہے جو ان کو حضرت رسول کریم ﷺ کے فیضِ صحبت سے حاصل ہوئے تھے۔“ (ص ۴)

حضرت نبی کریم ﷺ کے فیضِ صحبت کے سوا حضرات صحابہ کرام ﷺ اور دوسرے طریقوں سے بھی اس نورِ اخلاص و یقین کو حاصل فرماتے تھے۔



حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ”القول الجمیل“ میں فرماتے ہیں:

”میرا گمان غالب ہے کہ صحابہ کرام ؓ نسبت کو اور طریقوں سے بھی حاصل فرماتے تھے۔ مثلاً نماز و تسبیحات پر اُن کے شرائط کے ساتھ مواظبت، طہارت اور یادِ موت اور عذاب و ثواب کے خیال پر مداومت ان چیزوں سے مادی لذتوں سے بے تعلقی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ حضرات قرآن کی تلاوت اس میں تدبیر، وعظ اور زہد و رفاق کی احادیث کے سننے پر مواظبت فرماتے تھے اور اُس سے اُن کو ایک ملکہِ راسخہ اور ہیئتِ نفسانیہ حاصل ہوتی تھی۔“ (القول الجمیل)

اس سلسلے میں ایک اہم معاملہ کی طرف بھی اشارہ کرنا ہے جس پر حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ نے متنبہ فرمایا ہے، اس کی تشریح و تفصیل کا موقع نہیں ہے، تاہم ممکن ہے کہ اہل ذوق اس سے مطمئن ہوں۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا:

۱۔ یعنی جن عقائد و اعمال کے مخاطب و مکلف صحابہ کرام ؓ تھے، انہی کے مخاطب و مکلف ہم بھی ہیں ایسا نہیں ہے کہ اُن کے لئے دوسرے اعمال و عقائد تھے اور ہمارے لئے دوسرے، نیز دین کی جن حقیقتوں کا علم ان کو تھا، بعد والوں کو بھی ان کا علم ہوا اور نماز روزہ وغیرہ جو عمل وہ کرتے تھے، بعد والوں نے بھی وہ کئے۔

”فنا فی اللہ اور بقا باللہ اور جذب و سلوک کے تمام مقامات کے طے کرنے کے بعد جو قرب الہی حاصل ہوتا ہے، حضرات صحابہ کرام ؓ جو حضور ﷺ کی ایک صحبت کی بناء پر تمام اولیائے اُمت سے افضل قرار پائے۔ کیا اُن کو محض اسلام قبول کرنے سے یہ سیر و سلوک فیض صحبت سے حاصل ہو گیا تھا؟ اُن حضرات کو علم جذب و سلوک حاصل تھا، یا نہیں؟ اگر حاصل تھا تو اُس کا کیا نام تھا؟ اور اگر نہیں حاصل تھا، تو کیا اُس کو بدعتِ حسنہ کہہ سکتے ہیں؟“

اب مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جواب سنئے:

”اس اشکال کا حل صحبت سے تعلق رکھتا ہے، وہ بات جو اس مدت میں کسی نے نہیں کی۔ ایک مرتبہ لکھنے سے کیسے سمجھ میں آ سکتی ہے، لیکن جب دریافت کیا گیا تو اب جواب سے چارہ نہیں۔ اس لئے مختصر طور سے لکھا جاتا ہے:

وہ قرب خداوندی جس کا تعلق فناء و بقاء اور سلوک و جذب سے ہے، قرب ولایت ہے، اولیائے اُمت اس سے مشرف ہوئے ہیں اور جو قرب کہ صحابہ کرام ؓ کو حضور ﷺ کی صحبت میں حاصل ہوا وہ قرب نبوت ہے، اس قرب میں نہ فنا ہے نہ بقاء نہ جذب ہے نہ سلوک اور یہ قرب قرب ولایت سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس لئے کہ یہ



قرب حقیقی ہے اور وہ قرب ظلی ہے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے، مگر ہر شخص کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی ہے، خواص بھی اس موقع پر عوام کے مشابہ ہیں۔

گر بو علی نوائے قلندر نواختے!

صوفی بدے ہر آنکہ بہ عالم قلندر راست

کمالات قرب نبوت اگر قرب ولایت کے راستے سے طے ہوتے ہیں تو فنا و بقاء اور جذب و سلوک سے چارہ نہیں اور اگر اس راستے سے کمالات قرب نبوت نہ حاصل کئے جائیں، تو فنا و بقاء اور جذب و سلوک کی ضرورت نہیں ہے! صحابہ کرام ؓ نے قرب نبوت کے راستے سے منزل طے کی ہے۔ جذب و سلوک اور فنا و بقاء سے ان کو کام نہ تھا۔“ (مکتوبات جلد اول مکتوب سہ صد و سیزدہم)

حضرت مولانا سلیمان شہید رحمۃ اللہ علیہ ”صراط مستقیم“ میں ارشاد فرماتے ہیں:

”ایک باریک نکتہ جس سے اہل زمانہ ناواقف ہیں حب نفسانی اور حب عقلی کے درمیان تمیز کرنا ہے، حب نفسانی مبادی سلوک کے واردات میں سے ہے اور حب عقلی کمالات انبیاء کرام اور مقامات اولیاء عظام میں سے ہے۔ اکثر عوام صوفیاء نے حب نفسانی کو حب عقلی کی جگہ دے رکھی ہے اور اس کو اشارات شرعیہ کا مشاڑ الیہ جانتے ہوئے حضرات انبیاء و اولیاء کے

۱۔ حب نفسانی کا تعلق سلوک راہ ولایت سے اور حب عقلی کا تعلق سلوک راہ نبوت سے ہے، جیسا کہ صراط مستقیم میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔“

سلوک کو اہل عشق و موافق کے احوال سے تطبیق دینا چاہتے ہیں اور لا حاصل تشویشات میں پڑتے ہیں۔“ (ص ۴)  
اصل مقصود یہی سلوک راہ نبوت ہے، مگر چونکہ سلوک راہ ولایت سے سلوک راہ نبوت آسان ہو جاتا ہے۔ اس لئے سلوک راہ ولایت کو اختیار کیا جاتا ہے۔

حضرت شہید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”حصول نسبت ولایت سلوک راہ نبوت کو آسان کر دیتا ہے۔ اور جس کو نسبت ولایت حاصل ہوتی ہے وہ نسبت

نبوت کو تھوڑی محنت میں حاصل کر لیتا ہے۔“ (صراط مستقیم: ص ۸)

اب تصوف کے اُن اعمال و اشغال کا مسئلہ باقی رہا، جن کی ضرورت عہد نبوت سے دوری اور ماحول کی ناسازگاری کے باعث متاخرین کو پیش آئی۔ اس سلسلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ ان اعمال و اشغال میں ذکر و فکر یہ دو چیزیں بنیادی ہیں

اور یہ دونوں چیزیں مامورات شرعیہ میں سے ہیں۔ بحث جو کچھ ہے وہ ذکر و فکر کے طریقوں، وضعوں اور قیود میں ہے! تو خوب سمجھ لیجئے کہ ذکر و فکر کے یہ قیود، طرق اور اوضاع صرف تدبیر و معالجہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ”ایضاح الحق الصریح“ میں مولانا اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”صوفیاء کے نفع بخش اشغال کی حیثیت دو امور معالجہ کی ہے کہ بہ وقت ضرورت ان سے کام لے اور بعد میں پھر اپنے کام میں مشغول ہو۔“ (ص ۷۸)

معالجے کے یہ طریقے حالات کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ ”صراط مستقیم“ میں ہے:

”ہر وقت اور ہر قرن کے اشغال جدا ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر طریق کے محققین تجدید اشغال کی کوشش فرماتے رہتے ہیں۔“ (ص ۷)

اسی لئے محققین نے تصریح فرمادی ہے کہ: ”یہ ہرگز خیال نہ کرنا کہ نسبت بجز ان اشغال کے اور کسی طرح حاصل نہیں ہوتی ہے۔“ (القول الجلیل)

بلکہ اگر ان طرق و اوضاع اور اعمال و اشغال کو کوئی مقصود جانتا ہے تو یہ حضرات اس پر سخت انکار فرماتے ہیں۔ ”ایضاح الحق الصریح“ میں ارشاد ہے:

”وطائف واذکار، ریاضات، خلوت، چلہ کو مقرر کرنا، ذکر جہری اور ذکر خفی کی وضعوں کو مقرر کرنا، ضرب عدد اور مراقبہ برزخیہ کا مقرر کرنا، اگر طالب ان سب کو اصل کمال شرعی یا مکملات میں سے جانتا ہے تو یہ سب بدعت حقیقیہ ہیں، لیکن خواص جو اس کو صرف وسائل و ذرائع جان کر رواج دیتے ہیں، اُن کے حق میں بدعت حکمیہ ہیں، اور انھیں خواص جو ان چیزوں سے بہ وقت ضرورت کام لیتے ہیں اور پھر کام نکلنے کے بعد چھڑا دیتے ہیں اُن کے حق میں یہ بدعت نہیں ہے۔“ (ص ۳۷)

محققین صوفیاء ان اشغال و اعمال سے کس طرح کام لیتے ہیں اور پھر کس طرح ان سے الگ کر کے اصل مقصود میں لگا دیتے ہیں۔ اس کو جاننے کے لئے صرف مکاتیب رشیدیہ میں سے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے چند ارشادات نقل کئے جاتے ہیں:

”ذکر کے نور کا ملاحظہ جو ابتداء میں تلقین ہوتا ہے، وہ مقصد اصلی نہیں بلکہ تمہید ہوتا ہے۔“ (ص ۱۵)

”پاس انفاس وغیرہ سب حیل اس کے ہیں کہ ذکر خلیلہ میں قائم ہو جائے ورنہ اصل مقصود نہیں، جب خیال ذکر ذات قائم ہو جائے تو زبان اور انفاس کسی کی ضرورت نہیں۔“ (ص ۱۶)

”ذکر جہری کی اب کچھ حاجت نہیں، ذکر اصل میں تذکر قلب ہے سوجب ذکر قلبی حاصل ہوا، اب زبان کی کچھ ضرورت نہیں۔“ (ص ۱۷)

مکاتیب رشیدیہ کے اقتباسات سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے۔  
 ”ضرورت تعین شغل کی بلندی کے واسطے ہوتی ہے، منتهی اپنے اختیار میں ہوتا ہے، جس امر سے مطلب برآمد ہو وہی کرے، نہ اُس کو قید ذکر زبانی کی ہے، کوئی ذکر ہو، نہ کسی تصور خیال کی غرض کام سے ہے۔“ (ص ۲۸)  
 ”الحاصل اگرچہ یہ قوت تاثیر اور توجہ و کشف اور تصرف دنیا میں بہت ہے، مگر یہ نور یقین مثل کیمیا کے نادر الوجود ہے۔ اگرچہ عالم خالی نہیں، اشغال سب اس کے مقدمات تھے، اب خود مقصود ہو گئے اے کاش کہ اس یقین کا شائبہ ہوا بھی اس محروم کو لگ جائے کہ سارا مدار اس پر ہی ہے، اس نسبت کا نام نسبت احسان ہے کہ بعثت جناب فخر رسل (علیہ السلام) کی اس کے ہی واسطے تھی اور صحابہ جملہ اسی نسبت کے حامل تھے۔ علیٰ حسب مراتب ہم پھر اولیائے اُمت نے دوسرے طریقے سے پیدا کیا کہ ہر ایک نے اشغال اپنے اپنے طریقے کے وضع کئے، سو یہ سب مقدمات اس کے ہیں اور بس! اس کا کوئی طریق معین نہیں، ہر شخص کا طرز جدا گانہ ہے۔“ (ص ۸۱)  
 تصوف کا مقصد اور اس کے اعمال و اشغال کی حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد عرض ہے کہ اگر کوئی خوش نصیب ایسا ہے کہ اس کو کسی ریاضت و مجاہدہ کے بغیر اخلاص و احسان کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے تو وہ بہت ہی مبارک ہے اور نہ قاعدہ یہ ہے کہ آدمی کو جس چیز سے خود نفع ہوتا ہے اُسی کو وہ دوسروں کو بتلاتا ہے۔ اہل اللہ کی بڑی جماعت (جن کے صدق و اخلاص پر سب کو اتفاق ہے) خبر دیتی ہے کہ ذکر و فکر ہی کی راہ سے اُن کو اخلاص و یقین کی دولت حاصل ہوئی۔

من نہ تہادریں میخانہ مستم!

جنید شبلی و عطارؒ ہم مست

اس لئے اگر کسی کو ان کیفیات مطلوبہ کی ضرورت و تلاش ہے تو وہ اس راہ کو اختیار کرے۔  
 ۱۔ مطلب یہ ہے کہ قلب میں اللہ کے ذکر اور یاد کی کیفیت کو راسخ اور مستقل کرنے کے لئے جو جہری ذکر سالکین کو کرایا جاتا ہے، جب اللہ تعالیٰ وہ کیفیت پیدا فرمادیں۔ اور رسوخ حاصل ہو جائے تو پھر اس کے جاری رکھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ قلب میں اس کیفیت کے پیدا ہو جانے کے بعد ذکر باللسان کیا ہی نہ جائے۔ ذکر جو خود مقصود اور مامور ہے وہ تو تادم آخر جاری رہتا ہے۔ حدیث نبوی ﷺ میں ہے: (لا یزال لسانک

رطباً من ذکر اللہ

عاشق کہ شد کہ یار بحال نظر نہ کرد

اے خواجہ درویش و گرنہ طبیعت ہست

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ یہ راہ بحث و نظر کی نہیں، بلکہ جدوجہد اور عمل کی ہے۔ راقم سطور نے کئی برس ہوئے ایک جلیل القدر شیخ وقت (جو محمد اللہ اب بھی اپنے فیوض و برکات کے ساتھ موجود ہیں) کی خدمت میں عرض کیا کہ: ”تصوف پر پڑھنے کے لئے کوئی کتاب تجویز فرمادی جائے۔“

جواب میں ارشاد فرمایا کہ:

”اگر پڑھنا ہی ہے تو شاہ اسماعیل شہید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ”صراط مستقیم“ پڑھئے۔“

بہر حال گزارش کا مقصد یہ ہے کہ اگر دل میں جستجو ہے تو کسی صاحب کمال کے مشورہ سے کچھ کیجئے۔

قال راہگذار و مرد حال شو!

پیش مردے کا ملے پامال شو!

کسی اور مقصد سے نہیں، تو تجربہ کر کے دیکھئے۔ اگر کسی صاحب کمال کی صحبت، یا اُس کے بتلائے ہوئے طریقے پر عمل کرنے سے حق تعالیٰ کا تعلق بڑھتا ہو محسوس ہو، ایمان میں تازگی کے آثار پائے جائیں تو فہما، ورنہ جہاں زندگی میں اچھے اور برے بہت تجربے ہوتے ہیں۔ اس کو بھی ایک ناکام تجربہ سمجھ کر چھوڑ دیجئے گا۔

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی

تارہ میں نہ باشی کے راہ بر شوی

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق

ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

یقین اور اُس کے ثمرات!

تصوف کے بارے میں پیدا ہونے والے بعض شکوک و شبہات سے متعلق جو مضمون مختصر سا گزشتہ صفحات میں

ناظرین کرام نے ملاحظہ فرمایا، اُس میں ایک جگہ عرض کیا تھا: ”تصوف کا اصل مقصد مرتبہ یقین کی تحصیل ہے۔“

اس یقین کی حقیقت کیا ہے؟ اس کو بھی سمجھ لینا چاہئے۔ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ

”عوراف“ میں ارشاد فرماتے ہیں:

”بشری حجابات اٹھ جانے کے بعد دل میں جو نور حقیقت ظاہر ہوتا ہے، اُس کا نام یقین ہے، جس سے ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے۔ اس سے وہ یقین مراد نہیں جو محض دلائل سے حاصل ہو۔“

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ”ازالۃ الخفاء“ میں فرماتے ہیں:

”یہاں یقین سے مراد وہ یقین خاص ہے جو بطریق موہبت صالحین اُمت کو نصیب ہوتا ہے، اس کو صوفیاء کی اصطلاح میں یادداشت کہتے ہیں، نہ کہ وہ یقین جو استدلال یا تقلید سے پیدا ہو۔“ (مقصد دوم: ص ۱۴۲)

یہ یقین عبد اور معبود کے رشتہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اسلامی زندگی کی جان ہے، جس طرح قالب روح کے بغیر اور آنکھیں بغیر نور کے بے لطف ہیں، اسی طرح مرتبہ یقین کے بغیر اعمال بے کیف ہیں۔ صحیح روایت میں ہے کہ:

”اُمت محمدیہ ﷺ کے سوا اور امتوں نے گویا فجر سے ظہر تک کام کیا۔ بعضوں نے ظہر سے عصر تک کام کیا اور امت محمدیہ ﷺ نے عصر سے مغرب تک کام کیا۔ لیکن اجر و ثواب اس امت کو اوروں کے مقابلے میں دو گنا دیا جائے گا۔“

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

”یہ فرق قوت یقین ہی کی بناء پر ہے۔“ (کتاب الایمان: ص ۸۷ مطبع انصاری دہلی)

حضور ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ:

”مجھ کو پوری اُمت کے مقابلے میں وزن کیا گیا تو میرا پلہ بھاری رہا، پھر اس میں ابو بکر ﷺ کو رکھا تو وہ بھاری رہے۔ اس کے بعد عمر ﷺ کو تو لا گیا، تو وہ بھی سب سے وزنی رہے۔“

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

”یہ سب قوت ایمانی کا کرشمہ ہے۔“ (کتاب الایمان: ص ۸۷-۱۲۱)

یہی وہ یقین ہے کہ جس کے متعلق حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

”جب نور دل میں آتا ہے تو اس میں کشادگی پیدا ہوتی ہے۔“

صحابہ ﷺ نے عرض کیا کہ: ”یا رسول اللہ! اس کی نشانی کیا ہے؟“

ارشاد ہوا کہ: ”آخرت کی رغبت، دنیا سے نفرت، موت سے پہلے اس کی تیاری۔“ (مشکوٰۃ: کتاب

الرقاق-۱۲)

اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات، ان کے وعدوں و وعیدوں کو کون نہیں جانتا مانتا، لیکن ان کا یقین ہم کو کہاں تک

حاصل ہے، ہماری عملی زندگی خود اس کی شاہد ہیں۔

ہم سب جانتے اور مانتے ہیں کہ حق تعالیٰ حاضر و ناظر ہیں، ہمارے ساتھ ہیں رزاق ہیں، سمیع و بصیر ہیں، رؤف و رحیم ہیں۔ شفاء انہی کے ہاتھ میں ہے، موت و حیات اور نفع و ضرر کے وہی مالک ہیں۔ الغرض تمام صفات کمالیہ انہی کے لیے مخصوص ہیں۔ نیز یہ کہ طاعات اُن کی رضا اور معاصی اُن کے غضب کا باعث ہیں۔ لیکن اس جاننے اور ماننے سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر اگر ہم کو ان امور کا یقین کامل بھی حاصل ہو تو کیا عالم ہو اور ہماری زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب آجائے۔

کیا اپنی حاجات کو حق تعالیٰ کے سوا پھر ہم کسی اور کے سامنے بالا استقلال پیش کر سکتے ہیں؟ کسی معاملے میں ہمارے دلوں میں ان سے شکوہ پیدا ہو سکتا ہے۔ رنج و راحت کے مواقع پر ہم حدود سے بڑھ سکتے ہیں؟ کیا ہم بالقصد ان کی طاعات کو چھوڑ سکتے ہیں اور گناہوں کے مرتکب ہو سکتے ہیں؟ ان سے ایک لمحہ بھی غفلت ہو سکتی ہے؟ اور کیا پھر خضوع و خشوع کے بغیر نمازیں ممکن ہیں؟ ان کی معیت کا احساس کیا ہم کو انہیں کا نہ بنادے گا۔

آمد سحر آں دلبرِ خونیں جگراں  
گفتارِ تو بر خاطر من بار گراں  
شرمت بادا کہ من بہ سویت نگراں  
باشم تو نہی چشم بہ روئے و گراں

یہ یقین جب دل میں راسخ ہو جاتا ہے تو احکام شرعیہ سے تعلق بڑھتا ہے، رزائل دب جاتے ہیں اور فضائل کے چشمے اُبل پڑتے ہیں۔

بلے ہر جا شود مہر آشکارا

سہارا جز نہاں بودن چہ یارا

حضرت خواجہ محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ ملائمت اللہ کو تحریر فرماتے ہیں:

”یہ نسبت عارف پر جب غالب ہو جائے گی تو اس کو احکام شرعیہ سے زیادہ ربط ہوگا۔“ (مکتوبات: ص ۲۲۴)

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ”ازالۃ الخفاء“ میں تصوف کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ارشاد

فرماتے ہیں کہ اس کی تین اصل ہیں:

اصل اول: اعمال خیر مثلاً نماز، روزہ، ذکر، تلاوت وغیرہ کے ذریعہ سے یقین پیدا کرنا، یہ کھلی ہوئی بات ہے

کہ سب مسلمان بقدر استعداد نیکی کرتے ہیں، مگر ان کو مرتبہ یقین حاصل نہیں ہوتا ہے۔ استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اعمال کے ساتھ تین باتیں اور ملائی جائیں تو یقین پیدا ہوتا ہے۔ ایک تو اعمال میں اخلاص، دوسرے اعمال خیر کی زیادتی، تیسرے ان اعمال کی کیفیت خاصہ یعنی خشوع وغیرہ۔

اصل دوم: یقین سے مقامات پیدا ہوتے ہیں جو شیخ ابوطالب مکی کے حسب تحریر دس ہیں۔ توبہ، زہد، صبر، شکر، رجاء، خوف، توکل، رضا، فقر، محبت۔ جب یقین دل پر قبضہ کرتا ہے تو خوف و رجاء سب خدا سے متعلق ہو جاتا ہے اور اعتماد اسباب پر نہیں بلکہ مسبب الاسباب پر ہوتا ہے۔ یہ نہ جاننا کہ مقامات دس ہی ہیں، بلکہ اس کے سوا بھی ہیں، البتہ بنیادی اور اساسی مقامات یہی ہیں۔

اصل سوم: جب یقین کسی پر طاری ہوتا ہے تو وہ جو کچھ کہتا یا کرتا ہے، یقین سے کہتا اور کرتا ہے۔ مقامات عالیہ اُس کے سینے میں پیدا ہوتے ہیں اور دو امور ظاہر ہوتے ہیں، کرامات خارقہ اور تربیت مریداں۔ (مقصد دوم: ص ۱۴۲، ۱۴۳)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ موصوف ”حجة الله البالغة“ میں ارشاد فرماتے ہیں:

”مقامات و احوال کی بنیاد یقین پر ہے، یہ یقین ہی سے توحید اخلاص، توکل، شکر، انس، ہیبت، تفرید، صدیقیت اور محدثیت وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ نے ارشاد فرمایا کہ:

”یقین ایمان ہے۔“

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ”مجھ کو ایسا یقین نصیب فرما کہ دنیا کی مصیبتیں آسان ہو جائیں۔“ (مطبوعہ بریلی ص ۲۸۱)

مولانا اسماعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ شہید فرماتے ہیں:

”جب دل رزائل سے صاف ہو جاتا ہے۔ فضائل مثلاً شجاعت، قناعت، سخاوت، عفت، صبر و شکر، رضا اور توکل خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔“ (صراط مستقیم: ص ۲۸)

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:

”طالب حق کو چاہئے کہ اللہ سبحانہ کے ذکر میں ایسا مشغول ہو جائے کہ غیر اللہ اور خود کو مطلقاً بھول جائے کیونکہ وصول الی اللہ بغیر نفی غیر اللہ کے حاصل نہیں ہوتا ہے۔ طالب حق جب اس درجہ کو پہنچے گا، زہد، تقویٰ، توکل،

عزت، صبر، تسلیم، رضا سب بے قصد حاصل ہو جائیں گے۔“ (ضیاء القلوب: ص ۱۳)

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اخلاقِ ذمیمہ کے دو علاج ہیں، ایک جزئی یعنی خاص وہ یہ کہ ہر خلق کا جدا جدا علاج کیا جائے، جیسا احیاء العلوم وغیرہ میں لکھا ہے اس کو طریق سلوک کہتے ہیں۔ دوسرا کلی یعنی عام، وہ یہ کہ ذکر و شغل سے یا جس طرح شیخ کامل تجویز کرے۔ حق سبحانہ کی محبت قلب میں پیدا کی جائے۔ جب اس کا غلبہ ہوگا، اپنی ہستی خودی مضحل ہونا شروع ہوگی اور سب اخلاقِ ذمیمہ جو کہ اس خودی و دعویٰ ہستی سے پیدا ہوتے ہیں زائل ہو جائیں گے۔ اس کو طریق جذب کہتے ہیں۔“ (کلید مشنوی: دفتر اول ص ۹)

اسی سلسلے میں پیر رومی کے یہ پر جوش اشعار بھی پڑھ لئے جائیں۔

ہر کمرہ جامہ زعشقی چاک شد      اواز حرص و عیب کلی پاک شد

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما      اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما      اے تو افلاطون و جالینوس ما

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلے میں ایک عالم ربانی (اللہ ان کی برکات سے عرصہ تک استفادہ کا موقع

نصیب فرمائے) کے گرامی نامہ کے چند الفاظ بھی نظر سے گزر جائیں۔ ارشاد فرمایا:

”ضرورت اس کی بہت زیادہ ہے کہ اذکار میں پوری جدوجہد کی جائے، تاکہ ذکر طبعیت ثانیہ بن کر نسبت

مع اللہ پیدا کرتا ہوا، احسان جو کہ خلاصہ اور ثمرہ عبادت ہے، پیدا ہو جائے۔“

یہ ہے وہ یقین اور اس یقین کے ثمرات جس کی تحصیل کا ذریعہ تصوف ہے، اب اگر یہ امور کسی درجہ میں

مطلوب ہیں تو تصوف بھی اسی درجہ میں مطلوب ہے۔

والعلم عند اللہ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ

آخر میں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ سطور بالا میں یقین کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا منشاء یہ

ہرگز نہیں ہے کہ اس سے کم درجہ کا یقین کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ حاشا وکلا ایسا نہیں ہے۔ یہاں تو بحث صرف کمال

یقین کی تھی ورنہ خدا اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے متعلق کوئی شخص یقین کا کمزور درجہ بھی اگر رکھتا ہے تو ان شاء اللہ

آخرت میں وہ بیکار نہ ہوگا۔ گواہل ایمان کی شان یہی ہونا چاہئے کہ وہ ایمان و اسلام کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہوں۔

حضرت شاہ اسماعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ:



”جو شخص ان احوال و مقامات سے متصف ہو، اُس کو چاہئے کہ ان لوگوں کی تعظیم میں کوتاہی نہ کرے جو ان امور سے بے خبر ہیں، اس لئے کہ ہر مسلمان حق تعالیٰ کا نام لیتا ہے۔ پس اول تو مسلمان کی تعظیم اس نام پاک کی عظمت کی وجہ سے ہونا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ آدمی خود اپنے آغاز و انجام کو دیکھے۔ تیسرے حق تعالیٰ کے لئے دشوار نہیں کہ کسی کو ایک لمحہ میں

قطب الاقطاب بنادیں۔“ (صراط مستقیم: ص ۱۰۱)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کا ارشاد ہے کہ:

”اصلاح اعمال و عادات اور فضائل اخلاق کا جو ذکر ہوا تو رضائے حق کے لئے اور بارگاہِ خداوندی میں مقبولیت، عزت اور اعتبار کے لئے ہے، ورنہ مدارِ نجات تو صرف اسی کلمہ پر ہے جو صدق دل سے ادا ہو۔“ (صراط مستقیم)

☆☆☆☆

www.daruleeman.com

## تصوف اور شیخین!

”تصوف کے انکار اور اس کی تنقید کے سلسلے میں بعض حلقوں کی طرف سے شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی کثرت سے لیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ مولانا محمد اولیس صاحب کا یہ مختصر مقالہ اس سلسلہ میں اہل انصاف کے لئے تشفی بخش ہوگا۔“ (نعمانی غفرلہ)

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ کا نام لے کر اگر آج ہندوستان میں تصوف صحیح کی مخالفت کی جائے تو اہل علم مخالف کے مبلغ علم کے متعلق اچھی رائے نہ قائم کر سکیں گے۔ پھر کہتے ہیں:

”رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین“

### تصوف اور اتباع سنت!

حقیقی تصوف کی مخالفت تو درکنار، حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ تو دلائل و شواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ:

”طریق کتاب و سنت میں مقید ہے۔“

شیوخ عارفین کا اجماع نقل فرماتے ہیں کہ: ”تصوف کتاب و سنت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔“ اور بطور سند کے حسب ذیل بزرگوں کے اقوال نقل فرماتے ہیں:

سید الطائفہ جنید رحمۃ اللہ علیہ، ابو حفص رحمۃ اللہ علیہ، ابوسلیمان رحمۃ اللہ علیہ دارانی، سہل رحمۃ اللہ علیہ بن عبد اللہ، سری رحمۃ اللہ علیہ، ابویزیر رحمۃ اللہ علیہ، احمد رحمۃ اللہ علیہ بن ابی الحواری، ابو عثمان نیشاپوری، ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ نوری، محمد بن الفضل، عمرو بن عثمان مکی، ابوسعید خراز، ابن عطاء، ابو حمزہ بغدادی (ان کو امام احمد بن حنبل صوفی کہہ کر پکارا کرتے تھے) ابوالفتح رقی، ابویعقوب تہرجوری ابوالقاسم نصر باذی، ابوبکر مستانی، ابو عمرو بن نجید رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

حافظ صاحب موصوف فرماتے ہیں:

”اس راستہ سے جو صوفیاء الگ ہیں، وہ طریق کے رہزن اور ابلیس کے کارندے ہیں۔“ (مدارج السالکین

ج ۲ ص ۲۷۷)

ایک جگہ تصوف کے متعلق بحث فرماتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ:

”تصوف سنت ہی پر عمل کا نام ہے۔“

اس موقع پر حسب ذیل ”اہل الاستقامۃ ائمة الطريق اور علمائے طائفہ“ کے اقوال سے استشہاد کرتے

ہیں۔

سری، سید الطائفہ جنید، ابراہیم بن محمد نصر آبادی، اسمعیل بن نجید، احمد بن ابی الحواری، شبلی، ابو یزید بسطامی، سہل بن عبد اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔ (مدارج السالکین: ج ۳ ص ۷۴)

”اغاثۃ اللہفان“ میں فرماتے ہیں:

”اہل الاستقامۃ صحیح راستہ پر ہیں اور کتاب و سنت کے بغیر وہ خواطر و ہوا ہے جس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے

ہیں۔“ (ص ۶۸)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

”کتاب و سنت کا ہر معاملہ لحاظ، اولیاء اللہ کے نزدیک متفق علیہ ہے اور مشائخ کے اقوال میں بہ کثرت اُس

کی ہدایات موجود ہیں۔“ (الفرقان: ص ۳۱)

اسی طرح اگر شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دے کر حقیقی تصوف پر ناروا تنقید کی جائے تو جن لوگوں نے ان دونوں بزرگوں کی کتابوں کو پڑھا ہے اور جن کو ان بزرگوں (خصوصاً حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ) کے تصوف و احسان میں مرتبہ کا کسی قدر کتابی علم ہے، وہ ان ناقدین کے متعلق زیادہ بہتر خیال ظاہر نہ کر سکیں گے۔

ہم امکان کی حد تک حسن ظن سے کام لینا چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان ناقدین نے شیخین کی کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں فرمایا ہے۔ ورنہ شیخین کا نام لے کر وہ تصوف کی اس بیباکی کے ساتھ مخالفت نہ کرتے۔ بلاشبہ شیخین کی کتابوں میں تصوف کے بعض مسائل پر سخت تنقید ملتی ہے، اسی طرح متصوفین پر وہ سخت دار و گیر بھی کرتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تنقید کن صوفیاء پر اور کس تصوف پر ہے؟ کیا اُس تصوف پر جو کتاب و سنت کا اصل مقصد ہے؟ جس کا منتہی رجائے حق ہے؟ جس میں قدم قدم پر کتاب و سنت کے اتباع کی تاکید ہے؟ جس کی تعلیم حسن بصری، ابراہیم بن ادہم، فضیل بن عیاض، معروف کرخی، بشر حافی، شفیق بلخی، جنید، سہل تستری، ابوطالب مکی اور شیخ عبد القادر جیلانی رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے دی ہے؟ یہ لوگ ہیں جن کے متعلق شیخ الاسلام

ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

”یہ اسلام کے مشائخ ہیں، ائمہ ہدایت ہیں، خدا نے اُن کے حق میں امت کے اندر ”لسان صدق“ رکھ دی ہے۔“ (جلاء العینین: ص ۵۹)

۱۔ یہاں ایک واقعہ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے، ایک مرتبہ راقم سطور نے اپنے استاد علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عرض کیا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن قیم کے یہاں چونکہ تکلف نہیں ہے اس لئے اُن کی کتابوں میں بے حد جی لگتا ہے۔ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ابھی آپ نے ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن قیم کو نہیں پڑھا ہے جو فلسفیانہ باتیں کرتے ہیں، اس وقت تک عاجز نے شیخین کے فلسفیانہ اور متکلمانہ مباحث کو نہیں پڑھا تھا، پھر جب سید صاحب کی راہنمائی میں شرح عقیدہ اصفہانیہ کا مطالعہ کیا تو سید صاحب نے فرمایا: ”جب علم کلام کی سیر کا جی چاہے تو ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ پکڑ کر سیر کر لیا کیجئے گا۔“ بہت پر امن راستہ ہے۔

انہی ابراہیم بن ادہم، فضیل بن عیاض، معروف کرنی، ابوسلیمان دارانی، احمد بن الحواری، اور سری سقطی رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے متعلق ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔

”واکابر شیوخ الصالحین“ (فی السماع والرقص)

ایک موقع پر فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادہم، ابوسلیمان دارانی، معروف کرنی، جنید بن محمد، سہل بن عبد اللہ تسری رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور انہی کے مثل لوگوں کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ:

”یہ کتاب وسنت کے مشائخ ہیں۔“

اسی طرح یہ کہنے کا جی چاہتا ہے کہ لوگوں نے ابھی ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کو بہت کم پڑھا ہے، جو تصوف کے مباحث میں عالمانہ کلام کرتے ہیں، ورنہ تصوف کے متعلق نقطہ نظر دوسرا ہوتا۔ بلاشبہ شیخین کی کتابوں میں تصوف کے بعض مسائل پر سخت تنقید ملتی ہے، اسی طرح متصوفین پر وہ سخت داروگیر بھی کرتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تنقید کن صوفیہ پر اور کس تصوف پر ہے؟ کیا اُس تصوف پر جو کتاب وسنت کا اصل مقصد ہے؟ جس کا منتہی رجائے حق ہے؟ جس میں قدم قدم پر کتاب وسنت کے اتباع کی تاکید ہے؟ جس کی تعلیم حسن بصری، ابراہیم بن ادہم، فضیل بن عیاض، معروف کرنی، بشرحانی، شفیق بلخی، جنید، سہل تسری، ابوطالب مکی اور شیخ عبدالقادر جیلانی نے دی ہے؟ یہ لوگ ہیں جن کے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

”یہ اسلام کے مشائخ ہیں، ائمہ ہدایت ہیں، خدا نے اُن کے حق میں امت کے اندر ”لسان صدق“ رکھ دیا ہے۔“  
(جلاء العینین: ص ۵۹)

انہی ابراہیم بن ادھم، فضیل بن عیاض، معروف کرخی، ابوسلیمان دارانی، احمد بن الحواری، اور سری سقطی کے متعلق ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

”واکابر شیوخ الصالحین“ (فی السماع والرقص)

ایک موقع پر فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادھم، ابوسلیمان دارانی، معروف کرخی، جنید بن محمد، سہل بن عبد اللہ تسری اور انہی کے مثل لوگوں کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ:

”یہ کتاب وسنت کے مشائخ ہیں۔“

### فنِ تصوف کی اہمیت!

شیخ الاسلام ہروی صفا کی بحث میں لکھتے ہیں کہ:

”اس کے تین درجے ہیں، پہلا درجہ اس علم کا ہے جو سلوک طریق کے لئے انسان کو سنوارتا ہے۔“

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ:

”جس علم صافی کی طرف اشارہ کیا ہے، یہ وہی علم ہے جس کی قوم (یعنی صوفیاء اصحاب طریقت) نے وصیت کی ہے اور اس کی مفارقت سے ڈرایا ہے اور جس نے اس علم کو چھوڑا، اس کو بالکلیہ اہل طریق میں سے نکال دیا ہے اور یہی وہ علم ہے جس کو حضرت نبی کریم ﷺ لے کر تشریف لائے تھے۔“

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ فرماتے تھے:

”ہمارا یہ علم کتاب وسنت میں مقید ہے، پس جو کتاب وسنت سے الگ ہو، اس کو پیروی نہ کی جائے۔ یہی وہ علم صافی ہے جو مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ، یہ اس علم والے کو طریق عبودیت پر چلنے کے لئے سنوار دیتا ہے۔“ (مدارج السالکین: جلد ۲ ص ۸۹)

ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

”تصوف سلوک حقیقی کا ایک گوشہ ہے اور اس کا کام نفس کی تہذیب اور اس کا تزکیہ ہے، تاکہ اس کو رفیق اعلیٰ

کی صحبت کی سیر کے لئے تیار کر دے۔“ (مدارج السالکین: جلد ۲ ص ۱۷۷)

حضرت جنید کے قول: ”إِذَا رَاكَ اللَّهُ بِالْمَرِيدِ خَيْرًا وَقَعَهُ عَلَى الْفُقَرَاءِ مِنْهُ صَحْبَةُ الْقَرَاءِ“ ترجمہ: اللہ

تعالیٰ جب مرید کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو فقراء کی صحبت میں ڈال دیتا ہے اور قراء کی صحبت سے رو کر دیتا ہے۔ کی شرح میں لکھتے ہیں:

”قاری سے مراد ان لوگوں کے نزدیک وہ شخص ہے کہ جس کا رجحان عبادات کے ظاہر کی طرف ہو اور اہل تصوف، ارباب قلوب اور اہل معارف کے پاس جو ارواح معارف حقائق ایمان، روح محبت اور اعمال قلوب ہیں ان کو اس کی خبر نہیں ہے۔ پس جنید کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی پر خدا کا فضل ہوتا ہے اس کو صوفیاء کے پاس جانے کی توفیق ملتی ہے جو اس کے اخلاق کی تہذیب کرتے ہیں۔ ذائم اخلاق کا ازالہ کرتے ہیں، منازل طریق کی خبر دیتے ہیں اور قراء صرف ظاہری عبادات پر لگاتے ہیں اور اعمال کی چاشنی نہیں سکھاتے ہیں۔“

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلہ میں اپنا مشورہ دیتے ہیں کہ:

”ہوش مند کا کام یہ ہے کہ ہر جگہ سے وہ اپنا حصہ لے اور ہر جماعت سے بہتر معاملہ کرے، یہ طریقہ صادقین کا ہے۔“ (مدارج السالکین: جلد ۲ ص ۲۰۶)

حقیقی تصوف اور صحیح صوفیاء کے متعلق شیخین کی تصریحات بالا کے بعد کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ حضرات تصوف کے مخالف تھے۔

اصل یہ ہے کہ ناقدین کو غلط فہمی ہے، ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی تنقید تصوف اور اہل حق صوفیاء پر نہیں ہے، بلکہ ان کو فلسفیانہ تصوف سے اختلاف ہے۔ فلسفیانہ تصوف کسے کہتے ہیں؟ اس کو حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کی زبان سے سنئے:

”فلسفیانہ تصوف سے مقصود الہیات کے متعلق حکیمانہ خیالات رکھنا اور فلاسفہ کی طرح خشک زندگی اختیار کر کے ان کی اخلاقی تعلیمات پر عمل کرنا ہے، اس فلسفیانہ تصوف کا ماخذ یونان کا اشرافی اور اسکندریہ کا افلاطونی اسکول ہونا بعض قدیم مسلمان حکماء کے نزدیک بھی مسلم تھا۔“

مشہور حکیم ابوریحان البیرونی کہتا ہے کہ:

”سوف یونانی میں حکمت کو کہتے ہیں اور اسی سے فلیسوف کو یونانی میں ”پیللاسوپا“ کہتے ہیں، یعنی حکمت کا عاشق، چونکہ اسلام میں بعض لوگ ان کے قریب گئے، اس لئے وہ بھی اسی نام (صوفیاء) سے پکارے گئے۔“

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ ”فی السماع والرقص“ میں لکھتے ہیں:

”اور ابن سینا نے ایک فلسفہ پیدا کیا، جس کو اس نے پہلے یونانی فلاسفہ اور (مسلمانوں میں سے) بدعتی

متکلمین جھمیہ وغیرہ کے خیالات سے ملا کر بنایا تھا اور بہت سی علمی اور عملی باتوں میں وہ اسماعیلی مجددوں کے راستے پر چلا اور کچھ باتیں اس میں صوفیاء کی ملا دیں جو حقیقت میں اس کے ہم خیال اور اسماعیلی قرامطہ باطنیہ کے خیالات سے ماخوذ تھیں، کیونکہ ابن سینا کے اہل خاندان مصر کے حاکم بامر اللہ (فاطمی اسماعیلی) کے پیروؤں میں سے تھے۔ یہ لوگ اسی زمانہ میں تھے اور ان کا مذہب رسائل اخوان الصفا والوں کا مذہب تھا۔“

حاجی خلیفہ چلپی ”کشف الظنون“ میں تصوف کے ضمن میں لکھتا ہے کہ:

”اور جاننا چاہئے کہ حکماء الہیات میں سے اشراقی مشرب اور اصطلاح میں صوفیوں کے مانند ہیں۔ خصوصاً اُن میں سے پچھلے (اشراقی) لیکن فرق صرف ان مسائل میں ہے جن میں اشراقیہ کا مذہب اسلام کے مخالف ہے اور یہ کچھ بعید نہیں ہے کہ یہ اصطلاح (تصوف) انہی کی اصطلاح (سوف) سے ماخوذ ہو، جیسا کہ اس شخص سے چھپا نہیں ہے، جس نے اشراقی فلسفہ کی کتابیں دیکھی ہیں۔“

ان حوالوں سے واضح ہوتا ہے کہ فلسفیانہ تصوف، فلسفہ اشراق، جدید افلاطونی الہیات اور اخوان الصفا کی تاویلات ایک ہی سرچشمہ کی دھاریں ہیں۔ (خیام مختصراً)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کو اسی فلسفیانہ تصوف سے اختلاف تھا اور اسی تصوف سے پیدا شدہ مسائل پر وہ کڑی تنقید کرتے تھے۔ خود ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

”ان لوگوں نے تصوف میں گفتگو کی، لیکن مسلمانوں کے طریق پر نہیں، بلکہ فلاسفہ کے طریق پر۔“ (جلاء العینین: ص ۲۳)

رسالہ ”علم الظاہر والباطن“ میں باطنیہ اور قرامطہ کی تلخیصات کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”اور اسی قسم کی بہت سی باتیں متکلمین صوفیاء کے کلام میں راہ پا گئیں۔“ (مجموعہ رسائل نیریہ: اول)

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ زنادقہ صوفیاء کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”طریق کے رہزن زنادقہ صوفیاء اور ملاحدہ وہ ہیں جو پیغمبر کی پیروی کو طریق میں ضروری نہیں جانتے

ہیں۔“ (مدارج السالکین)

شیخین بلکہ تمام علماء حق کے مخالفت اسی طبقہ صوفیاء سے ہے، ورنہ جہاں تک صحیح تصوف اور اہل حق صوفیاء

کا معاملہ ہے، شیخین ان کا اعتراف اور پورا احترام کرتے ہیں۔ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ:

”صوفیاء میں بعض متکلمین کے طریق پر ہیں اور بعض اہل فلسفہ کے طریق پر اور ایک جماعت وہ ہے جو اہل حق

کے مسلک پر اور سنت پر ہے۔ جیسے فضیل اور تمام وہ لوگ جن کا (امام قشیری) نے رسالہ میں ذکر کیا ہے۔“ (جلاء العینین: ص ۳۵)

رسالہ قشیریہ بڑی آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے، اس میں تراسی اکابر صوفیاء کا ذکر ہے، ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ان کو مسلک اہل السنۃ پر مانتے ہیں اور یہی وہ حضرات ہیں کہ محققین صوفیاء آج بھی انہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ ”فی السماع والرقص“ میں خالی متصوفین کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

”یہ لوگ محققین صوفیاء اور اُن کے ائمہ کے برعکس ہیں۔“

معلوم ہوا کہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کو محققین صوفیاء سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے مدارج السالکین میں صوفیاء کی چار قسمیں اُن کے احوال کے اعتبار سے بیان کی ہیں اور ان کی مدح فرمائی ہے۔ (مدارج السالکین: جلد ۳ ص ۸۱)

ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ:

”حضرات صحابہ کرام ؓ اور امت کے دوسرے کاملین علم اور حال دونوں کے جامع تھے، جب اہل علم اور اہل حال میں تفریق ہوگئی، اسی وقت سے نقص اور خلل پیدا ہو گیا۔“ (مدارج السالکین: جلد ۳ ص ۸۲۔)

ابو العباس بن الغریف نے اپنی کتاب ”محاسن المجالس“ میں محبت اور شوق پر گفتگو کی ہے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ اس پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ہم ان کے کلام کو ذکر کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو مضامین منکشف فرمائے ہیں، اُن کو بھی نفع کی اُمید پر لکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر احسان فرمائے اور اُس کو علم سے حال کی طرف اور وصف سے اتصاف کی طرف لے جائے۔ (یعنی اُس کے علم کو اُن کا حال بنادے) اور ان اوصاف کا متصف بنادے۔“

(طریق الحجرتین: ۳۸۰)

باب الذوق میں فرماتے ہیں کہ:

”جن لوگوں نے ایمان کا دعویٰ کیا، لیکن وہ صاحبان ذوق نہ تھے، حق تعالیٰ نے اُن سے فرمایا کہ اپنے کو مومن نہ کہو، مسلم کہو: ﴿قَالَ الْأَعْرَابُ امْنَا قُلْ لَمْ تَمُنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ﴾ پس یہ لوگ مسلمان ہیں، مومن نہیں، اس لئے کہ ایمان اُن کے دل کے اندر رچا نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ صاحب ذوق نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ دائرۃ اسلام سے خارج ہیں، یا اُن کے اعمال کے اجر میں کمی ہوگی



(البتہ صاحب ذوق کا معاملہ ہی دوسرا ہے) ذوق ایک باطنی امر ہے اور عمل اس کا نشان ہے۔ پس اعمال علوم و عقائد کے ثمرات ہیں اور یقین سے جہاد اور احسان کے مقامات پیدا ہوتے ہیں۔“ (مدارج السالکین: ج ۳ ص ۵۸)

ذرا غور کیجئے کہ یہ جلیل القدر شیخ اذواق صحیحہ اور احوال صالحہ (جو کہ ثمرات مجاہدات میں سے ہیں) کا کیسا مداح ہے؟

”مدارج السالکین“ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول نقل کرتے ہیں کہ:

”میں نے صوفیاء کی صحبت اختیار کی اور ان کی دو باتوں سے بڑا نفع اٹھایا، ایک یہ کہ وقت ایک تلوار ہے۔ اگر تم اس کو نہ کاٹو گے تو وہ تم کو کاٹ دے گا اور دوسری بات یہ کہ اگر تم اپنے نفس کو حق میں مشغول نہ کرو گے تو وہ تم کو باطل میں مشغول کر دے گا۔“

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

”یہ کتنے قیمتی فقرے ہیں اور اپنے قائل کے علو ہمت پر دلالت کرتے ہیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ منقبت اس طبقہ (صوفیاء) کی جلالت شان کے لئے کافی ہے۔“ (مدارج السالکین: ۸۰/۳)

شیخین کو صوفیاء کے جس مسئلہ سے زیادہ تر اختلاف تھا وہ وحدت الوجود کا مسئلہ تھا۔ (القول الجلی

بر حاشیہ جلاء العینین: ص ۲۷)

جس وحدت الوجود سے ان کو اختلاف تھا اس کی حقیقت بھی انہی کی زبان سے سن لیجئے۔

”اس وحدت الوجود کی غایت یہ ہے کہ اس کے ماننے والے عبد اور معبود خالق اور مخلوق آمر اور مامور طاعت اور معصیت میں فرق نہیں کرتے۔ (طریق الہجر تین: ص ۳۳۳)

ملاحظہ اہل وحدت الوجود کے نزدیک غیر حق، عین حق میں گم ہو جاتا ہے، بلکہ غیر حق کا وجود نفس حق کا وجود ہوتا ہے، جس دونوں وجودوں میں فرق کرتا ہے۔ لیکن جب جس غائب ہوتا ہے تو کھل جاتا ہے کہ غیر حق کا وجود عین حق ہے۔“ (مدارج السالکین: ج ۳ ص ۸۷)

اس وحدت الوجود کے متعلق خود محققین صوفیاء کا مسلک کیا ہے؟ ذرا اس کو بھی گوش ہوش سے سنئے۔ حکیم

الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:

”عینیت کے یہ معنی نہیں کہ دونوں ایک ہو گئے، یہ تو صریح کفر ہے۔“ (تعلیم الدین: ج ۱ ص ۹۵)

اب اس مسئلہ کی اصل حقیقت بھی مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے سمجھ لیجئے:

”گو ممکنات موجود ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وجود دیا ہے۔ موجود کیوں نہ ہوتے، مگر وجود حق کے روبرو ان کا وجود نہایت ناقص و ضعیف و حقیر ہے، اس لئے وجود ممکن کو وجود حق کے روبرو گودم نہ کہیں گے مگر کالعدم ضرور کہیں گے، جب یہ کالعدم ہوا تو وجود معتد بہ ایک ہی رہ گیا۔ یہی معنی ہیں وحدت الوجود کے، کیونکہ اس کا لفظی ترجمہ ہے کہ ایک ہونا وجود کا۔ سوا ایک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ دوسرا گھر ہے سہی، مگر ایسا ہی ہے جیسا نہیں، مگر اس کو ادعاء وحدت الوجود کہا جاتا ہے۔ اس مسئلہ کو مرتبہ تحقیق علمی میں توحید کہتے ہیں جس کی تحصیل کوئی کمال نہیں اور جب یہ سالک کا حال بن جائے تو اس مرتبہ میں فنا کہلاتا ہے، یہ البتہ مطلوب و مقصود ہے اور یہی حاصل ہے وحدۃ الشہود کا جس کی دلالت اس معنی پر بہت ہی ظاہر ہے کیونکہ اس کا ترجمہ ہے ایک ہونا شہود کا، کہ واقع میں تو ہستی متعدد ہیں، مگر سالک کو ایک ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور سب کالعدم معلوم ہوتے ہیں۔ پس وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں اختلاف لفظی ہے۔ کما قال مرشدی مگر چونکہ وحدۃ الوجود کے معنی عوام میں غلط مشہور ہو گئے تھے اس لئے بعض محققین نے اس کا عنوان بدل دیا۔“

(کلیدِ مثنوی: ”شرح از شعر“ جملہ معشوق است و عاشق پردہ زندہ معشوق است و عاشق مردہ)

مسئلہ کی اس تفصیل کو ذہن میں رکھئے اور اب دیکھئے کہ شیخین کے ارشادات اس سلسلہ میں کیا ہیں؟

حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تقریر کا مفہوم حسب ذیل ہے:

”جس طرح انوار مخلوقہ نور حق کے سامنے اور علم خلق، علم حق کے سامنے اور مخلوق کی قدرت خدا کی قدرت کے سامنے مضحل ہے، اسی طرح زمان، دہر اور وقت دوام الہی کے سامنے مضحل ہے۔ جب سالک پر یہ استغراق طاری ہوتا ہے، قوت تمیز کمزور ہوتی ہے اور حال غالب ہوتا ہے تو اہل استقامت کی زبان سے نکل جاتا ہے کہ ”ما فی الوجود الا اللہ۔ مامن موجود الحقیقۃ الا اللہ ہناک یفنی من لم یکن ویبقى من لم یزل“ بلاشبہ وجود حق اور جب اُس کا دوام ماسوئی پر غالب آتا ہے تو ہر چیز ایسی ہوتی ہے جیسے کہ وہ نہیں ہے اور یہیں سے وحدۃ الوجود کے قائلوں کو غلط فہمی ہو گئی کہ واقعی کوئی دوسرا وجود نہیں ہے۔ اور اس قسم کے مشتبہ کلمات کو (جواہل استقامتہ کی زبان سے نکل گئے) انہوں نے اپنے کفر کا سنگ بنیاد قرار دے دیا۔“ (مدارج السالکین: ج ۳ ص ۸۶، اس بحث کو طریق الحجرتین: ص ۳۳۴ نیز مدارج السالکین: جلد اول ص ۸۳ میں ملاحظہ کیا جائے۔)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فناء کی تین قسمیں بیان کرتے ہیں: پہلی فناء انبیاء اور کالمین اولیاء کا حصہ ہے۔ دوسری قسم قاصدین اولیاء و صالحین کو نصیب ہوتی ہے، اس دوسری قسم کی ضمن میں شیخ فرماتے ہیں:

”دوسری قسم ماسواء کے شہود سے فناء ہے اور یہ اکثر سالکین کو پیش آتی ہے۔ خدا کی محبت، عبادت اور یاد کی طرف انجذاب سے یہ صورت پیدا ہوتی ہے۔ محبوب و مطلوب کا استغراق غیر کا شعور نہیں باقی رہنے دیتا ہے۔ پس موجود کا وجود، مشہود کا شہود اور مذکور کا ذکر اس سے غائب ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ مخلوق (اس کی نگاہ میں) فنا ہو جاتی ہے اور صرف خدا باقی رہ جاتا ہے (چونکہ پہلی قسم کی فنا سے اس فنا کا درجہ کم ہے، اس لئے) انبیاء اور اکابر اولیاء اللہ مثلاً حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور سابقین اول کو یہ فنا پیش نہیں آئی۔ ان امور کی ابتداء تابعین کے عہد سے ہوئی ہے اور شیوخ صوفیاء سے مثلاً ابویزید، ابوالحسن نوری، ابوبکر شبلی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ کو یہ حالات پیش آئے اور ان کے سوا ابوسلیمان درانی، معروف کرخی، فضیل بن عیاض، بلکہ جنید رحمہم اللہ تعالیٰ کو بھی یہ صورت پیش نہیں آئی۔“ (العبودیتہ: ۹۸)

غور کیجئے کہ تحقیق صوفیاء کے وحدت الوجود یا وحدت الشہود میں اور شیخین کی بیان کردہ اس فنا میں کیا فرق ہے؟ کوئی شبہ نہیں کہ فنا کے اس مرتبہ کو شیخین وہ اہمیت نہیں دیتے ہیں جو فنا کی پہلی قسم کو ان کے نزدیک حاصل ہے، مگر اس مرتبہ کو نہ صرف یہ کہ وہ گمراہی نہیں قرار دیتے ہیں بلکہ اقرار کرتے ہیں کہ حضرات تابعین کے وقت سے یہ کیفیات پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی وسعت خیال کا تو یہ عالم ہے کہ اگر سالک غلبہ حال میں ”سجانی“ یا ”مافی الحجة الالہ“ کہہ دے تو وہ اس کو بھی معذور اور معافی کے لائق جانتے ہیں۔ (مدارج السالکین: ج ۱ ص ۸۲ و طریق الحجرتین)

اگر فلسفیانہ تصوف کے سوا صحیح تصوف میں بھی کسی موقع پر انہوں نے اختلاف رائے ظاہر کیا ہے تو اس پر غور کیجئے کہ یہ اختلاف تصوف کے اصول و مقاصد سے ہے یا فروع میں۔ آپ یقین کریں کہ ان دونوں بزرگوں کو تصوف کے اصول اور مقصد سے مخالف کہیں نہ پائیں گے باقی فروع میں اختلاف کوئی اہم چیز نہیں ہے۔ نیز یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ باہم جلالت قدر و رفعت شان بہر حال غیر معصوم انسان تھے، جس طرح دوسروں کی رائے غلط ہو سکتی ہے اسی طرح وہ بھی غلطی کر سکتے ہیں اور ان کا اختلاف مسئلہ کے سقم کی نشانی نہیں ہے۔ اور اگر ان کا اختلاف صحیح بھی ہے تو کسی مسئلہ میں اختلاف کے یہ کب معنی ہیں کہ پورے فن کے مخالف تھے۔ بہتر ہو کہ ہمارے ناقدین خود حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کو قبول کر لیں جو انہوں نے شطحات صوفیاء کے ضمن میں ظاہر کی ہے فرماتے ہیں:

”ان شطحات سے دو مصیبتیں پیدا ہوئیں، ایک یہ کہ ان شطحات کی وجہ سے ایک جماعت ان بزرگوں سے

بدن ہوگئی اور ان کی پاکیزگی نفس، صدق معاملہ اور محاسن ان سے چھپ گئے اور ان حضرات کا مطلقاً انکار کر دیا گیا۔ لوگ اُن سے بدگمان ہو گئے، حالانکہ یہ صریح زیادتی ہے۔ کیونکہ جس شخص سے کوئی غلطی ہو جائے اگر اس کے تمام محاسن کا انکار کر دیا جائے تو تمام علوم اور صناعات بیکار ہو جائیں اور اُن کے نشانات مٹ جائیں۔ دوسری مصیبت یہ کہ بعض بزرگوں نے ان بزرگوں کے محاسن، صفاء قلب اور حسن معاملہ کو دیکھ کر اُن کے شطحیات کو بھی قبول کر لیا۔ ان سب میں صحیح تر وہ لوگ ہیں جو ہر چیز کو اپنے مرتبہ میں رکھتے ہیں۔ صحیح کو قبول کرتے اور غلط کو رد کرتے ہیں۔“ (مدارج السالکین: ج ۲ ص ۳۰)

یہی حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ ”مدارج السالکین“ میں ایک موقع پر شیخ الاسلام ہروی سے اختلاف کرتے ہیں، مگر فوراً ناظرین کو متنبہ کرتے ہیں کہ:

”یہ غلطی شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے بدن نہ کر دے اور ان کے محاسن کو نظر سے گرانہ دے، اس لئے کہ علم امامت معرفۃ اور سلوک میں ان کا جو مرتبہ ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے۔“ (مدارج السالکین: ج ۱ ص ۱۰۸)

حافظ موصوف کی یہی انصاف پسندی ہے کہ ”شیخ الاسلام حبیب البینا والحق احب الینامنه“ (مدارج السالکین: ج ۲ ص ۱۹) کے پیش نظر وہ ہروی سے جابجا اختلاف بھی کرتے ہیں، لیکن اُن کے محاسن اور رسوخ علم کے اعتراف میں بھی پیش پیش ہیں، ایک موقع پر کہتے ہیں:

استشهداه بهذه الاية فى هذا الباب يدل على رسوخه فى العلم والمعرفة والقرآن. (مدارج السالکین: ج ۳ ص ۱۲۲)

اور انجام کار یہی حافظ ابن قیم انہیں صوفی شیخ الاسلام ہروی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کہتے ہیں:

”اللہ شیخ الاسلام کی سعی کو مشکور فرمائے، اُن کے درجے بلند فرمائے، اُن کو بہترین جزا دے اور اُن کے محل کرامتہ میں ہم کو اور اُن کو جمع فرمائے۔“ (مدارج السالکین: ج ۲ ص ۲۷)

اب خاتمہ سخن پر خاکسار کو یہ عرض کرنا ہے کہ جن لوگوں کو شیخ الاسلام قصہ مخضر یہ ہے کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دے کر تصوف صحیح کی مخالفت کرنا ہرگز قرین انصاف نہیں ہے۔ ان دونوں بزرگوں کی کتابوں (فن تصوف پر حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے مفصل کتاب ”مدارج السالکین“ ہے جو تین جلدوں میں علامہ رشید رضا مصری مرحوم کے اہتمام میں چھپی ہے، اس کے ٹائٹل پیج پر درج ہے:

”یہ وہ کتاب ہے جس میں تصوف اور معارف الہیہ کے حقائق کتاب وسنت اور سلف صالحین کے مطابق

بیان کئے گئے ہیں۔ مصر کے ایک مشہور عالم شیخ حامد فتی (جو شیخین کے خاص محبین میں سے ہیں اور ان کے علوم کی نشر و اشاعت کا بہت شوق رکھتے ہیں) کو بڑا غم ہے کہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں شیوخ صوفیاء سے بکثرت نقل کیوں کیا ہے اور ان کے کلام کو اسلامی کیسے قرار دے دیا ہے؟ (حاشیہ العبودیتہ: ص ۲۹)

شیخ حامد کو یہی شکایت ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ہے کہ انہوں نے مشائخ صوفیاء کی تعریف کیوں کی ہے؟ (حواشی العبودیتہ) اللہ اکبر! یہ ”لنناس اعداء لما جہلوا“ کی کیسی دردناک صورت حال ہے۔ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی ہر رائے بہتر اور قابل ترجیح، لیکن جب وہ کوئی ایسی چیز بیان کریں جس کو اپنا نفس نہ قبول کرے تو وہ کسی دلیل کے بغیر رد کر دی جائے؟

علامہ رشید رضا مصری نے اس کتاب پر ایک مقدمہ لکھا ہے۔ انہوں نے بھی تصوف کے متعلق عام خیال بہتر نہیں ظاہر کیا ہے مگر مجبوراً یہ اقرار کرتے ہیں کہ: ”بلاشبہ صوفیاء کے حقائق ہیں جن کے سامنے فقہاء و متکلمین کی گردنیں جھک گئی ہیں اور یہ درحقیقت علماء حکماء ہیں۔ اسی دیباچہ میں کہتے ہیں کہ صالح صوفیاء نے اسرار شریعت کے بیان اور تربیت اخلاق کے ذریعہ سے اسلام کی خدمت کی ہے۔“

پڑھا جائے، دیکھا جائے کہ یہ مسائل تصوف پر کیسی عالمانہ بحث فرماتے ہیں، مشائخ کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ صحیح و سقیم میں امتیاز کرتے ہیں۔ راجح و مرجوح میں فرق فرماتے ہیں۔ صوفیاء کے درمیان مختلف فیہ مباحث میں محاکمہ کرتے ہیں۔ اگر یہ اس راہ حق کے رہبر اور بحر معرفت کے شناور نہ ہوتے تو اس فن میں یہ مرتبہ پانا ممکن نہ تھا۔ اقوال کے سوا خود ان کے احوال کو ملاحظہ کیجئے۔ ذکر الہی کی کثرت، عبادات میں خشوع و خضوع اور تبتل الی اللہ کا کیا عالم تھا؟ اگر طول بحث کا خوف نہ ہوتا تو میں ان احوال کو نقل کرتا جو حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ”مدارج السالکین“ میں ابواب تصوف کے ماتحت حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق نقل فرمائے ہیں۔ یہی اسباب ہیں کہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے صراحۃً فرمایا ہے کہ: ”جو شخص منازل السائرین کی شرح (مدارج السالکین) کو دیکھے گا اُس پر واضح ہو جائے گا کہ یہ دونوں حضرات (ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ و ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ) نہ صرف یہ کہ اہل سنت والجماعت میں سے ہیں، بلکہ اس اُمت کے اولیاء میں سے ہیں۔“ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ: ج ۴ ص ۴۲۷)

حافظ ابن رجب حنبلی کہتے ہیں:

”ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کو تصوف میں بڑا مرتبہ حاصل تھا اور ان کو اذواق و مواجید صحیحہ کا بڑا حصہ ملا تھا، جس پر

ان کی کتابیں شاہد ہیں۔“ (جلاء العینین: ص ۲۰)

ان حقائق کے انکشاف کے بعد ہمارے ناقدین اور معترضین شیخین کی کتابوں کو پڑھیں اور فیصلہ کریں کہ ان بزرگوں کو کس تصوف سے اختلاف تھا؟

ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ، حافظ ابن قیم، حضرت مجدد الف ثانی اور مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ سے حسن ظن ہے ان کو علمائے حق میں سے جانتے ہیں یا تو وہ یہ فیصلہ کر لیں کہ یہ سب حضرات با ایں ہمہ اتباع سنت ایک غلط چیز کو قبول کرنے پر متفق ہو گئے تھے؟ اور ان سب نے عہدِ اچھا اُمت کو نادرست چیز کی تعلیم و تلقین کی؟ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر خود اپنے متعلق غور کریں کہ کہیں اس باب میں انہی سے تو غلطی نہیں ہو رہی ہے؟

ناجیز راقم کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ ہمارے یہ معترضین و ناقدین اتنے اعتراض و تنقید کے وقت اس مروجہ تصوف کو پیش نظر رکھتے ہیں جس کی بارگاہ میں گستاخی کے مجرم ہم نیاز مند بھی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہم جس طرح اسرائیلیات کی بناء پر تفسیر کو، موضوعات کی بنا پر فن حدیث کو اور مرجوع مسائل کی بنا پر دفا تر فقہ کو رد نہیں کرتے ہیں۔ اسی طرح تصوف کے نام پر آج بہت سی خانقاہوں اور مزاروں پر جو کچھ ہوتا ہے، اس کی بناء پر نفس تصوف کو ہم رد نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ محمد اللہ اصل اور نقل کے امتیاز کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ (دیکھئے تصوف کیا ہے: ص ۶۱ تا ۱۱۰)

اب آخر میں راہ تشوکیہ و اخلاص کے طالبوں کے لئے چند ابتدائی مفید مشورے حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے پیش کرتے ہیں۔

### تصوف و احسان کے طالبوں کو چند ابتدائی مشورے!

”اس کتاب کے ابتدائی پانچ مقالات جب باقسط ”الفرقان“ میں شائع ہوئے تو بعض حضرات نے ان کو پڑھ کر اصرار فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے جن بندوں کے دلوں میں ان کے مطالعہ سے دین کے اس شعبہ کی ضرورت کا احساس اور اس کی تحصیل کی چاہت پیدا ہو، ان کو کچھ ایسے ابتدائی مشورے دینا بھی ضروری ہیں جن کی روشنی اور راہنمائی میں وہ اگر چاہیں تو بلا تاخیر اپنا سفر شروع کر سکیں۔ کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ اس قسم کے احساسات پر اگر جلدی عملی قدم نہ اٹھایا جائے تو بالآخر وہ مضلل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس لئے چند ابتدائی مشورے عرض کر دینا بھی مناسب معلوم ہوا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ان سے فائدہ پہنچائے۔“ محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

اللہ کے جن بندوں کے دل میں دین کے اس تکمیلی شعبہ کی طلب اور اس کی تحصیل کا داعیہ پیدا ہو، ان کو چاہئے کہ:

سب سے پہلے تو اپنی نیت صحیح کریں۔ یعنی اپنے نفس کی اصلاح اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنی عبدیت کے تعلق

کی درستی اور اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کو مقصود بنائیں۔ کشف و کرامات کی طلب یا بزرگی اور بڑائی حاصل کرنے کی ہوس ایک طرح کا شرک ہے۔ اس لئے اس طرح کا کوئی مقصد دل کے کسی گوشہ میں بھی باقی نہ رہنے دیں۔

پھر نیت اور ارادہ کی اس تصحیح کے بعد اس راستہ کی راہنمائی اور رہبری کے لئے اللہ کے کسی ایسے صالح اور صاحب ارشاد بندے کی طرف رجوع کریں جو اس کے اہل ہوں اور طبیعت کو بھی جن کے ساتھ مناسبت ہو اور جن کی خدمت میں پہنچنا اور صحبت سے فیضیاب ہونا زیادہ مشکل نہ ہو۔

اگر ایسے حضرات سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے خود فیصلہ اور انتخاب مشکل ہو تو بہتر یہ ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ اور دین میں بصیرت رکھنے والے نیک صالح لوگوں سے مشورہ لیں اور اپنے زمانہ کے جن جن بزرگوں کے متعلق وہ رائے دیں ان کی خدمت میں جائیں اور چند چند دنوں ٹھہر کر خود دیکھیں اور جہاں طبیعت کی مناسبت محسوس ہو اور دل میں جن کی عظمت اور محبت زیادہ پیدا ہو اور جن سے اپنے کونفیع کی زیادہ امید ہو، ان ہی کو اپنے لئے منتخب کر لیں اور اگر مخلص اور اہل مشیروں کے مشورے ہی سے کسی بزرگ کی طرف رجوع کرنے کے لئے اپنی رائے قائم ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ اُن ہی کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ کر لیا جائے۔ لیکن آخری فیصلہ کرنے اور اپنی طلب اور ارادت کا اُن سے اظہار کرنے سے پہلے بطریق مسنون استخارہ بہر حال کر لیا جائے جس کا طریقہ حدیث میں یہ بتلایا گیا ہے کہ:

”پہلے اہتمام سے وضو کیا جائے، اس کے بعد دو رکعت نفل نماز پڑھی جائے اور سلام کے بعد دل کی پوری توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اس طرح دعا کی جائے۔“

(اللَّهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُكَ بِعِلْمِكَ وَاسْتَفْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَاسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِیْمِ فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوبِ اللَّهُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هَذَا الْاَمْرُ خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ فَاقْدِرْهُ لِیْ وَیَسِّرْهُ لِیْ ثُمَّ بَارِكْ لِیْ فِیْهِ وَاِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هَذَا الْاَمْرُ شَرٌّ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ فَاصْرِفْهُ عَنِّیْ وَاصْرِفْنِیْ عَنْهُ وَاقْدِرْ لِیْ الْخَیْرَ حَیْثُ كَانَ ثُمَّ اَرْضِ بِهٖ.)

(دعائے استخارہ کے یہ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں، اس کے راوی حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”حضور ﷺ ہم کو استخارہ کی یہ دعا ایسے اہتمام سے سکھاتے تھے جیسے اہتمام سے قرآن مجید کی سورتیں سکھاتے تھے۔“) (مشکوٰۃ بحوالہ بخاری شریف)

”اے اللہ! میں تیرے علم محیط سے اپنی بہتری چاہتا ہوں (تو ہی اپنے محیط علم سے بہتری کی طرف میری



رہنمائی فرما) اور تیری قدرت کاملہ سے (اپنی بہتری پر) قدرت مانگتا ہوں اور تیرے فضل عظیم سے سوال کرتا ہوں، کیونکہ تو قادر ہے اور میں عاجز ہوں اور تو سب کچھ جانتا ہے اور میں کچھ نہیں جانتا اور تو سب غیبوں کا بھی جاننے والا ہے۔ اے اللہ! اگر یہ کام (جس کے بارے میں میں استخارہ کر رہا ہوں یہاں اس کام اور اس مقصد کا تصور کرنا چاہئے جس کے بارے میں استخارہ کرنا ہو مثلاً کسی شیخ کی طرف رجوع کرنے کے سلسلے میں استخارہ کرنا ہو تو اسی مقصد کا دل میں تصور کیا جائے۔) تیرے علم میں میرے لئے میرے دین اور میری دنیا اور میری آخرت کے لئے بہتر ہے اور اس میں میرے لئے خیر ہے تو اس کو میرے واسطے مقدر فرما دے اور اس کا حاصل کرنا میرے لئے آسان کر دے پھر اس کو باعث خیر و برکت بھی بنا دے اور اگر تیرے علم میں اس کام کا انجام میرے لئے، میرے دین، میری دنیا اور میری آخرت کے لئے برا ہے تو اس کو میری طرف سے پھیر دے اور میرے دل کو اس کی طرف سے پھیر دے اور جہاں کہیں میرے لئے بہتری ہو اس کو میرے واسطے مقدر کر دے۔ پھر میرے دل کو اس پر راضی اور مطمئن بھی کر دے۔“

استخارہ کے بعد اگر دل کا وہ رجحان ویسا ہی رہے یا اور ترقی کر جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر اور برکت کی امید کرتے ہوئے بنام خدا ان ہی بزرگ کی طرف رجوع کرنے اور ان سے اصلاحی تعلق قائم کرنے کا فیصلہ کر لیں۔ اور اگر استخارہ کے بعد دل اُدھر سے ہٹ جائے تو پھر کسی اور کے متعلق سوچیں۔

بہر حال استخارہ کے بعد دل کا جو رجحان ہو (خواہ کسی خواب وغیرہ کی رہنمائی سے ہو یا آپ سے آپ ہو) اسی کو استخارہ کا نتیجہ سمجھ کر اس کے مطابق عمل درآمد کرنا چاہئے۔ اور ایک دفعہ کے استخارہ کے بعد کوئی رجحان ضرور پیدا ہو جائے گا اور طبیعت اس طرف مائل کر دی جائے گی جس میں بہتری ہوگی۔

بہر حال استخارہ کے بعد جب دل کا رجحان کسی بزرگ کی طرف ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے خیر اور سعادت کی دعا کرتے ہوئے اپنا مقصد ان سے عرض کریں اور اپنی رہنمائی میں لینے کی اُن سے درخواست کریں۔ بیعت کا مقصد اور ارادت کی اصل حقیقت بس یہی ہے۔ (مطلب یہ ہے کہ بیعت تربیت کا یہاں ذکر ہے اسی لئے کی جاتی ہے۔ بیعت برکت اور بیعت توبہ کا ذکر یہاں نہیں ہے۔)

پھر وہ بزرگ جو کچھ ہدایات اور تعلیم فرمائیں اور جو مشورے دیں ان کی اس سے زیادہ اہتمام سے تعمیل اور پابندی کریں جتنے اہتمام سے جسمانی مریض اپنے معالج، حکیم یا ڈاکٹر کے طبی مشوروں کی پابندی کرتے ہیں۔ اسی لئے یہ ضروری ہے کہ اس راہ کی رہنمائی کے لئے جن کو منتخب کیا جائے ان میں پہلے ہی یہ چند چیزیں ضرور دیکھ لی



جائیں تاکہ تعلق کی بنیاد پورے اطمینان اور اعتماد پر ہو:

- (الف) وہ دین اور شریعت سے واقف ہوں اور ان کے یہاں شریعت و سنت کے اتباع کا پورا اہتمام ہو۔  
 (ب) ان کے احوال سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ وہ اللہ کے مخلص بندے ہیں اور ان کی طلب اور رغبت کا رخ دنیا اور اس کے جاہ و مال کی طرف نہیں، بلکہ اللہ اور آخرت کی طرف ہے۔  
 (ج) سلوک میں اتنی بصیرت رکھتے ہوں کہ طالب کے حالات کی رعایت رکھتے ہوئے اس کی رہنمائی اور رہبری کر سکیں۔

- (د) ان کے طرزِ عمل سے اس کا اندازہ ہو کہ طالبوں اور تعلق رکھنے والوں سے وہ شفقت رکھتے ہیں اور خیر خواہی اور نفع رسانی کی فکر اور کوشش کرتے ہیں۔  
 (ه) دین کے اس شعبہ (سلوک) کی تحصیل انہوں نے کسی شیخِ کامل کی رہنمائی اور نگرانی میں کی ہو اور ان کی صحبت اُٹھائی ہو اور انہوں نے ان کو ارشاد و تربیت کا اہل قرار دیا ہو۔  
 (و) جو لوگ ان سے تعلق رکھتے ہوں اور دین کے سلسلے میں ان کے پاس آتے جاتے ہوں، ان کو دینی نفع ہوتا ہو، اور آخرت کی فکر ان میں بڑھتی ہو۔

اگر ان چیزوں کو دیکھ بھال کر اور اپنے دل کا اطمینان کر کے اللہ کے کسی بندہ کے ساتھ راہِ سلوک میں استفادہ کا تعلق قائم کیا جائے گا اور اپنے کو ان کی رہنمائی میں دے دیا جائے گا تو ان شاء اللہ تعالیٰ ہرگز محرومی نہ رہے گی۔ (دیکھئے تصوف کیا ہے: ص ۱۳ تا ۱۳۶)

تصوف، طریقت و سلوک سے متعلق ضروری بحث آپ کے سامنے آگئی جس سے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ حقیقت میں تصوف و طریقت دینِ اسلام کے اس شعبہ کا نام ہے جس کو قرآن مجید کی اصطلاح میں تزکیہ اور حدیث کی اصطلاح میں احسان کہا جاتا ہے اور یہ انہی لوگوں سے سیکھا جاتا ہے جو متقی پرہیزگار ہوں اور ان کے دل رزائل سے پاک اور اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اس راہ کے پیچ و خم اور انسانی نفسیات سے بھی ایک حد تک واقفیت رکھتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نیک صالح متقی لوگوں کے ساتھ وابستہ رکھے۔ ”آمین“

## گناہ اور توبہ واستغفار کا بیان!

اللہ تعالیٰ نے انسان کے خمیر اور اسکی فطرت میں تقویٰ کی چنگاری اور نیکی اور برائی کا شعور رکھ دیا ہے۔ اس لئے وہ برائی و بدی کو برا اور نیکی اور تقویٰ کو محبوب رکھتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَالْهَمَّهُمْ أَفْجُورَ هَا وَتَقْوَاهَا﴾

”پس ہم نے اس کو الہام کر دی اسکی بدی اور اس کی نیکی“۔ (اشمس: ۸)

اسکا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر نیکی اور بدی کرنے کی صلاحیت اور طاقت بھی رکھ دی ہے اور اسکے اندر نیکی اور بدی کا وجدانی شعور بھی رکھ دیا ہے۔ اور اسی میں انسان کا امتحان ہوتا ہے۔

جب انسان کو تقویٰ اور نیکی محبوب ہے تو پھر وہ گناہ اور برائی کا ارتکاب کیوں کرتا ہے؟

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کو تقویٰ اور نیکی محبوب اور پسند ہے اور وہ بدی کو برا سمجھتا ہے،

تو پھر وہ بدی اور برائی کا ارتکاب کیوں کرتا ہے؟

اس کا جواب یہ کہ وہ برائی کو برائی جانتا ہے لیکن جذبات سے مغلوب ہو کر برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ انسان کا جسم و بدن مادی ہے اور اس بدن کی نشوونما اور بقا اور اسکی راحت و لذت وغیرہ کا سامان بھی انہی مادی چیزوں سے وابستہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ان چیزوں کے حاصل کرنے کی صلاحیت اور تقاضے و خواہش بھی پیدا فرمائے تاکہ وہ اسکی وجہ سے وہ اپنے بدن کی حفاظت کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو وہ چیزیں محبوب ہو جاتی ہیں جس سے اسکی خواہش پوری ہو جاتی ہیں۔ اس وجہ سے اسکو دنیا کے مال و متاع اور عزت و شہرت سے محبت ہو ا کرتی ہے۔ اس نفسانی خواہش کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ابلیس و شیطان کو بھی پیدا فرمایا ہے۔ جو ہر وقت اسے نفسانی خواہشات و لذات اور مال و جاہ حاصل کرنے کے حرام و ناجائز طور طریقے سکھاتا ہے اور فحاشی و بدکاری اور جرائم کا سبز باغ دکھاتا ہے اور گناہ کے کام کو اسکے سامنے مزین اور حسین بنا کر پیش کرتا رہتا ہے اور اسکی انتہائی کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح بندے کو ناشکری، نافرمانی اور گناہوں کی وجہ سے اپنے پروردگار اللہ رب العالمین سے دور کرے اور جب انسان پر نفس و شیطان کا داؤ چل جاتا ہے تو وہ جذبات سے مغلوب ہو کر گناہ اور جرم کا ارتکاب کر گزرتا ہے۔

گناہ کے ارتکاب کے بعد ہر اس شخص کو اس گناہ کا احساس ہوتا ہے اور اس پر نادم اور پشیمان ہوتا ہے جسکے اندر تقویٰ کی یہ صلاحیت اور شعور کسی نہ کسی درجے میں باقی ہو، تو گناہ کا یہ احساس اور اس پر ندامت، اس بات کی

دلیل ہے کہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ اسکو نیکی سمجھ کر نہیں کرتا بلکہ نفسانی خواہشات اور جذبات سے مغلوب ہو کر اس کا ارتکاب کرتا ہے۔

برے سے برے لوگ بھی گناہ کو گناہ اور برا سمجھتے ہیں!

اگرچہ بعض لوگ گناہوں سے اپنے نفس کو اس قدر زنگ آلود کر لیتے ہیں کہ وہ پھر اپنے کئے ہوئے گناہوں کے لئے دلائل اور عذر تلاش کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ اپنی برائیوں کو خوب جانتے ہیں اس حقیقت کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ:

﴿بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۚ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۝﴾

”بلکہ انسان خود اپنے اوپر شاہد (گواہ) ہے، اگرچہ وہ کتنی ہی معذرتیں (اور بہانے پیش) کرے۔“ (القیمة:

(۱۵، ۱۴)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر انسان اپنی اندرونی حالت کو خوب جانتا ہے اور برائیوں کو بھی خوب جانتا ہے، خواہ وہ زبان سے اپنے حق میں کتنے ہی دلائل اور عذر تراش لے۔ لیکن خود اس کا ضمیر اسکو ٹوکتا رہتا ہے چنانچہ ایک گمراہ آدمی ہزار دلائل پیش کر کے لوگوں کو یہ باور کرا سکتا ہے کہ وہ جس گمراہی پر جما ہوا ہے وہ درحقیقت اس گمراہی کو صحیح اور درست سمجھتا ہے لیکن اسکو خود معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس گمراہی پر کیوں ڈٹا ہوا ہے اور اسے حق کو حق تسلیم کرنے سے کون سے جذبات روک رہے ہیں۔ اسی طرح ایک چور، ایک منافق، ایک جھوٹا خائن اور ایک حرام خور اور ایک ظالم آدمی اپنی بد اعمالیوں کے لئے ہزار ہزار دلیلیں پیش کر کے لوگوں کو یہ یقین دلا سکتا ہے کہ وہ صادق، سچا، امانتدار، حلال خور اور حق پر ہے لیکن وہ خود تو اپنے جھوٹ و نفاق، چوری و بے ایمانی اور ظلم کو تو خوب جانتا ہے بلکہ اگر کوئی خود اپنے آپ کے لئے اپنی برائیوں کے لئے ہزار عذر اور دلائل بھی پیش کر کے اپنے ضمیر کو اطمینان دلانے کی کوشش کرتا ہے پھر بھی وہ اس برائی کو برائی ہی سمجھتا ہے، اگر کوئی دوسرا وہی برائی اسکے ساتھ کر بیٹھتا ہے، مثلاً کوئی دوسرا اس پر وہی ظلم کرتا ہے جو وہ دوسروں پر روا رکھتا تھا یا اسکی عزت و آبرو کو نقصان پہنچاتا ہے یا اسکے ساتھ جھوٹ اور غداری کا معاملہ کرتا ہے تو پھر یہی شخص اس برائی کو گناہ اور بدی کا کام ہی ٹھہراتا ہے اور اس کے خلاف احتجاج بھی کرتا ہے اور اسکا بس چلے تو اس پر اس کو سزا بھی دیتا ہے۔ ورنہ حکومت وغیرہ سے سزا دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔ تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کی فطرت کے اندر نیکی اور بدی کا شعور رکھ دیا گیا ہے۔ وہ نیکی و بدی، حق و باطل اور

صحیح و غلط میں تمیز کر سکتا ہے اور فطرتاً نیکی کو محبوب رکھتا ہے اور بدی کو ناپسند کرتا ہے اور نیکی و تقویٰ کا عزت و احترام کرتا ہے۔ اگرچہ خود اس کا عمل اسکے خلاف ہو۔ اگرچہ وہ ان نیکو کاروں سے دشمنی بھی رکھتا ہو جو اسکو اسکی برائی اور غلطی پر ٹوکتے رہتے ہیں۔ لیکن بس وہ بدی کو بدی ہی جانتا ہے اور نیکی کو نیکی۔ اور وہ اپنی فطرت کے تحت یہی چاہتا ہے کہ برائی کرنے والے کو سزا ملنی چاہیے اور نیکی کرنے والے کو انعام۔ البتہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر گناہ و جرم بھی کرتا ہے اور اپنے آپ کو اس سزا سے بھی بری بھی کرنا چاہتا ہے۔

انسان کے اندر بدی کا میلان اور قوت کیوں رکھی گئی ہے؟

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان کے اندر یہ بدی کا میلان اور بدی کی قوت کیوں رکھی گئی ہے۔ اور اس پر شیطان کیوں مسلط کر دیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسی قوت اور میلان اور شیطان سے ٹکر لینے کی وجہ سے تو انسان برابر مسلسل ترقی کرتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا مقرب بن کر اسکا مستحق بن جاتا ہے۔ اگر یہ قوت نہ ہوتی تو انسان ذرہ برابر ترقی بھی نہ کرتا۔

اللہ تعالیٰ کا قرب اور روحانی ترقی خواہشات کی قربانی سے کیسے حاصل ہوتی ہے؟

فرشتے اللہ تعالیٰ کی وہ پاکیزہ اور فرمانبردار مخلوق ہیں جس سے نافرمانی اور گناہ کا ہونا محال ہے۔ لیکن وہ اپنے مقام سے ذرہ برابر بھی ترقی نہیں کر سکتے اور نہ انکے اندر خلافت کی اہلیت اور صلاحیت موجود ہے۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ ان کے اندر گناہ اور بدی کا میلان اور قوت ہی نہیں ہے۔ جب ان کے اندر نفسانی خواہشات اور جذبات ہی نہیں ہیں تو ان کی اطاعت اور فرمانبرداری اور بے گناہی میں ان کی کسی قسم کی قربانی کا دخل نہیں اور ترقی کا راز تو نفس کیساتھ کشمکش اور اللہ تعالیٰ کیلئے نفسانی خواہشات کی قربانی اور انہیں کچل دینے میں پوشیدہ ہے۔ اور یہی خواہشات اور جذبات تو ہیں جن کی قربانی اور کچل دینے سے انسان فرشتوں سے بازی لے جاتا ہے اور انہی خواہشات و جذبات کے ایندھن کو جلا جلا کر قرب الہی اور روحانی پرواز کے لئے بے پناہ قوت اور (سٹیم) تیار کرتا رہتا ہے۔ اور اسکی وجہ سے وہ جنت کی دائمی، حقیقی لذتوں، راحتوں اور خواہشوں کا مستحق بن جاتا ہے۔ اگر انسان کے اندر یہ قوت نہ ہوتی تو وہ کسی انعام و اکرام کا مستحق بھی نہ ہوتا۔

جنت کی لذتیں، راحتیں قربانی پر ملتی ہیں!

اس میں کوئی شک نہیں کہ فرشتے بھی جنت میں ہونگے، لیکن جس طرح وہ دنیا کی لذتوں سے کوئی لذت نہیں

حاصل کر سکتے اسی طرح وہ جنت کی لذتوں سے بھی نا آشنا ہوں گے۔ جنت کی لذتیں اور راحتیں تو صرف انسان کے لئے ہیں اور یہ خوشیاں اور کامیابیاں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر خواہشات اور جذبات کی قربانی سے ملتی ہیں۔

### دنیا اور آخرت کی بربادیوں اور پریشانیوں کی وجہ!

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ انسان کی ترقی و کامیابی اور حقیقی راحتوں، لذتوں اور عزت کا راز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے نفسانی خواہشات کے کچلنے میں ہے تو اس سے یہ بات خود بخود معلوم ہوگئی کہ انسان کے تنزل اور ذلت اور بربادیوں اور پریشانیوں کا سبب یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کو شتر بے مہار چھوڑ دے اور جائز اور ناجائز کی پرواہ کئے بغیر اپنے نفس کی خواہشات کو پورا کرے۔ اسکی وجہ سے انسان فوری طور پر اور عارضی طور پر دنیا کی لذت یا راحت یا عزت تو حاصل کر سکتا ہے لیکن اس کا انجام ذلت اور بربادی ہی ہوتا ہے جیسا کہ یرقان اور شوگر کا مریض بد پرہیزی کی وجہ سے عارضی لذت تو حاصل کر لیتا ہے لیکن اس کا انجام اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیلنا ہوتا ہے۔

یہی حال گناہگار اور مجرمانہ زندگی کا ہوتا ہے جس کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں بھی انسان پر آفتیں اور مصیبتیں نازل ہو جاتی ہیں، اگر کوئی باز نہ آئے تو بالآخر دنیا اور آخرت دونوں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ ۖ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝﴾

”اور جو کچھ مصیبت تم کو پہنچتی ہے وہ تمہارے کرتوتوں کی بدولت ہی پہنچتی ہے (اور ہر گناہ پر نہیں پہنچتی) بلکہ بہت قصوروں کو وہ معاف بھی کر دیتا ہے اور تم زمین (میں کسی جگہ بھی پناہ لیکر) اللہ تعالیٰ کے قابو سے نکل نہیں سکتے اور اللہ تعالیٰ کے سوا نہ تمہارا کوئی سازگار (کام بنانے والا ہے) اور نہ کوئی مددگار ہے۔“ (الشوری: ۳۰-۳۱)

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝﴾

”بحر و بر (خشکی و تری ہر جگہ) میں لوگوں کے اعمال کی بدولت فساد (پھیل گیا ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ انکو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے، شاید کہ وہ (اپنے برے اعمال سے) باز آجائیں۔“ (الروم: ۴۱)

مذکورہ بالا آیات سے بات واضح ہوئی کہ جب لوگ دین فطرت اور نیکی کی راہ کو چھوڑ دیتے ہیں اور ظاہری

اور باطنی برائیوں کو اختیار کر لیتے ہیں تو ان برائیوں کی وجہ سے ان پر طرح طرح کے مصائب اور آفتیں نازل ہوتی ہیں اور انہی بد اعمالیوں کی وجہ سے خشکی اور تری ہر جگہ فساد چھا جاتا ہے جسکی وجہ سے انسان کی ظاہری اور باطنی اطمینان و سکون درہم برہم ہوتا ہے۔ اگرچہ لوگوں کی گمراہی اور اسکی بد اعمالیوں کا انجام تو موت کے بعد ان کے سامنے لایا جائیگا۔ لیکن دنیا میں بھی ان کو ان کی بد اعمالیاں، بے چینی، بیماریوں وغیرہ اور مصائب میں گرفتار کرتی ہیں۔ اور اسی طرح ان کو دنیا میں وقتی طور ان کے کرتوتوں کا مزہ چکھا دیتا ہے اور اس سزا سے مقصود لوگوں کو تنبیہ کرنا ہوتا ہے، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ اور اپنی برائیوں اور گمراہیوں سے باز آ کر راہِ راست پر آئیں اور ایمان و تقویٰ کی سیدھی شاہراہ کو اپنا کر فلاح پاسکیں۔ اور جو لوگ ان سزا آوروں سے عبرت حاصل نہ کریں اور جن کی فطرت اس قدر مسخ ہو چکی ہو کہ وہ ان تازیانوں سے بھی بیدار نہ ہوں تو یہی سزائیں ان پر حجت تمام کر دیتی ہیں اور بالآخر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دائمی عذاب میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ برائی کا انجام دنیا اور آخرت دونوں کے لحاظ سے تباہ کن ہے اس لئے انسان کیلئے صحیح رویہ یہی ہے کہ ایمان و تقویٰ کی راہ پر جمار ہے۔

### مصائب اور پریشانیوں کا علاج!

جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور برائیوں کی وجہ سے انسان بے چینی اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس سے خود بخود مصائب اور پریشانیوں کا علاج معلوم ہوا وہ یہ کہ انسان ظاہری اور باطنی گناہوں سے پرہیز کرے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اسکے دین کو پوری طرح اختیار کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمَى﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ

حَشَرْتَنِي أَعْمَى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا ۚ قَالَ كَذَلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا وَكَذَلِكَ الْيَوْمَ تُنْسَى ۝

”اور جو شخص میری یاد دہانی (اور نصیحت) سے اعراض کرے گا تو اسکے لئے تنگی کی زندگی ہوگی اور قیامت کے دن ہم اسکو اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا کہ اے میرے رب، تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا؟ حالانکہ میں تو (دنیا میں) بینا تھا۔ (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا۔ اسی طرح (دنیا میں) ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو تو نے ان کو بھلا دیا (یعنی ان کو نظر انداز کر دیا) تو اسی طرح آج تجھے بھلا دیا جائیگا (یعنی نظر انداز کیا جائیگا)۔“ (طہ: ۱۲۳-۱۲۶)

تنگ زندگی وہ ہوتی ہے جو سکون و طمانیت اور شرح صدر کی نعمت سے محروم ہوتی ہے۔ جو شخص ایمان و تقویٰ کی دولت سے محروم ہوتا ہے وہ اپنی زندگی میں غیر مطمئن، بے چین، مضطرب، ڈانواڈول، پریشان حال اور اندرونی خلفشار میں مبتلا رہتا ہے، اگرچہ وہ دنیا کے ظاہری اسباب، مال و دولت اور اپنی نمائشوں سے اس پر کتنا ہی

پردہ ڈالنے کی کوشش کرے۔ جو لوگ ایمان کی دولت سے محروم ہیں، ان کے ظاہری مال و دولت اور اقتدار و ٹھٹھا باٹ سے دھوکہ نہ کھائیں۔ اگر آپ ان کے سینوں میں جھانک کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر کس قدر بے چینی کی آگ بھڑکتی ہے اور وہ کس قدر ذہنی پریشانیوں، الجھنوں اور مصائب میں مبتلا ہیں اور موت کے بعد اور قیامت میں ان کا جو حشر ہوگا وہ تو بہت ہی ہولناک ہوگا۔ ایسے لوگ قیامت کے دن اندھے اٹھائے جائیں گے اور ان کو مسلسل دائمی عذاب میں گرفتار کیا جائیگا۔ کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں، آنکھوں، کانوں اور دل و دماغ کی سخت ناشکری اور ناقدری کی تھی کہ انہوں نے ان سے کام نہیں لیا۔ وہ قیامت کے دن فریاد کریں گے کہ ہمارے پروردگار، ہم تو آنکھیں رکھنے والے تھے، تو تو نے ہم کو اندھا بنا کر کیوں اٹھایا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو کہا جائیگا کہ ہم نے تمہارے پاس اپنی کتاب بھیجی تھی، جس کی آیات نے ایک ایک حقیقت تم پر پوری طرح واضح کر دی، لیکن تم نے ان کو نظر انداز کر دیا اور ان کا کچھ خیال نہ کیا اور اس وقت تم نے اپنی آنکھ، کان، دل و دماغ سے کوئی کام نہیں لیا، دنیا کے نشے میں اندھے بہرے بنے رہے۔ اس لئے اب تمہاری یہ آہ وزاری اور فریاد بے سود ہے جس طرح تم نے ہماری آیات کو نظر انداز کر دیا تھا، اسی طرح تم کو عذاب میں گرفتار کر کے نظر انداز کر دیا جائے گا۔ اور تمہاری فریادوں پر کوئی توجہ نہیں دی جائیگی۔ اس سے بھی یہی بات معلوم ہوئی کہ دنیا کی پریشانیوں اور مصائب کا واحد حل اور علاج گناہوں سے پرہیز اور اللہ تعالیٰ اور آخرت و رسالت پر حقیقی معنوں میں ایمان لانا اور تقویٰ کو اختیار کرنا ہے، جیسا کہ اسی حقیقت کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری جگہ دوسرے انداز میں یوں فرمائی ہے کہ:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ اٰنٰتٰی وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَیٰوَةً طَيِّبَةً ۖ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ

مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝﴾

”جو کوئی نیک عمل کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اس کو ایک پاکیزہ اور اچھی زندگی بسر کرائیں گے اور جو کچھ (نیک اعمال) وہ کرتے رہے، ہم ان کو (آخرت میں ان کا) بہترین بدلہ دیں گے۔“ (النحل: ۹۷)

پاکیزہ اور اچھی زندگی کا یہ وعدہ دین اور دنیا دونوں اعتبار سے ہے جو لوگ صحیح معنوں میں ایمان و تقویٰ کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں، ان کو آزمائشیں تو پیش آتی ہیں جنکی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے صبر و استقامت کا امتحان لیتا ہے اور ان آزمائشوں کی وجہ سے بندوں کی صلاحیتوں اور ان کے نورِ ایمان کو پروان چڑھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ



ایمان و تقویٰ کے سبب ان کو قلبی سکون و طمانیت اور شرح صدر کی نعمتوں سے نواز دیتے ہیں جنکی وجہ سے انکی پوری زندگی دین و دنیا دونوں کے اعتبار سے بہت ہی اچھی اور پرسکون اور پاکیزہ گزرتی ہے اور اس کا پورا ایمان باب تقویٰ میں ملے گا، یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ پریشانیوں کا واحد حل و علاج گناہوں سے پرہیز میں ہے۔

**نیک اعمال کے باوجود بعض لوگ بہت زیادہ پریشان حال کیوں ہوتے ہیں؟**

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو نماز، روزہ، تہجد اور ذکر وغیرہ عبادات کے خوب اہتمام کرنے والے ہوتے ہیں اور نیک اعمال کرتے رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ بے چین اور پریشان حال ہوتے ہیں، اسکا جواب یہ ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں گناہوں کو نہیں چھوڑتے۔ وہ نماز، روزہ، ذکر وغیرہ کی پابندی تو کرتے ہیں لیکن اسکی کمائی ناجائز اور حرام کی ہوتی ہے یا وہ جھوٹ، غیبت یا بدزبانی یا بدگمانی، حسد، بد نظری یا بندوں کے حقوق مارنے اور ان کو ایذا رسانی جیسے گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ تو ایسی صورت میں اسکی زندگی کس طرح مطمئن ہو سکتی ہے۔ ایک شخص اگر ایسے کمرے میں ایئر کنڈیشنر لگائے جس کے چاروں طرف بڑی بڑی کھڑکیاں اور دروازے ہوں اور وہ ان تمام دروازوں اور کھڑکیوں کو کھلا رکھے تو ایئر کنڈیشنر اس کمرے کو ٹھنڈا نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح جو شخص اپنے دل و دماغ اور اپنی آنکھوں، کان، زبان اور ہاتھ پاؤں وغیرہ تمام دروازوں کو گناہ کیلئے کھلا رکھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ذکر و عبادات کی پابندی کرتا رہتا ہے، تو یہ ذکر و عبادات اس کے دل کے کمرے کو حقیقی معنوں میں ٹھنڈا اور پرسکون نہیں کر سکتے ہیں۔ اسکے برعکس اگر کوئی شخص صرف فرض، واجب اور لازمی عبادات کو اختیار کرتا ہے لیکن وہ ہر قسم کی نافرمانیوں اور گناہوں کی کھڑکیوں کو بند کر دیتا ہے، اگرچہ وہ مستحب اعمال و عبادات نہ بھی کرے تو بھی ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی زندگی پرسکون گزرے گی۔

**گناہ کیا ہے؟**

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گناہ اور نافرمانی کیا ہوتی ہے؟ تاکہ اس سے بچا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جن چیزوں کا اللہ اور اسکے رسول ﷺ نے حکم فرمایا، انکو حضور ﷺ کے طریقے کے مطابق ادا کرنا، جن کاموں اور باتوں سے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانا اور پرہیز کرنا۔

**گناہوں اور نافرمانیوں کی تفصیل!**

اور ان گناہوں اور نافرمانیوں کی ضروری تفصیل یہ ہے:



(۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو بھی کسی طرح سے شریک ٹھہرانا۔

(۲) اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے ثابت شدہ عقائد اور حقائق اور احکامات و ہدایات میں سے کسی عقیدے اور حقیقت کا یا کسی حکم و ہدایت سے انکار کرنا۔ یا اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی ہدایات و احکامات پر دوسروں کے قوانین و احکامات کو ترجیح دینا۔ رسول اللہ ﷺ اور شعائر اللہ اور اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ لگی ہوئی چیزوں کی توہین اور بے ادبی کرنا۔

(۳) دین کے نام پر ایسے کاموں کو اختیار کرنا اور پھیلانا جن کی دین اسلام میں کوئی اصل اور بنیاد نہ ہو، اسکا

نام بدعت ہے۔

(۴) نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور عبادات میں کوتاہی و سستی کرنا۔

(۵) جھوٹ، غیبت، چغلی، گالی گلوچ، کسی کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچانا، کسی پر طعن کرنا، کسی کا مذاق اڑانا، امانت میں خیانت، دھوکہ، عداوت، سخت مجبوری کے بغیر لوگوں سے سوال کرنا، ناحق قتل کرنا، زنا، نشہ۔

(۶) چوری، ڈاکہ، کسی کا مال و زمین کو غصب کرنا۔

(۷) امر دلوں، حسین لڑکوں اور اجنبی عورتوں کو لالچ کی نظر سے دیکھنا اور بلا شرعی ضرورت کے ان کی طرف دیکھنا، ان سے گلے ملنا وغیرہ۔ اور گانوں، بین باجوں وغیرہ کو اختیار کرنا یا گانوں، بجانوں کو سننا یا ان کو فلموں، کیسٹوں وغیرہ کے ذریعے پھیلانا۔

(۸) اجنبی عورتوں کے ساتھ خلوت اور تنہائی میں ملنا۔

(۹) اجنبی عورتوں کے ساتھ اختلاط۔

(۱۰) سود، سٹہ، جوا، لوگوں پر ظلم کرنا۔

(۱۱) جائز امور میں والدین کی نافرمانی کرنا، ماں، باپ اور اپنے بڑوں کا ادب و احترام نہ کرنا اور چھوٹوں پر

شفقت نہ کرنا، ان کے حقوق کی ادائیگی میں سستی اور کوتاہی کرنا۔

(۱۲) یتیموں، محتاجوں، بے کسوں اور مظلوموں کے ساتھ حسن سلوک نہ کرنا اور ان کے ساتھ بے رخی کا رویہ

رکھنا یا ان پر احسان جتلا نا یا ان کی خدمت اور مدد کر کے انکو لوگوں میں رسوا کرنا۔

(۱۳) دشمنان اسلام کو راز دار دوست بنانا، مسلمانوں کے مقابلے میں ان کی حمایت کرنا اور اسلام کے

مقابلے میں ان کی طرز زندگی، لباس وغیرہ کو اپنانا۔



(۱۴) طاقت کے باوجود مسلمانوں کی مدد سے ہاتھ روکنا اور ان کو ظلم و بربریت کیلئے تہما چھوڑنا۔

(۱۵) کسی مسلمان کو اپنے قول یا اپنے عمل سے کسی طرح کی تکلیف پہنچانا۔

(۱۶) عورتوں کا مردوں کی طرح اور مردوں کا عورتوں کی طرح لباس، چال ڈھال اور گفتار وغیرہ اختیار کرنا۔

(۱۷) ضرورت اور وسعت کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑنا اور برائیوں کو روکنے کی

طاقت رکھنے کے باوجود لوگوں کو گناہوں سے نہ روکنا۔

(۱۸) جس وقت جہاد کا عام حکم ہو اس وقت بلا شرعی ضرورت کے جہاد سے جی چرانا یا بلا شرعی مجبوری کے

میدان جنگ سے صرف اپنے ذاتی مفادات کے تحت بھاگ کر واپس آ جانا اور اسلامی لشکر کے حوصلوں کو کمزور کرنا۔

(۱۹) کبر، غرور، فخر، ریاکاری، بخل، بے رحمی، بے صبری، ناشکری وغیرہ جیسے گناہوں میں مبتلا ہونا اور ان کے

تقاضوں پر عمل کرنا اور انکے علاج سے غافل ہونا۔

(۲۰) اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنے اور آخرت کے بجائے دنیا کی عزت و لذت اور مال و شہرت کو

مقصود بنانا۔

گناہوں اور نافرمانیوں سے متعلق اجمالاً چند ضروری باتوں کو ذکر کیا گیا ہے، تاکہ گناہوں کی چند صورتیں سامنے

آجائیں اور ہم ان کے بارے میں چوکے رہیں اور ان سے اور ان کی مختلف صورتوں سے اپنی حفاظت کر سکیں۔

**گناہ کا ارادہ بھی گناہ ہے!**

یہاں اس بات کو بھی یاد رکھیں کہ جس طرح نیکی کا ارادہ نیکی ہے اسی طرح گناہ کا ارادہ بھی گناہ ہے۔ گناہ کا

ارادہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی گناہ کا ارادہ کرے مثلاً چوری یا کسی کو ناحق قتل کرنے کا ارادہ کر لے کہ اب یہ کام میں

کر رہا ہوں۔ اس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے لیکن وہ اپنے ارادے کی تکمیل میں ناکام ہو جاتا ہے مثلاً اس لئے

چوری نہ کر سکا کہ چوکیدار کو دیکھا کہ وہ جاگا ہوا ہے یا جس کے قتل کرنے کا ارادہ تھا، اسکے قتل کرنے میں قدرت

حاصل نہ ہوئی تو ایسی صورت میں جبکہ وہ اپنے اس غلط ارادے پر پشیمان نہ ہوا تو یہ ارادہ بھی گناہ ہے، اگرچہ اسکو عمر

بھر چوری یا قتل کرنے کا موقع نہ ملے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَأَنْ تُبْذُلُوا مَنَافِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوا بِحَسَبِكُمْ بِهِنَّ اللَّهُ﴾

”جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے (خواہ) تم اسکو ظاہر کرو یا چھپاؤ (بہر حال) اللہ تعالیٰ تم سے اس کا حساب

لے گا۔“ (البقرہ: ۲۸۴)

دل کی چھپی ہوئی باتوں کا حساب لینے سے گناہ کے وہ خیالات نہیں ہیں جو بطور وسوسہ آدمی کے دل میں آتے ہیں بلکہ اس سے صرف وہ عزائم اور مضبوط ارادے مراد ہیں جو دل میں موجود ہیں لیکن کسی مجبوری یا مزاحمت کے سبب سے وہ ظاہری عمل میں نہ آ سکے۔

دل میں گناہوں کی تدابیر بنانا اور خیال سے گناہ کرنا بھی ناجائز اور گناہ ہے!

انسان کے دل میں گناہ کے جو خیالات خود بخود آتے ہیں اور بندے کو وہ خیالات ناگوار گزرتے ہیں، ان میں تو کوئی حرج نہیں، جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آجائیگا۔ لیکن دل میں گناہوں کی تدابیر اور منصوبے بنانا اور اپنے خیال سے گناہ کرنا اور اس سے لذت لینا بھی ناجائز اور گناہ ہے۔ چنانچہ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقْرُبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾

”اور بے حیائی کی باتوں کے نزدیک نہ جاؤ، جو ظاہر ہوں ان میں سے اور جو چھپی ہوئی ہوں“۔ (الانعام:

آیت ۱۵۱)

اور ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّي الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ...﴾

”(اے نبی ﷺ لوگوں سے) کہہ دو، میرے رب نے تو بس بے حیائیوں کو حرام ٹھہرایا ہے، جو ظاہر ہوں ان

میں سے یا پوشیدہ...“۔ (الاعراف: آیت ۳۳)

﴿فَوَاحِشَ﴾ فحش کی جمع ہے اور فحش کھلی بے حیائی اور حد درجہ فحش باتوں کو کہتے ہیں۔ یہاں فواحش کا لفظ ذکر کر کے ہر قسم کی بے حیائیوں سے منع کیا گیا ہے، اس لئے اس میں زنا، چوری، ڈاکہ وغیرہ تمام کھلی بے حیائیاں اور برائیاں شامل ہیں، پھر یہاں صرف یہ نہیں فرمایا کہ فواحش سے اپنے آپ کو بچاؤ، بلکہ یہاں یہ فرمایا کہ فواحش کے قریب بھی نہ پھٹکو، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تمام وہ چیزیں جو دل میں فحش کی تحریک پیدا کرتی ہیں مثلاً فحش گانے اور فحش تصویریں اور بد نظری اور کسی کو بری نیت سے چھونا وغیرہ سب چیزوں سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے کہ اپنی نظروں اور اپنے کان و زبان اور اپنے دل کی پوری حفاظت کریں۔

﴿مَا ظَهَرَ﴾ میں اعلانیہ طور پر گناہ کرنا اور بے حیائی کو عملی جامہ پہنانا دونوں شامل ہیں اور ﴿مَا بَطَنَ﴾ میں

پوشیدہ طور پر گناہ کے ارتکاب اور حسد و کینہ اور دل میں گناہ کے منصوبے بنانا، تدبیریں کرنا اور اپنے دل میں بے حیائی کے کاموں سے لذت لینا سب شامل ہیں۔

اس بات کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ نیکیوں اور بدیوں کا اصل سرچشمہ انسان کا باطن اور دل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے واقعی نیکی اس وقت تک وجود میں نہیں آسکتی جب تک دل کے اندر نیکی کی جڑ مضبوط نہ ہو۔ اسی طرح کوئی برائی انسان سے اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک اس برائی کی جڑ کو دل کے اندر سے نہ اکھاڑ دیا جائے۔ اگر کوئی برائی دل کے اندر موجود ہے تو وہ کان، آنکھ، زبان اور خیال کی راہ سے برابر اپنی خوراک حاصل کر کے موٹی ہوتی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ روح کے لئے ناسور بن کر رہ جاتی ہے ایسا شخص بستر پر لیٹے لیٹے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں کی لذت لیتا رہتا ہے۔

اگرچہ اس شخص کو اپنی تمام زندگی میں اس برے کام کا عملی موقع نہ ملے تاہم یہی باطل خیالات جن کو وہ اپنے اختیار سے اپنے اندر لا رہا ہے اور ان کو برابر پال رہا ہے، بالآخر بسا اوقات یہی پوشیدہ برائیاں اس کی اخلاقی اور ایمانی موت کا سبب بن جاتی ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ظاہری اور باطنی ہر قسم کے فواحش، بے حیائیوں اور برائیوں سے دور رہنے کی تاکید فرمائی ہے۔ بس انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے اختیار اور خوشی سے دل میں کبھی بھی غلط اور باطل خیالات نہ لائے اور نہ غلط کام کا ارادہ کرے اور جو غلط ارادے کئے ہیں، ان سے باز آجائے۔

### غیر اختیاری خیالات پر گرفت نہیں!

مذکورہ بالا بحث میں جو باطنی گناہوں کا ذکر ہوا، یہ وہ ارادے اور خیالات ہیں جو خود انسان کے اپنے فعل سے تعلق رکھتے ہیں، باقی رہے وہ خیالات جو خود بخود دل و دماغ میں آجاتے ہیں اور بندہ یہ نہیں چاہتا کہ یہ غلط خیال میرے دل میں آئے، لیکن وہ خود بخود آجاتا ہے اور وہ اس خیال کو ناپسند کرتا ہے تو یہ نفس کی چاہت شیطان کا وسوسہ اندازی ہوتی ہے جس پر کوئی گرفت نہ ہوگی۔

جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى تَجَاوَزَ عَنْ أَمْتِي مَا وَسَّوَسَتْ بِهِ صُدُورَهَا مَا لَمْ تَعْمَلْ بِهِ أَوْ تَتَكَلَّمَ)

”بے شک اللہ تعالیٰ نے میری امت کے ان وسوسوں کو معاف کر دیا ہے جو ان کے دلوں میں پیدا ہوتے

ہیں جب تک کہ وہ ان وسوسوں پر عمل نہ کریں اور نہ ان کو زبان پر لائیں۔“ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ)

وسوسہ کو برا سمجھنا ایمان کی علامت ہے!

بلکہ گناہ کے خیالات اور ایمان و یقین کے منافی وساوس اگر بندے کے دل میں پیدا ہوتے ہوں اور وہ ان

خیالات اور وساوس کو برا سمجھتا ہے تو یہ اس کے ایمان کی علامت ہے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چند صحابی رضی اللہ عنہم حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم اپنے دلوں میں بعض ایسی باتیں (یعنی خیالات) پاتے ہیں، جان کا زبان پر لانا بھی ہم بہت برا سمجھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم واقعی ایسا پاتے ہو (کہ جب کوئی گناہ کا یا ایمان و یقین کے منافی و سوسہ تمہارے اندر پیدا ہوتا ہے تو خود بخود تمہارے دل اسکو ناپسند کرتے ہیں اور اس کو زبان پر لانا بھی تم برا جانتے ہو) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ”ہاں“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(ذَاكَ صَرِيحُ الْإِيمَانِ .)

”یہ واضح اور کھلا ہوا ایمان ہے“۔ (مسلم، مشکوٰۃ)

بلاشبہ یہ ایمان و یقین کے منافی اور گناہ گارانہ خیالات جب دل میں پیدا ہوں اور ان کو دل نے برا جانا اور ان سے دل کا تنگ ہو جانا ایمان کی واضح علامت و نشانی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ تمہارے سامنے کسی شخص کے خلاف کوئی بات آتی ہے اگر اس شخص سے تمہارا دل تنگ پڑتا اور اس کے خلاف کی بات کو تم برداشت نہیں کرتے اور خلاف کہنے والوں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم کو وہ شخص محبوب ہے اور آپ واقعی اس کے طرفدار ہیں۔ اگر آپ اس کے خلاف سے خوش ہو، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمہارے دل میں بھی اس شخص کی مخالفت موجود ہے۔ اسی طرح جس شخص کے دل و دماغ پر نفس و شیطان، اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کوئی گناہ کی بات پیش کر دیتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک کے خیالات پیدا کر دیتے ہیں اور یہ ان خیالات کو برا سمجھتا ہے اور ان کو ناپسند کر کے ان سے مقابلہ کر کے ان سے جان چھڑانے کی کوشش کرتا ہے تو یہ بندہ واقعی اللہ تعالیٰ اور اسکے دین کو محبوب رکھتا ہے اور یہ بندہ حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ اور اسکے دین کو ماننے والا ہے۔

### وساوس کا علاج!

انسان کے دل میں جب ایسے خیالات پیدا ہوں، اسکو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرے کہ یا اللہ! میرے دل کو ان خیالات سے پاک کریں اور اسکے مقابلے میں مجھے تیری یاد خوف و عظمت کے خیالات اور وساوس پیدا ہوں۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنی زبان سے یہ کہے کہ ”اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم“ یا ”لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم“۔ تیسرا کام یہ کریں کہ یہ سوچیں کہ اللہ تعالیٰ میرے خیالات کو خوب جانتا ہے اور دیکھتا ہے اور ہم کو اپنی جان سے بھی زیادہ قریب ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾

”اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم (خوب) جانتے ہیں ان وسوسوں (اور خیالات) کو جو اس کے دل میں گزرتے ہیں اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔“ (ق: آیت ۱۶)

گناہوں کے وسوسوں کو کشتہ بنائیے!

شہوتوں، لذتوں اور گناہوں کے وسوسے سب کو آتے ہیں اور یہی انسان کی ترقی کا باعث بھی ہوتے ہیں اور اس کے تنزل کے بھی۔ انسان کو بھوک پیاس بھی لگتی ہے اور اسکو قضاء حاجت وغیرہ کی مجبوریاں بھی پیش آتی ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس شخص کو پیاس یا بھوک لگ گئی ہے۔ ایسی صورت میں اس کو کھانا کھانے یا پانی پینے کی خواہش بھی ہوگی۔ اور اسکو ان جگہوں کے خیالات بھی آئیں گے جہاں جہاں سے پانی یا کھانا ملنے کی امید ہو۔ البتہ اگر وہ نیک اور حلال خور شخص ہے تو وہ ناجائز جگہ سے کھانے پینے کی چیزیں لینے کا ارادہ بھی نہیں کر سکے گا بلکہ اگر اسکے سامنے حرام اور ناجائز کھانا پینا بھی رکھ دیا جائے، پھر بھی اسکا دل اس سے متنفر ہوگا۔ اسی طرح ایک نیک، صحت مند، غیر شادی شدہ نوجوان ہے اس کے سامنے حسین و جمیل عورت آجائے تو نفس و شیطان اسکو ابھارے گا کہ اسکی طرف دیکھے اور اسکے دل کے اندر وسوسہ اندازی کریگا لیکن وہ اسکی طرف دیکھنے کا ارادہ بھی نہیں کرے گا۔ ظاہر ہے یہ اس نیک آدمی کے تقویٰ کی دلیل ہے اور ایسی صورت میں تو وہ اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے دل پر آرے چلائے گا اور اپنے نفس کو پکچل دیتا ہے اور اسی طرح وہ اپنی لذت اور شہوت کے وسوسوں کو جلا کر اس سے اپنے اندر ایمانی و روحانی اور اخلاقی پرواز کی قوت پیدا کرتا رہیگا۔ اور حق کی خاطر مادی لذتوں کو قربان کرنے پر اللہ تعالیٰ اسکو دنیا میں ایمانی اور روحانی اخلاقی لذتیں نصیب کرے گا جس کے سامنے مادی لذتوں کی کوئی حیثیت نہیں۔

مثلاً حضرت ابو امامہ ؓ سے روایت ہے وہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

(مَامِنْ مُسْلِمٍ يَنْظُرُ إِلَى مَحَاسِنِ امْرَأَةٍ أَوْ لَمَرَةٍ ثُمَّ يَعْصُ بَصَرَهُ إِلَّا أَخَذَتْ اللَّهُ لَهُ عِبَادَةً يَجِدُ

حَلَاوَتَهَا)

”جس مسلمان کی پہلی مرتبہ (اچانک بلا قصد و ارادہ کے) کسی عورت کے حسن و جمال کی طرف نظر اٹھ جائے اور پھر وہ (اللہ تعالیٰ کے خوف سے فوراً) اپنی نگاہ کو نیچے کر لے تو اللہ تعالیٰ اسکے لئے ایک عبادت اور بندگی پیدا کر دے گا (یعنی اسکے اس نظر پھیر لینے اور نگاہ نیچے کرنے کو ایک ایسی عبادت اور بندگی میں تبدیل کرے گا) جس سے وہ شخص (اپنے دل کے اندر) لذت کو پائے گا۔“ (احمد، مشکوٰۃ: کتاب النکاح)

یہ قلبی اور روحانی لذت دراصل اس تلخی کا بدلہ ہوتا ہے جو اس نے اپنے نفس کی خواہش پر صبر و ضبط کر کے برداشت کی تھی۔ خلاصہ یہ کہ نفس کے تقاضے اور خواہشات ہر آدمی کے ساتھ ہوتے ہیں لیکن جو لوگ ان کے تقاضوں پر عمل نہیں کرتے اور نہ اس کے تقاضوں کے سبب برے عمل کا ارادہ کرتے ہیں، تو یہ وہی لوگ کرتے ہیں جو ایمانی، روحانی، اخلاقی اور قرب الہی کے اعتبار سے ترقی پر ترقی کرتے ہیں اور جو لوگ نفس کے تقاضوں پر شتر بے مہار ہو کر عمل کرتے رہتے ہیں تو بالآخر جانوروں اور درندوں سے نیچے گر جاتے ہیں۔

گناہوں کا تریاق توبہ واستغفار ہے!

جب آپ کے سامنے ظاہری اور باطنی گناہوں کی تفصیل آئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا و آخرت کی بے چینی، مصائب، آفتوں اور ہلاکتوں اور ذلت و رسوائی کا سبب گناہ اور نافرمانی ہی ہے تو اب یہ بات بھی جان لیں کہ اپنی زندگی میں سابقہ گناہوں کی نحوست اور انجام بد سے بچنے کا طریقہ اور اس کا علاج کیا ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ گناہوں کے برے انجام اور اثرات سے بچنے کا طریقہ اور گناہوں کے چھوڑے ہوئے اثرات کا علاج و تریاق توبہ واستغفار ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دنیا میں لوگوں پر جو ظاہری یا باطنی مصائب اور آفتیں آتی ہیں وہ زیادہ تر گناہوں کے نتائج ہوتے ہیں، لہذا انسان کو جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو سب سے پہلا کام اس کو یہ کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے پناہ مانگے اور اس کی رحمت کی طرف بھاگے اور صرف اس کے پاس پناہ مانگے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس سبب سے وہ غم میں مبتلا ہوا تھا، اس کو چھوڑ دے اور وہ سبب یہ تھا کہ بندے نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ٹکرایا تھا یا یوں کہئے کہ وہ مقام بندگی سے ہٹ گیا تھا جس کی وجہ سے اس پر مصائب اور آفتیں نازل ہوئیں تو اس کا حقیقی علاج یہی ہے کہ بندہ پلٹ کر پھر مقام بندگی کے نقطے تک آجائے جہاں سے وہ بھاگ کر مصیبت و غم میں مبتلا ہوا تھا۔ اسی ندامت اور اسی باطنی گردش اور دل کے پلٹ جانے کا نام توبہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ گناہ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ٹکرانے اور اللہ تعالیٰ کے حکم و ہدایت سے بھاگنے کا نام ہے اور توبہ یہ ہے کہ بندہ اس کی ٹکر اور بغاوت و سرکشی سے پلٹ کر اپنے پروردگار اور اس کے حکم و ہدایت کی طرف واپس آجائے اور اس سے رحم و مغفرت کی درخواست کرے اور بدی کے بجائے نیکی کو اختیار کرے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھیں کہ مصائب اور آفتوں کے اسباب گناہوں کے علاوہ اور بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً بعض بلند ہمت پاک لوگ مصیبت زدہ انسانوں کی تسلی کیلئے قصداً ایسی تنگی و فقر و فاقہ میں رہتے ہیں جس کو ہم تنگی اور مصیبت کہتے ہیں، حالانکہ ان لوگوں کا یہ



فقر وغیرہ اضطراری نہیں بلکہ اختیاری ہوتا ہے۔ کبھی اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو ایمان و یقین، صبر و عشق و محبت کے اعلیٰ جذبات کا مظاہرہ بھی ان مصائب کی روشنی میں کراتا ہے اور ان آزمائشوں کی وجہ سے ان کی صلاحیتوں اور قوتوں کو پروان بھی چڑھاتا ہے اور ان مصائب کی وجہ سے بندوں کے درجات کو برابر بڑھاتا ہے۔ یہ وہ مصائب ہوتے ہیں جن میں ان لوگوں کی تذلیل نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ ان کی وجہ سے ان کی عزت کو اور بڑھاتا ہے اور کبھی کبھی مصائب کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ایک طرف اپنے بندوں کے اندر اچھی صفات و اخلاق مستحکم اور مضبوط کر دیں اور دوسری طرف منافقوں کو ان کی جماعت سے جدا کر دیں۔

### توبہ کے معنی و مطلب!

توبہ کہ لغوی معنی رجوع کرنے اور واپس ہو جانے کے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں کسی گناہ سے اللہ تعالیٰ کے لئے باز آنے کو توبہ کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے خوف و حیا کی وجہ سے گناہ اور سرکشی کی راہ سے پلٹ کر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کو اپنائے۔ اسکی مثال یہ ہے کہ آپ لاہور سے راولپنڈی جانے کیلئے ایک سڑک پر لگ گئے۔ آگے چل کر راستے میں ایک کتبہ آیا جس پر لکھا تھا کہ پشاور اتنا کلومیٹر باقی ہے تو آپ کو فوراً احساس ہوگا کہ میں تو غلط جا رہا ہوں اور وہیں سے پلٹ کر راولپنڈی کی سڑک پر چلنے لگے، اسی کو واپس کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص وہیں کے وہیں کھڑا رہے، راولپنڈی کی سڑک کو اختیار نہ کرے تو اسکو واپس ہونا نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح اگر کسی کو اپنے گناہوں کا احساس ہوا اور وہ اس پر شرمندہ بھی ہے لیکن گناہوں کو چھوڑ کر سیدھی راہ کو اختیار نہیں کرتا بلکہ اسی طرح گناہوں کی راہ پر چل رہا ہے اور زبان سے توبہ توبہ کہتا جا رہا ہے تو یہ توبہ نہیں، مثلاً آپ نے کسی شخص کا کوئی حق دیا ہے اور کچھ عرصے کے بعد آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور آپ اس ظلم پر شرمندہ بھی ہوئے اور زبان سے توبہ توبہ بھی کی لیکن اس حقدار کے حق کو بدستور دیا ہوا ہے اور اس کو اس کا حق واپس نہیں کیا تو یہ ”توبہ“ کہنا توبہ نہیں ہے۔

### توبہ کی حقیقت!

توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو گناہ اور نافرمانی یا نامناسب عمل بندے سے سرزد ہو جائے، اس کے برے انجام کے خوف سے اس پر ندامت اور دلی پشیمانی ہو اور آئندہ کے لئے اس سے دور رہنے اور بچنے کا اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا پختہ ارادہ اور عزم کر لے۔ توبہ کی اسی حقیقت کی طرف قرآن مجید نے مختلف انداز میں بار بار اشارہ



فرمایا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾

”مگر وہ لوگ جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اپنی اصلاح کی تو بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔“

(آل عمران: آیت ۸۹)

وہ ان گناہوں کو بھی بخش دے گا اور ان پر مہربانی کر کے ان کو ترقیات سے بھی نوازے گا۔ ایک دوسری جگہ

اس حقیقت کو ان الفاظ سے واضح کر دیا گیا ہے کہ:

﴿وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا﴾

”اور جو شخص توبہ کر لے اور نیک عمل (کی راہ کو اختیار) کرے تو وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر رہا

ہے۔“ (الفرقان: آیت ۷۱)

ان دونوں آیات سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ توبہ اس وقت تک معتبر اور سچی توبہ نہیں جب تک آدمی

اس غلطی کی اصلاح نہ کر لے جس غلطی میں وہ مبتلا ہے۔

**توبہ کے صحیح ہونے کی شرائط!**

توبہ کے صحیح اور معتبر ہونے کی تین شرائط ہیں یا یوں کہئے کہ توبہ تین چیزوں کے مجموعے کا نام ہے۔ جب ان

تین چیزوں میں سے ایک چیز نہ ہوگی تو توبہ کامل نہ ہوگی۔

(۱) ایک یہ کہ جو گناہ سرزد ہوا، اس پر ندامت (یعنی شرمندگی اور پشیمانی) ہو۔

(۲) دوسری شرط یہ کہ جس گناہ میں مبتلا ہو، اس کو فی الفور چھوڑ دے اور اسکی تکمیل یہ ہے کہ جن گناہوں کی

تلافی ممکن ہو، اپنی طاقت کے مطابق ان کی تلافی شروع کرے، مثلاً فرض نماز یا روزہ فوت ہوا ہے تو اسکی قضا

شروع کر لے۔ زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے تو پہلے جو زکوٰۃ ذمے رہ گئی ہے اس کو بھی یکمشت یا تدریجاً ادا کرے۔ اسی

طرح جو شرعی فریضہ چھوڑا ہے تو اسے قضا کرنے میں لگ جائے اور اگر کسی کا حق دبا ہے رکھا ہے تو اس کو اس کا حق

واپس لوٹا دے۔ اگر کسی کا مال وغیرہ ناحق کھایا ہے اپنے پاس رکھا ہے تو اسے اس کا مال وغیرہ لوٹائے۔ اگر لوٹائے

جانے کی طاقت نہیں تو اس سے معاف کرائے اور اگر وہ زندہ نہیں اسکے ورثاء موجود ہیں تو ان کو وہ مال لوٹائے یا ان

کے وارثوں سے معاف کرائے۔ اگر کوئی وارث بھی نہیں تو اس مال کو اسلامی حکومت کے بیت المال میں جمع

کرائے۔ اگر بیت المال بھی نہیں یا اسکا انتظام درست نہیں تو جس میت کا مال ہے اس کی طرف سے صدقہ

کردے۔ اگر کوئی غیر مال حق ہے مثلاً غیبت کی ہے یا کسی کو ستایا ہے وغیرہ تو اسے جس طرح ممکن ہو، راضی کر کے اس سے معافی حاصل کرے۔ اگر دنیا سے وہ رحلت کر چکا ہے تو اسکے لئے دعائے مغفرت کرتا رہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ یا اللہ! اسے اپنی طرف سے دے۔

(۳) تیسری شرط یہ کہ آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے کہ آئندہ یہ گناہ یا کوئی گناہ نہیں کرونگا۔

پختہ عزم کے بارے میں مایوس نہ ہو!

بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ کسی گناہ سے پورے صدق دل اور خلوص کے ساتھ توبہ کرتے ہیں اور آئندہ اس گناہ کو نہ کرنے کا پختہ عزم بھی کرتے ہیں لیکن پھر ان سے وہی گناہ صادر ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں بھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ پھر سے صدق و خلوص کے ساتھ توبہ کرے۔

آئندہ گناہ کے اندیشے کی وجہ سے توبہ کو مؤخر نہ کریں!

آئندہ گناہ کے اندیشے کی وجہ سے توبہ کو قطعاً مؤخر نہ کریں۔ بعض لوگ کسی گناہ سے توبہ اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ سے پھر گناہ صادر ہو جائے اور اس طرح میری توبہ صحیح نہیں رہ جائیگی کیونکہ توبہ میں تو یہ شرط ہے کہ آئندہ نہ کرنے کا پختہ عزم ہو کہ پھر گناہ نہیں کرونگا۔ ان کو چاہئے کہ آئندہ گناہ کے اندیشے کی وجہ سے توبہ کو قطعاً مؤخر نہ کریں بلکہ توبہ کر کے اپنی طرف سے یہ پختہ ارادہ کر لیں کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کرونگا۔ اب اگر یہ ارادہ کرتے وقت دل میں یہ اندیشہ موجود ہے کہ معلوم نہیں میں اس عزم پر ثابت قدم رہ سکوں گا یا نہیں تو یہ اندیشہ عزم کا منافی نہیں بلکہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑ گڑائیں کہ یا اللہ میں توبہ کر رہا ہوں اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر رہا ہوں۔ لیکن میرا کیا عزم اور ارادہ ہوگا۔ میں تو بہت ہی کمزور ہوں تو ہی مجھے اس عزم پر ثابت قدم فرما اور تو ہی مجھے حق پر استقامت عطا فرما۔

استغفار کے معنی و مطلب!

استغفار کے معنی ہیں بخشش مانگنا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں اور قصوروں کی معافی اور بخشش مانگنا۔ جب بندے کو توبہ والی کیفیت نصیب ہوتی ہے تو جو گناہ سرزد ہو چکے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ سے معافی اور بخشش کی دعا ضرور کرے تاکہ ان گناہوں کی سزا اور برے انجام سے بچ سکے اور اللہ تعالیٰ کئے ہوئے گناہوں کی اس دنیا میں بھی ستاری فرمائے کہ کسی کو اس کے گناہ کا علم نہ ہو اور آخرت میں بھی اس کے گناہوں کی پردہ پوشی

کرے کہ دنیا و آخرت میں لوگوں کے سامنے رسوائی اور ذلت سے بچ جائے۔

استغفار توبہ کے مقابلے میں عام ہے!

استغفار توبہ کے مقابلے میں عام ہے۔ توبہ میں استغفار تو ہوتا ہی ہے لیکن بعض صورتوں میں استغفار ہوگا لیکن توبہ کی شرائط اس میں نہ ہونگی۔ مثلاً جب دل میں کسی گناہ کا وسوسہ پیدا ہو جائے یا عبادت مثلاً نماز، روزہ میں بندہ کوتاہی محسوس کرتا ہے تو وہ فوراً استغفار کر لے۔ اسی طرح کسی اضطرابی کیفیت میں حرام روزگار میں مبتلا ہے، مثلاً بینک کی ملازمت کو اختیار کیا تھا پھر بعد میں احساس ہوا کہ یہ کمائی جائز نہیں ہے، وہ اس پر شرمندہ ہوا، پشیمان ہے لیکن دوسری طرف وہ عیال دار ہے، بیوی بچے ہیں، ان کے خرچ اخراجات اس کے ذمہ ہیں۔ اب اگر وہ فوراً ملازمت چھوڑ دیتا ہے تو اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں اس سے زیادہ حرام میں یا سخت تکلیف و پریشانی میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اس لئے اس نے فی الحال تو بینک کی ملازمت اختیار کی لیکن دوسرے روزگار کی تلاش میں اس طرح لگا ہوا ہے، جس طرح ایک بے روزگار آدمی روزگار تلاش کرتا ہے۔ ایسا شخص استغفار کرے گا اور ندامت اور پشیمانی پر اپنے کئے ہوئے پر بخشش مانگے اور اس ناجائز روزگار سے جان چھڑانے کیلئے گڑ گڑائے کہ یا اللہ! یہ کام تو ناجائز اور گناہ ہے، میں اس پر شرمندہ ہوں لیکن اللہ میں مجبور ہوں اور اس کام کو فی الحال چھوڑنے پر قادر نہیں ہوں، مجھے اپنی رحمت سے معاف فرما اور مجھے اس ناجائز کام سے نکال دے اور حلال پاک روزگار نصیب فرما۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑ گڑائے گا، استغفار کرے گا اور ساتھ ساتھ دوسرے روزگار کے لئے دل سے بھاگ دوڑ کرے گا تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے معاف بھی فرمائے گا اور اس کو اس گناہ سے بھی نکال دے گا۔ اسی طرح کوئی شخص کسی سخت نشہ میں مبتلا ہے اور اس کو بعد میں احساس ہوا اور وہ نشہ ایسا ہے کہ اس کو فوراً چھوڑنے میں سخت بیماری کا اندیشہ ہے اور وہ طبیب اور ڈاکٹر کے مشورے سے تدریجاً چھوڑ رہا ہے یا اس کے مقابلے میں کچھ وقت اس سے ہلکا نشہ تجویز کرتا ہے اور اسی طرح بتدریج وہ نشہ کی عادت کو چھوڑتا ہے تو ایسی صورت میں بھی بندہ استغفار کرے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑ گڑائے کہ یا اللہ! میں آپ کے سامنے سخت شرمندہ ہوں لیکن کیا کروں سخت مجبور ہوں، فوری طور پر نشہ چھوڑنے پر قادر بھی نہیں ہوں، آپ اپنی رحمت سے مجھے معاف فرمائیں اور مجھے اس گناہ سے جلد از جلد نکال دیجئے۔ اسی طرح جو شخص بھی کسی سخت مجبوری کی وجہ سے کسی گناہ میں مبتلا ہو چکا ہے اور وہ اسی طرح استغفار کرے گا اور اس گناہ سے جان چھڑانے کیلئے بے تاب ہوگا اور کوشش کرے گا۔ تو ان شاء اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے معاف بھی فرمائے گا اور ان کو ایسے لوگوں میں شمار نہیں فرمائے گا، جو

گناہوں پر اصرار اور ڈٹے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو اس گناہ سے نکال دے گا۔ جیسا کہ ایک حدیث شریف میں اس بات کی طرف راہنمائی کی ہے، چنانچہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَا أَصْرَمَنِ اسْتَغْفَرَ وَإِنْ عَادَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِينَ مَرَّةً)

”جو شخص (اپنے گناہ پر) استغفار کر لے۔ اس نے گناہ پر اصرار نہیں کیا، اگرچہ وہ دن میں ستر بار گناہ کر لے۔“

(ترمذی، ابوداؤد، مشکوٰۃ)

گناہ پر اصرار اور ڈٹ جانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی گناہ پر دوام اختیار کیا جائے۔ اس حدیث کا مطلب بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔

جو شخص سخت مجبوری کی وجہ سے کسی گناہ میں مبتلا ہو چکا ہے وہ اپنے اس گناہ پر شرمندہ ہے اور اس سے نکلنے کی پوری کوشش کرتا ہے لیکن فی الحال چھوڑنے پر قادر نہیں اس لئے وہ شرمندہ ہو کر اپنے گناہ پر استغفار کرتا ہے تو وہ گناہ پر اصرار کرنے والوں میں شمار نہ ہوگا۔ استغفار کے عام ہونے کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ گناہوں سے توبہ ہر آدمی خود کریگا۔ دوسرے کسی کے حق میں توبہ نہیں کر سکتا اس کے برعکس استغفار دوسروں کیلئے بھی ہو سکتا ہے مثلاً یہ کہنا کہ یا اللہ فلاں کے گناہوں اور قصور کو بخش دے، خلاصہ یہ ہوا کہ استغفار توبہ کے مقابلے میں عام ہے۔ استغفار ہر حالت میں اور ہر مسلمان کے لئے کی جاسکتی ہے، جبکہ توبہ کیلئے ضروری یہ ہے کہ آئندہ نہ کرنے اور اپنی اصلاح کا عزم ہو، نیز توبہ ہر شخص کا صرف شخصی معاملہ ہے جبکہ استغفار دوسرے مسلمانوں کیلئے بھی کیا جاسکتا ہے کیونکہ استغفار ایک خاص دعا ہے جو اپنے حق میں بھی کی جاسکتی ہے اور دوسرے مسلمانوں کے حق میں بھی، بلکہ فرشتے بھی مومنوں کے حق میں استغفار کرتے ہیں۔ (سورہ مومن: آیت ۷ اور سورہ شوری: آیت ۵)

مسلمان، مرنے والے دوسرے مسلمان بھائیوں اور رشتہ داروں کیلئے بھی دعاء مغفرت کریں! بلکہ حدیثوں میں مسلمان مرنے والوں کے لئے دعاء مغفرت کی ہدایت بھی کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قبر میں مدفون مردے کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جو دریا میں ڈوب رہا ہو اور وہ مدد کے لئے چیخ و پکار کر رہا ہو، وہ انتظار کرتا ہے کہ ماں باپ یا بھائی یا کسی دوست آشنا کی طرف سے دعاء مغفرت و رحمت کا تحفہ پہنچے جس کی طرف سے اس کو دعاء مغفرت پہنچتی ہے تو وہ اس کو دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوتا ہے اور دنیا میں رہنے والوں کی دعاؤں کی وجہ سے قبر کے مردوں کو اتنا عظیم ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے جس کی مثال پہاڑوں سے دی جاسکتی ہے اور مردوں کے

لئے زندوں کی طرف سے بہترین تحفہ ان کے لئے استغفار یعنی دعاء مغفرت ہے۔ (مشکوٰۃ)

اس حدیث میں ایک طرف مسلمانوں کو ترغیب ہے کہ وہ مسلمان رشتہ داروں، دوستوں کیلئے دعاء مغفرت کریں اور دوسری طرف لوگوں کو یہ ترغیب ہے کہ وہ دنیا میں ایسے کام کریں اور لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں کہ وہ موت کے بعد بھی تمہارے لئے دعائیں کریں۔ بلاشبہ نیکوکاروں کو زندوں کی دعائیں اور استغفار نفع پہنچاتا ہے۔

مسلمانوں کیلئے استغفار کرنے کا ثواب!

نیز حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو مسلمان بندہ عام مسلمان مردوں، عورتوں کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور بخشش مانگے گا، اسکے لئے ہر مسلمان مرد و عورت کے حساب سے ایک ایک نیکی لکھی جائیگی۔ (طبرانی، دیکھئے معارف الحدیث: ج ۵ ص ۳۲۵)

نیز حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو بندہ عام مومنین و مومنات کیلئے ہر روز ستائیس دفعہ اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کی دعا کر لے گا وہ اللہ تعالیٰ کے ان مقبول بندوں میں سے ہو جائیگا جن کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور جن کی برکت سے دنیا والوں کو رزق ملتا ہے۔ (مجمع کبیر، طبرانی، دیکھئے معارف الحدیث: ج ۵ ص ۳۲۶)

خلاصہ یہ کہ استغفار مسلمان رشتہ داروں اور عام مسلمانوں کے لئے بھی کیا جاتا ہے اور ان لوگوں سے ہمدردی اور حسن سلوک کا اس کو عظیم ثواب بھی ملے گا۔

گناہوں کا چھوڑنا فرض عین ہے!

گناہوں کا چھوڑنا فرض عین ہے، جس بندے سے جو گناہ سرزد ہو چکا ہے یا جس گناہ میں مبتلا ہے اس سے توبہ اور استغفار کرے۔ اگر کسی کو اپنا ظاہری یا باطنی گناہ نظر نہ بھی آ رہا ہو، تب بھی مسلمان کو چاہئے کہ وہ برابر توبہ و استغفار کرے اور نیکی کے کسی مقام پر بھی قناعت نہ کرے اور ہر وقت اپنے آپ کو اور اپنی عبادت و فرمانبرداری میں کمی محسوس کرے اور اس پر توبہ و استغفار کرے اور ادنیٰ حالت سے اعلیٰ اور بہتر سے بہترین حالت کی طرف بڑھنے کی کوشش کرے۔

توبہ اور استغفار کی اقسام!

توبہ و استغفار کی چار اقسام ہیں:

(۱) کفر و شرک، گناہوں اور خطاؤں سے توبہ اور استغفار۔

(۲) عبادات اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں ہونے والی کوتاہیوں سے استغفار۔

(۳) اس بات پر استغفار کہ اللہ تعالیٰ کا حق بندگی ادا نہیں کیا۔

(۴) دوسرے مسلمانوں کے لئے استغفار کرے یعنی دوسرے مسلمانوں کے بارے میں دعا کرے کہ یا اللہ

ان کو بخش دے اور ان کی مغفرت فرما۔

توبہ اور استغفار کی اقسام میں غور کرنے سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ توبہ اور استغفار صرف عاصیوں اور گناہگاروں ہی کا کام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے خاص و مقرب بندے یہاں تک کے انبیاء علیہم السلام جو گناہوں سے محفوظ و معصوم ہوتے ہیں ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی وہ محسوس کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق بالکل ادا نہیں ہو سکا۔ اس لئے وہ برابر توبہ و استغفار کرتے ہیں اور اپنے ہر عمل کو حتیٰ کہ اپنی نمازوں کو بھی قابل استغفار سمجھتے ہیں۔

پس توبہ و استغفار عاصیوں اور گناہگاروں کیلئے مغفرت و رحمت کا ذریعہ ہے اور مقربین و معصومین کیلئے درجات، قرب الہی و محبوبیت میں بے انتہا ترقی کا وسیلہ ہے۔ اس لئے توبہ و استغفار سے کوئی بھی ایمان والا مستثنیٰ نہیں بلکہ سب کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ توبہ و استغفار کریں۔

تمام لوگوں کو توبہ و استغفار کرنا چاہئے!

اس لئے ہر انسان کو چاہئے کہ وہ برابر اپنی اصلاح میں لگا رہے اور برابر توبہ و استغفار میں لگا رہے اور اللہ تعالیٰ نے مومن کی پہلی صفت ﴿التَّائِبُونَ﴾ (وہ توبہ کرنے والے ہیں) بیان فرمائی ہے۔ اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جملہ انبیاء علیہم السلام کے استغفار کو نقل فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام اور خود نبی کریم ﷺ کو استغفار کا حکم فرمایا تھا اور آپ ﷺ روزانہ استغفار کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنے نیک، متقی بندوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

﴿كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الْإِنسَانِ مَا يَهْتَجُونَ ۝ وَلَا سَخِرَ لَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۝﴾

”وہ رات میں تھوڑا سوتے تھے (یعنی رات میں قیام، رکوع و سجود اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہتے تھے)

اور رات کے آخری وقت میں معافی اور بخشش مانگتے تھے“۔ (الذاریات: آیت ۱۷ تا ۱۸)

مطلب کہ وہ اپنی عبادات اور اطاعت پر نازاں نہیں ہوتے اور نہ عبادات اور ریاضت سے مقصد ان کا

کشف و کرامات وغیرہ کا حصول ہوتا ہے بلکہ ان کی یہ ساری جدوجہد اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اسکی خوشنودی کا حصول ہوتا ہے اس لئے وہ اپنی عبادت سے استغفار کرتے ہیں کہ عبادت کا جیسا حق تھا، ویسا حق ہم سے ادا نہ ہو سکا۔ بلاشبہ جس شخص کے دل پر جس قدر اللہ تعالیٰ کی عظمت چھائی ہوئی ہوگی اسی قدر وہ اللہ تعالیٰ سے بخشش اور معافی مانگے گا اور اسی قدر وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی کی ہوئی عبادت اور اطاعت پر شرمندگی سے پانی پانی ہوگا۔

### توبہ میں جلدی کرو ورنہ.....!

ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ توبہ میں تاخیر نہ کرے جب بھی کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو فوراً توبہ کر لے۔ آج موقع ہے کہ توبہ کر کے اپنے آپ کو پاک صاف کریں ورنہ جب موت سر پر کھڑی ہوگی تو اس وقت ہرگز توبہ قبول نہ ہوگی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ الشُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ط وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ح حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ اللَّهُنَّ وَلَا لِلَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارًا ۖ أُولَٰئِكَ أَغْتَذَنَآ لَهُمْ عَذَابًا لَّيْمًا ۝﴾

”اللہ تعالیٰ پر توبہ قبول کرنے کی ذمہ داری تو بس ان لوگوں کے لئے ہے جو جہالت سے برائی کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں، پس یہی لوگ ہیں جنکی توبہ اللہ تعالیٰ قبول کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور بڑی حکمت والا ہے اور ان لوگوں کے لئے توبہ (کا وعدہ) نہیں ہے جو برائیاں کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب موت ان میں سے کسی کے سامنے آجائے تب کہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو اس حال میں مرتے ہیں کہ وہ کافر ہیں، ان لوگوں کیلئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔“ (النساء: آیت ۱۸ تا ۱۹)

ان دو آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ توبہ کا وعدہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو ایک توجہ جہالت کے سبب گناہ کر جاتے ہیں، دوسرا یہ کہ وہ گناہ کے بعد جلدی توبہ کر لیتے ہیں اور ان آیات میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان لوگوں کی کوئی توبہ نہیں جو حالت کفر میں مر جاتے ہیں یا جو اس وقت توبہ کرتے ہیں جب موت ان کے سامنے آجائے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

### جہالت کی تفصیل!

ان آیات میں ایک بات یہ سامنے آئی کہ توبہ کا وعدہ ان لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے جہالت کی وجہ سے گناہ کئے۔ ’جہالت‘ کے معنی نہ جاننے کے ہیں اور نہ جاننے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کسی سے واقف نہ ہو،



دوسری یہ کہ کسی چیز کا علم تو ہے لیکن خواہش نفس اور جذبات کے جوش اور تیزی اس کے علم کو چھپا لیتی ہے۔ اور انسان سے غفلت کے سبب کوئی نامناسب کام سرزد ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس لفظ کا غالب استعمال حلم کی ضد یعنی عدم برداشت اور بے صبری کیلئے ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھائیوں کے متعلق قرآن مجید میں ہے:

﴿قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَافَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ﴾

”حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے سوتیلے بھائیوں سے (کہا کہ کیا تم کو خبر ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اسکے بھائی کے ساتھ جو سلوک کیا جبکہ تم نادان تھے)۔ (الیوسف: آیت ۸۹)

حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے بھائیوں نے حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے بھائی کے ساتھ جو زیادتیاں کی تھیں وہ انہوں نے کسی خطا و نسیان کی وجہ سے نہیں کی تھیں بلکہ قصد اور ارادے سے کی تھیں۔ لیکن انہوں نے جو کچھ کیا تھا، وہ حسد کے جذبات سے مغلوب ہو کر کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ اپنے سچے بندوں کی صفات کا ذکر کر کے فرماتا ہے:

﴿إِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾

”جب جاہل لوگ ان سے اچھتے ہیں تو وہ ان کو سلام کر کے رخصت ہو جاتے ہیں“۔ (الفرقان: آیت ۶۲)

یہاں جاہل سے مراد وہی لوگ ہیں جو حسد، تعصب، تکبر اور ہٹ دھرمی کے جذبات کی وجہ سے مجادلہ اور مناظرہ کے درپے ہوتے ہیں اور حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ:

﴿قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ وَلَا تُصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝﴾

”یوسفؑ نے دعا کر کے (کہا، اے میرے رب! قید خانہ مجھے اس چیز سے زیادہ پسند ہے کہ جس کی طرف یہ (عورتیں) بلا رہی ہیں اور اگر تو نے ان کے فریب کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا“۔ (الیوسف: آیت ۳۳)

یہاں بالکل واضح ہے کہ جہالت سے مراد جذبات سے مغلوب ہونا ہے جس کی وجہ سے انسان برائی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور انبیاء علیہم السلام کی معصومیت!

اسی سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی فطرت سلیم اور ان کی معصومیت کا اندازہ لگائیے کہ حضرت یوسف علی



نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام تازہ نوجوان ہیں اور مصر کی حسین و جمیل اونچے اونچے خاندان والی لڑکیوں نے ان کو اپنی طرف پورے عشق و محبت اور فریب و مکر کے ساتھ متوجہ کرنے کی کوشش کی اور ان کیلئے بار بار ایسی فضا بنائی گئی کہ کسی طرح ان کو اپنی طرف مائل کریں اور ہر کاوٹ کو دور کیا لیکن ان پر اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور عظمت کا اس قدر غلبہ تھا اور وہ گناہ اور گناہ کی طرف میلان سے بھی اس قدر متنفر تھے کہ کوئی مکر و فریب اور کوئی دوسری چیز ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں ذرہ برابر کامیاب نہ ہو سکی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ سے بڑی لجاجت کے ساتھ درخواست کی کہ یا اللہ یہ خواتین مجھے جیل بھجوانے کی دھمکیاں دے رہی ہیں۔ یا اللہ جیل مجھے زیادہ پسند ہے اس چیز سے جس کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں اور تو ہی مجھے ان کے مکر و فریب سے بچائے رکھ۔ اگر تو نے ان کے مکر و فریب کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں جذبات سے مغلوب ہو کر ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا۔ دیکھئے حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ و السلام اپنے اوپر اعتماد نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہیں اور ان کی تواضع کو دیکھئے کہ اس قدر پاکیزگی کے باوجود ان کے کلام میں کوئی دعویٰ کی چیز نظر نہیں آتی اور آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں جہالت سے مراد جذبات سے مغلوب ہونا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جہالت کا غالب استعمال، جذبات، شہوت و غصہ وغیرہ سے مغلوب ہو کر کسی گناہ یا ظلم یا نامناسب کام کر گزرنے کیلئے آتا ہے۔

### جہالت کی بنیاد پر گناہ کا مطلب!

لہذا یہاں جہالت کی بنیاد پر گناہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ جب کسی کو کسی گناہ کے گناہ ہونے کا علم نہ ہو اور اس سے گناہ سرزد ہو جائے تو اس کیلئے توبہ ہے اور دوسروں کے لئے نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو بندہ بے خبری سے یا جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی برائی کر گزرتا ہے پھر جب اس کو علم ہو جاتا ہے یا جب جذبات کی تیزی دور ہو جاتی ہے تو فوراً نادم و پشیمان ہو کر توبہ کر لیتا ہے، ایسے ہی لوگوں کی توبہ اللہ تعالیٰ قبول فرماتا ہے۔

### جلدی توبہ کر لینے کا مطلب!

وقت قریب اور جلدی توبہ سے مراد یہ ہے کہ وہ جذبات جن سے مغلوب ہو کر اس نے یہ گناہ کیا ہے، مثلاً غصہ سے کسی کو گالی دی یا کوئی اور برائی کی، جب ان جذبات کی تیزی ختم ہو جائے تو فوراً نادم ہو کر اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ تائب ہو جائے۔

### جو لوگ دیر سے توبہ کریں ان کا حکم!

مذکورہ بالا بیان سے اتنی بات تو کھل کر سامنے آگئی کہ جو لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی برائی کر بیٹھتے ہیں، پھر فوراً توبہ تائب ہو کر اپنی اصلاح کر لیتے ہیں، ان لوگوں کے لئے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرما لیتے ہیں لیکن جو لوگ گناہ کے بعد فوراً جلدی توبہ نہ کریں، لیکن اتنی تاخیر بھی نہ کریں کہ موت سامنے آجائے تو ایسے لوگوں کا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت رحم و کرم کرنے والا ہے۔ وہ ان لوگوں کی توبہ کو بھی قبول فرما لیتا ہے جو موت کے آثار ظاہر ہونے سے پہلے توبہ کر لیں جیسا کہ متعدد آیات اور احادیث کے مضمون سے یہی بات نکلتی ہے کہ موت کے آثار ظاہر ہونے سے پہلے توبہ قبول ہو جاتی ہے۔ اس لئے بعض علماء فرماتے ہیں کہ قریب اور جلدی توبہ سے مراد آثار موت سے قبل توبہ کرنے کے ہیں، بلکہ اس کے بارے میں خود نبی کریم ﷺ کی واضح حدیث موجود ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(إِنَّ اللَّهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُعْرَغْ)

”بے شک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتا ہے جب تک کہ غرغہ کی کیفیت شروع نہ ہو جائے“۔ (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

موت کے وقت جب بندے کی روح جسم سے نکلنے لگتی ہے تو حلق کی نالی میں ایک قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ اسکو عربی میں غرغہ کہتے ہیں۔ اسکے بعد زندگی کی کوئی امید نہیں رہتی۔ اسوقت آدمی کا رابطہ اور تعلق اس دنیا سے کٹ کر عالم برزخ کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ بہر حال غرغہ انسانی زندگی کا وہ آخری وقت ہوتا ہے جبکہ موت کے آثار سامنے آجائیں اور موت کا یقین ہو جائے۔

اس بات کو قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت میں یوں بیان فرمایا ہے: ﴿لَيْسَتِ التَّوْبَةُ...﴾ ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہ ہوگی جو برابر برائیاں کرتے رہے، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت آجائے تو کہنے لگے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں۔ انسان کو چاہیے کہ اس غلط فہمی نہ رہے کہ ابھی توبہ کی کیا جلدی ہے، موت سے پہلے توبہ کر لوں گا، کیا پتہ اچانک ہی موت آجائے اور بہت بار ایسا ہوتا ہے کہ گناہوں کی نحوست بالآخر انسان کو توبہ کی توفیق سے موت کے آخری وقت محروم کر دیتی ہے۔ اس لئے بندے کو چاہئے اور مناسب یہی ہے کہ وہ فوراً اللہ تعالیٰ کے آگے توبہ تائب ہو کر اپنی اصلاح کا پختہ عزم کر لے اور اپنی اصلاح فوراً شروع کر دے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی آغوش میں ڈال دے۔

## توبہ کا طریقہ!

توبہ کیلئے کوئی خاص مکان یا زمان یا نماز وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ توبہ تو یہ ہے کہ انسان نادم ہو کر اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑ گڑائے۔ اس سے سابقہ گناہوں کی معافی مانگے اور آئندہ کیلئے گناہوں سے بچنے کا پختہ ارادہ کر لے اور اپنی اصلاح شروع کرے۔ اور جو حقوق اس کے ذمے رہ گئے ہیں، جس قدر ممکن ہو سکے، حسب طاقت ان کی تلافی اور ادائیگی شروع کرے اور حتی الوسع ہر ذی حق کو اس کو دیا ہوا حق واپس کر دے۔

اور توبہ کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت نفل توبہ کی نیت سے پڑھے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور میں ندامت اور شرمندگی، عاجزی اور انکساری اور آہ و زاری کے ساتھ گڑ گڑائے اور ایک ایک گناہ کو یاد کرے کہ یا اللہ اب تک بچھلی زندگی میں مجھ سے جو کچھ گناہ سرزد ہوئے ہیں، چاہے وہ ظاہری گناہ ہوں یا باطنی گناہ ہوں، بڑے گناہ ہوں، قصداً کئے ہوں یا بھول چوک سے کئے ہوں۔ یا اللہ میں ان سب سے توبہ کرتا ہوں، آئندہ نہیں کرونگا، تو ہی مجھے توبہ پر استقامت نصیب فرما اور میری توبہ کو قبول فرما۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے خوب گڑ گڑا کر اس سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگے، پھر جو گناہ ہیں ان کی تلافی شروع کرے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ مجھے ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بالکل سچ فرمایا کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص کوئی برائی اور گناہ کرتا ہے، پھر اس پر ندامت اور شرمندگی ہونے کی وجہ سے اٹھ کر وضو کرتا ہے اور پھر نماز پڑھتا ہے اور اپنے رب سے اپنے گناہ کی معافی مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسکے گناہ کو معاف فرما دیتا ہے۔ الحدیث (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

## گناہگاروں کے لئے خوشخبری!

گناہگاروں کو قطعاً مایوس نہیں ہونا چاہئے، جب تک موت سامنے نہ آئی ہو اس وقت تک بندوں کیلئے توبہ کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ لہذا جتنے گناہ کئے ہیں اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ذات، ندامت، شرمندگی اور پشیمانی کے ایک آنسو اور ایک توبہ کیساتھ سارے گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ گناہگاروں کو خوشخبری دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قُلْ يٰۤعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ۚ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝ وَاَنْۢبِیَآءِیْ رَّبِّکُمْ وَاَسْلَمُوْا لَہٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاتِیَکُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنصَرُوْنَ ۝﴾

”اے پیغمبر لوگوں سے (کہہ دو کہ) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ (میرے وہ بندوں، جنہوں نے (گناہ کر کے) اپنی

جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو بخش دے گا، بے شک وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے اور تم اس موقع کو غنیمت جانو اور فوراً جلدی جلدی اپنے رب کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرمانبردار بن جاؤ اس سے پہلے کہ تم پر عذاب آجائے، پھر تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائیگی۔ (الزمر: آیت ۵۳-۵۴)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بہت وسیع ہے، وہ توبہ اور معافی مانگنے پر بڑے بڑے گناہ اور قصور معاف فرمادیتا ہے اور بڑے بڑے مجرموں اور گناہگاروں کو سچی توبہ کے سبب بخش دیتا ہے اگرچہ اس کی قہر و جلال کی صفت بھی ہے لیکن وہ انہی مجرموں کیلئے جو جرائم اور گناہوں پر جے اور قائم رہتے ہیں جو کہ خالص شیاطین کا کام ہے اور ایسے لوگ سخت عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں۔

### توبہ واستغفار کے فضائل و فوائد!

توبہ واستغفار کے فضائل اور فوائد اس قدر کثرت سے بیان ہوئے ہیں کہ ان کے لئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے، یہاں بطور نمونہ صرف چند فضائل اور فوائد بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

### توبہ واستغفار ترقی کا زینہ ہے!

جو شخص اپنے رب سے راضی رہتا ہے اور اپنی نیکیوں پر قانع نہیں ہوتا اور جس شخص کے دل پر اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی چھائی رہتی ہے، وہ شخص برابر توبہ واستغفار کرتا رہیگا اور وہ برابر روحانی اور اخلاقی اور قربت الہی کے زینے طے کرتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام بھی برابر توبہ واستغفار کرتے رہتے تھے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(وَاللّٰهُ اِنِّیْ لَا اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ فِی الْیَوْمِ اَکْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنِ مَرَّةً)

”اللہ تعالیٰ کی قسم! میں دن میں ستر بار سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔“ (بخاری)

(مشکوٰۃ)

بلاشبہ جو بندہ جس قدر بندگی کے اونچے مقام پر فائز ہوتا ہے اور اپنے طور پر یہ سمجھتا ہے کہ شائد مجھ سے اللہ تعالیٰ کی بندگی میں کوئی قصور ہو گیا ہے اور میں وہ بندگی نہ کر سکا ہوں جو بے انتہا عظمت و کبریائی والے رب ذوالجلال والاکرام کی شان کے لائق ہے اور یہی وہ احساس ہوتا ہے جو بندے کو کسی اونچے سے اونچے مقام پر قانع نہیں ہونے دیتا بلکہ برابر بندگی اور قرب الہی کے زینے پر اونچے مقامات تک چڑھتا رہتا ہے۔ اور ایک دوسری

حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(يَا أَيُّهَا النَّاسُ تُؤْتُوا إِلَى اللَّهِ فَإِنِّي أَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ)

”اے لوگو! اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو (اور اسکی طرف رجوع کرو) اور میں بھی روزانہ سو مرتبہ اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرتا ہوں۔“ (صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

**توبہ واستغفار صرف زبانی چیز نہیں!**

یہ بات پہلے بھی ذکر ہو چکی ہے کہ توبہ واستغفار دراصل دل کے پلٹنے اور اپنے کئے پر ندامت اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور دل کی طلب کا نام ہے۔ زبان صرف اس دلی کیفیت کی ترجمانی کرتی ہے لہذا استغفار معافی کے الفاظ کی تلاوت اور پڑھنے کو نہیں کہتے بلکہ یہ وہ دل سے نکلے ہوئے الفاظ ہوتے ہیں جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی جاتی ہے اور اس بات کو ہر کوئی جان سکتا ہے کہ صرف معافی کے الفاظ پڑھنے اور سچی معافی مانگنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

**توبہ کرنے والے اللہ کے محبوب ہوتے ہیں!**

اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ﴾

”بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ کرنے والوں کو محبوب (اور دوست) رکھتا ہے اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں

کو محبوب (اور دوست) رکھتا ہے۔“ (البقرة: آیت ۲۲۲)

گناہوں پر نادم یا اپنی عبادات و طاعت پر نادم ہو کر توبہ کرنا عبدیت اور بندگی کا سب سے اعلیٰ مظہر ہے کیونکہ توبہ کے وقت بندہ اپنی گناہ گاری اور تقصیر و کمی کے احساس کی وجہ سے انتہائی ندامت اور پستی کی حالت میں ہوتا ہے اور گناہ کی گندگی کی وجہ سے اپنے پروردگار کو منہ دکھانے کے قابل نہیں سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو مجرم اور خطا کار سمجھ کر معافی اور بخشش مانگتا ہے اور آئندہ کیلئے توبہ کرتا ہے۔ اس لئے بندگی اور تذلل اور گناہ گاری و خطا کے احساس کی جو کیفیت توبہ کے وقت میں ہوتی ہے وہ کسی دوسری عبادت کے وقت نہیں ہوتی، اسی وجہ سے توبہ واستغفار بذات خود ایک اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے اور ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت یہ ہوتی ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ محبوب اور دوست رکھتا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا آیت میں اس محبت اور دوستی کو وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

نیز حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ ارشاد فرماتے تھے: خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کی توبہ سے اس مسافر آدمی سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو کسی ایسی غیر آباد اور سنسان زمین میں جو سامانِ حیات سے خالی اور اسبابِ ہلاکت سے بھری ہوئی ہو اور اسکے ساتھ بس ایک سواری کی اونٹنی ہو اس پر اسکے کھانے پینے کا سامان ہو۔ پھر وہ (آرام کرنے کیلئے) سر رکھ کر سو جائے پھر اسے نیند آجائے، پھر نیند سے بیدار ہو جائے تو دیکھے کہ اونٹنی غائب ہے تو وہ اس کی تلاش میں سرگردان ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ گرمی اور پیاس وغیرہ کی شدت سے جب اسکی جان خطرے میں پڑ جاتی ہے تو سوچنے لگتا ہے کہ (میرے لئے یہی بہتر ہے) کہ میں اسی جگہ جا کر پڑ جاؤں (جہاں سویا تھا)، یہاں تک کہ مجھے موت آجائے۔ وہ اسی ارادے سے وہاں آکر اپنے بازو پر سر رکھ کر مرنے کے لئے لیٹ جائے تو اسکی آنکھ کھلے تو وہ دیکھے کہ اسکی اونٹنی اس کے پاس موجود ہے اور اس پر کھانے پینے کا پورا سامان بھی لدا ہوا محفوظ ہے تو جتنا خوش یہ مسافر اونٹنی کے ملنے سے ہوگا، اللہ کی قسم! مومن بندے کی توبہ کرنے سے اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے۔ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ)

بلاشبہ اس حدیث شریف میں توبہ کرنے والے گناہگاروں کو اللہ تعالیٰ کی جس خوشنودی کی بشارت سنائی گئی ہے وہ جنت اور اسکی ساری نعمتوں سے بھی بڑھ کر ہے۔ حضرت مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو نقل کر کے اسکی تشریح میں لکھتے ہیں:

”ذرا تصور کیجئے اس بد و مسافر کا جو اکیلا اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر اور راستہ بھر کیلئے کھانے پینے کا سامان اُس پر لاد کر دور دراز کے سفر پر کسی ایسے راستہ سے چلا جس میں کہیں دانہ پانی ملنے کی امید نہیں، پھر اٹانے سفر میں وہ کسی دن دوپہر میں کہیں سایہ دیکھ کر اتر اور آرام کرنے کے ارادہ سے لیٹ گیا، اس تھکے ماندے مسافر کی آنکھ لگ گئی، کچھ دیر کے بعد جب آنکھ کھلی تو اسنے دیکھا کہ اونٹنی اپنے سارے ساز و سامان کے ساتھ غائب ہے، وہ بیچارہ حیران و سرسیمہ ہو کر اسکی تلاش میں دوڑا بھاگا، یہاں تک کہ گرمی اور پیاس کی شدت نے اس کو لب و دم کر دیا، اب اس نے سوچا کہ شاید میری موت اسی طرح جنگل بیابان میں لکھی تھی اور اب بھوک پیاس میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مرنا ہی میرے لئے مقدر ہے اس لئے وہ اسی سایہ کی جگہ مرنے کے لئے آ کے پڑ گیا اور موت کا انتظار کرنے لگا، اسی حالت میں اسکی آنکھ پھر چھلکی، اس کے بعد جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اونٹنی اپنے ساز و سامان کے ساتھ اپنی جگہ کھڑی ہے۔ ذرا اندازہ کیجئے کہ بھاگی ہوئی اور گرم شدہ اونٹنی کو اس طرح اپنے پاس کھڑا دیکھ کے اُس بد و کو جو مایوس ہو کر مرنے کے لیے پڑ گیا تھا کس قدر خوشی ہوگی۔ صادق مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث پاک میں قسم کھا کے فرمایا کہ: خدا کی

قسم! بندہ جب جرم و گناہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا اور سچے دل سے توبہ کر کے اس کی طرف آتا ہے تو اس رحیم و کریم رب کو اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے جتنی کہ اس بد و کو اپنی بھاگی ہوئی اونٹنی کے ملنے سے ہوگی۔

قریب قریب یہی مضمون صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی مروی ہے۔ اور صحیح مسلم میں ان دونوں بزرگوں کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ، حضرت نعمان بن بشیر اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہم سے بھی یہی مضمون مروی ہے، بلکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس بد و مسافر کی فرط مسرت کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ: اونٹنی کے اس طرح مل جانے سے وہ اتنا خوش ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی اس بے انتہا عنایت اور بندہ نوازی کے اعتراف کے طور پر وہ کہنا چاہتا تھا کہ: ”اللَّهُمَّ انتَ رَبِّي وَأَنَا عَبْدُكَ“ (خداوند! بس تو ہی میرا رب ہے اور میں تیرا بندہ) لیکن خوشی کی سرمستی میں اس کی زبان بہک گئی اور اُس نے کہا: ”اللَّهُمَّ انتَ عَبْدِي وَأَنَا رَبُّكَ“ (میرے اللہ! بس تو میرا بندہ اور میں تیرا خدا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کی اس غلطی کی معذرت کرتے ہوئے فرمایا: ”أَخْطَأَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ“ (فرط مسرت اور بے حد خوشی کی وجہ سے اُس بے چارے بد و کی زبان بہک گئی)۔

بلاشبہ اس حدیث میں توبہ کرنے والے گناہگاروں کو اللہ تعالیٰ کی جس خوشنودی کی بشارت سنائی گئی ہے وہ جنت اور اُس کی ساری نعمتوں سے بھی فائق ہے۔

شیخ ابن القیم نے ”مدارج السالکین“ میں توبہ و استغفار ہی کے بیان میں اسی حدیث پر کلام کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی اس خوشنودی کی وضاحت میں ایک عجیب و غریب مضمون لکھا ہے جس کو پڑھ کر ایمانی روح وجد میں آجاتی ہے۔ ذیل میں اس کا صرف حاصل و خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

”اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کی ہوئی ساری کائنات میں انسان کو خاص شرف بخشا ہے دنیا کی ساری چیزیں اُس کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور اُس کو اپنی معرفت اور اطاعت و عبادت کے لئے پیدا فرمایا ہے، ساری مخلوقات کو اس کے لئے مسخر کیا اور اپنے فرشتوں تک کو اس کا خادم اور محافظ بنایا، پھر اس کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کتابیں نازل فرمائیں اور نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا، پھر ان ہی میں سے کسی کو اپنا خلیل بنایا اور کسی کو شرف ہم کلامی بخشا اور بہت بڑی تعداد کو اپنی ولایت اور قُرب خصوصی کی دولت سے نوازا..... اور انسانوں ہی کے لئے اعلیٰ و فقہائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے سمجھا کہ اگر اس طرح کسی کی زبان بہک جائے اور اُس سے کفر کا کلمہ نکل جائے تو وہ کافر نہ ہوگا، فقہ اور فتاویٰ کی کتابوں میں اس کی تصریح ہے۔



در اصل جنت و دوزخ کو بنایا..... الغرض دنیا و آخرت میں اور عالم خلق و امر میں جو کچھ ہے اور ہوگا اُس سب کا اصل مرکز و محور بنی نوع انسان ہی ہے اُسی نے امانت کا بوجھ اٹھایا، اُسی کے لئے شریعت کا نزول ہوا اور ثواب و عذاب دراصل اُسی کے لئے ہے..... پس اس پورے کارخانہ عالم میں انسان ہی اصل مقصود ہے، اللہ نے اُس کو اپنے خاص دستِ قدرت سے بنایا، اُس میں اپنی روح ڈالی، اپنے فرشتوں سے اُس کو سجدہ کرایا اور ابلیس اس کو سجدہ ہی نہ کرنے کے جرم میں مردودِ بارگاہ ہوا اور اللہ نے اُس کو اپنا دشمن قرار دیا..... یہ سب اس لئے کہ اُس خالق نے انسان ہی میں اس کی صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ایک زمینی اور مادی مخلوق ہونے کے باوجود اپنے خالق و پروردگار کی (جو وراء الراء اور غیب الغیب ہے) اعلیٰ درجہ کی معرفت حاصل کر کے، ممکن حد تک اس کے اسرار اور اُس کی حکمتوں سے آشنا ہو، اُس سے محبت اور اُس کی اطاعت کر کے اُس کے لئے اپنے نفسانی مرغوبات اور اپنی ہر چیز کو قربان کر کے اور اس دنیا میں اس کی خلافت کی ذمہ داریوں کو ادا کر کے اور پھر اس کی خاص الخاص عنایتوں اور بے حساب بخششوں کا مستحق ہو کر اس کی رحمت و رأفت، اس کے پیار و محبت اور اس کے بے انتہا لطف و کرم کا مورد بنے اور چونکہ وہ ربِّ کریم اپنی ذات سے رحیم ہے اور لطف و کرم اس کی ذاتی صفت ہے (جس طرح بلا تشبیہ مامتاں کی ذاتی صفت ہے) اس لئے اپنے وفادار اور نیک کردار بندوں کو انعامات و احسانات سے تو ازنا اور اپنے عطیات سے ان کی جھولیوں کو بھر دینا اُس کے لئے بلا تشبیہ اسی طرح بے انتہا خوشی کا باعث ہوتا ہے جس طرح اپنے بچے کو دودھ پلانا اور نہلا دھلا کر اچھے کپڑے پہنانا مامتا والی ماں کے لئے انتہائی خوشی کا باعث ہوتا ہے..... اب اگر بندے نے بدبختی سے اپنے اُس خالق و پروردگار کی وفاداری اور فرمانبرداری کا راستہ چھوڑ کے بغاوت و نافرمانی کا طریقہ اختیار کر لیا اور اس کے دشمن اور باغی شیطان کے لشکر اور اس کے تابعین میں شامل ہو گیا اور ربِّ کریم کی ذاتی صفت رحمت و رأفت اور لطف و کرم کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے بجائے وہ اُس کے قہر و غضب کو بھڑکانے لگا تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ میں (بلا تشبیہ) غصہ اور ناراضی کی سی کیفیت پیدا ہوگی جو نالائق اور ناخلف بیٹے کی نافرمانی اور بدکرداری دیکھ کر مامتا والی ماں کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے..... پھر اگر اُس بندے کو کبھی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ محسوس کرے کہ میں نے اپنے مالک و پروردگار کو ناراض کر کے اپنے مستقبل کو برباد کر لیا اور اُس کے دامن رحم و کرم کے سوا میرے لئے کوئی جائے پناہ نہیں ہے، پھر وہ اپنے کئے پر نادم و پشیمان ہو اور مغفرت و رحمت کا سائل بن کر اُس کی بارگاہ کرم کی طرف رجوع کرے، سچے دل سے توبہ کرے، روئے اور گڑگڑائے اور معافی مانگے اور آئندہ کے لئے وفاداری اور فرمانبرداری کا عہد و ارادہ کر لے تو سمجھا جاسکتا



ہے کہ اس کے اس کریم رب کو جس کی ذاتی صفت رحمت و رأفت اور جس کا پیار ماں کے پیار سے بھی ہزاروں گنا زیادہ ہے اور جو بندوں پر نعمتوں کی بارش برسا کے اتنا خوش ہوتا ہے جتنا نعمتوں کو پا کر محتاج بندے خوش نہیں ہوتے، تو سمجھا جاسکتا ہے کہ ایسے کریم پروردگار کو اپنے اس بندے کی اس توبہ و انابت سے کتنی خوشی ہوگی۔“

شیخ ابن القیمؒ نے اس سے بہت زیادہ وضاحت اور بسط کے ساتھ یہ مضمون لکھنے کے بعد آخر میں کسی عارف کا ایک واقعہ لکھا ہے جو شیطان یا نفسِ امارہ کے اغواء سے غلط راستے پر پڑ گئے تھے اور سرکشی و نافرمانی کے جراثیم اس کی رُوح میں پیدا ہونے لگے تھے.....

وہ لکھتے ہیں کہ:..... ”وہ عارف ایک گلی سے گزر رہے تھے، انھوں نے دیکھا کہ ایک گھر کا دروازہ کھلا اور ایک بچہ روتا چلا تا ہوا اُس میں سے نکلا، اس کی ماں اس کو گھر سے دھکے دے دے کے نکال رہی تھی، جب وہ دروازہ سے باہر ہو گیا تو ماں نے اندر سے دروازہ بند کر لیا، بچہ اسی طرح روتا چلا تا بکلتا بڑا تا دور تک گیا، پھر ایک جگہ پہنچ کے کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ میں اپنے ماں باپ کے گھر کے سوا کہاں جاسکتا ہوں اور کون مجھے اپنے پاس رکھ سکتا ہے، یہ سوچ کے ٹوٹے دل کے ساتھ وہ اپنے گھر کی طرف لوٹ پڑا، دروازہ پر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ دروازہ اندر سے بند ہے تو وہ بیچارہ وہیں چوکھٹ پر سر رکھ کے پڑ گیا اور اسی حالت میں سو گیا۔ ماں آئی، اُس نے دروازہ کھولا اور اپنے بچے کو اس طرح چوکھٹ پر سر رکھ کے پڑا دیکھ کے اس کا دل بھر آیا اور مامتا کا جذبہ ابھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، بچے کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور اس کو پیار کرنے لگی اور کہہ رہی تھی: بیٹے تو نے دیکھا تیرے لئے میرے سوا کون ہے، تو نے نالائق نادانی اور نافرمانی کا راستہ اختیار کر کے اور میرا دل دکھا کے مجھے وہ غصہ دلایا جو تیرے لئے میری فطرت نہیں ہے، میری فطرت اور مامتا کا تقاضا تو یہی ہے کہ میں تجھ پر پیار کروں اور تجھے راحت و آرام پہنچانے کی کوشش کروں، تیرے لئے ہر خیر اور بھلائی چاہوں میرے پاس جو کچھ ہے تیرے ہی لئے ہے..... اُن عارف نے یہ سارا ماجرا دیکھا اور اس میں اُن کے لئے جو سبق تھا وہ لیا۔“

اس قصہ پر غور کرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سامنے رکھئے: ”اللّٰهُ اَرْحَمُ لِعِبَادِهِ مِنْ هٰذِهِ بَوْلَدِهَا“ (خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ کی ذات میں اپنے بندوں کے لئے اس سے زیادہ پیارا اور رحم ہے جتنا کہ اس ماں میں اپنے بچے کے لئے ہے)۔ کیسے بد بخت اور محروم ہیں وہ بندے جنہوں نے نافرمانی کی راہ اپنا کے ایسے رحیم و کریم پروردگار کی رحمت سے اپنے کو محروم کر لیا ہے اور اس کے قہر و غضب کو بھڑکار رہے ہیں، حالانکہ توبہ کا دروازہ اُن کے لئے کھلا ہوا ہے اور وہ اُس کی طرف قدم بڑھا کے اللہ تعالیٰ کا وہ پیار حاصل کر سکتے ہیں جس کے

سامنے ماں کا پیار کچھ بھی نہیں اللہ تعالیٰ ان حقائق کا فہم اور یقین نصیب فرمائے۔

سچی توبہ فرض عین ہے اور سچی توبہ کرنے والوں کے لئے آخرت میں جنت ہے!

توبہ فرض عین ہے اور سچی توبہ کرنے والوں کا صلہ آخرت میں جنت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ

جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ.....﴾

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع (اور اسکے آگے توبہ) کرو، مخلصانہ توبہ۔ امید ہے کہ تمہارا رب

تمہاری برائیاں تم سے دور کر دے اور تم کو ایسی جنتوں میں داخل فرما دے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔“

(التحریم، آیت ۸)

توبہ نصوح سے مراد وہ توبہ ہے جو دل کی پوری ندامت و پشیمانی اور انقیاد اور سچے اور پختہ عزم کے ساتھ ہو اور

جس کے بعد اس گناہ کی طرف کوئی خیال اور ارادہ باقی نہ رہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سچی توبہ فرض عین ہے

۔ ہر ایمان والے کو چاہئے کہ وہ فوراً اپنے گناہوں سے توبہ کر کے ایمان و تقویٰ کی سیدھی شاہراہ کو اختیار کرے۔ اللہ

تعالیٰ اسکے تمام گناہوں کو ان کے اثرات کو دور فرمائے گا اور ان کو جنتوں میں ہمیشہ کیلئے داخل فرما دے گا۔

توبہ کرنے والا گناہوں سے ایسے پاک ہو جاتا ہے کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں!

انسان کا آئینہ فطرت جس کا جوہر پاکیزہ و صاف ستھرا ہے اس لئے نیکی سے اسکی پوری موافقت ہے اور گناہ

اس آئینہ فطرت کو زنگ آلود اور داغدار کرتا ہے لیکن ندامت اور دل کے آنسو اور سچی توبہ اس کو اس طرح صاف و

شفاف کرتا ہے کہ آئینہ فطرت پر کوئی داغ دھبہ اور گرد باقی نہیں رہ جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو نبی کریم ﷺ نے ان

الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

(التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ)

”گناہوں سے توبہ کرنے والا اس شخص جیسا ہے کہ جس نے گناہ کیا ہی نہیں۔“ (ابن ماجہ، بہیقی، مشکوٰۃ)

۱۔ یہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک حدیث کا ٹکڑا ہے۔ ایک عورت تھی جو والہانہ انداز میں اپنے بچے کو بار بار اٹھا کے

سینے سے لگاتی اور دودھ پلاتی تھی، دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ مامتا کے جذبہ سے اس کا سینہ بھرا ہوا ہے، رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا: ”خدا کی قسم! اللہ کی ذات میں اپنے بندوں کے لئے

اُس سے زیادہ پیارا اور رحم ہے جتنا کہ اس ماں میں اپنے بچے کے لئے ہے۔“

توبہ جلدی کرنی چاہئے اور توبہ دل کا صیقل ہے!

توبہ کے سبب دل سے گناہوں کا زنگ دور ہو کر پاک صاف اور شفاف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ

ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”بے شک مومن بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اسکی وجہ سے اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے پھر اگر اس نے گناہ کے بعد توبہ واستغفار نہ کیا بلکہ مزید گناہ پر گناہ کئے تو دل کی سیاہی اور بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ اسکے دل پر چھا جاتی ہے اور یہی وہ سیاہی ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا:

﴿كَأَبْلُ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾

”ہرگز نہیں بلکہ ان (برے) کر تو توں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ لگ گیا ہے (جسکی وجہ سے وہ ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں)

اس سے معلوم ہوا کہ گناہوں کا صیقل توبہ واستغفار ہے اور یہ بھی کہ بندہ کو چاہئے کہ وہ اپنے گناہوں سے جلد توبہ کریں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گناہوں کا زنگ اس قدر بڑھ جائے کہ وہ اس کے پورے دل پر چھا جائے جس کے بعد اس کا دل بینائی سے محروم ہو جائے اور خدا نہ کرے کہ کہیں قیامت کے روز کفار و مشرکین کی صف میں کھڑا ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو سچی توبہ نصیب فرمائے اور ہم کو بُری موت سے بچا کر ایمان و تقویٰ پر خاتمہ فرمائے، آمین!

پہلی توبہ واستغفار کرنے والوں کے لئے دنیوی فائدے!

پہلے بھی یہ بیان آپکا ہے کہ توبہ واستغفار کرنے والے کی دنیاوی زندگی اچھی اور پاکیزہ گزرتی ہے اور یہاں اس کے بارے میں قرآن و حدیث سے مزید کچھ نقل کر دیتا ہوں۔ قرآن مجید نے حضرت ہود علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا خطاب جو اپنی قوم کو کیا تھا، اسکو نقل کیا ہے، اس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ بھی قوم سے فرمایا تھا کہ:

﴿وَيَقَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَى قُوَّتِكُمْ

وَلَا تَتَوَكَّلُوا مُجْرِمِينَ ۝﴾

”اے میری قوم! اپنے رب سے معافی مانگو، پھر اس کی طرف رجوع کرو، وہ تمہارے اوپر خوب (رحمت) کی بارشیں برسائے گا اور تمہاری قوت میں اضافہ کرے گا اور تم مجرم بن کر روگردانی نہ کرو۔“ (الہود: آیت ۵۲)

اور حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی قوم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۖ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۖ وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَيَنْبِنَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا ۖ مَا لَكُمْ لَاتَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ۖ﴾

”پس میں نے (ان سے) کہا کہ اپنے رب سے معافی مانگو، بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا اور تمہارے لئے باغات پیدا کریگا اور تمہارے لئے نہریں جاری کریگا۔ تم کو کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے لئے کسی وقار و عظمت اور جلال کی توقع نہیں رکھتے۔“ (النوح: آیت ۱۰ تا ۱۳)

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے ذریعے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

﴿وَإِنْ اسْتَغْفِرُوا رَبُّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَتَاعًا حَسَنًا إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى وَيُؤْتِ كُلَّ ذِي فَضْلٍ فَضْلَهُ.....﴾

”اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی مانگو، اس کی طرف رجوع کرو۔ وہ تم کو ایک وقت مقررہ تک سامان زندگی پہنچائے گا، اچھا سامان زندگی اور ہر مستحق فضل (زیادتی والے) کو (خاص) اپنے فضل (زیادتی) سے نوازے گا۔“ (الہود: آیت ۳)

مذکورہ بالا آیات میں سے پہلی اور اس آخری آیت میں استغفار کے بعد توبہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس سے توبہ کی حقیقت اور زیادہ واضح ہو گئی۔ وہ یہ کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہ اور جرم کی معافی مانگے اور اس سے آئندہ باز رہنے کا پختہ عزم کرے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے اس صحیح راہ کو اختیار کر لے جس کی طرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے رہنمائی فرمائی ہے۔

### توبہ واستغفار کے سبب رحمت کی بارشیں!

دوسری بات مذکورہ بالا آیات میں یہ بیان ہوئی کہ اللہ تعالیٰ سچی اور خالص توبہ کے سبب خوب رحمت کی بارشیں برسائے گا۔ یہ حلال، پاک رزق کی فراوانی کی تعبیر ہے کہ توبہ اور ایمان و تقویٰ کے سبب آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں جیسا کہ اس کا پورا بیان ان شاء اللہ تقویٰ کے باب میں آئے گا۔

### باغات اور خوشحالی!

تیسری بات ان آیتوں میں یہ بیان ہوئی کہ توبہ واستغفار اور ایمان وتقویٰ کے سبب اللہ تعالیٰ تمہارے لئے باغات پیدا کر دیگا اور تمہارے لئے پانی کی نہریں جاری کریگا۔

### مال اور اولاد کی ترقی!

چوتھی بات یہ فرمائی گئی کہ اللہ تعالیٰ توبہ واستغفار کی برکت سے تم کو مال اور اولاد میں فروغ اور ترقی نصیب فرمائے گا۔

### روحانی، جسمانی اور سیاسی قوت!

پانچویں بات ان آیتوں میں یہ ذکر ہوئی کہ وہ تمہاری قوت میں اضافہ پر اضافہ کریگا۔ اس سے مراد جسمانی، مالی اور ان مادی قوتوں پر مزید روحانی قوت و عزت کا اضافہ بھی مراد ہے۔ اور اس میں اجتماعی توبہ سے اس برکت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ تمہاری سیاسی قوت اور شوکت و دبدبہ میں اضافہ کرے گا اور اضافی قوت میں قلبی اطمینان و سکون بھی شامل ہے۔

### عزت و شرف والی اچھی اور خوشحال زندگی!

ان آیات میں چھٹی بات یہ بیان ہوئی کہ اللہ تعالیٰ تم کو توبہ واستغفار اور رجوع الی اللہ کی برکت سے ایک مقررہ وقت تک سامان زندگی پہنچائے گا، اچھا سامان زندگی و متاع سے مراد وہ سامان زندگی ہے جس سے انسان فائدہ حاصل کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تمہارے لئے جتنا وقت مقرر ہے اس وقت تک تم کو دے گا۔

### سامان زندگی کی دو اقسام ہیں!

سامان زندگی جس سے لوگ دنیا کی زندگی میں فائدہ اٹھاتے ہیں، اس کی دو اقسام ہیں: ایک وہ سامان زندگی اور مال و دولت وغیرہ جو انسان کو دھوکے اور غفلت میں ڈال دیتا ہے اور وہ انسان کو اور زیادہ اللہ تعالیٰ سے دور کر دیتا ہے اور فخر و غرور و حسد وغیرہ بدترین بیماریوں میں انسان کو مبتلا کر دیتا ہے اور اسکی دنیا و آخرت کو برباد کر دیتا ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو انسان کی شکرگزاری میں اضافہ کرتا ہے اور انسان کی دنیا و آخرت دونوں کیلئے اطمینان و سکون اور راحت و عزت اور کامیابیوں و کامرانیوں کا سبب بنتا ہے۔ پہلی قسم کو متاع الغرور یعنی دھوکے کا سامان زندگی اور دوسری قسم کو متاع حسن یعنی اچھا اور حسن و خوبی والا سامان زندگی کہتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا میں جتنی زندگی تمہارے لئے مقدر ہے، اس دنیا کی زندگی میں بھی توبہ واستغفار اور ایمان و تقویٰ کے سبب اللہ تعالیٰ تم کو اچھی اور پاکیزہ زندگی نصیب فرمائے گا اور تم کو حسن و خوبی والے سامان زندگی عطا فرمائے گا جسکی وجہ سے تم ذلت و خواری کے بجائے عزت و شرف اور باہمی الفت اور ظاہری و باطنی امن و سکون کے ساتھ گزارو گے اور دنیا کے یہ سامان، مال و دولت اور دبدبہ وہ سامان زندگی نہ ہوگی جو ناشکروں اور گمراہ لوگوں کو ملتی ہے جسکی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ سے اور زیادہ غفلت اور دوری میں پڑ جاتے ہیں اور وہ ان کیلئے فخر و غرور، حسد، قلبی بے چینی اور باہمی بغض و عناد و فساد اور بد امنی کا اور بالآخر دنیا و آخرت کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ بلکہ یہ وہ حسن و خوبی والا سامان ہوگا جو تمہارے اخلاق و کردار کے اندر اور زیادہ حسن و خوبی پیدا کرے گا۔ اسکی وجہ سے تمہاری شکرگزاری، ایمان و تقویٰ میں اور زیادہ اضافہ ہوگا جس کی وجہ سے تم اللہ تعالیٰ اور اسکے بندوں کے حقوق اچھی طرح ادا کرو گے اور یہ وہ سامان زیست ہوگا جس کے سبب دنیا میں خیر و صلاح کو پھیلاؤ گے اور شر، ظلم و فساد کو مٹا دو گے۔ خلاصہ یہ کہ وہ سامان زندگی ہوگا جو تمہارے لئے دنیا و آخرت دونوں جہاں کے لئے اطمینان و سکون، باہمی الفت و مودت اور عزت و شرف اور کامرانیوں، ترقیوں کا سبب بنے گا۔

### تمام تر مسائل اور مشکلات کا حل!

بلاشبہ توبہ واستغفار اور ایمان و تقویٰ کی راہ کو اختیار کرنا انسان پر دنیا اور آخرت کی نعمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے اور اسی وجہ سے دنیا کے تمام مسائل حل ہو جاتے ہیں اور اسی کی وجہ سے دنیاوی مصائب اور آفتیں دور ہو جاتی ہیں۔ اس پر تاریخ، تجربہ اور قرآن مجید سب گواہ ہیں کہ جن لوگوں نے توبہ واستغفار اور ایمان و تقویٰ کی راہ اختیار کی، انکو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی میں بھی نواز اور ان کو عزت و شرف کی زندگی نصیب کی۔

### مختلف اقسام کے پریشان حال لوگوں کی پریشانیوں کا ایک ہی جواب!

بس ہر پریشانی کا حل اور ہر کامرانی کا راز توبہ واستغفار اور ایمان و تقویٰ کے اپنانے میں ہے۔ ابن صبیح کہتے ہیں کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک آدمی آیا۔ اس نے قحط سالی کی شکایت کی تو انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔ ایک دوسرا شخص آیا، اس نے اپنے فاقہ و تنگی کی شکایت کی، انہوں نے اس کو بھی یہی جواب دیا۔ تیسرا آدمی آیا، اس نے اولادِ زینہ کیلئے دعا کی درخواست کی، تو انہوں نے اس کو بھی یہی جواب دیا۔ چوتھا آدمی آیا اور اس نے عرض کی کہ میرا باغ خشک ہو گیا ہے، پھل نہیں دیتا، انہوں نے اس کو بھی یہی جواب دیا کہ

استغفار کرو، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔ ابن صبیح کہتے ہیں کہ ہم نے ان سے عرض کیا کہ مختلف لوگوں نے مختلف چیزوں کے بارے میں دعا کی درخواست کی۔ آپ نے سب کا ایک ہی جواب دیا۔ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ میں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا بلکہ اللہ تعالیٰ سورۃ نوح میں فرماتا ہے:

﴿اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَيَجْعَلْ لَكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَلْ لَكُمْ أَنْهَارًا﴾

توبہ واستغفار میں ہر مصیبت و پریشانی کا علاج ہے!

خلاصہ یہ کہ سچی توبہ واستغفار ہی میں ہر تنگی اور ہر پریشانی، فقر و فاقہ اور ہر غم کا علاج ہے، جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے اور آخر میں اسکے متعلق خود نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی پڑھ لیجیے:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ لَزِمَ الْإِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللَّهُ مِنْ كُلِّ ضِيقٍ مَخْرَجًا وَمِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا وَآرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ)

”جو بندہ استغفار کو لازم پکڑ لے (یعنی اللہ تعالیٰ سے برابر اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہے) تو اللہ تعالیٰ اسکے لئے ہر تنگی سے نجات پانے کی راہ نکال دیتا ہے اور اس کا ہر غم اور پریشانی دور کر دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے اور ایسے طریقوں سے (حلال و پاک) رزق دیتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔“ (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

یاد رہے کہ یہ وعدہ صرف استغفار پڑھنے پر نہیں بلکہ توبہ واستغفار کی اس حقیقت پر جس کا بیان بار بار کر چکا ہوں۔ وہ یہ کہ بندہ اپنے قصوروں اور کوتاہیوں پر نادم اور پشیمان ہو اور دل سے اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست کرتا ہو اور اپنی اصلاح کی کوشش میں لگا ہوا ہو اور نبی کریم ﷺ نے جو یہ بات فرمائی اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾

”اور جو شخص تقویٰ کو اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسکے لئے (ہر تنگی سے) نکلنے کی راہ نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ (اور ایسے طریقوں) سے رزق دیتا ہے جہاں سے اس کا خیال و گمان بھی نہیں ہوتا۔“

توبہ واستغفار کن الفاظ کے ساتھ کرنا چاہئے!

توبہ واستغفار کن الفاظ میں کرنا چاہئے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ توبہ گناہوں سے باز آنے اور پچھلے



گناہوں اور قصوروں پر اللہ تعالیٰ سے مانگنا ہوتا ہے۔ اس لئے توبہ واستغفار کیلئے کوئی خاص الفاظ یا خاص زبان ضروری نہیں بلکہ بندہ جس زبان اور جن مناسب الفاظ سے توبہ واستغفار کریگا، وہ اگر سچے دل سے ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیقی توبہ واستغفار ہے۔ لہذا توبہ واستغفار کے الفاظ یہ ہیں کہ سیدھے سادھے طریقے پر اپنی زبان میں ہی اللہ تعالیٰ سے گناہوں پر معافی مانگے مثلاً یہ کہ یا اللہ، میرے کئے ہوئے گناہوں، قصوروں اور کوتاہیوں کو معاف کر دیجئے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے کہ عاجزی وانکساری اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے اپنے الفاظ میں معافی مانگے اور توبہ کر لے۔ البتہ قرآن وحدیث میں معافی مانگنے کے کئی الفاظ آئے ہیں: یہ وہ الفاظ ہیں جن سے آدمی عاجزی وانکساری سیکھ جاتا ہے۔

**صرف الفاظ کے پڑھنے سے توبہ قبول نہ ہوگی اور توبہ واستغفار کا حق ادا نہ ہوگا!**

اگرچہ ان الفاظ کا پڑھنا بھی بہت ہی بابرکت ہے، لیکن جب تک ان کے معنی کو سیکھا نہ جائے گا اور ان الفاظ کو مد نظر رکھ کر اللہ تعالیٰ سے معافی نہ مانگی جائے تو ان الفاظ کے پڑھنے سے توبہ قبول نہ ہوگی اور نہ توبہ واستغفار کا حق ادا ہوگا جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے، عرض یہ کرنا ہے کہ توبہ واستغفار کے جو الفاظ قرآن وحدیث میں ذکر کئے گئے، ان کا پڑھنا اور ان کی تلاوت کرنا اگرچہ فائدہ وثواب سے خالی نہیں لیکن جب تک ان الفاظ کو سمجھا نہ جائے اور ان الفاظ سے توبہ واستغفار نہ کیا جائے تو اس وقت اس کی حیثیت ایک ذکر کی تو ہوگی لیکن توبہ واستغفار ہرگز نہ ہوگا۔ اسلئے یہاں توبہ واستغفار کے جن الفاظ کو لکھا جاتا ہے اس کا ترجمہ بھی لکھوں گا۔ آپ ان الفاظ کے ترجمے کو سیکھیں۔ پھر ان الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کر لے، اگر عربی کے الفاظ یاد نہ ہوں تو اس کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہو اس سے اپنی بولی میں توبہ واستغفار کریں۔

**توبہ واستغفار کے منقول الفاظ!**

اب یہاں قرآن وحدیث مختصر طور پر توبہ واستغفار کے چند کلمات کو نقل کر دیتا ہوں، ان میں جو آسان ہوں، ان کو معنی کے ساتھ یاد کر لیں۔

**توبہ کرنے کے مختصر الفاظ!**

(۱) اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوبُ اِلَیْهِ

”میں اپنے رب اللہ سے ہر گناہ وقصور کو توبہ کی معافی اور بخشش مانگتا ہوں اور اسکے سامنے توبہ کرتا ہوں۔“



(۲) رَبِّ اغْفِرْ لِي وَتُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُورُ

”اے میرے رب! مجھے معاف کر دے اور مجھے بخش دے اور میری توبہ کو قبول فرما، بے شک تو ہی توبہ قبول کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔“

ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک ہی مجلس میں سو مرتبہ مذکورہ بالا الفاظ سے توبہ واستغفار کرتے تھے۔ دیکھئے احمد، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، مشکوٰۃ۔

(۳) نبی کریم ﷺ سے توبہ واستغفار کے یہ الفاظ منقول ہیں:

اَسْتَغْفِرُ اللَّهَ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ

”میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور بخشش چاہتا ہوں جسکے سوا کوئی معبود نہیں جو الحی والقیوم ہے اور اسکے حضور میں توبہ کرتا ہوں۔“ (دیکھئے ترمذی، ابوداؤد، مشکوٰۃ)

(۴) آپ ﷺ کبھی کبھی مسجد میں ان الفاظ کے ساتھ بھی استغفار کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ كُلَّهُ دِقَّةً وَجُلَّةً وَاٰخِرَةً وَعَلَا نِيَّتَهُ وَسِدَّةً

”اے میرے رب! میرے تمام قصوروں، کوتاہیوں کو خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں، پہلے ہوں یا پچھلے ہوں، اعلانیہ کھلے ہوں، چھپے ہوں، سب کو معاف و بخشش دے“ (صحیح مسلم، مشکوٰۃ، کتاب الصلوٰۃ)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا استغفار!

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ نے سلام پھیرنے سے پہلے جودعا سکھائی تھی، وہ یہ ہے کہ:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا کَثِیْرًا وَّلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَاعْفِرْ لِیْ مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ

وَارْحَمْنِیْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ

”یا اللہ! بے شک میں نے اپنے نفس پر بہت ظلم کیا ہے اور تیرے سوا کوئی دوسرا گناہوں اور قصوروں کو نہیں بخشتا، لہذا تو مجھ کو بھی بخش دے اپنی طرف سے خاص طور پر بخشنا اور مجھ پر رحم فرما، بے شک تو بخشنے والا مہربان ہے۔“ (دیکھئے بخاری و مسلم، مشکوٰۃ، کتاب الصلوٰۃ)

سید الاستغفار!

نبی کریم ﷺ نے توبہ واستغفار کے کچھ کلمات سکھائے ہیں اور ان کو آپ ﷺ نے سید الاستغفار بتایا، وہ کلمات

یہ ہیں:

اللَّهُمَّ أَنْتَ رَبِّي لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ خَلَقْتَنِي وَأَنَا عَبْدُكَ وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَأُكَبِّرُ بِذَنْبِي فَاعْفِرْ لِي فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ

”یا اللہ! آپ میرے پروردگار (مالک و مولا) ہیں، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو نے ہی مجھے پیدا کیا اور میں تیرا بندہ ہوں اور جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا، تیرے ساتھ کئے ہوئے (ایمانی) عہد اور (اطاعت و فرمانبرداری کے) وعدے پر قائم رہوں گا، میں نے جو کچھ کیا ہے اس کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں، میں اقرار و اعتراف کرتا ہوں کہ تو نے مجھے نعمتوں سے نوازا اور یہ اقرار و اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے گناہ اور تیری نافرمانیاں کی ہیں (میں آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتا ہوں)۔ پس تو مجھے بخش دے، کیونکہ تیرے سوا گناہوں کو بخشنے والا کوئی نہیں۔“

توبہ واستغفار کے ان الفاظ کے بارے میں خود فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص پورے یقین کے ساتھ ان کلمات کے ساتھ صبح کے وقت توبہ واستغفار کر لے تو شام تک اگر اس کا انتقال ہو گیا تو وہ جنتی ہوگا۔ جو ان کلمات کو پورے یقین کے ساتھ پڑھے گا اور صبح تک اس کا انتقال ہو تو وہ جنتی ہوگا۔ (بخاری و مشکوٰۃ)

معافی مانگنے کے آسان سے آسان مختصر الفاظ!

اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کیلئے آسان سے آسان اور مختصر الفاظ یہ ہیں:

أَسْتَغْفِرُ اللَّهَ

”میں اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتا ہوں۔“

يَا رَبِّ اغْفِرْ لِي

”اے میرے پروردگار! مجھ کو بخش دے“

يَا اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي

”اے اللہ! مجھ کو بخش دے“

حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی توبہ واستغفار کے الفاظ!

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت حوا علیہا السلام کو توبہ واستغفار کے جو کلمات

سکھائے تھے، وہ یہ ہیں:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنْفُسَنَا وَإِنْ لَمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾

”اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا (تو ہی ہم کو معاف فرما) اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم خسارہ پانے (اور گھانا اٹھانے) والوں میں سے ہو جائیں گے“۔ (الاعراف: آیت ۲۳)

حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے استغفار کے الفاظ!

حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ سے ان الفاظ میں بخشش اور معافی مانگی تھی:

﴿رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ﴾

”اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا، پس تو مجھ کو بخش دے“ (القصص: آیت ۱۶)

یا اللہ! ہم سب کو اپنی عظمت کبریائی اور بڑائی کا احساس واستحضار اور اپنی شدید محبت نصیب فرما اور ہم سب کو سچی توبہ واستغفار کی توفیق عنایت فرما اور ہم سب کی کامل بخشش فرما، آمین!

☆.....☆.....☆

www.daruleeman.com

## تقویٰ کا بیان!

## تقویٰ کے معنی!

تقویٰ کا اصل ”وقایہ“ ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کی حفاظت کرنا، نگہداشت کرنا، نگہبانی کرنا، محفوظ کرنا، اور تقویٰ کے معنی ہیں نفس کو ایسی چیز سے بچانا اور محفوظ کرنا جس سے ضرر کا اندیشہ ہو اور شریعت کی اصطلاح میں، ان چیزوں سے اپنے آپ کو بچانا اور محفوظ رکھنا جو انجام اور آخرت کے لحاظ سے ”مضر اور نقصان دہ ہوں“ کو تقویٰ کہا جاتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر گناہ سے اس کے برے نتائج اور اللہ تعالیٰ کے غضب و ناراضگی سے بچتے رہنا، یا یوں کہئے کہ اللہ تعالیٰ کے خوف و عظمت کی وجہ سے ہر گناہ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی سے بچتے رہنا اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی پوری فرمانبرداری کرنا، کو تقویٰ کہا جاتا ہے۔

## تقویٰ کے اجزاء!

مذکورہ بالا تعریف میں غور کریں تو تقویٰ کے چار اجزاء بنتے ہیں اور تقویٰ چار چیزوں سے وجود میں آتا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی عظمت کا احساس۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن اور اچھا گمان اور امید۔

(۳) اخلاص۔

(۴) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرنا اور اللہ تعالیٰ اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی سے بچتے

رہنا۔

## تقویٰ درست ایمان کا پھل اور نتیجہ ہوتا ہے!

تقویٰ کی اس تعریف سے معلوم ہوا کہ تقویٰ درست ایمان کا پھل اور نتیجہ ہوتا ہے اور انسان کا ایمان و یقین جس قدر مضبوط اور راسخ ہوگا اس قدر وہ متقی اور باکردار اور نیک سیرت ہوگا۔ جس شخص کے ایمان سے تقویٰ کے برگ و بار پیدا نہ ہوں اس کا ایمان یا تو نہایت کمزور اور بودا ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے۔

خوف و رجاء کسے کہتے ہیں اور یہ کیسے پیدا ہوتا ہے!

خوف یعنی ڈرنا دل کی حالتوں میں سے ایک حالت ہے اور یہ انسان میں کسی چیز کے متعلق اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس چیز کے متعلق علم و معرفت (پہچان) حاصل ہو جاتی ہے مثلاً بچہ اس بات کو نہیں جانتا کہ

انگارہ کیا چیز ہے اور اس کی خاصیت کیا ہے اس لئے وہ اس کے رنگ کو دیکھ کر اٹھالیتا ہے اور جس بچے کو یہ علم اور پہچان ہو جائے کہ انگارہ جلاتا ہے تو وہ اس سے ڈرتا ہے یا مثلاً جو بچہ سانپ بچھو کے ضرر سے ناواقف ہے تو وہ سانپ کو دیکھ کر اس کو پکڑنے کی کوشش کرے گا اور جو اس سے واقف ہے وہ اس سے ڈرے گا، اسی طرح جس انسان کو اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کے متعلق جس قدر علم و معرفت حاصل ہوگا وہ اس قدر اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے گا۔

### خوف الہی کی نوعیت اور رجاء!

لیکن یہ خوف سانپ، بچھو وغیرہ کی طرح نہیں جو اپنے اندر سانپ، بچھو کی نفرت لئے ہوئے ہے بلکہ یہ ایسا خوف ہے جو اللہ تعالیٰ کے صفت جلال، قہاریت، جباریت اور صفت عدل اور صفات کمال اور اس کی عظمت و بڑائی اور اس کے ساتھ شدید محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس لئے ایک مؤمن ایک طرف جس قدر اللہ تعالیٰ اور اس کی نافرمانی سے ڈرتا ہے تو دوسری طرف وہ اللہ تعالیٰ کی صفات جمال، رحمانیت، رحیمیت اور کریمیت وغیرہ کو دیکھ کر پُر اُمید ہو جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہت ہی نیک گمان رکھتا ہے اسی اُمید کو ”رجاء یعنی اچھی اُمید کہتے ہیں۔“

### نا اُمیدی، کفر اور صلاحیتوں کی تباہی کا ذریعہ ہے!

اور اُمید انسان میں عمل کی خواہش اور طلب پیدا کرتی ہے اور کامل کو چُست اور چُست کو اور زیادہ سرگرم عمل بنادیتی ہے اور اس کے مقابلے میں نا اُمیدی جو حرکت، عمل کے تمام اسباب و دواعی کو یکسر ختم کر دیتی ہے نا اُمیدی کا عنصر سب سے زیادہ کفار و مشرکین میں پایا جاتا ہے اس کے بعد ان لوگوں میں جن کا ایمان بہت کمزور ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی نظر مادی وسائل و اسباب پر ہی ہوتی ہے اور جب مادی اسباب و وسائل سے اپنے آپ کو عاجز پاتے ہیں تو نا اُمید ہو جاتے ہیں اس کے برعکس یکے مؤمن کی رجاء و اُمید کی کوئی حد نہیں ہوتی وہ کفار اور مشرکین اور باطل کے خلاف لڑتا ہے ظاہری اسباب کم یا نہ ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے فتح و کامرانی کی اُمید باندھے رکھتا ہے اگر اس پر تنگی اور مشکلات کے اوقات آ جاتے ہیں تو پھر بھی اللہ تعالیٰ سے لو لگا کر مطمئن ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تنگی و پریشانی کے ان اوقات کو ختم کر دیں گے، اگر کبھی اس سے گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو پھر بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے گناہ کی معافی مانگ لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ غرض اسباب اور وسائل کو استعمال میں لا کر بھی مؤمن بندہ کی نظر اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے اس لئے وہ اسباب و وسائل سے محروم ہو کر بھی اللہ تعالیٰ سے مایوس نہیں ہوتا اور اس کے برعکس کافر اور کمزور ایمان والا جوں ہی اسباب و وسائل

کو اپنے ارد گرد نہیں پاتا تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کا عمل و حرکت رک جاتی ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سے ناامیدی انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کو تباہ کر ڈالتی ہے اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ انسان کی اندرونی صلاحیتوں کو زندہ اور قوت پر قوت بخشتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے اس کی عظیم اور لامحدود قدرت اور اس کی بے انتہاء رحمت سے مایوس اور ناامید ہو وہ مؤمن کیسے ہو سکتا ہے اس لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ:

﴿إِنَّهُ لَا يَأْتِيَنَّ مِنْ رَوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ﴾

”اللہ تعالیٰ کی رحمت سے صرف کافر لوگ ہی مایوس اور ناامید ہوتے ہیں“ (سورت یوسف: آیت ۸۷)

یہ بھی یاد رکھیں کہ مسلمان کا ”خوف“ بھی رجاء کی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے اندر لئے ہوئے ہوتا ہے بلکہ اس کے خوف کا منشاء و محرک بھی محبوب حقیقی کی ناراضگی کا احساس ہوتا ہے۔“

**امید بھی ضرورہ چیز سے بچنے کا سبب بنتا ہے!**

غرض یہ کہ جس طرح کسی چیز سے ضرر کا خوف انسان کو اس چیز کے ضرر سے بچانے کا سبب ہوتا ہے اسی طرح اُمید بھی عمل پر اُکسانے کے ساتھ بچنے رہنے کا سبب بھی ہوتی ہے اگر اُمید کی چنگاری نہ ہو پھر بھی انسان اپنے آپ کو ضرورہ چیزوں سے نہیں بچا سکتا۔ مثلاً آدمی کڑوی دوا کے پینے اور سخت سے سخت پرہیز کو اس اُمید پر اختیار کر لیتا ہے کہ اس کو یہ اُمید ہوتی ہے کہ اس کڑوی دوا اور اس پرہیز سے میں صحت مند ہو جاؤں گا یا کم از کم صحت مزید خراب ہو جانے سے بچ جائے گی آپ نے غور کیا ہوگا جب کوئی شخص اپنی صحت سے ناامید ہو جاتا ہے تو وہ علاج اور پرہیز کو چھوڑ دیتا ہے۔ نیز آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ آدمی اس وقت تک کسی چیز سے ڈرتا رہتا ہے اور بچتا رہتا ہے جب تک اس کو یہ اُمید ہو کہ اس طرح میں موت یا ضرر سے بچ جاؤں گا اور جب اس کی یہ اُمید جاتی رہتی ہے تو پھر وہ اپنی حفاظت چھوڑ دیتا ہے اسی طرح اگر کوئی شخص گناہ کر لیتا ہے اور اس کی یہ اُمید نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دے گا اور دوزخ کے عذاب سے بچائے گا تو ایسا شخص توبہ اور اپنی اصلاح کی راہ کو اختیار نہیں کر سکے گا بلکہ وہ یہی سمجھے گا کہ جب جہنم ہی ٹھکانا ہے اور اس سے خلاصی کی کوئی اُمید ہی نہیں تو پھر توبہ اور اصلاح کے کیا معنی ہیں؟ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے ضرر سے بچنے کے لئے خوف کی ضرورت ہے اسی طرح اُمید کی بھی اور آخرت میں نجات و فلاح کے لئے بھی انہی دو قوتوں کی ضرورت ہے ان میں سے اگر کوئی ایک نہ رہے تو نہ تقویٰ وجود میں آ سکتا ہے نہ نجات و فلاح، لہذا انسان کو چاہئے کہ وہ گناہوں اور گناہوں کے برے نتائج اور جہنم

سے ڈرے اور توبہ و اصلاح کی راہ کو اختیار کر کے اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھے کہ وہ اس کو معاف فرمائے گا اور توبہ و اصلاح کی صورت میں اس کو اپنا مقرب اور دوست بنائے گا اور جنت الفردوس میں داخل فرمائے گا۔

**خوف ورجاء کے بعد عمل و پرہیز کے لئے صحیح نیت اور اخلاص کا نمبر آتا ہے!**

خوف ورجاء کے بعد عمل کے لئے اخلاص کا نمبر آتا ہے اور اسی خشیت اور خوف الہی اور رجاء (اُمید) سے اخلاص وجود میں آتا ہے کیونکہ جب آدمی کسی چیز کے ضرر سے ڈرتا ہے اور خیر کی اُمید رکھتا ہے تو اس ضرر سے دل کی گہرائیوں کے ساتھ بچتا ہے اور اس خیر کو دل کے خلوص کے ساتھ اختیار کر لیتا ہے ورنہ جس سے ضرر کا اندیشہ نہ ہو یا خیر کی توقع نہ ہو وہاں بچاؤ اور اختیار کرنے میں قطعاً خلوص نہیں ہو سکتا بلکہ وہ اختیار و بچاؤ صرف ظاہر داری اور نمائش ہوگی۔

**اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اور ہر گناہ سے پرہیز!**

خوف ورجاء اور اخلاص کے بعد عمل و پرہیز کا نمبر آتا ہے اور یہ عمل و پرہیز خوف ورجاء کا ثمرہ اور پھل ہوتا ہے، عمل سے مراد اللہ تعالیٰ کے احکامات اور اس کی پسندیدہ چیز کو اپنانا اور اُن پر عمل کرنا اور پرہیز سے مراد ان باتوں اور کاموں سے اپنے آپ کو بچانا جن باتوں اور کاموں سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں اور جن کاموں اور باتوں سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے روکا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ تقویٰ چار چیزوں سے مرکب ہے خوف ورجاء، اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچتے رہنا ان میں سے اگر کوئی ایک بھی نہ رہے تو حقیقی تقویٰ جو مطلوب ہے وہ وجود میں نہیں آ سکتا۔

بعض علماء کرام نے تقویٰ کے دو جز قرار دیئے ہیں ایک خوف الہی اور دوسرا اس کے مطابق عمل و پرہیز اس کا مطلب بھی یہی ہے، کیونکہ عمل و پرہیز خوف ورجاء کے بغیر نہیں ہوتا اور نہ اخلاص خوف و اُمید کے بغیر پیدا ہو سکتا ہے غرض تقویٰ کے اجزاء سمٹ کر دو بھی ہو جاتے ہیں اور تفصیل کر کے چار بھی، نیز بعض مقامات پر ”تقویٰ“ کے معنی خوف اور ڈر سے کیے جاتے ہیں اس کا مطلب بھی یہی ہوا ہے کہ خوف کا نتیجہ اور پھل احتیاط، پرہیز اور بچنا ہے۔

**تقویٰ کا خلاصہ!**

تقویٰ کا خلاصہ یہ ہوا کہ آدمی گناہ اور اس کے برے نتائج اور اللہ تعالیٰ کے غضب سے ڈر کر گناہوں سے

پختار ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور تقرب حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی سے پرہیز کرے یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی پوری اطاعت اور فرمانبرداری کرے اور اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی نہ کرے اور ان تمام کاموں اور باتوں سے پختار ہے جو اس کے خالق و مالک اللہ رب العالمین کے تعلق اور اس کے رابطے میں خلل ڈالیں بس تیرا رب تجھے وہاں نہ دیکھے جہاں جانے سے اس نے روکا ہے اور اس مقام سے غیر حاضر نہ پائے جہاں حاضر ہونے کا اس نے حکم دیا ہے۔

### تقویٰ اور قرآن مجید اور احادیث رسول ﷺ!

تقویٰ کی اسی حقیقت کو قرآن مجید اور احادیث مبارکہ مختلف انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝﴾

”اور جو شخص اپنے پروردگار کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا اور اپنے نفس کو بری خواہش سے روکتا رہا (یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے پختار رہا) تو یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہوگا۔“ (النازعات: آیت ۴۱-۴۰)

اور کہیں اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو یوں بیان فرماتا ہے کہ:

﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝﴾

”اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی اور رسول ﷺ کی اطاعت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اس کی نافرمانی سے پختار ہوتا ہے بس یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔“ (سورۃ نور: آیت ۵۲)

”تقویٰ“ کی روح اگرچہ خوف اور خشیت الہی ہے لیکن یہاں دو لفظ ایک ساتھ استعمال ہوئے ہیں جن میں سے دل کی حالت کی تعبیر کے لئے خشیت کو استعمال کیا گیا ہے اور حدود الہی کی پاسداری کے لئے اور نافرمانی سے بچنے کے لئے ”تقویٰ“ کو استعمال کیا گیا صرف مذکورہ بالا دو آیتوں میں غور کریں تو ان میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے خوف پر ہوائے نفس اور بری خواہشات کی روک تھام کو مرتب کیا یعنی نفس کو بری خواہش اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچانا یہی تقویٰ ہے اور دوسری آیت میں خشیت الہی اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے پر ﴿يَتَّقْهُ﴾ یعنی تقویٰ اختیار کرے یا یوں کہئے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے پختار ہے، کو مرتب کیا۔ اور نبی کریم ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا:

(أَمَّاوَاللَّهِ إِنِّي لَا خَشَاةَ لَكُمْ وَاتَّقَاكُمْ)



”خبردار میں تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور تم سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہوں (اللہ تعالیٰ کا زیادہ فرمانبردار اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں زیادہ محتاط ہوں)۔“ (بخاری و مسلم)

حضرت عمرؓ نے ابی بن کعبؓ سے پوچھا کہ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے۔ تو انہوں نے کہا:

(أَمَّا سَلَكْتُ طَرِيقًا ذَا شَوْكٍ)

”تم کبھی ایسے راستے پر چلے ہو جس میں کانٹے ہوں، فرمایا ”ہاں“ کہا ”فَمَا عَمِلْتُ“ اس حالت میں تم نے کیا کیا؟ فرمایا ”شَمَرْتُ وَجْهَهُ دُت“ میں نے اپنے آپ کو سمیٹا اور کوشش کی (کہ کانٹوں سے بچ کر نکل جاؤں) کہا ”فَذَلِكَ التَّقْوَى“ یہی تقویٰ کی حقیقت ہے۔ یعنی جب کانٹوں سے ڈرتا ہے تو وہ ان سے کپڑے سمیٹ کر بچنے کی کوشش کرتا ہے اور پھونک پھونک کے قدم رکھتا ہے تاکہ کوئی کانٹا اس میں چھب نہ جائے اسی طرح قرآن مجید و حدیث شریف میں غور و فکر کے بعد یہی حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ تقویٰ کا مجنون خوف ورجاء، عمل اور پرہیز سے بنتا ہے۔

### نجات کے لئے مجرد دعوائے ایمان کافی نہیں!

مذکورہ بالا دونوں آیتوں سے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ نجات و فلاح کے لئے صرف دعوائے ایمان کافی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت بھی ضروری ہے دوسری چیز یہ کہ صرف ظاہری اطاعت بھی کافی نہیں بلکہ اس اطاعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خشیت اور اللہ تعالیٰ کی حدود کی پاسداری اور پرہیز بھی ضروری ہے۔ بس پورے فلاح و نجات پانے والے لوگ وہی ہیں جو نرم گرم ہر حالت میں اپنے تمام ذاتی اغراض و مفادات سے بالاتر ہو کر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کریں اور ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو اور وہ اپنی روزمرہ زندگی میں اللہ تعالیٰ کی حدود کی پوری پوری پاسداری کریں اور ان کی پوری پوری احتیاط رکھیں۔

### تقویٰ کا مرکز دل ہی ہے!

خوف و خشیت الہی اور تقویٰ و پرہیزگاری دل کی صفت ہے اور اس کا اصل تعلق دل سے ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ تقویٰ کا مرکز دل ہی ہے۔ اس کے متعلق بطور نمونہ قرآن و حدیث سے کچھ پڑ لیجئے۔

﴿حُنَفَاءَ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ ط وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي

بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ ۝ ذَٰلِكَ وَمَنْ يُعْظَمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ ۝﴾

”خاص اللہ تعالیٰ کے ہو کر رہو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرتا ہے تو گویا آسمان سے گرا پھر اسے پرندے اُچک لیتے ہیں یا ہوا اُسے اُڑا کر کسی اور درجہ بھینک دیتی ہے، بات یہی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نامزد چیزوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔“ (الحج: آیت ۳۱-۳۲)

﴿لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لُحُومَهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ﴾

”اللہ تعالیٰ کو ان (قربانیوں) کے گوشت نہیں پہنچتے اور نہ ان کا خون پہنچتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو تمہارا تقویٰ (یعنی تقویٰ کا عظیم رکن جو اخلاص و اللہیت ہے وہی) پہنچتا ہے۔“ (حج: آیت ۳۷)

یہاں یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قدر و قیمت اس عمل کی ہے جس سے مقصود اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری، اخلاص و محبت کے ساتھ ہو ورنہ اخلاص و اللہیت کے بغیر عظیم سے عظیم عبادت بھی بے روح ڈھانچہ بن جاتی ہے جس کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں۔ جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں دلی اخلاص و تقویٰ ہی شرف قبولیت حاصل کرتا ہے تو اس سے یہ بات بھی خوب معلوم ہوگئی کہ جس کے دل میں جتنا اخلاص زیادہ ہوگا اور جس کے عمل میں جتنا اخلاص ہوگا وہ اتنا ہی قیمتی اور مقبول ہوگا اس سے یہ بھی خوب معلوم ہوا کہ تقویٰ کا اصل تعلق دل سے ہے۔

### شعائر اللہ کی تعظیم تو حید میں داخل ہے!

مذکورہ بالا آیتوں میں سے پہلی آیت میں تو حید کی بلندی اور شرک کی پستی اور مذمت بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی بتلائی کہ اللہ تعالیٰ کے نام لگی ہوئی چیزوں کی محبت و تعظیم شرک میں داخل نہیں اور نہ یہ تو حید کے خلاف کوئی چیز ہے بلکہ یہ مطلوبہ تو حید میں داخل ہے اور عین تو حید کا نتیجہ اور اس کے آثار اور علامات ہیں۔

شعائر اللہ سے مراد وہ مقدس چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عظمت و معبودیت کے لئے علامات اور نشانیاں قرار دی گئی ہیں اور بالخصوص جو حق تعالیٰ شانہ کی طرف منسوب اور اس سے وابستہ ہیں جیسے قرآن مجید اور کتب سماویہ، بیت اللہ، صفاء مروہ، مساجد، قربانی کا جانور وغیرہ نیز انبیاء علیہم السلام رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، اولیاء اللہ وغیرہ اسی طرح تمام حدود و فرائض اور احکام دینیہ، غرض اللہ تبارک و تعالیٰ کے نام سے لگی ہوئی تمام چیزوں کا ادب و احترام حسب مراتب ضروری ہے اور ان کی بے حرمتی حرام اور ممنوع ہے اور ان اشیاء کا ادب و احترام اور ان سے محبت شرک نہیں بلکہ عین تو حید کے آثار اور علامات ہیں اور ان چیزوں سے محبت اور ان کی قدر دانی و احترام حسب

مراتب از خود توحید کے مفہوم میں داخل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے وابستہ اشیاء سے محبت اور ان کا احترام خود اللہ تعالیٰ سے محبت اور اس کی قدردانی کی علامت ہے اور جو کوئی اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتا ہو اور اس کے دل میں اللہ جل شانہ کی عظمت ہو تو وہ اس کے نام سے لگی ہوئی چیزوں کی ضرورت قدر کرے گا اور ان سے محبت رکھے گا، کیونکہ یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوتا ہے اور محبوب سے وابستہ اور ان سے نسبت رکھنے والی اشیاء بھی محبوب ہوتی ہیں یہ احترام و تعظیم دل کے تقویٰ اور سچی توحید کا نتیجہ ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی تعظیم موجود ہے جیسا کہ اس کے نام لگی ہوئی چیزوں کا احترام و ادب کرتا ہے اگر کوئی شخص جان بوجھ کر شعائر اللہ کی ہتک کرے تو یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کا دل اللہ تعالیٰ کے خوف سے خالی ہے۔ خلاصہ یہ کہ شعائر اللہ کی تعظیم و تکریم کے بغیر توحید کو توحید نہیں کہا جاسکتا بلکہ وہ تفریق ہے اور نفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ ہو اور پھر بھی اس کی پسندیدہ چیزوں اور اس کے نام لگی ہوئی چیزوں سے محبت نہ ہو تو اصل میں اللہ تعالیٰ سے محبت نہیں اور اس کا یہ دعویٰ باطل اور منافقانہ ہے اور شعائر اللہ کی تعظیم و تکریم ہی عین توحید ہے اور اس کے آثار و علامات توحید کے مفہوم میں داخل ہیں البتہ تعظیم اور عبادت میں فرق کرنا ضروری ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ تعظیم و تکریم کے پردے میں کسی مخلوق کی عبادت اور پرستش کی جائے اور کسی غیر اللہ کو سجدہ اور رکوع کیا جائے یا غیر اللہ کے نام نذر و نیاز مانی جائے یا کسی چیز کی تعظیم و تکریم میں اللہ تعالیٰ کے مقررہ حدود سے تجاوز کیا جائے۔ ایسی صورتوں میں تعظیم اور تکریم اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں ہوگی بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور توحید کے منافی رویہ اور عمل ہوگا جو دین اسلام کی رو سے حرام ہے۔ (توحید اور محبت و تعظیم کی پوری تفصیل ”توحید و شرک“ میں دیکھیں۔)

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُعْصُونَ أَمْرَاتِهِمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ ط لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ﴾

”بلاشبہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے حضور میں پست آواز میں (یعنی دبی اور دھیمی آواز سے بولتے ہیں) یہی لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ”تقویٰ“ کے لئے جانچ لیا ہے اور ان کے لئے بخشش اور اجر عظیم ہے۔“ (حجرات: آیت نمبر ۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(الْمُسْلِمُ أَخُ الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ وَلَا يَحْقِرُهُ التَّقْوَىٰ هُنَا وَيَشِيرُ إِلَى صَدْرِهِ تِلْكَ مِرَارٍ)

”ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا (دینی) بھائی ہے (لہذا کوئی) مسلمان مسلمان پر ظلم نہ کرے اور اس کی مدد و اعانت ترک نہ کرے اور اس کو ذلیل اور حقیر نہ سمجھے پھر آپ ﷺ نے اپنے سینے (مبارک) کی طرف تین بار اشارہ کر کے فرمایا کہ ”التقویٰ ہُنَا“ تقویٰ یہاں ہے۔ (یعنی سینے اور دل کے اندر ہوتا ہے)۔“ (مسلم، مشکوٰۃ: باب الشفقة والرحمة)

قرآن مجید کے مذکورہ بالا چند آیتوں اور حدیث شریف سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تقویٰ کا مرکز انسان کا دل ہی ہے اور اس کا اصل تعلق انسان کے دل ہی سے ہے پھر دل کا یہ خوف و خشیت اور محبت الہی، تقویٰ ہی ہوتا ہے جس کا اثر انسان کے تمام افعال اور اعمال میں دیکھا جاتا ہے اس لئے جس طرح تقویٰ کا لفظ اس کی دلی کیفیت اور صفت پر بولا جاتا ہے اسی طرح اسی صفت کے اثر اور نتیجہ پر بھی یہی ”تقویٰ“ کا لفظ بولا جاتا ہے اور تقویٰ کا تعلق ظاہر اور باطن دونوں سے ہے۔

### تقویٰ کا جوہر یا عشق الہی!

بس تقویٰ باطل سے بچاؤ اور عشق حق اور عشق الہی کا وہ جوہر ہے جو انسان کے اندر فطری طور پر رکھ دیا گیا ہے یہ وہی ختم ہے جو اچھے جذبات والے درست اعمال سے ترقی بھی کرتا ہے اور اس سے اچھے اعمال مثلاً روزہ، نماز وغیرہ میں سے تقویٰ کے عطر کو نچوڑا جاتا ہے اور اس سے تقویٰ کی قوت اور سٹیم بنتی ہے اور جس قدر تقویٰ کی قوت زیادہ ہوتی ہے اور بڑھتی رہتی ہے اسی قدر انسان حسن اخلاق کا پیکر اور بلند کردار اور روحانی ترقیوں کی راہ پر برابر بڑھتا ہے اور اسی کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کی ابدی نعمتوں کی طرف کھینچا چلا جاتا ہے اور بڑھتا چلا جاتا ہے اور اس کے برعکس جو شخص حق کی متلاشی جوہر کو، نفسانی خواہشات، خود غرضی، ریاء و بخل، حسد، ضد، عناد وغیرہ جیسی بد اخلاقیوں میں دبائے رکھے تو ایسے شخص کے برے اعمال تو کیا اس کے بظاہر اچھے اعمال میں بھی فساد آ جاتا ہے اور اس کے نماز اور روزہ وغیرہ کو جب نچوڑا جاتا ہے تو ان سے وہی دنیا اور خواہش نفس اور فحور کے ختم کا پانی نکلتا ہے جو تقویٰ کے جوہر کے بجائے خواہش نفس اور فحور کے ختم کو ترقی دیتا ہے اور اسی طرح انسان کا جوہر تقویٰ دب کر برباد ہو جاتا ہے اور انسان ابدی تباہیوں کا شکار ہو جاتا ہے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

﴿فَالْهَمَّهُمْ فُجُورَهُمْ وَتَقْوَاهُمْ ۖ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهُمْ ۖ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهُمْ﴾

”پھر ڈال دیا اس کے دل میں اس کی بدی اور اس کا تقویٰ یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے اپنے نفس کو (پاک

کر کے حسن اخلاق سے) آراستہ کیا اور یقیناً نامراد ہوا جس نے اس کو (برائیوں اور بد اخلاقیوں کے ساتھ) آلودہ کیا۔“ (الشمس: ۱۰-۸)

### خوف ورجاء اور تقویٰ کے درجات علم و معرفت کے مطابق!

پہلے یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات جلال و صفات کمال کے علم و معرفت سے خوف ورجاء اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت پیدا ہو جاتی ہے تو اس سے خود بخود یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ جس شخص کو جس قدر اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم اور معرفت حاصل ہوگا اسی قدر وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی ناراضگی سے خائف ہوگا اور اسی قدر اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن اور محبت بھی ہوگی اور اسی قدر وہ ”متقی“ یعنی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنے اور پرہیز کرنے کی کوشش بھی کرے گا اور اس کی بقدر اس کے مفید ثمرات برآمد ہوں گے اور علم و یقین و معرفت کی بقدر بندوں میں ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک بے شمار درجے بن جاتے ہیں اور اسی طرح ان کے خوف کی اقسام اور تقویٰ کے حرکات کی نوعیت اور اقسام بھی مختلف ہوں گی۔

### خوف یا تقویٰ کے درجات کے اقسام کی ایک مثال!

مثلاً کسی کا خوف و پرہیز جہنم وغیرہ کی وجہ سے ہے اور بعض کا خوف اتنا ہوتا ہے کہ جنت سے نہ رہ جاؤں اور بعض کا دنیا کے لئے اور بعض کا کسی اور وجہ سے اور اس بات کو عوام کے ذہنوں کے قریب کرنے کے لئے ایک مثال پیش کرتا ہوں جس کی وجہ سے اس مسئلے کے سمجھنے میں قدر آسانی پیدا ہو جائیگی مثلاً ملک کا خلیفہ اور امیر ایسا ہے جو نہایت عدل و انصاف والا ہے اور اس کی گرفت بھی اسی قدر مضبوط ہے کہ کوئی مجرم جرم کر کے نہ بھاگ سکتا ہے اور نہ اس کو کوئی اس کی سزا سے بچا سکتا ہے نیز وہ اپنی رعایا پر بہت ہی مہربان ہے اور اپنی رعایا پر اپنے خدا و اخوانوں کو نچھاور کرنے والا ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے سونے چاندی اور گندم وغیرہ جیسے مال کے بڑے بڑے خزانے اور گودام دیئے ہیں اور محبت اور شفقت والا بھی ہے اور جو اس کا قریب اور دوست بننا چاہے وہ اس کو اپنا دوست بھی بنا لیتا ہے تو اب اس بادشاہ کے یہ خداداد کمالات حکومت کے جس باشندے پر جس قدر کھلیں گے اسی قدر وہ اس سے خائف بھی ہوگا اور اس کی نافرمانی سے بھی بچے گا مثلاً بعض لوگ ایسے ہوں گے کہ وہ جرائم سے صرف اس لئے ڈرتے رہیں گے اور بچتے رہیں گے کہ بادشاہ کی مقررہ سزاؤں سے بچ جائیں اور بادشاہ کے انعامات کو بھی حاصل کریں اور جو لوگ اس کی صفات سے اور زیادہ واقف ہوں اور ان کو زیادہ اس کا تجربہ ہو چکا ہے تو ان کو بادشاہ یا اس

کے خلیفہ سے بغاوت کا تو تصور بھی نہ ہوگا بلکہ وہ تو خلیفہ کے احکام کی بجا آوری میں کوتاہی سے ڈرتے رہیں گے اور وہ اس کے جاری کردہ احکام پر خوب پختگی سے اور بیداری کے ساتھ کاربند ہوں گے اور جن کو اس دوسری قسم سے بھی زیادہ تجربہ اور علم اور اس خلیفہ کی پہچان ہوگی وہ تو اس خلیفہ کے منشاء کو سمجھنے کی کوشش کریں گے تاکہ وہ اس کے قرب اور دوستی کو حاصل کر کے اس کے دوست اور مقرب بن جائیں وہ ان کا محبوب اور یہ اس کے محبوب ہو جائیں اس قسم کے لوگ اس بات سے بھی ڈرتے رہیں گے اور بچتے رہیں گے کہ کوئی بات ایسی نہ ہو جائے جس کی وجہ سے بادشاہ کے ساتھ تعلق اور قرب میں نقصان آئے نیز وہ ہر اس رکاوٹ سے بھی ڈرتے رہیں گے اور بچتے رہیں گے جو تعلق اور قرب کی ترقی میں حائل ہوتا ہے یہ ایک ادنیٰ سی مثال ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور اس کی رحمت، مہربانی، حسن و جمال عدل وغیرہ ہر ایک صفت کمال لامحدود ہے اور اس کی ذاتی ہے پھر خالق اور مخلوق عبد اور معبود کے درمیان جو نسبت علاقہ اور محبت و عظمت کا تعلق ہے تو اس کے لئے یہ مثال بہت پھکی پھکی لگتی ہے تاہم اس سے خوف اور تقویٰ کے موٹے موٹے درجات اقسام سامنے اور سمجھنے میں آسکتے ہیں۔

### تقویٰ کے محرکات یا خوف کی اقسام اور وجوہات!

جو لوگ جرائم اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے تقویٰ اختیار کر کے بچتے رہتے ہیں تو اس کا محرک چونکہ خوف اور ڈر ہی بن جاتا ہے اس لئے یہاں خوف کی وجوہات اور اقسام جو تقویٰ کے محرکات ہیں کو ذکر کرتے ہیں ان کو پڑھ لیجئے۔

#### (۱) دنیا کی وجہ سے ڈرنا اور بچنا!

دنیا کی مصیبتوں اور تکلیفوں سے ڈرنا اور اسی وجہ سے جرائم اور گناہ سے بچنا یا دنیا کے حاصل کرنے کے لئے غلطیوں سے ڈرنا اور بچنا اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض انسان ایسے ہوتے ہیں جو اپنی شہرت کے بہت بھوکے ہوتے ہیں یا دنیا کی تکلیفوں سے سخت گھبراتے ہیں پس جو لوگ اپنی شہرت کے بھوکے ہوتے ہیں وہ اس طرح کے جرائم سے ڈرتے ہیں اور بچتے ہیں تاکہ ان کی شہرت میں نقصان نہ آنے پائے اور جو لوگ تکلیفوں سے ڈرتے ہیں تو وہ جرائم کا ارتکاب اس لئے نہیں کرتے ہیں تاکہ وہ حکومت یا قومی تنظیموں وغیرہ کی سزایا جرمانوں سے بچ سکیں اور جو لوگ شہرت کے بھوکے ہوتے ہیں یا مال اور دولت وغیرہ کے حاصل کرنے کے سخت لالچی ہوتے ہیں تو ظاہری غلطیوں سے اس لئے ڈرتے ہیں اور بچتے ہیں جو ان کی شہرت یا دنیا کے مال و دولت کمانے میں رکاوٹ بن سکتے ہیں اور وہ ایسے بھلائی والے کام کرتے ہیں جن میں ان کی شہرت زیادہ سے زیادہ ہو سکے یا ان کو زیادہ سے زیادہ

دنیاوی ترقی یا مال و دولت حاصل ہو جائے یا اس لئے ٹھیک ٹھیک ملازمت کرتے ہیں تاکہ ان کی تنخواہ بڑھادی جائے وغیرہ وغیرہ تو ایسے لوگ ظاہری گناہ اور جرائم سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور لوگوں کے سامنے اچھے کام اور اچھے اعمال بھی کرتے ہیں لیکن چونکہ ان کا یہ سارا تقویٰ و احتیاط اور پرہیزگاری دنیا کی خاطر ہوتی ہے اس لئے ایسے لوگ علیحدگی میں جہاں ان کو کوئی انسان نہ دیکھتا ہو وہ حلال و حرام کی تمیز نہیں کریں گے اور اس وقت وہ بھلائی اور نیکی کے کاموں میں سست ہوں گے یہ وہ قسم ہے جس کو ریاء کا ریاء منافق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

### (۲) لوگوں سے حیاء کی وجہ سے برے کاموں سے ڈرنا اور ان سے احتیاط کرنا!

مطلب یہ ہے کہ بعض لوگوں میں صفت حیاء کا عنصر زیادہ ہوتا ہے وہ اگرچہ زیادہ دین دار نہیں ہوتے لیکن وہ برے کاموں سے صرف اس لئے ڈرتے اور احتیاط کرتے ہیں کہ لوگ دیکھیں گے اور ان کے سامنے میری بے عزتی ہو جائیگی اور شرمندہ ہو جاؤں گا تو وہ صرف شرمندگی کی وجہ سے برے اور غلط کاموں سے مجتنب رہتے ہیں۔

### (۳) باطل سے ڈرنا اور اس سے بچنا اور اس کے مقابلے میں حق کو اختیار کرنا!

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر باطل اور برائی اور مضر چیز سے ڈرنے اور اس سے بچنے اور بھلائی و حق کی حمایت و محبت اور اس کی تلاش رکھ دی ہے تو جو لوگ اپنے ضمیر کو باطل سے تباہ و برباد نہ کر چکے ہوں تو ایسے لوگ اس خداداد قوت کی وجہ سے ہر باطل اور ہر برائی سے خوف کھا کر اس کو چھوڑتے ہیں اور اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن مجید اور دین اسلام چونکہ سراسر حق ہے اس لئے جس شخص کے اندر بھی یہ حق کی تلاش اور جستجو اور باطل سے ڈر اور خوف موجود ہو یعنی اس نے اپنے بد اعمالیوں اور ہٹ دھرمیوں کو خاک میں ملا کر اس کو تباہ و برباد نہ کیا ہو تو ایسے لوگ قرآن مجید اور اسلام کی حقانیت کو دیکھ کر اپنے باطل مذہب کو چھوڑ دیتے ہیں اور دین اسلام کو قبول کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ﴾

”یہ وہ کتاب ہے جس کے کتاب الہی ہونے میں کوئی شک نہیں یہ ہدایت ہے متقیوں کے لئے۔“ (البقرہ: ۲)

یعنی یہ ان لوگوں کو ہدایت پر چلاتی ہے جن کے اندر قبولیت حق کی استعداد باقی ہے اس کی وجہ سے وہ باطل سے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب اور اس کی ناراضگی سے بچنا چاہتے ہیں یہ کتاب ہدایت ہے حق کے طالبوں کے لئے اسی طرح ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:



﴿هَذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ﴾

”یہ لوگوں کے سمجھانے کے لئے بیان ہے اور متقیوں کے لئے ہدایت اور نصیحت ہے۔“ (آل عمران: ۱۳۸)

(۴) دنیا و آخرت کے عذاب سے ڈرنا اور بچنے کی کوشش کرنا!

اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض انسانوں پر یہ حقیقت پوری طرح کھل گئی ہوتی ہے اور اس پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ انسانی افعال اور اعمال کے ساتھ اس کے نتائج اور ثمرات بندھے ہوتے ہیں جیسا کہ مادی چیزوں کی خاصیتیں ہوتی ہیں کوئی گرم ہے کوئی ٹھنڈی کوئی ترش ہے کوئی میٹھا کوئی قابض ہے کوئی مسہل وغیرہ وغیرہ اس طرح اعمال کے بھی خواص اور اثرات ہوتے ہیں جو انسان کی دنیاوی اور اخروی زندگی میں ظاہر ہوتے ہیں تو ایسے حضرات پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں اور ہر اس عمل و فعل سے ڈرتے رہتے ہیں اور اس سے بچتے رہتے ہیں جس کا انجام اور نتیجہ برا ہوتا ہے اگرچہ اس میں وقتی طور پر تسکین خواہش یا کچھ فائدہ ہوتا ہے لیکن وہ اس وقتی فائدہ اور وقتی خواہش پوری کرنے سے پرہیز کرتے ہیں تاکہ زیادہ مصیبت اور عذاب سے بچ سکیں۔

(۵) ہر اس عمل سے بچنا جو اس کی آخرت کی ترقی میں رکاوٹ ڈال دے!

اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ باہمت ہوتے ہیں ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ کوئی عمل ان سے ایسا صادر نہ ہو جائے جو ان کی آخرت کے لحاظ سے نقصان دہ ہوں اور نہ کوئی ایسا عمل ترک کیا جائے جو آخرت میں ترقی کا باعث بنتا ہے تو ایسے لوگ عذاب سے ڈرنے والے اور آخرت کے درجات کے خواہاں ہوتے ہیں اور وہ ہر وہ کام کر گزرتے ہیں جس میں آخرت کی ترقی کو دیکھتے ہیں اور ہر اس کام کو چھوڑ دیتے ہیں جو آخرت کی دائمی زندگی میں خلل ڈالتا ہو۔

(۶) اللہ تعالیٰ کی ناشکری سے ڈرنا اور پرہیز کرنا!

اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض سمجھدار لوگ جب اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے ظاہری اور باطنی انعامات اور احسانات کو دیکھتے ہیں تو وہ ان پر شکر کرتے ہیں اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی جسمانی ظاہری و باطنی اور خارجی تمام نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف استعمال کرنے سے ڈرتے ہیں اور پرہیز کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں اور انعامات کی قدردانی کر کے ان کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے مطابق استعمال کرتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی پوری اطاعت اور فرمانبرداری میں استعمال کرتے ہیں تاکہ یہ انعامات ان سے زائل نہ ہوں اور آخرت کی لازوال



نعمتیں بھی میسر ہو جائیں اور یہ لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ گویا اللہ تعالیٰ ان کی نظروں کے سامنے ہے اور وہ اسے دیکھ رہے ہیں یا وہ ان کو دیکھ رہا ہے۔

(۷) اللہ تعالیٰ سے حیاء کہ وہ دیکھ رہا ہے اس لئے اس کی نافرمانی سے رکنا اور بچنا!

یعنی بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر یہ حقیقت خوب واضح ہو گئی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ظاہر و باطن ہمارے اعمال اور خیالات کو ہر حال میں دیکھ رہا ہے اور یہ حالت ان پر ایسی چھائی رہتی ہے کہ وہ اس سے غافل نہیں ہوتے تو ان حضرات کا اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے ڈرنا اور ان سے بچنا صرف اس لئے ہوتا ہے کہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کی اس نظر اور دیکھنے سے حیاء آتی ہے اور اس حیاء کی وجہ سے وہ گناہوں سے ڈرتے اور بچتے ہیں۔

(۸) اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال سے خوف!

یعنی یہ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کی ہیبت ایسی چھائی رہتی ہے کہ اس وقت نہ تو ان کو جنت کا خیال ہوتا ہے اور نہ دوزخ کا صرف اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرتے رہتے ہیں اور احتیاط کرتے رہتے ہیں۔

(۹) محبوب حقیقی کی ناراضگی سے ڈرنا اور اس سے بچنا!

بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی اور سخت محبت ہو کر رہتی ہے اور یہی ان کے دلوں پر ایسی چھائی رہتی ہے کہ ان کو اکثر اوقات گناہوں سے بچنے یا نیک اعمال کو کرتے وقت جنت اور دوزخ کا کوئی تصور نہیں آتا بلکہ وہ صرف محبوب کی ناراضگی کی وجہ سے اُس کی نافرمانی سے ڈرتے ہیں اور پرہیز کرتے ہیں اور ان کا نیک اعمال سے بھی صرف محبوب حقیقی کی خوشنودی کے سوا کچھ مقصد نہیں ہوتا اس کو مقام محبت کہتے ہیں۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ کے قرب میں زیادہ سے زیادہ کوشش!

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قرب میں زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے ہیں اور ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر رکاوٹ سے خوف زدہ اور ڈرنے لگتے ہیں جو اس کے خالق اور اس کے درمیان میں حائل بن کر اس کے قرب میں اضافے کو روکتی ہے یا اللہ تعالیٰ اور اس کے درمیان تعلق اور قرب کو سست بناتی ہے یا اس کو محبوب حقیقی سے ہٹاتی ہے تو وہ اس طرح کی ہر رکاوٹ سے ڈرتا رہتا ہے اور اس سے بچنے اور اس کو ہٹانے کی کوشش کرتا رہتا ہے خوف کی یہ چند وجوہات یا اقسام تھیں جو سمیٹ کر بیان کی گئیں ہیں ورنہ اس سے زیادہ بھی

ہوسکتی ہیں اور پھر ہر ایک قسم میں ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک بے شمار درجات ہوتے ہیں نیز یہ کہ کسی شخص کی پرہیزگاری میں خوف کی ایک سے زائد اقسام بھی جمع ہو جاتی ہیں۔

### تقویٰ کے درجات!

مذکورہ بالا تقویٰ کے محرکات کے بعد تقویٰ کے درجات کے بیان کی چنداں ضرورت نہیں لیکن پھر بھی تقویٰ کے چند مشہور درجات کو لکھ دیتا ہوں تاکہ متقیوں کی مختلف اقسام اور صورتیں سامنے آجائیں اور ہم زیادہ متقی اور پرہیزگار بننے کی کوشش کریں تقویٰ کے درجات سے پہلے تقویٰ کا خلاصہ سمجھ لیجئے۔

### تقویٰ کیا ہے؟

دین و ایمان کو ضرر پہنچانی والی چیزوں سے پرہیز کرنا یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق اور قرب میں رکاوٹ ڈالنے والی چیزوں سے پرہیز کرنا۔ جب تقویٰ کی آسان تعریف سامنے آچکی تو اب اس کی موٹی موٹی اقسام سمجھ لیجئے۔

(۱) تقویٰ کا ادنیٰ اور کمتر درجہ یہ ہے کہ کفر و شرک اور بدعات اور حرام چیزوں سے پرہیز اور کبیرہ یعنی بڑے گناہوں سے پرہیز کیا جائے اور فرائض و واجبات وغیرہ دین کے ضروری امور ادا کئے جائیں۔

(۲) دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان اعمال اور کاموں سے بھی اجتناب اور پرہیز کیا جائے جن کا مکروہ ہونا یقینی طور پر ثابت ہو نیز صغیرہ یعنی چھوٹے گناہوں سے پرہیز کرنا اور مستحبات اور اسلامی آداب کا بھی خوب اہتمام کیا جائے۔

(۳) تیسرا درجہ یہ ہے کہ جن کاموں کے کرنے میں یا جن چیزوں کے کھانے میں یا استعمال میں حرام کا شبہ اور اشتباہ ہو ان سے اجتناب کرنا یعنی کسی ایک چیز کے متعلق حلال و حرام ہونے، دونوں قسم کے دلائل موجود ہوں ایک دلیل سے اس کی حرمت ثابت ہوتی ہو اور دوسری سے حلال ہونا اور فقہاء علماء اسلام نے اس کی ظاہری حالت کو دیکھ کر حلال ہونے کا فتویٰ دے دیا ہو مگر چونکہ اس میں حرمت کی بھی ایک دلیل موجود ہے اس لئے اس بناء پر اس کو چھوڑ دینا اگر حرام ہونے کا قوی احتمال اور مضبوط دلیل موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں صرف وہم کی بناء پر کسی حلال چیز کے استعمال کو مشتبہ چیز نہیں سمجھا جائے گا، مشتبہ چیز وہ ہوتی ہے جس کی دلیل میں حرمت کی بوپائی جاتی ہو جو سلیم الفطرت انسان کے دل کو کھٹکے تو اس کے چھوڑنے کے بعد انسان پر تقویٰ کے اعلیٰ درجات و مقامات

کھلتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

(لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِيقَةَ التَّقْوَى حَتَّى يَدَعَ مَا حَاكَ فِي الصَّدْرِ)

”بندہ تقویٰ کی حقیقت کو اُس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس کو نہ چھوڑے جو اس کے دل میں

کھلے۔“ (بخاری: کتاب الایمان)

شاید حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوگی جیسا کہ ایک حدیث سے یہ بات معلوم ہوئی وہ یہ کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے دو باتیں پوچھیں اور ان میں ایک بات یہ تھی کہ گناہ کیا چیز ہے تو آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

(إِذَا حَاكَ فِي نَفْسِكَ شَيْءٌ فَدَعْهُ)

”جب کوئی چیز آپ کے دل میں کھلے تو اس کو چھوڑ دو۔“ (مسند احمد، مشکوٰۃ: کتاب الایمان)

اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

حلال ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہیں اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ چیزیں ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں جانتے لہذا جس شخص نے مشتبہ چیزوں سے پرہیز کیا اس نے اپنے دین کو پاک و محفوظ کر لیا اور جو شخص مشتبہ چیزوں میں مبتلا ہوا وہ حرام میں مبتلا ہو گیا اور اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو ممنوعہ چراگاہ کے کنارے اپنا ریوڑ چراتا ہے اور ہر وقت اس کا امکان رہتا ہے کہ اس کے جانور اس ممنوعہ چراگاہ میں داخل ہو جائیں اور یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی ممنوعہ چراگاہ حرام چیزیں ہیں۔ (بخاری و مسلم)

اس کا مطلب یہ ہے کہ حلال و حرام جن کے واضح اور بین احکامات موجود ہیں وہ تو سب کو معلوم ہیں مثلاً چوری، زنا، مردار جانور، غیبت وغیرہ حرام ہیں اور سبزیاں گندم وغیرہ کھانا حلال ہیں لیکن کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے حرام اور حلال ہونے کے بارے میں دلائل متعارض ہوتے ہیں اور واضح حکم معلوم نہیں ہوتا بلکہ یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ یہ حرام ہیں یا حلال مثلاً ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کا ارادہ کیا تو ایک دوسری عورت نے آکر یہ بات کہہ دی کہ میں نے تو تم دونوں کو اپنا دودھ پلایا ہے اس صورت میں یہ عورت مشتبہ ہو گئی کیونکہ ایک طرف تو صرف ایک عورت کا بیان ہے کہ میں نے تم دونوں کو اپنا دودھ پلایا ہے اس لئے یہ دونوں رضاعی بہن بھائی ہوئے اور یہ تو ظاہر ہے کہ رضاعی بھائی بہن سے نکاح درست نہیں ہے اور اگر اس دلیل کو دیکھا جائے تو ان دونوں کے درمیان قطعاً نکاح جائز نہیں مگر دوسری طرف چونکہ ایک عورت کا بیان ہے جس پر کوئی شرعی گواہی موجود نہیں ہے اس

لئے اس عورت کی بات پر یقین نہیں کیا جاسکتا کہ یہ عورت صحیح کہہ رہی ہوگی ہو سکتا ہے کہ یہ عورت محض بد نیتی کی وجہ سے یہ بات کہہ رہی ہو یا ان دونوں کے درمیان افتراق کرانا چاہتی ہو تو ایسی صورت میں کہا جائے گا کہ نکاح درست ہے یا مثلاً کسی شخص کے پاس کچھ مال حلال کمائی سے آیا اور کچھ ناجائز طریقے سے اور یہ معلوم نہیں کہ کتنا مال حرام کمائی سے آیا ہے تو ایسی صورت میں سب مال اسی شخص کے حق میں مشتبہ ہو گیا بہر حال جب دونوں طرف سے حلال و حرام کے قوی احتمالات اور دلائل آجائیں تو ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ حرام میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اس چیز کو چھوڑ دیا جائے اگرچہ ظاہری شریعت کا فتویٰ یہی ہے کہ وہ جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت رابعہ بن معبد ؓ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے رابعہ تم یہی تو پوچھنے آئے ہو کہ نیکی کیا ہے؟ اور گناہ کیا ہے؟

میں نے عرض کیا کہ ”جی ہاں“ تو (یسن کر) آپ ﷺ نے اپنی انگلیاں جمع کیں اور ان کے ساتھ میرے سینے کو مار کر فرمایا:

(اسْتَفْتِ نَفْسَكَ اسْتَفْتِ قَلْبَكَ)

”اپنے آپ سے دریافت کرو اور اپنے دل سے پوچھ لیا کرو۔“

یہ الفاظ آپ ﷺ نے تین بار فرمائے اس کے بعد فرمایا کہ:

(اَلْبِرُّ مَا اَاطَمَّا نَتُّ اِلَيْهِ النَّفْسُ وَاطْمَأَنَّ اِلَيْهِ الْقَلْبُ وَالْاِثْمُ مَا حَاكَ فِى النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِى

الصُّدُورِ وَاِنْ افْتَاكَ النَّاسُ)

”یعنی نیکی وہ ہے جس سے نفس مطمئن ہو جائے اور جس سے دل کو سکون و اطمینان حاصل ہو جائے اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور جس سے سینے میں شک و تردد پیدا ہو جائے اگرچہ لوگ تجھے (درست ہونے کا) فتویٰ دیں تو بھی اس چیز سے پرہیز کریں۔“ (احمد دارمی مشکوٰۃ)

اسی طرح کی حدیثوں میں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اپنے دل سے دریافت کرنے کا یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ کسی چیز کے بارے میں کوئی واضح شرعی فیصلہ سامنے نہ ہو اور اس میں علمائے امت کا اختلاف ہو تو پھر اس قول کے مطابق عمل کرنا چاہئے جس کو اپنا دل صحیح اور راجح تسلیم کرے اور دل اس پر مطمئن ہو جائے اسی طرح کوئی مشتبہ چیز ہے تو اس کو بھی چھوڑ دے اگرچہ علماء نے اس کے جواز میں فتویٰ دے دیا ہو جیسا کہ اس کی دو مثالیں پہلے دے دی گئیں ہیں یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ضمیر کی صحیح رہنمائی کا جو ہر اور حق و باطل کی یہ کسوٹی ہر شخص کو

نصیب نہیں ہوتی یہ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو نصیب فرماتے ہیں جو صالح اور متقی ہوں اور جن کا دل ہوائے نفس کی کدورت سے پاک و صاف ہو اور جن کے دل خدا ترسی کے جوہر سے معمور ہوں جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ ”تقویٰ کے فضائل“ میں آئے گا۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو قلب سلیم رکھتے ہیں اور جن کے دل صرف خیر و بھلائی کی طرف مائل اور برائی سے بیزار رہتے ہیں اس لئے وہ برائی کی بدبو کو محسوس کر کے ان کے دل اس سے بے چین ہو جاتے ہیں اور خیر و بھلائی کی خوشبو سے ان کے دل مطمئن اور پرسکون ہوں ورنہ جن کو حلال و حرام کی کوئی پرواہ نہ ہو اس کو کیا کھٹکے گا۔

(۴) ایسے مباح اور جائز کاموں سے بھی پرہیز کرنا جو حرام میں پڑ جانے کا سبب بن جاتے ہیں اس کا مطلب یہ کہ مباح اور جائز چیزوں کے استعمال سے بچیں جن کے زیادہ استعمال سے حرام میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو مثلاً زیادہ کھانا پینا جو غفلت کا سبب بن جاتا ہے یا جن مباحات کی وجہ سے کسی برتر مقصد کے حصول میں نقصان واقع ہو مثلاً جائز کھیل یا تجارت وغیرہ میں اس قدر مشغول ہو جانا کہ علم کے حصول یا دین اسلام کے لئے جدوجہد میں نقصان آجائے یا ایسا کھیل کھیلنا جس میں نہ جسمانی فائدہ ہو نہ جہاد کی تیاری سے تعلق رکھتا ہو۔ چنانچہ حضرت عطیہ سعدیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(لَا يُلْغُ الْعَبْدُ أَنْ يَكُونَ مِنَ الْمُتَّقِينَ حَتَّى يَدَعَ مَالًا نَاسَ بِهِ حَدَرًا مَبَاسًا بِهِ)

یعنی ”بندہ اس وقت تک (کامل) پرہیزگاروں میں شمار نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ان چیزوں کو نہ چھوڑے جن میں کوئی قباحت اور مضائقہ نہیں تاکہ اسی طرح وہ ان چیزوں سے بچ سکے جن میں قباحت ہے۔“ (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس وقت تک صحیح معنوں میں کامل اور متقی پرہیزگار نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس اندیشہ سے مباح یا کسی مباح چیز کی کثرت استعمال کو بھی نہ چھوڑ دے کہ مبادیہ مباح چیز کسی حرام یا مکروہ یا مشتبہ چیز تک پہنچنے کا ذریعہ نہ بن جائے۔

(۵) تقویٰ کا اعلیٰ مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کے خیال سے بھی پرہیز کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مباح کاموں میں بھی اللہ تعالیٰ کی یاد کو اور اس کی حضوری کو بھر دیں جو بھی کام کریں گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھ کر کر رہے ہوں اور اسی کی خوشنودی کے لئے کر رہے ہوں۔ یہاں تک کہ کفار کے ساتھ لڑنے یا بحث و مباحثہ کرنے اور اپنی بیوی کے ساتھ بات چیت اور ملنے کے وقت بھی اللہ تعالیٰ یاد رہے اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی

خوشنودی اور اس کی رضا کو تلاش کریں اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی و در ماندگی اور اس کی طرف فقر و احتیاج ہو۔

خلاصہ یہ کہ جو کام یا فعل اور جو چیز بھی بندہ اور اللہ تعالیٰ کے تعلق اور حضوری میں خلل ڈالتی ہو یا حضوری اور تعلق میں سے مانع ہو اس سے بچا جائے اور اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں اور تمام افعال اور اعمال میں اور باتوں میں یا فکر چھائی رہے کہ گویا میں اپنے پروردگار ذوالجلال والا کرام کے سامنے ہوں اور گویا میں اس کو دیکھ رہا ہوں اور دل کی لوائے اللہ تعالیٰ کے ساتھ لگی ہوئی ہو اس کے ساتھ دل اٹکا اور وابستہ ہو چکا ہو یا یہ فکر ہر وقت غالب رہے کہ میرا پروردگار مجھے دیکھ رہا ہے اور اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ رکھیں اور ہر اُس کام اور بات سے پرہیز کریں جو اس تعلق میں کمی کا باعث بنے یا ترقی کو روکے۔

مذکورہ بالا پانچ درجے ہیں لیکن ان میں سے ایک ایک درجے میں ادنیٰ سے اعلیٰ تک بے شمار درجات ہیں مثلاً پانچواں درجہ جو کہ سب سے اعلیٰ ہے اس کو لے لیں تو اللہ تعالیٰ مقرب لوگوں میں سے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ مقرب اور محسن لوگوں کے بے شمار درجات بن جاتے ہیں دیکھئے انبیاء علیہم السلام کا بھی اللہ تعالیٰ سے قرب و تعلق تھا اور دوسرے اولیاء اللہ کا بھی ایک قرب و تعلق ہوتا ہے دونوں میں نام کی مناسبت کے سوا اور کوئی مناسبت نہیں پھر دوسرے انبیاء علیہم السلام کے قرب و احسان کا ایک مرتبہ تھا اور محمد رسول اللہ ﷺ کا بھی قرب و احسان کا مرتبہ تھا پھر ان کے درمیان جو فرق ہو وہ اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہے یا ہو سکتا ہے حدیث کی اصطلاح میں اس آخری درجہ کو ’احسان‘ کہا جاتا ہے یہ مقام جس راہ سے حاصل ہوتا ہے اس کو طریقت، تصوف، سلوک و احسان، کہا جاتا ہے اسی راہ کو راہ تزکیہ یا طریق تقویٰ، کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے جیسا کہ اس کا بیان اخلاق کے باب میں آچکا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بندوں کو تقویٰ کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے!

خلاصہ یہ کہ تقویٰ اور قرب الہی اور احسانی کیفیت کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک بے شمار درجات و مقامات ہوتے ہیں اور مومن کے لئے ولایت عامہ سے مقربین کی ولایت خاصہ تک قرب اور رضائے الہی کی جملہ منازل تقویٰ ہی سے طے ہوتی ہیں اور قرب حق اور رضائے الہی کے لامحدود مدارج تقویٰ والے اعمال ہی کے مختلف درجات ہیں اور اس کا اعلیٰ مقام احسان سے شروع ہوتا ہے اور احسان یہ ہے کہ آدمی اس دھیان سے زندگی گزارتا رہے کہ گویا اللہ تعالیٰ اس کے سامنے اور وہ اسے دیکھ رہا ہے یا اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے قرب و رضا کی راہوں کا جاننا اور اس پر آخری دم تک چلنا سلوک کا مقصد ہے اور یہ ریاضت

محنت و مجاہدہ اور محبت صالح ہی سے حاصل ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہی ترغیب دی ہے کہ وہ تقویٰ و احسان کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچنے کی حتی الوسع کوشش کریں اور اس بات کو اللہ تعالیٰ نے مختلف انداز میں بیان فرمائی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوْا وَاحْسَنُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝﴾

یعنی ”جو ایمان لائے اور نیک کام کئے ان پر کوئی گناہ نہیں جو پہلے کھا چکے ہیں جبکہ آئندہ کو پرہیزگار ہوئے اور ایمان لائے اور نیک اعمال کئے پھر پرہیزگار ہوئے اور ایمان لائے پھر پرہیزگار ہوئے اور خوب نیکی کی اور اللہ تعالیٰ محسنین (یعنی نیکو کاروں) سے محبت رکھتا ہے۔“ (مائدہ: آیت ۹۳)

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَأَسْمِعُوا وَأَطِيعُوا.....﴾

یعنی پس جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچیں (یعنی اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کرو) سنو اور حکم مانو (یعنی اپنی پوری قوت و توانائی تقویٰ اور سمع و طاعت میں خرچ کرو)۔“ (تغابن: آیت نمبر ۱۶)

نیز ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس سے تقویٰ کا حق ہے اور نہ مرو مگر ایسے حال میں کہ تم مسلمان ہو۔“ (آل عمران آیت نمبر ۱۰۲)

اس کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

(حَقُّ تَقَاتِهِ هُوَ أَنْ يُطَاعَ فَلَا يَعْصَى وَيَذْكُرُ فَلَا يَنْسَى وَيَشْكُرُ فَلَا يَكْفُرُ)

”حق تقویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری ہر کام میں کی جائے کسی کام میں نافرمانی نہ کی جائے اور اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ یاد رکھا جائے اور کبھی نہ بھولا جائے اور اس کا شکر ہمیشہ ادا کیا جائے اور کبھی ناشکری نہ کی جائے۔“ (دیکھئے ابن کثیر اور قرطبی مستدرک وغیرہ)

”حَقُّ تَقَاتِهِ“ کی یہی تفسیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی مروی ہے۔ (دیکھئے تنویر المقياس من

تفسير ابن عباس)



اس کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ کا اعلیٰ اور حقیقی مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں اپنی پوری قوت اور توانائی اس طرح خرچ کی جائے کہ اس میں نافرمانی کا کوئی شائبہ نہ ہو اور اپنے دل و زبان اور عمل سے اس کا اس طرح شکر ادا کیا جائے کہ اس میں ناشکری کی کوئی آمیزش نہ ہو تو ایسی حالت میں بندے اور معبود، ساجد اور مسجود میں دوری کے پردے اٹھ جاتے ہیں اور بندے کا دل جاگ جاتا ہے اور اس کے دل کی آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں کہ وہ تو اپنے محبوب حقیقی کا مشاہدہ دل سے کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی اس پر ہر آن کھلتی رہتی ہے اور اس میں برابر ترقی جاری رہتی ہے اور اس کے دل پر اللہ تعالیٰ کی یاد اور استحضار اس قدر غالب رہتا ہے کہ کبھی بھی اس پر غفلت طاری نہیں ہوتی ہے اور اس کو اصطلاح میں ”مقام احسان“ یا احسانی کیفیت کہا جاتا ہے۔ یہ ایک مؤمن کے لئے روحانی ترقی کا اعلیٰ مقام ہے یہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ جل شانہ اپنے بندے کے ساتھ خصوصی محبت کرتا ہے اور یہ وہ مقام ہے کہ جس پر پہنچنے کے بعد بندہ کی مرضی اور ارادے اللہ تعالیٰ کی مرضی میں فنا اور ڈوب کر ختم ہو جاتے ہیں اور اس کی پوری زندگی کے خدوخال اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا دیکھنا اور اس کا ہر ارادہ اور ہر خواہش زندگی کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک حرکت و سکون اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق گزرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: ”جو شخص میرے ولی کو تکلیف پہنچاتا ہے تو میں اس کے ساتھ لڑائی کا اعلان کرتا ہوں اور میرا بندہ میرا قرب کسی ایسے ذریعہ سے حاصل نہیں کرتا جو میرے نزدیک ان چیزوں سے زیادہ محبوب ہو جو میں نے اس پر فرض کی ہیں اور میرا وہ بندہ (جس کو فرائض کے ذریعے میرا تقرب حاصل ہے) برابر نوافل (نفلی رکعتیں نفلی روزے ذکر و اذکار اور نفلی صدقات وغیرہ) کے ذریعے میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں (کیونکہ وہ فرائض اور نفلی عبادات اور ہر قسم کی اطاعت اور ذکر و اذکار) کو اختیار کر لیتا ہے اور نافرمانی سے بالکل اجتناب کرتا ہے) اور جب میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں کہ وہ اس کے ذریعہ سے سنتا ہے میں اس کی بینائی بن جاتا ہوں وہ اسی کے ذریعہ سے دیکھتا ہے میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں وہ اسی کے ذریعہ پکڑتا ہے اور اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو اس کو ضرور دیتا ہوں اور اگر وہ کسی چیز سے پناہ چاہے تو میں اسے ضرور بچاؤں گا۔“ (صحیح بخاری، مشکوٰۃ)

اس حدیث کے اندر اور بھی بہت سی باریکیاں علمائے کرام اور صوفیاء عظام نے بیان فرمائی ہیں لیکن اس میں سے بعض بہت ہی مشکل سے سمجھ میں آتی ہیں بلکہ جب تک یہ مذکورہ کیفیت حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک اس کا



صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا اس لئے درمیانی درمیانی بات لکھ دی جس میں عام و خاص دونوں کے لئے سمجھنے کے اسباب موجود ہیں۔

### تقویٰ کے درجات اور نام نہاد متقین اور پرہیزگاریاں!

جب تقویٰ کی تعریف اور اس کے درجات معلوم ہو گئے تو تقویٰ کا غلط مفہوم اور اس کا جھوٹا لباس خود بخود تار تار ہو گیا جو بعض نام نہاد متقیوں اور پرہیزگاروں یا نام نہاد صوفیوں نے اپنے اوپر اوڑھ رکھا ہے عام لوگ ان کو متقی اور پرہیزگار کہتے ہیں جو نوافل اور مستحبات میں خوب زور و شور دکھاتے ہیں اور اسلامی آداب بلکہ بعض خود ساختہ آداب کا خوب اہتمام کرتے ہیں اسی طرح کھانے پینے کی چیزوں میں پاک و ناپاک میں تو دور دور کے توہمات و شکوک نکال کر ان سے اپنے دامن کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں اور بندوں کے حقوق جو واجب اور لازم ہیں وہ ان سے غفلت اور معاملات کی خرابی میں غیر مسلموں سے بھی آگے آگے رہتے ہیں، قرض لے کر بھول جاتے ہیں اپنا کام اور اپنا مطلب نکالنے میں جھوٹ، چالپوسی، غیبت دوسرے بندوں کے حقوق مارتے ہیں، مال کے حاصل کرنے میں یہ نام نہاد پرہیزگار اور متقی سود تک سے گریز نہیں کرتے خلاصہ یہ کہ دین کے ضروری اور اہم فرائض و واجبات میں کوتاہی کرتے ہیں اور حرام اور مکروہ چیزوں اور کاموں کو اختیار کرتے ہیں بلکہ یہ نام نہاد پیر متقی پرہیزگار دنیا پرستی مال و جاہ کی حرص و لالچ اور تکبر و حسد جیسے برے اخلاق میں عوام سے بازی لے جاتے ہیں لیکن پھر بھی ان حضرات کی پرہیزگاری اور بندگی مجروح نہیں ہوتی اور نہ ان کے ایمان و یقین کے زبانی جمع خرچ کے جھوٹے وعدوں میں فرق آتا ہے گویا ان کا تقویٰ اور ایمان و یقین یا تصوف اور بزرگی صرف اتنا ہے کہ فرائض اور واجبات کو چھوڑ کر صرف مستحبات (جس کا درجہ فرائض و واجبات اور سنن کے بعد ہے) کا اپنانا ہے اور حرام کاموں اور مکاریوں میں پڑ کر صرف ظاہری طور پر ان چیزوں سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں جو عوام کے نزدیک بزرگی، تقویٰ اور پرہیزگاری یا ایمان و یقین کی دلیل بن سکتی ہے اور یہ تقویٰ اور پرہیزگاری سراسر قرآن و سنت کے خلاف شیطانیت اور تکبر ہے اسی طرح اگر کسی شخص کا تقویٰ صرف اس کی زندگی کے ایک شعبہ میں دکھائی دیتا ہے تو یہ بھی محض تکلف اور بناوٹ ہے اور یہ اس کی اتباع نفس کی علامت ہے۔

### تقویٰ دل کی ایک صفت ہے!

بس تقویٰ اور پرہیزگاری تو دل کی ایک صفت ہے اور یہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بناء پر انسان کو

حق کے ساتھ شدید محبت اور اس کو اپنانے کی شدید رغبت اور باطل سے سخت نفرت و بغض ہوا کرتی ہے یا بالفاظ دیگر یہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بناء پر ہر فعل و عمل کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق بنانے کی شدید محبت و رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت ہوتی ہو اور حرام چیزوں سے بچنا جو اللہ تعالیٰ اور بندے کے تعلق میں رخنہ ڈالتے ہیں یا ترقی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں یا حق کا متلاشی ہونا یہ سب کچھ اس صفت کے برگ و بار ہیں جس شخص میں جس قدر یہ صفت ترقی پر ہوگی اسی قدر یہ شخص متقی اور پرہیزگار اور اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوگا، اسی قدر اللہ تعالیٰ کا قرب اس کو حاصل ہوگا اور اس میں وہ ترقی کرتا ہوگا اور اس کی دل کی یہ صفت (یعنی تقویٰ) اس کی زندگی کے تمام شعبوں میں واضح طور پر دیکھائی دے گی اور اس کا ہر قول و فعل ہر محبت و بغض اور ایک ایک لمحہ اسی صفت میں رنگا ہوا ہوگا اور جس میں جس قدر یہ صفت ہوگی اسی قدر اس کی زندگی اللہ تعالیٰ کی صفات کے رنگ میں رنگی ہوگی۔

**تقویٰ کے ثمرات، حق اور نیکی کو قبول کرنے والا متقی ہوتا ہے!**

تقویٰ کی تعریف و درجات وغیرہ کے بعد اب تقویٰ کے ثمرات پڑھ لیجئے۔

(۱) متقی اور پرہیزگار شخص حق کا متلاشی اور طالب رہتا ہے متقی اور پرہیزگار بہت محتاط ہوتا ہے وہ اپنے ہر قدم کو بہت احتیاط سے اٹھاتا ہے وہ اپنے کسی فکر و عمل میں بے پروا نہیں ہوتا وہ ہر بات اور ہر کام کو درستگی کے ساتھ سمجھنے اور کرنے کی کھٹک رکھتا ہے حق کی تلاش میں وہ برابر لگا رہتا ہے ہر باطل اور ہر برائی سے بچتا رہتا ہے اور ہر حق اور ہر اچھائی کو اور نیکی کو تلاش کر کے اختیار کر لیتا ہے اور دل کی یہی وہ صفت ہے جو ہر انسان میں فطری طور پر رکھی گئی ہے اور جن لوگوں نے اپنی بد اعمالیوں جھوٹ و فریب وغیرہ سے اس صفت کو جلا کر رکھ نہ کر دیا ہو یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو قرآن مجید اور حق سے فائدہ اٹھانے والے ہوتے ہیں کیونکہ قرآن مجید اور دین اسلام ہی سراسر حق ہے اور سراسر نیکی اور بھلائی ہے تو جو بھی حق اور نیکی کا متلاشی ہوگا، تو وہ قرآن مجید کو اور اس کی تعلیمات کو سن کر ضرور فائدہ اٹھائے گا یہ ان کی فطرت اور ضمیر کی خود اپنی آواز ہوتی ہے پھر قرآن مجید و سنت کی تعلیم اور عمل سے اس صفت میں برابر ترقی ہوتی رہتی ہے چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ:

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾

”یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں یہ متقی لوگوں کے لئے ہدایت ہے۔“ (بقرہ: آیت ۲)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿هٰذَا بَيٰٰنٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾

”یہ لوگوں کے واسطے بیان ہے اور تقویٰ والوں کے لئے ہدایت و نصیحت ہے۔“ (آل عمران: ۱۳۸)

اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کتاب سے فائدہ وہی لوگ اٹھائیں گے جن کے اندر تقویٰ کا جوہر موجود ہو جس طرح سورج چمکتا تو سب کے لئے ہے لیکن اس کی روشنی سے فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو آنکھیں بھی رکھتے ہیں اور آنکھوں کو دیکھنے کے لئے کھولتے بھی ہیں یہ کتاب اتری تو سب ہی کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے ہے لیکن اس سے فائدہ وہی لوگ اٹھائیں گے جن کے اندر کے باطن میں اللہ تعالیٰ کا خوف و تقویٰ کا جوہر موجود ہو یا بالفاظ دیگر کہ ان کے اندر قبولیت حق کی صلاحیت باقی رہ گئی ہو اور وہ حق کے طالب بنیں۔

ایمان و یقین والامتی اور پرہیزگار اللہ تعالیٰ کے نام لگی ہوئی چیزوں سے محبت رکھتا ہے اور اس کی تعظیم و احترام کرتا ہے!

(۲) ایمان و یقین والامتی پرہیزگار اللہ تعالیٰ کے نام لگی ہوئی چیزوں سے محبت رکھتا ہے اور اس کی تعظیم و تکریم کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ذَلِكَ وَمَنْ يُعْظَمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ (حج: آیت ۳۲)

”بات یہی ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نامزد چیزوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ دلوں کے تقویٰ اور پرہیزگاری سے ہے۔“

نیز اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کی تعظیم و تکریم اور ان کے ساتھ محبت رکھنے پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ فَلَتَتَقْوَى ۖ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ﴾

”اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اونچی نہ کرو اور نہ بلند آواز سے آپ ﷺ سے بات کیا کرو جیسا کہ تم ایک دوسرے سے پکار کر (بات) کیا کرتے ہو کہیں تمہارے اعمال برباد نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو بلاشبہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں وہی ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور پرہیزگاری کے واسطے جانچا ہے ان کے لئے بخشش (اور معافی) ہے اور بڑا اجر۔“ (حجرات: آیت ۳۲ تا ۳۴)

جو حق اور سچ لائے اور جو حق کی تصدیق کرے یہی لوگ پرہیزگار ہیں!

(۳) ﴿وَالَّذِي جَاءَ بِالصَّدَقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾

”اور جو سچی (اور حق) بات لایا اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی متقی اور پرہیزگار ہیں۔“ (سورۃ زمر:

آیت ۳۳)

متقی اور پرہیزگار صبر کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کی تمام تعلیمات پر استقامت سے چلنے والا ہوتا ہے!

(۴) ﴿إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾

”بلاشبہ جو پرہیزگاری کرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی نیکوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔“ (یوسف: آیت ۹۰)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَأَنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾

”اور اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔“ (آل عمران: ۱۸۶)

متقی، عفو و درگزر کرنے والا ہوتا ہے!

(۵) ﴿وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾

”تمہارا معاف کر دینا تقویٰ سے قریب تر ہے۔“ (بقرہ: آیت ۲۳۷)

ہر حال میں عدل و انصاف پر قائم رہنا تقویٰ کی علامت ہے!

(۶) ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا طَاعِدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ

بِمَا تَعْمَلُونَ﴾

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے واسطے انصاف و عدل کی گواہی دینے پر قائم رہو اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس

بات پر نہ ابھارے کہ عدل و انصاف کو چھوڑ دو و عدل و انصاف کرو یہی بات تقویٰ کے قریب تر ہے اور اللہ (کی

نافرمانی) سے بچو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے یقیناً خبردار ہے۔“

(۷) سود اور ناجائز مال کے حصول سے بچنا اور تقویٰ!

متقی شخص مال کے حصول میں بہت ہی احتیاط کرتا ہے وہ سود اور ہر قسم کے ناجائز مال سے بچنے کی پوری کوشش

کرتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

”اے ایمان والو! سود و گناہ پر دو گنا کر کے مت کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کی ناراضگی سے بچتے رہو

تاکہ تم فلاح پاؤ۔“

(آل عمران: آیت ۱۳۰)

### (۸) مخلوق پر ترس کھانا اور صلہ رحمی اور تقویٰ!

متقی اور پرہیزگار شخص رشتہ داروں، والدین بہن بھائی اور دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہوگا، اور اس کے دل میں مخلوق کے لئے رحم و مہربانی اور اس پر شفقت ہوگی چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ ط إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾

”اور اس اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی اور ناراضگی) سے پرہیز کرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رشتہ داروں کے تعلقات کو بگاڑنے سے بچو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔“ (النساء: آیت ۱)

اس آیت کریمہ کے شروع میں بھی اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ﴾

”اے لوگو اس اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی) سے پرہیز کرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا فرمایا پھر چند جملوں کے بعد پھر فرمایا ﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ﴾ پھر اللہ تعالیٰ نے پرہیزگار اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اور اس کی ناراضگی سے بچنے کی تاکید کے بعد کچھ احکامات دے دیئے وہ یہ ہیں صلہ رحمی اور رشتہ داروں کے تعلقات کو نہ بگاڑنا اور رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔

﴿وَاتُوا الْيَتَامَىٰ اَمْوَالَهُمْ﴾ اور یتیموں کو ان کا مال دے دیا کرو۔

﴿وَلَا تَبْدِلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ﴾ یعنی رومی مال کو (ان کی) عمدہ چیز سے نہ بدلو۔

﴿وَلَا تَأْكُلُوا اَمْوَالَهُمْ اِلٰى اَمْوَالِكُمْ﴾ اور ان (یتیموں) کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ۔

اس کے بعد یتیم بچیوں کے معاملہ میں عدل و انصاف اور ان پر رحم کا اور ان پر ظلم نہ کرنے کا حکم دے دیا اور پھر اپنی بیویوں کے مہر کی ادائیگی اور ان پر مہربانی رحم اور ترس کھانے کا اور ان کا حق خوشی سے دے دینے کا حکم فرمایا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دے دیا کہ جب یتیم اس قدر سمجھدار نہ ہو جائے کہ وہ کاروبار کو سنبھال سکے اس وقت تک ان کے مالوں میں سے تو ان کو روٹی، کپڑا اور ان کے ضروری اخراجات دیتے رہو اور ان کو نصیحت کی باتیں بھی کہتے رہو لیکن ان کو ان کے اموال سپرد نہ کیا کرو کہ وہ اس کو بے جا اڑائیں گے البتہ جب وہ کاروبار سنبھالنے کی حد تک پہنچ جائیں اور وہ ہوشیار بھی ہوں تو پھر دو گواہوں کے سامنے ان کو ان کے مال سپرد کر دو اور آخر میں رشتہ داروں سے اور یتیموں اور مسکینوں پر رحم و مہربانی کی تعلیم دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

﴿وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينُ فَأَرْضُوهُمْ مِنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا﴾  
 ”اور جب (میراث کی) تقسیم کے وقت (غیر وارث) رشتہ دار یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے کچھ انہیں بھی دے دیا کرو اور ان سے اچھی بات کہو۔“ (سورت نساء: آیت ۸)

### متقی اور پرہیزگار متوکل ہوتا ہے!

(۹) متقی اور پرہیزگار شخص کا اللہ تعالیٰ اور اُس کی تعلیمات و ہدایات پر توکل (توکل کسے کہتے ہیں اس کی پوری تفصیل ”توکل کے باب“ میں دیکھ لیں۔) اور پورا پورا بھروسہ اور اعتماد ہوتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:  
 ﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾  
 ”اور اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی اور ناراضگی) سے بچتے رہو اور ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ پر بھی بھروسہ کرنا چاہئے۔“ (مائدہ: آیت ۱۱)

### متقی نیک کاموں میں تعاون کرے گا!

(۱۰) متقی اور پرہیزگار نیک کاموں اور نیکی کی باتوں میں تعاون کرے گا اور ظلم اور برائی اور بری باتوں میں کسی کے ساتھ تعاون اور مدد نہیں کرے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:  
 ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾  
 ”اور آپس میں نیکی اور تقویٰ (کے کاموں اور باتوں) میں مدد کرو اور گناہ و ظلم پر مدد نہ کرو اور اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی و ناراضگی) سے پرہیز کرو بے شک اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔“ (مائدہ: آیت ۲)  
 ظالم کا ہاتھ روکنا اور مسلمانوں کے مابین صلح کرنا ان کے باہمی تعلقات درست کرنا تقویٰ کی علامت ہے!

(۱۱) دو مسلمان یا دو مسلمان جماعتوں یا قوموں کے درمیان صلح صفائی کرنا اور ان کے باہمی تعلقات کو بہتر بنانے کا کام پرہیزگاروں کا کام ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال میں صلح اور ظالم کے ہاتھ روکنے کی تعلیم اور مسلمانوں کے گروہ بندیوں میں عدل و انصاف کے ساتھ صلح اور ان کے باہمی تعلقات بہتر بنانے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلَحُوا بَيْنَ أَخَوِيكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾

”بلاشبہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں پس اپنے بھائیوں میں صلح کرو اور اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی اور ناراضگی) سے بچتے رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔“ (حجرات: آیت ۱۰)

متقی اور پرہیزگار غیبت اور لوگوں کے مذاق اڑانے وغیرہ سے پرہیز کرتا ہے!  
(۱۲) متقی اور پرہیزگار غیبت وغیرہ جیسے ناجائز کاموں سے پرہیز کرے گا چنانچہ اللہ تعالیٰ لوگوں کی غیبت اور ان کے مذاق اڑانے اور ان پر فقرے کسنے اور طعن اور ان پر بلا وجہ بدگمانی سے منع کر کے آخر میں فرماتے ہیں کہ ﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ﴾ (حجرات: ۱۲)

”اور اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی اور ناراضگی) سے بچتے رہو اللہ تعالیٰ یقیناً بڑا توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے۔“

متقی اور پرہیزگار مجاہد، باطل سے جنگ کرنے والا ہوتا ہے اور کفر سے جنگ کے لئے تیاری کرنے والا ہوگا!

(۱۳) متقی اور پرہیزگار شخص اللہ تعالیٰ کے کلمہ اور دین اسلام کو غالب کرنے کیلئے ہر باطل کے ساتھ پوری قوت سے لڑے گا اور اس لڑنے اور جہاد میں اللہ تعالیٰ کے حدود اور احکامات کی پوری پوری نگہداشت کرے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ۖ وَعَلِمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾  
”اے ایمان والو اپنے نزدیک کے کافروں سے قتال کرو (یعنی لڑو) اور چاہئے کہ وہ تم میں سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔“ (التوبہ: ۱۲۳)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾  
”اے ایمان والو صبر کرو اور (دشمن کے مقابلہ میں) ثابت قدم اور مضبوط رہو اور (دشمن کے مقابلہ کے لئے) تیار رہو اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور نافرمانی سے بچو تا کہ فلاح پاؤ۔“ (آل عمران: آیت ۲۰۰)

نیز اللہ تعالیٰ یہ حکم دیتے ہوئے کہ (کفار و مشرکین کے ساتھ اس وقت تک قتال اور جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ و فساد باقی نہ رہے اور اللہ تعالیٰ کا دین قائم ہو جائے) پھر اس کے بعد کچھ اور احکامات بتلا کر فرماتے ہیں کہ:

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ وَعَلِمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾



”اور اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی) سے بچو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں اور پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔“

(بقرہ: آیت ۱۹۴)

پورے دین اسلام پر صدق و اخلاص کے ساتھ عمل کرنے والا متقی و پرہیزگار ہوتا ہے! (۱۴) یہ چند آیات بطور نمونہ پیش کی گئیں ورنہ قرآن مجید تقریباً ہر رکوع میں تقویٰ اور پرہیزگاری کا حکم ہے جگہ جگہ قرآن مجید میں آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ جب بھی کسی خیر کے کرنے کا حکم دیتے ہیں مثلاً نماز کا حکم دیا یا حج وغیرہ یا کسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وغیرہ وغیرہ یا کسی چیز سے منع فرماتے ہیں تو اس کے بعد یا اس سے پہلے ﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ﴾ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو۔ یا اسی طرح کی ترغیب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرو اور اس کی نافرمانی اور ناراضگی سے بچتے رہو، جو جو احکامات دیئے گئے ہیں ان پر اخلاص کے ساتھ عمل کرو اور جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان سے اللہ تعالیٰ کے لئے پرہیز کرو لہذا اگرچہ تقویٰ اور پرہیزگاری کا تعلق دل سے ہے لیکن یہی تقویٰ ہے جس کا برگ و بار دین اسلام پر خلوص اور پختگی سے عمل کرنا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ پیغمبروں نے اپنی اپنی قوموں سے کہہ دیا کہ:

﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا﴾

”پس اللہ تعالیٰ (سے خوف کھا کر اس کی نافرمانی) سے بچو اور میری اطاعت کرو۔“ (شعراء: آیت ۱۰۸)

یا مثلاً اللہ تعالیٰ متقی اور پرہیزگار کے متعلق فرماتے ہیں:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ  
وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ  
وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ  
وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَاللَّيْكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾

یعنی ”نیکی (صرف) یہی نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو بلکہ نیکی تو ان لوگوں کی ہے جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں اور آسمانی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور اس کی محبت میں رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں اور غلاموں کے آزاد کرنے میں (اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا) مال دیں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جو عہد اور وعدہ کر کے اپنے عہدوں اور وعدوں کو پورا کرنے



والے ہیں اور تنگدستی میں بیماری میں اور (دشمن اسلام کے ساتھ) لڑائی کے وقت صبر کرنے (یعنی ثابت قدم رہنے) والے بھی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔“ (بقرہ آیت: ۱۷۷)

### تقویٰ کی اہمیت اور اس کے فضائل!

تقویٰ اسلام کا ایک عظیم رکن ہے اور اسلام کی پوری عمارت دل کے اس جوہر تقویٰ پر کھڑی کی جاتی ہے اور جو شخص اپنے کرمات سے اس صفت کو جلا کر ختم کر دیتا ہے اس پر حق کے راستے بند ہو جاتے ہیں اگر ایسے شخص کے اعمال بظاہر نیک بھی ہوں تو بھی وہ وقتی اور خالص ریاکاری اور نمائشی اعمال ہوتے ہیں جو اس کے لئے نہ تو دنیاوی زندگی میں راحت و سکون اور اطمینان کا ذریعہ بن سکتے ہیں اور نہ آخرت میں بلکہ یہی نمائشی اعمال اس کی قلبی بے چینی و بے قراری اور آخرت کی آگ کو اور زیادہ گرم کر دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف اسی عمل کی قدر ہے جو تقویٰ سے پیدا ہو چکا ہو اور اس کے برگ و بار تقویٰ سے لگے ہوں!

اللہ تعالیٰ کو صرف وہی عمل مقبول ہے جو انسان کے تقویٰ سے پیدا ہو چکا ہو اور اس کے برگ و بار میں اسی تقویٰ کی روح دوڑ رہی ہو چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لِحُومَهَا وَلَا دِمَاءُهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ﴾

”پس اللہ تعالیٰ کو نہ (ان قربانی کے جانوروں) کے گوشت پہنچتے ہیں اور نہ خون بلکہ اس کو تو صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔“ (الحج: آیت ۳۷)

مطلب یہ ہے کہ جانور کو ذبح کر کے محض گوشت کھانے اور کھلانے یا اس کا خون گرانے سے تم اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کبھی حاصل نہیں کر سکتے نہ یہ خون و گوشت اٹھ کر اس کی بارگاہ تک پہنچتا ہے نہ یہ طریقہ اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو گوشت و خون کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ کے یہاں تو تمہارے دل کا تقویٰ اور تمہارا قلبی خلوص پہنچتا ہے کیونکہ جانور کی قربانی ایک علامتی فعل ہے یہ قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی یادگار ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کر کے اپنے محبوب فرزند حضرت اسماعیل علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیش کیا اور اس کی اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ مسلمان کو ہر وقت اپنی عزیز سے عزیز چیز اپنے رب کی خاطر اور دین اسلام کی خاطر قربانی کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے اور مسلمان اس قربانی کے ذریعے اس عزم اور جوش کا اظہار کرتے ہیں

کہ میں اللہ تعالیٰ کی دیے ہوئے مال واولاد اور عزت اور ہم خود اپنے آپ کو اس کی راہ میں اسی طرح قربان کرنے کے لئے تیار ہیں جس طرح اس جانور کو ذبح اور قربان کر رہے ہیں اور اگر قربانی کی یہ حقیقت سامنے نہ ہو اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے ساتھ محبت کا یہ جوش و خروش نہ ہو اور قربانی اور اعمال کے اندر للہیت اور خلوص کا جو ہر موجود نہ ہو اور آدمی صرف رسمی طور پر جانور کی گردن پر چھری چلا دے یا دین کا عمل صرف رسمی طور پر ادا کر دے تو گو اس نے ظاہر میں قربانی کر دی یا خدا پرستی کا عمل کر دیا لیکن فی الحقیقت وہ اس قربانی اور عمل کی روح سے بے خبر رہا حالانکہ اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کرنے والی چیز وہ روح اور اخلاص ہی ہے نہ کہ ظاہری عمل و رسم۔ لہذا دل میں جتنا خلوص ہوگا اور آدمی کی قربانی اور عمل پر تقویٰ کا رنگ جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی اس کی مقبولیت ہوگی اور وہ عمل و قربانی اس قدر روزنی اور آخرت میں کام آنے والی ہوگی اسی حقیقت کو قرآن مجید بار بار سامنے لایا ہے اور فرمایا ہے کہ:

﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾

”اللہ تعالیٰ تو صرف متقیوں اور پرہیزگاروں سے قبول فرماتا ہے۔“ (مائدہ: آیت ۲۷)

اس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں صرف وہی عمل قبول ہے جو تقویٰ سے پیدا ہو چکا ہو اور جس کے اندر اخلاص و تقویٰ کی روح دوڑ رہی ہو۔

**متقی لوگ ہی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں!**

متقی اور پرہیزگار شخص کو اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے اور جس قدر پرہیزگار ہوتا ہے اس قدر اللہ تعالیٰ کو محبوب اور اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز و کرم ہوتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں بار بار اس بات کو بیان فرمایا ہے کہ:

﴿فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾

”پس بلاشبہ اللہ تعالیٰ متقین اور پرہیزگاروں سے محبت رکھتا ہے۔“ (آل عمران: آیت ۷۶، توبہ: آیت ۴)

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ (حجرات: آیت ۱۳)

”بے شک تم میں سے زیادہ عزت والا اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہو۔“

**اللہ تعالیٰ متقی اور پرہیزگار کے ساتھ ہے!**

جو شخص متقی اور پرہیزگار ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی مدد اسی کے ساتھ ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہ

اسی بات کو بیان فرمایا ہے کہ:

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ ﴿وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾

”اور اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی) سے بچو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ پر ہیزگاروں کے ساتھ ہے۔“ (بقرہ: آیت

۱۹۲، توبہ: آیت ۳۶)

متقی اور پرہیزگار ہی اللہ تعالیٰ کا دوست اور ولی ہوتا ہے!

بزرگ اللہ تعالیٰ کا دوست اور ولی ہوتا ہے اور وہی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرتا ہے اور اس کی نافرمانی سے

پوری قوت سے پرہیز کرتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالْظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ﴾ (جاثیہ: آیت ۱۹)

”اور بے شک ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی پرہیزگاروں کا دوست اور مددگار ہے۔“

اور ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿إِنِّي أَوْلِيَاءُ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝﴾

”یاد رکھو بے شک اللہ تعالیٰ کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (یہ اولیاء اللہ) وہ لوگ

ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا۔“ (سورہ یونس: آیت ۶۲ تا ۶۳)

ولایت عامہ اور ولایت خاصہ!

ولایت کی بڑی بڑی قسمیں دو ہیں ایک ولایت عام جو ہر مؤمن کو اور مسلمان کو حاصل ہوتی ہے چنانچہ اللہ

تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ﴾

یعنی ”اللہ تعالیٰ مؤمنوں کا دوست ہے۔“ (آل عمران: آیت ۶۸)

اور دوسری قسم ولایت خاصہ ہے یہ وہ ولایت ہے جو اعلیٰ درجہ پر فائز ہونے والے متقی اور پرہیزگاروں کو

حاصل ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

دنیا کا سکون اور قلبی راحت اور مصائب سے نجات اور برکت والی روزی بھی متقی اور پرہیزگار

لوگوں کے لئے مقدر ہوتی ہے!

جو شخص اللہ تعالیٰ کے خوف سے چھوٹے بڑے گناہ چھوڑ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور تعلیمات پر

پورا عمل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں بھی قلبی سکون و اطمینان اور راحت اور آرام نصیب فرماتا ہے اس کی زندگی، روزی وغیرہ میں برکت ہو جاتی ہے گویا وہ دنیا میں رہ کر جنت کے آثار کو اپنے اوپر دنیا میں محسوس کرتا ہے جب کوئی مشکل آ جاتی ہے تو اس مشکل میں سے اللہ تعالیٰ اس کو راستہ دے کر اس کو نجات دے دیتے ہیں اور دنیا کی مصیبت اس کیلئے بسا اوقات دنیا میں ہی آخرت کی ترقی کا باعث بن جاتی ہے حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو کنوئیں گرا دیا گیا جیل اور قید میں ڈال دیا گیا اسی طرح کی ہر مصیبت جو بظاہر مصیبت نظر آرہی تھی لیکن ہر آنے والی ایک ایک مصیبت ان کیلئے دنیا میں ترقی پر ترقی کا سبب ہوئی اور آخرت تو ہوتی ہی پرہیزگاروں کے لئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ....﴾ (الطلاق: آیت ۲-۳)  
 ”اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے نافرمانی سے بچا اللہ تعالیٰ (تنگی اور مشکل حالات میں سے) اس کے لئے نجات کا کوئی راستہ نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے اس کا گمان بھی نہ ہو۔“  
 نیز اللہ تعالیٰ چند آیتوں کے بعد پھر فرماتے ہیں:

﴿.....وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا﴾ (الطلاق: آیت ۴)  
 ”اور جو شخص اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی) سے بچتا رہے اللہ تعالیٰ اس کے کام کو آسان کر دیتا ہے۔“  
 نیز اللہ تعالیٰ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ:

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾

”اور اگر بستی والے ایمان لے آتے اور تقویٰ (اور ہیزگاری) اختیار کرتے (یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہوں سے بچتے) تو ہم آسمان اور زمین سے برکتوں اور نعمتوں کے دروازے ضرور ان پر کھول دیتے لیکن انہوں نے (حق اور پیغمبروں کو) جھٹلایا تو ان کی کرتوتوں کی وجہ سے جو انہوں نے کیے تھے ہم نے پکڑ لیا (اور دنیا اور آخرت کی سخت سزا اور عذاب میں گرفتار ہو گئے۔)“ (سورۃ اعراف: آیت ۹۶)

آخری جیت اور انجام خیر اور آخرت کی خوشیاں صرف متقی لوگوں کے لئے مقدر ہیں!  
 متقی اور پرہیزگار شخص ہی ہے جس کے لئے انجام اور آخرت کی خوشیاں مقدر ہیں اور اسی کے لئے جنت ہوگی اور آخرت کی ابدی نعمتیں ہوں گی اور جو جس قدر متقی اور پرہیزگار ہوگا اسی قدر ابدی نعمتوں اور خوشیوں میں

ترقی پر ترقی کرتا ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید میں بار بار اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ:

﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾

”اور انجام خیر پرہیزگاروں ہی کے لئے ہوگا۔“ (سورہ اعراف: آیت ۱۲۸)

نیز ارشاد ہے:

﴿فَاصْبِرْ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ﴾

”پس صبر کرو بے شک بہتر انجام پرہیزگاروں ہی کے لئے ہوتا ہے۔“ (ہود: آیت ۴۹)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقَوٰی﴾

”بہترین انجام تقویٰ اور پرہیزگاری کے لئے ہے۔“ (طہ: آیت ۱۳۲)

نیز آخرت کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَعِبٌ وَلَهْوَ وَلِلْآٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ.....﴾

”اور دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور تماشہ ہے (یعنی ایک عارضی اور فانی چیز ہے) اور آخرت کا گھر

پرہیز کرنے والوں کے لئے بہتر ہے کیا پھر کیوں نہیں سمجھتے۔“ (انعام: آیت ۳۲)

اور جنت کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾

”اور اپنے رب پروردگار کی بخشش کی طرف دوڑو اور جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین جتنی

(آل عمران: آیت ۱۳۳)

ہے جو پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔“

اور ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۖ تَجْرٰی مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۖ كُلُّهَا ذَآٰئِمٌ وَّظِلُّهَا ۖ تِلْكَ عُقْبٰی

الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَعُقْبٰی الْكَافِرِيْنَ النَّارُ ۝﴾

”اس جنت کا حال جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے ایسا ہے کہ اس کے نیچے نہریں بہتی ہیں اس کے

پھل (اور میوے) اور سائے ہمیشہ رہیں گے اور یہ پرہیزگاروں کا انجام ہے اور کافروں کا انجام تو جہنم کی آگ

ہے۔“ (سورہ رعد: آیت ۳۵)

سورت مریم میں اللہ تعالیٰ جنت کی خوشیاں بیان کر کے آگے فرماتے ہیں کہ:

﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا﴾ (مریم: آیت ۶۳)

”یہ وہ جنت ہے کہ ہم اپنے بندوں میں سے اس کو وارث بنائیں گے جو پرہیزگار ہوگا۔“

قرآن مجید کی یہ چند آیتیں لکھ دی گئیں یہ بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں ورنہ جب یہ معلوم ہے کہ دین اسلام کے تمام اعمال کی بنیاد ہی تقویٰ پر ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی تمام تر تعلیمات پر عمل کرنا احکامات، فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات کو ادا کرنا جو اللہ تعالیٰ کی یاد سے ذرہ برابر بھی غافل کر دے تو قرآن مجید میں جو کچھ بھی فضائل ہیں وہ سب کے سب پرہیزگاروں ہی کے لئے ہیں خواہ وہ اخلاق ہوں جیسا کہ صبر و شکر وغیرہ یا ظاہری اعمال میں سے ہوں جیسا کہ نماز، روزہ، جہاد وغیرہ یہ سب کے سب اسی شجرہ تقویٰ کے عمل، شاخیں اور پھول و پتے ہیں اور یہی جو ہر تقویٰ ہے جس کی بدولت انسان اللہ تعالیٰ کا دوست بن جاتا ہے اور یہی تقویٰ ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا محبوب اور مقرب بندہ اور اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز و مکرم بن جاتا ہے اور یہی تقویٰ ہے جس کے اعلیٰ درجہ کو احسان کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اعلیٰ سے اعلیٰ تقویٰ اور پرہیزگاری نصیب فرمادے۔ آمین

متقی اور پرہیزگار فرماست والا ہوتا ہے!

جو شخص جس قدر متقی اور پرہیزگار ہوگا اسی قدر وہ فراست والا ہوگا اور اس قدر وہ حق، باطل میں مفید اور غیر مفید میں فرق کر سکے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ایسا نور اور بصیرت عطا کی جاتی ہے جس پر وہ ہر چیز کو پرکھ لیتا ہے اور معلوم کر لیتا ہے کہ یہ حق ہے یا باطل کھوٹا ہے یا کھرا مفید ہے یا غیر مفید چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ

دُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾

”اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی) سے بچتے رہو اللہ تعالیٰ تم میں حق و باطل میں تمیز کی قوت پیدا کر دے گا اور تم سے تمہارے گناہ دور کر دے گا اور تمہیں بخش (اور معاف) کر دے گا اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے۔“ (سورت انفال: آیت ۲۹)

فرقان ایک روشنی ہے جس سے حق و باطل مفید اور غیر مفید ہدایت اور گمراہی کا واضح امتیاز ہو جاتا ہے یہ فرقان تقریباً وہی چیز ہے جس کو معرفت یا بصیرت کہا جاتا ہے بصیرت کسی آدمی میں وہ اندرونی روشنی پیدا کرتی ہے اور وہ ظاہری پہلوؤں سے دھوکہ کھائے بغیر ہر بات کو اس کے اصل روپ میں دیکھتا ہے۔

## متقی مومن کی نگاہ!

انسان کی نگاہ جس قدر آگے مستقبل پر ہوتی ہے اس کی نگاہ میں اسی قدر قوت و گہرائی ہوتی ہے اور جہاں تک نگاہ جاتی ہے وہاں تک کی چیز اس پر کھول دی جاتی ہے ذرا غور کیجئے آدمی کی نگاہ اگر صرف عارضی لذت اور راحت پر ہوتی ہے تو اس پر صرف اپنی عارضی لذت و راحت حاصل کرنے کی چیز اور اسباب کھلتے ہیں اس سے آگے کے حقائق اور زندگی کے غم اور خوشیاں اس پر پوشیدہ رہتی ہیں اور جس شخص کی نگاہ دنیا میں عزت حاصل کرنے پر نہیں ہوتی تو عارضی لذت و سکون کی چیزیں مثلاً نشہ آور چوری اور عزت کو نقصان پہنچانے والی چیزوں سے اجتناب کرے گا اس کی نظر پہلے کے مقابلے میں زیادہ تیز ہوگی اور اس کی نگاہ پہلے کے مقابلے کچھ زیادہ آگے آنے والے دنوں پر ہوتی ہے اس لئے اس کی نگاہ نشہ آور چیزوں اور شہوانی جذبات وغیرہ کے نقصانات کو اچھی طرح معلوم کر لیتی ہے اور ان سے بچتا رہتا ہے۔ اسی طرح جس کی نگاہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و قوت اور اس کی صفات اور آخرت پر ہوتی ہے تو اس کی نگاہ اس قدر تیز ہوتی ہے کہ آج سے لے کر آخرت تک کی نقصان دہ چیزیں اس کے سامنے آ جاتی ہیں اور وہ حق و باطل میں امتیاز کر لیتا ہے اگر ایک آدمی کی نظر کمزور ہے صرف ایک گز کے فاصلے پر لگتی ہے ظاہر ہے کہ اس پر صرف ایک گز کی حد تک چیزیں منکشف ہوں گی اور ایک گز کے آگے جو گڑھے اور خطرات ہیں وہ اس پر چھپے رہیں گے اگر کسی کی نظر ایک میل دور تک جاتی ہے تو اس پر ایک میل تک کی چیزیں کھلیں گی اور اس سے آگے کی چیزیں اس کی نظروں سے غائب رہیں گی۔ یہی حال دنیا والوں اور آخرت والوں کا ہے دنیا پرستوں کی نگاہیں صرف دنیا کی حد تک محدود رہتی ہیں ان کے فیصلے اور کام دنیاوی مفادات اور جذبات باطلہ کے تحت ہوتے ہیں وہ حق و باطل کو نہیں پرکھ سکتے اس کے برعکس آخرت والوں کی نگاہیں ان حضرات کی بقدر تیز ہوتی ہے اور وہ حق و باطل کی خوشبو اور بدبو کو پالیتے ہیں۔ بلاشبہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کے غضب سے ڈرتا ہے اور وہی کرتا رہتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور اس سے بچتا رہتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے تو یہ خوف و تقویٰ اس کی اندرونی صلاحیتوں کو پیدا کرتا ہے اور وہ حد درجہ حقیقت پسند بن جاتا ہے اور یہ تقویٰ اس کے ذہن کے تمام پردوں کو اس طرح ہٹا دیتا ہے کہ جس کی وجہ سے حق و باطل صحیح و غلط مفید اور غیر مفید میں امتیاز اور فرق کرنے لگتا ہے اور یہی علمی اور بصیرتی فرقان کے ثمرات عملی میدان میں بالآخر آ جاتے ہیں اور بالآخر عام لوگوں پر بھی یہ بات کھل جاتی ہے کہ جو کچھ یہ صاحب بصیرت کہتے تھے وہی بات حق اور سچ تھی اسی طرح بالآخر متقی عملی میدان میں جیت جاتا ہے اسی حقیقت کو نبی کریم ﷺ نے عام فہم انداز میں اختصار کے ساتھ بیان



فرمایا ہے، چنانچہ حضرت امامہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ:

(اتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللَّهِ)

”مومن کی فراست سے بچو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے۔“ (رواہ الطبرانی واسنادہ حسن مجمع

الزوائد: ج ۱۰ ص ۲۶۸)

اس حدیث کو ترمذی نے حضرت ابوسعید خدری ؓ سے بھی روایت کیا ہے خلاصہ یہ کہ تقویٰ پر نیکی کی بنیاد ہے اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ اور دنیا و آخرت کی تمام سعادتوں کا راز اسی تقویٰ میں ہے تمام اسلاف نے تقویٰ کے ذریعہ ہر بھلائی حاصل کی اور ان کی ہر کامیابی کا راز اسی صفت تقویٰ کے اندر پنہاں تھا اور اس کی وجہ سے دشمنوں پر غالب آجاتے تھے اور لوگوں کے دلوں کو اسی کے ذریعے فتح کرتے تھے اور تمام ترفوتحات اسی تقویٰ کی برکت سے انہیں حاصل ہوئیں اور اسی کی وجہ سے وہ پوری دنیا پر غالب آ گئے۔

تقویٰ کو کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے؟

(۱) یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ تقویٰ کا مرکز دل ہی ہے اور جسم کے تمام تراعمال و افعال کے کا دار و مدار دل کی اصلاح اور درستگی پر ہے تو یاد رہے کہ دل کی اصلاح اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات پر کامل یقین اور اس کے حاضر ناظر ہونے کا ہمہ وقت خیال نہ ہو اور یہ کیفیت عموماً بغیر مشق کے حاصل نہیں ہوتی ہے جس طرح انسان کی بدکاری، بری تعلیم، بری صحبت اور برے کاموں کی مشق اور کثرت سے بڑھتی جاتی ہے اسی طرح اچھے کاموں کی مشق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے اور اس کی قلبی کیفیت میں ترقی ہوتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادْهُمْ هُدًى وَاتَّبَعَتْهُمْ تَقْوَاهُمْ﴾

”جو لوگ راہ پر آئے اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت اور بڑھائی اور ان کو ان کا تقویٰ عطا کیا۔“ (محمد: آیت ۱۷)

اس لئے تقویٰ کو قصداً اختیار کیا جائے گا جس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حلال اور حرام کردہ اور مشتبہ چیزوں کو معلوم کیا جائے اور اپنی پوری زندگی کو بہت احتیاط سے گزاریں تاکہ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی ایسا عمل نہ ہونے پائے جو اللہ تعالیٰ کو ذرہ برابر ناپسند ہو، بلکہ ان مباح چیزوں کی کثرت استعمال سے بھی پرہیز کریں جن کی زیادہ استعمال سے حرام و مکروہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کریں۔ (اس کی تفصیل ان شاء اللہ ذکر اللہ کے بیان میں آجائے گی) ہر



وقت زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ترک کرنے کی کوشش کریں۔

اور تمام بدن کو اللہ تعالیٰ کی امانت سمجھ کر اس کے ہر عضو کو اللہ تعالیٰ کے خوشنودی میں استعمال کریں، زبانی ذکر کے ساتھ عملی ذکر کا خوب اہتمام کیا جائے۔

(۳) ریاضت کی راہ کو اختیار کریں یعنی حسب توفیق روزے رکھیں کم خوراک کریں، نیند کو کم کریں اور ابتدائی مراحل میں لوگوں سے اختلاط ملنا جلنا کم کر دیں اور باتوں کو اس قدر کم کر دیں کہ بغیر ضرورت کے کوئی بات زبان سے نہ نکالیں عرض یہ کہ نفس کو سخت کاموں کا عادی بنانے کی حتی الوسع کوشش کریں۔

(۴) غیر متقی بدکاروں، دنیا پرستوں اور غافل لوگوں کی صحبت سے پرہیز کریں اور سچائی کے ساتھ دین اسلام پر چلنے والوں اور پرہیزگاروں کی صحبت میں رہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ (کی نافرمانی) سے بچتے رہو اور سچوں کے ساتھ رہو۔“ (توبہ: آیت نمبر ۱۱۹)

قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اور (رسول اللہ ﷺ) کے بہت سے ارشادات اور حدیثوں میں مختلف انداز سے اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ سچے اور پاکیزہ لوگوں کی صحبت اور محبت کو اختیار کیا جائے اور برے لوگوں کی صحبت اور ان کی دوستی و محبت سے پرہیز کیا جائے۔

(۵) تقویٰ کا اعلیٰ درجہ اور احسانی کیفیت کے حاصل کرنے کا آسان اور بے ضرر راستہ ”سلوک و احسان“ تزکیہ یا راہ تقویٰ ہے جس کو اصطلاح میں ”تصوف“ کہا جاتا ہے اس کو اپنایا جائے اور کسی مسلمان متقی پرہیزگار، صاحب دل اور روحانی امراض اور علاج سے واقف اور ماہر شخص کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا جائے اور جو علاج وہ تجویز کرے اس پر اہتمام سے عمل کیا جائے تجربہ یہی ہے کہ جو شخص جستجو اور اللہ تعالیٰ کا طالب اور اپنی جستجو میں سچا اور پکا ہو وہ اس راستے کو اپنا کر بہت جلد ہی اپنا مقصود پالیتا ہے اس کی پوری تفصیل تصوف کے بیان میں موجود ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے فضل و کرم سے اپنا سچا اور صحیح تعلق نصیب فرمائے اور تقویٰ کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات پر پہنچائے۔ (آمین)

### اخلاص نیت کا بیان!

لغت میں نیت کے معنی دل سے قصد اور ارادہ کرنے آتے ہیں اور یہی چیز کسی عمل کے مقصد کا تعین کرتی ہے اور یہی چیز ہے جو کسی عمل کا باعث اور محرک ہوا کرتی ہے۔ لیکن شریعت مطہرہ کی خاص اصطلاح میں صرف ارادہ اور قصد کو نیت نہیں کہا جاتا بلکہ ارادہ اور قصد کے ساتھ جب عبادت کو غیر عبادت سے یا عادت کو غیر عادت سے یا ایک عبادت کو دوسری عبادت سے ممتاز کرنا مقصود ہو تو یہ نیت کہلائے گی مثلاً ایک شخص دن بھر کھانے پینے وغیرہ سے پرہیز کرتا ہے، اب اس پرہیز کی متعدد وجوہات ہو سکتی ہیں۔ مثلاً حکیم نے ہر طرح کھانا پینا کچھ وقت کیلئے بند کیا ہے یا اس کی عادت ہے کہ صرف مغرب کے بعد کھاتا پیتا ہے اور دن بھر اس کو کسی چیز کے کھانے کا شوق ہی نہیں یا پیٹ خراب ہے وغیرہ وغیرہ اور ایک وجہ پرہیز کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کے لئے عبادت کے طور پر کھانے پینے وغیرہ سے پرہیز کیا جائے تو یہاں یہ آخری قصد و ارادے نے عبادت کو عادت سے جدا کر دیا۔ اسی کو اصطلاح میں نیت کہتے ہیں۔ اسی طرح کوئی ظہر کی نماز کی نیت کرتا ہے تو وہ اس نیت سے دوسری عبادت مثلاً عصر کی نماز وغیرہ کو الگ کر دیتا ہے۔

### اخلاق میں نیت کی اہمیت!

اخلاق کے متعلق جب یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ ان کا تعلق انسان کے باطن اور اندر سے ہے اور افعال و اعمال انہی اندرونی کیفیات اور جذبات کے مظاہر، ثمرات، علامات اور نشانیاں ہیں تو اس سے یہ بات بھی خود بخود معلوم ہو گئی کہ اخلاص تقویٰ کا رکن اعظم ہے اور اخلاق کی بحث میں ارادہ اور نیت کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ اگر نیت صحیح نہیں تو بڑے بڑے اخلاقی کام اور بظاہر بڑے بڑے نیک کام حسن خلق اور نیکی کے دائرے سے خارج ہو جاتے ہیں اور ایسے بے روح کاموں کا نتیجہ آخرت میں نقصان اور خسران کے سوا کچھ نہیں بلکہ دنیا میں بھی وہ عمل کوئی دنیاوی تعریف و ستائش کے قابل نہیں اور نہ اس کے خاطر خواہ اچھے نتائج نکلتے ہیں بلکہ جس عمل میں اخلاص کی روح موجود نہ ہو تو ایسے بے جان اعمال اور بڑے بڑے کام معاشرے میں بھی اصلاح کے بجائے بگاڑ کا سبب بن جاتے ہیں اور ایسا بے جان ڈھانچے فائدے کے بجائے معاشرے کو مزید بدبودار کر دیتے ہیں۔

### بری نیت سے درست عمل بھی فساد برپا کرے گا!

کیونکہ بری نیت کی وجہ سے صرف اعمال ہی بے جان نہیں بن جاتے بلکہ بری نیت کی وجہ سے عمل کا جو ڈھانچہ اور جسم وجود میں آتا ہے، وہ ڈھانچہ اور جسم ہی اپنی ظاہری چمک دمک کے باوجود جس بری نیت سے بن چکا

ہے اسی بری نیت کے برے اثرات دنیا اور معاشرے پر بھی پڑیں گے، کیونکہ ہر اختیاری عمل جس ارادہ اور نیت سے وجود میں آتا ہے، وہی ارادہ اور نیت اسی عمل کا اصل مواد ہوتا ہے اور عمل اس کی صورت اور شکل ہوا کرتی ہے اب اگر نیت، ارادہ اور مواد ہی فاسد ہے تو شکل، صورت خواہ کیسی اچھی ہی کیوں نہ ہو تو اس سے صرف یہ نہ ہوگا کہ آخرت میں اس کا فائدہ نہ ہوگا بلکہ اس کے برے اثرات معاشرے اور قوم پر بھی پڑیں گے۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ جو شخص زہر قاتل کو عطر کی شکل میں، دودھ کے رنگ میں، شربت کی صورت میں یا دوا کی صورت اور نام میں پیش کرتا ہے وہ بہر حال زہر قاتل ہی ہے اور اس کا نقصان صرف اس کے پیش کرنے والے تک محدود نہ ہوگا بلکہ بظاہر خوشبو اور مٹھاس وغیرہ فائدے کے باوجود ایسا شخص معاشرے اور قوم کو بھی نقصان پہنچا رہا ہے اور یہ زہر قاتل بہر حال انسانی وجود کے لئے خطرناک ثابت ہوگا کیونکہ ان صورتوں اور شکلوں اور ناموں پر پیش کرنے والی چیز کا مواد ہی مہلک اور نقصان دہ ہے۔

اسی طرح اگر کوئی بظاہر اچھا کام کرتا ہے مثلاً فقیروں کی امداد کرتا ہے، لیکن اس کا ارادہ اور نیت فاسد ہے، مثلاً نیت یہ ہے کہ لوگ مجھے بڑا شخص مان لیں تو ایسی صورت میں بظاہر چند فقیروں کو مالی فائدہ ہونے کے اس شخص کے اس عمل سے بھی باہمی اخوت، الفت اور رحم کے جذبات معاشرے میں نہیں بڑھیں گے بلکہ اس سے کبر و بڑائی اور ناچاقی اور بے رحمی کے جذبات کا فروغ ہوگا۔ دیکھئے بعض اوقات لوگ مال کو پانی کی طرح بہا دیتے ہیں، مثلاً انتخابات کے موقع پر امیدوار فقیروں اور غریبوں کی خوب امداد کرتا ہے، لیکن چونکہ نیت فاسد ہوتی ہے اس لئے مودت اور مہربانی سے معاشرہ بننے کے بجائے بگڑتا ہے۔ اسی طرح بری نیت کے برے اثرات صرف اس بری نیت والے پر نہیں پڑتے بلکہ اس کے غلط اثرات معاشرے پر بھی پڑتے ہیں اگرچہ ان غلط اثرات کا علم نہ ہونے کی وجہ سے ہم دوسری چیزوں کی طرف منسوب کریں، تاہم اس کا زیادہ تر تعلق دلوں اور نیتوں کے فساد سے ہوتا ہے۔

**ٹھیک نیت کے ساتھ برا عمل بھی سخت خطرناک ہے!**

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات کوئی برا عمل ٹھیک نیت سے کرتا ہے، ایسی صورت میں اس ٹھیک نیت کا فائدہ معاشرے کو بھی پہنچنا چاہئے اور اس پر ٹھیک نیت کرنے والے کو بھی فائدہ اور ثواب ملنا چاہئے۔ مثلاً کوئی شخص چوری صرف اس نیت اور ارادہ سے کرتا ہے کہ اس کی وجہ سے فقیروں کی امداد کرے، گویا ایسی صورت میں چوری کا ختم یا مواد فقیروں کی ہمدردی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اس کے ایک طرف جذبات تو اچھے ہیں لیکن دوسری طرف اس کے جذبات برے بھی ہیں کیونکہ جس طرح فقیروں کی امداد کرنا ایک اچھا جذبہ ہے، اسی

طرح چوری، ڈاکہ ظلم کے جذبات اپنے اندر لئے ہوئے ہے ورنہ اگر یہ چوری و ڈاکہ کر کے فقیروں کی امداد کر سکتا ہے، تو یہ ایسا بھی تو کر سکتا ہے کہ محنت مزدوری کر کے کمائے اور پھر اس سے فقیروں کی امداد کرے لیکن اس کے اندر حرص اور ظلم کے جذبات بھی ہیں جس کی وجہ سے وہ دوسروں کے اموال کو چراتا ہے یا غصب کرتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کوئی زہر گوندھ کر اس کے برتن بنائے اور پھر اس زہریلے برتن میں دودھ ڈال کر پیش کرے، ایسی صورت میں یہ شخص بعض اوقات دگنے جرم کا ارتکاب کرتا ہے، ایک تو زہری وجہ سے لوگوں کو نقصان پہنچا رہا ہے اور دوسری طرف دودھ کو بھی ضائع کر رہا ہے۔ اسی طرح اچھی نیت کے ساتھ برے عمل کو سمجھئے کہ بسا اوقات اچھی نیت کے ساتھ برے عمل کرنے میں دگنا جرم ہوتا ہے اور یہ جرم اس وقت اور بھی سخت اور خطرناک ہو جاتا ہے کہ اس برے عمل اور کام کو شرعی جواز کے بغیر حلال سمجھا جائے کہ ایسی صورت میں شرعی حرام کو حلال سمجھنا کفر اور احکامات الہی سے بغاوت کی بات ہوگی۔

اس پوری تفصیل سے جو بات معلوم ہوئی وہ یہ کہ اختیاری اعمال کا مواد انسان کا ارادہ اور نیت ہے اور صحیح و درست عمل وہی ہے جس کا جسم اور ڈھانچہ بھی صحیح ہو یعنی وہ کام بھی اچھا ہو اور اس عمل کی یہ اچھی صورت جس نیت اور جذبے سے وجود میں آ چکی ہو، وہ بھی بالکل صحیح اور درست ہو اور جو عمل برا ہو لیکن اس کا وجود اچھی نیت سے بن چکا ہے تو ایسی صورت صحیح مواد کو غلط اور ظلم کے زہریلے مواد سے خلط ملط کرنا یا اپنی ٹھیک نیت اور مواد کو زہریلی چیزوں میں پیش کرنا ہے تو ایسا عمل بعض حالات میں برا اور بعض حالات میں بدترین اور بعض حالات میں انتہائی سخت گھناؤنا جرم بن جاتا ہے اور جو شخص اچھا عمل بری نیت سے کرتا ہے تو ایسی صورت میں یہ شخص اور بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے کہ وہ زہریلے مواد کو اچھی صورت میں پیش کر کے قوم اور معاشرہ کو برباد کر دیتا ہے اور یہی وہ نفاق اور ریا کاری ہے جس کے ادنیٰ سے اعلیٰ تک بے شمار درجات ہو سکتے ہیں جیسا کہ اس کا بیان کتاب الایمان میں موجود ہے۔

نیت بھی ٹھیک ہے اور عمل بھی درست، لیکن اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان نہیں تو یہ عمل

آخرت کے لحاظ سے بیکار ہے!

رہی یہ بات کہ ارادہ بھی ٹھیک ہے اور عمل بھی درست اور اچھا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہیں یعنی دین اسلام کو قبول نہیں کیا ہے تو ایسے عمل کے متعلق کیا کہا جاسکتا ہے؟ مثلاً کسی غیر مسلم کو مخلوق پر ترس اور

رحم آجاتا ہے اور وہ اسی ترس اور رحم کے جذبے سے فقراء اور ناچار لوگوں کی امداد کرتا ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ ایک غیر مسلم رحمدل ہو سکتا ہے اور وہ اس رحمدلی کی بنیاد پر لوگوں کے ساتھ مدد کرتا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ ایسے عمل کا فائدہ دنیا میں اسی رحمدل کو بھی ہو سکتا ہے اور دنیا والوں پر اور معاشرہ پر بھی کچھ اچھے اثرات پڑ سکتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے، ایسے شخص میں اگر دوسرے سخت امراض نہ ہوں تو اکثر ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ جاتے ہیں اور دین اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں لیکن دوسری بد بختیوں کی وجہ سے کوئی اسلام سے محروم رہ جاتا ہے اور کفر کی حالت میں دنیا سے چلا جاتا ہے تو پھر اس شخص کے عمل کی بنیاد چونکہ ایمان نہیں ہے جو اس عمل کی روح اور بنیاد ہے تو ایسی صورت میں اس عمل کا دنیاوی فائدہ تو ہوگا لیکن روح اور بنیاد سے خالی ہونے کی وجہ سے دائمی طور پر کارگر ثابت نہ ہوگا اور آخرت میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

### نیت اور عمل کے صلاح و فساد کا خلاصہ!

اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہوا کہ اختیاری اعمال میں بڑی بڑی چار صورتیں بن گئیں:

(۱) مواد یعنی نیت اور ارادہ بھی صحیح ہوں اور اس سے بننے والا وجود اور ڈھانچہ یعنی عمل بھی صحیح اور درست ہو اور ایسا عمل کرنے والا مؤمن بھی ہو، تو جس شخص کے جس قدر جذبات اور ارادے نیک اور اچھے ہوں اور جس قدر ایمان و یقین اور رضائے الہی میں زیادہ پختہ ہو، اسی قدر اس کے اعمال وزنی ہونگے۔ دنیا اور آخرت دونوں لحاظ سے اسی قدر صحیح اور اچھے نتائج برآمد ہونگے۔

(۲) نیت و ارادہ ٹھیک جذبات سے کام کر رہا ہے اور وہ کام بھی ٹھیک اور درست ہے لیکن مسلمان نہیں، تو دنیا کے لحاظ سے فائدہ ہوگا، اگر ایسا شخص کفر کی حالت میں مرا تو بنیاد اور ایمان نہ ہونے کی وجہ سے آخرت میں اس کے اعمال بے کار ہونگے اور ایسا شخص بھی آخرت کے لحاظ سے گھائے اور نقصان میں ہوگا۔

(۳) ایمان بھی ہے اور جذبات و ارادے بھی اچھے ہیں، لیکن بری اور غلط شکل میں اس کو پیش کرتے ہیں، اس سے کام کی نوعیت اور غلط ہونے کے لحاظ سے اسی قدر بد نتائج دنیا میں برآمد ہونگے اور بعض صورتوں میں بدترین جرائم کا مرتکب ہوگا۔ جس کی وجہ سے آخرت میں بھی نقصان اٹھائے گا۔

(۴) نیت فاسد اور خراب ہے لیکن اس کی ریاکاری کی وجہ سے وہ اس کو ٹھیک اور درست جسم اور ڈھانچے میں پیش کرتا ہے، یعنی دھوکہ دہی اور ریاکاری کیلئے اچھا عمل کرتا ہے تو ایسے شخص کا یہ عمل دنیا کے لحاظ سے بھی معاشرے اور قوم کے لئے نتائج کے لحاظ سے فائدہ مند نہیں اور آخرت میں تو نقصان ہی نقصان ہے۔ پھر جس قدر ریاکاری

زیادہ ہوگی اسی قدر اس کے دنیاوی و اخروی نقصانات بھی زیادہ ہونگے۔

**آج کل ظاہری نیک اعمال کے باوجود فساد کی وجہ نیتوں کا فساد ہے!**

آج کل اکثر قوموں اور ملکوں، قبیلوں اور گھروں میں بلکہ بظاہر دیندار معاشرے کو اگر غور سے دیکھئے تو ان کے درمیان اخوت اور الفت کے آثار کو بہت کم پائے جاتے ہیں اور ظاہری طور پر اچھے اور عمدہ کاموں کے باوجود معاشرے میں فساد بڑھ رہا ہے۔ اسکی ایک بڑی وجہ نیتوں کا فساد ہے اور درست اعمال کے ڈھانچوں میں بری نیتوں کی نجاست معاشرہ کو بدبودار کرتا ہے اور معاشرے میں کینسر کی طرح ریا کاری اور ظاہر داری اور نمائش اور حرص و لالچ کی وبا پھیل رہی ہے جس کی وجہ سے انسانوں کے دلوں میں الفت و اخوت اور رحمت کے جذبات کے بجائے منافقت، تنفر اور خود غرضی کے جذبات بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ ریا کاری اور بے اخلاصی کے دنیاوی نقصانات ہیں اور اس کے جو غلط اثرات ریا کاروں کی آخرت کی ابدی زندگی پر پڑتے ہیں وہ تو اس قدر گھناؤنے ہونگے جس کا تصور بھی اس دنیا میں نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا مزید بیان ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آجائیگا۔

**اخلاص یا خالص نیت کا بیان!**

اخلاص یا خالص اس چیز کو کہتے ہیں جس میں کسی دوسری جنس کی آمیزش اور ملاوٹ نہ ہو مثلاً ہم کہتے ہیں کہ یہ دودھ خالص ہے، یہ گھی خالص ہے یا یہ شہد خالص ہے یعنی ان میں کسی دوسری جنس کی کوئی ملاوٹ اور آمیزش نہیں ہے۔ چونکہ اخلاص کا اصل انسان کا ارادہ اور نیت ہے اور نیت میں ہی اخلاص ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نیت صرف ایک ہی چیز کی ہو اور صرف ایک ہی چیز اس کام اور عمل کا محرک بنے اور اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نیت خالص ہو، اس میں سوائے رضائے الہی کے اور کسی چیز کی آمیزش نہ ہو یعنی درست اور ٹھیک کام کو اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے سوا ہر غرض سے پاک رکھا جائے، نہ تو اس میں دکھاوے کی بو پائی جائے اور نہ جسمانی راحت اور نہ کوئی دوسرا ذاتی مفاد اس میں پایا جائے۔ اگر کسی عمل کا محرک صرف رضائے الہی نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ دوسری جنس کی نیت بھی پائی جائے تو یہ عمل خالص نہ رہے گا اور عمل میں جس قدر رضائے الہی کے سوا نیت پائی جائیگی، اسی قدر وہ عمل خالص نہ رہیگا۔

**ہر عمل کی مختلف نیتیں ہو سکتی ہیں!**

بلاشبہ انسان کے ہر عمل کا محرک پست سے پست اور بلند سے بلند ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک انسان کسی دوسرے

کے ساتھ تعاون کرتا ہے تو اس تعاون اور امداد کے مختلف اور کئی اغراض ہو سکتی ہیں:

- (۱) تاکہ وہ اس سے خوش ہو کر اسکی مالی امداد کرے۔
  - (۲) تاکہ لوگوں میں مشہور ہو جائے کہ بہت بڑا خدمت گزار ہے تو وہ انتخابات میں اسی کے حق میں ووٹ ڈال دیں گے۔
  - (۳) یا لوگ اس کو متواضع اور بااخلاق و دیندار شخصیت جان کر اس کی عزت اور احترام کریں گے۔
  - (۴) یا لوگوں کے ساتھ تعاون اس لئے کرتا ہے تاکہ کل اسکے ساتھ بھی وہ تعاون کریں۔
  - (۵) یا وہ لوگوں کی خدمت سے طبعاً خوش ہوتا ہے اور اسی لئے تعاون و خدمت کرتا ہے تاکہ لوگوں کی خدمت کر کے اپنی خوشی کا سامان کرے۔
  - (۶) یا اس کا تعاون کسی انسان سے محبت کی وجہ سے ہو۔
  - (۷) یا اس کو پہلے احسان کا بدلہ دینا مقصود ہو۔
  - (۸) یا اس شخص کے دل میں رحم و مہم و ترس زیادہ ہو تو جب ہی وہ کسی کو تکلیف اور مشقت میں دیکھتا ہے تو اس کا ہاتھ بٹاتا ہے۔
  - (۹) یا اس کے تعاون اور خدمت سے مقصود صرف و صرف خالق کائنات اللہ رب العالمین کی رضا و خوشنودی ہو۔
  - (۱۰) یا مقصود یہ ہو کہ اس کام کی وجہ سے جنت مل جائیگی۔
- اسی طرح ایک ہی کام کی کئی مختلف اغراض ہو سکتی ہیں جو ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ کی طرف بہت سے درجات پر تقسیم ہو سکتی ہیں اور جو نیت اور غرض جس قدر ذاتی اور نفسانی خواہش کے رنگ میں رنگی ہو وہ اس قدر پست اور جو جس قدر ذاتی اور نفسانی غرض سے پاک ہو، وہ اس قدر قابل قدر اور بلند ہوگی۔
- پھر انسانوں کی اغراض اپنی قوت اور ضعف کے لحاظ سے بھی ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک بے شمار درجات میں تقسیم ہو سکتی ہیں۔ مثلاً کوئی زیادہ لالچی ہوتا ہے، کوئی کم۔ کوئی زیادہ متقی پاک باز ہوتا ہے اور کوئی اس سے کم۔ یہاں ایک بات یہ بھی یاد رہے کہ جنت کے حصول کیلئے کوئی کام کرنا اسلامی تعلیمات کے مخالف نہیں اور یہ بھی بہت ہی اعلیٰ مقصد ہے، لیکن سب سے اعلیٰ مقصد اور بلند ترین مقصد یہ ہے کہ ہر کام صرف و صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کیلئے کیا جائے اور اسکے ایمان و یقین اور معرفت الہی کے بقدر ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ بے شمار درجات ہو سکتے ہیں۔ جو شخص جس قدر ایمان و یقین اور معرفت الہی میں بڑھا ہوا ہو اس کا اخلاص و یقین اس کے بقدر روزنی اور بڑھا ہوا ہوگا



اور اسی قدر اس کے اعمال وزنی ہونگے۔ مثلاً عام صحابہ کرام ؓ کے ایمان و یقین اور ان کے خلوص کا یہ حال تھا کہ ان کے متعلق آپ ﷺ فرماتے ہیں:

(لَا تَسْبُوا أَصْحَابِي فَلَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدًّا أَحَدِهِمْ وَلَا نِصْفَهُ)

”تم میرے صحابہ (ؓ) کو برا نہ کہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص اُحد کے پہاڑ کے برابر سونا (اللہ تعالیٰ کی راہ میں) خرچ کر دے تو اس کا ثواب میرے صحابہ ؓ کے ایک مُد (یعنی ایک صاع کے چوتھائی حصہ) یا آدھے مُد (یعنی صاع کے آٹھویں حصہ) کے برابر بھی نہیں پہنچ سکتا۔“ (صحیح بخاری و مسلم)

جب عام صحابہ کرام ؓ کے خلوص کا یہ حال ہے تو خاص صحابہ کرام ؓ اور خلفائے راشدین کے خلوص کی شان کیا ہوگی؟ غرض اعمال کا وزن ایمان و یقین اور خلوص کے بقدر ہوتا ہے اور جس عمل میں جس قدر اخلاص ہوگا، اسی قدر اعمال وزنی ہونگے۔

اب اخلاص کے فضائل اور ریا کاری کی مذمت اور وعیدوں کو پڑھ لیجئے۔

قرآن مجید میں اخلاص کے فضائل اور ریا کاری کی مذمت!

اخلاص کے فضائل اور ریا کاری کی مذمت قرآن مجید کی بہت سی آیات میں آئی ہے۔ ان میں سے چند کو پیش کرتے ہیں:

(۱) ﴿وَمَا تَنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ﴾

”اور تم اللہ تعالیٰ ہی کی رضا مندی کے لئے خرچ کرتے ہو۔“ (البقرة: آیت ۲۷۲)

(۲) ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يُشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَؤُوفٌ بِالْعِبَادِ﴾

”اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی جان بھی بیچ ڈالتے ہیں (یعنی جو اپنے پروردگار کے رضا جوئی کیلئے اپنا تن من دھن قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے۔“ (البقرة: آیت ۲۰۷)

(۳) ﴿وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا﴾ (النساء: آیت ۱۱۴)

”اور جو لوگ یہ کام اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کیلئے کرے تو ہم انہیں اجر عظیم دیں گے۔“

ان آیات سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف وہ عمل قبول ہوتا ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ہو، خواہ وہ نماز، روزہ، صدقہ و خیرات ہو یا بندوں کے حقوق۔ ہر درست کام کے اندر صرف ایک ہی جذبہ کار فرما ہوا ہو کہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کام کیا جائے۔



ایک جگہ اللہ تعالیٰ اہل عقل کے چند اوصاف بیان فرماتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے عہد و پیمان کو توڑتے نہیں اور وہ اس چیز کو جوڑتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے جوڑ رکھنے کا حکم فرمایا ہے (یعنی والدین، رشتہ داروں اور بندوں کے حقوق کو ادا کرتے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں) اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ یہ کام کسی نمود و نمائش یا دنیوی غرض سے نہیں کرتے بلکہ

﴿...وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُونَ سُوءَ الْحِسَابِ وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ...﴾

یعنی ”اور وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں اور جو اپنے رب کی خوشنودی میں (حق پر) ثابت قدم رہتے ہیں“۔ (الرعد: آیت ۲۰ تا ۲۲)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا یہ سب کچھ (نیک کام کرنا) دنیا کیلئے نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اسکے عذاب کے خوف کے سبب ہے اور اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی کی راہ میں جو مشکلات و مصائب پیش آتے ہیں وہ ان کو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کیلئے برداشت کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کیلئے کسی سختی سے گھبرا کر راہ حق سے نہیں ہٹتے اور ان کا یہ صبر و استقلال بھی صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہی کیلئے ہوتا ہے نہ یہ کہ لوگ ان کو مستقل مزاج و بہادر وغیرہ کے القابات و خطابات سے یاد کریں اور نہ ان کے صبر کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ ایسے مجبور ہوں کہ صبر کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ خلاصہ یہ کہ ان کے انفرادی و اجتماعی و دینی کام اور ان کا صبر صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کیلئے ہو۔ یہی لوگ عقلمند ہیں اور ان ہی لوگوں کو کامیابیاں ملتی ہیں۔ اور اخلاص کی اس حقیقت کو سورہ دہر میں یوں واضح فرمایا:

﴿وَيُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكْرًا إِنَّا نَخَافُ مِنْ رَبِّنَا يَوْمًا غُيُوبًا قَدْ خَلَقْنَاكُمْ فَافْقَهُمْ اللَّهُ شَرَّ ذَلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّهْم نَضْرَةً وَسُرُورًا﴾

”اور وہ اس کی محبت میں کھانا کھلاتے ہیں محتاج کو، یتیم کو اور قیدیوں کو، ہم تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے کھلاتے ہیں، ہم نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ (اور شائباش) ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت اور تلخ دن کا اندیشہ رکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس دن کے شر (اور آفت و مصیبت) سے بچایا اور ان کو تازگی اور مسرور (خوشی) سے نوازا“۔ (الدہر: آیت ۸ تا ۱۱)

اخلاص والا اپنا عمل آخرت کی کھیتی میں ڈال دیتا ہے!

انسان کا عمل گویا ایک بیج اور ختم ہے اور جو شخص صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی درست عمل کرتا ہے تو وہ اس کو

آخرت کی بھیتی میں کاشت کرتا ہے اور اس عمل کی بہار اور باغات آخرت میں دیکھے گا۔

(۴) چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِائَةٌ حَبَّةٌ وَاللَّهُ يُضَعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَمْنًا وَلَا اذًى لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾

”جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ (یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی) میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں انکی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک دانہ (بویا جائے اور وہ) سات بالیں (خوشے) اگائے اور ہر بالی (خوشے) میں سو دانے ہوں اور اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے (اس کے ایمان و یقین اور نیت کی بقدر اس سے بھی زیادہ) بڑھا دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا، جاننے والا ہے۔ جو لوگ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتے ہیں اور نہ دل آزاری کرتے ہیں، ان کے لئے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور نہ تو ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“ (البقرة: آیت ۲۶۱ تا ۲۶۲)

ان آیات سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کچھ مال و جان لگاتے ہیں، مخلوق کی خدمت کرتے ہیں اگر وہ اس خرچ و خدمت کے بعد احسان جتلاتے ہیں یا کسی پہلو سے بھی کوئی دل آزاری کریں تو یہ بھی اخلاص کے منافی ہے جیسا کہ اس کی وضاحت آنے والی آیات میں موجود ہے۔ ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آخرت کی بھیتی میں پڑنے والا عمل ہمیشہ کیلئے بڑھتا رہتا ہے، پھلتا اور پھولتا رہتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اعمال کا ثواب اور بڑھوتری عمل کی نوعیت، عمل کے زمانے اور عمل کرنے والے کے ظاہری و باطنی اور اس کے ایمان و یقین پر مبنی ہوگا۔ اگر ایک نیکی مشکل حالات اور تنگ وسائل کے ساتھ کی گئی ہے تو اس کا اجر آسان حالات اور وسائل کی فراوانی کی بہ نسبت زیادہ ہوگا۔ اسی طرح ایک نیک عمل پورے جوش و خروش کے ساتھ کیا گیا تو اس کا اجر و ثواب کم جوش و خروش سے کئے ہوئے عمل کی نسبت زیادہ ہوگا۔ غرض ہر نیکی ایمان و یقین، حالات اور اخلاص کے مطابق تولی جائیگی۔ اس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اللہ جسے چاہتا ہے، بڑھاتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور چاہت اور اسکے قانون مشیت اللہ تعالیٰ کی حکمت اور عدل پر مبنی ہوتا ہے۔ اسلئے بعد میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بڑا وسعت والا اور جاننے والا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو چھوٹی یا بڑی، پوشیدہ یا اعلانیہ نیکی کی جاتی ہے، اس کی مقدار اسکی نوعیت و کیفیت سب کی سب اس کے علم میں رہتی ہے اور اسکے خزانے بھی غیر

محدود ہیں، اس کا علم بھی غائب و حاضر پر محیط ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق اجر دے گا اور اس کے خزانوں میں اس سے کوئی کمی نہیں آسکتی۔

نیکی کر کے احسان جتلا نایا کسی پہلو سے نیکی کی وجہ سے کسی کی دل آزاری کرنا ریا کاری کے

مترادف ہے!

پہلے بھی بتایا گیا تھا کہ نیکی کر کے احسان جتلا نایا کسی پہلو سے نیکی کرنے کی وجہ سے کسی کی دل آزاری کرنا اخلاص کے منافی اور دل آزاری کے مترادف ہے۔

(۵) چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَتَكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِثَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ ثُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا لَا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝ وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَشْيِئَاتِمْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ مِّنْ بَرْنَةِ أَصَابِهَا وَابِلٌ فَاتَتْ أَكْثَرُهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَإِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطُلٌّ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾

”اے ایمان والو! احسان جتلا کر اور دکھ پہنچا کر اپنے صدقات کو اس شخص کی طرح برباد مت کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کیلئے خرچ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا، پس اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی چکنی چٹان ہو جس پر کچھ مٹی پڑی ہو، پھر اس پر زور کی بارش بر سے تو (وہ ساری کی ساری مٹی کو بہا کر) بالکل اسکو صاف کر دے۔ ایسے لوگوں کو اپنی (خیرات و صدقات کی) کمائی ذرہ برابر بھی ہاتھ نہ لگے گی اور اللہ تعالیٰ کفر اختیار کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ اور (اسکے برعکس) جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اور اپنے دلوں کو مضبوط اور پختہ کر کے خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس باغ جیسی ہے جو ایک بلند زمین پر ہو (اگر) اس پر زور کی بارش بر سے تو دگنا پھل لائے اور اگر اس پر بارش نہ (بھی) بر سے تو شبنم ہی اس کیلئے کافی ہو جائے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کا خوب دیکھنے والا ہے“۔ (البقرہ: آیت ۲۶۴ تا ۲۶۵)

ان آیات میں چند باتیں قابل غور ہیں:

(۱) ایک یہ کہ ریا کاری کے صدقہ و خیرات والے کیساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ﴿وَلَا يَوْمَنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

الآخر ﴿یعنی﴾ ”وہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لایا“۔ ظاہر ہے کہ یہ قید اس لئے تو نہیں رکھی گئی کہ اگر اللہ تعالیٰ پر قیامت کے دن پر ایمان ہو تو پھر ریا کاری کے ساتھ صدقہ و خیرات کا ثواب ملے گا بلکہ ریا کار کا اجر و ثواب تو صرف اسکی ریا کاری ہی سے باطل ہو جاتا ہے اگرچہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ تو یہاں ان الفاظ کو اس لئے لایا گیا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر کامل ایمان و یقین ہو، وہ ہرگز لوگوں کو دکھانے کے لئے کوئی کام نہیں کرے گا۔ یہ ریا کاری تو منافق لوگوں کے مناسب حال ہے۔ مؤمن کی یہ شان نہیں کہ وہ ریا کاری کرے۔

(۲) دوسری بات یہاں یہ بتائی گئی کہ جو لوگ صدقہ و خیرات دیکر احسان جنائے یا دینی خدمت پر فخر کرے یا ان صدقات و خیرات اور خدمات کی وجہ سے کسی کو کسی پہلو سے ستائے، اسکو ایذا پہنچائے تو اسکا عمل بھی اسی طرح باطل ہو جاتا ہے جس طرح ریا کار کا عمل ضائع ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اپنے وہ اعمال جو بظاہر خالص نیت سے کئے گئے ہوں ان کی حفاظت بھی سخت ضروری ہے اور بظاہر اخلاص سے کیا ہوا عمل بھی انسان کے اپنے ہاتھوں ضائع ہو سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنی دینی خدمات پر فخر کرتے ہیں یا لوگوں پر احسان جتلاتے ہیں یا کسی پہلو سے ستاتے ہیں تو اس شخص کی دینداری اوپری ہوتی ہے اور اسکی دینداری اس میں راسخ نہیں ہوتی اسلئے بعد کے حالات اس کی دینداری اور نیک کاموں سے پردہ اٹھا دیتے ہیں۔ اور خود ہی اسکو بتا دیتے ہیں کہ تمہارے یہ اعمال اخلاص سے نہ تھے ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کیلئے ہوتے تو لوگوں پر احسان جتلانے یا ان کو ستانے کا کیا معنی؟

(۳) ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے صدقہ کی تمثیل بھی بیان کی ہے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور تنہیت نفس کیلئے خرچ کرتے ہیں۔ یہ تنہیت نفس کیا ہے؟ تنہیت، ثبت سے نکلا ہے اور اور ثبت کے معنی ہیں ثابت رہنا، ایک حالت پر جمے رہنا۔ تو تنہیت کے معنی ہیں مضبوط کرنا، جمائے رکھنا اور مستحکم کرنا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے مال کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ اس مقصد سے بھی خرچ کرتے ہیں کہ وہ اس طرح اپنے نفس کی تربیت کرتے ہیں تاکہ وہ دین کے احکام کی تعمیل اور خدمتِ خلق میں اللہ تعالیٰ کیلئے اچھی طرح پختہ اور مضبوط ہو جائے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جانی و مالی قوتوں کو خرچ کرنا اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کرنا ایک ریاضت اور مجاہدہ ہے جو ابتداءً نفس پر شاق اور گراں گزرتا ہے لیکن مسلسل خدمتِ خلق اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جانی و مالی قوتوں کو خرچ کر کے انسان کا نفس قابو میں آ جاتا ہے اور بالآخر اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا اور مخلوق کی خدمت کرنا اور لوگوں کیساتھ خیر خواہی کرنا اس کی عادت اور صفت بن جاتی ہے اور اس طرح انسان کیلئے اللہ تعالیٰ

کے قرب کی راہ آسان ہو جاتی ہے۔

(۴) ان آیات میں غیر مخلص اور اپنی خدمت اور خرچ کا احسان جتانے والوں کی تمثیل اس کاشتکار سے دی ہے جس نے اپنی فصل ایسی زمین میں بوئی جس کے نیچے سخت اور پکنی چٹان ہو اور جب اس پر بارش کا جھونکا آئے تو چٹان کے اوپر کی ساری مٹی فصل سمیت بہہ گئی اور نیچے خالی چٹان نکل آئی۔ اس مثال سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح اس کاشتکار کی ساری محنت اور بویا ہوا تخم بھی ضائع اور برباد ہو جاتا ہے اسی طرح اس خیرات کرنے والے کے صدقات و خیرات اور خدمات بھی برباد اور ضائع ہو کر رہ جاتی ہیں۔ جو خیرات اور خدمات کے احسان جتنا ہے اور دل آزاری کرتا ہے، وہ غیر مخلص ہے اور اسکی دینداری اور اخلاص وقتی اور عارضی ہوتا ہے اور مخصوص حالات اور اسکی دینداری اور اخلاص سے پردہ اٹھا دیتے ہیں۔ ان آیات میں ان لوگوں کے انفاق کی تمثیل بھی بیان ہوئی ہے کہ جو اپنے مالک کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اپنے نفس کی تربیت کیلئے خرچ کرتے ہیں، ان کے بارے میں فرمایا کہ بے شک یہ لوگ اپنی خدمات کی عظیم اجرت پائیں گے کیونکہ انہوں نے بہہ جانے والی (دنیا کی زمین) پر باغ لگانے کے بجائے (آخرت کی) ایسی بلند سطح اور اچھی آب و ہوا والی زمین پر اپنا باغ لگایا ہوا ہے کہ بارش ہو تو وہ اس کو برباد کرنے کے بجائے اس کی بار آوری کو دو چندان کر دیتی ہے اور اگر بارش نہ بھی ہو تو شبنم اور ہلکی پھوار بھی آب و ہوا کی وجہ سے اس کی کفایت کرتی ہے۔

### اخلاص کی برکت اور قیمت!

مذکورہ بالا آیات میں غور و فکر کریں۔ ان دونوں آیات میں صدقات و خیرات کرنے والے دو قسم کے آدمیوں کا بیان آیا ہے ایک وہ جن کی نیت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی نہیں بلکہ اس کے سوا کوئی دوسری غرض ہو، مثلاً لوگوں کے دکھانے کے لئے اپنا مال خیر کے کاموں میں خرچ کرتے ہیں اور دوسری قسم ان لوگوں کی جو محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی نیت اور غرض سے غریبوں، مسکینوں اور حاجت مندوں کی مدد کرتے ہیں اور اپنا مال خیر کے کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کے ظاہری عمل میں بظاہر کوئی فرق نہیں کیونکہ دونوں بظاہر یکساں طور پر اپنا مال غریبوں اور مسکینوں اور حاجت مندوں پر خرچ کرتے ہیں مگر قرآن مجید بتلاتا ہے کہ ان دو قسم کے لوگوں کی نیتیں چونکہ مختلف ہیں، اس لئے دونوں کے عمل کے ثمرات و نتائج بھی مختلف ہیں۔ ایک کا عمل سراسر خیر و برکت اور دوسری قسم کے لوگوں کے بالکل ضائع و برباد۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف اخلاص والا عمل قبول ہے!

اللہ تعالیٰ کسی کے صرف ظاہری عمل کو نہیں دیکھتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی نظر دلوں اور جذبات پر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف وہ عمل قبول ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے ہو۔

(۶) چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَنْ يَنَالَ اللَّهُ لُحُومَهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنْكُمْ﴾

”اللہ تعالیٰ کے پاس تمہاری ان قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ اس کے پاس تو تمہارا تقویٰ

پہنچتا ہے۔“ (الحج: آیت ۳۷)

اس آیت میں قربانی کی اصل حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے اونٹ وغیرہ کی قربانی پیش کر کے اپنے دل کی اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ یا اللہ جس طرح ہم نے آپ کے دیئے ہوئے اونٹ وغیرہ کو ذبح کیا ہے اسی طرح اپنے نفس کو ذبح کر کے آپ کے ہر حکم پر اپنی تمام خواہشات نفس کو قربان کرتے ہیں اور آپ کے دیئے ہوئے مال و اولاد اور جان کے ساتھ خود بھی تیری راہ میں اسی طرح قربان ہونے کے لئے تیار ہیں۔ انسان کا یہی خلوص اور اللہ تعالیٰ کے قوانین اور ہدایت کی نگہداشت کا یہی جذبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچتا ہے۔ لہذا قربانی کا جانور ذبح کر کے محض گوشت کھانے کھلانے یا اس کا خون گرانے سے تمہیں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کبھی حاصل نہ ہوگی جب تک تمہاری قربانیوں پر تقویٰ کا رنگ نہ ہو۔ جس شخص کے دل میں جس قدر خلوص ہوگا اور اسکے عمل پر جتنا زیادہ تقویٰ کا رنگ چڑھا ہوگا اس کی قبولیت اور اجر و قیمت اتنی زیادہ ہوگی اور جو عمل خلوص و تقویٰ سے خالی ہوگا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسکی کوئی قیمت نہ ہوگی اور نہ آخرت میں اس عمل پر کچھ ملے گا۔

اخلاص اور ریاکاری کے متعلق چند احادیث!

قرآن مجید کی مذکورہ بالا چند آیات اخلاص کے بارے میں جو نقل کی گئی ہیں، اس سے اخلاص کی قدر و قیمت اور ریاکاری کے نقصانات اور تباہ کاریاں اچھی طرح سامنے آئیں۔ اب اس کے متعلق نبی کریم ﷺ کے چند ارشادات بھی پڑھ لیجئے۔

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّا نَوَىٰ فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَهِيَ حُرَّةٌ إِلَى اللَّهِ



وَرَسُولُهُ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَىٰ دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ أَمْرًا يَبْتَزُّهَا فَهِيَ هِجْرَتُهُ إِلَىٰ مَا هَا جَبَرَ إِلَيْهِ)

”انسانی اعمال کا دار و مدار بس نیتوں پر ہے اور آدمی کو اس کی نیت ہی کے مطابق پھل ملتا ہے۔ تو جس شخص نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کی (یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا جوئی اور اطاعت کے سوا اس کی ہجرت کا کوئی اور محرک نہیں تھا) تو اس کی ہجرت درحقیقت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ہی طرف ہوئی (اور اس کو اس ہجرت پر اجر عظیم ملے گا) اور جو شخص کسی دنیاوی غرض کیلئے یا عورت سے نکاح کیلئے ہجرت کرتا ہے (اسکی یہ ہجرت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کیلئے نہ ہوگی بلکہ جس دوسری نیت اور غرض سے اس نے ہجرت کی ہے عند اللہ) بس اس کی طرف اس کی ہجرت مانی جائیگی۔“ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ)

اخلاص کے بغیر بڑے سے بڑا کام بھی بے قیمت اور مردود ہے!

اس حدیث میں اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ تمام اعمال کے صلاح و فساد، خیر و شر، عند اللہ مقبول ہونے یا مردود ہونے کا دار و مدار انسان کی نیت پر ہے اور عمل صالح وہی ہوگا اور اسکی اللہ تعالیٰ کے ہاں قدر و قیمت ہوگی، جو درست کام اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کیلئے کیا گیا ہو اور جو بھی خیر کا کام کسی بری غرض اور فاسد نیت سے کیا گیا ہو، وہ اعمال صالحہ کے زمرے میں آئے گا اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوگا۔ اگرچہ بظاہر وہ بہت ہی بڑا نیک اور خیر کا کام سمجھا جاتا ہے لیکن اس میں جس قدر فاسد نیت اور غرض ہوگی اس کے مطابق وہ عمل فاسد اور مردود ہوگا۔

(۲) جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جن لوگوں کے خلاف فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا جائیگا، ان میں ایک شہید ہوگا ان کو اللہ تعالیٰ کے سامنے لایا جائیگا، پھر اللہ تعالیٰ اسکو بتائے گا کہ میں نے تجھے کیا کیا نعمتیں دی تھیں، وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی سب نعمتوں کا اقرار کریگا۔ پھر اللہ تعالیٰ اس سے پوچھے گا کہ بتا تو نے ان نعمتوں میں رہ کر کیا کام کیا۔ وہ عرض کریگا کہ میں نے تیری راہ میں جہاد کیا، یہاں تک کہ شہید کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو جھوٹ کہتا ہے۔ تو نے جہاد اس لئے کیا تھا کہ لوگ تجھے بڑا بہادر کہیں (اور تیرا یہ مقصد تو حاصل ہو چکا ہے، کیونکہ دنیا میں لوگ) تجھے بڑا بہادر بتا چکے ہیں۔ اس کے بعد اسکو جہنم میں پھینک دیئے جانے کا حکم ہوگا اور وہ اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائیگا۔

دوسرا شخص وہ ہوگا، جس نے علم دین حاصل کیا ہوگا اور دوسروں کو اس کی تعلیم بھی دی ہوگی اور قرآن مجید بھی خوب پڑھایا ہوگا۔ اسکو بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائیگا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنے انعامات اور احسانات یاد کرا کے اس سے بھی دریافت فرمائے گا کہ ان نعمتوں کا تو نے کیا عمل کیا؟ وہ نعمتوں کا اقرار کر کے کہے گا کہ اے اللہ!



میں نے علم سیکھا اور دوسروں کو سکھایا اور تیری رضا جوئی میں قرآن مجید پڑھتا رہا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو نے جھوٹ بولا، تو نے علم اس لئے سیکھا تھا اور قرآن تو اس لئے پڑھتا تھا کہ تجھے عالم وقاری و عابد کہا جائے، لہذا (تیرا یہ مقصد تجھے حاصل ہو چکا ہے اور دنیا میں) تیرا عالم ہونا، قاری ہونا اور عابد ہونا مشہور ہو چکا ہے پھر اسکے لئے بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہو جائیگا اور وہ بھی اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائیگا۔

اور تیسرا شخص ایک سخی ہوگا جس پر اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بڑی وسعت فرما رکھی تھی، ہر طرح کا مال اس کو عطاء فرمایا ہوگا۔ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائیگا۔ اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنی نعمتیں اور احسانات بتلائے گا۔ وہ سب کا اقرار کرے گا، پھر اللہ تعالیٰ اس سے بھی پوچھے گا کہ تو نے میری ان نعمتوں سے کیا کام کیا؟ وہ عرض کرے گا کہ اے اللہ جس جس راستہ اور جن جن کاموں میں خرچ کرنا تجھے پسند ہے، میں نے تیرا دیا ہوا مال ان سب ہی راستوں میں خرچ کیا ہے اور صرف تیری رضا جوئی کیلئے خرچ کیا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ (اس کے جواب میں یہی) فرمائے گا کہ تو نے جھوٹ کہا۔ درحقیقت یہ سب کچھ تو نے اس لئے کیا کہ دنیا میں تو سخی مشہور ہو، پس (تیرا یہ مقصد تجھے حاصل ہو چکا ہے اور دنیا میں) تیری سخاوت اور فیاضی مشہور ہوگئی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں حکم فرمائے گا اور وہ بھی اوندھے منہ گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائیگا۔ (صحیح مسلم، مشکوٰۃ کتاب العلم)

### تین عظیم کام اور عظیم شخصیتیں!

بلاشبہ ظلمت، کفر اور باطل کے خلاف مال و جان سے لڑنا اور اپنا سر حق کی خاطر قربان کرنا بہت ہی عظیم کام ہے، اسی طرح علم دین کا حصول و فروغ جس میں اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور نامرضیات، عقائد اور اعمال و افعال بتلائے جاتے ہیں بہت ہی عظیم کام ہے اور اس پر عمل کر کے پوری انسانیت کو تارکی اور جہالت سے نکال کر دنیا اور آخرت کے چین و سکون حاصل کر لینا ہے۔ نیز یہ بھی بہت بڑا کام ہے کہ فقیروں، مسکینوں، حاجت مندوں اور رفاہی کاموں میں اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا مال خرچ کیا جائے۔ تو یہ تین کام ایسے ہیں کہ اگر ان کو رضائے الہی کے حصول کی خاطر کیا جائے تو اس سے پورے معاشرے میں چین و سکون، باہمی الفت و محبت اور رحم و کرم کی فضا بن جاتی ہے اور باطل و طاغوت اور ظلم و غرور کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اور یہ تینوں اقسام یعنی عالم، مجاہد اور سخی لوگ بہت بڑی شخصیتیں ہوتی ہیں لیکن جب یہ عظیم کاموں اور انہیں اختیار کرنے والی شخصیتوں میں بھی رضائے الہی کے علاوہ کوئی دوسری روح اور دوسری اغراض کا خون دوڑ رہا ہو تو یہ عظیم کام صرف آخرت کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ دنیا کے لحاظ سے بھی معاشرے اور انسانیت کیلئے بے نتیجہ ثابت

ہو جاتے ہیں اور ریاء کاری کا زہر جب ان عظیم کاموں میں آ جاتا ہے تو اس کا اثر معاشرے پر بھی نتیجتاً بہت ہی برا پڑتا ہے۔

تو اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس قدر عظیم کام بھی اگر اخلاص کی روح سے خالی ہوں تو ایسے عظیم کام کرنے والے بے اخلاص لوگ بھی جہنم ہی میں پھینک دیئے جائیں گے۔

### ایک غلط فہمی کا ازالہ!

بعض نا سمجھ لوگ مذکورہ بالا اس حدیث کو بہت ہی غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ دیکھئے بعض علماء، شہداء اور سنی لوگ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے جبکہ ایک سنت پر عمل کرنے والے کو سوشہیدوں (سوشہیدوں والی روایت کے مطالب اور مفہوم کتاب قیام حق اور اقامت دین میں پڑھ لیجئے) کا ثواب مل جاتا ہے، لہذا جہاد پر جانے میں خطرہ ہے کیونکہ اگر ذرہ برابر بھی اخلاص نہ ہوگا تو جنت کے بجائے دوزخ ہے اور یہاں مفت میں سوشہیدوں کا ثواب حاصل ہوتا ہے، حالانکہ بہت ہی بڑا مغالطہ ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی پوری تفصیل جہاد کے بیان میں آجائے گی۔ لیکن یہاں صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ جاہلوں کی ایسی بے ہودہ باتوں سے عوام کے دلوں میں جہاد، علم اور سخاوت، باہمی رحم و الفت کے جذبات ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور جو بھی جماعت اور قوم ان تین جذبات سے خالی ہو جاتی ہے تو وہ قوم اور جماعت آخرت میں تو کیا فلاح پائے گی، دنیا کے لحاظ سے بھی وہ پریشان حال اور برباد ہو جاتی ہے۔ حالانکہ حدیث شریف تو صرف یہ بتلا رہی ہے کہ بری نیت تو اس قدر مہلک ہے کہ وہ ان عظیم کاموں میں آجائے تو وہ اس کو بھی فاسد کر ڈالے گی اور اللہ تعالیٰ کے بے شمار انعامات اور اس عظیم توفیقات کی ناشکری کی وجہ سے پہلے جہنم میں پھینک دیئے جائیں گے۔

یہاں تو ان کاموں کی اہمیت سامنے آ جاتی ہے کہ جب ان عظیم کاموں میں بری نیت اس قدر مہلک ہے اور ایسے عظیم کام کرنے والوں کی بے اخلاصی معاف نہیں کی جائیگی تو ان کے علاوہ جو کام ہیں اس میں بے اخلاصی کیسے معاف کر دی جائیگی۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ فلاں کام میرا بیٹا بھی کر دے تو اس کو سب سے پہلے سزا دوں گا، تو بادشاہ کے اس حکم کا مطلب یہ تو نہیں کہ ان کو بیٹے سے محبت نہیں یا ان کے نزدیک بیٹے کی اہمیت نہیں بلکہ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ وہ کام اس قدر خطرناک ہے کہ اس میں پڑنے والی اس قدر اہم اور محبوب شخصیتوں کو بھی معاف نہیں کیا جائیگا، بلکہ اس کام کے کرنے والے اپنی اہمیت اور محبوبیت کی بقدر غیر اہم اور مغضوب ہو جاتے ہیں۔ تو جس طرح بادشاہ یہ جملہ

کہہ کر ایک طرف اس کام کی نزاکت کو بیان کرتا ہے تو دوسری طرف اپنے بیٹے کی اہمیت اور محبوب ہونے کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے، اسی طرح حدیث شریف میں ریاء کے تباہ کن اثرات اور نتائج کو بیان کر کے اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا ہے کہ عالم، مجاہد اور سخی اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین بندے ہیں، اگر ان کے علم، سخاوت اور جہاد میں اخلاص و لکھیت ہو۔ جیسا کہ جہاد، شہادت، علم اور سخاوت کے بہت ہی زیادہ فضائل قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔

**اللہ تعالیٰ دلوں کو اور اعمال کے اندر روح اور اخلاص کو دیکھتا ہے!**

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُورِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ)

”اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا

ہے۔“ (مسلم، مشکوٰۃ: باب الریاء)

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبولیت کا معیار کسی کی شکل و صورت یا اسکی دولت مندی نہیں ہے بلکہ نیک نیتی، اخلاص اور نیک کرداری ہے اور اسی نیک نیتی اور نیک کرداری پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے اور بعض روایتوں میں اس حدیث کے الفاظ یوں بھی آئے ہیں:

(إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ وَلَا إِلَى صُورِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ)

”اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور تمہاری صورتوں اور تمہارے صرف ظاہری اعمال کو نہیں دیکھتا بلکہ (اعمال کے

ساتھ) تمہارے دلوں کو (بھی) دیکھتا ہے۔“ (جمع الفوائد: ج ۲ ص ۱۶۰)

ایک حدیث میں ہے کہ آدمی چار ہوتے ہیں۔ ایک وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال بھی دیا ہو اور علم بھی اور اس مال کو علم کے مطابق (اچھے کاموں میں) اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ دوسرا وہ شخص جو اس شخص کو دیکھ کر (اپنے دل میں خیال رکھتا ہے اور) کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی مال و علم عطا فرمائے تو میں بھی اسی جیسی خیرات و صدقات کروں۔ یہ دونوں شخص نیت (یعنی اس نیک نیتی کی وجہ سے اس کو نیت کا ثواب ملے گا اور جس قدر اچھی نیت ہوگی، اسی قدر اچھی نیت کا اجر و ثواب ہوگا اور جس شخص کی نیت جس قدر بری ہوگی، اسی قدر بد نیتی کے بقدر اس کو گناہ ہوگا) کے لحاظ سے اجر و ثواب میں برابر ہیں۔ تیسرا وہ شخص ہے جس کو صرف مال عطا ہوا ہے اور علم نہیں اور یہ شخص اپنی جہالت کی وجہ سے فضول اور بیجا اپنے مال کو اڑاتا ہے اور چوتھا شخص وہ ہے جو اس (تیسرے شخص) کو دیکھ کر (یہ ارادہ رکھتا ہے اور) کہتا ہے کہ اگر مجھے مال مل جائے تو میں بھی اسی طرح (مال کو بے جا خرچ کر کے)

عیش کرونگا تو یہ دونوں اشخاص (نیتوں کے لحاظ سے) گناہ میں برابر ہیں۔ (ابن ماجہ)

### اخلاص کی قیمت اور بے اخلاصی کی بربادی!

اس میں کوئی شک نہیں کہ نیک نیتی اور اخلاص کی وجہ سے انسان دنیا و آخرت میں سرخرو اور کامیابی پالیتا ہے اور بے اخلاصی دنیا و آخرت کا نقصان اور تباہی ہے۔ آخر اتنا تو سوچئے کہ ایک شخص آپ کی بڑی خدمت کرتا ہے اور آپ کو ہر طرح کی راحت و آرام پہنچاتا ہے اور خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن پھر آپ کو معلوم ہو جائے کہ وہ آپ کی خدمت اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں کرتا اور نہ آپ کے ساتھ اسکی عقیدت ہے، نہ خالص محبت بلکہ وہ تو آپ کی خدمت اس لئے کرتا ہے کہ فلاں ذاتی غرض آپ سے پوری کرنا چاہتا ہے یا آپ کی خدمت کر کے آپ کے دوستوں یا رشتہ داروں سے کوئی ذاتی غرض پوری کرنا چاہتا ہے تو ایسی صورت میں آپ کے ہاں بھی اس کی خدمت وغیرہ کی کوئی قیمت باقی نہ رہے گی، لیکن چونکہ ہم کسی کی بے اخلاصی کا اندازہ تو نہیں لگا سکتے، اس لئے ہمیں تو مغالطہ دیا جاسکتا ہے لیکن جو ذات انسان کے خیالات اور اسکے دل کو دیکھتی ہے تو ایسی صورت میں اعمال کی قیمت بقدر اخلاص لگے گی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں جس کا محرک اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے بجائے دنیاوی غرض اور نفسانی خواہش ہو۔

### اخلاص کے ساتھ ایک کھجور کا ثواب!

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ وَلَا يَقْبَلُ اللَّهُ إِلَّا طَيِّبَ فَإِنَّ اللَّهَ يَقْبَلُهَا يَبْمِئِهِ ثُمَّ يُرِيهَا لِصَاحِبِهَا كَمَا يُرَى أَحَدُكُمْ فُلُوهُ حَتَّى تَكُونَ مِثْلَ الْجَبَلِ )

”جو شخص کھجور کے برابر حلال کی کمائی میں سے صدقہ کرتا ہے اور (یہ یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ صرف حلال مال کو قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے (یعنی کھجور کے برابر صدقہ کو) اپنے داہنے ہاتھ سے قبول کرتا ہے اور پھر اس صدقہ دینے والے کے لئے اسی طرح پالتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنا بچھڑا پالتا ہے یہاں تک کہ وہ (صدقہ یا اس کا ثواب) پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے۔“ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ)

(۵) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ كَانَ نِيَّتُهُ طَلَبُ الْآخِرَةِ جَعَلَ اللَّهُ غِنَاهُ فِي قَلْبِهِ وَجَمَعَ لَهُ شِمْلَهُ وَاتَّيْتَهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ وَمَنْ

كَانَتْ نِيَّتُهُ طَلَبَ الدُّنْيَا جَعَلَ اللَّهُ الْفَقْرَيْنِ عَيْنَهُ وَشَتَّتَ عَلَيْهِ أَمْرَهُ وَلَا يَأْتِيهِ مِنْهَا إِلَّا مَا كَتَبَ لَهُ)  
 ”جس شخص کی نیت محض آخرت (اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی) کی طلب ہو تو اللہ تعالیٰ اسکے دل کو غنی کرتا ہے اور اس کو اطمینان خاطر بخشتا ہے، نیز اس کے پاس دنیا ذلیل ہو کر آتی ہے اور جس شخص کی نیت دنیا کی طلب ہو تو اللہ تعالیٰ اس کا فقر و احتیاج اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیتا ہے اور اس کے کام اور ذہن پر انگندہ اور منتشر کر دیتا ہے، اور (دنیا میں سے بھی) اس کو اتنا ہی ملتا ہے جو اس کیلئے لکھا گیا ہے۔“ (ترمذی، دارمی، مشکوٰۃ)

(۶) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(قَالَ اللَّهُ تَعَالَى أَنَا غَنِي الشُّرَكَاءِ عَنِ الشُّرِكِ مَنْ عَمَلَ عَمَلًا اشْرَكَ فِيهِ مَعِيَ غَيْرِي تَرَكَتُهُ وَشُرَكَاهُ وَفِي رَوَايَةٍ فَأَنَامَنَهُ بَرِيٌّ هُوَ الَّذِي عَمَلَهُ)

”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرک اور شرکت سب سے بے نیاز ہوں (یعنی جس طرح باقی شرکاء ایک دوسرے کے اشتراک اور تعاون کے محتاج ہوتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے شریک بنتے ہیں اور شرکت پر راضی ہو جاتے ہیں اور مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن میں چونکہ خالق کائنات اور قادرِ مطلق ذات ہوں اور میں ہر قسم کی شرکت سے بالکل بے نیاز اور سخت بیزار ہوں) پس جو شخص کوئی عمل (عبادت وغیرہ) کرے، جس میں میرے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کرے (یعنی میری رضا جوئی کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے کو دکھانے کی نیت کرتا ہے) تو میں اس کو اور اسکے شرک دونوں کو چھوڑ دیتا ہوں اور ایک روایت میں ہے کہ میں اس بے تعلق اور بیزار ہوں، وہ عمل (میرے لئے نہیں بلکہ) صرف اس دوسرے کیلئے ہے، جس کے لئے اس نے کیا ہے۔“ (مسلم، مشکوٰۃ)

(۷) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ ”جب الحزن“ (یعنی غم کے کنویں یا خندق) سے پناہ مانگا کرو۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ ”جب الحزن“ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

(وَادِيٌّ فِي جَهَنَّمَ يَتَعَوَّذُ مِنْهُ جَهَنَّمُ كُلَّ يَوْمٍ أَرْبَعِ مِائَةِ مَرَّةٍ)

”جہنم میں ایک وادی (یا خندق) ہے (جو اس قدر بری اور ذلیل کن ہے کہ) جس سے خود جہنم ہر دن میں چار سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے۔“ آپ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ اس میں کون لوگ جائیں گے تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: (الْقُرَّاءُ الْمُرَاؤُونَ بِأَعْمَالِهِمْ) یعنی وہ زیادہ قرآن پڑھنے والے (یا بڑے عبادت گزار) جو لوگوں کو دکھانے کیلئے اچھے اعمال کرتے ہیں۔ (ترمذی)

### ریاءِ شرک اصغر یا شرکِ خفی ہے!

اسی طرح قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ میں ریاءِ کاری کی بہت ہی مذمت آئی ہے، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ نے ریاء کو شرکِ اصغر اور شرکِ خفی سے موسوم کیا ہے۔ چنانچہ محمود بن لبید ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ مجھے تمہارے متعلق سب سے زیادہ خطرہ ”شرکِ اصغر“ سے ہے۔ صحابہ کرام ؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ: (وَمَا الشَّرْكُ الْأَصْغَرُ؟ قَالَ الرَّيَاءُ)

### شرکِ اصغر (یعنی چھوٹا شرک) کیا ہوتا ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: ”ریاء“ (یعنی دکھلاوا)

اور حضرت شداد بن اوس ؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ فرماتے تھے: (مَنْ صَلَّى يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ، وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ، وَمَنْ صَامَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ) ”جس نے لوگوں کو دکھانے کے لئے نماز پڑھی، اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کے لئے صدقہ و خیرات کیا، اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کیلئے روزہ رکھا، اس نے شرک کیا“۔ (مشکوٰۃ)

### ریاءِ کاری کی مذمت!

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ ریاءِ کاری کی مذمت بیان کر کے فرماتے ہیں کہ: ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن ایک منادی اعلان کرے گا کہ جس شخص نے اپنے کسی عمل میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیا ہے، وہ اس شریک سے اپنا ثواب مانگ لے۔ اللہ جل شانہ شریک سے بے نیاز ہے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابوسعید خدری ؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم لوگ دجال کا تذکرہ کر رہے تھے۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں ایسی چیز بتاؤں جس کا میں تم پر دجال سے بھی زیادہ خوف کرتا ہوں۔ ہم نے عرض کیا کہ ضرور بتائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ شرکِ خفی ہے۔ مثلاً ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے (اخلاص سے شروع کی ہے، کوئی شخص اس کی نماز کو دیکھنے لگے) وہ آدمی کے دیکھنے کی وجہ سے اپنی نماز لمبی کر دے۔ ایک دوسرے صحابی ؓ حضور ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ مجھے تم پر سب سے زیادہ خوف چھوٹے شرک کا ہے۔ صحابہ ؓ نے عرض کیا، چھوٹا شرک کیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا، ریاء ہے۔ ایک حدیث میں اس کے بعد یہ

بھی ہے کہ جس دن اللہ تعالیٰ بندوں کو انکے اعمال کا بدلہ عطا فرمائیں گے۔ ان لوگوں سے یہ ارشاد ہوگا کہ جن کو دکھانے کیلئے کئے تھے، دیکھو ان کے پاس تمہارے اعمال کا بدلہ ہے یا نہیں۔ (مشکوٰۃ)

قرآن پاک میں بھی حق تعالیٰ کا پاک ارشاد ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا﴾

”جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے (اور ان کا محبوب و مقرب بننا چاہے) تو نیک کام کرتا رہے اور

اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔“ (الکہف: ۱۱۰)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ میں بعض (دینی) مواقع میں اللہ جل شانہ کی رضا کے واسطے کھڑا ہوتا ہوں مگر میرا دل چاہتا ہے کہ میری اس کوشش کو لوگ دیکھیں۔ حضور ﷺ نے کوئی جواب مرحمت نہیں فرمایا، حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوگئی۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک صاحب نے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں صدقہ کرتا ہوں اور صرف اللہ جل شانہ کی رضا مقصود ہوتی ہے، مگر دل یہ چاہتا ہے کہ لوگ مجھے اچھا کہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ایک حدیث قدسی میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اپنے عمل میں میرے ساتھ کسی دوسرے شخص کو شریک کرتا ہے تو میں اس سارے عمل کو ہی چھوڑ دیتا ہوں۔ میں صرف اس عمل کو قبول کرتا ہوں جو خالص میرے لیے ہو۔ اسکے بعد حضور ﷺ نے یہ آیت شریفہ تلاوت فرمائی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ جل شانہ فرماتے ہیں کہ میں اپنے ساتھی کے ساتھ بہترین تقسیم کر نیوالا ہوں۔ جو شخص اپنی عبادت میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو سا جھی کر دے، میں اپنا حصہ بھی اس سا جھی کو دے دیتا ہوں۔ ایک حدیث میں ہے کہ جہنم میں ایک وادی ایسی ہے کہ جس سے جہنم بھی خود چار سو مرتبہ روزانہ پناہ مانگتی ہے، وہ ریاکاروں کے واسطے ہے۔

ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ کا ارشاد آیا ہے کہ جب الحُزْنُ سے پناہ مانگا کرو (یعنی غم کے کنوئیں سے جو جہنم میں ہے)۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ اس میں کون لوگ رہیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو اپنے اعمال میں ریاکاری کرتے ہیں۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ آیت شریفہ قرآن پاک میں سب سے آخر میں نازل ہوئی (درمنثور)۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَتَكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ لَا كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِثَاءَ النَّاسِ﴾



”اے ایمان والو! تم احسان جتنا کر ایداء پہنچا کر اپنی خیرات کو برباد مت کرو جس طرح وہ شخص (برباد) کرتا ہے جو اپنا مال لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے خرچ کرتا ہے اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور قیامت پر۔ اس شخص کی مثال ایسی ہے کہ ایک چمنا پتھر ہو۔ اس پر کچھ مٹی آگئی ہو (اور اس مٹی میں کچھ سبزہ وغیرہ جم گیا ہو) پھر اس پتھر پر زور کی بارش پڑ جائے سو وہ اس کو بالکل صاف کر دے گی (اسی طرح احسان رکھنے والوں، ایدادینے والوں اور ریاکاروں کا خرچ کرنا بھی بالکل صاف اڑ جائیگا اور قیامت کے دن) ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی (یعنی یہ جو نیکیاں کی تھیں، صدقات دیئے تھے۔ یہ سب ضائع جائیں گے)۔“ (البقرہ: ۲۶۴)

اس کے علاوہ اور بھی کئی جگہ قرآن پاک میں ریا کی مذمت فرمائی ہے۔ اس کے علاوہ احادیث میں کثرت سے اس پر تنبیہ کی گئی ہے اور بہت زیادہ اہمیت سے حضور اقدس ﷺ نے اپنی امت کو اس پر تنبیہ کی ہے کہ جو کام بھی کیا جائے وہ خالص اللہ جل شانہ کیلئے کیا جائے اور جتنا بھی اہتمام ہو سکے، اس کا کیا جائے کہ اس میں ریا اور نمود و شہرت اور دکھاوے کا شائبہ بھی نہ آنے پائے۔ مگر اس جگہ شیطان کے ایک بڑے مکر سے بے فکر نہیں ہونا چاہئے۔ دشمن جب قوی ہوتا ہے وہ مختلف انواع سے اپنی دشمنی نکالا کرتا ہے۔ یہ بہت مرتبہ آدمی کو اس وسوسے کی بدولت کہ اخلاص تو ہے ہی نہیں، اہم ترین عبادتوں سے روک دیا کرتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شیطان اول تو نیک کام کرنے سے روکتا ہے اور ایسے خیالات دل میں ڈالا کرتا ہے جس سے اس کام کے کرنے کا ارادہ ہی پیدا نہ ہو، لیکن جب آدمی اپنی ہمت سے اس کا مقابلہ کرتا ہے اور اس کے روکنے پر عمل نہیں کرتا تو وہ کہا کرتا ہے کہ تجھ میں اخلاص تو ہے ہی نہیں، یہ تیری عبادت محنت بیکار ہے، جب اخلاص ہی نہیں پھر ایسی عبادت کرنے سے کیا فائدہ؟ اور اس قسم کے وسوسے پیدا کر کے نیک کام کرنے سے روک دیتا ہے اور جب آدمی رک جاتا تو اس کی غرض پوری ہو جاتی ہے۔ (احیاء) اس لئے اس خیال سے نیک کام کرنے سے رکنا نہیں چاہئے کہ اخلاص تو ہے نہیں۔ بلکہ نیک کام کرنے میں اخلاص کی کوشش کرتے رہنا چاہیے اور اس کی دعا کرتا رہے کہ حق تعالیٰ محض اپنے لطف سے دستگیری فرمائے، تاکہ نہ تو دین کا مشغلہ ضائع ہو، نہ برباد ہو۔ (فضائل صدقات حصہ اول: ص ۱۶۱ تا ۱۶۵)

### ریا کی تعریف اور اس کا بیان!

کوئی عبادت یا دینی کام یا نیک عمل کرنا یا اپنے سابقہ اعمال صالحہ کو اس لئے شہرت دینا کہ (لیکن اگر کوئی نیک عمل لوگوں کو دکھانے کیلئے کرنا ہو کہ وہ بھی اس طرح عمل کریں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن ایسا کرنے

سے اکثر لوگ بالآخر ایسے ریا میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن کو اپنی ریاکاری کا علم بھی نہیں ہوتا، جو ریاکاری سے بھی خطرناک ہے (لوگوں کے دل میں انسان کی وقعت اور قدر و منزلت پیدا ہو جائے، شرک خفی یا ریا کہلاتا ہے اور جو شخص ریا کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یا تو اس کا اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین ہی نہیں، لیکن وہ اپنے ذاتی مفادات کیلئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور آخرت کو ماننے اور ایمان و اسلام کا دعویٰ کرتا ہے۔ یا یقین تو ہے لیکن وہ اس قدر کمزور ہے کہ مخلوق سے اس کا جس قدر اجر، عزت و ذلت کی توقع ہے اتنی امید اللہ تعالیٰ سے نہیں یا وہ اللہ تعالیٰ اور مخلوق دونوں سے اجر و داد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بہر حال ریاکار شخص کا دل یا تو اللہ تعالیٰ پر ایمان و یقین سے خالی ہوگا یا پھر ایمان و یقین ہونے کے باوجود اس قدر کمزور ہوگا کہ وہ اپنے اعمال کو محض اللہ تعالیٰ کیلئے خالص نہیں کر سکتا۔

### ریاکاری کی بڑی دو قسمیں کفر و نفاق اور شرک اصغر یا شرک خفی!

لہذا ظاہر و باطن انسان کے اندرون و بیرون یعنی اندر، نیت و غرض کچھ اور ہے۔ ظاہر میں کچھ اور باور کر رہا ہے اور بتلا رہا ہے۔ اس کی دو بڑی قسمیں بنتی ہیں:

(۱) کوئی شخص نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہو، نہ اس کے رسول ﷺ پر اور نہ آخرت پر۔ لیکن لوگوں کو باور کرائے کہ وہ مسلمان ہے اور بظاہر دینی اعمال بھی کرتا رہے۔ یہ اصل ایمان میں ریا ہے اور اسے نفاق کہتے ہیں اور اسکے کرنے والے کو منافق۔ یہ جلی اور عظیم شرک سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور اس کا حشر و ٹھکانہ دوسرے مشرکین و کفار سے زیادہ سخت اور اس کا ٹھکانہ سب سے نیچے انتہائی خراب اور برا ہے۔ نفاق کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ اول یہ کہ اندر سے اسلام کا بالکل منکر ہے لیکن مسلمانوں میں افتراق، انتشار پھیلانے اور فتنہ برپا کرنے کیلئے خود کو مسلمان ظاہر کرے اور ظاہری فرمانبرداری جیسے نماز وغیرہ ادا کرے۔ دوم یہ کہ اندر سے تو صاف منکر ہے لیکن مسلمانوں سے اپنے مفادات حاصل کرنے کیلئے ایمان اور اسلام کا اظہار کرے۔ اگرچہ فتنہ انگیزی کا خیال نہ ہو۔ سوم یہ کہ دل سے اسلام کا صاف منکر تو نہ ہو لیکن اسلام کے برحق ہونے پر کامل اطمینان بھی نہ ہو، بلکہ کفر و ایمان میں متردد اور متذبذب ہو۔ لیکن صرف مسلمانوں کی جماعت میں رہنے کی وجہ سے بظاہر اسلام کا نام لیوا ہو یا یہ کہ دل سے تو اسلام کو تو برحق مانتا ہو اور حب دنیا اور اپنے ذاتی مفادات اور شہوات کے غلبہ نے اس کو ایسا کنما بنا دیا ہو کہ دنیا کی خاطر وہ اسلام اور مسلمانوں کی بربادی اور دین کے مذاق اڑانے کو مباح عمل کی طرح برداشت کر لیتا ہو اور ایسے حالات میں بھی جہاد سے جی چراتا ہو جبکہ اسلام اور مسلمانوں کو اسکی سخت ضرورت ہو۔ قرآن مجید نے مختلف

مقامات پر ان مختلف اقسام کے منافقین کی نشاندہی کی ہے، مثلاً ایک جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَى نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ بُشْرَىٰ لَكُمْ الْيَوْمَ جَنَّةٌ تَجْرَىٰ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ يَوْمَ يَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ ۚ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَهُ بَابٌ طَبَاطُئُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرَةٌ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝ يُنَادُونَ لَهُمْ أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ ۚ قَالُوا بَلَىٰ وَلَكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ أَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَغَرَّكُمْ بِاللَّهِ الْغُرُورُ ۝ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ مَا أَوْىٰ كُمْ النَّارُ ۚ هِيَ مَوْلَاكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝﴾

”اس (قیامت کے) دن جبکہ تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا (ان سے کہا جائیگا کہ) آج بشارت ہے تمہارے لئے ایسی جنتوں کی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، یہی بڑی کامیابی ہے۔ اس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ مؤمنوں سے کہیں گے کہ ذرا ہماری طرف دیکھو تا کہ ہم تمہارے نور سے کچھ فائدہ اٹھائیں۔ مگر ان سے کہا جائے گا کہ پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ اور (وہاں) نور تلاش کرو۔ پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائیگی جس میں ایک دروازہ ہوگا اس کے اندر رحمت ہوگی اور باہر کی جانب عذاب ہوگا۔ منافق اہل ایمان کو پکاریں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے، مومن جواب دیں گے، ہاں مگر تم نے اپنے آپ کو فتنوں میں ڈال دیا۔ ہماری تباہی کا انتظار کرتے رہے۔ شک میں پڑے رہے اور دھوکہ میں ڈال دیا تمہیں جھوٹی توقعات نے، یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آپہنچا اور دھوکہ دیتا رہا تمہیں تمہارے اللہ کے بارے میں وہ بڑا دغا باز (شیطان)۔ پس آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائیگا اور نہ ان لوگوں سے جنہوں نے کھلا کفر کیا تھا۔ تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہی تمہاری خبر گیری کرنے والی ہے اور یہ بدترین انجام ہے۔“

(الحمدید: آیت ۱۵ تا ۱۲)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الْمُنْفِقِينَ فِي الدَّرَكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَهُمْ نصِيرًا﴾

”یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نچلے درجے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ

گے۔“ (النسائی: آیت ۱۴۵)

ریاء کی اس قسم جسے نفاق کہا جاتا ہے اس کا مفصل بیان ”نفاق کے بیان“ میں گزر گیا ہے۔

ریاء کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر تو ایمان ہو لیکن عبادات اور دوسرے خیر کے کاموں کو لوگوں کے دکھلاوے اور نام و نمود کیلئے کرے تو اسی کو ریاء کہتے ہیں اور اسی کو شرک خفی یا شرک اصغر بھی کہتے ہیں۔

### شرک اصغر اور شرک خفی کی اقسام!

شرک اصغر یا شرک خفی کی بھی ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک اور ضعف و قوت کے لحاظ سے بہت سی اقسام اور درجات ہو سکتے ہیں لیکن یہاں اسکی موٹی موٹی چند اقسام بیان کرتے ہیں:

(۱) ریاء کی پہلی قسم یہ ہے کہ فرائض میں تو ریاء نہ ہو لیکن اگر کوئی پاس ہو تو نفل نمازوں، صدقات اور دیگر مستحبات کا اہتمام ہو لیکن اگر کوئی نہ دیکھے تو نہ نوافل ہوتے ہیں، نہ مستحبات۔ یہ ریاء بھی خطرناک ہے۔

(۲) دوسری قسم یہ کہ تنہائی میں اتنی عبادت یا کارِ خیر نہیں کرتا جتنی لوگوں کی موجودگی میں کرتا ہے ایسی عبادت پر بھی شدید عذاب کا اندیشہ ہے۔

(۳) تیسری قسم کا ریاء یہ ہے کہ جو عبادت اور نیک عمل لوگوں کے سامنے کرتا ہے وہی ان کی غیر موجودگی اور تنہائی میں بھی کرتا ہے لیکن لوگوں کے سامنے زیادہ نشاط، مسرت اور حسن سے ادا کرتا ہے۔ مثلاً کوئی ہمیشہ تہجد پڑھتا ہو، لیکن مہمان کے سامنے زیادہ نشاط اور خوبصورت طریقے سے پڑھے۔ اس میں بھی ریاء ہے اگرچہ پہلی قسم سے کم (البتہ اگر کارِ خیر میں رضا اور خوشنودی تو اللہ تعالیٰ کی مقصود ہو اور جب کوئی دیکھنے والا ہو تو نشاط اور حسن ادا نیکی بھی نہ ہو مگر طبیعت خوش ہو جائے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا اور اس عمل کو قبول فرمائے گا۔ بلکہ اگر اس کو خوشی صرف اس بناء پر ہو کہ الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے نیک اعمال کو ظاہر فرمایا اور ہمارے برے اعمال اور گناہوں کو پوشیدہ کیا، کیونکہ نیکی کا اظہار کرنا اور گناہوں پر ستاری کرنا قیامت کی رسوائی سے بچاؤ کی علامت ہے۔ اس قسم کی خوشی میں کوئی مضائقہ نہیں)

(۴) چوتھی قسم ریاء کی وہ ہے جس میں کسی کی موجودگی یا غیر موجودگی کی پروا تو نہ ہو لیکن یہ چمکا گا ہوا ہو کہ کسی طرح لوگوں کو میرے نیک اعمال اور باطنی حالات (یہ لوگ تو ایسے ہیں کہ جو اعمال کرتے اور اپنے اندر کچھ کیفیات محسوس کرتے ہیں اور ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ہمارے اعمال اور اندرونی کیفیات کا اظہار ہوتا کہ لوگوں میں ان کی شہرت ہو، لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو محض ظاہری حالت اور کیفیت بڑے لوگوں کی طرح بنا لیتے ہیں اور ایسے اعمال کا اظہار کرتے ہیں کہ جو انہوں نے کیے نہیں ہیں، مثلاً کسی نے نفلی روزے نہیں رکھے ہوں لیکن ہونٹوں کو خشک رکھے یا کہتا رہے کہ میرا روزہ ہے یا تہجد نہیں پڑھتا مگر ایسی حالت بنا لیتا ہے یا ایسے الفاظ اور اشارے کرتا ہے تاکہ

لوگ سمجھیں کہ یہ بڑا تہجد گزار ہے یا صوفیاء کی چند باتیں سیکھ کر انہیں دہراتا ہوتا کہ لوگ اسکو بڑا صوفی اور تصوف کا ماہر سمجھیں یا چند روایات و حکایات سیکھ لے اور انہیں صرف اس لئے بیان کرتا ہے کہ لوگوں پر یہ ثابت کر دے کہ بڑا عالم ہے یا کوئی غمگین اور رونی صورت بنائے تاکہ لوگ سمجھیں کہ اس کو دین کا بڑا غم ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ ایسی شدید قسم کی ریاء اور مکاری ہے جو کسی بھی باحیا انسان سے اس کا صدور ممکن نہیں۔ یہاں یہ خیال رہے کہ یہ چیزیں دوسروں میں تلاش نہ کریں کیونکہ یہ نفل نماز، روزہ، تہجد، ذکر، اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا اور یاد رکھنا اور دین کا غم وغیرہ تو بہت اہم امور ہیں لیکن صرف دکھلاوے کی وجہ سے ریاء اور شرک خفی بن جاتے ہیں۔ اس لئے دوسروں کے بارے میں تو خیال بس یہ رہے کہ وہ اس کو اچھی نیت سے کر رہے ہیں اور اس کی کیفیت یقینی ہے البتہ اپنے بارے میں ہر وقت بدگمان رہے اور اپنی جان کا محاسبہ کرتا رہے اور اپنی نیت کو خالص بنانے کی کوشش کرتا رہے اور ریاء کے خوف سے کسی عمل کو بھی نہ چھوڑیں، یہ شیطان کا دھوکہ ہے) کی خبر ہو جائے اور مختلف طریقوں سے اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔

(۵) ریاء کی پانچویں قسم یہ ہے کہ کسی نیک عمل کو محض اس لئے ترک نہ کرے کہ لوگ اسے ریاکاری کا طعنہ دیں گے یا اپنی خفیہ مجالس یا اپنے خیالات میں اسے ریاکار سمجھیں گے۔ یہ بھی ریاء کی بہت خطرناک قسم ہے کیونکہ یہ شخص بے عملی کے ساتھ لوگوں کے سامنے اپنے اخلاص اور اپنی بزرگی کا ثبوت مہیا کرنا چاہتا ہے جبکہ دوسرے ریا کار عمل کر کے اپنی نیکو کاری وغیرہ کی شہرت چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک باریک ریاکاری کا عمل ہے۔

شرک خفی اور ریاء کی کئی قسمیں ہیں جو بہت باریک ہیں لیکن قابل معافی ہیں۔ جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ”ازلۃ الخفاء“ میں معقل بن یسار سے روایت کرتے ہیں کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے ابوبکر (ؓ)! شرک تم میں چھوٹی کے پاؤں کی آواز سے بھی زیادہ چھپا ہوا ہے۔ حضرت ابوبکر ؓ نے کہا کہ کیا شرک اس کے علاوہ اور بھی کچھ ہے کہ کوئی اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی معبود بنائے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کہ جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ البتہ شرک چھوٹی کے پاؤں کی آواز سے بھی زیادہ چھپا ہوا ہے۔ کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو تم کہہ لیا کرو، تو اس (شرک) کا قلیل اور کثیر سب جاتا رہے (یعنی معاف ہو جائے) فرمایا: (اللَّهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ وَاَنَا اَعْلَمُ وَاسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا اَعْلَمُ.) (ازلۃ الخفاء: ج ۲، ص ۱۳۰)

ریا کاری کے وسوسے سے اعمال نہ چھوڑیں، یہ بھی شیطان کا ایک داؤ ہوتا ہے! یاد رکھیں کہ ریاء کا عمل وہ ہے جو قصد اپنی شہرت اور نام آوری کی غرض کیلئے کیا جائے یا اپنے کئے ہوئے

اعمال کو لوگوں میں اس لئے مشہور کیا جائے تاکہ لوگ اس کے معتقد ہو جائیں۔ جیسا کہ پہلے یہ بتایا گیا ہے اور یہ سب اختیاری چیزیں ہیں اسکے علاوہ بعض لوگوں کو ریا کاری کا وسوسہ ہوتا ہے تو پھر اعمال ہی کو چھوڑ دیتے ہیں یہ قطعاً صحیح نہیں، اعمال صالحہ ضرور کریں اور ریا کاری کے خدشہ سے کوئی عمل نہ چھوڑیں۔ بلکہ کرنے کے ساتھ ساتھ خلوص نیت کی کوشش میں لگے رہیں کیونکہ ریا کاری کے وسوسے اور اندیشوں میں ڈال کر اعمال صالحہ روکنا یہ بھی شیطان کا ایک عظیم حربہ ہے تاکہ انسان کو بے عمل بنایا جائے نیز کبھی کبھی اچھے اعمال کرنے کے بعد ریا کاری کا وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے تو ریا کاری اور ریا کاری کے وسوسے میں بھی بڑا فرق ہے کیونکہ ریا کاری اختیاری چیز ہے کہ جس عمل کا محرک اور باعث ہی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے بجائے دوسری چیز ہو اور وسوسہ آنا غیر اختیاری چیز ہے، بلکہ ریا کا وسوسہ آنا للہیت اور خلوص کی علامت ہے کہ یہ شخص ریا کاری سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اس لئے تو اس کو اپنے اعمال میں ریا کاری محسوس ہوتی ہے ورنہ جس کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول مقصود ہی نہ ہو تو اس کو اس قسم کے خیالات اور وسوسے کیونکر آ سکتے ہیں۔

### اعمال صالحہ کی وجہ سے خود بخود مشہور ہو جانا بھی ریا نہیں!

یہ بات یاد رکھیں کہ جو شخص کسی نیک عمل کی وجہ سے دنیا میں خود بخود مشہور ہو جائے اور لوگ اس سے محبت کرنے لگیں تو یہ ریا کاری کے زمرے میں نہیں داخل نہیں بشرطیکہ وہ عمل شہرت کی غرض سے نہ کرتا ہو۔ جیسا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو کوئی اچھا عمل کرتا ہو اور اس کی وجہ سے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں؟ اور ایک روایت میں ہے کہ پوچھنے والے نے یوں عرض کیا کہ ایسے شخص کے بارے میں کیا حکم ہے جو کوئی اچھا عمل کرتا ہے اور لوگ اس سے اس کی وجہ سے محبت کرتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

(تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ)

یعنی ”یہ تو بندہ مومن کی نقد بشارت ہے۔“ (مسلم) جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے نیک عمل کی شہرت ہو جانا اور لوگوں کا اس کی تعریف کرنا یا اس سے محبت کرنا کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت میں ملنے والے انعام سے پہلے اس دنیا میں نقد صلہ اور اس بندہ کی عند اللہ مقبولیت کی ایک خوشخبری اور علامت ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:



﴿كَانُوا قَلِيلًا مِنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ ۚ وَلَا سَحَارَ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾ (ذاریات: ۱۷)

یعنی ”وہ راتوں کو کم ہی سوتے ہیں اور آخر رات میں (اللہ تعالیٰ سے) مغفرت (اور معافی) مانگتے ہیں۔“

مطلب یہ ہے کہ ہمارے بندے راتوں کو بہت کم سوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں رات گزارتے ہیں پھر بھی جب صبح ہونے لگتی ہے تو اپنی عبادت پر ناز نہیں کرتے کہ ہم نے ساری رات اللہ تعالیٰ کی یاد اور عبادت میں گزاری بلکہ ڈرتے رہتے ہیں کہ معلوم نہیں ہماری عبادت قبول بھی ہے یا نہیں اور اپنی کوتاہیاں سامنے آ جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگنے لگتے ہیں یہ ہے اخلاص و اللہیت نہ یہ کہ عبادت پر ناز و فخر کیا جائے اور جو عبادت پر فخر و ناز کرتے ہیں تو ایسے حضرات اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت سے خالی ہوتے ہیں۔

اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے سمجھتے ہیں کہ گویا ہم نے اللہ تعالیٰ پر احسان کیا، ورنہ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بڑائی ہو، وہ تو ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے گا وہ کسی حالت پر قانع نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اس کا بیان ”عصمت انبیاء“ کے باب میں گزر چکا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ ”اللہ تعالیٰ کے ذکر“ کے بیان میں بھی اس کے متعلق کچھ ذکر کیا جائے گا نیز ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿إِنَّ الَّذِينَ هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ ۚ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ۚ وَالَّذِينَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ ۚ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا قُلُوبُهُمْ وَجَلَّةٌ أَنْهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ ۚ أُولَٰئِكَ يُسْرِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ ۝﴾

یعنی ”بے شک جو اپنے رب کی ہیبت سے ڈرنے والے ہیں اور جو اپنے رب کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو (کسی طرح بھی) شریک نہیں کرتے اور وہ (اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے) جو کچھ دے دیتے ہیں اس حال میں دے دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرتے ہیں کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں یہی لوگ نیکوں میں فلدی کرتے ہیں اور یہی لوگ نیکوں میں آگے بڑھنے والے ہیں۔ (سورہ مؤمنون: ۵۷ تا ۶۱)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت ﴿وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا قُلُوبُهُمْ وَجَلَّةٌ أَنْهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ ۚ﴾ (اور وہ جو کچھ دے دیتے ہیں اس حال میں دیدیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرتے ہیں) کے بارے میں پوچھا کہ کیا اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو شراب پیتے ہیں اور چوری کرتے ہیں؟ (جس کی وجہ سے ان کے دل اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں)



تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا:

(لَا يَأْتِيَنَّكَ الصَّدِيقُ وَلَكِنَّهُمْ الَّذِينَ يَصُومُونَ وَيُصَلُّونَ وَيَتَصَدَّقُونَ وَهُمْ يَخَافُونَ أَنْ لَا يَقْبَلَ مِنْهُمْ أُولَئِكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ.)

”اے صدیق کی بیٹی ایسا نہیں بلکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں اور صدقہ دیتے ہیں اور اس کے باوجود انہیں ڈر لگتا ہے کہ شاید ان کے یہ اعمال ناقبول نہ ہو جائیں یہی وہ لوگ ہیں جو نیکیوں میں جلفی کرتے ہیں“۔ (ترمذی وابن ماجہ)

اور یہی حالت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں گم ہو گئے تھے اور اپنے کئے ہوئے نیک اعمال ان کی نظروں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کی وجہ سے گم ہو جاتے تھے۔

**اخلاص اس وقت ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت ہو اور بے اخلاصی کا علاج!**

اللہ تعالیٰ کی محبت دنیا کی ہر چیز پر غالب ہو تو پھر انسان کے اعمال محض اللہ تعالیٰ کیلئے ہی ہو جاتے ہیں گزشتہ صفحات میں اس بات کی وضاحت موجود ہے کہ انسان کے اعمال کا اصل پیکر اور اصل وجود وہی ہے جو اس کے دل کے کارخانے میں تیار ہوتا ہے اور انسانی اعمال کے اصل مواد انسان کے جذبات اور انسان کی نیت اور ارادہ ہے اور اس سے خود بخود یہ بات معلوم ہو گئی کہ نیت کوئی زبانی چیز نہیں کہ انسان کہہ دے کہ میں نے ٹھیک اور راست نیت کی ہے بلکہ نیت تو ایک کشش، رغبت اور ایک تحریک ہے جو دل میں پیدا ہوتی ہے اور وہی آدمی کو کام میں مشغول کر دیتی ہے۔ اب یہ بات کہ کشش، رغبت اور تحریک دل میں کیسے پیدا ہوتی ہے تو آسان اور سادہ جواب یہ ہے کہ یہ محبت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے یا اپنی اصلاح و تزکیہ نفس سے محبت ہے اور وہ کسی دیندار کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا دوست اور محبوب ہے یا وہ میری اصلاح کرے گا تو وہ اس کی خدمت اور فرمانبرداری اس لئے کرتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے، یہاں اللہ تعالیٰ کی محبت میں وہ اس دیندار شخص کی فرمانبرداری اور خدمت کرتا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے شدید محبت کی وجہ سے اب اس کی نیت میں دوسری دنیاوی اغراض شامل نہیں ہوں گی۔

اور اس کے برعکس ایک دوسرا شخص ہے وہ بھی اس دیندار شخص کی عزت و احترام اور خدمت کرتا رہتا ہے، لیکن اس کو اپنی شہرت سخت محبوب ہے تو اس کی خدمت عزت و احترام کی نیت میں یہ بات شامل ہوگی تاکہ یہ نام آوری یا معروف بزرگ مجھے کوئی منصب عزت پر فائز کر دے مثلاً اپنا نائب و خلیفہ بنائے وغیرہ وغیرہ۔ نیز ایک شخص کے

دل میں دنیا اور مال کی سخت محبت ہے تو اس کے ہر کام میں خواہ وہ دین کا ہو یا دنیا کا، اس میں کسی نہ کسی طرح دنیا اور مال و متاع کے حصول کی نیت شامل ہوگی، اگرچہ وہ اس کو محسوس نہ کرے کیونکہ دنیا سے بھرے ہوئے دل میں سے نکلنے والا عمل دنیا کے زہر سے آلودہ ہو کر ہی نکلے گا۔

نیز ایک شخص کو کوئی جابر شخص یہ حکم دیتا ہے کہ فلاں کام کرو، مثلاً تین میل تک میرے سامنے دوڑو اور یہ اس پر گراں گزرتا ہے لیکن اس کو اپنی جان محبوب ہے تو اپنی جان بچانے کی محبت میں مرنے کے بجائے تین میل دوڑنے کو اختیار کرے گا۔ یا کسی کو مال کی ضرورت ہے تو چونکہ انسان کو اپنی حاجت کے پورا ہونے سے محبت ہوتی ہے تو ایسی صورت میں اگر وہ سخت مزدوری اور اپنی ناگوار محنت کو اختیار کر لیتا ہے تو وہ صرف اس لئے کہ اسے خود کو تکلیف اور مشقت کے بچانے کے بجائے اپنی ضرورت پوری ہونا زیادہ محبوب اور پسند ہے اس لئے اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے وہ سخت کام بھی کرتا ہے۔

غرض جہاں بھی دیکھیں تو یہی بات مل جائیگی کہ یا تو اللہ تعالیٰ کی محبت غالب ہوگی یا کسی شخص کی محبت غالب ہوگی یا اپنی جان بچانے کی محبت زیادہ محبوب ہوگی یا اپنی عزت زیادہ محبوب ہوگی یا اپنی شہرت کا سخت خواہاں ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ اور جس چیز کی محبت غالب ہوگی وہی چیز کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا باعث اور محرک ہوگی۔

اب اگر مذکورہ بالا مقدمہ اور تفصیل ذہن میں آچکی ہے تو پھر یہ بات خود بخود ذہن میں آجائیگی کہ وہی انسان سب سے زیادہ خالص اور پر خلوص عمل کرے گا جس کے دل میں دنیا کے بجائے اللہ تعالیٰ کی محبت سب سے زیادہ ہو۔ ورنہ اگر کسی شخص کے دل میں اللہ تعالیٰ کے بجائے دنیا کی محبت زیادہ غالب ہوگی تو دنیاوی کام تو کیا بلکہ اس کے تمام دینی کاموں کا بھی کوئی نہ کوئی دنیاوی و نفسانی محرک ہوگا یا تو وہ طلب شہرت کیلئے کام کرتا ہوگا یا دنیاوی معاوضہ کیلئے کرتا ہوگا یا اسی طرح کوئی نہ کوئی دنیاوی اور نفسانی مقصد اس میں شامل ہوگا بلکہ ایسے شخص کی تحقیق اور اختلافی مسائل میں بحث و مباحثہ وغیرہ میں بھی حق کی تلاش اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی مد نظر نہیں ہو سکتی بلکہ اس میں بھی وہ شہرت اور اپنے نفس کی خواہش کا متلاشی ہوگا اور یہی نفس پرستی ہے اگرچہ اسکی شکلیں اور تصویریں مختلف ہیں اور یہی خواہش نفس حب دنیا ہے، نفس پرستی اور دنیا پرستی ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ:

﴿أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ﴾

”کیا آپ نے اس کو دیکھا ہے جس نے خود اپنی نفسانی خواہش کو الہ (یعنی معبود اور خدا) بنا لیا ہے“

خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت جب تک دنیا اور دنیا کی ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان اور عزت پر غالب نہ

ہو جائے اس وقت تک انسان کے اعمال میں کھوٹ اور غیر اللہ کی آمیزش باقی رہے گی۔ اس لئے اصل تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت ہی انسان کو اللہ تعالیٰ کا خالص بندہ بنالیتی ہے اور یہی مومن کی صفت ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾

”اور جو لوگ ایمان لائے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت رکھتے ہیں۔“

### اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے حاصل ہو!

اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے حاصل ہو۔ اس کو یہاں نہایت اختصار کیساتھ لکھوں گا اور اسکی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ کتاب کے دوسرے عنوانات میں مفصل مل جائیگی۔

(۱) توحید الہی کو پوری طرح اپنایا جائے، اعتقادی لحاظ سے بھی اور عملی لحاظ سے بھی۔ جس کی پوری تفصیل اس کتاب کے توحید اور کلمہ طیبہ کے بیان میں موجود ہے۔

(۲) شعائر اللہ اور اللہ تعالیٰ سے وابستہ چیزوں سے محبت کریں، جس کی تفصیل اسی کتاب میں ”محبت کے بیان“ میں موجود ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کریں اور یاد رکھیں، آسمان وزمین میں فکر کریں اور اللہ تعالیٰ کے احسانات کو یاد کریں، جس کی پوری تفصیل ان شاء اللہ ”ذکر اللہ کے بیان“ میں آجائیگی۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی تمام تعلیمات اور ہدایات یا بالفاظ دیگر پورے دین اسلام پر مضبوطی سے کار بند رہنے کی کوشش کریں اور نفس کی مخالفت کر کے اسلام کا کوئی حکم نہ ٹوٹنے پائے اور نہ کوئی ایسا کام کریں جس سے دین اسلام یا جو دین اسلام میں ناجائز اور ممنوع ہو۔

(۵) ایسے لوگوں کی صحبت میں رہیں جن میں دنیا کی محبت پر اللہ تعالیٰ اور آخرت کی محبت و خوف غالب ہو جس کی تفصیل ان شاء اللہ ”صحبت اور رفاقت کے بیان“ میں آجائیگی۔

اور اس کے ساتھ ساتھ نیت کو خالص کرنے کیلئے چند تجاویز بھی بتائی جاتی ہیں، ان شاء اللہ ان پر عمل کرنے سے اعمال میں اخلاص آسکے گا۔

### نیت کو خالص کرنے کیلئے چند تجاویز!

(۱) یہ سوچے کہ جس بدن کی راحت کیلئے اس کو خوش کرنے کیلئے کام کرتا ہوں یا عمل کر کے جن لوگوں کی

نگاہوں میں عزت اور تعریف چاہتا ہوں، نہ وہ رہیں گے اور نہ میں رہوں گا۔ تھوڑے دنوں کے بعد کوئی نہ پوچھے گا، پھر ایسی بے بنیاد چیزوں کی طلب میں اپنے اعمال کو برباد کر کے کیوں اپنی آخرت کو برباد کروں۔

(۲) بے اخلاصی اور ریاکاری پر آنے والی وعیدوں کو بار بار پڑھیں اور آخرت کو کثرت سے یاد کریں۔

(۳) اس دھیان کو حاصل کرنے کی کوشش کریں کہ آپ پر ہر وقت یہ بات چھا جائے کہ جیسے اللہ تعالیٰ کو تو دیکھ رہا ہے، ورنہ اتنا تو خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے دیکھ رہا ہے اور اس کے حصول کی کوشش کرتے رہیں۔ اور آخرت کو کثرت سے یاد کرنے اور اس دھیان کے پختہ کرنے کے لئے اس کا مراقبہ کیا کریں اور سب سے آسان اور سہل کام یہ ہے کہ اپنے آپ کو کسی باشرع نیک صالح ماہر صوفی کے سپرد کر دیں۔

چند چیزیں ریاکاری اور بے اخلاصی میں شامل نہیں!

(۱) اپنے استاد یا شاگرد یا مرشد یا کسی بزرگ کو اس نیت سے اچھی آواز بنا کر قرآن مجید سنانا کہ ان کا دل خوش ہو جائے، یہ ریا اور بے اخلاصی میں شامل نہیں۔

(۲) دوسری بات یہ کہ اگر نیت اللہ تعالیٰ کی رضا کی ہے پھر دل میں وسوسہ آتا ہے کہ شاید اس عبادت میں ریاکاری کرتا ہوں تو نفس کی خواہش کو پوری کرتا ہوں، تو یہ ریا اور بے اخلاصی نہیں بلکہ وسوسہ ریا یا وسوسہ بے اخلاصی ہے، اسکی ہرگز پرواہ نہ کریں اور نہ پریشان ہوں ورنہ شیطان وسوسہ ڈال کر اس عمل سے محروم کر دے گا، جیسا کہ پہلے بھی یہ بات بتلائی گئی ہے۔

(۳) تیسری بات یہ کہ غلطیوں کو بہر حال چھپانا چاہئے، اپنی غلطیوں اور خطاؤں کو چھپانا ریاکاری نہیں ہے۔

اخلاص نیت کیا ہے، اس کا خلاصہ!

اب اس بحث کے آخر میں پھر اخلاص نیت کے بیان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

کسی کام کو نفس کی تمام آمیزش سے پاک کر کے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا جوئی کے لئے کیا جائے یعنی دین کا جو بھی کام کرے اس میں نہ تو دکھلاوا ہو، نہ منصب و عزت اور اقتدار کی لالچ ہو، نہ راحت مطلوب ہو، مثلاً کوئی روزہ رکھنے سے کسی شہرت کا متمنی نہیں ہے لیکن روزہ اس لئے رکھتا ہے کہ پیٹ میں گرانی ہے تو اس خیال سے روزہ رکھے کہ پیٹ ٹھیک ہو جائے یا مثلاً کوئی ہوٹل کے کرایہ سے بچنے کی غرض سے مسجد میں اعتکاف کر لے یا گرمی کے موسم میں وضو پر وضو اس غرض سے کرے کہ ٹھنڈا ہو جائے یا کوئی مزدور نماز اس لئے لمبی پڑھے کہ اتنی دیر کام

کی محنت سے چھوٹ جائے، غرض جب اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے بجائے کسی دینی کام میں ذرہ برابر کسی طرح بھی نفس کی آمیزش پائی جائے تو وہ عمل خالص نہیں رہتا۔ جتنی آمیزش ہوگی اتنی مقدار اخلاص کی اس میں کم ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے ہاں خالص عمل ہی مقبول ہے اور اخلاص کے بقدر ہی وزنی ہوتا ہے۔ البتہ اگر کسی کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہی مقصود ہے لیکن ایک ہی عمل میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لائق متعدد نیتیں جمع ہو جائیں تو یہ اخلاص کے منافی نہیں بلکہ جس قدر نیتیں ہوگی اسی قدر ثواب زیادہ ہوگا، مثلاً مسجد جاتے وقت انتظار نماز کی نیت ہو، اعتکاف کی نیت بھی ہو اور یہ بھی غرض ہو کہ مسجد جا کر وہاں آنکھوں، کانوں کی حفاظت ہوگی اور یہ بھی نیت کریں کہ وہاں اللہ تعالیٰ کو یاد کروں گا، تلاوت، درود شریف، استغفار، تہلیل و تسبیح کروں گا۔ اسی طرح جتنی نیتیں ہوگی تو چونکہ یہ صرف ایک ہی طرح کی نیتیں ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی تو اس ایک عمل میں جس قدر اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے کاموں کی نیتیں کی جائیں گی، اتنا ثواب ملے گا۔ البتہ ضروری یہ ہے کہ دوسری جنس اور نفس کی لائن کی نیت نہ ہو ورنہ جتنی بری نیتیں ہوگی اس قدر گناہ ہوگا۔

### اخلاص کی علامتیں!

اخلاص کے بارے میں جب یہ معلوم ہوا کہ اس سے مراد ہر قول و فعل اور ہر سرگرمی اور دینی کام کا مقصد بس اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور آخرت کی کامرانی ہو، وہ کسی مال اور دنیاوی عزت کا حریص نہ ہو وہ کسی اقتدار اور منصب کا بھوکا نہ ہو، وہ دنیا میں کسی طرح کے خطابات و القاب اور داد کے حصول کا امیدوار نہ ہو تو اس سے خود بخود اخلاص کی علامتیں سامنے آ جاتی ہیں۔

جونیک کام لوگوں کے سامنے جس انداز میں کرے، اسی کام کو علیحدگی اور خلوت میں بھی اسی طرح کرے!

(۱) اخلاص کی ایک علامت یہ ہے کہ جونیک کام مثلاً نماز، صدقہ وغیرہ لوگوں کے سامنے جس انداز میں کرے، خلوت اور علیحدگی میں بھی اس کام کو اسی انداز سے کرے، جس حسن و خوبی کے ساتھ لوگوں کے سامنے کرتا ہے۔ ایک کاشتکار یا باغبان اپنی کھیتی اور باغ میں شب و روز کام کرتا ہے۔ لوگ اس کو دیکھیں یا نہ دیکھیں وہ اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا کیونکہ وہ اس محنت کے ذریعے لوگوں سے کوئی داد یا شاباش یا کسی مال و منصب کا خواہاں نہیں ہوتا بلکہ اسکی نظر فصل اور پھلوں پر رہتی ہے کہ اپنے وقت پر اس کھیت اور باغ سے مجھے غلہ اور پھل ملے گا۔ اسی

طرح جو شخص ہر کام میں صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت پر نظر رکھتا ہے اسکو نفع و نقصان، عزت و ذلت کا مالک مانتا ہو اور اس کی نظر آخرت پر لگی ہوئی ہو تو ہر حال میں خواہ اسکو لوگ دیکھیں یا نہ دیکھیں اپنے کام کو حسن و خوبی سے جاری رکھے گا، اسی حقیقت کو سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمایا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا صَلَّى فِي الْعَلَانِيَةِ فَاحْسَنَ وَصَلَّى فِي السِّرِّ فَاحْسَنَ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى هَذَا عَبْدِي

حَقًّا)

”بے شک جب بندہ علانیہ (لوگوں کے سامنے) نماز پڑھتا ہے تو حسن و خوبی سے پڑھتا ہے اور جب (تہائی میں) پوشیدہ طور پر پڑھتا ہے تو (اس وقت بھی اسی) حسن و خوبی کے ساتھ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا یہ سچا (اور راست باز) بندہ ہے۔“ (ابن ماجہ، مشکوٰۃ: باب الریاء)

**دینی اور نیک کاموں کا نتیجہ دنیا میں نہ ڈھونڈنا!**

(۲) اخلاص کی دوسری علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ نیک اور دینی کام کر کے اس کا نتیجہ دنیا میں تلاش نہیں کرتا بلکہ اس کی نظر اللہ تعالیٰ اور آخرت پر رہتی ہے، اس لئے وہ نیک اور دینی کام کر کے نتیجے سے بے فکر ہو جاتا ہے جیسا کہ کاشتکار اپنے کھیت اور باغ میں محنت مزدوری کر کے اسی وقت فصل اور پھل کا امیدوار نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے اصل وقت کا انتظار کرتا ہے اور فصل کاٹنے اور پھل لینے تک وہ فصل اور پھلوں کی تباہی اور ہلاکت سے ڈرتا رہتا ہے، کہ کوئی آسمانی یا زمینی آفت یا چرند پرند اسکو ضائع نہ کر دیں۔ یہی حال مخلص کا ہوتا ہے کہ وہ نتیجے کا انتظار آخرت میں کرتا ہے نہ کہ دنیا میں۔ یہی وجہ ہے کہ مخلص دینی و نیک کاموں کی وجہ سے کسی منصب و اقتدار اور کسی مسند و امارت پر فائز ہونے کا قطعاً لالچ نہیں کرتا بلکہ وہ ان جیسی چیزوں سے ڈرتا ہے کہ کہیں ان چیزوں کی وجہ سے آخرت کی کامیابیوں سے محروم نہ ہو جائے۔

**مخلص اپنے نیک کاموں کی تشہیر نہیں کرتا!**

(۳) اخلاص کی تیسری علامت یہ ہے کہ مخلص اپنے دینی اور نیک کاموں کی تشہیر نہیں کرتا کہ میں نے یا ہم نے یا ہماری جماعت نے یوں کیا اور یوں کیا۔ اور جو لوگ اپنے نیک اور دینی کاموں کو ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، دراصل وہ اپنے دینی اور نیک کاموں کا صلہ اور بدلہ اللہ تعالیٰ کے بجائے لوگوں سے اور آخرت کے بجائے دنیا میں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

### اخلاص کی علامت اجتماعی کاموں میں!

(۴) اخلاص کی چوتھی علامت کا تجربہ اجتماعی کاموں میں ہوتا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ اخلاص کا سب سے بڑا تجربہ اجتماعی کاموں میں ہوتا ہے، کیونکہ اجتماعی کاموں میں دین حق کے قیام و بقاء کیلئے اپنے ہم کام ساتھیوں کی باتوں، ناچاقیوں وغیرہ کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ کبھی امیر اور کبھی مامور، کبھی جرنیل اور کبھی سپاہی بننا پڑتا ہے۔ اب ایسی اونچ نیچ کی صورت میں اگر اخلاص کی قوت موجود ہو تو تمام مراحل اور ہر قسم کی اونچ نیچ میں وہ یکساں طور پر اپنی دینی محنت کو جاری رکھے گا کیونکہ وہ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ اور آخرت کیلئے کرتا ہے نہ کہ لوگوں اور منصب و عزت کے حصول کیلئے اور اگر اخلاص نہ ہو تو وہ بات بے بات بے جا تنقید کرتا رہے گا اور عزت و منصب کی صورت میں خوش ہوگا اور یہ چیزیں نہ ہونے کی صورت میں دوسروں کی ٹانگیں کھینچے گا۔ اور جو مخلص ہوتا ہے وہ دوسروں کو آگے کرے گا اور دوسروں کی ترقی سے خوش رہے گا اور دوسروں کو عزت اور ترقی پر اس کا دل باغ باغ ہوگا۔ یہ وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ کبھی ذلیل و رسوا نہیں کریگا۔

### ایک مخلص انسان دینی امور میں بہت لالچی ہوتا ہے!

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مخلص انسان دینی امور میں بہت لالچی ہوتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ راضی ہو جائے۔ اس لئے وہ چاہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کروں۔ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی مخلوق کی خدمت کروں اور جب کوئی دوسرا ایسا کام کرتا ہے تو اس کو رشک بھی ہوتا ہے اور یہ آرزو مند بھی ہوتا ہے کہ میں بھی اس طرح کام کروں تاکہ مجھ سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے، لیکن وہ حسد کے مرض میں مبتلا نہیں ہوتا۔

### آجکل اکثر دینی کام کر نیوالوں کا حال!

جیسا کہ آجکل اکثر دینی کام کرنے والوں کا حال ہے کہ ایک دینی ادارے والے دوسرے دینی ادارے کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دینی مدرسہ کے اہتمام کرنے والے دوسرے دینی مدرسہ کی بیخ کنی کر رہے ہیں، یہی حال دینی جماعتوں کا ہے اور یہی حال ایک ہی مدرسہ اور ایک ہی جماعت میں کام کرنے والوں کا ہے کہ ہر کوئی یہ چاہتا ہے کہ میرے نام کا ڈنکا بجے۔ وہ دوسروں کے عیب دیکھ کر اسکو چھپاتے نہیں بلکہ خود اس کے پھیلانے اور اس کی تشہیر کا ذمہ اپنے سر اٹھا لیتے ہیں بلکہ ہر ایک جماعت دوسری جماعت، ایک ادارہ دوسرے ادارے، ایک کارکن یا



استاد دوسرے کارکن اور استاد کی برائی اور غلطی کیلئے شدت سے منتظر رہتا ہے تاکہ کسی طرح وہ بدنام ہو جائے۔ یہ خالص شیطانی ذہنیت ہے ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہ کہیں قیامت میں شیطانوں کی صف میں نہ کھڑے ہوں۔ اللہ تعالیٰ سب کی ستاری فرمائے۔ ورنہ جہاں تک اخلاص اور للہیت کی بات ہے وہ آجکل کے مسلمانوں میں بہت کم پائی جاتی ہے اور اسی وجہ سے دینی کاموں اور بظاہر نیک کاموں کے باوجود روز بروز ہمارا معاشرہ جنتی معاشرہ ہونے کے بجائے جہنمی معاشرہ بن رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص و للہیت کی دولت سے نوازے، آمین!

### مخلص احسان جتانے والا اور ستانے والا نہیں ہوتا!

(۵) اخلاص کی پانچویں علامت یہ ہے کہ مخلص شخص اپنی دینی خدمات اور نیک کاموں، اپنے کئے ہوئے صدقات وغیرہ کی وجہ سے نہ کسی پراحسان جتلائیگا اور نہ ان کی وجہ سے کسی سے دنیوی فائدے یا داد اور شکریہ حاصل کرنے کا امیدوار ہوگا اور نہ وہ ان کاموں کی وجہ سے کسی کی دل ازاری کرے گا۔ وہ تو اس ذات سے اجر و ثواب کا امیدوار ہوگا جس کی خوشنودی اور رضا جوئی کیلئے اس نے کام کیا ہے اور جو شخص دوسروں پر احسان جتلاتا ہے یا دوسروں سے عزت یا داد اور شکریہ وغیرہ کے حصول کا طلبگار اور امیدوار ہو یا وہ اپنے کئے ہوئے احسان کی وجہ سے کسی کی دل ازاری کرتا ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس نے یہ کام اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے نہیں کئے بلکہ اس نے وہ کام لوگوں کیلئے کیا ہے جس کا بیان پہلے مدلل اور مفصل گزر چکا ہے۔

### مخلص دوسروں کے نیک کاموں سے خوش ہوتا ہے!

(۶) اخلاص کی چھٹی علامت یہ ہے کہ وہ دوسروں کے نیک کاموں سے خوش ہوتا ہے اور جس ہاتھ سے بھی کوئی برائی مٹ جائے تو وہ اس سے خوش ہوتا ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کیساتھ سچی محبت ہوتی ہے اور اسکے دین سے اسکو سچا لگاؤ ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کیساتھ خیر خواہی کرنے کا طالب ہو، ظاہر ہے کہ ایسا شخص دوسروں کے نیک کاموں سے خوش ہوگا اور وہ اس کو پسند کریگا اور اس کا ایک گونہ احسان مند ہوگا کہ گویا وہ اسی کام کرتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص دوسروں کے نیک کام کو پسند نہیں کرتا اور جب دوسروں کے ہاتھ کوئی برائی مٹے تو وہ اس سے خوش نہ ہو تو وہ شخص مخلص نہیں ہو سکتا بلکہ خود پرست اور مفاد پرست ہے، وہ دین پھیلانا اور بے دینی کو مٹانا نہیں چاہتا بلکہ دین کے پھیلاؤ اور بے دینی کے مٹانے میں عزت اور منصب کا خواہشمند نہیں ہے۔ اس لئے جب دوسروں کے ہاتھ نیک کام وجود میں آئے اور یا کوئی برائی ختم ہو جائے تو وہ اس

سے جلتا ہے کہ یہ عزت اور منصب دوسرے کو کیوں ملی اور یہ داد اور عزت میں نے کیوں نہ حاصل کی۔ اس لئے ایسا شخص دوسروں کے نیک کام کا معترف نہ ہوگا اور نہ ان نیک کاموں کی تعریف کو برداشت کر سکے گا۔ اسکی مثال یوں سمجھیں کہ بھائیوں کی ایک مشترک کھیتی ہے، اس میں جھاڑ جھنکار پھیلی ہوئی ہے ایک بھائی اس کھیتی میں کام کر رہا ہے اس جھاڑ جھنکار کو بن بیج سے اکھاڑ رہا ہے لیکن وہ جھاڑ جھنکار زیادہ ہے وہ اس کو پوری طرح صاف نہیں کر سکتا اور اسی اثناء میں اس کی غیر موجودگی میں اس کا دوسرا بھائی آتا ہے وہ پوری ہمت سے اس میں کام کر کے اس کھیتی کو صاف کر لیتا ہے ایسی صورت میں تو پہلا بھائی اس دوسرے بھائی کا احسان مند ہوگا اور اس سے خوش ہوگا کہ اس نے اس کا ہاتھ بٹایا۔ اسی طرح ایک مخلص شخص بھی دوسروں کے نیک اور دینی کاموں سے اس وقت تک خوش رہتا ہے جب تک کہ وہ ان کاموں میں کسی خرابی اور فساد کے مرتکب نہ ہوں۔

**مخلص دینی اور نیک کام کر کے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے!**

(۷) اخلاص کی ساتویں علامت یہ ہے کہ دینی اور نیک کام کر کے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو مثلاً جس شخص سے اللہ تعالیٰ دین کا بہت کام لے رہا ہے اور لوگوں کو اس سے بہت زیادہ دینی نفع پہنچ رہا ہے اور خود بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر اور مخلوق الہی کی خدمت میں مصروف ہے اور اسکی وجہ سے لوگوں دینی و دنیوی، مادی و روحانی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اب اگر یہ شخص ان تمام نعمتوں کے بارے میں یہ خیال کرتا ہے کہ یہ میرا کمال ہے تو اس میں فخر و ناز کے نفسیات پیدا ہونگے اور یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری، خود پرستی اور بے اخلاصی کی علامت ہے۔ اگر ان نعمتوں کے بارے میں اس کا یہ پختہ یقین ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ہی فضل و کرم ہے تو اس کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہوگا۔ وہ ایک تو اس بات سے خوف کھائے گا کہ کہیں یہ ترقی استدراج نہ ہو کہ اس کی وجہ سے ہلاکت و تباہی میں پڑ جاؤں خدا خواستہ میری کوئی بات یا عمل اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہو، جس کی وجہ سے یہ نعمت مجھ سے چھین لے یا کہیں اپنے کمال پر نظر چلی گئی ہو، حالانکہ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی نوازشات ہیں تو ایسی صورت میں لازماً اس کا وبال یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ یہ نعمتیں مجھ سے چھین لے گا۔ اس طرح وہ نیک اور دینی کام کرتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے خوف سے لرزتا رہتا ہے اور یہی اخلاص اور اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامت ہے۔

**جو شخص اپنے آپ کو مخلص سمجھتا ہے وہ مخلص نہیں!**

اور جو شخص اپنے آپ کو مخلص سمجھتا ہے وہ حقیقی معنوں میں مخلص نہیں کیونکہ جو شخص اپنی عبادت اور اللہ تعالیٰ کی

بندگی میں اپنے آپ کو مخلص سمجھتا ہے اسکے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی محبت کی کمی ہے اور جس شخص کے اندر عظمت اور محبت کی کمی ہوتی ہے تو اسکی نظر اپنے اعمال پر ہوتی ہے اور اکثر یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی بے اخلاصی ہی کو اخلاص سمجھتا ہے اور اپنے اعمال پر فخر کرنے لگتا ہے کہ گویا میں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ احسان کیا ہے، حالانکہ اگر سچی محبت اور عظمت ہوتی تو ایک عشق ہزار بدگمانیاں ہوتیں، ایسی صورت میں اسکی نظر کبھی اپنے اعمال پر نہیں پڑتی وہ تو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال کو دیکھ کر اپنے کئے ہوئے اچھے اعمال کو دیکھ کر پانی پانی ہو جاتا اور اسکو یہ ڈر لگتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا یہ عمل میرے منہ پر مارا جائے۔ اس لئے تو وہ نیک اعمال کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑ گڑاتا ہے کہ یا اللہ میرا یہ عمل (جس کی توفیق بھی تو نے ہی دی تھی) آپ کی شان اور پورے اخلاص کے ساتھ ادا نہیں ہوئی مگر آپ ہی اس کو اپنی شان کی مطابق قبول فرمائیے۔

مخل داعی حق خلوت اور تنہائی کے ذکر و مناجات کے لئے بے چین رہتا ہے!

(۸) اخلاص کی آٹھویں علامت یہ ہے کہ مخلص داعی حق اور مصلح، خلوت اور تنہائی میں اللہ تعالیٰ کی یاد اور اسکے ساتھ مناجات کیلئے بے چین رہتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ مخلص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت رکھتا ہے اس لئے وہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کا حکم مان کر لوگوں میں دین کے لئے بھاگ دوڑ کرتا ہے اور دینی خدمات کو انجام دیتا ہے اور دوسری طرف اس کا دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ اٹکا ہوا ہوتا ہے وہ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اور اسکی نظر اللہ تعالیٰ پر ہوتی ہے، جس وقت وہ دوسروں کی علمی، مالی یا جانی خدمت کرتا ہے لیکن اس وقت چونکہ اس کا خیال مخلوق کی طرف ہوتا ہے کہ لوگوں کیساتھ مشغول رہتا ہے اس لئے وہ بے چین رہتا ہے کہ جلد از جلد اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر کے یکسوئی کیساتھ اپنے محبوب حقیقی کو یاد کرے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ کوئی معشوق و محبوب اپنے محبت اور عاشق کو کسی کام پر بھیجے تو اس کام کو کرتے ہوئے اس کا دل محبوب کیساتھ اٹکا رہتا ہے اور وہ اس کام کو حسن و خوبی کیساتھ انجام دینے کیلئے بھاگ دوڑ بھی کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کیلئے بھی بے چین رہتا ہے کہ میں اس کام سے فارغ ہو کر جلد از جلد اپنے محبوب سے تنہائی میں ملوں۔ یہی حال مخلص اور اللہ تعالیٰ کے سچے بندے کا ہوتا ہے، اس کا دل ہر وقت یہی چاہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کیساتھ تنہائی میں مناجات کرے، ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کی یاد میں مصروف ہو، مگر اپنے محبوب حقیقی اللہ رب العالمین ہی کا حکم ہوتا ہے کہ اسکی ہدایات دوسروں کو پہنچائے اس کی مخلوق کی علمی، مال و جانی خدمت کرے۔ اس لئے اپنے پروردگار اور محبوب کے حکم کی تعمیل میں اپنی خواہش کو فغا کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم اور اپنی ذمہ داری پوری کر کے خلوت اور تنہائی کی طرف لپک جاتا ہے، حضرات

انبیاء علیہم السلام خصوصاً نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سچے مصلحین اور مبلغین کی زندگیوں پر نظر کریں تو ان کی زندگیوں میں یہی دو طرفہ بے چینی کو پائیں گے۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ اور اسکے حکم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے لئے بے چین ہوتے ہیں اور ان کی خدمت میں سرگرم رہتے ہیں اور دوسری طرف خلوت و تنہائیوں میں اپنے محبوب حقیقی کے ساتھ مناجات کرتے ہیں، اسکو یاد کرتے ہیں اور اسکے سامنے ایسے بے چینی اور دلی جوئی سے روتے ہیں جیسا کہ آگ پر رکھی ہوئی ہانڈی جوش مارتی ہے اور اسکے برعکس جو لوگ دین کے کام کرتے ہیں، خواہ وہ عورت و تبلیغ ہو یا درس و تدریس ہو یا جہاد اور اصلاح کا کوئی کام۔ وہ اگر انہی کاموں میں اس قدر مشغول ہوں کہ ان کو ہر وقت لوگوں میں بیان اور کام کرنے کا شوق چڑھتا رہتا ہو اور وہ خلوت و تنہائی کیلئے بے چین نہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اسکو اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ شدید محبت نہیں جو مومن کیلئے ضروری ہے اور وہ یہ کام اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ اپنے نفس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے کرتے ہیں، ورنہ اگر ان کو اللہ تعالیٰ سے صحیح معنوں میں محبت ہوتی تو ان کا دل تنہائی اور خلوت کے ذکر اور یاد میں خوش ہوتا اور ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز و ذکر الہی میں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح معنوں میں اپنا بندہ بنائے اور ہم سب کو صدق و اخلاص سے نوازے، آمین!

## تکبر و غرور کا بیان!

تکبر اور غرور بدترین مرض ہے اور بہت سے باطنی امراض اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حسد، بخل اور حقوق کی ادائیگی میں دھاندلی اور ریا وغیرہ۔

## تکبر کے معنی!

”کبر“ بڑائی کو کہا جاتا ہے اور تکبر بڑائی کے اظہار کو کہتے ہیں۔ جب کوئی انسان اپنے اندر کوئی وصف و کمال دیکھتا ہے تو اس کے دل میں اس کمال کا خیال پیدا ہوتا ہے اور جب خیال ترقی کرتا ہے تو وہ ان لوگوں کو جن میں یہ وصف و کمال دکھائی نہیں دیتا یا کم پایا جاتا ہے تو وہ ان کو اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ ”یہی وہ بڑائی ہے کہ جس کو کبر کہا جاتا ہے اور پھر جب وہ باطنی برائی کو اپنے قول و فعل یا ادا سے ظاہر کرتا ہے تو اس کبر کے اظہار کو تکبر کہا جاتا ہے۔“

اور نبی کریم ﷺ نے ”کبر“ کی حقیقت کو یوں بیان فرمایا کہ:

”الْكِبَرُ بَطْرُ الْحَقِّ وَغَمَطُ النَّاسِ“

”کبر یہ ہے کہ حق بات کو ہٹ دھرمی سے نہ ماننا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔“ (مسلم، مشکوٰۃ)

## تکبر کے درجات اور اس کا پہلا درجہ!

تکبر کے بڑے بڑے دو درجے ہیں۔

(۱): تکبر کا پہلا درجہ حق کے معاملہ میں تکبر کرنا ہے کہ قصداً حق کا انکار اس لئے کیا جائے کہ وہ حق اس

متکبر کے بجائے دوسرے کے پاس ہوتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اس حق کو جو دوسرے کے پاس ہے اگر قبول کرے تو یہ اس دوسرے کی برتری

کو تسلیم کرنا ہوتا ہے اور اس سے اس کا پندار سیادت مجروح ہوتا ہے اس لئے وہ سرے سے حق کا ہی انکار کرتا ہے۔

ہٹ دھرمی سے حق سے ٹکرانے والے کون لوگ ہوتے ہیں؟

جو لوگ قصداً حق سے ٹکراتے ہیں وہ قوم کے وہ مغرور اور متکبر لوگ ہوتے ہیں جو دینی یا دنیوی لحاظ سے

لوگوں کی قیادت و پیشوائی کرتے ہوں۔

انہیں مغرور قائدین، پیشوا اور لیڈروں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ۖ إِن فِي صُذُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيهِ﴾

”جو لوگ کسی حجت و سند کے بغیر جو ان کے پاس آئی ہو اللہ تعالیٰ کی آیتوں میں جھگڑا (اور کجی نکال کر ان کا انکار) کرتے ہیں (اس کی وجہ اور کوئی نہیں بلکہ) ان کے دلوں میں صرف کبر ہوتا ہے کہ وہ اس تک کبھی پہنچنے والے نہیں۔“ (مؤمن: ۵۶)

اس کا مطلب وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے کہ لوگوں کی مخالفت کا سبب یہ نہیں کہ ان سے حق مخفی ہے یا ان کے پاس اس کے خلاف کوئی سند، حجت اور دلیل ہے بلکہ یہ صرف اس وجہ سے مخالفت کر رہے ہیں کہ ان کے دلوں میں کبر اور بڑائی ہے وہ ڈرتے ہیں کہ اگر انہوں نے تمہاری بات تسلیم کر لی تو یہ تمہاری برتری تسلیم کر لینا ہے جس سے ان کا پندار سیادت مجروح ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں وہ تمہارے مقابلے میں اپنی برتری کھودیں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جانتے بوجھتے ہوئے حق سے ٹکرانے والے دراصل وہ مغرور لوگ ہوتے ہیں جو دینی اور دنیاوی اعتبار سے لوگوں کی قیادت اور پیشوائی کرتے ہوں اور عام لوگ چونکہ ان کے پیروکار اور ان کے ماننے والے ہوتے ہیں اس لئے ان کی وجہ سے ابتداءً عوام کی اکثریت حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ البتہ جب ان مغروروں باطل پرستوں کا زور ٹوٹ جاتا ہے تو سادہ لوح عوام کی آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں اور پھر وہ بھی حق کو اپنالیتے ہیں۔

تکبر کا دوسرا درجہ!

(۲): تکبر کا دوسرا درجہ مخلوق کے معاملے میں تکبر کرنا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے یا حسن و جمال سے یا جسمانی قوت و طاقت سے یا علم سے نوازا ہے یا انہیں اللہ تعالیٰ نے کسی شرف والے خاندان میں پیدا کیا ہے یا انہیں اقتدار و عزت نصیب کی ہے یا انہیں کثرت سے نوافل اور ذکر و عبادت اور نیک کاموں کی توفیق ملی ہو، تو بہت سے ناشکرے اور مغرور ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ان خداداد نعمتوں کی وجہ سے دوسروں کو حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ صحیح رویہ یہ ہے کہ ان نعمتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے اور ان نعمتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر بندوں کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان کو حسن و خوبی سے پورا کریں۔

اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس اور تکبر!

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار نعمتیں عنایت فرمائی ہیں پھر انسانوں میں سے بعض کو وہ نعمتیں اور صلاحیتیں

مل گئیں جو دوسروں کو نہیں ملی۔ اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو علم کی عظیم نعمت سے نوازا، کسی کو مال و دولت کی فراوانی نصیب فرمائی، کسی کو دوسروں پر حاکم اور بادشاہ بنایا، کسی کو دو آنکھیں اور بہترین بینائی دی، کسی کو اچھی صحت ملی، کسی کو عزت والا منصب عطا فرمایا۔ اسی طرح انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے کے مقابلے میں مختلف خوبیوں، صلاحیتوں سے نوازا ہے۔

اور لوگ اس پر خوش ہوتے ہیں کہ ہم کو یہ یہ نعمتیں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ملی ہیں یہ خوش ہونا تکبر نہیں، بلکہ ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ سے خوش اور راضی رہنا ضروری ہے اور ان کا انکار کفرانِ نعمت، ناشکری اور اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں کی ناقدری ہے۔

لہذا اگر کوئی اپنے اوپر دوسروں سے زیادہ نعمتوں کا احساس کرتا ہے مثلاً مال و دولت والا شخص یہ سمجھتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک فقیر کے مقابلہ میں زیادہ مال و دولت عنایت فرمائی ہے یا ان پڑھ کے مقابلے میں پڑھا لکھا عالم دین بنا دیا ہے یا بیماری کے مقابلے میں صحت بخشی ہے یا دوسروں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کمال میں ممتاز فرمایا ہے تو یہ تکبر میں داخل نہیں۔ تکبر تو یہ ہے کہ اپنے آپ کو ان خوبیوں اور نعمتوں کا مستحق سمجھ کر دوسروں کو حقیر یا اپنے آپ کو دوسروں سے افضل سمجھے۔

بندوں کے لئے صحیح رویہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے بارے میں یہ خیال کرے کہ میری ذات میری صلاحیتیں اور یہ تمام نعمتیں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا عطیہ اور بخشش ہیں میری ذات میں کوئی بھی کمال اور کسی عمل کی ذرہ برابر صلاحیت نہ تھی اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے یہ نعمتیں نصیب فرمائی ہیں اور ہر وقت اس اندیشہ میں رہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ ناراض ہو کر مجھ سے یہ نعمتیں چھین نہ لے۔ کسی کو بھی حقیر نہ جانے خواہ اس کا ظاہر جس طرح بھی ہو۔ اس کے متعلق یہی خیال کرے کہ ہو سکتا ہے کہ اس کے اندر کوئی ایسی خوبی ہو جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مجھ سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ ہو جائے یا آنے والے وقت میں اس کو ہدایت ہو جائے کہ وہ بڑے بڑے دینی کام کر کے انجام کے اعتبار سے مجھ سے بڑھ جائے۔

میری کوئی عادت خدا نخواستہ ایسی بری ہو، جو میرے لئے آخرت کی بربادی کا باعث بنے۔

ہم زندگی میں بار بار اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ صاحب منصب اور حاکم جیل میں جاتے ہیں اور فقیر بادشاہ بن جاتے ہیں۔ بعض دیندار لوگ بالآخر گمراہ ہو کر دنیا سے اسی حال میں چلے جاتے ہیں، فساق و فجار اور کافر ہدایت پا کر ایسے بڑے بڑے دینی اور خیر خواہی کے کام کر جاتے ہیں کہ وہ پیدائشی مسلمانوں اور نیکوکاروں سے بھی



بڑھ جاتے ہیں۔

لہذا اللہ تعالیٰ کے بندوں کو چاہئے کہ وہ کسی کو حقیر اور خود کو دوسروں سے افضل نہ سمجھیں کیونکہ فضیلت کا دار و مدار اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبولیت پر ہے۔ بندے تو صرف اتنی بات معلوم کر سکتے ہیں کہ فلاں صاحب کمال ہے یا کوئی صحت مند ہے یا بیمار۔ مگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون افضل اور بہتر ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

**تکبر کی مذمت اور اس کے دنیاوی اور اخروی نقصانات!**

تکبر بہت سے روحانی اور اخلاقی امراض اور تمام رزائل جیسے ریا، بغض، کینہ اور حسد وغیرہ کی ماں اور بنیاد ہے اور بہت سی بیماریاں اسی ایک مرض سے جنم لیتی ہیں۔ تکبر انتہائی سخت جرم ہے قرآن وحدیث میں اس بارے میں بہت زیادہ وعیدیں آئی ہیں اور اس مرض کی بہت زیادہ مذمت بیان فرمائی گئی ہے۔  
ذیل میں نبی کریم کے ارشادات میں کچھ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

**متکبر اللہ تعالیٰ کا حریف بنتا ہے!**

جو آدمی کبر اور تکبر کے مرض میں مبتلا ہے اور اپنی بڑائی کا اظہار کرتا ہے تو دراصل یہ شخص اپنی حقیقت کو بھولا ہوا ہے اور بندگی کے بجائے خود اللہ تعالیٰ کا حریف اور مد مقابل بن جاتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَلِلَّهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمَوَاتِ وَرَبِّ الْأَرْضِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ وَلَهُ الْكِبَرِيَاءُ فِي السَّمَوَاتِ

وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝﴾

”پس ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں جو رب ہے آسمانوں کا اور رب ہے زمین کا، رب ہے تمام جہانوں کا، اسی کے لئے بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔“ (سورہ جاثیہ: ۳۶-۳۷)

جب ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں اور وہی اس بے انتہا عظیم کائنات کا پروردگار ہے اور وہی تمام جہانوں کا رب اور مالک ہے۔ تو پھر دوسرے کے لئے ہرگز یہ زیبا نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہو کر اللہ تعالیٰ کی کائنات میں تکبر کا رویہ اختیار کرے۔

﴿وَلَهُ الْكِبَرِيَاءُ...﴾ ”اور بڑائی اسی کے لئے ہے.....“

یہ دوسری آیت اوپر والی پہلی آیت کا نتیجہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس ساری کائنات کا پروردگار اس کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور ساری تعریفیں اسی کے لئے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہوئے آسمانوں اور زمین میں کسی دوسرے کے لئے کبریائی اور بڑائی کی گنجائش کہاں سے نکل آئی۔

پس کبریائی کا حقدار تو وہی ہے تو سب کو اسی کے سامنے سر تسلیم خم اور صرف اسی کے آگے سرافگندہ ہونا ہے اگر کوئی اس کی مملکت میں اس کے مقابل سر اٹھاتا ہے تو وہ اس کی کبریائی کو چیلنج کرتا ہے اور جو اس کی کبریائی کو چیلنج کرے گا تو وہ لازماً تباہ و برباد ہو جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ عزیز یعنی غالب زبردست ہے تو اس وجہ سے کوئی اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ بہت سے مشرکین متکبر و دندنا تے پھرتے ہیں تو گویا وہ اللہ کی گرفت سے باہر ہو گئے ایسا ہرگز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ان کی سرکشی کے لئے مہلت دے رکھی ہے اور اس مہلت میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمت ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ عزیز کے ساتھ حکیم بھی ہے اور اس کا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کفار کی بدحواسی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

﴿ذَلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ بِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُونَ ۝﴾

”یہ اس سبب سے ہے کہ تم زمین میں ناحق اتر اترتے اور اٹھ اٹھتے رہے۔“ (مؤمن: ۷۵)

اللہ تعالیٰ ہی تمام کائنات کا خالق و مالک ہے اور سب کچھ اسی کی ملکیت ہے۔ اس وجہ سے کبریائی صرف اسی کے لئے زیبا ہے۔ اگر کوئی دوسرا اس کائنات میں تکبر کرتا ہے تو یہ بڑائی کا ناحق اور جھوٹا دعویٰ ہے اور ایسا شخص اللہ تعالیٰ کی خاص ردا اپنے اوپر ڈالنے کی جسارت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا حریف بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اسی حقیقت کی طرف ایک حدیث قدسی میں اشارہ کیا گیا ہے۔

چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

(الْكِبَرِيَاءُ رِدَائِي وَالْعِظْمَةُ إِزَارِي فَمَنْ نَارَ عَنِي وَاحِدًا مِنْهُمَا أَدْخَلْتُهُ النَّارَ)

”کبریائی اور بڑائی (تمہارے اعتبار سے) میری چادر ہے اور عظمت (تمہارے اعتبار سے) میرا ازار (یعنی تہبند) ہے پس جو شخص ان دونوں میں سے کسی ایک میں بھی مجھ سے جھگڑا کرے گا تو میں اس کو جہنم میں ڈال دوں گا۔ (مسلم و مشکوٰۃ)

## تکبر شرک ہے!

مذکورہ بالا آیتوں اور حدیث سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوئی کہ متکبر حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا حریف و مد مقابل بنتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ تکبر شرک ہے۔

## جس دل میں تکبر موجود ہو اس کو ہدایت نہیں ملتی!

جس کے دل میں جب تک تکبر کا یہ خطرناک مرض موجود ہو تو اس کو ہدایت نہیں مل سکتی یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی مزاحمت اور مخالفت انہیں لوگوں نے کی جو اپنے آپ کو اور لوگوں سے بڑا سمجھتے تھے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو بڑی بڑی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے سردروں کے پاس بھیجا لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایت کے قبول کرنے سے مسلسل اس لئے انکار کیا کہ ان کے دلوں میں کبر تھا اور وہ اپنے آپ کو سب سے بالا تر سمجھتے تھے۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ثُمَّ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ وَأَخَاهُ هَارُونَ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ۝ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ وَكَانُوا قَوْمًا

عَالِينَ ۝﴾

”پھر ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون (علیہما السلام) کو بھیجا اپنے نشانوں اور کھلی دلیل کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس تو انہوں نے تکبر کیا اور وہ مغرور لوگ تھے۔“ (مؤمن: ۴۵-۴۶)

## مغرور کے دل پر اللہ تعالیٰ کی مہر لگ جاتی ہے!

جو لوگ مسلسل غرور اور اپنے گھمنڈ کے مرض میں مبتلا رہتے ہیں تو بالآخر سنتِ الہی کے مطابق ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لئے ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ مُنْكَبِرٍ جَبَّارًا ۝﴾

”اسی طرح اللہ تعالیٰ مہر لگا دیتا ہے ہر مغرور اور سرکش کے دل پر۔“ (مؤمن: ۵۳)

## مغرور شیطان مردود کا بھائی ہے!

جو شخص فخر و غرور میں مبتلا رہتا ہے حقیقت میں وہ شیطان کی سنت کو اپناے ہوئے ہے اور اس کا پیروکار و

بھائی ہے اور شیطان ہی پہلا مغرور ہے اور اسی غرور کے نتیجے میں ملعون اور مردود ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے شیطان کے واقعہ کو بیان فرمایا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے (حضرت) آدم (علیہ السلام) کو پیدا کیا اور ان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا تو اللہ تعالیٰ نے فرستوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں تو ان سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کی نافرمانی کی وجہ بھی بتلائی کہ:

﴿اَبٰی وَ سَتَكْبَرُ وَ كَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ ۝﴾

”اس ابلیس نے انکار کیا اور تکبر (و غرور) کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔“ (سورہ بقرہ: ۳۰-۳۲)

مغرور لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم اور اللہ تعالیٰ کو مبغوض ہوتے ہیں!

جن لوگوں کے دلوں میں تکبر و غرور سمایا ہوا ہوتا ہے وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم اور اللہ تعالیٰ کو مبغوض ہوتے ہیں اس حقیقت کی نشاندہی قرآن مجید نے بہت سے مقامات میں مختلف اسلوب سے کی ہے یہاں بطور نمونہ صرف ایک ہی آیت پیش کی جاتی ہے:

﴿اَلْهٰكُمُ اللّٰهُ وَ اٰحَدٌ جَ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْآخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكَرَةٌ وَ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ لَا جَرَمَ

اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ط اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۝﴾

”تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے پس جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے انکے دل انکار کرنے والے ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ یقیناً جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں بے شک وہ (اللہ تعالیٰ) تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“ (نحل: ۲۲-۲۳)

ان دونوں آیتوں میں سے پہلی آیت میں منکرین حق کے انکار کا سبب استکبار بتایا گیا ہے اور دوسری آیت میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس انکار کا باطنی محرک اور ان کے اس ظاہری انکار کو خوب جانتا ہے اور وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ ان کے دلوں میں استکبار اور غرور کا خناس سمایا ہوا ہے اس وجہ سے وہ حق کو حق مانتے ہوئے جھٹلا رہے ہیں اور آخر میں بتایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ متکبروں اور مغروروں کو دوست نہیں رکھتا۔ دوست نہ رکھنے کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو مبغوض رکھتا ہے۔

مغرور اور متکبر کا ٹھکانا جہنم ہے!

جو لوگ غرور اور تکبر کا شکار ہوتے ہیں ان کا ٹھکانا جہنم ہے اس بارے میں بہت سی آیتیں موجود ہیں

یہاں صرف چند ایک پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ

دَاخِرِينَ ۝﴾

”اور تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ مجھ کو پکارو میں تمہاری درخواست قبول کروں گا۔ جو لوگ میری بندگی

سے تکبر (یعنی سرتابی) کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔“ (المؤمن: ۶۰)

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے متکبرین اور مشرکین پر پڑنے والی سختیوں کا ذکر کیا ہے کہ ان کی گردنوں میں

طوق ہوں گے اور زنجیریں ہوں گی اور وہ کھولتے ہوئے پانی میں گھیٹے جائیں گے وغیرہ یہ تمام سختیاں بیان کر کے

آخر میں فرمایا ان مشرکین و متکبرین سے کہا جائے گا کہ:

﴿ذَلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ بِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُونَ ۝ ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ

خَالِدِينَ فِيهَا جَ فَيَسَّ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ ۝﴾

”یہ اس سبب سے ہے کہ تم زمین میں ناحق اتراتے تھے اور اس سبب سے کہ تم غرور اور گھمنڈ کرتے

تھے۔ (اب) داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں، اس میں ہمیشہ رہنے کے لئے پس کیا ہی برا ٹھکانا ہے تکبر اور

غرور کرنے والوں کا۔“ (مؤمن: ۷۵-۷۶)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قِيلَ ادْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا جَ فَيَسَّ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ ۝﴾

”کہا جائے گا کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ رہنے کے لئے پس کیا برا ٹھکانا ہے

تکبر و غرور کرنے والوں کا۔“ (زمر: ۷۲)

ہر متکبر جہنم میں ہوگا!

ایک حدیث کے آخر میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ النَّارِ كُلُّ غُتْلٍ جَوَاطٍ مُتَكَبِّرٍ)

”کیا میں تم کو بتاؤں کہ دوزخی کون ہے؟ ہر اکھڑا، بدخوا اور مغرور شخص۔“ (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ)

جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا!  
تکبر اللہ تعالیٰ کو اس قدر ناپسند اور مبغوض ہے کہ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر موجود ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرمایا کہ:

(لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبَرٍ)

”وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر موجود ہوگا۔“ (بخاری و مسلم)

اس کا مطلب یہ ہے کہ تکبر اس قدر خطرناک مرض ہے کہ جب تک ذرہ برابر بھی دل میں موجود رہے گا اس وقت تک وہ بندہ سیدہا جنت میں داخل نہ ہو سکے گا بلکہ اس کو اس کی قلبی کھوٹ دور کرنے کے لئے جہنم میں پھینکا جائے گا اور جب وہاں آگ میں اس کا مدہ تکبر پوری طرح جل جائے گا اور غرور کی گندگی سے بالکل پاک و صاف ہو جائے گا تو پھر اگر وہ شخص صاحب ایمان ہے تو اس کے بعد جنت میں داخل ہو سکے گا۔

متکبر اور مغرور کو اللہ تعالیٰ دنیا میں خنزیروں سے بھی زیادہ ذلیل کرے گا!

متکبر اور مغرور کو اللہ تعالیٰ دنیا میں خنزیروں سے بھی زیادہ ذلیل و رسوا کرے گا جیسا کہ ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ:

(وَمَنْ تَكَبَّرَ وَضَعَهُ اللَّهُ وَهُوَ فِي أَعْيُنِ النَّاسِ صَغِيرٌ وَفِي نَفْسِهِ كَبِيرٌ حَتَّى هُوَ آهَوْنٌ عَلَيْهِمْ)

مِنْ كَلْبٍ أَوْ خَنزِيرٍ.)

”اور جو کوئی تکبر اور غرور کا رویہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو نیچے گرا دے گا۔ چنانچہ وہ لوگوں کی نظروں میں تو حقیر و ذلیل ہو جائے گا اگرچہ وہ خود اپنے خیال میں اپنے آپ کو بڑا سمجھے گا۔ (لیکن دوسروں کی نظروں میں اس قدر گرجائے گا) یہاں تک کہ وہ ان کی نظروں میں کتوں اور خنزیروں سے بھی زیادہ حقیر ہو جائے گا۔ (بیہقی، مشکوٰۃ)

قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے متکبرین کی تصویر کو ﴿ثَانِي عَظْفَةٍ﴾ کے ساتھ بیان کر کے اس کے

بارے میں فرمایا ہے کہ:

﴿لَهُ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَنَذِيقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَذَابَ الْحَرِيقِ﴾

”اس کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو جلتی ہوئی آگ کا عذاب چکھائیں

گے۔“ (سورہ حج: ۹)

### متکبر اور مغرور کی روزِ محشر میں ذلت!

متکبر اور مغرور کا اصل ٹھکانا جہنم ہے لیکن موت کے بعد متکبر کو جس قدر ذلت آمیز مراحل پیش آنے ہیں ان میں سے ایک مرحلہ محشر بھی ہے۔ محشر کے دن اس کو جو عذاب اور جو تکلیف ہوگی وہ تو اپنی جگہ ہوگی اس کے ساتھ ساتھ اس کو یوں ذلیل کیا جائے گا۔

حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے اور وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے

ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

(يُحْشَرُ الْمُتَكَبِّرُونَ أَمْثَالَ الدَّرِّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ فِي صُورِ الرِّجَالِ يَعْشَاهُمُ الدُّلُّ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ يُسَاقُونَ إِلَى سِجْنٍ فِي جَهَنَّمَ يُسَمَّى بَوْلَسَ تَعْلُوهُمْ نَارُ الْأَنْبَارِ يُسْقَوْنَ مِنْ خُصَارَةِ أَهْلِ النَّارِ طِينَةَ الْخَبَالِ)

”قیامت کے دن فخر و غرور کرنے والوں کو چھوٹی چیونٹیوں کی طرح مردوں (یعنی انسانوں) کی صورت میں جمع کیا جائے گا۔ پھر ان کو جہنم کے ایک قید خانے کی طرف جا کا نام بولس ہے ہانکا جائے گا وہاں آگوں کی آگ ان پر چھا جائے گی اور دوزخیوں کا نچوڑ (یعنی ان کے بدنوں سے بننے والا خون، پیپ وغیرہ) طینۃ الخبال پلایا جائے گا۔ (ترمذی، مشکوٰۃ)

مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن تکبر و غرور کرنے والے ایسے ذلیل و خوار ہوں گے کہ ان کے جسم تو چھوٹی چھوٹی چیونٹیوں کی طرح چھوٹے ہوں گے لیکن ان کی شکل و صورت اسی طرح ہوگی کہ جس شکل و صورت کے ساتھ یہ دنیا میں تھے۔ اور ان پر میدانِ محشر میں اس قدر ذلت و خواری چھائی ہوگی کہ ان کی زلت و رسوائی تمام مخلوق کے سامنے ظاہر ہو جائے گی۔ پھر ان کو جہنم کی گہرائیوں میں بولس نامی قید خانے میں ڈال دیا جائے گا جہاں آگ پر آگ ان پر چھا جائے گی اور ان کو دوزخیوں کے بدنوں سے جو گر شیرہ، خون، پیپ وغیرہ بہتا ہے جس کا نام طینۃ الخبال ہے وہی پلایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے تکبر و غرور سے بچائے اور بچائے رکھے۔ آمین

### غریب متکبر کے بارے میں وعید!

غرور اور تکبر کے انجام کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کافی ہے لیکن یہاں اس شخص کے انجام کو بھی



پرہ لیجئے جو غریب اور نادار ہونے کے باوجود صرف خباثتِ نفس کی وجہ سے تکبر کے مرض میں مبتلا ہو چکا ہو۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

(ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ. وَفِي رَوَايَةٍ وَلَا يُنْظَرُ إِلَيْهِمْ. وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ،

شَيْخٌ زَانٍ وَمَلَكٌ كَذَّابٌ وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ.)

”تین آدمی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کلام نہیں فرمائے گا اور نہ ان کا تزکیہ کرے گا اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اور نہ ان کی طرف (رحمت و عنایت کی نظر سے) دیکھے گا۔ اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا ایک بوڑھا زانی، دوسرا جھوٹا بادشاہ (اور حکمران) اور تیسرا غریب متکبر۔“ (صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

اس حدیث کو نقل کر کے حضرت مولانا محمد منظور احمد نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ:

”بعض معصیتیں بذاتِ خود بھی سنگین اور گناہِ کبیرہ ہوتی ہیں لیکن بعض خاص حالات میں اور خاص اشخاص سے اگر ان کا صدور ہو تو ان کی سنگینی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے مثلاً چوری بذاتِ خود بڑی معصیت ہے لیکن اگر چوری کرنے والا کوئی دولت مند ہو جس کو چوری کی کوئی ضرورت نہ ہو یا سرکاری سپاہی اور چوکیدار ہو، تو پھر اس کا چوری کرنا اور بھی زیادہ سنگین جرم ہوگا اور اس کو قابلِ معافی نہیں سمجھا جائے گا۔“

اس حدیث میں اسی قسم کے تیم مجرموں کے حق میں اعلان فرمایا گیا ہے کہ ان بد بختوں بد نصیبوں سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہم کلام نہ ہوگا اور ان کا تزکیہ بھی نہ فرمائے گا اور آخرت میں یہ مجرم رب کریم کی نظر کرم سے بھی قطعی محروم رہیں گے۔ ایک بوڑھا زان کا ر، دوسرا جھوٹا فرمانروا اور تیسرا ناداری کی حالت میں تکبر کرنے والا اور یہ اس لئے کہ جوانی کی حالت میں اگر کوئی شخص زنا کا مرتکب ہوا تو اس کا یہ گناہ کبیرہ ہونے کے باوجود درگزر بھی ہو سکتا ہے کیونکہ جوانی کی حالت میں شہوت سے مغلوب ہونا ایک فطری کمزوری ہے۔ لیکن اگر کوئی بوڑھا بڑھاپے میں یہ حرکت کرے، تو یہ اس کی طبیعت کی سخت خباثت کی نشانی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی بیچارہ عام آدمی اپنی ضرورت نکالنے کے لئے جھوٹ بول لے تو اس کا گناہ بھی کبیرہ ہونے کے باوجود قابلِ معافی ہو سکتا ہے لیکن ایک صاحب اقتدار حکمران اگر جھوٹ بولتا ہے تو یہ اس کی طبیعت کی انتہائی گندگی اور خدا سے بے خونی کی نشانی ہے۔ ایسے ہی کوء دولت مند اگر تکبر کرے، تو انسان کی عام فطرت کے لحاظ سے کچھ زیدہ مستبعد نہیں۔

”چوبدولت برسی مست نہ گردی مردی“

لیکن گھر میں فقر و فاقہ کے باوجود اگر کوئی شخص غور و تکبر کی چال چلتا ہے تو بلاشبہ یہ اس کا انتہائی دناءت

اور مکینہ پن ہے۔

الغرض تینوں قسم کے یہ مجرم قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی ہم کلامی سے اور اس کی نظر کرم سے محروم رہیں گے تزکیہ نہ کئے جانے کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ ان کے گناہ معاف نہیں کئے جائیں گے اور صرف عقیدہ یا بعض اعمال صالحہ کی بنیاد پر ان کو مؤمنین صالحین کے ساتھ شامل نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کو سزا بھگتنی ہی پڑے گی۔ واللہ اعلم (دیکھئے معارف الحدیث: ۲/۲۸۴ تا ۲۸۵)

### متکبرانہ اعمال اور کردار کا بیان!

جب تکبر اور غرور کی مذمت اور تباہیاں سامنے آئیں تو اب ضروری سمجھتا ہوں کہ متکبرانہ اعمال اور کردار اور صفات کی نشاندہی بھی کی جائے تاکہ ہم ایسے اعمال و صفات سے پرہیز کریں۔

### تکبر و غرور سے پیدا ہونے والے برے اخلاق!

جتنے رزائل اور برے اخلاق ہیں وہ تقریباً سب کے سب اسی تکبر سے پیدا ہوتے ہیں۔ کفر اور انکارِ حق، حسد، بغض، ریا، بے جا غصہ، خود غرضی، بے وفائی، بخل، سنگدلی اور فخر کی نفسیات وغیرہ سب اسی خبیث مرض سے جنم لیتے ہیں اور ان رزائل میں بعض کا تفصیلی بیان اس کتاب میں آچکا ہے اور بعض کا بیان ان شاء اللہ بعد میں آئے گا۔

### متکبر اور مغرور شخص حقوق میں دھاندلی کرے گا!

تکبر اور غرور کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ نعمتیں ملی ہوئی ہوتی ہیں وہ ان نعمتوں میں کھو جاتا ہے اور وہ اس خبط میں پر جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو بجائے اللہ تعالیٰ کے اپنی طرف منسوب کرتا ہے کہ یہ سب کچھ میری صلاحیت اور قابلیت کا کرشمہ ہے اور یہ میرے استحقاق کا ذاتی ثمرہ ہے اس لئے وہ اپنے اوپر کسی کا حق ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔

مثلاً قارون کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر مال و دولت عطا فرمایا تھا کہ اس کے خزانوں کی چابیاں اس قدر تھیں کہ ایک طاقتور جماعت ان کے اٹھانے سے تھک جاتی تھی۔ جب اس کی قوم کے نیک لوگوں نے اس سے کہا کہ اتر اور مت اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تم کو دیا ہے اس میں آخرت کے طالب بنو اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے اس طرح تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان و بھلائی کرو تو

ان نے جواب میں کہا کہ:

﴿إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي﴾

”یہ مال تو مجھ کو ایک علم کی بناء پر ملا ہے جو میرے پاس ہے۔“ (قصص: ۷۶ تا ۷۸)

قارون کے جواب کا مطلب یہی ہے کہ یہ مال و متاع جو مجھے حاصل ہے یہ میری حسن تدبیر و مہارت فن اور قابلیت کا ثمرہ ہے اور یہی وہ تکبر کا خناس ہوتا ہے جو ہر متکبر اور غاصب حقوق کے اندر چھپا ہوتا ہے۔ خواہ اس کا کوئی اظہار کرے یا نہ کرے خواہ اس کا اظہار بھونڈی صورت میں کرے، دنیاوی صورت میں کرے یا دینی صورت میں بہر حال حقوق کی دھاندلی میں یہی خناس کام کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

احساس برتری اور خود غرضی ہی اصل میں معاشرے میں تمام تر فساد اور برائیوں کی جڑ ہے اگر ایک آدمی دوسروں کو بھی اپنے برابر سمجھے اور خود غرض نہ ہو تو وہ ان کے حقوق کو تلف نہیں کرے گا اور ان کے اموال نہیں چھینے گا یہی وہ برائیاں ہیں جو معاشرے میں فساد اور بد امنی، قتل و غارت گری، باہمی حسد اور نفرت کا موجب بنتی ہیں۔

اس کے برعکس صاحب ایمان کی نگاہ میں دنیا اور اس کے مال و متاع کی اہمیت اتنی کم ہو جاتی ہے کہ وہ اس کی خاطر دوسرے کا حق سلب کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ تو عظمت کے اس مقام پر ہوتا ہے کہ اپنا حق دوسرے کو دینے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ وہ اس طرح زندہ رہتا ہے کہ اس کی ذات سے دوسروں کو زیادہ سے زیادہ فیض ملتا رہے نہ کہ اس طرح کہ وہ دوسروں سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اللہ تعالیٰ ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تم صرف اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو کسی طرح بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ، قرابت داروں، رشتے داروں کے ساتھ اور یتیموں، مسکینوں اور رشتے دار پڑوسی اور اجنبی پڑوسی اور ہم نشین پاس بیٹھنے والے اور مسافر کے ساتھ اور اپنے مملوک (غلاموں اور خادموں) کے ساتھ اچھا سلوک (اور احسان کا معاملہ کیا) کرو۔

اس کے متصل بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا﴾

”بے شک اللہ تعالیٰ اترانے اور بڑائی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“ (نساء: ۳۶)

ان الفاظ کو متصل ذکر کر کے جو بتانا مقصود ہے اس کو اگر کھول دیا جاتا تو پوری بات یوں بن جاتی ہے کہ:

”مذکورہ بالا حقوق وہی لوگ ادا کر سکتے ہیں جن کا سینہ جوہر انسانیت سے معمور ہو اور وہ کریمانہ اخلاق کے پیکر ہوں تو وہ لوگ اسباب و وسائل کو اللہ تعالیٰ کا انعام و احسان سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اندر شکر و تواضع کا جذبہ ابھرتا ہے اور یہ جذبہ ان کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان پر احسان فرمایا ہے اسی طرح وہ دوسروں پر احسان کریں۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے دلی خوشی کے ساتھ لوگوں کے حقوق ادا کرتے ہیں اور ان کے ساتھ احسان کرتے ہیں اور اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے لائق بن جاتے ہیں اور اس کے برعکس جو لوگ اپنے متعلق خود فریبی میں مبتلا ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں اور وسائل و اسباب کو اپنی قابلیت اور اپنی حسن تدبیر کا کرشمہ سمجھتے ہیں تو ان کے اندر شکر گزاری و تواضع کے بجائے گھمنڈ اور غرور پیدا ہو جاتا ہے اور پھر لوگوں پر احسان کرنے کے بجائے ان پر رعب جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ”بے شک اللہ تعالیٰ اترانے اور بڑائی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“ یعنی وہ ایسے لوگوں کو مبغوض رکھتا ہے اور ان سے نفرت کرتا ہے۔

### مغفروں اور متکبروں کی چند مزید خصوصیات!

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے متصل تکبر اور فخر کرنے والوں کی چند مزید بری صفات کو بیان کیا ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

﴿الَّذِينَ يَخْلُونُ وَيَأْمُرُونَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ۝ وَالَّذِينَ يُفْقُونَ أَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَنْ يَكُنِ الشَّيْطَانُ قَرِينًا فَسَاءَ قَرِينًا ۝﴾

”یہ اترانے اور فخر کرنے والے لوگ ہیں (جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخلت کا مشورہ دیتے ہیں) اور بخل سکھاتے ہیں (اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے دے رکھا ہے وہ اس کو چھپاتے ہیں) یہ لوگ سخت ناشکرے ہیں (اور ہم نے ایسے ناشکروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو اپنے مالوں کو دکھانے (اور نمائش) کے لئے خرچ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن (حقیقی معنوں میں) ایمان نہیں رکھتے۔) بلکہ یہ لوگ شیطان کے جال میں پھنس کر اس کے ساتھ اس کے ساتھی بن گئے ہیں) اور جس کا ساتھی شیطان بن جائے تو نہایت برا ساتھ ہے۔“ (نساء: ۳۷-۳۸)

ان دونوں آیتوں میں فخر و غرور کرنے والوں کی پانچ مزید خصوصیات بیان کی گئی ہیں:

(۱): ایک یہ کہ خود بھی بخل ہوتے ہیں۔

(۲): دوسری یہ کہ دوسروں کو بھی بخلت کا مشورہ دیتے ہیں اور بخلت سکھاتے ہیں۔

(۳): تیسری یہ کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں۔  
(۴): چوتھی یہ کہ وہ مال و دولت اڑاتے ہیں خرچ کرتے ہیں لیکن آخرت کے لئے نہیں بلکہ دکھلاوے اور نام و نمود کے لئے۔

(۵): پانچویں خصوصیت یہ کہ ان کا حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات اور آخرت پر ایمان ہیں ہوتا اس لئے انہوں نے غرور و تکبر کا رویہ اختیار کر رکھا ہے اس لئے ان کا تعلق اور دوستی اللہ تعالیٰ کے بجائے شیطان کے ساتھ استوار ہے۔

اب ان پانچوں خصوصیات کی ضروری تفصیل بھی ملاحظہ فرمائیں۔

**بخل کسے کہتے ہیں؟ اور بخل کا سبب!**

غرور کرنے والوں کی جو اضافی خصوصیات بیان ہوئی ہیں ان میں پہلی خصوصیت بخل ہے اور یہاں پہلے بخل کی تشریح کو پیش کرتے ہیں۔

”بخل“ بخل اس روکنے کو کہتے ہیں کہ جہاں روکنا مناسب نہ ہو یعنی جو چیزیں حاصل ہیں ان کو ان مواقع سے روکنا کہ جہاں انہیں روکنا درست نہ ہو۔ یا بالفاظ دیگر جہاں دینے کا حق بنتا ہو وہاں سے چیزوں کو روک دے اور بخیل اس شخص کو کہا جاتا ہے کہ جو لوگوں کے حقوق کی ادائیگی میں تنگدل ہو اس کا دل وہاں مال و اسباب خرچ کرنے سے تنگ ہوتا ہے جہاں خرچ کرنا چاہئے اور جہاں خرچ کرنے میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہو۔

بخل کا براسبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے مال و اسباب اور حاصل کردہ چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے فضل کے بجائے اپنی تدبیر و قابلیت اور محنت کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی کمائی کو صرف اپنا حق سمجھتا ہے اس لئے اس کے اندر تواضع اور شکر گزاری کا وہ جذبہ ختم ہو جاتا ہے جو جو داور کرم و سخاوت کا اصل محرک ہوتا ہے اور جو شخص حقیقی معنوں میں حاصل شدہ چیزوں کو صرف اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھتا ہے۔ تو ایک طرف تو وہ اللہ تعالیٰ سے لرزتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو کر یہ نعمتیں مجھ سے کہیں سلب نہ کر لے اور دوسری طرف وہ اللہ تعالیٰ کا دل سے احسان مند اور شکر گزار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ احسان کا معاملہ فرمایا ہے اس تواضع اور شکر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص دوسروں کے حقوق کو کشادہ دلی سے ادا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اس کے بندوں کے ساتھ احسان کرتا ہے۔ پھر وہ اپنی ذات پر انتی فیاضی سے خرچ نہیں کرتا جتنی فیاضی سے وہ اللہ تعالیٰ کے لئے محتاجوں اور ضرورت مندوں پر خرچ کرتا ہے۔

دوسروں کو بخل سکھانے کا مطلب اور وہ ایسا کیوں کرتا ہے!

بخل کے مشورہ میں بخل والے قوانین اور رسوم بنان بھی شامل ہے جیسا کہ سودی نظام یا جو دے اس کو دو، جو احسان کرے صرف اسی کے ساتھ احسان کرو وغیرہ۔

بخل کا مشورہ دینا یہ بھی ہے کہ جو شخص حقوق العباد کے معاملہ میں فیاضی کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتا ہے مسکینوں محتاجوں کے ساتھ خوب اچھی طرح احسان کا معاملہ کرتا ہے تو یہ اس کو کہتا ہے کہ اتنا زیادہ دینے کی کیا ضرورت ہے یہ لوگ محتاج نہیں بلکہ ان کے پاس بہت کچھ ہوتا ہے تم خواہ مخواہ اپنے آپ کو تنگی میں ڈالتے ہو۔ اس طرح مختلف انداز اور مختلف طریقوں سے بلکہ اپنے عمل سے بھی یہی ترغیب دیتا ہے کہ دیکھئے اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے لیکن ان لوگوں کو اس لئے اتنا زیادہ نہیں دیتا کہ مجھے خوب معلوم ہے کہ ان کے پاس ضرورت کی چیزیں موجود ہیں۔ بہر حال بخیل اور تکبر کا یہ دستور ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح دوسروں کو بھی بخل پر آمادہ کرتے ہیں۔ اور بخیل شخص دوسروں کو بخل کا مشورہ اس لئے دیتا ہے تاکہ اس کی بخلالت پر پردہ پڑا رہے۔ آپ ان ممالک کی طرف نظر اٹھائیے جہاں عام معاشرہ بخل کی راہ پر چل پڑا ہے۔ اپنے ماں باپ سے مکان کا کرایہ وصول کرنا اور ان کو دودھ فروخت کرنا اور ان کو ضروریات زندگی کھانے پینے کے لئے سود پر قرض دینا بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے ایسے معاشرے میں سخت سے سخت بخیل کی بخلالت کو بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

بہر حال عرض یہ کرنی تھی کہ بخیل دوسروں کو بخلالت کی ترغیب اس لئے دیتا ہے کہ دوسروں کی فیاضی اور سخاوت سے خود اس کی بخلالت کا راز فاش ہوتا ہے۔ اس عیب پر پردہ ڈالنے کے لئے اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح وہ دوسروں کے حقوق دبائے بیٹھا ہے اسی طرح دوسرے بھی حقوق کو دبائے بیٹھے رہیں تاکہ خود اس کی بخلالت اور ظلم کا بھانڈا نہ پھوٹے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام کو چھپانے کا مطلب!

فخر و غرور کرنے والوں کی تیسری خصوصیت یہ بیان ہوئی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان کو چھپاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان پر کیا ہے۔

چھپانے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص اپنے پہچاننے والے محتاجوں اور پڑوسیوں وغیرہ کے سامنے اپنے وسیع اخراجات اور اس پر جو کاروباری قرضہ جات ہوتے ہیں وہ بیان کرتا ہے کہ فلاں کو اتنے لاکھ دینے ہیں اور فلاں کو

اتنے اور اس کا جو لوگوں پر قرض ہوتا ہے اور اس کے پاس جو کروڑوں کا سرمایہ ہوتا ہے اس کا وہ ذکر ہی نہیں کرتا۔ ذیل میں اللہ تعالیٰ نے ان بخیل مالداروں کی ایک نہایت پوشیدہ نفسیاتی پہلو کی طرف اشارہ فرمایا وہ یہ کہ: ان بخیل مالداروں کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص پر ان کی عزت، سیادت و ریاست کی دھونس جمی رہے اور دوسری طرف وہ یہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ کوئی شخص ان کو بخیل اور کنجوس نہ ٹھہرائے اس لئے وہ ہر ملنے جلنے والے اور ہر جاننے پہنچانے والے کے سامنے اپنے اخراجات اور قرضہ جات بیان کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ محتاجوں اور سانکوں کو جو کچھ دیا ہے اس کو بھی بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ واہ! یہ شخص کس قدر سخی اور دیادل ہے کہ سا قدر اخراجات اور قرضوں کے باوجود پھر بھی کچھ نہ کچھ کسی سائل کو بھی دے دیتا ہے۔

**متکبر اور مغرور لوگ نمائش کی جگہوں میں خوب خرچ کرتے ہیں!**

مغرور کی چوتھی صفت یہ بیان ہوئی تھی کہ وہ نام و نمود اور نمائش کے مواقع میں مال کو خوب خرچ کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کے بیٹے یا بیٹی کی شادی ہوتی ہے اس کی نمائش یا اس کی اپنی مصلحتوں کی تسکین ہو یا جہاں مال کے خرچ کرنے میں اس کی شہرت ہو رہی ہو تو پھر وہاں تو اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے لیکن خاموش دینی مواقع پر خرچ کرنے میں بخیل ہوتا ہے کیوں کہ اس میں اس کو دنیا کا کوئی مفاد نظر نہیں آتا وہاں اگر دیتا بھی ہے تو شرمائشی میں بہت تھوڑا سا دے کر احسان جتلاتا ہے۔

**مغرور اور متکبر کا حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہیں ہوتا!**

مغروروں اور متکبروں کی پانچویں برائی یہ بیان ہوئی تھی کہ ان کا حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان نہیں ہوتا۔

یہی وہ سبب ہے کہ جس کی وجہ سے ان کے دل شکر کے جذبے سے خالی ہوتے ہیں اور تکبر و غرور میں مبتلا ہو چکے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بجائے شیطان کے دوست اور ساتھی بن گئے ہیں۔ کیونکہ جس شخص کا بھی حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ پر ایمان اور روز آخرت پر یقین ہو وہ کبھی بھی ناشکری، تکبر اور غرور کے مرض میں مبتلا نہیں ہو سکتا جیسا کہ اس کا بیان گذر چکا ہے۔

**اکڑ کر چلنا اور مغروروں کا سارویہ!**

جن اشخاص کے اندر تکبر و غرور کا زہر موجود ہوتا ہے تو ان کی چال ڈھال اور گفتار اور ہر ادا سے غرور اور



تکبر کی گندگی چکتی رہتی ہے جب وہ لوگوں میں چلتے پھرتے ہیں تو اکڑتے ہوئے چلتے ہیں اس لئے شریعت نے اکڑ کر چلنے میں پابندی لگا دی ہے الا یہ کہ جہاں ضرورت ہو جیسا کہ جہاد کے موقع پر اس کی اجازت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿لَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾

”اور زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔“ (سورہ بنی اسرائیل: ۳۷)

اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی زمین پر پاؤں مارتا ہوا اور سینہ تان کر گردن کو اٹھا کر چلے پھرے۔ اور یہی مغروروں اور متکبروں کی چال ہے تو یہاں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ مغروروں اور متکبروں کی چال نہ چلو۔

اور حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو چند زریں نصیحتیں کی تھیں ان میں سے چند یہ ہیں:

﴿وَلَا تَصْغُرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ط إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ

فَخُورٍ ۝ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاعْظِضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ۝﴾

اور لوگوں سے بے رخی نہ کرو اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو (کیونکہ یہ مغروروں کی چال اور رویہ ہے) بے شک اللہ تعالیٰ ہر اترانے، اکڑنے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی آواز کو پست کرو، بے شک سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔“ (سورہ لقمان: ۱۸-۱۹)

ان آیتوں میں چار چیزوں کی ہدایت کی گئی ہے:

ایک یہ کہ لوگوں سے بے رخی نہ کرو۔ دوسری یہ کہ زمین پر اکڑ کر نہ چلو۔ تیسری یہ کہ اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو۔ اور چوتھی یہ کہ اپنی آواز کو پست کرو۔

ان چاروں ہدایات میں جن دو چیزوں سے منع کیا گیا ہے وہ متکبرانہ رویہ ہے اور جن دو کا حکم ہوا ہے وہ متواضعانہ رویہ ہے۔ زمین پر اکڑ کر چلنے کا بیان تو پہلے گزر چکا ہے اس لئے باقی تین ہدایات کی ضروری تفصیل پیش خدمت ہے۔

لوگوں سے بے رخی کی ممانعت!

ان آیتوں میں لوگوں سے بے رخی کی ممانعت کی گئی ہے۔

لوگوں سے بے رخی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ غرور و تکبر کی وجہ سے لوگوں سے بے رخی و بے پروائی اختیار

کی جائے۔

﴿نصع﴾ عربی میں ایک بیماری کو کہتے ہیں جو اونٹ کی گردن میں ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے اس کی گردن ٹیڑھی ہو جاتی ہے اور منہ ایک طرف کو مڑ جاتا ہے۔ اس سے محاورہ نکلا ”فُلَانٌ صَعْرٌ خَدَّہٗ“ فلاں شخص نے (اونٹ کی طرح) اپنا رخسار پھیر لیا یعنی تکبر کے ساتھ پیش آیا اور منہ پھر کر بات کی۔

مغرور اور متکبر لوگوں کا یہ رویہ ہمیشہ فقیروں، غریبوں اور کمزوروں کے ساتھ ہی ہوا کرتا ہے کہ ان کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ان کے ساتھ بات چیت اور ملنے جلنے میں متکبرانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ تکبر کی وجہ سے گردن ٹیڑھی اور رخسار کو جھکائے رکھتے ہیں۔

اس ہدایت کا مطلب یہ ہوا کہ لوگوں کو حقیر سمجھ کر متکبروں کی طرح صورت و شان کو نہ اپناؤ بلکہ ان کے ساتھ متواضعانہ طریقہ اور خندہ پیشانی کے ساتھ بات چیت اور ملاقات کیا کرو۔

اور اکڑ کر چلنے اور بے رخی سے منع کر کے یہ وعید بھی سنائی گئی کہ یہ چال ڈھال اور رویہ متکبرانہ و مغرورانہ ہے اس سے بچو کیونکہ مغرور اور متکبر لوگ اللہ تعالیٰ کو ناپسند اور مبغوض ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہوتے ہیں۔

### درمیانی اور تواضع کی چال کی ہدایت اور حکم!

ان آیتوں میں یہ ہدایت اور حکم بھی ہوا ہے کہ درمیانی چال چلو۔

یہ تواضع انکساری کی تعلیم مثبت انداز میں دی گئی ہے کہ اپنی چال میں اکڑا ہٹ کے بجائے تواضع اور انکساری پیدا کرو۔ اس ہدایت کا یہ مطلب نہیں کہ تیز بھی نہ چلو اور آہستہ بھی نہ چلو بلکہ متوسط چال اختیار کرو، کیونکہ آہستہ چلنا یا تیز چلنا کوئی اخلاقی چیز نہیں اور نہ اس کے لئے کوئی مقدار مقرر کی جاسکتی ہے۔ نبی کریم ﷺ سر جھکائے اس قدر چلتے تھے کہ جیسے کوئی پہاڑ کی بلندی سے اتر رہا ہو۔ نیز کبھی کہیں جلدی پہنچنا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ وقت پر پہنچنے کے لئے تیز چلے گا اور جو شخص محض تفریح کے لئے اپنے باغ یا کھیتی وغیرہ میں نکلا ہے تو وہ آہستہ چال سے چلے گا۔ بلکہ کبھی سخت جلدی کے مواقع میں آدمی کو دوڑنا بھی پڑتا ہے جیسا کہ دشمن کے تعاقب یا چور اور ڈاکوؤں کے پکڑتے وقت ان کے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔

عرض یہ ہے کہ یہاں میانہ روی سے رفتار کی سستی یا تیزی مراد نہیں بلکہ عاجزی و انکساری کی چال کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔

البتہ یہ بات صحیح ہے کہ بلا ضرورت دوڑنا آدمی کے وقار اور سنجیدگی کو ختم کر دیتا ہے اور جب کہیں جانا ہو تو گن گن کر قدم رکھنا عیب اور روانگی کے خلاف ہے اور سر اٹھا کر سینہ تان کر پاؤں کو زمین پر مار کر چلنا متکبروں اور مغروروں کی چال ہے جو کہ سخت مذموم ہے اور یہ تمام چالیں اعتدال کے خلاف اور شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ اور اس ممانعت میں شامل ہیں۔

### اپنی آواز کو پست رکھیں!

ان آیتوں میں چوتھی ہدایت یہ ہوئی کہ اپنی آواز کو پست رکھو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ہی قسم کی آواز پر پیدا نہیں کیا ہے بلکہ اس کے اندر یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ اپنی آواز کو پست بھی کر سکتا ہے اور بلند بھی اور آدمی کو چاہئے کہ وہ موقع محل کے مطابق اس صلاحیت کو استعمال کرے اور موقع محل کے مطابق اپنی آواز کو نکالے۔

متکبر اور مغرور لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو ذلیل اور مرعوب کرنے کے لئے چلاتے اور کرخت آواز نکالتے ہیں اس لئے یہاں نصیحت کی گئی ہے کہ سخت لب و لہجہ اور خشونت کے بجائے اپنی آواز میں لہنت اور نرمی پیدا کرو۔

نہ تو مغروروں اور متکبروں کی طرح کرخت اور سخت لہجہ میں بات کرو اور نہ بلا ضرورت گدھے کی طرح ہمیشہ اپنی آواز سے لوگوں کے کان کے پردے پھاڑنے کی کوشش نہ کرو۔

﴿إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ۝﴾ کے الفاظ اسی کرخت اور سخت لب و لہجہ سے نفرت دلانے کے لئے ہیں اگر ہو وقت تیز بولنا اور کرخت لہجہ کوئی کمال ہوتا تو سب سے تیز اور کرخت آواز تو گدھے کی ہے حالانکہ وہ سب سے بری ہے لہذا جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اس کو حسن کلام اور حسن بیان کی صلاحیت اور نعمت دے رکھی ہے تو اس مقام کو چھوڑ کر گدھوں کی صف میں شامل ہونے کی کوشش نہ کی جائے کہ ہمیشہ کرخت اور سخت لب و لہجہ استعمال کر کے لوگوں کے کانوں کو گدھے کی طرح پھاڑے اور ان کو لب و لہجہ سے ڈرائے یا کم از کم ستائے۔

یاد رہے کہ جب انسان ہمیشہ کرخت اور سخت لب و لہجہ استعمال کرتا ہے اور زور سے بولتا رہتا ہے تو بسا اوقات اس کی آواز بھی بے ڈھنگی اور بے سری ہو جاتی ہے اب ذیل میں نبی کریم ﷺ کی رفتار وغیرہ سے متعلق بھی کچھ اختصار کے ساتھ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب شمائل ترمذی مع خصائل نبوی میں

سے کچھ پیش کرتا ہوں اس کو بھی ملاحظہ فرمائیے:

### نبی کریم ﷺ کی رفتار کا بیان!

نبی کریم ﷺ کی رفتار کے بارے میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

(إِذَا مَشَى تَكْفَأُ تَكْفُؤًا كَأَنَّمَا يَنْحَطُّ مِنْ صَبَبٍ)

”جب حضور اقدس ﷺ چلتے تھے تو ایسے کہ گویا کسی اونچی جگہ سے نیچے کو اتر رہے ہوں۔ (خصائل

نبوی ﷺ: ۱۴)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ:

(إِذَا مَشَى تَقَلَّعَ كَأَنَّمَا يَنْحَطُّ مِنْ صَبَبٍ)

”جب آپ ﷺ چلتے تھے ہمت اور قوت سے پاؤں اٹھاتے (عورتوں کی طرح پاؤں کو زمین پر گھسیٹ

کر نہیں چلتے تھے۔ چلنے میں تیزی اور قوت کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ) گویا اونچائی سے اتر رہے ہوں۔“

(خصائل نبوی ﷺ: ۱۷)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ:

”حضور اقدس ﷺ کی رفتار تینوں صفتوں کے ساتھ منصف ہوتی تھی اور لفظ (يَتَكْفَأُ) بھی تینوں معنوں

کو محتمل ہے۔

حضور اقدس ﷺ تیز رفتاری کے ساتھ چلتے تھے محبوبین زمانہ کی طرح عورتیں کی چال نہیں چلتے تھے نیز

حضور ﷺ کی عادت جھک کر چلنے کی تھی متکبرانہ رفتار سینہ نکال کر نہیں چلتے تھے۔

نیز مردانہ رفتار کہ پاؤں زمین سے اٹھا کر چلتے تھے نہ یہ کہ زمین پر پاؤں گھسیٹ کر چلیں۔“ (شہائل

ترمذی مع خصائل نبوی ﷺ: ۱۳ تا ۱۴)

### نبی کریم ﷺ لوگوں کے ساتھ کس طرح ملتے تھے؟

نبی کریم ﷺ لوگوں کے ساتھ کس طرح ملتے تھے اس کا بیان حدیثوں میں یوں آیا ہے:

(إِذَا التَّفَتَ التَّفَتَ مَعًا)

”جب آپ ﷺ کسی کی طرف توجہ فرماتے تو پورے بدن مبارک کے ساتھ توجہ فرماتے۔“

یعنی یہ کہ صرف گردن پھیر کر کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے اس لئے کہ اس طرح دوسرے کے ساتھ لاپرواہی ظاہر ہوتی ہے اور بعض اوقات متکبرانہ حالت ہو جاتی ہے بلکہ سینہ مبارک سمیت اس کی طرف توجہ فرماتے۔ (خصائل نبوی ﷺ: ۱۸)

حضرت امام حسین ﷺ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد حضرت علی ﷺ سے حضور ﷺ کا اپنی اہل مجلس کے ساتھ طرزِ عمل پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ:

(كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ذَائِمَ الْبَشْرِ سَهْلَ الْخُلُقِ لَيِّنَ الْجَانِبِ لَيْسَ بَفِظٍ وَلَا غَلِيظٍ وَلَا سَخَابٍ وَلَا فَحَاشٍ وَلَا عِيَابٍ وَلَا مَشَاحٍ يَتَغَافَلُ عَمَّا لَا يَشْتَهِي وَلَا يُؤْيِسُ مِنْهُ رَاجِيَهُ.....)

”آپ ﷺ ہمیشہ خندہ پیشانی اور خوش خلقی کے ساتھ متصف رہتے تھے (یعنی چہرہ انور پر تبسم اور بشارت کا اثر نمایاں ہوتا تھا) آپ ﷺ نرم مزاج تھے (یعنی کسی بات میں لوگوں کو آپ ﷺ کی موافقت کی ضرورت ہوتی تھی تو آپ ﷺ سہولت کے ساتھ موافق ہو جاتے تھے) نہ آپ ﷺ سخت گوشتے اور نہ سخت دل تھے۔ نہ آپ ﷺ چلا کر بولتے تھے، نہ فحش گوئی اور نہ فحش کلامی فرماتے، نہ عیب گیر تھے کہ دوسروں کے عیب پکڑیں اور وہ توجہ نہیں فرماتے ایسی بات پر جو ان کو پسند نہ ہوتی اور امید رکھنے والے ان سے مایوس نہیں ہوتے تھے..... (شمائل ترمذی: باب ماجاء فی خلق النبی ﷺ)

حسب نسب پر فخر کرنا تکبر ہے!

حسب نسب پر فخر کرنا اور دوسرے خاندانوں کو حقیر سمجھنا بھی غرور و تکبر ہے اور شریعت کی رو سے یہ ناجائز اور شیطان کی سنت ہے۔

جب ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب میں نے تجھ کو حکم دیا تو تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روک دیا ابلیس شیطان نے جواب میں کہا:

﴿أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ۝﴾

”میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس (آدم علیہ السلام) کو مٹی سے پیدا کیا

۔“ (اعراف: ۱۲)

اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کی سرکشی کی بنیاد اس فخر و غرور پر تھی کہ شرف و عزت کا تعلق نسل و نسب پر

ہے۔ قرآن مجید نے یہاں یہ رہنمائی فرمائی کہ شرف و عزت کو نسب و نسل سے متعلق سمجھنا اور اس بنیاد پر یہ جذبہ رکھنا کہ ﴿اَنَا خَيْرٌ مِنْهُ﴾ ”میں اس سے بہتر ہوں“۔ ابلیس کی سنت اور اس کی ایجادات میں سے ہے اور جہاں کہیں بھی یہ جذبہ پایا جاتا ہے تو یہ ایک شیطانی جذبہ ہے۔ اور ابلیس و شیطان کے راستے پر چلنا ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں جو چیز سبب عزت و سرخروئی ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت اور تقویٰ ہے اس کے سوا کئی چیز بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت پانے کا سبب نہیں بن سکتی۔

کسی کا مذاق اڑانا، طعنہ وغیرہ جیسے امور جذبہ غرور سے پیدا ہوتے ہیں!

چونکہ کسی کا مذاق اڑانا و طعنہ دینا وغیرہ جیسے امور بھی جذبہ غرور سے پیدا ہوتے ہیں اور ان میں دوسروں کی تحقیر و تذلیل مقصود ہوتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے تمام امور کو ممنوع فرمایا ہے جس سے تکبر و غرور کی بدبو ٹپکے یا کسی بندے کی بلا وجہ ذرہ برابر تحقیر و تذلیل ہوتی ہو۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونَ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ط بئسَ الاسمُ الفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ ج وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ٥﴾

”اے ایمان والو! نہ کوئی قوم دوسری قوم و جماعت کا مذاق اڑائے ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد فسق کا تو نام ہی برا ہے اور جو لوگ (اس بعد بھی) توبہ نہ کریں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔“ (سورہ حجرات: ۱۱)

اس آیت کریمہ میں چند چیزوں سے سختی سے منع کیا گیا ہے:

ایک یہ کہ کوئی کسی کا مذاق نہ اڑائے۔ دوسری یہ کہ کوئی کسی کو طعنہ نہ دے۔ تیسری چیز یہ کہ ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارو۔ یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں کہ جو کوئی ان چیزوں کو اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے۔ لیکن کیا اگر کوئی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے اور بڑا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کیا وہ فی الواقع بری عزت اور شہرت والا بن گیا ہرگز نہیں عزت و شہرت اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔

## شرافت و عزت کا معیار!

اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرافت اور رذالت کا انحصار آدمی کے ایمان و تقویٰ پر ہے اور ایمان و تقویٰ کا صحیح وزن آخرت کے دن اللہ تعالیٰ کے میزانِ عدل سے معلوم ہوگا کہ ایک شخص اپنے آپ کو بڑا دیندار پاکباز اور بہت بڑی چیز سمجھ رہا ہو لیکن آخرت کے دن جب اس کا راز کھل جائے گا تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا وزن پرکاش کے برابر بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح اس کا بھی امکان ہے کہ جس کی دنیا والوں کی نظر میں کوئی وقعت نہ ہو لیکن قیامت کے دن پتہ چلے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جو مقام اس کا ہے وہ ان لوگوں کا نہیں جنہوں نے اس کو حقیر اور ذلیل جانا تھا۔

کسی کا مذاق اڑانا، طعنہ دینا اور برے القاب چسپاں کرنا فسق ہے!

اللہ تعالیٰ نے کسی کا مذاق اڑانے، طعنہ زنی اور کسی پر برے القاب چسپاں کرنے کو فسق قرار دیا اور ان کے مرتکب کو ظالم قرار دیا۔ بلاشبہ یہ چیزیں تکبر اور میں دوسروں سے بہتر ہوں، کے مرض کی شاخیں ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ نے آیت کے آخر میں ان چیزوں پر سخت تنبیہ فرمائی۔

چنانچہ فرمایا:

﴿بَسَّ الْأَسْمَ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيْمَانِ ج وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝﴾

”ایمان کے بعد فسق کا تو نام بھی برا ہے اور جو لوگ (اس وضاحت کے بعد بھی) توبہ نہ کریں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم ایمان سے آشنا نہ ہوتے تو پھر تم سے کوئی فسق و گناہ کی بات صادر ہو جاتی تو یہ چیز زیادہ تعجب انگیز نہ ہوتی، لیکن جب تم کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت نصیب کی تب اب تمہیں فسق کا نام ہی برا لگنا چاہئے اور اس کے نام ہی سے تمہیں بدبو محسوس کرنی چاہئے۔ چہ جائیکہ تم میں سے کسی سے فسق کا صدور ہو لہذا مذکورہ بالا کام بھی فسق کے کام ہیں ان سے سخت اجتناب کرو اور ان چیزوں سے وہ کہہ کر اور آئندہ کے لئے پرہیز کرو اور اس قدر وضاحت کے بعد بھی جو لوگ توبہ نہیں کریں گے تو وہی ظالم لوگ ہیں اور وہ لازماً ظلم کی سزا اور عذاب سے دوچار ہوں گے۔

یاد رکھیں! کہ غیبت، بدگمانی و حسد وغیرہ جیسے گناہ بھی اسی کبر و غرور سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ ان چیزوں کا بیان تفصیل کے ساتھ اپنے مقام پر آئے گا۔



اسی طرح شلوار اور تہبند کو ٹخنوں سے نیچے کرنا، لباس اور کھانے وغیرہ جیسی چیزوں میں غرور و تکبر کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ لباس اور کھانے پینے کے آداب میں آئے گا۔

یہاں صرف اتنی بات سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو صرف کبر و غرور سے منع نہیں فرمایا ہے بلکہ مغروروں کی چال ڈھال اور اداؤں سے بھی منع فرمایا ہے۔ یہ اس لئے کہ ایک تو مغرورانہ چال ڈھال اور ادائیں فتنج و قابل نفرت ہیں دوسری بات یہ کہ اگر دل میں تکبر و غرور نہ بھی ہو تو پھر بھی یہی چال ڈھال اور ادائیں آہستہ آہستہ تکبر پر ڈالنے کا سبب بن جاتی ہیں اور پھر انسان کے اندر تکبر و غرور کا مرض پیدا ہو جاتا ہے۔

لہذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ تکبر و غرور کے تمام طور طریقوں چال ڈھال گفتار اور اداؤں سے دور رہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کبر و غرور کے مرض سے حفاظت فرمائے اور جو کبر و غرور ہے اسے دور فرما کر ہم کو حقیقی معنوں میں تواضع اور بندگی کی صفت سے نوازے۔

اب ذیل میں بطور خلاصہ تکبر و غرور کی چند علامتیں پیش کرتا ہوں اور آخر میں ان شاء اللہ تعالیٰ تکبر و غرور کا علاج بھی لکھ دوں گا۔

### تکبر کی علامتیں!

تکبر اپنے معنی اور تعریف کی رو سے تو بالکل واضح ہے یعنی خود کو اوروں سے اونچا سمجھنا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا لیکن انسان کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ (جس کو اپنے تکبر کا احساس ہوتا ہے اس میں تواضع موجود ہوتی ہے اس لئے جب اس سے کوئی متکبرانہ فعل سرزد ہوتا ہے تو وہ اپنے اوپر متکبر کا فتویٰ لگاتا ہے جو کہ آثار تواضع میں سے ہے۔) جتنا کسی کے اندر یہ مرض ہوتا ہے اتنا ہی وہ اپنے آپ سے نفی کرتا ہے اور بے فکر ہوتا ہے۔ اس لئے اسکی چند علامات ذکر کی جاتی ہیں تاکہ تکبر کو اپنے اندر تلاش کرنے میں سہولت ہو، وہ علامتیں یہ ہیں:

(۱): متکبر کو اپنی رائے یا اعتقاد کے مقابلہ میں امر حق کو قبول کرنے سے نفرت ہوتی ہے۔

(۲): دوسروں کے اعتقاد و خیال، رائے و قیاس، صورت و لباس کو حقیر سمجھتا ہے۔

(۳): شرعی ضرورت کے بغیر دوسروں کی برائی یا عیب و نقصان کی بات کرتا ہے۔ یا رغبت سے سنتا ہے

کبھی ظاہر میں کہہ بھی دیتا ہے کہ غیبت نہ کرو مجھ کو اچھی نہیں لگتی لیکن اندر سے دل ہی کی چاہت ہوتی ہے کہ یہ میری بات نہ مانے بلکہ اپنی بات سنائے۔

(۴): تواضع کا کوئی کام کر کے یہ خیال کرنا کہ میں نے تواضع اختیار کی ہے کیونکہ متواضع کو اپنی تواضع کی

طرف توجہ بھی نہیں ہوتی اس کا مطلب یہ ہے کہ میں بڑا آدمی ہوں میں نے یہ کام تواضع اختیار کرنے کی وجہ سے اپنی حیثیت سے کم درجے کا کیا ہے یہی تو کبر ہے، اگر اندر بڑائی کا تصور نہ ہوتا تو وہ کام تواضع کا معلوم نہ ہوتا جیسے کوئی فقیر آدمی زمین پر بیٹھے تو اس کو کوئی متواضع نہیں کہے گا اور نہ وہ اپنے آپ کو متواضع کہا سکتا ہے۔

(۵): اپنے تقویٰ اور دینداری کی مجموعی حالت کے لحاظ سے غیر متوازن طور پر چھوٹی چھوٹی جزوی باتوں، پاک، ناپاک، حلال و حرام کا بہت شور کرنا، اسی طرح فرائض اور حقوق سے غفلت کے باوجود مستحبات پر زور و شور دکھانا، اسی طرح نفلی عبادات میں مسارعہ کرنا اور واجبات کی بجا آوری میں سستی کرنا۔

(۶): ایسے شخص میں غصہ و حسد، بعض، ریا، بدگمانی وغیرہ کے امراض بہت زیادہ ہوں گے۔

(۷): جن دینداروں یا علماء کو کسی ایک چیز کے علم میں شہرت ہو جاتی ہے اور وہ بڑے عالم یا دیندار مشہور ہو جاتے ہیں۔ تو جب ان سے کوئی آدمی مسئلہ پوچھے تو خواہ یاد ہو یا نہ ہو وہ ضرور اپنی عقل سے بلا تکلف جواب دے دیتے ہیں ان کے لئے یہ کہنا بہت گراں ہوتا ہے کہ مجھے معلوم نہیں کسی اور سے پوچھ لیں۔

### تنبیہ!

ان مثالوں میں غور کرنے سے تکبر سے واقفیت ہو سکتی ہے لیکن یہ بات نہایت ضروری ہے کہ سا طرح کا غور و فکر صرف اپنے بارے میں کرے۔ دوسروں میں یہ علامتیں تلاش نہ کرے اور نہ ان کو ان علامات کی وجہ سے متکبر سمجھے کیونکہ یہ علامات اپنے حق میں تو یقینی ہیں کہ آپ ان کو اپنے اندر دیکھ رہے ہیں لیکن دوسروں کے حق میں یہ علامتیں مشتبہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض لوگوں میں تکبر کی صرف صورت ہوتی ہے سا کی حقیقت ان میں بالکل نہیں ہوتی بلکہ ان کی طبعی عادت یا کسی جسمانی مرض کی وجہ سے ان سے متکبر کی طرح حرکات سرزد ہوتی ہیں۔ مثلاً ممتاز جگہ پر بیٹھنا یا جلد بازی کے سبب اپنا کام دوسروں کے کام سے پہلے کرانے کی کوشش کرنا طبعی وضع داری اور شرم کی وجہ سے بازار جانے اور سودا اٹھا کر نہ لانا۔ اسی طرح کبھی اعصابی کمزوری کی وجہ سے غصہ میں بے قابو ہو جانا وغیرہ۔ غرض دوسروں کے اندر تکبر کی علامت کو نہ ڈھونڈنا چاہئے۔ ورنہ اس صورت میں خود ہی اس خطرناک مرض کا شکار ہونے کا اندیشہ ہے۔ پس عیوب کو صرف اپنے اندر تلاش کر کے علاج کیا جائے۔

البتہ بعض لوگوں میں عیب تلاش کرنا جائز ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

(۱): آل و عیال تاکہ ان کی اصلاح ہو۔ (۲): شاگرد۔

(۳): وہ دوست جس کی اصلاح کا حق دوسرے پر عائد ہوتا ہے۔



(۴): مرید جس نے اپنی اصلاح کا کام صدقِ دل سے شیخ کے سپرد کر رکھا ہو۔

ان صورتوں میں بغرض اصلاح ان عیبوں کو کریدنا اور ان کی غیبت سن لینا درست ہے لیکن شرط یہ ہے کہ دل سے ان کو حقیر و ذلیل اور اپنے آپ کو ان سے افضل تصور نہ کرنا۔

### تکبر کا علاج!

(۱): تکبر کے بارے میں وعیدیں اور اس کی مذمت میں آنے والی احادیث مبارکہ اور آیات کریمہ کو بار بار پڑھیں، سنیں، متواضع اور خاکسار لوگوں کے قصے اور متکبرین کا انجام اور قصے پڑھیں، سنیں، تکبر کی علامات کو ذہن میں پوری طرح حاضر کر کے پھر اپنے اندر جستجو کریں جو جو علامتیں تکبر کی اپنے اندر معلوم ہو جائیں تو اس کا علاج شروع کریں اور یقین کر لیں کہ میں بیمار ہوں اور علاج کا محتاج ہوں۔

(۲): پہلا کام یہ کیا کریں کہ روزانہ اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑ گڑائیں کہ یا اللہ مجھ سے تکبر و غرور کے مرض کو دور فرما اور میرے اندر تواضع پیدا فرما۔

(۳): ایک جگہ سب سے یکسو ہو کر اپنی پیدائش اور موجودہ حالت اور انجام ان تینوں میں غور و فکر کیا کریں یعنی یہ سوچیں کہ میرا اصل کیا ہے ناپاک پانی کے قطے سے بنا پھر ناپاک خون سے پرورش پائی وغیرہ۔ اسی طرح باطنی اور معنوی گندگیاں جیسے تکبر، بخل اور دوسری شہوات کی نجاست کو سوچیں۔ جو کہ لاکھ درجہ طاہری نجاست سے بڑھ کر ہیں پھر اللہ تعالیٰ کی ستاری پر نظر دوڑائیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے ستاری فرما رکھی ہے ورنہ ہمارا باطنی حال اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے تو نفرت کر کے کوئی قریب بھی نہیں آئے گا۔

(۴): امیر لوگوں کے بجائے فقراء اور حاجت مندوں کی صحبت کو اختیار کریں فقراء کی دعوت قبول کریں اور ان کی خدمت کریں۔

(۵): اپنے ہاتھ سے جتنا کام ہو سکے کریں۔

(۶): عوام ہر کسی کو پہلے خود ہی سلام کریں۔

(۷): اپنی غیبت اور برائی سن کر اپنے باطنی عیوب کے پیش نظریوں شکر کریں کہ میری برائیوں میں سے

بہت تھوڑی برائیاں بیان ہوئی ہیں اور اس میں بھی میرا ہی فائدہ ہے کہ تکبر توٹ جائے گا اور کچھ گناہوں کا کفار ادا ہو جائے گا۔

(۸): متکبرانہ اعمال اور رویہ کو چھوڑ دیں اور تواضع کی چال ڈھال کو اختیار کریں۔

(۹): کسی وقت کسی پر غصہ اتار دے تو چھوٹے اور کم منصب والے سے بھی معافی مانگ لیا کریں۔  
 (۱۰): اس مرض کا آسان علاج یہ ہے کہ کسی روحانی ماہر علاج یعنی شیخ وصوفی کی طرف رجوع کیا جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ وہ تشخیص کر کے آسان علاج بتائے گا۔ اگر مذکورہ بالا تجاویز پر عمل کیا تو ان شاء اللہ تعالیٰ تکبر دب جائے گا اور تواضع پیدا ہوگی۔

### عجب اور خود بینی کا بیان!

عجب یعنی خود بینی اور خود پسندی اپنے نفس سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ ہوتی ہے اور یہی تکبر کی بنیاد بن جاتی ہے۔ کبر اور عجب میں فرق یہ ہے کہ تکبر و غرور میں اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا اور بہتر سمجھا جاتا ہے اور عجب اور خود پسندی میں یہ ضروری نہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو ہی اچھا سمجھتا ہے اور یہ بھی بہت خطرناک بیماری ہے اور اس سے تکبر کی بیماری پیدا ہوتی ہے۔

عجب اور خود بینی تھوڑی دیر کے لئے بھی ہو تب بھی زیادہ نقصان دہ ہے!

عجب اور خود بینی بہت ہی مہلک مرض ہے اس لئے اس سے بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے یہ جذبہ اگر تھوڑی ہی دیر کے لئے بھی سراٹھائے تو اس کے نتائج بہت ہی خطرناک ہوتے ہیں۔

غرور و حنین میں مسلمانوں کی تعداد کافروں کی تعداد سے زیادہ تھی یہ کچھ کر بعض مسلمانوں کے دل میں کچھ اس طرح کا خیال آیا کہ جب ہم کفار و مشرکین سے تعداد اور اسلحہ دونوں اعتبار سے بہت کم تھے تب ہم نے ان کو شکست دی تھی اب تو الحمد للہ ہم بہت زیادہ ہیں اسلحہ بھی کافی ہے اب ہمارا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ اب تو یہ کفار چند لمحوں کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکیں گے۔ غرض یہ کہ جب بعض مسلمانوں میں تھوڑی دیر کے لئے اپنی کثرت پر عجب و ناز کی شان پیدا ہوئی تو اللہ تعالیٰ کو ایمانی پہاڑوں کی یہ شان پسند نہ آئی اور نبی کریم ﷺ کے ہوتے ہوئے مسلمان تتر بتر ہو کر شکست کھا گئے پھر جب مسلمانوں کے دلوں سے عجب و ناز کی ہلکی سی گرد شکست نے جھاڑ دی ت پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے پاؤں کو جمادیا اور بالآخر کفار کی فتح کو شکست میں تبدیل کیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کو قرآن مجید میں یوں پیش کیا ہے:

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمْ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ۝ ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى



المُؤْمِنِينَ وَانزَلَ جُنُودًا لَّهُمْ تَرَوْهُمَا جَعَلُوا طَوْفًا وَلِذَلِكَ جِزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝

”بے شک اللہ تعالیٰ نے بہت سے موقعوں پر تمہاری مدد کی ہے اور جنین کے دن جب تمہاری کثرت نے تم میں عجب (اور ناز) پیدا کیا تھا پھر وہ (کثرت) تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی۔ پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور مؤمنین پر اپنا سکینہ نازل فرمایا اور ایسے لشکر اتارے جن کو تم نہیں دیکھتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کو (شکست کا ذلت آمیز) عذاب اور سزا دی اور یہی کافروں کا بدلہ ہے۔“ (سورہ توبہ: ۲۵-۲۶)

اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد کرو تو سرخرو اور کامیاب ہو گے!

کامیابی و ناکامی اللہ تعالیٰ ہی کے دستِ قدرت میں ہے اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور طاقت پر بھروسہ کرے گا اور اس کے حکم کے مطابق چلے گا تو وہ کامیاب اور سرخرو ہوگا اور اپنی ذات پر بھروسہ آدمی کے اندر گھمنڈ کا جذبہ بھارتا ہے اور بالآخر انسان کو خود پسندی خود پرستی کے مرض میں مبتلا کر دیتا ہے۔

جب آدمی کے اندر عجب و خود بینی پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے غفلت طاری ہوتی ہے اور عجب کثرت اسباب سے بھی پیدا ہوتا ہے!

بلاشبہ عجب خود بینی او غلط قسم کی خود اعتمادی بہت مہلک جذبہ ہے اسکی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے بے پروائی اور بے توجہی و غفلت پیدا ہوتی ہے اور یہی چیز مسلمانوں کے لئے شکست اور ناکامی کا پہلا سبب بن جاتی ہے۔ جب اسباب و وسائل موجود نہ ہوں پھر تو اکثر یہی ہوتا ہے کہ ایک مسلمان اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اسی پر اعتماد و بھروسہ کرتا ہے اسی سے مانگتا رہتا ہے لیکن جب اسباب و وسائل کی فراوانی ہو جاتی ہے اس وقت آدمی کی نظر اللہ تعالیٰ کے بجائے اسباب و وسائل پر چلی جاتی ہے۔ اس وقت مسلمان کو چاہئے کہ اپنے آپ کو خوب سنبھالے رکھے اور اسباب و وسائل کے باوجود اپنے آپ کو ہر طرح سے اللہ تعالیٰ کا محتاج سمجھے اور اسباب و وسائل کے بجائے اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھے۔

### عجب کی ہلاکت!

عجب اور خود رانی بہت ہی باعثِ ہلاکت مرض ہے یہ جس گھر والوں میں پیدا ہوتا ہے اس گھر والوں کو برباد کر کے چھوڑتا ہے اور جس قوم کے اندر یہ مرض عام ہو جائے تو پوری قوم افتراق انتشار کا شکار ہو جاتی ہے اور

بالآخر تباہ ہو جاتی ہے اور جب یہ مرض کسی جماعت کے اندر پھیل جاتا ہے تو اس جماعت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے مشورہ اور ایک دوسرے کی رائے سے استفادہ کرنا بند ہو جاتا ہے اور جب یہ مرض پوری دنیا کو لپیٹ میں لے لے گا تو اس وقت تمام لوگ غافل ہو جائیں گے اور ہر شخص عجب اور خود بینی کے مرض میں مبتلا ہو جائے گا اور اختیاری طور پر ذکر کرنے والا ایک بھی شخص نہیں رہے گا تو دنیا کی روح نکل جائے گی مرجائے گی اور چاند، سورج، پہاڑ وغیرہ درہم برہم ہو کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور قیامت کی پشتگونیوں میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر کے نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس کا مطلب یہ کہ:

”جب ہر شخص کو اپنی رائے بھلی معلوم ہوگی اور اسی پر عجب و ناز کرے گا اور اترائے گا اور یہی وہ موقع ہے جس میں ہر شخص کو اپنی فکر کرنی چاہئے۔“ (ابوداؤد)

نیز نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ:

”اس وقت تک قیامت قائم نہ ہوگی جب تک ایک شخص بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہو۔“

ظاہر پر ہیزگاری کی وجہ سے آدمی کا عجب و ناز میں مبتلا ہونا!

بعض لوگ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچتے رہتے ہیں اور دینی لحاظ سے ان کی حالت اچھی ہوتی ہے تو وہ اپنے نفس سے خوش ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو بڑا پرہیزگار سمجھتے ہیں اور عجب اور ناز کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے عجب و ناز کو بھی سختی سے منع فرمایا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنْشَأَكُمْ مِّنَ الْأَرْضِ وَإِذْ أَنْتُمْ أَجْنَةٌ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ﴾

”وہ تم کو خوب جانتا ہے جب اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی شکل میں تھے پس تم اپنے آپ کو پاکیزہ نہ سمجھو، وہی خوب جانتا ہے ان لوگوں کو جنہوں نے (حقیقی معنوں میں) تقویٰ اختیار کیا ہے۔“ (نجم: ۳۲)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ زیبا نہیں کہ کوئی اپنے آپ کو پاکیزہ اور مقدس سمجھے اللہ تعالیٰ سب کی پاکیزگی کو خوب جانتا ہے اللہ تعالیٰ تمہاری اس حالت کو تو جانتا ہی ہے وہ تو تمہاری اس حالت کو بھی جانتا ہے جب اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اس مرحلے کو بھی خوب جانتا ہے کہ جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی شکل میں تھے

لہذا پانی، کچھڑ اور مٹی سے وجود میں آنے والی مخلوق اور پھر ذلیل گندے پانی کی ایک بوند سے ماں کے رحم کے اندر پرورش پانے والی ہستی کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ خود اپنے آپ کو متقی اور پرہیزگار ٹھہرائے اور اس کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑے بڑے رتبوں کا مستحق قرار دے اس میں شک نہیں کہ عزت و شرف کا حصول ایمان و تقویٰ کی بنیاد پر ہے لیکن کسی شخص میں کس قدر ایمان و تقویٰ ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے۔ وہی رحم و عدل والی ذات اپنے میزان عدل میں تولے گی اور جس شخص کو جس مرتبے کا مستحق پائے گی اس کو اسی رتبے پر فائز کر دے گی اور یہ فیصلہ روزِ آخرت میں ہوگا لہذا کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مقدس ٹھہرائے اور از خود اپنی طرف سے اپنے لئے عالی مقامات کا مدعی بن بیٹھے، آدمی کو چاہئے کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے لرزاں و ترساں رہے اور اسی سے حسن ظن اور اچھی امید باندھے رکھے اور اسی کے حکم کی دل و جان سے اطاعت کرے اور اس کی اللہ تعالیٰ سے توفیق مانگا کرے اور بندے کا کام صرف اسی قدر ہے نتائج اور مراتب اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہیں اور وہی ان کو خوب جانتا ہے۔

### عجب کے نقصانات کا خلاصہ!

عجب کے بہت ہی زیادہ نقصانات ہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(۱): عجب سے تکبر پیدا ہوتا ہے۔

(۲): ایسے شخص کو اپنی برائیاں بہت کم دکھائی دیتی ہیں اس لئے وہ متکبر کی طرح اپنی غلطیوں اور اپنی

اصلاح سے محروم رہتا ہے۔

(۳): چونکہ اس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ میں تو بخشا بخشایا ہوں اس لئے وہ قیامت اور آخرت سے بے فکر

ہو جاتا ہے۔

(۴): عجب کی وجہ سے دل غافل ہو جاتا ہے اور اسباب و وسائل پر اس کی نظر چلی جاتی ہے جس کی وجہ

سے وہ نفس اور اسباب و وسائل کے حوالے ہو کر اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت سے محروم رہ جاتا ہے۔

(۵): وہ اللہ تعالیٰ کی تدبیروں سے نڈر اور بے خوف ہو جاتا ہے اور اپنی عبادات اور اپنی خدمات پر

ناز ادا رہتا ہے۔

(۶): خود رائی اور خود بین شخص کسی سے پوچھتا نہیں اگر پوچھتا بھی ہے تو چونکہ وہ دوسروں کی رائے کو

اہمیت نہیں دیتا اس لئے دوسروں کی رائے سے استفادہ حاصل نہیں کر سکتا اس وجہ سے ہمیشہ ناقص رہتا ہے۔



(۷): عجب کا اصل نقصان آخرت کا نقصان ہے جیسا کہ اس کا بیان تکبر کے باب میں گذر چکا ہے۔

### عجب کا علاج!

اپنے عیبوں کو سوچا کریں ہر نعمت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کریں اور اپنے آپ کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا محتاج سمجھیں اور اس سے ڈرتے رہیں اور ہر وقت اپنے عجز اور در ماندگی کا اعتراف کریں اور اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور بے نیازی کو سوچیں اور تکبر کے علاج میں جو کچھ گذرا ہے وہ بھی پڑھیں اور اس کے مطابق عمل کریں ان شاء اللہ تعالیٰ عجب جاتا رہے گا۔

### تواضع کا بیان!

تواضع تکبر کی ضد ہے جو اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کے شعور اور اس کی بے انتہا عظمتوں کا ثمرہ ہوا کرتی ہے جس شخص کے دل میں جس قدر زیادہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا احساس ہوتا ہے اور جس قدر کوئی زیادہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر گزار ہوتا ہے اسی قدر اس کے اندر تواضع کی صفت بھی زیادہ ہوا کرتی ہے۔

### تواضع کے معنی و مطلب!

”تواضع“ اپنے آپ کو کم سمجھنا۔

اور یہ ٹھیک تکبر کی ضد ہے کیونکہ تکبر کے معنی ہیں کہ اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھنا۔ جس طرح تکبر سارے رذائل اور بہت سے گناہوں کی جڑ ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گذر چکا ہے اس کے برعکس تواضع ایک ایسی صفت ہے کہ اس سے ہر خوبی جنم لیتی ہے۔ دراصل بندگی کی روح بھی حقیقی تواضع ہے۔

### تواضع آدمی کے اندر کب آ جاتی ہے!

جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ تواضع تکبر کی ضد ہے تو جب تکبر یعنی ”انا“ ”میں“ کا بت دل میں موجود رہتا ہے اس وقت تک آدمی کے اندر کامل تواضع اور بندگی پیدا نہیں ہوتی۔

### اللہ تعالیٰ کے بندے متواضع ہوتے ہیں!

اللہ تعالیٰ کے بندے وہی ہوتے ہیں جن کے دلوں میں انکساری اور تواضع ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے سچے بندے متواضع ہی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا ۝﴾

وَالَّذِينَ يَبْتَغُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا ۝ وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ﴿۶۶﴾

”اور رحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر فوتی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے الجھتے ہیں تو ان کو سلام (یعنی سلامتی اور اچھی بات) کہہ کر رخصت ہوتے ہیں اور جو اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! جہنم کے عذاب سے ہم کو دور رکھ بے شک اس کا عذاب پوری تباہی ہے بے شک وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے اور برا مقام ہے۔“ (الفرقان: ۶۳-۶۶)

اس پورے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کے اخلاق و خصوصیات اور کردار کو بیان فرمایا ہے اور ان کی ابتدا ہی تواضع اور فروتنی کی صفت سے کی ہے۔

﴿ہوں﴾ کے معنی فروتنی اور خاکساری کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنے بندوں کے بارے میں شروع میں یہ بات واضح کی کہ ان کے دلوں میں تواضع و انکساری ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کی چال ڈھال ہر کام سے تواضع، فروتنی اور خاکساری کا عطر ٹپکتا ہے اور وہ زمین میں اکڑتے اور اتراتے نہیں بلکہ نہایت تواضع و فروتنی کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے صرف چلنے کا ذکر کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں صرف ان بندوں کی باطنی کیفیت کو سامنے لانا مقصود ہے اور آدمی کا چلنا پھرنا اس کی باطنی کیفیت کا عکس اس کی پوری شخصیت سے عبارت ہوتی ہے یہاں اصل بات یہ بتائی جا رہی ہے کہ ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کی ایسی ہیبت طاری رہتی ہے کہ جس کی وجہ سے ان سے اپنی بڑائی ”انا، میں“ کا احساس ختم ہو جاتا ہے اور مٹ جاتا ہے اور ان کے دل کبر و غرور کی گندگی سے پاک و صاف ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر تواضع اور عبدیت کی روح پوری طرح سما جاتی ہے اور یہ تواضع اور عبدیت ان کے ہر اس قدم سے نمایاں ہوتی ہے جو وہ زمین پر رکھتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیتوں میں جو وجہ بیان ہوئی وہ یہ ہے کہ:

جب ان سے جاہل ہوگ الجھ جاتے ہیں تو وہ ان کو سلامتی والی بات کہہ کر ان سے رخصت ہو جاتے ہیں

یعنی یہ نہیں کہہ بھی ان ہی جیسا رویہ اختیار کریں بلکہ نرم بات کہتے ہیں۔

یہ بھی فروتنی اور بندگی کا رویہ ہے کہ وہ لوگوں کو حق کی طرف دعوت دیتے ہیں اور دلائل کے ساتھ ان پر حق

کو بھی واضح کر دیتے ہیں لیکن جب وہ سمجھ جاتے ہیں کہ مخاطب جذبات سے مغلوب ہو رہا ہے بات کو سمجھنے کے

بجائے بد تمیزی اور الجھنے پر اتر آیا ہے تو پھر وہ حسن و خوبی کے ساتھ اس سے علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ وہی شخص کر سکتا ہے جو تواضع اور فروتنی کا پیکر ہو اور یہی لوگ داعیانِ حق ہو سکتے ہیں۔

خدائے رحمان کے بندوں کی تیسری خصوصیت یہ بیان ہوئی کہ وہ اپنے رب کے آگے سجدہ اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں اور وہ اپنے پروردگار سے دعائیں کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھ۔ یہاں ایک طرف رحمان کے بندوں کی اللہ تعالیٰ سے محبت و ذوق و شوق کا بیان ہے کہ وہ نرم نرم بستروں کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے آگے قیام اور سجدوں میں راتیں گزارتے ہیں اور دوسری طرف تواضع، عبدیت اور خوفِ الہی کو سامنے لایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے راتیں گزارنا یہ قیام اور سجدہ کرنا ان کے اندر فخر اور اپنی پاکیزگی کی نفسیات پیدا نہیں کرتے اور نہ وہ از خود اپنے لئے مقامات و مراتبِ عالیہ کے مدعی بن بیٹھتے ہیں اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کے لاڈلے بن کر اس پر جری ہوتے ہیں اور نہ وہ تہجد کی نماز کی وجہ سے آخرت سے بے فکر ہو جاتے ہیں بلکہ راتوں میں اٹھ اٹھ کر اللہ تعالیٰ اور جہنم کے عذاب سے بچ جانے کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے حقیقی ایمانداروں اور نیکوکاروں کے اوصاف کے بارے میں اسی حقیقت کو ایک اور انداز میں یوں بیان فرمایا ہے کہ:

﴿وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَالَتَهُمْ وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ لَهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ﴾

”اور وہ لوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں کہ ان کے دل لرزتے ہیں (اس خیال سے) کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں۔“ (مؤمنون: ۶۰)

اس آیت میں ایمان والوں اور نیکوکاروں کی ایک صفت یہ بتائی گئی کہ وہ نیک کام کر کے فخر نہیں کرتے وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس پر فخر اور نمائش نہیں کرتے بلکہ ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور عظمت اس قدر چھائی ہوتی ہے کہ نیک کام اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے خرچ کر کے بھی ان کے دل کانپتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہم نے کیا ہے اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں اللہ تعالیٰ اس کو ہمیں رد نہ فرمادے اور ایک دن اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا اور اس کو منہ دکھانا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھا کہ کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب پیتے ہیں چوری کرتے ہیں اور اس وجہ سے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا:

(يَا بَنَتَ الصَّدِيقِ وَلَكِنَّهُمْ الَّذِينَ يَصُومُونَ وَيَصَلُّونَ وَيَتَصَدَّقُونَ وَهُمْ يَخَافُونَ أَنْ لَا يَقْبَلَ مِنْهُمْ أُولَئِكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ)

”اے صدیق کی بیٹی ایسا نہیں بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں نماز پڑھتے ہیں صدقہ دیتے ہیں (یعنی نیک کام کرتے ہیں اور پھر بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں کہ ان کے یہ اعمال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کہیں نامقبول و نامنظور نہ ہو جائیں۔“ (احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

**تواضع اور چالپوسی و دناءت اور احساس کمتری میں فرق!**

یہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ”تواضع“ چالپوسی اور احساس کمتری ان تینوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

**چالپوسی کیا ہے؟**

چالپوسی اور ذلت نفس اور دناءت اس کیفیت کا نام ہے جس میں آدمی اپنی خواہش کی خاطر اپنی ذلت اور رسوائی اختیار کرتا ہے۔

**چالپوسی کی مثالیں!**

ایک شخص کسی نوکری کا امیدوار ہے اور وہ نوکری دینے کا اختیار زید کے پاس ہے اب یہ شخص زید کی چپلیں سیدھی کرتا ہے اس کے منہ پر اس کی تعریف کرتا ہے اس کے سامنے جھک جھک کر سلام کرتا ہے زید اس کو بھگانے کی کوشش کرتا ہے دھتکا رہتا ہے لیکن وہ برابر اس کی چالپوسی کو اختیار کیا ہوا ہے۔

یا کسی سے مال و دولت ملنے کی توقع ہو یا کسی رشتہ کی امید ہو یا کسی سے اور کوئی دنیوی غرض ہو اور اس دنیوی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو کسی کے سامنے رسوا کرنا اور اپنی عزت اور خوداری کو ختم کرنے کا نام چالپوسی ہے، چالپوسی نفس پرستی اور دنیا پرستی سے پیدا ہوتی ہے اور یہ صرف اس شخص سے ہوتی ہے کہ جس سے کوئی نفسانی خواہش یا کوئی دنیاوی مفاد وابستہ ہو۔

اور تواضع تو اللہ تعالیٰ کی معرفت اس کی کبریائی اور عظمت کے احساس اور اپنے نفس کے عیوب و نقائص کے دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے اور ایسے شخص کا دل مخلوق کے بجائے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کرتا ہے اور ان کے ساتھ رحم و احسان کا معاملہ کرتا ہے اور جہاں سے اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رضا حاصل ہونے کی توقع ہو وہاں وہ انتہائی عاجزی اور انکساری کا رویہ اختیار کرتا ہے اور جہاں

کہیں کسی کے غرور و تکبر پر ضرب لگانے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے وہاں وہ سینہ تان کر اس متکبر و مغرور کے غرور پر ضرب بھی لگا دیتا ہے کہاں متواضع شخص کا اعلیٰ کردار اور کہاں چا پلوس کے کر توت دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

### احساس کمتری کسے کہتے ہیں؟

احساس کمتری اس بیماری کا نام ہے جس میں آدمی کا یہ خیال ہوتا ہے کہ مجھے محروم اور پیچھے رکھا گیا ہے۔ اور یہ بیماری اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور اس کی تخلیق و تقدیر پر شکوہ و شکایت سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ مجھے بد صورت پیدا کیا گیا ہے مجھے کم دولت دی گئی ہے اور لوگوں کو زیادہ عزت مل گئی ہے اور مجھے پیچھے رکھا گیا ہے دوسرے لوگوں کو تندرست اور مجھے بیمار پیدا کیا گیا ہے۔ میں تو بڑے رتبے اور مال کا مستحق تھا لیکن مجھے کم مرتبہ ملا وغیرہ۔

یہ ہے احساس کمتری جو کہ ایک مرض ہے اور اس کی وجہ سے وہ دوسرے لوگوں سے حسد بھی کرتا ہے۔ تو اب ظاہر ہے کہ کہاں تواضع اور کہاں یہ احساس کمتری دونوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے ایک عظیم اور بہترین صفت ہے اور دوسری بیماری ہے ایک شکر کا نتیجہ اور دوسری ناشکری کا نتیجہ اللہ تعالیٰ سب کو صحیح معنوں میں متواضع بنادے اور ہر قسم کے ظاہر و باطنی امراض سے حفاظت فرمائے۔ آمین

### تواضع اور تواضع کے دکھاوے میں فرق!

یہاں یہ بات بھی یاد رکھیں کہ ایک ہے تواضع اور ایک ہے تواضع کا دکھاوا تواضع کا دکھاوا یہ ہے کہ صرف زبان سے تواضع کا اظہار ہو اور دل میں تواضع کا جوہر موجود نہ ہو۔

مثلاً بعض اوقات ہم زبان سے یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ ”میں کچھ بھی نہیں ہوں میں ناچیز ہوں“ کوئی اپنے نام کے ساتھ خاکسار لکھتا ہے کوئی ضعیف وغیرہ۔ لیکن بہت بار ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ صرف دکھاوے کے لئے ہوتے ہیں یا صرف رسم و رواج کے طور پر لکھتے ہیں یا بولتے ہیں اور بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ جب یہ الفاظ کہتے ہیں یا لکھتے ہیں تو یہ ان کے دل کی صدا ہوتی ہے لیکن عام طور پر یہ ایک رسم سی بن گئی ہے جیسا کہ لوگ تحریر کی ابتداء میں یوں ہی بغیر سوچے سمجھے بسم اللہ لکھتے ہیں اور کوئی ۸۶ وغیرہ اسی طرح یہ الفاظ بھی اکثر بغیر سوچے سمجھے کہے اور لکھے جاتے ہیں بلکہ بعض تو ان کو صرف اپنی تواضع کی دھونس جمانے کی خاطر لکھتے ہیں اور کہتے ہیں۔ عرض یہ ہے کہ تواضع کے الفاظ اور تواضع میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اپنے لئے تواضع کے

الفاظ لکھنے اور بولنے والا لازماً متواضع ہوگا۔ بلکہ تواضع دل کی ایک صفت ہے جس میں انسان اپنے آپ کو کم درجہ سمجھتا ہے ایسے شخص کا ہر قدم، ہر بول اور ہر حرکت و سکون سے تواضع کی خوشبو مہکتی ہے۔

### متواضع شخص کا متواضعانہ کردار!

یہاں یہ بات بھی رکھیں کہ بعض لوگوں نے جب جان لیا کہ تواضع دل کی صفت ہے تو پھر وہ ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کی بول چال، چال ڈھال متواضعانہ ہوتی ہے اور وہ ان پر اپنی طرف سے تواضع کے دکھلاوے کے فتوے لگا دیتے ہیں ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ تواضع کوئی ایسی قلبی صفت ہے کہ اس کا عکس و اثر اس ظاہر جسم پر نمایاں ہونا ضروری نہیں۔ یہ بات اور سوچ بالکل غلط بلکہ متکبرانہ ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اصل تواضع تو دل کی ہر صفت اور ہر حالت کا عکس و اثر انسان کے ظاہر پر بھی نمایاں ہوتا ہے اسی طرح اس کا عکس اور اس کا اثر بھی انسان کی وضع قطع بول چال، چال ڈھال اور عہدہ ہر ایک حرکت و سکون سے نمایاں ہوتا ہے جیسا کہ اس کی دلیل میں قرآن مجید کی آیتوں کو نقل کر چکا ہوں اور اس کا مفصل بیان تکبر کے باب میں آچکا ہے۔ کہ شریعت مطہرہ نے متکبروں اور مغروروں کی چال ڈھال وضع قطع سے بھی منع فرمایا ہے۔

### تواضع اور انکساری کی علامتیں!

اب ذیل میں تواضع کی چند موٹی موٹی علامتوں کو ذکر کیا جاتا ہے تاکہ ان کے مطابق اپنا آپ بنایا

جاسکے۔

(۱): متواضع شخص کی بول چال، چال ڈھال کسی چیز سے بھی تکبر و غرور ظاہر نہیں ہوتا اور وہ کسی کا مذاق

نہیں اڑاتا، طعنہ نہیں دیتا، کسی پر فقرے چسپاں نہیں کرتا اور نہ کسی کی غیبت کرتا ہے۔

(۲): وہ تصنع اور تکلف سے بھی پاک ہوتا ہے اور حسد سے بھی۔

(۳): وہ کبھی اپنی بڑائی جتلانے کی خاطر بحث مباحثہ اور مناظرہ نہیں کرتا۔

(۴): وہ لوگوں کی رضا کارانہ خدمت کرتا ہے والدین اپنے بڑوں اور مشائخ علمائے دین، بزرگان دین

کا ادب کرتا ہے۔

(۵): وہ یتیموں، بے کسوں اور تمام لوگوں کے ساتھ حسن و خوبی کے ساتھ ملتا ہے اور ان کی باتوں کو اور

احاجتوں کو غور سے سنتا ہے اور جو تعاون اور احسان اس سے ہو سکے اس کو کر گزرتا ہے۔

- (۶): بغیر کسی شدید ضرورت کے کرخت لب و لہجہ سے پرہیز کرتا ہے۔  
 (۷): اگر کسی کو جائز کام میں اس کی موافقت کی ضرورت ہو تو وہ آسانی سے اسکے ساتھ موافق ہو جاتا ہے۔  
 (۸): ہر حق دار کو اس کا حق حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرتا ہے۔  
 (۹): دین کے بہت ہی کام اور خدمت کرے یا غریبوں اور مسکینوں کی گیر معمولی امداد کرے یا کوئی اور بڑا کارنامہ انجام دے تو اس کی گردن اللہ تعالیٰ کے سامنے پہلے سے زیادہ جھک جاتی ہے اور اس کی وجہ سے وہ کبھی تکبر و غرور میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے کہ کہیں اس کی دی ہوئی توفیق اور فضل مجھ سے چھن نہ جائے۔

- (۱۰): متواضع شخص لوگوں کا خیر خواہ اور بخشنے والا ہے اور وہ کبھی کسی پر کسی طرح کا احسان نہیں جتلاتا۔  
 (۱۱): اللہ تعالیٰ کی خاطر اس کے دین کی خاطر اپنے مال و جان ہر چیز کو قربان کر کے پھر بھی تشنہ لب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت، کبریائی اور عظمت کے احساس کی وجہ سے وہ یہی سمجھتا ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔

رضا جان جانان جان دینے پر بھی سستی ہے  
 جان دے دی دی ہوئی اسی کی تھی  
 حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا  
 تواضع کے فضائل!

- تواضع کے بہت ہی زیادہ فضائل و فوائد بیان کئے گئے ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:
- (۱): تواضع سے ہر خیر اور ہر خوبی پیدا ہوتی ہے۔  
 (۲): تواضع بندگی کی روح بھی ہے اور بندگی کا مظہر بھی۔  
 (۳): متواضع شخص ہمیشہ خوشی اور راحت میں ہوتا ہے، وہ حسد و غیرہ کے غم و حزن اور جلن سے محفوظ ہوتا ہے۔  
 (۴): متواضع شخص سے خیر پھیلتی ہے اور ہر خیر اسی کی طرف لوٹ آتی ہے۔  
 (۵): جس بندے میں جس قدر تواضع اور عبدیت ہوتی ہے وہ بندہ اسی قدر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہوتا ہے اور اسی قدر اللہ تعالیٰ کا مقرب بن جاتا ہے۔  
 (۶): تواضع اور خاکساری میں بھی رفعت اور بلندی کا سبب ہے اور آخرت کے درجات اور بلندی کا



سبب بھی۔

(۷): متواضع شخص شر و فساد سے محفوظ رہتا ہے اور مصائب اور مشکل وقت میں اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتا ہے اور اس کے لئے آسانی کی راہ نکال دیتا ہے۔

(۸): متواضع شخص چونکہ اللہ تعالیٰ کا شاکر بندہ ہوتا ہے اور اس کے دل پر اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کی ہیبت طاری رہتی ہے اس لئے اس پر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں، شفقتیں نازل ہوتی رہتیں ہیں۔

(۹): متواضع شخص لوگوں کی نظروں میں اونچا اور بڑا ہوتا ہے اور اس کے اعمال اور دعاؤں کو اللہ تعالیٰ حسن و خوبی کے ساتھ قبول فرماتے ہیں۔

(۱۰): اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع کا صلہ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور جنت ہے۔

تواضع اختیار کرنے والوں کے جنت میں عالی مقامات!

تواضع اختیار کرنے والوں کو جنت میں عالی مقامات پر فائز کیا جائے گا چنانچہ اللہ تعالیٰ خدائے رحمان کے بندوں کی بندگی اور تواضع والے بول چال، چال ڈھال اور کردار و اخلاق کو ذکر کر کے آخر میں فرماتا ہے کہ:

﴿أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا ۖ خَالِدِينَ فِيهَا حَسُنَتْ

مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ۖ﴾

”یہ لوگ ہیں کہ ان کو ان کی ثابت قدمی کے صلے میں بالا خانے ملیں گے اور ان میں ان کا استقبال دعا و سلام کے ساتھ ہوگا وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے وہ خوب جگہ ہے ٹھہرنے کی اور خوب جگہ ہے رہنے کی۔“ (فرقان: ۷۵-۷۶)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو مذکورہ بالا صفات سے متصف ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو حق کی خاطر نیچے کر لیا تھا اور تواضع اور فوٹی کی زندگی گزاری اور اسی عبدیت اور متواضعانہ خدا پرستانہ زندگی پر استقامت اختیار کی تو اس وجہ سے یہ لوگ جنت کے عالی مقامات کے مستحق ٹھہریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو بڑی سرفرازی عطا فرمائے گا۔

تواضع رفعت و بلندی کا ذریعہ ہے!

بلاشبہ تواضع بہت ہی عظیم انسانی خصوصیت ہے، جس کو یہ نعمت نصیب ہو جائے تو وہ براہی خوش نصیب ہے اور اسی میں دنیا و آخرت کی رفعت و بلندی ہے۔



چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِّنْ مَّالٍ وَمَا زَادَ اللَّهُ بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلَّهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللَّهُ)

”صدقہ (دینے نے کسی کے) مال کو کم نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ معاف کر دینے کی وجہ سے (معاف کرنے والے) بندے کی عزت کو بڑھاتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو رفعت و بلندی نصیب کرتا ہے۔“ (مسلم، مشکوٰۃ: باب فضل الصدقة)

نیز حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ:

”اے لوگو! تواضع اور انکساری کو اختیار کرو کیونکہ میں رسول ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے (لوگوں کے ساتھ) تواضع کا رویہ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بلندی سے نوازتا ہے۔ لہذا وہ اپنی نظر میں تو حقیر ہوتا ہے (کیونکہ اس کی نظر اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور اپنے عیوب و نقائص پر ہوتی ہے) لیکن لوگوں کی نظر میں بلند ہوتا ہے اور جو شخص تکبر و غرور کا رویہ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیچے گرا دیتا ہے۔ لہذا وہ لوگوں کی نظروں میں تو حقیر ہوتا ہے اگرچہ وہ اپنے خیال میں اپنے آپ کو بلند سمجھتا ہے لیکن لوگوں کی نظروں میں کتے اور خنزیر سے بھی زیادہ بدتر ہوتا ہے۔“ (مشکوٰۃ: باب الغضب والكبر)

### دنیا کی محبت کا بیان!

دنیا کی محبت اور اس کی حرص ایک بدترین خصلت ہے اور یہی خصلت طرح طرح کے فساد اور فتنوں اور برائیوں کا سبب بن جاتی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مذموم محبت ہے جو ہر گناہ اور خطا کی بنیاد ہوا کرتی ہے۔

### دنیا کی محبت کیا چیز ہے؟

انسان دنیا میں رہتا ہے اور اس کو دنیا کی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے نیز انسان بھی دوسرے انسانوں کے کام آتے ہیں مثلاً کوئی طبیب اور ڈاکٹر ہے کوئی کارگر ہے کوئی مخدوم ہے کوئی خادم ہے اور کوئی نوکر ہے، کوئی بادشاہ ہے کوئی رعایا ہے اسی طرح انسانوں کی ضروریات بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اس لئے دنیا کی چیزوں کی فروانی سے خوش ہو جاتا ہے کہ زیادہ مال و دولت ہو، کھانے پینے، رہنے سہنے کا زیادہ سے زیادہ اچھے سے اچھا سامان ہو اور لوگوں میں میری عزت ہو شان و شوکت ہو، مختصر یہ کہ انسان دنیا میں خوش رہنے کے لئے دو چیزوں کو بہت ہی اہم سمجھتا ہے ایک یہ کہ اس کے پاس دنیا کی مال و دولت اور سامان ہو اور دوسرا لوگوں کی نظروں میں معزز اور مقبول بھی ہو۔ پہلی کو حب مال یعنی مال واسباب کی محبت اور دوسری کو حب جاہ یعنی اپنی جان اور شان و شوکت و مقبولیت کی یا ان دونوں میں سے کسی ایک کی محبت اس قدر غالب ہو جاتی ہے کہ وہ اس کو اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے احکامات سے غافل کر دے، یا اللہ تعالیٰ کی بندگی میں رکاوٹ ڈال دے یا اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں سستی پیدا کر دے تو اسی کو دنیا کی محبت کہا جاتا ہے اور اسی کو دنیا بھی کہتے ہیں اور دنیا کی محبت میں لوگوں کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک بے شمار درجات بن جاتے ہیں اور محبت کی کمی و بیشی کے مطابق زہد اور دنیا پرستی کے درجات کو تقسیم کیا جاتا ہے۔

### دنیا کی چیزوں سے کس درجہ میں محبت ہونی چاہئے؟

جب یہ بات معلوم ہوئی کہ انسان کو دنیا کی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے اور اپنی عزت کا خیال بھی اس کو رہتا ہے اور یہ مشاہدہ بھی ہے کہ کوئی لاکھ بار کہے اور سوچے کہ مجھے دنیا کے ساتھ کوئی بھی دلچسپی نہیں، پھر عارضی طور پر بھی اس کو ضرور بضرور کسی نہ کسی درجے میں دنیا کی چیزوں کی تلاش رہتی ہے اور ان کو استعمال میں لاتا ہے مثلاً سخت پیاس کی وجہ سے اس کو پانی سے عارضی محبت ہونا اور اس کی تلاش کرنا جب کہ یہی حالت بھوک میں بھی پیش آتی ہے۔

انسان کو قضاے حاجت کی ضرورت پڑتی ہے تو اس وقت ایسی جگہ کو تلاش کرتا ہے جہاں وہ اپنا تقاضا پورا کرے اور یہی تلاش ہی دلچسپی کی دلیل ہے۔ انسان بعض اوقات دشمن کی تلاش میں رہتا ہے اس وقت بھی اس کے

دل میں ایک خواہش اور ایک محبت پائی جاتی ہے وہ یہ کہ اپنے دشمن کو ایذا اور تکلیف پہنچائے یا اس کو مارنے سے دلچسپی اور محبت ہوتی ہے غرض انسان کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اور جس چیز کی خواہش کرتا ہے اور اس کو تلاش کرتا ہے تو اس کو اس سے محبت ہوتی ہے حتیٰ کہ اگر وہ تلخ دوا یا آپریشن سے اپنا علاج کراتا ہے تو اس علاج کو اختیار کرنے کی محبت اس کے اندر موجود ہوتی ہے اگرچہ وہ اس کو بظاہر ناپسند کرے اس سے روئے چیخ و پکار کرے، کیونکہ ایسی صورت میں اس کو اپنی صحت سے زیادہ محبت ہوا کرتی ہے اس لئے وہ اس مرض سے نجات پانے کی خاطر اس عارضی تکلیف کو قبول کر لیتا ہے اور ڈاکٹر کو دوا کی قیمت اور آپریشن کی مزدوری (فیس) بھی دے دیتا ہے اسی طرح اگر کسی کو کہا جائے کہ ایک گھنٹہ یا ایک دن جیل میں گزارو تو بادشاہ بنائے جاؤ گے تو وہ بادشاہی کی محبت میں جیل سے بھی محبت کرے گا۔

### زہد کسے کہتے ہیں؟

اگر یہ بات ذہن نشین ہوگئی ہو تو اب اس سے خود بخود زہد کا مفہوم سمجھ میں آجائے گا زہد کے لغوی معنی کسی چیز سے بے رغبت ہو جانے کے ہیں اور دین اسلام کی خاص اصطلاح میں اللہ تعالیٰ اور آخرت کے لئے دنیا سے بے رغبت ہو جانے کو زہد کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت یا جنت کی محبت اس قدر غالب ہو کہ اس کے مقابلے میں دنیا کی عزت اور دنیا کا مال، دولت حقیر نظر آئے۔

### دنیا کا کاروبار نہ کرنا وغیرہ زہد نہیں!

جب زہد کی تعریف معلوم ہوئی تو اس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ دنیا کا کاروبار چھوڑنا یا دنیا سے اس قدر متنفر ہونا کہ خودکشی کر لی جائے یا دنیا کی ساری نعمتوں، راحتوں اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر لینا یا مال اڑانا زہد نہیں بلکہ یہ سب کچھ ایسی صورت میں بھی پیش آتا ہے جب انسان سخت قسم کا دنیا پرست یا آرام پرست ہوتا ہے۔ ایک بے ہمت اور بے کار آدمی اس لئے کاروبار کو چھوڑ کر بظاہر تارک الدنیا بن جاتا ہے کہ اس کو مال و دولت سے زیادہ اپنی راحت و آرام کی فکر دامن گیر رہتی ہے ایسی صورت میں یہ شخص مال و دولت سے بے رغبت ہے لیکن اس کی یہ بے رغبتی صرف بے ہمتی اور صرف اپنی آرام کی خاطر ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور دین اسلام کی خاطر ایک آدمی خودکشی کر لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کو دنیا سے نفرت اور آخرت سے محبت ہے بلکہ جو شخص خودکشی کرتا ہے تو اس کی وجہ یا تو لوگوں کے طعنوں کا خوف اور ان کے سامنے ذلیل ہونے کا تصور ہوتا ہے جو اس کے لئے ناقابل

برداشت بن جاتا ہے یا اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی ذہنی پریشانی و بے چینی یا جسمانی درد و تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے اور وہ اس کو ناقابل برداشت سمجھ کر خودکشی کر لیتا ہے تو خودکشی کرنے والا زندگی پر موت کو ترجیح اس لئے نہیں دیتا کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور آخرت کو حاصل کر لے بلکہ وہ صرف اپنی جسمانی راحت و سکون وغیرہ کے خیال سے اس سنگین جرم کو اختیار کر لیتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی شان و شوکت بنانے کی خاطر اپنا مال و دولت اڑاتا ہے اور کسی چیز کو اپنے پاس نہیں رہنے دیتا تو وہ بھی زاہد نہیں بلکہ یہ لوگوں میں بڑا بننے کا شوق و محبت ہے جسے وہ دنیا کی چیزوں کو قربان کر کے حاصل کرنا چاہتا ہے اسی طرح ایک فقیر نادار جس کے پاس کوئی مال و دولت نہیں اسے بھی اس وقت تک زاہد نہیں کہا جاسکتا جب تک اس کے دل میں مال جمع کرنے کی حرص و لالچ موجود ہو، بلکہ زاہد تو وہی ہوتا ہے جو دنیا اور اس کی لذتوں اور راحتوں اور مال و متاع پر قدرت و اختیار حاصل ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ اور آخرت کی خاطر دنیا کے مال و متاع، اس کی عیش و تنعم اور اس کی لذتوں اور راحتوں کو قربان کر دیتا ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی محبت اور آخرت کی محبت اس قدر غالب آچکی ہو کہ جس کے مقابلہ میں دنیا کی عزت دنیا کا مال و دولت دنیا کی لذتیں راحتیں وغیرہ ساری چیزیں بالکل بے قیمت اور حقیر بن جائیں۔

مذکورہ بالا بحث سے زہد اور فقر میں فرق واضح ہو گیا وہ یہ کہ زاہد وہی ہوتا ہے جس پر اللہ تعالیٰ اور آخرت کی محبت اس قدر غالب آچکی ہو کہ دنیا کے مال و جاہ کو حاصل کرنے کے باوجود دنیا سے بے التفات ہو دینا اس کے پیچھے بھاگے وہ اس سے دامن چھڑائے، اگر معاملہ برعکس ہو کہ دنیا کو حاصل کرنا تو چاہتا ہے مگر دنیا اس کے ہاتھ نہ آئے تو یہ زاہد نہیں بلکہ اسے فقر کہا جاتا ہے اگرچہ فقر کی فضیلت آئی ہے لیکن یہ زاہد نہیں جو انسان کی بلند ترین صفات میں سے ہے۔

### زہد کی اساس اور بنیاد!

زہد کی اصل، اساس اور بنیاد یہ ہے کہ آدمی کو دنیا کے عیش کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور آخرت کی فکر زیادہ دامن گیر ہو جائے اور یہ اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر (جس میں وعدہ آخرت، جنت اور دوزخ بھی ہے) پر مکمل بھروسہ اور اطمینان ہو، جیسا کہ اس کا بیان ”توکل“ کے باب میں موجود ہے تو جس شخص کا سینہ کھل جاتا ہے اور اس حقیقت کو پالیتا ہے کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا ایک حقیر اور ایک بے قیمت چیز ہے اور اس کی کوشش دنیا کے بجائے آخرت کے لئے ہو جاتی ہے جیسا کہ یہ قاعدہ ہے انسان اس چیز کو حاصل

کرتا ہے اور اسی چیز کو تلاش کرتا ہے جو اس کے نزدیک اہم، قیمتی اور محبوب و مرغوب ہو۔

دیکھئے! کاشٹکار کو گندم سے محبت ہوا کرتی ہے لیکن وہ صرف غالب گمان کی بناء پر اس کو زمین میں پھینک دیتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد اس کو زیادہ مل سکے۔ ایک آدمی کو کسی شخص کے ساتھ کچھ محبت ہے اور وہی شخص جب اس کے ایک محبوب دوست یا اس کے محبوب بیٹے یا بھائی کا مخالف ہو جاتا ہے تو اب اس محبوب کے مقابلے میں کم محبت والے شخص سے متنفر ہو جاتا ہے اور اس نفرت اور بے رغبتی کی وجہ یہی دوسری غالب محبت ہو جایا کرتی ہے۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو اپنے ماں باپ سے محبت ہوا کرتی ہے لیکن جب وہ شادی کرتے ہیں اور اس کی ماں اس کی بیوی سے لڑتی ہے تو ان پر ماں کے مقابلہ میں بیوی کی محبت غالب آ جاتی ہے اور وہ اپنی بیوی کے مقابلے میں اپنی ماں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ تو ان صورتوں میں نفرت اور حقیر جاننے کی وجہ ایک محبوب پر دوسرے محبوب کی محبت کا غالب آ جانا ہوتا ہے۔ اسی طرح دنیا کی چیزیں اور دنیا میں عزت و آرام سے رہنا ہی انسان کی محبوب چیزیں ہیں لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر مکمل اعتماد و بھروسہ اور یقین ہو تو جو چیز بھی آخرت کے حصول اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی میں رخنہ ڈالتی ہو یا رکاوٹ بن جاتی ہو یا اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی بندگی اور فرمانبرداری میں سستی پیدا کرتی ہو تو اس سے اُسے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ اُس چیز کو چھوڑ دیتا ہے یہی اللہ تعالیٰ اور آخرت کی محبت اور فکر ہے جو زہد کی بنیاد اور توکل کا شرعہ اور پھل ہے اور جس شخص کا جس قدر زیادہ توکل اور فکر ہوگا اسی قدر وہ زہد اور دنیا سے بے رغبت ہوگا اور دنیا کو آخرت پر قربان کرنے والا ہوگا۔

### اصل زہد کیا ہے؟

زہد کے سلسلے میں حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ:

الرَّهَادَةُ لَيْسَتْ بِتَحْرِيمِ الْحَلَالِ وَلَا بِإِضَاعَةِ الْمَالِ وَلَكِنَّ الرَّهَادَةَ فِي الدُّنْيَا أَنْ لَا تَكُونَ بِمَافِي يَدَيْكَ أَوْ تَقَى بِمَافِي يَدِ اللَّهِ وَأَنْ تَكُونَ فِي ثَوَابِ الْمُصِيبَةِ إِذَا أَتَتْ فِيهَا أُصِيبَتْ بِهَا رَغَبٌ لَوْ أَنَّهَا أَبْقِيَتْ لَكَ.

”دنیا سے زہد اور بے رغبتی اختیار کرنا (صرف) یہ نہیں ہے کہ حلال چیزوں کو (اپنے اوپر) حرام کر لیا جائے اور اپنے مال و اسباب کو برباد کر دیا جائے بلکہ دنیا سے زہد اختیار کرنا یہ ہے کہ جو کچھ تیرے پاس اور تمہارے ہاتھ میں ہے اس سے زیادہ بھروسہ تم کو اُس پر ہو جو اللہ تعالیٰ کے قبضہ اور اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور یہ کہ جب تم کو کوئی مصیبت پہنچے تو اس سے اخروی ثواب کی طلب و رغبت تمہارے دل میں زیادہ ہو بہ نسبت اس خواہش کے کہ وہ مصیبت تم کو پیش ہی نہ آتی۔“ (ترمذی ابن ماجہ مشکوٰۃ)

بہت سے لوگ ناواقفی سے زہد کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی دنیا کی ساری نعمتوں، راحتوں اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر لے نہ کبھی لذیذ کھانے کھائے، نہ ٹھنڈا پانی پیئے نہ اچھا کپڑا پہنے وغیرہ تو آپ ﷺ نے اس روایت میں ایسی غلط خیالی کی اصلاح فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ زہد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جن نعمتوں کا استعمال بندوں کے لئے حلال کیا ہے آدمی ان کو حرام کر لے اگر روپیہ پیسہ اور مال ہاتھ آئے تو اسے برباد کر دے بلکہ زہد کا اصل معیار اور تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ اس دنیا میں اپنے پاس اور اپنے ہاتھ میں ہو اس کو فانی اور ناپائیدار یقین کرتے ہوئے اس پر اعتماد و بھروسہ نہ کرے اور اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے غیر فانی غیبی خزانوں اور اسکے فضل و کرم پر زیادہ اعتماد اور بھروسہ کرے اور دوسرا معیار اور دوسری علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جب کوئی تکلیف اور مصیبت پہنچ جائے تو اس کے اخروی اجر و ثواب کی چاہت اور رغبت اس کے دل میں اس مصیبت اور تکلیف کے پہنچنے کی خواہش سے زیادہ ہو یعنی بجائے اس کے کہ اس کا دل اس وقت یہ کہے کہ کاش یہ تکلیف مجھے نہ پہنچتی اس کے دل کا احساس یہ ہو کہ آخرت میں مجھے اس تکلیف کا جو اجر و ثواب ملے گا وہ ان شاء اللہ تعالیٰ تکلیف نہ پہنچنے کے مقابلہ میں میرے لئے ہزاروں درجے بہتر ہوگا۔

بہر حال اگرچہ زہد کا مفہوم یہی ہے کہ دنیا سے بے رغبتی ہو لیکن نبی کریم ﷺ نے زاہد کی دو صفات اور بیان فرمائیں اور بتایا کہ اگر کسی شخص میں یہ دونوں صفات موجود ہوں تو یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ وہ زہد کے حقیقی مقام پر فائز ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اور اس کے غیبی خزانوں ہی پر بھروسہ و اعتماد ہو دوسری بات یہ کہ آخرت کی طرف رغبت و اشتیاق اس حد تک پہنچے کہ اس دنیا میں جو مصیبتیں بلائیں تکلیفیں پہنچیں ان پر آخرت میں عظیم اجر و ثواب ملنے کی تمنا محبوب و پسندیدہ بن جائے اور ان کا پہنچنا ان کے نہ پہنچنے سے زیادہ مرغوب ہو اگر صبر و توکل کا یہ مقام حاصل ہو جائے تو سمجھنا چاہئے کہ حقیقی زہد حاصل ہو گیا۔

### زہد کی علامتیں!

جس طرح دنیا کی محبت گویا تمام گناہوں اور غلطیوں کی اساس اور بنیاد ہے اس کے برعکس اللہ تعالیٰ اور آخرت کے لئے دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے انسان ان تمام گناہوں اور بد اخلاقیوں سے نجات پاتا ہے جو دنیا کی محبت سے پیدا ہو جاتی ہیں لیکن یہاں زہد کی صرف چند موٹی موٹی اور اہم علامات ذکر کرتے ہیں تاکہ ان علامتوں کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۱) زاہد آدمی دنیا کی عیش اور لذتوں میں زیادہ مشغول نہیں ہوتا اور نہ وہ اپنے پاس زیادہ لذت اور عیش کا



سامان جمع کرتا ہے۔

(۲) جب اور جہاں دنیا کی چیزوں کے ترک کر دینے اور چھوڑنے میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اس کی خوشنودی کی خاطر دنیا کی چیزوں اور لذتوں و راحتوں سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور جہاں اور جس جگہ اللہ تعالیٰ کا حکم اور خوشنودی ہو کہ دنیا کی چیزوں کو اختیار کر لیا جائے تو اس وقت اور اسی جگہ وہ اس کو اختیار کر لیتا ہے۔

(۳) وہ سخی ہوتا ہے لیکن سخی بھی ایسا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر دنیا کا اپنا تمام مال و متاع مسکینوں وغیرہ کو دے کر بھی اس کے دل میں یہ نہیں آتا کہ اس نے کوئی بہت بڑی یا اہم چیز اللہ تعالیٰ کے نام پر قربان کر دی ہے اور وہ جس کے ساتھ کوئی احسان کرتا ہے تو ایسے انداز میں کرتا ہے گویا کہ اسی کے ساتھ احسان کیا جا رہا ہے وہ احسان کر کے بھی احسان جتانے کے بجائے خود احسان مند ہوتا ہے۔

(۴) بادشاہوں کے خزانے اور عیش و عشرت میں پلنے والے لوگوں کا ساز و سامان اس کی نظر میں مکھی کے پر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔

(۵) اس میں قناعت ہوتی ہے دنیا کے مال و عزت کے بارے میں قانع ہوتا ہے یعنی مال و عزت کے حصول کا لالچی اور حرص نہیں ہوتا ہے بلکہ قناعت کی زندگی گزارتا ہے۔

(۶) وہ متکبر نہیں ہوتا بلکہ متواضع اور منکسر المزاج اور خاکسار ہوتا ہے کیونکہ اس کی نظر میں دنیا کا مال و متاع اور دنیا کی چیزیں اور دنیا کی اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ بندہ اس دنیا میں مصائب اور تکالیف کی دعا کرے یا تمنا کرے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوئی مصیبت یا تکلیف بندہ کو پہنچ جائے تو پھر مؤمن کا مقام اور زہد کا تقاضا یہ ہے کہ اس مصیبت یا تکلیف کا جواز و ثواب آخرت میں ملنے والا ہے وہ اجر اس مصیبت و تکلیف کے پہنچنے سے زیادہ محبوب و مرغوب ہو۔

عزت کوئی اہمیت نہیں رکھتی اس لئے ان چیزوں کا ہونا اور نہ ہونا اس کے نزدیک برابر ہوتا ہے اس لئے ان چیزوں کے وجود سے اس میں تکبر پیدا نہیں ہوتا ہے اور اگر یہ چیزیں اس کے بجائے دوسروں کے پاس موجود ہوں تو وہ دوسروں کے ساتھ حسد نہیں کرتا اور نہ ان سے جلتا ہے۔

(۷) اس کے دل میں مال و جاہ کی محبت نہیں ہوتی مال کی محبت کی علامتیں ”حب مال“ اور جاہ کی علامتیں ”حب جاہ“ کے باب میں پڑھ لیجئے۔

(۸) اس کی کوشش و بھاگ دوڑ دنیا کے بجائے صرف آخرت اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے ہوتی ہے۔

### قناعت کسے کہتے ہیں؟

زہد کی علامتوں میں بعض علامتیں تو سمجھ میں آچکی ہوں گی البتہ اس میں تکبر، حسد اور قناعت کا ذکر ہے جو قدرے تفصیل چاہتا ہے۔ ان میں سے پہلے قناعت کو ذکر کیا جاتا ہے اور تکبر اور حسد کی تفصیل بھی ان شاء اللہ تعالیٰ مناسب جگہ میں بیان کی جائے گی۔ اب قناعت کے معنی سمجھ لیجئے۔

قناعت کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ حصہ (یا قسمت) میں آئے اس پر صبر کر کے راضی رہنا (یعنی اس سے زیادہ کی حرص و لالچ نہ کرنا) اور دنیا کے بارے میں قناعت کا مطلب یہ ہوا کہ بقدر ضرورت جس قدر دنیوی مال و متاع اس کو کوشش وغیرہ کے نتیجے میں میسر آئے اور جو کچھ حصہ اس کو مل جائے اس پر صبر کر کے اللہ تعالیٰ سے راضی اور خوش رہتا ہے اور وہ اس سے زیادہ کی حرص و لالچ میں گرفتار نہیں ہوتا اور نہ اپنے سے زیادہ آسودہ حال اور عزت والے لوگوں سے حسد کرتا ہے اور نہ ان سے جلتا ہے، نیز قناعت کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ اس کو جو صورت بھی پیش آئے صحت مند یا قوت والا یا اولاد والا ہونا یا نہ ہونا وغیرہ جیسی تقدیر و تقسیم پر راضی ہوتا ہے اور اس کا نفس کبھی ناممکنات کی طلب کے درپے نہیں ہوتا۔

غرض یہ کہ قانع شخص اللہ تعالیٰ کی تقدیر و تقسیم اور دنیاوی نتائج کو صبر و شکر اور خوشی سے قبول کر لیتا ہے اور قناعت کی ضد حرص و لالچ ہے۔

### قناعت کی علامتیں!

- (۱) قانع شخص چوری، ڈاکہ، حرام خوری، حرص اور لالچ سے پاک ہوتا ہے۔
- (۲) خود دار ہوتا ہے کسی کے سامنے ذلیل ہو کر دست سوال دراز نہیں کرتا۔
- (۳) جو کچھ بقدر ضرورت اس کو مل جاتا ہے اس پر اکتفا کرتا ہے اور اس پر خوش ہوتا ہے۔
- (۴) وہ لوگوں سے طمع نہیں رکھتا۔
- (۵) وہ اپنے سے آسودہ حال اور زیادہ دولت مند و عزت مند لوگوں سے ملتا جلتا نہیں۔
- (۶) اپنے موقف پر ڈٹ جانے والا ہوتا ہے۔

### زہد و قناعت کا اندرونی عمل!

زہد و قناعت انسان کے اندر مستعدی اور احساس و ضمیر کو زندہ رکھتا ہے، پوشیدہ طاقتوں کو ابھارتا ہے اور اس کی

وجہ سے انسان میں عظیم صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں اور بڑھ جاتی ہیں جس کی وجہ سے انسان عظیم کارنامے انجام دیتا ہے اور آخرت کی دائمی زندگی کو بہترین بنالیتا ہے اس کے برعکس عیش و آرام پرستی ضمیر و احساس کی شدت کو کند کر کے فراست سے محروم کر دیتی ہے، روح کو کمزور کرتی اور سلا دیتی ہے اور دل کو زنگ آلودہ اور مردہ کر دیتی ہے۔

### زہد میں افراط و تفریط!

آج کل جس طرح دوسرے دینی امور میں سخت افراط و تفریط آچکا ہے اور حق کو باطل سے ملا کر باطل کو حق قرار دیا جاتا ہے اسی طرح زہد کے بارے میں بھی یہ افراط و تفریط پائی جاتی ہے بعض تو اس معاملہ میں اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ رہبانیت (جو شریعت مطہرہ میں ممنوع ہے) کو زہد کا نام دینے لگے اور بعض نے زہد کا ایسا حلیہ بگاڑا کہ خالص دنیا پرستی کو عین زہد باور کرانے لگے اور انہوں نے قرآن و حدیث کی تعلیم اور صحابہ کرام ؓ و اسلاف کی زندگی نظر انداز کر کے اپنی دنیا پرستی کی دلیل کے لئے کچھ روایتیں ڈھونڈ نکالیں جن کو وہ اپنا من مانا مفہوم بنا کر دنیا پرستی کو عین زہد اور زہد کو رہبانیت قرار دیتے ہیں اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ معلوم کیا جائے، کہ وہ کون سی رہبانیت ہے جو شریعت مطہرہ میں ممنوع و مذموم ہے؟ اور نبی کریم ؐ اور صحابہ کرام ؓ کی زندگی کیسی تھی نیز یہ کہ کیا وقتی خلوت و اعتکاف وغیرہ جیسے امور شریعت مطہرہ میں محمود و مطلوب ہیں یا مکروہ؟

### رہبانیت کیا ہے؟

رہب عربی میں خوف اور ڈر کو کہتے ہیں اور رہبانیت اس مسلک اور طرز حیات جس کی بنیاد خوف اور ڈر پر ہو اور اصطلاح میں دنیا کی لذتوں اور حلال، پاکیزہ چیزوں کو عبادت کی نیت سے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینا رہبانیت کہلاتا ہے۔

### رہبانیت کی ابتداء!

جب شر و فساد و ظلم و استبداد اور سرکشی اس درجہ بڑھ جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی جان اور ایمان خطرے میں پڑ جائے تو ایسی صورت میں اگرچہ عزیمت اور بڑی مردانگی کی بات تو یہ ہے کہ کلمہ حق پر پہاڑ کی طرح جمار ہے اور باطل کے طوفان کے ساتھ ٹکری جائے۔ ایسی عظیم شخصیتیں زیادہ تعداد میں نہیں ہوتیں اور عام لوگ اتنی عظیم قربانی والے نہیں ہوتے اس لئے ایسے سخت جابرانہ، ظالمانہ، بدکارانہ اور بے ایمانہ ماحول و معاشرہ میں اتنی ہمت پھر بھی کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ بے ایمانی وغیرہ میں شریک نہیں ہوتا اور اس خطرے کی وجہ سے کہ اس کو

کہیں بے ایمانی وغیرہ پر مجبور نہ کیا جائے تو ایسی اضطراری اور سخت مجبوری کی صورت میں اگرچہ لوگوں کو بالکل چھوڑ کر ایک طرف ہو جاتا ہے مثلاً جنگل میں چلا جاتا ہے یا کہیں گوشہ نشین ہو جاتا ہے تو یہ بھی اس کی ہمت ہوتی ہے اور ایسی مجبوری اور اضطراری حالت میں اگرچہ عزیمت پھر بھی مقابلہ اور ڈٹ جانے میں ہے لیکن دوسرے درجہ پر یہی کچھ ہو سکتا ہے کہ فساق و فجار ظالموں اور بدکاروں کو چھوڑا جائے اور ان سے کنارہ کشی اختیار کی جائے۔

اور یہ رخصت صرف پہلوں کیلئے نہ تھی بلکہ یہ تعلیم تو اسلام میں بھی ہے جو کہ ابدی بھی ہے اور تمام جہانوں کے لئے بھی۔ چنانچہ جب حالات اس درجہ نازک ہو جائیں کہ لوگوں کے ساتھ رہنے کی صورت میں جان دینی پڑے گی یا باطل پر مجبور ہونا پڑے گا تو ایسی صورت میں یہ جائز اور رخصت ہے کہ کوئی اپنے دین و ایمان کی حفاظت کے لئے دنیا کے علاقے سے کٹ کر عزالت نشینی اور جدائی اختیار کر لے۔ جب یہ بات سمجھ آگئی تو اب رہبانیت کی ابتداء کو پڑھ لیجئے۔

حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کے بعد جب بنی اسرائیلیوں اور بنی اسرائیل کے بادشاہوں میں بے دینی، بے ایمانی، ظلم و استبداد اور تشدد اس قدر بڑھ گیا کہ ان ظلموں اور بدکاریوں سے روکنے والوں کو قتل کیا جاتا تھا تو ایسے سخت اور نازک وقت میں بعض دین دار عیسائیوں نے لوگوں سے کنارہ کش ہو کر پہاڑوں وغیرہ میں سکونت اختیار کی اور اصحاب کہف کا مشہور و معروف واقعہ جس کا بیان قرآن مجید میں موجود ہے یہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو ظالموں جابروں سے تنگ آ کر پہاڑ کے غار میں رہنے پر مجبور ہو گئے تھے اور یہ جائز اور وقت کے لحاظ سے مناسب عمل تھا کیونکہ انہوں نے تو یہ سب کچھ دین کی حفاظت کی خاطر کیا تھا لیکن اس کے بعد آنے والے لوگوں نے بلا مجبوری کے کنارہ کشی کے ساتھ دوسری چیزوں کو بھی شامل کر کے مسلک رہبانیت کی ایک مستقل بنیاد ڈال دی اور ان کے مسلک رہبانیت کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے اوپر یہ لازم کر دیا کہ دنیا کی تمام جائز لذتیں اور راحتیں چھوڑ دی جائیں نہ نکاح کیا جائے نہ اچھا لباس پہنا جائے نہ ماں باپ وغیرہ جیسے رشتہ داروں سے تعلق و محبت رکھی جائے نہ رہتے سہنے کے لئے مکان اور گھر کا اہتمام کر لیا جائے بلکہ لوگوں سے دور کسی پہاڑ وغیرہ میں زندگی بسر کریں یا خانہ بدوشوں کی طرح اپنی زندگی سیاحت میں گزار دی جائے۔

رہبانیت میں مزید تشدد اور غلو!

یوں جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اسی رہبانیت میں کچھ اور اضافے کئے گئے اور لوگوں نے اپنے اوپر تشدد اور پابندیوں کا اس قدر بوجھ لاد لیا کہ بالآخر وہ اس تشدد کو نباہ نہ سکے چنانچہ انہوں نے روحانی مدارج طے کرنے کے

لئے اول شرط یہ رکھی کہ ازدواجی زندگی کو خیر باد کہا جائے۔ ماں باپ بہن بھائی اور اولاد وغیرہ کے ساتھ مرتے دم تک کسی قسم کا تعلق نہ رکھا جائے نہ ان کے ساتھ ملاقات کی جائے اور نہ ان کو اپنا چہرہ دکھایا جائے نیز یہ کہ میلا کچلا پراگندہ حال ہو، نہ صفائی کا اہتمام کیا جائے نہ اچھے لباس کا استعمال، نہ عطر و خوشبو استعمال کی جائے اور نہ عمدہ طعام کھایا جائے اور یہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ جان کو بلاوجہ سخت سے سخت تکلیف پہنچانے کو روحانی ترقی کا واحد راستہ سمجھتے تھے۔ ان میں کوئی سخت سردی میں اپنے جسم کو ننگا کرتا، کوئی سالہا سال تک اپنے کو کھڑا رکھتا یا سالہا سال تک بیٹھا رہتا تھا اور لیٹنے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا۔

اسی طرح اپنی جانوں کو مختلف قسم کی تکلیفیں دے کر وہ اس کو اللہ تعالیٰ کی محبت اور روحانی ترقیات کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ لیکن انسانی فطرت کے ساتھ جنگ کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ان کے کلیسا کا نظام حرام کاری کے اڈوں میں تبدیل ہو گیا اور جس قدر دنیا پرستی مال و جاہ کی پرستش اس نظام کے اپنانے والوں کی اکثریت کے اندر آگئی تھی وہ اس نظام سے باہر نہیں پائی جاتی تھی اور قرآن مجید نے جگہ جگہ اس نظام و مسلک کو اپنانے والوں کا ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض رہبانوں یعنی پادریوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

﴿لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْذِّينَ قَالُوا إِنَّا نَصْرِي ط ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَسِيصِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝﴾

یعنی ”(غیر مسلموں میں سے) تمام لوگوں سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ دشمنی رکھنے میں یہود و مشرکین کو پاؤ گے اور تم مسلمانوں کے ساتھ دوستی میں (دوسرے غیر مسلموں کی بہ نسبت) قریب تر ان لوگوں کو کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ (یعنی عیسائی) ہیں یہ اس لئے کہ ان میں علماء اور رہبان (یعنی تارک الدنیا درویش) موجود ہیں اور اس لئے کہ وہ تکبر نہیں کرتے۔“

(مائدہ: آیت نمبر ۸۲)

مذکورہ بالا آیت میں نصاریٰ کے بعض علماء اور بعض اچھے تارک الدنیا درویش رہبانوں کی مدح فرمائی گئی کہ ان میں تکبر نہیں اس لئے وہ حق پرستی اور اسلام دوستی میں دوسرے غیر مسلموں سے زیادہ قریب ہیں اور ان میں دوسروں کی بہ نسبت حق اور اسلام کی دشمنی کم پائی جاتی ہے اس لئے وہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ حق اور اسلام کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

اور ایک دوسری جگہ بعض راہبوں کی کمزوری کو قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّا كَثِيرٌ مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لِيَآْكُلُوا أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ

سَبِيلَ اللَّهِ ط

یعنی ”بہت سے عالم راہب لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ (یعنی دین اسلام سے) سے روکتے ہیں۔“ (توبہ: آیت ۳۴)

نیز قرآن مجید ایک جگہ رہبانیت اور اسی مسلک کو اختیار کرنے والے راہبوں کے متعلق بیان فرماتا ہے کہ:

﴿ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَافَةً وَرَحْمَةً وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَنَّاعُوهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾

یعنی ”پھر ان کے بعد ہم یکے بعد دیگرے اپنے اور رسولوں کو بھیجتے رہے اور عیسیٰ بن مریم کو بعد میں بھیجا اور اسے ہم نے انجیل دی اور جن لوگوں نے ان کی اتباع اختیار کی تھی ان کے دلوں میں رحم ڈال دیا اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کی ہم نے اسے ان پر فرض نہیں کیا تھا مگر انہوں نے رضائے الہی کو حاصل کرنے کے لئے اسے اختیار کیا تھا اور پھر (ان راہبوں میں زیادہ تر لوگ ایسے ہو گئے کہ) انہوں نے اسی کو (یعنی رہبانیت کو جو انہوں نے خود ایجاد کر کے اپنے اوپر لازم کر لی تھی) نباہ نہ سکے جیسے اس کے نباہنے کا حق تھا تو ان میں سے جو ایمان لائے تھے ہم نے انہیں ان کا اجر دے دیا اور ان میں اکثر فاسق (فاجر اور نافرمان) ہیں۔“ (حدید: آیت ۳۷)

اسلام فطری دین ہے اس میں نصاریٰ کی طرح رہبانیت و درویشی کی گنجائش نہیں! اسلام ایک فطری اور تمام دنیا کے لئے ابدی دین اور ضابطہٴ حیات ہے، اس نے ہر معاملہ میں صحیح توازن و تناسب کے ساتھ اعتدال کا راستہ بتلایا اس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت، نماز و نوافل وغیرہ کی خوب ترغیب دی خواہشاتِ نفس کی پیروی سے سختی سے روکا، دنیا کی لذتوں اور آسائشوں میں غرق ہونے سے منع فرمایا، لیکن اسلام نے نفسِ گشی اور روحانی ترقی کے اس طریقہ سے منع کر دیا جو عیسائیوں نے ایجاد کر دیا تھا اور جس کا نام رہبانیت ہے۔ اسلام نے بتلادیا کہ ازدواجی زندگی اور شادی اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان رکاوٹ نہیں اور نہ کھیتی باڑی، تجارت اور صنعت وغیرہ روحانی ترقی میں رخنہ پیدا کرتی ہیں بلکہ ان ساری چیزوں کو سچائی سے اختیار کرنے کی اور نباہنے کی ترغیب دی اور صفائی اور طہارت کو ایمان کا جز قرار دیا۔ باپ، بھائی، بہن اور بیوی بچوں کے حقوق کی ادائیگی کو لازم کر دیا بلکہ اس نے تو ہر انسان پر یہ بھی فرض کیا کہ وہ اپنی جان کا حق بھی ادا کرے اور اسے ایسی ریاضتوں اور ایسی مشقتوں میں مبتلا نہ کرے جو صحت کے لئے مضر اور نقصان دہ ہوں۔

### نا جائز رہبانیت کی ممانعت قرآن مجید کی رو سے!

چنانچہ قرآن مجید نے صفائی اور طہارت پر خوب زور دیا ہے نیز جائز لذتوں اور راحتوں کے متعلق قرآن مجید

کا بیان یہ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَحَرُّوا طَبِيبًا وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ  
كُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ حَلَالًا طَيِّبًا وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ﴾

یعنی ”اے ایمان والو! ان ستھری اور پاک چیزوں کو حرام نہ کرو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور جو کچھ حلال اور پاکیزہ رزق اللہ تعالیٰ نے تم کو دیا ہے اسے کھاؤ (اور پیو) اور اس اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچتے رہو۔ جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔“

(مائدہ: آیت ۸۷ تا ۸۸)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے کہ:

﴿يَسَىٰ أَدَمَ خُدُوًا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝  
مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ ط قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ  
الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَمَةِ ط كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾

یعنی ”اے آدم کی اولاد! ہر نماز کے وقت (یعنی ہر عبادت کے موقع پر خواہ نماز ہو یا طواف وغیرہ) اپنا لباس پہن لیا کرو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو بے شک اللہ تعالیٰ حد (یعنی حدود شرعی) سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کی اس زینت (یعنی لباس وغیرہ) کو جو اس نے اپنے بندوں کے لئے بنائے ہیں کس نے حرام کیا ہے؟ اور (کس نے اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ پاکیزہ (اور لذیذ) کھانوں کو) حرام کر دیا ہے؟ آپ فرما دیجئے یہ (ساری پاک حلال) چیزیں اس دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لئے ہیں اور قیامت کے روز (تو ساری نعمتیں) خاص (مسلمانوں) کے لئے ہوں گی یونہی ہم آیتوں کو ان لوگوں کے لئے مفصل (کھول کر) بیان کرتے ہیں جو جاننے والے ہیں۔“

(اعراف: ۳۱ تا ۳۲)

مذکورہ بالا آیتوں میں غور کریں ان سے صاف صاف جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ دنیا کی ساری جائز زینتیں اور ساری حلال پاکیزہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں تاکہ وہ صبر و شکر کے ساتھ دنیا کی چیزوں کو ٹھیک سے اور مناسب طریقہ سے استعمال کر کے ان سے فائدہ اٹھا سکیں تاکہ ان چیزوں میں اور باہمی



تعلقات میں اللہ تعالیٰ کی تعلیمات اس کی حدود اور اس کے عائد کردہ حقوق کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ کی بندگی کو کامل طریقے پر اپنایا جاسکے بلکہ دنیا میں جو نعمتیں ہیں وہ بھی حقیقت کے اعتبار سے تو مسلمانوں اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور شکر گزار بندوں کے لئے ہی پیدا ہوئی ہیں لیکن چونکہ یہ دنیا دار الامتحان ہے اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے آزمانا ہے اس لئے تمام لوگ خواہ کافر ہوں یا مسلمان فرمانبردار ہوں یا نافرمان سب کے سب ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور آخرت میں تو ساری خالص پاکیزہ نعمتیں صرف اللہ تعالیٰ کے فرمانبرداروں اور مسلمانوں کے لئے ہوں گی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ قرآن مجید کے رو سے جائز زینت اور حلال پاکیزہ عمدہ چیزوں کو بلا کسی ضرورت کے خواہ مخواہ چھوڑنے کی کوئی نیکی نہیں اور نہ دنیا کی جائز چیزوں کا استعمال روحانی ترقی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول میں رکاوٹ بن سکتا ہے البتہ روحانی ترقی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول میں رکاوٹ اور خلل ڈالنے والی چیز، دنیا کی چیزوں کا غیر مناسب استعمال اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے حدود سے تجاوز کرنا ہے۔

رہبانیت کی ممانعت رسول اللہ ﷺ کے عمل اور ارشاد کی رو سے!

قرآن مجید کی چند آیتوں کے بعد نبی کریم ﷺ کے ارشادات اور آپ ﷺ کے عمل (جو کہ قرآن مجید کی تشریح اور اس کا بیان ہے) کو بطور نمونہ پیش کرتے ہیں تاکہ یہ بات خوب معلوم ہو جائے کہ اسلام میں عیسائی رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں۔

(۱) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے یہاں تشریف لائے تو آپ ﷺ کی نظر ایک پراگندہ آدمی پر پڑی جس کے سر کے بال بالکل منتشر تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

(مَا كَانَ يَجِدُ هَذَا مَا يَسْكُنُ بِهِ رَأْسَهُ)

”کیا یہ آدمی کوئی ایسی چیز نہیں پاسکتا جس سے اپنے سر کے بال ٹھیک کر لیتا؟“

نیز اسی مجلس میں آپ ﷺ نے ایک اور آدمی کو دیکھا جو بہت میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا تو اس کے متعلق

ارشاد فرمایا کہ:

(مَا كَانَ يَجِدُ هَذَا مَا يَغْسِلُ بِهِ ثَوْبَهُ)

”کیا اس آدمی کو ایسی کوئی چیز نہیں مل سکتی جس سے یہ اپنے کپڑے دھو کر صاف کر لیتا؟“ (مسند احمد و نسائی)

(۲) عطار بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ایک آدمی مسجد

میں آیا اس کے سر اور داڑھی کے بال بکھرے ہوئے تھے تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اس کو اشارہ فرمایا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے سر اور داڑھی کے بالوں کو ٹھیک کر آئے لہذا اس نے ایسا ہی کیا اور (سر اور داڑھی کو ٹھیک کر کے) پھر لوٹ کر آگیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

(الْيَسَ هَذَا خَيْرٌ مِنْ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ أَثَرُ الرَّأْسِ كَأَنَّهُ شَيْطَانٌ)

”کیا یہ (تمہارا سر اور داڑھی کے بالوں کو ٹھیک کر کے آنا) اس سے بہتر نہیں کہ تم میں سے کوئی پرانگندہ بال ایسی (بدنما اور قبیح) صورت میں آئے کہ گویا وہ شیطان ہے۔“ (موطا امام مالک)

(۳) حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا کہ: ”معلوم ہو چکا ہے کہ تم نے یہ معمول بنا رکھا ہے کہ تم ہمیشہ روزہ رکھتے ہو اور رات بھر نوافل پڑھتے ہو۔“ میں نے عرض کیا کہ: ”ہاں یا رسول اللہ ﷺ (ایسا ہی کرتا ہوں)“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”یہ طریقہ چھوڑ دو روزے بھی رکھا کرو اور نافع بھی کیا کرو اسی طرح رات کو نماز بھی پڑھا کرو اور سو یا بھی کرو کیونکہ تمہارے جسم کا تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے اور تمہارے مہمانوں کا بھی تم پر حق ہے (اور یہ تمہارے لئے جائز نہیں کہ جن جن کا حق تجھ پر عائد ہوتا ہے ان کی حق تلفی کر کے سارا دن اور ساری رات نماز اور روزے میں مشغول رہو اور یاد رکھو) جو ہمیشہ روزے رکھتا ہے اس نے گویا روزہ رکھا ہی نہیں ہر مہینہ میں تین دن کے نفلی روزے رکھ لینا ہمیشہ روزہ رکھنے کے حکم میں ہے اس لئے تم ہر مہینہ میں تین روزے رکھا کرو اور مہینے میں ایک قرآن مجید (تہجد میں) ختم کر لیا کرو۔“ عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ: ”میں تو اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں (اس لئے زیادہ کی اجازت دے دی جائے)“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو پھر تم داؤد علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے روزوں کا طریقہ اختیار کر لو اور وہ یہ کہ ایک دن روزہ اور ایک دن افطار (یعنی روزہ نہ رکھا) کرو اور سات راتوں میں ایک قرآن مجید ختم کر لیا کرو اور اس سے زیادہ نہ کرو۔“ (صحیح بخاری صحیح مسلم)

(۴) تین صحابہ کرامؓ کے بارے میں نبی کریم ﷺ کو معلوم ہو گیا کہ ان میں سے ایک نے ہمیشہ ساری رات نماز پڑھنے کا اور دوسرے نے ہمیشہ روزہ رکھنے کا اور تیسرے نے ہمیشہ نکاح سے پرہیز کرنے کا عہد کر لیا ہے تو نبی کریم ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ: ”تم لوگوں نے ایسا ایسا کیا ہے؟“ اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

(أَمَّا وَاللَّهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلَّهِ وَأَتَقَاكُمْ لَهُ لَكِنِّي أَنَا صُومٌ وَأَفْطِرُ وَأَصَلِّي وَأَرْقُدُ وَأَنْزَوُجُ النِّسَاءِ)

فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي .

”خبردار میں تم سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سے زیادہ متقی ہوں (لیکن اس کے باوجود) میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار (یعنی روزے میں ناعہ) بھی کرتا ہوں (رات میں تہجد کی) نماز بھی پڑھتا ہوں اور (رات کو) سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں (یہی میرا طریقہ ہے لہذا) جو شخص میرے طریقہ سے انحراف کرتا ہے وہ مجھ سے نہیں (یعنی میری جماعت میں سے نہیں)۔“ (دیکھئے مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری و صحیح مسلم)

نیز حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ کو یہ معلوم ہوا کہ وہ سارا دن اور ساری رات عبادت میں مشغول رہتے ہیں بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے دن کو روزہ رکھتے ہیں رات کو سوتے نہیں آپ ﷺ نے اُن کو بلا کر پوچھا کہ کیوں عثمان تم میرے طریقے سے ہٹ گئے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کی قسم میں نہیں ہٹا ہوں، آپ کے طریقہ کا طلب گار ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا میں سوتا بھی ہوں اور رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار (یعنی روزے میں ناعہ) بھی کرتا ہوں۔ عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، اے عثمان! اللہ تعالیٰ سے ڈرو کہ تمہارے اہل و عیال کا بھی تم پر حق ہے تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے تم (نفلی) روزے بھی رکھو اور افطار بھی کرو (رات کو) نماز بھی پڑھو اور (رات کو) سوؤ بھی۔

(دیکھئے ابوداؤد: کتاب الصلوٰۃ)

(۵) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(لَا تُشَدُّوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ فَيُشَدِّدَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ فَاِنْ قَوْمًا شَدُّوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ فَشَدَّ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ قَبْلَکَ

بَقَايَاهُمْ فِی الصَّوْمِ الدِّیَارِ رَهْبَانِیۃٍ نَّابِتَدْعُوْهُمَا مَا کَتَبْنَا عَلَیْهِمْ)

”تم اپنے اوپر سختی نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر سختی کریگا، ایک قوم (یعنی بنی اسرائیل) نے اپنے اوپر بھی تشدد اور سختی کو اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر تشدد اور سختی کی (اور آج بھی) ان کے بقایا راہب خانوں اور کنیسوں میں پائے جاتے ہیں یہ رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کی تھی ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی۔“ (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگ غیر شرعی اور غیر فطری مشقتوں میں اپنی جانوں کو مبتلا نہ کرو ورنہ پکڑے جاؤ گے جیسا کہ بنی اسرائیل نے اختیار کر کے رہبانیت اور سخت مشقتوں میں اپنے آپ کو مبتلا کیا بالآخر ان کا نباہ نہ ہو سکا اور پکڑے گئے لہذا شرعی حدود کے اندر اپنی زندگی گزارو اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے جو فرائض اور حدود مقرر کئے ہیں ان کی پابندی کرو اپنی طرف سے ریاضتوں اور مشقتوں کو ایجاد کر کے اپنے آپ کو بلا وجہ سختی اور

اللہ تعالیٰ کی گرفت میں نہ ڈالو۔

(۶) حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھ کو خصی (نامرد) ہونے کی اجازت دیجئے (تاکہ گناہوں کا خدشہ بھی نہ رہے) آپ ﷺ نے فرمایا وہ شخص ہم میں سے نہیں جو (لوگوں کو) خصی کرتا ہے یا خود خصی بن جاتا ہے بلکہ میری امت کے لئے خصی ہونا روزہ رکھنا ہے (کیونکہ روزہ رکھنے سے نفس اور خواہشات قابو میں ہو جاتے ہیں) انہوں نے پھر عرض کیا کہ مجھے سیر و سیاحت کی اجازت دے دی جائے (جیسا کہ بعض فقیر اور درویش لوگ ہمیشہ پھرتے رہتے ہیں) تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا:

”کہ امت کی سیاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا جائے انہوں نے تیسری بار پھر عرض کیا کہ مجھے یہ اجازت دیجئے کہ رہبانیت کو اختیار کر لوں تو آپ ﷺ نے فرمایا میری امت کی رہبانیت یہ ہے کہ مسجدوں میں نماز کے انتظار میں بیٹھا جائے۔“ (دیکھئے مشکوٰۃ: باب المساجد)

(۷) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک لشکر میں تھے تو ایک آدمی ایک غار کے پاس سے گزرا، وہاں کچھ پانی اور سبزی (بھی) تھی تو اس شخص کے دل میں یہ خیال گزرا کہ وہ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر اسی جگہ ٹھکانہ بنائے اس نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(اِنِّی لَمْ اُبْعَثْ بِالْیَهُودِیَّةِ وَلَا بِالنَّصْرَانِیَّةِ وَلَکِنِّی بُعِثْتُ بِالْحَنِیْفِیَّةِ السَّمُجَةِ وَالَّذِیْ نَفْسَ مُحَمَّدٍ بِیَدِهِ لَعْدُوَّةٌ اَوْ رُوْحَةٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ خَیْرٌ مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا وَالْمَقَامُ اَحَدٌ کُمْ فِی الصَّفِّ خَیْرٌ مِّنْ صَلَوٰتِهِ سِتِّیْنَ سَنَةً)

”(یاد رکھو) نہ تو میں یہودیت کے ساتھ (اس دنیا میں) بھیجا گیا ہوں اور نہ عیسائیت کے ساتھ (کہ میں تمہیں رہبانیت کی تعلیم دوں) بلکہ میں تو ایک سیدھا آسان دین حنیف لے کر آیا ہوں اور قسم ہے اس پاک ذات کی جس کے قبضہ میں محمد ﷺ کی جان ہے دن کے صرف ابتدائی یا آخری حصے میں (یعنی صبح و شام) کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جہاد) میں چلے جانا دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں سے بہتر ہے اور تم میں سے کسی کا (میدان جنگ کی) صف میں کھڑا ہونا اس کی ساٹھ سال کی پڑھی جانے والی نماز سے بہتر ہے۔“ (مشکوٰۃ: کتاب الجہاد)

(۸) ایک حدیث شریف میں ہے کہ:

(اِنَّ الرَّهْبَانِیَّةَ لَمْ تُکْتَبْ عَلَیْنَا)

”بے شک رہبانیت ہم پر فرض نہیں کی گئی ہے۔“ (مسند احمد: ج ۶ ص ۲۶۶)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ:

(لِكُلِّ نَبِيٍّ رَهْبَانِيَّةٌ وَرَهْبَانِيَّةُ الْأُمَّةِ الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ)

”یعنی ہر نبی کے لئے ایک (طرح) کی رہبانیت ہوتی ہے اور اس امت (یعنی امت مسلمہ) کی رہبانیت

اللہ عزوجل شانہ کی راہ میں جہاد ہے۔“ (مسند احمد دیکھئے الفتح الربان: ج ۱ ص ۶)

ایک روایت میں ”لِكُلِّ نَبِيٍّ رَهْبَانِيَّةٌ“ کے بجائے ”لِكُلِّ أُمَّةٍ رَهْبَانِيَّةٌ“ ہے یعنی ہر امت کے لئے ایک

(قسم کی) رہبانیت ہوتی ہے اور میری امت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ امت مسلمہ روحانی ترقی کے لئے عیسائیوں کی طرح جان بچانے اور مصیبتوں سے بچنے کی خاطر رہبانیت کو اختیار نہیں کرتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتی ہے اور امت مسلمہ فتنوں اور مصیبتوں سے گھبرا کر لوگوں سے نہیں بھاگتی بلکہ ان کے ساتھ مقابلہ کر کے حق کا بول بالا کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہتی ہے اور جہاد فی سبیل اللہ میں مجاہدہ اور مشقت بھی ہوتی ہے اور حق کا بول بالا بھی اور روحانی ترقی بھی بلکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مسلمان میدان جہاد کی طرف جب قدم اٹھاتا ہے تو وہ اپنے نفس اور اپنے اہل و عیال اور ہر قسم کی دنیاوی لذتوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اس وقت اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے سوا کچھ نہیں ہوتا اس لئے اس وقت اس کی وہ روحانی ترقی ہوتی ہے جو کسی دوسرے عمل سے نہیں ہوتی۔

مذکورہ بالا قرآن مجید کی آیتوں اور رسول اللہ ﷺ کی ارشادات اور آپ ﷺ کے طریقہ حیات سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے طالبوں اور ان سے محبت رکھنے والوں کو اپنی صورت اور لباس وغیرہ سے بے پروائی ہوتی ہے وہ میلے کچیلے پرانگندہ ہوتے ہیں اور وہ جنگلوں میں رہتے ہیں یا مخلوق سے کٹ کر ہمیشہ کے لئے خلوت نشینی اختیار کرتے ہیں اور صفائی ستھرائی، خوبصورت لباس کو سنوارنے کی فکر، لوگوں سے ملنا جلنا اور حسن معاشرت وغیرہ گویا یہ سب کا سب دنیا داری کی بات ہے جو لوگ ایسا کرتے ہیں اور ایسا سوچ و فکر رکھتے ہیں بلاشبہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و ہدایت اور دین اسلام کے مزاج سے ناواقف ہیں، نبی کریم ﷺ سر مبارک میں تیل لگاتے تھے عطر کے ساتھ محبت تھی اور معطر وجود اور عطر سے زیادہ خوشبودار پینے کے باوجود عطر کو کثرت سے استعمال فرماتے تھے آنکھوں مبارک میں سرمہ لگاتے تھے صاف ستھرا رہتے تھے اگر عمدہ کھانا ملا تو عمدہ کھانا بھی تناول فرماتے تھے اگر عمدہ لباس میسر آ جاتا تو پہن لیتے متعدد شادیاں کیں اور ان کے حقوق کا پورا خیال رکھا، یہی انسانیت کا کمال ہے کہ دنیا والوں سے تعلق رکھے اور ہر حق دار کا حق اچھی طرح ادا کرے نہ اللہ تعالیٰ کے

حقوق میں کوتاہی کرے اور نہ اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ فرائض اور حقوق میں کسی طرح کا نقصان کرے۔ بے دینی اور ظلم کا سیلاب آجائے تو پھر حق پر جما رہے اور ہر باطل کے سامنے سینہ سپر رہے اور باطل کو ختم کرنے اور حق کا بول بالا کرنے میں اپنی جان و مال کی بازی لگائے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے لوگوں کو پوری بندگی کی ترغیب دی ہے جس میں عبادات اور حقوق العباد وغیرہ سب کے سب شامل ہیں جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے اور اسلام نے نفلی نمازوں، روزوں اور کسی قدر کی خلوت و اعتکاف کی ترغیب بھی دے دی ہے۔

اور نفسانی خواہشات کی پیروی سے بھی روکا ہے لیکن ترک دنیا اور نفس گشی کے اس طریقے کو ممنوع قرار دیا جو عیسائی رہبانیت کا خاصہ ہے اور عیسائی رہبانیت ایک ایسی چیز ہے جس کو اختیار کرنے کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ انسانی زندگی اور معاشرہ کا شیرازہ بکھر جاتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ حقوق و فرائض میں کوتاہی ہوگی اور اللہ تعالیٰ کے بندگی کا جو اصل حق ہے وہ ادا نہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی نہ رہے گی۔ پچھلے صفحات میں جو کچھ گزر گیا وہ تو اس لئے لکھا گیا تاکہ یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اسلام میں عیسائی رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں اس کے بعد ان لوگوں کی غلطی کی وضاحت بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جنہوں نے مذکورہ بالا حدیثوں اور اس طرح کی اور روایات کو جمع کر کے اسلام کو ایسے رنگ میں پیش کیا کہ گویا اسلام میں زہد کا کوئی تصور ہی نہیں چنانچہ جو بھی اپنی اصلاح کی خاطر وقتی طور پر لوگوں سے کٹ کر خلوت میں بیٹھ گیا یا کسی نے نفلی روزے رکھنے شروع کئے یا اعتکاف کیا تو اس پر رہبانیت کی مہر لگا دیتے ہیں ”لَا صُرُورَ فِي الْإِسْلَامِ“ اسلام میں رہبانیت نہیں۔ اس کی غلط تعبیر کر کے اس کی آڑ میں اسلامی لباس اور وضع قطع اور خالص دنیا پرستی کو عین اسلام اور روح اسلام باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں اور آج کل یہی فتنہ عام ہو رہا ہے کہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی ایک روایت یا کسی غیر متعلقہ اور مجمل آیت کو ڈھونڈھ نکالتے ہیں اور اس کے مقابلے میں قرآن مجید کی واضح آیتوں اور صحیح اور واضح حدیثوں کو دبا کر دیتے ہیں لہذا اس لئے یہاں خلوت، عزلت نشینی اور زہد و قناعت کے متعلق قرآن و حدیث میں سے بھی مختصر طور پر کچھ نقل کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

### وقتی طور پر خلوت اور عزلت نشینی اور نفلی عبادات!

وقتی طور پر خلوت نشینی سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا اور نفلی نماز اور نفلی روزوں اور اعتکاف کا پورا بیان نماز اور روزہ اور اعتکاف کے باب میں موجود ہے یہاں بھی بطور نمونہ نقل کیا جاتا ہے۔

## روحانی ترقی اور خلوت و عزلت نشینی!

ہم دیکھتے ہیں دنیا میں جو عظیم شخصیتیں آجکی ہیں جنہوں نے لوگوں کے دلوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت اور یاد سے گرمایا اور آشنا کیا وہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے وقتی طور پر ابتداء میں خود گوشہ نشینی کو اختیار کیا تھا یا ان کو حکم ہوا کہ وہ گوشہ نشینی کو اختیار کریں یا ان کے ایسے حالات بنائے گئے کہ وہ ایک عرصہ تک لوگوں کے ازدحام سے ایک طرف رہے اس کے متعلق چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) مثلاً حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے چند سال بکریاں چرائیں پھر نزولِ تورات سے قبل ان کے متعلق قرآن مجید کا بیان ہے کہ:

﴿وَوَاعَدْنَا مُوسَىٰ ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَأَتَمَّمْنَا بِعَشْرِ فَنَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً﴾

”یعنی ہم نے موسیٰ (علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) سے تیس راتوں کی (خلوت نشینی و گوشہ نشینی اور اعتکاف) کا وعدہ کیا تھا اور (پھر) دس راتیں بڑھا کر (چلہ) پورا کیا تو (اس طرح) اس کے رب کی میعاد چالیس راتیں پوری ہو گئیں۔“ (اعراف: آیت ۱۴۲)

یعنی مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام پر اپنا کلام نازل کرنے کا وعدہ فرمایا اور اس کے لئے یہ شرط لگائی کہ تیس رات جو کہ پھر چالیس رات کر دی گئی کوہ طور پر آکر خلوت نشینی اور اعتکاف کریں تاکہ تمام لوگوں اور تمام مشاغل سے الگ تھلگ ہو کر اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر میں وقت گزر جائے اور اس روح و دل کو وہ قوت و توانائی حاصل ہو جائے جو اس بارگراں اٹھانے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

(۲) نیز حضرت مریم علیہا السلام جو ایک بہت ہی نیک عورت تھیں اور جن کے بطن کو اللہ تعالیٰ نے اس حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے چنا تھا جن کی پیدائش خلافِ عادت بن باپ کے ہوئی تھی اور جن کے پاس جبرائیل علیہ السلام کو آنا تھا اور انہوں نے روح بھی پھونکی تھی تو ان ساری چیزوں کے لئے بہت ہی بڑی ہمت اور قوت درکار تھی چونکہ یہ بھی ایک بہت ہی بڑا بارگراں تھا جس کو حضرت مریم علیہا السلام نے اٹھانا تھا اس کے لئے تکوینی طور پر پہلے سے بندوبست کیا گیا کہ پہلے اس کو ایک پیغمبر یعنی زکریا علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی تربیت میں دیدیا گیا جنہوں نے ان کو سب سے کاٹ کر گوشہ نشینی میں رکھا جیسا کہ قرآن مجید کا بیان ہے کہ:

﴿وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَمْرِئُؤُمَّ إِنِّي لَكَ هَذَا

قَالَتُ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾



”اور اُس (مریم) کی کفالت تو زکریا (علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) نے کی جب بھی اس (یعنی مریم) کے پاس (زکریا) (علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) عبادت گاہ میں داخل ہوتے تو اس کے پاس کھانے کی چیزیں موجود پاتے زکریا نے کہا یہ تمہارے پاس کہاں سے آئیں مریم نے کہا کہ یہ اللہ کے پاس سے آئی ہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔“ (آل عمران: آیت ۳۷)

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ:

﴿وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَكَةُ يَمْرَيْمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ﴾

”اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم بے شک اللہ تعالیٰ نے تجھے برگزیدہ کر دیا اور خوب پاک کر دیا ہے او ردنیا کی عورتوں کے مقابلہ میں تجھے منتخب کر لیا ہے۔“ (آل عمران: آیت ۴۲)

نیز جبرائیل علیہ السلام نے آ کر حضرت مریم علیہا السلام سے کہا:

﴿قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا﴾

”فرشتے نے کہا میں تو تیرے پروردگار کی طرف بھیجا ہوا ہوں (اور اس لئے نمودار ہوا ہوں) کہ تجھے ایک پاکیزہ فرزند عطا کر دوں۔“ (مریم: آیت ۱۹)

(۳) نبی کریم ﷺ نے بھی بعثت سے پہلے غار حراء میں خلوت نشینی کو اختیار کیا تھا چنانچہ:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ وہی سے پہلے رسول اللہ ﷺ پر سچے خوابوں کا سلسلہ شروع ہوا چنانچہ آپ ﷺ جو بھی خواب دیکھتے اُس کی سچائی اس طرح ہوتی جس طرح سپیدہ صبح نمودار ہوتا ہے پھر خلوت اور عزلت نشینی آپ ﷺ کو محبوب کر دی گئی چنانچہ آپ غار حراء میں گوشہ نشین ہو کر کئی کئی رات تک عبادت میں مشغول رہتے اور ساتھ اپنے کھانے پینے کا سامان بھی لے جاتے (اور جب خورد و نوش کا سامان ختم ہو جاتا تو واپس آ کر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آ جاتے اور اتنی ہی راتوں کے لئے پھر سامان خورد و نوش لے جاتے، یہی سلسلہ جاری رہا) حتیٰ کہ آپ ﷺ کے پاس ایسے حال میں حق آ گیا جب کہ آپ غار حراء میں (خلوت نشین) تھے، چنانچہ فرشتہ آپ ﷺ کے پاس آ گیا اور آپ ﷺ سے کہا ”إِقْرَأْ“ پڑھو میں نے جواب میں کہا ”مَا أَنَا بِقَارِئٍ“ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر اس فرشتے نے (یعنی جبرائیل علیہ السلام) نے مجھے پکڑ لیا اور مجھے اس قدر بھیچا کہ میری طاقت انتہا کو پہنچ گئی پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا کہا ”إِقْرَأْ“ پڑھو پھر میں نے جواب میں کہا ”مَا أَنَا بِقَارِئٍ“ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ پھر فرشتے نے مجھے پکڑا اور دبا یا یہاں تک کہ اس

کا دباؤ میری طاقت کی انتہا کو پہنچ گیا پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور مجھے کہا کہ ”إِقْرَأْ“ پڑھو ”مَأْنَا بَقَارِی“ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر اس نے مجھے پکڑا اور تیسری بار دبوچ لیا اور پھر چھوڑ کر کہا:

﴿إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ إِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ﴾

”پڑھیے اپنے رب کے نام سے جس نے انسان کو جھے ہوئے خون سے پیدا کیا پڑھئے اور آپ کا پروردگار بڑا عزت والا ہے۔“

یہ آیات لے کر آپ گھر تشریف لے آئے۔ (الحديث) (دیکھئے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کتاب الوحي) مذکورہ بالا حدیث کا خلاصہ یہ ہوا کہ آپ ﷺ پر پہلے سچے خوابوں کا سلسلہ شروع ہوا پھر آپ ﷺ کی طبیعت مبارک میں یکسوئی اور الگ ہوئے، تنہائی میں اللہ تعالیٰ کی یاد اور ذکر و فکر کا جذبہ پیدا ہوا جس کی وجہ سے آپ ﷺ مسلسل کئی مہینے غار حراء میں خلوت نشینی کیے رہے اور اس حالت میں آپ ﷺ پر وحی کی ابتداء ہوئی۔

لہذا نبی کریم ﷺ کی طرز حیات اور مذکورہ بالا حدیث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ وقتی خلوت نشینی پسندیدہ ہے نہ کہ غیر پسندیدہ اور جو لوگ جوش بیان میں یہ کہتے ہیں کہ غار حراء میں گوشہ نشینی اور خلوت گزینی اللہ تعالیٰ کو پسند نہ تھی اس لئے آپ کو حکم ہوا کہ ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ﴾ ”اے مدثر اٹھئے لوگوں کو ڈرائیے۔“ لیکن ان لوگوں کا یہ خیال بالکل غلط اور باطل ہے آخر وہ اتنی سیدھی سادھی بات کو بھی نہ سوچ سکے کہ غار حراء میں آیتیں نازل ہو چکی تھیں وہ تو ﴿إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ اور اس کے بعد والی آیتیں نازل ہو چکی تھیں جیسا کہ اس کا بیان اوپر والی حدیث میں موجود ہے اور سورت مدثر تو بعد میں نازل ہوئی نیز یہ اس کو بھی نہیں دیکھتے کہ اگر غار حراء اور اس میں آپ ﷺ کی خلوت گزینی اللہ تعالیٰ کو پسند نہ ہوتی تو ایسی جگہ میں اللہ تعالیٰ اپنے اس عظیم کامل اور مکمل ابدی اور عالمی ہدایت و کتاب کی ابتداء نہ فرماتے تو جب ایسی جگہ میں ایک لمبی گوشہ نشینی کے بعد قرآن مجید جیسی عظیم کتاب کی ابتداء اور افتتاح بلا کسی تنبیہ کے بہت ہی محبت کے پیرائے میں کی گئی کہ ﴿إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو آپ ﷺ کی یہ حالت پسند تھی نہ کہ غیر پسند، بلکہ اگر غور کیا جائے تو یہ خلوت نشینی تھی جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو محبوب کردی تھی جیسا کہ حدیث کے الفاظ ”ثُمَّ حُبِّبَتْ إِلَيْهِ الْخَلَاءُ“ (پھر آپ کو خلوت نشینی محبوب کردی گئی۔) سے واضح ہے اور بالآخر یہی خلوت نشینی جس کی وجہ سے خصائص اور ثمرات نبوت پوری طرح پک گئے اور دائمی اور ابدی اور عالمی نبوت کے بارگراں اٹھانے کے لئے تیار ہو گئے، جیسا کہ اس کی پوری تفصیل ”وحی و رسالت“ کے بیان میں لکھ چکا ہوں۔

مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ وقتی طور پر گوشہ نشینی اور خلوت، شریعت مطہرہ میں ممنوع نہیں بلکہ نبی کریم ﷺ نے خود بھی وقتی طور پر لمبی گوشہ نشینی اختیار کی تھی اور پھر اس لمبی گوشہ نشینی کے بعد ہمیشہ آپ ﷺ رات کی ہجرت کا خوب اہتمام فرماتے تھے اور فرصت کے اوقات میں لوگوں سے الگ ہو کر عبادت میں مصروف ہو جاتے تھے نیز مسلسل رمضان المبارک کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تھے اور امت کو بھی اعتکاف اور خصوصاً آخری عشرہ کی خوب ترغیب دی ہے، اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مسلمان پر یہ لازم ہے کہ وہ لازماً خلوت گزینی کو اختیار کرے نہ میرا مطلب یہ ہے کہ بغیر خلوت گزینی کے روحانی ترقی ناممکن ہے کیونکہ بعض لوگوں کی صحبت ایسی زود اثر اور مبارک ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ ملتے رہنے یا ان کے ساتھ رہتے ہوئے انسان کو وہ روحانی ترقی نصیب ہوتی ہے جو کسی اور مجاہدہ سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

مثلاً نبی کریم ﷺ کی صحبت مبارکہ اور آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبت اور ان کے بعد دوسرے اولیاء کرام کی صحبت بلکہ یہاں تو صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ اسلام میں یہ ممنوع نہیں کہ کچھ عرصہ کے لئے خلوت گزینی اور اعتکاف کو اختیار کیا جائے تاکہ لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر کچھ عرصہ اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی عبادت میں مشغول ہو جائے اور خلوص اور احسانی کیفیت کو بڑھایا جائے اور یہی خلوص اور احسانی کیفیت اعمال کی روح ہے اور اسی کی وجہ سے اعمال کے اندر قوت آتی ہے اس لئے جو شخص اعتکاف کرتا ہے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”هُوَ يَنْكَفُ الدُّنُوبَ وَيَجْرِي لَهُ مِنَ الْحَسَنَاتِ كَعَامِلٍ الْحَسَنَاتِ كُلِّهَا“

”وہ (یعنی معتکف) گناہوں سے بچتا رہتا ہے اور اس کی نیکیوں کا حساب نیکیاں کرنے والے بندے کی طرح جاری رہتا ہے۔“ (ابن ماجہ)

مطلب یہ کہ وہ مسجد میں خلوت گزینی کی وجہ سے گناہوں سے بچا رہتا ہے اور اس کے صحیفہ اعمال میں وہ ساری نیکیاں لکھی جاتی ہیں جن کا وہ پہلے عادی تھا مثلاً مریضوں کی عیادت یتیم اور یتیم کی مدد کے لئے دوڑ دھوپ اور تعلیم و تدریس وغیرہ جو یہ پہلے کرتا تھا لیکن اعتکاف کی وجہ سے مجبور ہو کر وہ ان اعمال کو نہیں کر سکتا تو یہ سارے اعمال اس کے لئے برابر لکھے جاتے ہیں کیونکہ اس کے اس عمل اعتکاف سے تمام اعمال میں خلوص اور احسانی کیفیت بڑھ جائیگی جیسا کہ اس کا بیان اعتکاف کے بیان میں گزر چکا ہے۔

(ج) مالی امداد کے آداب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نہایت مخفی طور پر اور عزت و احترام کے ساتھ دیا جائے

اور دینے والے امراء خدمت دین میں مشغول غرباء کے قبول کر لینے کو ان کا احسان سمجھیں اور ان کو اپنے سے افضل سمجھیں کہ باوجود غربت و عسرت کے وہ دین کے لئے گھر سے نکلے ہیں، دین کے لئے گھر سے نکالنا صفت ہجرت ہے اور ان کی مدد کرنا صفت نصرت ہے اور انصار کبھی مہاجرین کے برابر نہیں ہو سکتے۔

(د) اس راہ میں کام کرنے والوں کی مدد زکوٰۃ و صدقات سے زیادہ ہدیہ کی صورت میں کی جائے، زکوٰۃ و صدقات کی مثال ہانڈی کے میل کچیل اور اجزائے ردیہ کی سی ہے کہ ان کو نکالنا ضروری ہے ورنہ ساری ہنڈیا خراب رہے گی اور ہدیہ کی مثال ایسی سمجھو کہ جیسے تیار کھانے میں خوشبو ڈالی جائے اور اس پر چاندی کے ورق لگادیئے جائیں۔ (دیکھئے ملفوظات حضرت محمد الیاس رحمہ اللہ: ص ۷۸ تا ۷۹)

نیز حضرت مولانا الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ تبلیغی کام کو جدید طرز پر شروع کرنے سے پہلے خلوت گزینی کو پسند کرتے تھے اور تبلیغی مصروفیتوں کے باوجود بھی وقتی خلوت نشینی کا خوب اہتمام فرماتے تھے چنانچہ حضرت مولانا الیاس رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق حالات میں لکھا گیا ہے کہ:

(۱) گنگوہ کے قیام میں خانقاہ کی مسجد کے قریب ایک تنگ گلی میں جہاں لوگوں کی آمد و رفت نہ تھی گھنٹوں آنکھیں بند کئے مراقب رہتے تھے۔ (دیکھئے ذکر و اعتکاف کی اہمیت: ص ۱۱)

(۲) ہستی نظام الدین میں حضرت کے بڑے بھائی حضرت مولانا محمد صاحب کا قیام تھا ان کی وفات کے بعد خاندانی محبین و معتقدین نے حضرت سے اصرار کیا کہ آپ نظام الدین میں قیام فرمائیں مگر حضرت نے اپنی آمد کو حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت سے معلق کیا۔ چنانچہ حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت و مشورہ کے مطابق نظام الدین میں قیام فرمایا یہ زمانہ حضرت کے بڑے مجاہدے و ریاضت کا تھا۔ ہمایوں کے مقبرے کے شمال میں عبدالرحیم خان کے مقبرے اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ سید نور محمد بدایونی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب پہروں خلوت میں رہتے، دو پہر کا کھانا وہیں چلا جاتا اور رات کا مکان میں آکر کھاتے، نماز سب وقتوں کی جماعت کے ساتھ پڑھتے جس کی صورت یہ ہوتی کہ چند طلباء نماز کے اوقات میں ایک ایک لوٹا پانی لے کر وہاں پہنچ جاتے حضرت وضو وغیرہ کر کے باجماعت نماز پڑھتے طلباء واپس آ جاتے اور حضرت وہیں بیٹھے رہتے یہ تو ابتدائی دور تھا لیکن تبلیغی کام شروع ہونے کے بعد ذکر کے اہتمام میں ذرا فرق نہیں آیا حضرت شیخ زید مجدہم سے بارہا سنا کہ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہ اپنی شدت علالت سے پہلے تک دوازدہ تسبیح (سلسلہ چشتیہ کا بارہ تسبیح کا ذکر بالجہر) کا بڑا اہتمام فرماتے تھے ماہ مبارک میں عصر کے بعد ذکر کرتے تھے اس وقت

پاس بیٹھنے والے کو بھی تراوٹ آ جاتی تھی۔ (دیکھئے ذکر و اعتکاف کی اہمیت: ص ۱۱)

حضرت مولانا خود فرماتے ہیں:

مجھے جب بھی میوات جانا ہوتا ہے تو ہمیشہ اہل خیر اور ذاکرین کے مجمع کے ساتھ جاتا ہوں پھر بھی عموماً اختلاط سے قلب کی حالت اس قدر متغیر ہو جاتی ہے کہ جب تک اعتکاف کے ذریعہ اس کو غسل نہ دوں یا چند روز کے لئے سہارن پور (جہاں عربی مدرسہ اور اہل ذکر مشائخ کا ماحول ہے) یا رائے پور (جہاں ذکر و شغل کے لئے خانقاہ ہے) کے خاص مجمع اور خاص ماحول میں جا کر نہ رہوں قلب اپنی حالت پر نہیں آتا، دوسروں سے بھی کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ دین کے کام کرنے والوں کو چاہئے کہ گشت اور چلت پھرت کے طبعی اثرات کو خلوت کے ذکر و فکر کے ذریعہ دھویا کریں اسی ملفوظ کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت کے شیخ زید مجدہم نے ایک گرامی نامہ لکھوایا کہ جب شیخ المشائخ کا یہ حال تھا تو میرا تمہارا کیا حال ہوگا اس سے بھی بڑھ کر حضور ﷺ کو نماز میں التباس پیدا ہوا۔ سلام کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: لوگ اچھی طرح وضو کر کے نہیں آتے ہماری نماز میں گڑبڑ کرتے ہیں۔ (دیکھئے ذکر و اعتکاف کی اہمیت: ص نمبر ۱۶ تا ۱۷)

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے مفصل حالات اور ان کی دینی دعوت کی تفصیل کے لئے متعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب ”حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی دینی دعوت“ کی طرف رجوع کریں۔

**سخت مجبوری کے وقت لوگوں سے کنارہ کش ہو کر زندگی گزارنا!**

وقتی طور پر خلوت نشینی کے جواز بلکہ مستحب ہونے میں تو کسی کا اختلاف نہیں البتہ بغیر سخت مجبوری کے لوگوں سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کش ہو کر زندگی گزارنا اور دائمی طور پر خلوت نشینی کو اختیار کرنا اسلامی تعلیمات میں سے نہیں، ہاں دو صورتیں ایسی ہیں جن میں لوگوں سے کنارہ کش ہو کر زندگی گزارنا صرف جائز نہیں بلکہ بہتر اور اچھا ہے۔ ایک صورت یہ کہ کسی شخص کا مزاج بہت ہی سخت ہو اور وہ لوگوں میں رہ کر لوگوں کو تکلیف پہنچاتا ہو تو ایسے شخص کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ لوگوں سے کنارہ کش ہو کر زندگی گزارے۔ دوسری صورت یہ کہ فتنہ و فساد اس قدر بڑھ جائے کہ اس کی اصلاح حال سے وہ عاجز آجائے اور مقابلے کی ہمت نہ رہے یا کوئی شخص طبعاً کمزور ہے تو ایسی صورت میں بھی اپنے دین و ایمان کو اور اپنے آپ کو فتنہ و فساد میں مبتلا ہونے سے بچانے کی خاطر کنارہ کش ہو کر زندگی گزارنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ اچھا ہے اور اب ایسی صورتوں کے متعلق نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو پڑھ

لیجئے۔

(۱) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی (یعنی بدوی) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ سب سے بہتر شخص کون ہے؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا:

(رَجُلٌ جَاهِدَ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ وَرَجُلٌ شَعْبٌ مِنَ الشَّعَابِ يَعْبُدُ رَبَّهُ وَيَدْعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهِ)

”یعنی ایک تو وہ شخص جو اپنی جان و مال کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قربان کرتا ہے اور دوسرا وہ شخص جو کسی گھاٹی میں بیٹھ کر اپنے رب کی عبادت کرے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رہنے دے۔“ (صحیح بخاری: ج ۲ کتاب الرقاق باب العزله راحۃ من خلاط السوء)

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے انسانوں کی دو قسمیں بتلائیں ایک وہ جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق اور یہ جذبہ عطاء فرمایا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کے بندوں کی خدمت کرنے اور ان کے ساتھ نیکی اور مہربانی کا برتاؤ اور ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں تو ایسے لوگوں کی ذمہ داری تو یہی ہے کہ وہ لوگوں میں رہ کر ان کے ساتھ بھلائی اور مہربانی کا معاملہ کریں اور اپنے مال و جان کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر کے لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن کا مزاج بہت سخت ہے اور وہ لوگوں کے ازدھام میں رہ کر لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں تو ایسے لوگوں کی اخلاقی اور روحانی اصلاح اسی میں ہے کہ لوگوں سے الگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی بندگی میں اپنا وقت خرچ کریں ان کے اس طریقہ کار سے ایک تو خود ان لوگوں کو فائدہ ہوگا کہ ظلم اور لوگوں کی دل آزادی کے گناہ اور بے اطمینانی و بے چینی سے بچ جائیں گے اور دوسرا فائدہ لوگوں کو ہوگا کہ وہ ان کی ایذا رسانیوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔

(۲) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(يُوشِكُ أَنْ يَكُونَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ يُتَبَعُ بِهَا شَعْفُ الْجَبَا وَصَوَقُ الْقَطْرِ يَغْرِيدُ مِنْ الْفَتَنِ)

”یعنی غنقریب (ایسا زمانہ آنے والا ہے جس میں) ایک مسلمان کے لئے بہترین مال بکریاں ہوں گی جن کو لے کر وہ بارش کی جگہوں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں کو جائے تاکہ وہ بھاگ کر اپنے دین و ایمان کو (فتنوں سے) بچا سکے۔“ (صحیح بخاری: ج ۲ کتاب الرقاق)

یعنی مطلب یہ کہ جب معاشرہ زیادہ بگڑ جائے اور ایک شخص بذات خود نیک اور صالح ہے لیکن اپنی طبعی کمزوری کی وجہ سے معاشرہ کی اصلاح پر قادر نہ ہو تو اس کے لئے بھی لوگوں سے الگ ہو کر زندگی گزارنا اچھا ہے۔



تو یہ تین قسم کے لوگ ہو گئے۔

(۱) ایک وہ شخص جو برائیوں کے ساتھ مقابلہ کر سکتا ہے اور جس کا وجود لوگوں کے لئے نفع مند ہے تو ایسے شخص کو لوگوں کے ازدحام میں رہ کر ان کی خدمت اور ان کی اصلاح اور برائیوں کو مٹانے کا فریضہ بہر حال انجام دینا چاہئے اس کے لئے قطعاً یہ صحیح نہیں کہ وہ دائمی طور پر لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی گزارے۔

(۲) وہ شخص جس کی سختی کی وجہ سے لوگوں کو فائدے کے بجائے نقصان زیادہ ہو اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ زندگی گزارے تاکہ اپنے ضرر سے لوگوں کو بچا سکے۔

(۳) وہ شخص جو خود نیک و صالح ہے لیکن طبعاً کمزور ہو اور برے معاشرہ اور فتنے و فساد کے وقت لوگوں کی اصلاح سے عاجز ہو تو ایسے شخص کے لئے بھی بہتر یہی ہے کہ وہ فساد کے وقت لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر زندگی گزارے لیکن آخر کی تیسری اور دوسری یہ دونوں صورتیں اگرچہ ان حضرات کے حق میں اچھی اور بہتر ہیں لیکن بذات خود یہ دونوں قسمیں کمزور اور ضعیف ہیں دوسری قسم میں صبر و حلم کا فقدان ہے جبکہ تیسری قسم اور صورت میں جرأت و شجاعت اور استقامت کی کمی اور فقدان ہے۔

اسلام سادگی بے تکلفی اور زہد و قناعت کی تعلیم دیتا ہے!

انسان کا وجود اس کا اپنا نہیں بلکہ یہ اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ایک امانت ہے اس کی حفاظت انسان کا فرض ہے چنانچہ جن چیزوں کے اختیار کرنے سے انسانی صحت تباہ ہو جاتی ہے ان کو چھوڑنے کا اور جو چیزیں انسان کی صحت و بقاء کے لئے ضروری ہیں ان کے اختیار کرنے کو دین اسلام نے لازم اور ضروری قرار دیا ہے۔

لہذا جو شخص باوجود قدرت کے کھانے پینے کی چیزوں کو اس طرح چھوڑ دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ مر جائے یا اتنا کمزور ہو جائے کہ جو واجبات اور ذمہ داریاں شریعت مطہرہ کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہیں ان کو بھی وہ ادا نہ کر سکے تو یہ شخص دین اسلام کی رو سے مجرم اور سخت گنہگار ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انسان صبح و شام کھانے پینے، لباس وغیرہ جیسی چیزوں کے دھندے میں لگا رہے اور کھانے پینے وغیرہ کو اپنا مقصد اولین بنا لے اور اس کی پوری زندگی کا محور اور مدار یہی خوش خوراک اور خوش لباسی بن کر رہ جائے حالانکہ کھانے وغیرہ تو اس لئے ہیں تاکہ انسان کی صحت اور زندگی قائم رہے تاکہ زندگی میں پوری قوت کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے احکامات کو پورا کرے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی کا مقصد کھانا پینا لباس وغیرہ کو بنا کر پوری زندگی کو اس میں صرف کر دیا جائے۔



کھانے پینے زینت وغیرہ میں اسراف ممنوع ہے!

اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاں لباس کھانے پینے کا حکم دیا ہے وہاں اسراف سے بھی روکا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ

کا ارشاد ہے:

﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾

”کھاؤ پیو اور اسراف مت کرو اور اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔“ (اعراف: آیت ۳۱)

اسراف کے معنی حد سے تجاوز کرنا ہے اور یہ اسراف کی عام صورتوں کو شامل ہے جائز اور حلال کی حد سے نکلنا اور ناجائز اور حرام کی حد میں پہنچنا اسراف ہے اور حلال کو حرام کرنا اسراف ہے کھانے پینے میں اعتدال کو چھوڑنا بھی اسراف ہے مثلاً سیر ہو جانے کے بعد بھی کھانا کھانا یا فضول خرچی کرنا وغیرہ اسی طرح ہر وقت کھانے پینے کی فکر میں رہنا بلکہ جس چیز کو بھی جی چاہے اس کو ضرور حاصل کر کے کھانا یہ بھی اسراف میں داخل ہے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(إِنَّ مِنَ السَّرَفِ أَنْ تَأْكُلَ كُلَّ مَا شَتَّهَيْتَ)

یعنی ”بلاشبہ اسراف میں سے یہ بھی ہے کہ جس چیز کو بھی تیرا جی چاہے وہ (ضرور) کھائے۔“ (سنن)

ابن ماجہ ابواب الاطعمہ)

نیز نبی کریم ﷺ کی تعلیمات میں جس طرح یہ تعلیم و ترغیب دی گئی ہے کہ صاف ستھرا رہنا چاہئے اور جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے دے رکھی ہیں ان میں بخل اور کنجوسی سے کام نہیں لینا چاہئے بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے ہوئے ان کو خود بھی استعمال کرنا چاہئے اور کام میں لانا چاہئے جیسا کہ اس بیان میں پہلے بھی گزر چکا ہے اور لباس وغیرہ کے بیان میں موجود ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم بھی دی ہے کہ اپنی زیب و زینت اور لباس وغیرہ میں زیادہ مشغول نہیں ہونا چاہئے۔

غرض حد سے تجاوز کی کئی قسمیں ہیں قرآن مجید میں ﴿وَلَا تُسْرِفُوا﴾ ”اسراف مت کرو۔“ کے چند حروف میں کھانے پینے لباس اور استعمال کی تمام چیزوں میں اسراف کی تمام قسموں کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اسراف اور حد سے تجاوز کی صورتوں اور قسموں کا اجمالی خاکہ ذیل میں ہے۔

(۱) پاک اور حلال سے تجاوز کر کے گندے اور حرام تک پہنچ جانا یعنی جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے

رسول اللہ ﷺ نے ممنوع قرار دیا ہے ان کو کھانا پینا اور استعمال کرنا اسراف میں داخل ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو بلاوجہ شرعی حرام سمجھ کر چھوڑ دینا اور ان دونوں صورتوں میں حد سے تجاوز ہونا اور ان کی حرمت اور جرم ہونا تو بالکل ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں ممنوع اور حرام ہیں اور دوسری صورت میں اللہ تعالیٰ کے قانون کی مخالفت ہے۔

(۳) کھانے پینے اور استعمال وغیرہ کی چیزوں کو بلاوجہ ضائع کرنا مثلاً بچے ہوئے سالن کو بلاوجہ پھینک کر ضائع کرنا۔

(۴) سیر ہو جانے کے بعد بھی کھانا کھانا۔

(۵) اتنا کم کھانا کہ صحت بگڑ جائے اور واجبات کی ادائیگی پر قدرت نہ رہے۔

(۶) ہر قسم کے کھانے پینے اور لباس وغیرہ کی دھن سوار کر لینا اور ان کی درستگی کی فکر میں لگے رہنا۔

(۷) ہر وقت اپنے نفس کی خواہش کو پورا کرنا۔ یعنی جب اور جس چیز کو جی چاہے کہ فلاں چیز کھائے یا پیئے یا پہنے تو ضرور بضرور اس چیز کو حاصل کرے اور ضرور ہی خواہش کو پورا کرے۔

(۸) اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور ناجائز کاموں میں مال و متاع کو خرچ کرنا۔ اگرچہ بہت تھوڑا ہی کیوں نہ خرچ

کیا جائے یہ بھی اسراف ہے۔

(۹) ریاکاری نام و نمود کی خاطر مال و دولت خرچ کرنا۔

(۱۰) جائز کاموں میں مال و دولت کو حد سے زیادہ خرچ کرنا یا اپنی استطاعت اور حیثیت سے زیادہ خرچ

کرنا یہ سب صورتیں اسراف میں داخل ہیں۔

اور اسراف کے تمام صورتوں کے متعلق شریعت مطہرہ کی تفصیلی ہدایات اور تنبیہات موجود ہیں جیسا کہ ان

میں سے بعض کا بیان پہلے گزر چکا ہے اور بعض کا بیان یہاں بھی لکھا جاتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيْطَانِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا﴾

”بے شک بے جا خرچ کرنے والے لوگ شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا

ناشکر ہے۔“ (اسراء: آیت ۲۷)

ایک دوسری جگہ اپنے محبوب و مقبول بندوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا أَنْفَقُوا لَمْ يَسْرِ فَوْاؤَ لَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ فَوَاحِشًا﴾

”اور جب وہ خرچ کرنے لگتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ کنجوسی (اور تنگی) کرتے ہیں بلکہ ان کا خرچ

کرنا دونوں (اسراف اور تنگی) کے درمیان اعتدال (میانہ روی) پر قائم رہتا ہے۔“ (فرقان: آیت ۶۷)

اسراف کا مطلب اور اس کی صورتیں تو اوپر ذکر کی گئیں، بخل کا مطلب یہ ہے کہ بھلائی اور نیکی کے کاموں میں مال و دولت خرچ نہ کیا جائے اور اپنے اہل و عیال اور خدام وغیرہ پر اپنی حیثیت کے مطابق خرچ نہ کرے۔

مختصر یہ کہ جو مال و دولت اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے حکم کے مطابق خرچ نہ کیا جائے تو وہ بخل ہے اور جو مال وغیرہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور حکم کے بغیر خرچ کیا جائے وہ اسراف ہے۔ واللہ اعلم

نیز نبی کریم ﷺ کی تعلیمات میں بھی جس طرح یہ تعلیم و ترغیب دی گئی ہے کہ صاف ستھرا رہنا چاہئے اور جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے دے رکھی ہیں ان میں بخل اور کنجوسی سے کام نہیں لینا چاہئے بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے ہوئے ان کو استعمال کرنا چاہئے اور کام میں لانا چاہئے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے اور لباس وغیرہ کے بیان میں بھی موجود ہے اور ساتھ ساتھ نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہ تعلیم بھی دی ہے کہ اپنی زیب و زینت اور لباس وغیرہ میں زیادہ مشغول نہیں ہونا چاہئے اور نہ ان چیزوں کو حد سے زیادہ اہمیت دی جائے چنانچہ نبی کریم ﷺ نے جس طرح کنگھی اور بالوں کو درست کرنے کا حکم فرمایا اسی طرح ہر وقت کنگھی کرنے سے منع بھی فرمایا اور جن لوگوں کو دیکھا کہ وہ اپنی شکل و صورت کی اصلاح کی فکر نہیں کرتے اور قدرت کے باوجود کنجوسی یا لا پرواہی سے پھٹے پرانے کپڑے پہنتے ہیں ان کو تو صفائی اور بالوں وغیرہ کو درست کرنے اور اچھے لباس پہننے کی ہدایت فرمائی اور جن لوگوں کو دیکھا کہ وہ اس معاملہ میں بڑھ جاتے ہیں اور اپنے بناؤ سنگار ہی میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں تو ان کو اعتدال پر لانے کے لئے یوں ہدایت فرمائی۔ یہاں بطور نمونہ نبی کریم ﷺ کے چند ارشادات نقل کئے جاتے ہیں۔

(۱) حضرت مقداد بن معدیکرب ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَامَلَأَ آدَمِيٌّ وَعَاءَ شَرَّ أَمِنْ بَطْنٍ بِحَسْبِ بْنِ آدَمَ أَكَلَاتِ يَقْمَنَ صَلْبُهُ فَإِنْ كَانَ لَمْحَالَهُ فَنُتْلُكُ

طَعَامٌ وَتُلْتُكُ شَرَابٌ وَتُلْتُكُ لِنَفْسِهِ) (ترمذی ابن ماجہ مشکوٰۃ)

یعنی ”انسان (اگر اپنے پیٹ کو حد سے زیادہ بھر لے تو اس) نے پیٹ سے بُرا کوئی برتن نہیں بھرا بنی آدم کے لئے چند لقمے کافی ہیں جو اس کی پیٹھ کو قائم رکھ سکیں (یعنی جسمانی توانائی کو برقرار رکھنے کے لئے کافی ہوں) اگر پیٹ بھرنا ہی ضروری (اور مقصود) ہو تو (اس کو چاہئے کہ پیٹ کے تین حصے کرے) ایک حصہ کھانے کے لئے ایک حصہ پینے کے لئے اور ایک حصہ سانس کے لئے (خالی چھوڑ دے)۔“

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کے ڈکار لینے کو سنا تو آپ

ﷺ نے فرمایا:

(أَقْصِرْ مِنْ جِثَائِكَ فَإِنَّ أَطُولَ النَّاسِ جُوعًا يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَطُولُهُمْ شَبَعًا فِي الدُّنْيَا)  
”اپنی ڈکار سے باز آ جاؤ کیونکہ قیامت کے دن لوگوں میں سب سے لمبی اور دراز بھوک والا وہی شخص ہوگا جو اس دنیا کی امیدوں میں سب سے لمبا اور دراز ہے۔“ (شرح السنۃ مشکوٰۃ)

(۳) حضرت ابوامامہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(لَا تَسْمَعُونَ إِلَّا تَسْمَعُونَ إِنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْإِيمَانِ) (ابوداؤد)  
”کیا تم نہیں سنتے؟ کیا تم نہیں سنتے؟ (یعنی سنو اور غور سے سنو) کہ سادگی اور خستہ حالی بھی ایمان میں سے ہے۔“  
یعنی ظاہری سادگی و خستہ حالی اور بناؤ سنگاری کی طرف زیادہ فکر نہ کرنا بھی اندرونی ایمانی کیفیت سے پیدا ہو جاتی ہے۔

(۴) حضرت معاذ بن انس ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ تَرَكَ الْبِطَاسَ تَوَاضَعًا لِلَّهِ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَيْهِ دَعَا اللَّهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى رُؤْسِ الْخَلَائِقِ حَتَّى يُخَيَّرَ مِنْ أَيْ حُلَلِ الْإِيمَانِ يَلْبُسُهَا)

”جو شخص تواضع اور انکساری کی وجہ سے عمدہ لباس کو استطاعت و حیثیت کے باوجود استعمال نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن ساری مخلوقات کے سامنے بلا کر اس کو اختیار دے گا کہ وہ ایمان کے جوڑوں میں سے جو جوڑا بھی پسند کرے اس کو پہن لے۔“ (ترمذی)

(۵) حضرت عبداللہ بن مغفل ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (ہر وقت) کنگھی سے منع فرمایا  
الایہ کہ ایک روز چھوڑ کر کنگھی کی جائے۔ (ترمذی ابوداؤد و نسائی مشکوٰۃ)

(۶) حضرت عبداللہ بن بریدہ ؓ کا بیان ہے کہ ایک دن حضرت فضالہ بن عبیدہ ؓ سے ایک شخص نے پوچھا کہ میں آپ کو (بعض اوقات) پراگندہ بال (یعنی بغیر کنگھی کئے ہوئے) دیکھ رہا ہوں تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ:

(إِنَّ رَسُولَ اللَّهِ كَانَ يَنْهَانَا عَنْ كَثِيرٍ مِنَ الْأَرْخَاةِ)

یعنی ”بے شک رسول اللہ ﷺ ہمیں زیادہ عیش و آرام کی چیزوں سے منع فرماتے تھے۔“ اس شخص سے پھر

پوچھا کہ میں آپ کے پاؤں میں جوتا نہیں دیکھ رہا ہوں۔ تو انہوں نے جواب میں فرمایا:

(كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْمُرُنَا أَنْ نَحْتَفِيَ أَحْيَانًا)

”رسول اللہ ﷺ ہمیں یہ حکم دیتے تھے کہ کبھی کبھی ننگے پاؤں بھی پھرا کریں۔“ (ابوداؤد و مشکوٰۃ)

خوراک، پوشاک اور خلوت گزاری وغیرہ امور میں جائز، ناجائز کا خلاصہ!

مذکورہ بالا بحث سے بھی اور اس کے بعد آنے والی زہد کی فضیلت اور دنیا کی مذمت سے بھی یہ چند باتیں

ثابت ہو جاتی ہیں، ان کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) کسی یقینی حلال چیز کو اعتقادی طور پر حرام سمجھ کر ترک کر دینا کفر اور سنگین جرم ہے۔

(۲) اگر اعتقادی طور پر حرام نہ سمجھا جائے بلکہ حلال اور جائز ہی سمجھا جائے مگر بلا کسی ضرورت و مصلحت کے

قسم کھا کر اپنے اوپر حرام کر دیا جائے مثلاً یوں کہہ دے ”واللہ دودھ نہ پیوں گا“ تو یہ گناہ ہے اور اسی طرح قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا ضروری ہے۔

(۳) اگر کسی ضرورت اور مصلحت کی وجہ سے قسم کھا کر اپنے اوپر حرام کر دیا تو جائز ہے مگر پھر بھی بہتر یہی ہے

کہ قسم توڑ کر کفارہ ادا کیا جائے اس کا مفصل بیان ”قسم کے بیان“ میں موجود ہے۔

(۴) کسی حلال اور جائز چیز کو نہ اعتقادی طور پر حرام سمجھے اور نہ قسم کھا کر اپنے اوپر حرام کرے مگر ثواب کی نیت سے

ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے کا دل میں عزم کر لے تو یہ وہ رہبانیت ہے جو شریعت مطہرہ میں ممنوع اور مذموم ہے۔

(۵) اگر حلال اور جائز کے چھوڑ دینے جانے میں ثواب کی نیت بھی نہیں بلکہ صرف جسمانی مرض کے علاج

کے طور پر کسی حلال چیز کو وقتی طور پر چھوڑ دیا جائے تو یہ بلا کراہت جائز ہے بلکہ بعض وقت ضروری ہے۔

(۶) کسی حلال چیز کو اس لئے وقتی طور پر چھوڑ دینا تاکہ انسانی خواہشات کو اعتدال پر لایا جائے تو یہ بھی

بلا کراہت جائز ہے بلکہ بعض حالات میں ضروری ہے مثلاً کوئی شخص دنیاوی لذتوں میں غرق ہو چکا ہے تو اس کے

لئے ضروری ہے کہ وہ وقتی طور پر لذتوں کو چھوڑ دے تاکہ اعتدال پر آجائے اور بعض حقانی صوفیاء کے متعلق جو

روایتیں ایسی نقل کی گئی ہیں کہ انہوں نے بعض یقینی حلال چیزوں کو چھوڑ دیا تھا تو ان کو اسی قسم پر محمول کرنا چاہئے۔

اسی طرح صوفیاء کرام اپنے شاگردوں کے ساتھ اختلاط یا کم کھانے یا خوش خوراک کی کو کم کرنے اور کم سونے کی

تاکید کرتے ہیں وہ بھی صرف ابتداء ہی میں ہوتا ہے اور یہ ایک مجاہدہ ہوتا ہے تاکہ نفس کو اعتدال پر لایا جائے اور

جب یہ گمان ہو جاتا ہے کہ اس کا نفس قابو ہو گیا ہے اور ناجائز تک پہنچنے کا خطرہ دور ہو گیا تو پرہیز کو چھوڑ

دیا جاتا ہے۔

یہ درحقیقت رہبانیت نہیں بلکہ تقویٰ اور ورع ہے جو دین اسلام میں مطلوب اور صحابہ و تابعین و ائمہ متبوعین سے ثابت ہے۔

(۷) بہت کم کھانا کہ واجبات بھی ادا نہ ہو سکیں جرم اور گناہ ہے اسی طرح بہت زیادہ کھانے اور ہر وقت جی چاہی چیزوں کے حصول میں لگے رہنا بھی مذموم اور ممنوع ہے۔

(۸) کنجوسی اور لا ابالی کی وجہ سے عمدہ لباس ترک کرنا مناسب نہیں۔

(۹) اگر نہ کنجوسی ہے اور نہ لا پرواہی لیکن تواضع و انکساری کی وجہ سے زیادہ عمدہ لباس کے استعمال کو ترک

کیا جائے تو یہ جائز بلکہ اچھا ہے۔

(۱۰) دنیا کی نعمتیں بے شک جائز ہیں مگر ان سے بے دریغ فائدہ اٹھانا اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈالنا ہے کہ آدمی کے نازک احساسات مردہ ہو جائیں اور آخرت طلبی کی اعلیٰ کیفیات سے خالی ہو کر محض اسلام کا ایک ریکارڈ بن جاتا ہے جو خارج سے ملی ہوئی کچھ آوازوں کو اپنے اندر محفوظ کر دیتا ہے پھر اس محفوظ ریکارڈ کو بجا کر فضا میں نشر کر دیتا ہے۔

..... آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو نعمتیں حاصل تھیں لیکن انہوں نے بقدر کفایت کر کے باقی کو خلق خدا کے لئے وقف کر دیا۔

(۱۱) اسلام میں اگرچہ عیسائیت کی طرح رہبانیت نہیں مگر زہد ایک محمود اور مطلوب چیز ہے۔

نبی کریم ﷺ نے خود بھی نکاح کئے اور دوسروں کو ترغیب بھی دلائی عمدہ لباس بھی پہنا ہے عمدہ کھانا مل بھی گیا تو تناول فرمایا لیکن آپ ﷺ نے ان چیزوں کو حاصل کرنے کا اہتمام نہیں کیا بلکہ کھانے پینے کے لئے جو کچھ آسانی سے مل گیا تناول فرمایا اور جو لباس میسر آیا پہن لیا اور یہی حال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔

اس میں عمدہ لباس عمدہ کھانا اور پہننا ممنوع نہیں مگر انسان آرائش و مجملات وغیرہ کے حاصل کرنے میں عمر گراں برباد کرے لہذا مذہب و شہوات میں غرق ہو جائے تو یہ اسلام میں ناجائز اور ممنوع ہے۔

(۱۲) وقتی طور پر گوشہ نشینی بھی عیسائی رہبانیت نہیں بلکہ روحانی ترقی کا ذریعہ اور شریعت مطہرہ میں محمود ہے۔

(۱۳) دائمی گوشہ نشینی صحیح نہیں البتہ فتنہ و فساد کے وقت کمزور شخص کے لئے یا طبعی طور پر بد مزاجوں کے لئے

اچھا یہ ہے کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ زندگی گزارے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

## دین و دنیا کا فرق!

عام لوگ دینی کاموں اور دنیاوی کاموں کو الگ الگ شعبے بنا لیتے ہیں ان کے نزدیک نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ جیسی چیزیں دینی امور ہیں جبکہ تجارت، سلطنت، سپہ سالاری وغیرہ دنیاوی کام، حالانکہ اسلام اس تفریق کی قطعاً نفی کرتا ہے، اسلام میں ہر مباح کام بھی دین کا کام ہے اور کارِ ثواب ہے جبکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اور اچھی نیت سے کیا جائے اور اس کے برعکس ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہو یا جس کام میں بری نیت شامل ہو جائے تو وہ دنیا ہے۔

لہذا اگر تجارت، سلطنت وغیرہ کاموں کو اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصول اور قانون کے مطابق کئے جائیں تو یہ دین اور کارِ ثواب بن جاتے ہیں اور اس کے برعکس اگر نماز، روزہ میں ریا کاری ہو تو یہ دینی کام بھی دنیا ہو کر رہ جاتے ہیں ایک زمانہ ہمارے اسلاف اور صحابہ کرام ؓ کا تھا کہ ان کا سپہ سالار اور سلطان ان کا امام بھی ہوتا تھا لیکن آج ہمارے اندر پورے دین کا جذبہ مٹ گیا اور یہ اسلام کے مطابق اپنی پوری زندگی گزارنے کو بھول گئے اس لئے ہم میں یہ تخیل آ گیا ہے کہ ہنر کسب و تجارت، سپہ سالاری، بادشاہی وغیرہ سب دنیاوی کاروبار ہیں اس لئے ان کے ذمہ دار اہل دنیا اور امراء و بادشاہ ہیں اور نماز، روزہ وغیرہ کا ذمہ دار مسجد کا امام مفتی اور فقیہ الزمان ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے مدعی (بظاہر دیندار) لوگ سپہ سالاری، سلطنت وغیرہ جیسے کسی کام کے اہل نہ رہے اس لئے مسلمانوں کے اقتدار کی باگیں اور مسلمانوں کی حکومتیں ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئیں جو اللہ تعالیٰ کے خوف و خشیت سے بالکل عاری اور خالی ہیں اور جنہوں نے دنیا کو آخرت کے بدلے لے کر مسلمانوں پر پوری طرح کفریہ احکامات کو نافذ کر رکھا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اخلاص و نیک نیتی کے ساتھ دنیاوی کاموں کو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق انجام دینا بھی دین ہے۔

## ایک تنبیہ!

البتہ اس بات کو یاد رکھیں دین میں اصل عبادات ہی ہیں یہی وہ کام ہیں جن کو اپنانے سے اللہ تعالیٰ کا صحیح اور قوی تعلق اور اللہ تعالیٰ کا عشق و محبت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے انسان کی پوری زندگی خواہ وہ دینی کام ہوں یا دنیاوی کام سب کے سب اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہو کر رہ جاتے ہیں اس لئے عبادات کو دین کی بنیاد کہا جاتا ہے کہ



اسلام کی پوری عمارت عبادات پر ہی استوار کی جاتی ہے اور ان بنیادی چیزوں میں کمزوری کی وجہ سے اسلام کی پوری عمارت ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ گزشتہ اُمّتوں کی گمراہی اور بربادی کی ابتداء اور سبب کو بیان فرماتے ہیں کہ:

﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهْوَاتِ فَسُوفَ يَلْقَوْنَ غِيًّا﴾

”پھر ان کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور اپنی نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے پس عنقریب وہ گمراہی کی سزا سے دوچار ہوں گے۔“ (مریم: آیت ۵۹)

اس آیت کریمہ میں بتایا کہ جب انبیاء علیہم السلام کے پیروکاروں میں سے بعد میں آنے والوں نے نماز کو ضائع کیا اور ان کی نمازیں خشوع و خضوع کی روح سے خالی ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور رابطہ ختم ہوا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے بجائے نفسانی خواہشات کے پیچھے پڑ گئے آج کل بھی بہت سے مفکرین اسلام بن گئے ہیں جن کے نزدیک نماز تسبیح کی اہمیت نہیں وہ اپنے دلچسپ نعروں سے قوم کو اپنی طرف متوجہ کر کے نماز تسبیح ذکر و اذکار کی ناقداری کرتے ہیں اور ان چیزوں کی حفاظت سے غافل ہو جاتے ہیں اور ان چیزوں میں کوتاہی اور کمزوری کی وجہ سے ان کا رابطہ اللہ تعالیٰ سے ٹوٹ جاتا ہے اور اس لئے مسلمانوں کی جماعتیں خالص دنیا پرست تنظیمیں ہو کر رہ جاتی ہیں۔

لہذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ دلچسپ نعروں کے پیچھے نہ چلیں عبادات، ذکر و اذکار پر خوب پابندی اور ان کی خوب حفاظت کے ساتھ ساتھ دنیاوی کاموں کو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنائیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی بندگی میں گزر جائے گی اور پورے دین پر عمل نصیب ہوگا۔

دنیا دار اور دین دار کی علامات کیا ہیں؟

مذکورہ بالا بحث سے دنیا دار اور دین دار کے پرکھنے کے لئے دونوں کی علامات بھی واضح ہو گئیں وہ یہ ہیں کہ:

دین دار شخص پورے دین اسلام پر عمل کرنے والا ہوتا ہے اس کے معاملات درست ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کے حقوق کی بھی اور اس کے بندوں کے حقوق کی بھی پوری رعایت کرے گا غریبوں اور فقیروں سے محبت رکھے گا، حسد، ریاکاری، جھوٹ، غیبت وغیرہ جیسی بیماریوں سے اور گندی چیزوں سے پاک ہوگا، موت سے نہ ڈرنے والا، سخی، بہادر اور امانت دار ہوگا دین دار شخص کبھی بھی دنیاوی عزت اور جاہ و منصب کے حصول کے پیچھے نہیں پڑتا اس کے سامنے آخرت ہوتی ہے اور پوری زندگی کی گاڑی اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور آخرت کی سڑک پر دوڑتی رہتی ہے اور

اس کے برعکس دنیا دار شخص یا تو حقوق اللہ اور حقوق العباد میں کوتاہی کرتا ہوگا یا حسد، جھوٹ، ریا کاری مال و جاہ کے حصول کی محبت جیسے امراض میں مبتلا ہوگا وہ دنیا کی عارضی لذتوں کا اس قدر عادی ہوگا کہ اس کے مقابلہ میں وہ آخرت کے کاموں کو نظر انداز کرے گا۔

عرض یہ ہے کہ جس شخص کے دل میں دنیا کی محبت بھری ہوتی ہے اُس کی پوری زندگی دنیا کی سڑک پر دوڑتی رہتی ہے۔ ایسا شخص اگرچہ بظاہر دین کے کام بھی کرتا ہے تقریریں کرتا ہے تبلیغ و تدریس کرتا ہے لیکن چونکہ مقصود و مطلوب دنیا ہوتی ہے اس لئے اس کے اندر بغض، عناد اور حسد جیسی اخلاقی برائیاں ہوں گی نیز معاملات اور کسی کے خلافت وغیرہ جیسے امور کی حدود پر قائم نہیں رہ سکتا اور دنیا داروں کی محبت فقیروں کے بجائے مال داروں سے ہوتی ہے۔

### دنیا کی محبت کا خلاصہ!

پس دنیا کی محبت کا خلاصہ یہ ہوا کہ جو چیز بھی انسان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے احکامات سے غافل کر دیتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بندگی میں رکاوٹ بنتی ہے یا اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں سستی پیدا کرتی ہے تو وہ دنیا ہے خواہ مال کی صورت میں ہے یا اولاد کی صورت میں ہو یا لوگوں سے اپنی تعریف سننے کی خواہش کی صورت میں ہو یا آرام پسندی وغیرہ خواہ کسی دوسری صورت میں ہو۔

### دنیا کی محبت بدترین خصلت اور تمام برائیوں کی جڑ ہے!

دنیا کی حرص و محبت ایک بدترین خصلت ہونے کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے فساد، برائیوں اور فتنوں کا ذریعہ ہے، دنیا کی لذتوں اور شہوتوں، مال و جاہ کا دلدادہ ہونا دل و دماغ کو گندہ کرتا ہے اور انسان کے اعمال و کردار کو خبیث اور پلید کر کے رکھ دیتا ہے۔

قرآن مجید کی سینکڑوں آیات میں دنیا کی کی ناپائیداری اور اس میں پڑنے والوں کے برے انجام کو ذکر کیا گیا ہے نیز نہایت مؤثر اور لطیف انداز میں دلائل و حقائق بتلائے ہیں کہ بہت ہی عارضی زندگی ہے اور یہ اس قدر ناپائیدار ہے جیسا کہ پانی پر نقش یا پانی کا بلبلہ کی حیثیت ہے۔ قرآن مجید کی ذکر کردہ آیاتوں سے بطور نمونہ چند آیتوں کو پیش کرتے ہیں۔

(۱) چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَأَضْرَبَ لَهُم مَّثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَا أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيْحُ وَكَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا﴾

”اور آپ بیان کر دیجئے ان لوگوں سے دنیوی زندگی کی مثال، کہ بس اس کی حالت ایسی ہے کہ ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس پانی کے ذریعے زمین کے بنات و سبزے خوب گنجان ہو گئے پھر وہ (بعد اس کے کہ تروتازہ اور شاداب تھے خشک ہو کر) ریزہ ریزہ ہو گئے جس کو ہوائیں لئے اڑے پھرتی ہیں (یہی حال بس دنیوی زندگی کا ہے۔ آج یہ حیات دنیا سبز و شاداب اور ہری بھری نظر آرہی ہے لیکن کل اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا جس طرح آج لہلہاتی ہوئی کھیتی شاداب اور نظروں کو بھلی معلوم ہوتی ہے مگر خشک ہونے پر کٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے گی اور ہوائیں اس کے ریزوں کو اڑائے پھرتی ہوں گی) اور بے شک اللہ رب العزت تو ہر چیز پر بڑی ہی قدرت والا ہے۔“ (سورۃ کہف: ۴۵)

دنیا کی اسی حقیقت کو سمجھانے کے لئے آنحضرت ﷺ نے یہ نصیحت فرمائی: (كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ السَّبِيلِ) کہ دنیا میں اس طرح زندگی بسر کر کہ گویا تو ایک مسافر ہے یا راستہ طے کرنے والا ہے۔

(۲): (اعْلَمُوا أَنَّ الدُّنْيَا لَمَلْعَبٌ وَلَهُمْ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ) ”(اے لوگو!) یہ بات جان لو کہ دنیا کی زندگی بس ایک کھیل اور تماشا ہے اور بناؤ سنگار اور ایک دوسرے سے بڑائی اور شیخی اور ایک دوسرے سے مال و اولاد میں بڑھنے کی خواہش۔“ (حدید: آیت ۲۰)

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے کہ:

﴿يَقَوْمُ إِنَّمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ﴾

”اے میری قوم! یہ دنیا کی زندگی صرف چند روزہ مزہ ہے اور ہمیشہ رہنے کا گھر تو آخرت ہے۔“ (مؤمن

آیت ۳۹)

﴿وَمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهُمْ وَلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِیَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ﴾

”یہ دنیا کی زندگی کچھ نہیں مگر ایک کھیل تماشا ہے اصل زندگی تو آخرت کا گھر ہے کاش یہ لوگ جانتے۔“

(عنکبوت: آیت ۶۴)

جس طرح بچے تھوڑے وقت کے لئے گھر بنا لیتے ہیں اور اس کے لئے خوش ہوتے ہیں اور ہم ان کو کھیل تماشا سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہی تو ہے کہ وہ ہمارے نزدیک عارضی اور کمزور چیز ہوتی ہے اس طرح آخرت کو دیکھنے

والوں کے نزدیک یہ دنیا بچوں کا ایک کھیل و تماشا اور عارضی چیز ہے بلکہ بچوں کے کھلونے اور مٹی سے بنائے ہوئے گھر کو ہم صرف اس لئے کھیل کہتے ہیں کہ ان کا مقابلہ ہم ساٹھ سالہ یا سو سال تک رہنے والی عمارتوں سے کرتے ہیں اور یہ بات تو معلوم ہے کہ آخرت کا ٹھکانہ وہاں تو ہمیشہ رہنا ہے لا محدود زندگی ہے تو یہاں کی سو سالہ زندگی اس کے مقابلہ میں کوئی بھی حقیقت نہیں رکھتی۔

بلکہ دنیا کی کوئی شکل بھی پائیدار نہیں یہاں کی ہر چیز عارضی ہے بچپن، جوانی بوڑھا پائمانی خوشی مال وغیرہ عارضی ہی ہیں۔ تو مذکورہ بالا آیتوں میں اللہ تعالیٰ انسان کو یہ نصیحت فرماتا ہے کہ مال و اولاد وغیرہ صرف دنیوی زینت ہیں اور دنیا کی کوئی چیز پائیدار نہیں اور دنیا کے یہ سارے مزے آخرت کی دائمی زندگی کے مقابلہ میں ایک کھیل، فضول اور بے فائدہ ثابت ہو جائیں گے، دراصل پائیدار زندگی تو آخرت کی زندگی ہے، لہذا دنیا کی زندگی تو صرف ایک مہلت ہے اور امتحان ہے اور انسان کے لئے اصل زندگی جو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے وہ تو آخرت کی زندگی ہے تو یہاں امتحان کی مدت کو ”لہو و لعب“ کھیل تماشہ میں ضائع کرنا بہت بڑی حماقت ہے اس دنیا کا ایک ایک لمحہ بہت ہی قیمتی ہے، اس کو تو آخرت کی فکر اور ان کاموں میں استعمال کرنا چاہئے جو آخرت اور ہمیشہ زندگی میں بہترین نتائج پیدا کریں۔

### حق و باطل کا معیار نہ مال و متاع اور دنیا کی فراوانی ہے نہ تنگی!

عام لوگ جب کسی شخص کو دیکھتے ہیں کہ اس کو دنیا کی مال و دولت اور اولاد زیادہ مل چکی ہے یا یہ کہ جب یا جس کو دنیا میں کوئی اچھا منصب مثلاً حکومت کی سربراہی مل گئی ہے تو وہ اپنی جہالت و حماقت سے یہ سمجھتے ہیں گویا یہ اللہ تعالیٰ کا محبوب اور صاحب مقام ہے اس لئے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انعام و اکرام ہے اور یہ انعامات جو اس کو مل چکے ہیں یہ اس کی دلیل و علامت ہے کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کا مقرب اور مقبول بندہ ہے اور دوسری طرف بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب بھی کسی کے پاس مال و دولت اور اولاد کی فراوانی یا کسی منصب کو دیکھتے ہیں تو وہ بھی اپنی نادانی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دولت وغیرہ کی فراوانی یا اس کا یہ منصب اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بندہ باطل پر ہے اور اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے اس لئے اسے دنیا کا مال و متاع مل رہا ہے تاکہ اس کو آخرت میں مبتلائے عذاب کر دے یہ دونوں فکر قطعاً غلط ہیں حق و باطل کا معیار اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی کو اخلاص کے ساتھ اختیار کر چکا ہے وہ حق پر ہے اور جو بندگی الہی کو نظر انداز کرتا ہے وہ اللہ کے نزدیک مغضوب و مردود ہے اور باطل پر ہے، باقی رہی دنیا اور رزق کی تنگی یا کشادگی جو کچھ بھی ہوتی ہے یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کی بنا پر ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی مصلحتوں کو کون جان سکتا ہے وہاں

تک ہماری رسائی نہیں ہو سکتی البتہ اتنی بات ہر صاحب عقل سمجھ لیتا ہے کہ مشاہدہ یہ ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کہ بہت ہی زیادہ ناپاک گندے اور بہت گھناؤنے کردار والے ہوتے ہیں مگر ان کے پاس مال و متاع کی فراوانی ہوتی ہے اور اس کے مقابلہ میں بہت سے نیک و شریف لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی اچھائی اور حسن اخلاق و کردار کی خوبی کا ہر شخص معترف ہوتا ہے مگر اس کے باوجود وہ نادار اور تنگ دست ہوتے ہیں تو آخر کون سا صاحب عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ پاکیزہ کردار اور پاک لوگ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں اور شریر و خبیث لوگ اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں کیا قارون کے پاس دولت کی فراوانی نہیں تھی نمرود و فرعون بادشاہ و حکمران نہ تھے عرض یہ ہے کہ کسی کو زیادہ رزق دیئے جانے کا لازماً یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش یا ناراض ہے، بلکہ بسا اوقات ایک شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت مغضوب اور مردود ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اس کو بہت زیادہ مال و متاع دے دیتا ہے اور بالآخر یہ دولت اس کے اوپر اور عذاب لے آتی ہے جیسا کہ پتھروں میں چوہوں کے لئے ان کا محبوب طعام رکھ دیا جاتا ہے لیکن یہی طعام ان پر بالآخر مصیبت ڈھادیتا ہے اور اس کے برعکس اگر کسی کا رزق تنگ ہے تو اس کا لازماً یہی مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہے اور اسے سزا دے رہا ہے بلکہ اکثر مقررین بارگاہ اور نیک لوگوں کی روزی تنگ ہوا کرتی ہے اور اس کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوتے ہیں اور اس تنگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کے خزانے کھول دیتے ہیں اسی طرح بہت سے دیندار اور مقررین بارگاہ دنیا میں بادشاہ ہو کر گزرے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں مال و متاع بہت زیادہ عطا فرمایا تھا اور اس کے برعکس بہت سے کفار و مشرکین اور ملعون اور مغضوب لوگ ایسے بھی رہے ہیں جو دنیا میں بھی تنگی و مصیبت کی زندگی گزار کر چلے گئے ہیں اس تمہید کے بعد قرآن مجید اور احادیث شریف میں سے کچھ پیش کرتے ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ۝ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَنَعْنُ بِمُعَذِّبِينَ ۝ قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ بِالَّتِي تُقَرَّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفَىٰ الْأَمَنُ وَاعْمَلْ صَالِحًا فَاُولَٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الضَّعْفِ بِمَا عَمِلُوا وَهُمْ فِي الْغُرُفَاتِ آمِنُونَ﴾

”اور ہم نے کسی بستی میں ڈرانے (اور خبردار کرنے والا یعنی پیغمبر) نہیں بھیجا مگر اس بستی کے آسودہ حال (یعنی صاحب مال و اولاد اور صاحب اقتدار) لوگوں نے یہی کہا کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو ہم اس کا انکار کرتے ہیں اور وہ یہی کہتے ہیں کہ ہم مال و اولاد میں تم سے زیادہ ہیں اور ہمیں ہرگز عذاب نہیں دیا جاسکتا (اے نبی) آپ

ان سے کہہ دیجئے میرا رب جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے مگر اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے (اور یاد رکھیں) تمہارے اموال اور تمہاری اولاد ایسے نہیں ہیں کہ تمہیں ہمارا مقرب بنادیں مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے (اسی کو ہمارا قرب نصیب ہوگا) پس یہی لوگ ہیں جن کے لئے ان کے اعمال کا دُگنا صلہ ہے وہی بلند و بالا عمارتوں میں امن و چین سے رہیں گے۔“ (سبا: آیت ۳۴ تا ۳۷)

مذکورہ بالا آیتوں میں اس بات کی پوری وضاحت موجود ہے کہ مال و دولت یا عزت و جاہ کی کمی بیشی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول یا مردود ہونے کی علامت نہیں بلکہ اس کے نزدیک مقبولیت کا مدار صرف ایمان و عمل صالح پر ہے جس کو یہ حاصل ہو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے اور جس کو یہ حاصل نہ ہو وہ مردود۔

(۲): ﴿فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَافِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَنَزَهَ قَرْنَهُمْ وَهُمْ كَفِرُونَ﴾

”پس ان کے مال و دولت اور (کثرت) اولاد تمہیں تعجب میں نہ ڈال دیں اللہ تعالیٰ تو یہی چاہتا ہے کہ انہی چیزوں کے ذریعہ دنیوی زندگی میں عذاب دیں اور ان کا سانس اس حال میں نکلے کہ وہ کافر ہوں۔“ (توبہ: آیت ۵۵)

مذکورہ بالا آیت میں یہ بات بتلائی گئی کہ مال و دولت اور کثرت اولاد کی وجہ سے وہ دنیا و آخرت میں مبتلائے عذاب ہو جاتے ہیں۔

(۳) حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوم کو کفر و شرک اور جرائم سے روکا اور اس کے بدلے میں دنیا میں خوشحال رہنے، ستھری اور مطمئن زندگی ملنے کا یقین بھی دلایا حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس تعلیم کو قرآن مجید نے یوں ذکر کیا ہے:

﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبِّيَ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۝ وَصُمِّدَ ذُكُومًا بِأَمْوَالٍ وَيَبْنِيَنَّ لَكُمْ جَنَّتٍ وَيَجْعَلَ لَكُمْ أَنْهَارًا ۝ مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ۝﴾

”حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کہتے ہیں کہ میں نے (اپنی قوم سے) کہا کہ اپنے رب سے معافی مانگ لو (یعنی گناہوں کو چھوڑ دو اے قوم) بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشنے والا ہے وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا اور اموال اور اولاد میں ترقی دے گا اور تمہارے لئے باغات پیدا کرے گا تمہارے لئے نہریں جاری فرمائے گا اور تمہیں کیا ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ سے وقار (یعنی عظمت و بڑائی) کی اُمید نہیں رکھتے۔“ (نوح: آیت

(۱۳ تا ۱۰)

اللہ تعالیٰ سے وقار و بڑائی کی اُمید رکھنے کا مطلب یہ بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت و بڑائی سے اُمید رکھنا چاہئے کہ تم اس کی فرمانبرداری کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو عزت و وقار عطا فرمائے گا۔ واللہ اعلم

مذکورہ بالا آیتوں میں توبہ و استغفار اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور گناہوں کی نافرمانی چھوڑنے میں جس مال و دولت اور جس اولاد اور عزت وغیرہ کی یقین دہانی ہے وہ بلاشبہ ایسا مال و اولاد ہو سکتی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و نعمت ہو اور جو دنیا و آخرت میں بھی پریشانی اور مصیبت کے بجائے چین و سکون کا باعث بن سکتی ہے۔ یہاں ایک بات یاد رکھیں جو شخص گناہوں اور نافرمانی کی زندگی کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور کامل زندگی کو اختیار کر لیتا ہے اس کی زندگی پر سکون اور چین و اطمینان سے گزرے گی ان کو کبھی فقر و فاقہ اور دوسری چیزوں کا غم اور ڈرنہ ہوگا، خواہ اس کے پاس دنیا کا مال و متاع زیادہ ہو یا کم جیسا کہ اس کا بیان اپنی جگہ میں ذکر کر چکا ہوں یہاں تو صرف یہ بتلانا مقصود تھا کہ مال و دولت یا اولاد کی کثرت اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول یا مردود ہونے کی علامت نہیں بلکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے تکوینی مصالح کے تحت ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی تکوینی مصالح کے مطابق کسی کو زیادہ مال و متاع اور اولاد عطا فرماتے ہیں اور کسی کو کم۔ وہ رحیم، کریم اور حکیم ذات ہے وہی اپنی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے رحیم و کریم اور حکیم پروردگار اللہ رب العزت کی صحیح اور کامل بندگی نصیب فرمائے۔ آمین

جو مال و اولاد دیا جو چیز بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل یا اس کی یاد میں رکاوٹ ڈال دے تو وہ دنیا ہے اور دنیا مذموم اور ملعون ہے!

بس جو مال و متاع اور عزت وغیرہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اس کی یاد میں رکاوٹ ڈال دے تو وہ دنیا ہے جو کہ مذموم اور مردود ہے۔ چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”خبردار دنیا اور جو کچھ اس میں ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت و پھنکار ہے اور اس کی رحمت سے محرومی ہے سوائے اللہ تعالیٰ کی یاد کے، اور ان چیزوں کے جن کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق اور واسطہ ہے اور سوائے عالم اور متعلم کے۔“ (کہ یہ چیزیں ملعون اور مردود نہیں ہیں) (ترمذی وابن ماجہ، مشکوٰۃ)

دنیا میں جو اعمال و افعال ہوتے ہیں عموماً تین قسم پر ہیں ایک قسم تو یہ ہے جن کا ظاہر و باطن گناہ ہے جیسے سود، حرام، زنا وغیرہ اس کی خرابی میں تو کسی کو کلام نہیں دوسری قسم ان چیزوں کی ہے جو بظاہر تو نیک اور اچھے ہیں لیکن



نیت کی خرابی سے گناہ بن جاتے ہیں۔ جیسے نماز، روزہ، خواہشات سے احتراز، صدقات وغیرہ اگرچہ یہ نیک کام ہیں اور بہت اجر و ثواب رکھتے ہیں، لیکن اگر ریاء و شہرت اور مقبولیت خلق کے لئے کئے جائیں تو یہی نیک کام نیت کی خرابی کی وجہ سے فاسد ہو کر باعث لعنت و پھٹکار بن جاتے ہیں البتہ اگر اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کیلئے کئے جائیں تو پھر یہی چیزیں ذکر بن جاتی ہیں۔

تیسری قسم میں وہ اعمال و افعال شامل ہیں جو بظاہر دنیا اور حظ نفس کے لئے معلوم ہوتے ہیں لیکن صحیح نیت اور ارادے سے وہ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا سبب بن جاتے ہیں جیسے نکاح کرنا، کھانا کھانا اور اس لئے مال کمانا کہ مخلوق سے طمع و سوال نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے نام پر خرچ کر دوں گا اسی طرح تمام وہ کام جو گناہ سے خالی ہوں، یہی کام اگر صحیح نیت سے کئے جائیں تو وہ دنیا نہیں رہتے بلکہ باعث اجر ہو جاتے ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ اس دنیا میں صرف وہی چیزیں اور وہی اعمال اللہ تعالیٰ کی رحمت کے لائق ہیں جن کا اللہ تعالیٰ سے اور دین سے کوئی تعلق ہو، خواہ بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ۔

اور جن اعمال و افعال کا اللہ تعالیٰ اور دین سے کوئی تعلق نہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور اور محروم اور قابل لعنت ہیں اور جو مال و متاع اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق حاصل ہوں اور اس کے مطابق خرچ ہوں اور وہ یاد الہی میں رکاوٹ بن جانے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی یاد اور آخرت کی کمائی میں ترقی کا سبب بن جائیں تو وہ دنیا نہیں بلکہ دین بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

”پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو تا کہ تمہیں فلاح نصیب ہو جائے۔“ (جمعہ: آیت ۱۰)

مطلب یہ ہے کہ نماز جمعہ سے فارغ ہو کر تجارت وغیرہ کی اجازت ہے اسی آیت کریمہ سے رزق حاصل کرنے کے لئے جو یہ الفاظ استعمال کئے گئے کہ ﴿وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔“ ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو مال اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق جائز طریقے سے حاصل ہو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کا فضل ہے اور دوسری تعلیم اس آیت میں یہ دے دی گئی ہے کہ ”اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو“ جس کا مطلب یہ ہے کہ روزی کی تلاش میں بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہو ہر وقت اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا خیال رہے اور کام

مزدوری وغیرہ کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کی یاد سے دل و زبان کوتاہ اور تر رکھو ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿رَجَالٌ لَا تُلْهِهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ﴾

”وہ (جوان) مرد (لوگ) جنہیں کوئی تجارت (اور دھندا) اور کوئی خرید و فروخت اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز (کے اہتمام و) قیام سے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتی اور وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں (بہت سے لوگوں کے) دل اور آنکھیں اُلٹ جائیں گی۔“ (نور: آیت ۳۷)

یہاں مومنین کی صفات ہی میں یہ صفت بھی بیان کی گئی ہے کہ ان کے دل اللہ کے عشق و محبت سے اس قدر لبریز ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی یاد ان کے دلوں میں اس قدر رچی بسی ہوتی ہے کہ دنیا کی کوئی مصروفیت ان کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اس کی بندگی اور اس کی یاد سے غافل نہیں کر سکتی اور ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف اس دنیوی زندگی کے طالبگار نہیں ہوتے بلکہ ان کی نظریں ہر وقت آخرت کی ابدی زندگی پر لگی رہتی ہے اور وہ ہر وقت قیامت کے روز آخرت کی بربادی سے لرزا بر اندام رہتے ہیں۔

### اچھے اور برے مال و متاع کی پہچان!

مذکورہ بحث کے بعد اب اچھے اور برے مال و متاع کی علامات ذکر کر دی جاتی ہیں۔

- (۱) جو مال و متاع غلط اور ناجائز راستوں سے ملتا ہے مثلاً چوری، ڈکیتی وغیرہ یہ مال اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے۔
- (۲) جو مال دار اپنے مال کو اڑاتا یا اپنی اولاد پر فخر کرتا اور اس کی وجہ سے لوگوں کو ڈراتا اور دباتا ہے تو وہ مال و اولاد وبال ہے۔

- (۳) جو مال و عزت جائز طریقہ سے حاصل ہوا ہو لیکن اس میں زکوٰۃ، صدقات نہ ہوں وہ مال بھی بالآخر بتلائے عذاب کر دے گا۔

جس مال و متاع اور اولاد کو ناجائز امور میں استعمال کیا جاتا ہے یا جس مال و متاع اور اولاد میں اس قدر مشغولیت ہو جو اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے احکامات سے غافل کر دے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ مال و اولاد اس پر وبال اور عذاب لائے گا یہ مال و دولت وغیرہ اگرچہ بظاہر نعمت معلوم ہو لیکن اس کے اندر دنیوی پریشانی بے اطمینانی کے انگارے اور آخرت کا عذاب و پھٹکار چھپا ہوا ہوتا ہے اور اس کے برعکس جو مال، اولاد اور عزت جائز ذرائع سے حاصل ہوتی ہے اور جس کے حصول میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی نہ ہو تو ایسا مال، متاع اچھا

اور نعمت الہی ہے بشرطیکہ اس کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق استعمال اور خرچ بھی کر دیا جائے نیز وہ مال و متاع کے حصول میں اس قدر مشغول نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اس کی یاد میں رکاوٹ ڈال دے۔ تو یہی مال و متاع اور عزت صرف دنیا میں مفید نہیں بلکہ اس مال و متاع کی وجہ سے انسان کے لئے آخرت کے درجات اور ترقیات اور خوشیوں میں بھی اضافہ کر دیا جائے گا۔

### آخرت کی فکر کرو!

یہ دنیا جس میں ہم بستے ہیں جس کو اپنی آنکھوں، کانوں وغیرہ سے محسوس کرتے ہیں تو جس طرح یہ ایک واقعی حقیقت ہے اسی طرح آخرت بھی ایک قطعی اور یقینی حقیقت ہے اور یہاں اس دنیا میں ہمارا اُس دنیا کو نہ دیکھنا اور محسوس نہ کرنے کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ماں کے پیٹ میں ہونے کے دوران ہم اس دنیا کو نہیں دیکھتے پھر جس طرح ہم نے یہاں آکر اس دنیا کو دیکھ لیا زمین و آسمان کی وسعتوں اور اس میں کروڑوں اشیاء ہمارے مشاہدے میں آگئیں اور خوراک کی ایسی چیزیں اور دوسری لذتوں کو دیکھ لیا اور دنیا میں ایسی تکالیف اور مصائب دکھ درد بھی دیکھے یا ان میں مبتلا ہوئے جن کا ماں کے پیٹ میں ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اسی طرح اس دنیا کی نعمتوں اور لذتوں کے مقابلے میں آخرت کی نعمتیں، لذتیں اور خوشیاں بے نہایت اور لامحدود ہیں یہی حال آخرت کی تکالیف اور مصیبتوں کا بھی ہے کہ دنیا کا سخت غم، تکلیف اور بڑا سے بڑا دکھ بھی دوزخ کے ہلکے سے ہلکے درجے کے عذاب سے کوئی مشابہت یا نسبت نہیں رکھتا تو آخرت کی ابدی نعمتیں و لذتیں اور تکالیف و مصائب ایسی ہیں جن کا اس دنیا میں ہم تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں اور یہاں جو کچھ نعمتیں خوشیاں اور غمیاں دکھ درد ہے گویا یہ آخرت میں آنے والی حقیقتوں کے نمونے اور تصاویر ہیں، اصل حقیقی زندگی حقیقی نعمتیں اور حقیقی مصائب تو آخرت کے ہیں جس کو یہاں نہیں بلکہ مرنے کے بعد عالم آخرت میں پہنچ کر جنت و دوزخ کو اور عالم آخرت کی ان تمام چیزوں کو دیکھ لیں گے اور پالیں گے جن کی اطلاع اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے اور اللہ جل شانہ کی کتابوں نے دی ہے۔ پس انسان کی بڑی خوش بختی یہ ہوتی ہے اور سینکڑوں برائیوں سے بچنے کی اساس اور بنیاد بھی یہی ہے کہ اس کے دل کا رخ آخرت کی طرف ہو اس کا اصل مقصد اور مطمح نظر آخرت کی زندگی رہے اور اس کی بڑی بد بختی اور سینکڑوں بد کاریوں کی جڑ اور بنیاد بھی یہی ہے کہ وہ آخرت کے انجام سے غافل اور بے فکر ہو کر زندگی گزارتا رہے احکامات الہی کے بجائے اپنی خواہشات کی پیروی کرتا رہے اور ان خواہشات کی فانی لذتوں کو اپنا مقصود و اصلی بنالے۔

### انسان کیوں دنیا کو آخرت پر مقدم کرتا ہے!

لیکن عام انسانوں کا حال یہ ہے کہ ان کے نزدیک دنیا کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے وہ آنکھوں کے سامنے ہے اور آخرت اور اس کی حقیقتیں آنکھوں سے اوجھل اور غائب ہیں اس لئے اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ آخرت اور اس میں جو کچھ پیش آنے والا ہے اس کے ماننے والوں پر فکر دنیا اور اس کی طلب غالب رہتی ہے زبانی طور پر جو کچھ بھی کہہ دیا کریں لیکن وہ اپنے اعمال سے اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ ان کے نزدیک دنیا کی اہمیت جتنی ہے اتنی اہمیت آخرت کی نہیں گویا یہ جلد بازی انسانوں کی فطری کمزوری ہے اور ان کا مال اس معاملہ میں ٹھیک ٹھیک ان چھوٹے بچوں جیسا ہے جن کو بچپن میں اپنے کھیل، کھلونوں سے دلچسپی ہوتی ہے اور مستقبل کی زندگی کو خوشگوار اور شاندار بنانے والے تعلیمی اور تربیتی مشاغل ان کے لئے سب چیزوں سے زیادہ غیر دلچسپ بلکہ انتہائی شاق ہوتے ہیں اور ان کے شفیق ماں باپ ان کو سمجھا بچھا کر ان اچھے کاموں کی طرف راغب کرتے رہتے ہیں جن میں لگ کر وہ کامیاب انسان بن سکتے ہیں اور عزت و عافیت کی زندگی حاصل کر سکتے ہیں ہمیشہ انسانوں کی اس غلطی اور کمزوری کی اصلاح کی کوشش انبیاء علیہم السلام نے کی اور انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے آخرت کی ابدی زندگی میں ان کو کامل مقام تک پہنچانے کے لئے جن چیزوں پر خاص طور پر بہت زور دیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ انسان دنیا کو بالکل حقیر اور بے قیمت سمجھے اس سے زیادہ جی نہ لگائے اور اس کو اپنا مقصود نہ بنائے بلکہ آخرت کو اپنی اصلی منزل اور اپنا دائمی وطن یقین کرتے ہوئے اور دنیا کے مقابلہ میں جو قدر و قیمت اور جواہریت ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہاں کی کامیابی حاصل کرنے کی فکر اپنی تمام دنیوی فکروں پر غالب رکھے اور دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دے۔

چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ:

﴿بَلْ تَوَثُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰی ۝ اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُولٰٓئِی ۝ صُحُفٍ

ابراہیم و موسیٰ ۝﴾

یعنی ”تمہارا حال یہ ہے کہ تم (آخرت کے مقابلہ میں) دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت (دنیا سے بدرجہا) بہتر اور باقی رہنے والی ہے یہی بات اگلی کتابوں میں بھی آئی ہوئی ہے ابراہیم اور موسیٰ (علیہم السلام) کے صحیفوں میں۔“ (سورۃ اعلیٰ: ۱۹-۱۷)

اور ایک جگہ یوں ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ هَؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا نَقِيلًا﴾

یعنی ”یہ لوگ دنیا سے محبت اور اپنے آگے آنے والے بھاری دن کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔“ (یعنی دنیا کی محبت نے ان کو ایسا اندھا کر دیا ہے کہ ان کو آنے والے انتہائی مصیبت کے دن کی پروا نہیں ہے)۔ (سورہ دھر: ۲۷)

اور مستورد بن شداد رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرماتے تھے کہ ”دنیا کی مثال آخرت کے مقابلہ میں بس ایسی ہے جیسے کہ تم میں سے کوئی اپنی انگلی دریا میں ڈال کر نکال لے اور پھر دیکھے کہ پانی کی کتنی مقدار اس میں لگ کر آئی ہے۔“ (مسلم)

در اصل یہ مثال سمجھانے کے لئے دی گئی ہے ورنہ درحقیقت دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں یہ نسبت بھی نہیں کیونکہ دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے یہ سب محدود اور آخرت لامحدود اور بے نہایت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے دونوں مونڈھے پکڑ کر مجھ سے فرمایا کہ دنیا میں ایسی زندگی بسر کرو جیسا کہ تو پردیسی ہے یا راستہ چلتا ہوا مسافر۔ (بخاری)

اسی طرح بہت سی قرآنی آیات اور روایات حدیث میں دنیا کی تحقیر اور مذمت بیان کی گئی ہے اور مختلف طریقوں سے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور آخرت کے مقابلہ میں یہ دنیا کس قدر حقیر اور بے قیمت ہے تو یہاں فکر آخرت کو اپنانے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل کا رخ آخرت کی طرف ہو اور آخرت ہی پیش نظر رہے اور اس میں روز بروز ترقی کے لئے کوشاں رہے۔

### فکر آخرت کیسے پیدا ہو؟

جب ہمارے لئے ضروری یہ ہے کہ ہماری فکر وسیع بس آخرت کے لئے ہو اور دنیا سے ہمارا تعلق صرف ناگزیر ضرورت کے بقدر ہو اس کے آنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک تو قبر و حشر، جنت و دوزخ کے متعلق آنے والی آیات و روایات کو سنے جہاں ایسی مجالس ہوں ان میں بیٹھیں اور ایسی کتابوں کو اپنے مطالعہ میں رکھیں جن میں جنت و دوزخ کے حالات آیات و روایات ہوں جیسا مولانا عاشق الہی دامت برکاتہم کی کتاب ”موت کی یاد“ دوسرا کام یہ کرے کہ روزانہ کیا ہوگا“ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”موت کی یاد“ دوسرا کام یہ کرے کہ روزانہ یاد رہے دنیا کی مذمت جو کی گئی ہے وہ وہی دنیا ہے جو آخرت کے مقابل والی ہو اور جو دنیا کی مشغولیت اور دنیا سے جو فائدہ فکر آخرت کے تحت ہو اور آخرت کی راہ میں رکاوٹ نہ ہو وہ مذموم اور ممنوع نہیں بلکہ وہ تو جنت پہنچنے کا ذریعہ ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا اور آگے بھی ان شاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

کسی وقت بیٹھ کر یہ سوچیں کہ ایک دن مرنا ہے میرے سامنے فلاں فلاں دوست اور رشتہ دار اس دنیا سے چل بسے میں بھی ایک دن اس دنیا سے جاؤں گا مجھے غسل دیا جائے گا، مجھ پر نماز جنازہ پڑھایا جائے گا دفنانے کے بعد منکر و نکیر آئیں گے سوال و جواب ہوگا، میری قبر یا تو جنت کی باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہوگا یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا دنیا ختم ہو جانے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوں گے طویل زمانہ حساب، کتاب ہوگا۔ ہر کوئی اپنے برے اعمال کے مطابق تکلیف اور پسینہ میں ڈوبا ہوا ہوگا، اب میرے اعمال تو لے جائیں گے پوری دنیا کے اول تا آخر آنے والے لوگ میری رسوائی یا عزت و اکرام کی نمائش کریں گے، پھر پل صراط پر چلنا ہوگا پھر جنت میں جاؤں گا یا دوزخ میں، پھر جنت کی ان نعمتوں کو سوچیں اور جہنم کی ان تکالیف کو بھی جو قرآن وحدیث میں آئی ہیں۔ تیسرا کام یہ کریں کہ کم از کم ہفتہ میں ایک بار کسی نزدیک قبرستان میں جایا کریں خاص کر ان لوگوں کی قبروں کو دیکھا کریں جو آپ کے سامنے دنیا سے چل بسے ہیں اور ان سے عبرت پکڑیں اور آخرت کی یاد کو تازہ کریں اور فانی دنیا کی نعمتوں اور مصیبتوں کو سوچیں کہ اگر یہ لوگ نعمتوں میں رہے یا مصیبتوں میں اچھے دن گزارے یا برے تنگی کے دن گزارے یا فراخی کے، بہر حال گزر گئے اب ان کو صرف وہ اعمال کام آئیں گے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے کئے ہیں آخرت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کئے ہیں، دنیا نے اور دنیا کے اسباب و سامان نے ان لوگوں کے ساتھ کس قدر وفاداری کی کس حد تک ان کا ساتھ دیا غرض اسی طرح بہت دور تک سوچا کریں اور دوسرے انسانوں کو بربادی سے بچانے کے لئے بھی یہی طریقہ اختیار کریں کہ ان کے سامنے دنیا کی بے حقیقتی اور بے قیمتی کو اور آخرت کی اہمیت اور برتری کو قوت کے ساتھ پیش کیا جائے اور قیامت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی اور اعمال کی جزا و سزا کا اور جنت و دوزخ کے ثواب و عذاب کا یقین ان کے دلوں میں اُتارنے کی کوشش کی جائے کبھی ان کے سامنے اللہ تعالیٰ اور فکر آخرت کے فوائد اور فضائل بیان کئے جائیں اور کبھی اللہ تعالیٰ کے قہر و جلال اور آخرت کے ان سخت اعمال اور کبھی جنت کی ان نعمتوں اور مزے والی ابدی زندگی کو ان کے سامنے پیش کیا جائے جو قرآن مجید اور احادیث کے ذخیرہ میں موجود ہے ان شاء اللہ اسی طرح کرنے سے اپنے اندر بھی فکر آخرت آئے گی اور دوسرے کے اندر بھی، اب اس کے بعد یہاں دنیا کی مذمت اور آخرت کی اہمیت پر قرآن وحدیث سے مزید کچھ پیش کیا جاتا ہے اس کو بھی پڑھ لیجئے۔

### مال و متاع کی محبت کی علامتیں!

دنیا کی مذمت اور اس کی حرص و ولالچ کے بعد مال و متاع اور جاہ کی محبت کی علامات اختصار کے ساتھ پیش



- کرتے ہیں مال کی محبت ذیل میں بیان کردہ آثار و علامات سے پہچانی جاسکتی ہے۔
- (۱) مال کمانے اور حاصل کرنے میں حرام یا مشتبہ ذرائع سے اجتناب نہیں کرے گا۔
- (۲) زکوٰۃ کی ادائیگی اور دوسرے مالی واجبات سے دل تنگ پڑے گا اور بخل میں مبتلا ہوگا۔
- (۳) فقراء و مساکین کی رفاقت اور ان کی ملاقات سے دل میں تنگی ہوگی اور ان سے نفرت کرے گا اگرچہ کچھ مال وغیرہ بظاہر دیا کرے لیکن ان کی محبت مالداروں کے ساتھ ہوگی۔
- (۴) مال کماتے وقت اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم متوجہ ہو مثلاً نماز کا وقت ہوا، یا جہاد کے لئے اعلان ہوا تو ایسے حالات میں سستی دکھائے گا۔
- (۵) مال و دولت کی باتوں میں اس کو سرور اور دل لگی ہوگی۔
- ایسے اور بھی قرائن ہو سکتے ہیں جس سے اپنے آپ کو معلوم کیا جاسکتا ہے کہ مجھ میں مال کی کس قدر محبت و روح بس گئی ہے جن کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

### حب الدنیا کی مذمت اور زہد و قناعت کی اہمیت و فضیلت!

آخرت کے مقابلے میں دنیا سے محبت اور دنیا کی حرص و لالچ کی مذمت اور زہد و قناعت کی فضیلت اور مصائب پر صبر کی ترغیب قرآن مجید و احادیث شریفہ میں اتنی کثرت سے مختلف انداز میں ذکر کی گئی ہیں کہ ان سب کو اگر مختصر بھی کیا جائے پھر ایک اچھی خاصی کتاب بن جائے گی لیکن یہاں اس کے متعلق مختصر طور پر کچھ آیات اور احادیث وغیرہ پیش کرتا ہوں وہ بھی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب فضائل صدقات میں سے اختصار کے ساتھ نقل کر دیتا ہوں۔

﴿زَيْنَ النَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُجْرٌ مُمَكَّنٌ ۝ قُلْ أُوْنَسِكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذَٰلِكُمْ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ ط وَاللَّهُ بِصِيرٍ بِالْعِبَادِ ۝ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّا أَمْنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَنِتَّةِينَ وَالْمُتَّقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالسَّحَرِ ۝﴾ (آل عمران: ۱۴-۱۳)

”آراستہ کردی گئی لوگوں کے لئے خواہشات کی محبت (مثلاً) عورتیں ہوئیں اور بیٹے ہوئے اور ڈھیر لگے



ہوئے سونے اور چاندی کے اور نشان لگے ہوئے (یعنی عمدہ اور اعلیٰ) گھوڑے اور دوسرے مویشی اور زراعت (لیکن یہ سب چیزیں) دنیوی زندگی کی استعمالی چیزیں ہیں اور انجام کار کی خوبی (اور کام آنے والی چیز تو) اللہ ہی کے پاس ہے (اے محمد ﷺ) تم اُن سے کہہ دو کیا میں تم کو ایسی چیز بتا دوں جو (بدرجہا) بہتر ہو ان سب چیزوں سے (وہ کیا ہے غور سے سنو!) ایسے لوگوں کے لئے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں ان کے رب کے پاس ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اُن میں وہ لوگ ہمیشہ رہیں گے اور (اُن کے لئے وہاں) ایسی پیبیاں ہیں جو ہر طرح پاک و صاف ستھری ہیں اور (ان سب سے بڑھ کر چیز) اللہ کی خوشنودی ہے اور اللہ تعالیٰ بندوں (کے احوال) کو خوب دیکھنے والے ہیں (یہ لوگ جن کے لئے یہ آخرت کی چیزیں ہیں ایسے لوگ ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے ہیں، پس آپ ہمارے گناہوں کو معاف کر دیجئے اور ہم کو جہنم کے عذاب سے بچا دیجئے۔ یہ لوگ (وہ ہیں جو مصیبتوں پر) صبر کرنے والے ہیں، سچ بولنے والے ہیں (اللہ تعالیٰ کے سامنے) عاجزی کرنے والے ہیں اور (نیک کاموں میں مال) خرچ کرنے والے ہیں اور پچھلی رات میں گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں۔“ (آل عمران: آیت ۱۴ تا ۱۷)

ف: حق تعالیٰ شانہ نے ان سب چیزوں کی محبت کو شہوتوں کی محبت سے تعبیر کیا ہے۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ شہوت کی افراط ہی کا نام عشق ہے جو بیماری ہے ایسے دل کی، جو تفکرات سے کالا ہو۔ اس کا علاج ابتداء ہی سے کرنا ضروری ہے کہ اس کی طرف نظر کم کر دے، اس کی طرف التفات کم کر دے۔ ورنہ جب التفات بڑھ جائے گا تو ہٹانا مشکل ہو جائے گا اور ابتداء میں بہت سہل ہے۔ یہی حال ہے ہر چیز کے عشق کا، مال ہو، جاہ ہو، جائداد ہو، اولاد ہو، حتیٰ کہ پرندوں (کبوتر وغیرہ) سے کھیلنے کا اور شطرنج وغیرہ سے کھیلنے کا بھی یہی حال ہے کہ یہ سب چیزیں جب آدمی پر مسلط ہو جاتی ہیں تو اس کے دین اور دنیا دونوں کو برباد کر دیتی ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص سواری پر سوار ہے۔ اگر وہ جانور کی باگ اسی وقت دوسری طرف پھیر دے جب وہ بے جگہ جانے کا رخ کر رہا ہو، تو اُس وقت بہت آسانی سے اس جگہ سے مڑ سکتا ہے۔ لیکن جب وہ جانور کسی دروازے میں گھس جائے اور سوار پھر دُم پکڑ کر پیچھے کو کھینچنا چاہے تو پھر بڑی سخت دشواری ہو جاتی ہے اس لئے ان سب چیزوں کی محبت کو ابتداء ہی سے نگاہ میں رکھے کہ اعتدال سے نہ بڑھنے دے (احیاء) علماء نے فرمایا ہے کہ دنیا کی جتنی بھی چیزیں ہیں وہ تین قسم میں داخل ہیں معدنیات، نباتات، حیوانات۔ حق تعالیٰ شانہ نے ان آیات میں تینوں کی مثالیں ذکر فرما کر دنیا کی ساری ہی چیزوں پر متنبہ فرمادیا۔ بیویوں اور بیٹوں کو ذکر فرما کر آل و اولاد، عزیز و اقارب، احباب غرض انسانی

محبوبوں پر تنبیہ فرمادی اور سونے چاندی کو ذکر فرما کر ساری معدنیات پر اور گھوڑے مویشی کو ذکر فرما کر ہر قسم کے جانوروں پر اور کھیتی سے ہر قسم کی پیداوار پر اور یہی چیزیں ساری دنیا کی کائنات ہیں (احیاء)۔ اور ان سب کو گنوا کر اور ان پر تنبیہ فرما کر ارشاد فرمادیا کہ یہ سب کی سب اس چند روزہ زندگی کے گزران کی چیزیں ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی محبت کے قابل نہیں، دل لگانے کے قابل نہیں۔ دل لگانے کی چیزیں صرف وہی ہیں جو پائدار ہیں، ہمیشہ رہنے والی ہیں، ہمیشہ کام آنے والی ہیں اور ان میں سب سے بڑھ کر اللہ کی رضا ہے، اس کی خوشنودی ہے وہ دنیا اور آخرت کی ہر چیز پر فائق ہے، ہر چیز سے بڑھ کر ہے۔

دوسری جگہ جنت کی نعمتوں کو ذکر فرما کر ارشاد ہے:

﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾

”کہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی ان سب چیزوں سے بڑھی ہوئی ہے یہ وہی چیز ہے جو بڑی کامیابی ہے۔“ اور حقیقت بھی یہی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی برابری نہ دنیا کی کوئی چیز کر سکتی ہے نہ آخرت کی کوئی نعمت اس کے برابر ہے۔ آیات بالا میں دنیا کی ساری مرغوبات کو تفصیل سے ذکر فرما کر اس پر تنبیہ کر دیا کہ یہ سب محض دنیوی زندگی کے اسباب ہیں اور پھر بار بار قرآن پاک میں اس چیز پر تنبیہ فرمائی گئی، مختلف عنوانات سے نصیحت کی گئی، کہیں دنیا طلبی کی مذمت کی گئی، کہیں دنیا کو ترجیح دینے والوں کی قباحت بیان کی گئی، کہیں اس کی بے ثباتی پر تنبیہ کی گئی، کہیں اس کو محض دھوکا بتایا گیا تا کہ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے کہ دنیا اور دنیا کی ہر چیز محض عارضی ہے محض ضرورت پورا کرنے کی چیز ہے۔ نہ یہ دائمی ہے، نہ دل لگانے کی چیز ہے۔

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يَخَفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ﴾

”یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے بدلہ میں خرید لیا۔ پس نہ تو ان کے عذاب میں تخفیف

کی جائے گی، نہ ان کی کسی قسم کی مدد کی جائے گی۔“ (بقرہ: آیت ۸۶)

﴿فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَمِنْهُمْ مَّن يَقُولُ

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا﴾

”پس بعض آدمی تو ایسے ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں تو جو کچھ دینا ہے دنیا ہی میں دے

دیں (پس ان کو جو کچھ ملنا ہوگا دنیا ہی میں مل جائے گا) اُن کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بعض لوگ یوں

کہتے ہیں کہ اے اللہ ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب

(بقرہ: آیت ۲۰۰-۲۰۱)

الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبِطُلٌ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٥﴾

”جو شخص (اپنے نیک اعمال سے) دنیاوی زندگی اور اس کی رونق چاہتا ہے (جیسے مال و متاع یا شہرت و نیک نامی وغیرہ) ہم اُن لوگوں کے اعمال (کا بدلہ) اُن کو دنیا ہی میں پورے طور سے بھگتا دیتے ہیں اور اُن کے لئے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ نہیں ہے اور انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ آخرت میں سب کا سب بیکار ثابت ہوگا اور (حقیقت میں) یہ جو کچھ کر رہے ہیں سب باطل (بیکار) ہے۔“

(سورۃ ہود: آیت ۱۵-۱۶)

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا ۝ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ۝ كُلُّ أَنْثٍ هَؤُلَاءِ وَهَؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۝ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ۝ أَنْظِرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۝ وَلَٰلِآخِرَةِ أَكْبَرُ دَرَجَتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا ۝﴾

”جو شخص دنیا کا ارادہ کرتا ہے (اور اپنی کوشش اور اعمال کا ثمرہ صرف دنیا ہی میں چاہتا ہے) ہم اس کو دنیا میں جتنا چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں دیتے ہیں (نہ یہ ضروری ہے کہ ہر شخص کو دے دیں۔ جس کو ہم چاہتے ہیں، دیتے ہیں اور جس کو دیتے ہیں اس کو بھی یہ ضروری نہیں کہ جتنا وہ مانگے سب دے دیں۔ جتنا ہم چاہتے ہیں دیتے ہیں) پھر آخرت میں اس کے لئے جہنم تجویز کر دیتے ہیں کہ وہ اس میں بد حال رہے اور جلتا رہے گا اور جو شخص آخرت کا ارادہ کرے اور اس کے لئے جیسی کوشش کرنا چاہئے، کرے، بشرطیکہ وہ مومن ہو، ایسے لوگوں کی کوشش اللہ کے یہاں مقبول ہے۔ ہر فریق کی (دنیا دار ہو یا دین دار) آپ کے رب کی عطا میں سے ہم مدد کرتے ہیں اور آپ کے رب کی (یہ دنیاوی عطا) کسی سے بھی بند نہیں کی گئی۔ آپ خود ہی دیکھ لیں کہ اس دنیاوی عطا میں ہم نے ایک کو دوسرے پر (خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر) کیسی فوقیت دے رکھی ہے (آپ اس سے خود ہی اندازہ کر لیں گے، کہ عطا کسی اور کی طرف سے ہے کہ ایک شخص کو کوشش سے بھی بہت کم ملتا ہے اور دوسرا بغیر کوشش کے بھی بہت کچھ حاصل کر لیتا ہے) اور آخرت (جو مخصوص ہے ایمان کے ساتھ) اس دنیا سے درجوں کے اعتبار سے بہت بڑی ہے

اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔“ (بنی اسرائیل: آیت ۲۱ تا ۲۸)

﴿اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهُمْ زِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ مِّنْ بَيْنِكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ ط كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا ط وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ط وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَمَتَاعٌ الْعُرُورِ ۝ سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ط ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ط وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝﴾

”تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی (ہرگز ہرگز اس قابل نہیں کہ آدمی اسی میں لگ جائے تو) محض لہو و لعب اور ظاہری زیب و زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا ہے اور اموال و اولاد میں ایک دوسرے پر بڑھوتری ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ مینہ برساکہ اس کی وجہ سے پیداوار (ایسی بڑھی کہ وہ) کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہونے لگی پھر وہ کھیتی خشک ہو جاتی ہے کہ پھر تو اس کو زرد دیکھتا ہے پھر وہ پھو را پھو را ہو جاتی ہے (یہی حالت دنیا کی زیب و زینت اور بہار کی ہے کہ آج زوروں پر ہے، پھر اضمحلال ہے، پھر زوال ہے) اور آخرت کی یہ حالت ہے کہ اس میں سخت عذاب ہے (جس سے بچنے کی انتہائی کوشش ہونا چاہئے) اور خدا تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے (جس کے حاصل کرنے کی کوشش اس کی شان کے مناسب ہونا چاہئے۔ اور یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ) دنیا کی زندگی دھوکہ کا سامان ہے (جب دنیا کی یہ حالت ہے اور آخرت کی یہ کیفیت، تو سعادت کی بات یہ ہے کہ) تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو (اور اس کی شان کے مناسب کوشش کرو اور نہایت اہتمام سے دوڑو) ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین کی وسعت کے برابر ہے۔ جو ایسے لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل و احسان ہے وہ جس کو چاہتا ہے اپنے فضل سے نواز دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ شانہ بہت زیادہ فضل والے ہیں۔“ (مگر کوئی اس کے فضل سے حصہ لینا بھی چاہے) (سورۃ حدید: آیت ۱۹ تا ۲۱)

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ بچہ جب اس کو کچھ بھی سمجھ شروع ہوتی ہے تو وہ لہو و لعب کی طرف مشغول ہوتا ہے اور اس کے اندر اس کا ایسا جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کے مقابلہ میں اس کو کوئی چیز اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ پھر اس کے بعد جب وہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو اس میں زیب و زینت، اچھے کپڑوں کا پہننا، گھوڑے وغیرہ کی سواری کا شوق پیدا ہوتا ہے جس کے سامنے لہو و لعب کی لذت بھی لغو ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس میں جوانی کی لذتوں کا زور

ہوتا ہے۔ شہوت پوری کرنے کے مقابلہ میں اس کی نگاہ میں کوئی چیز نہیں رہتی۔ نہ مال و متاع کی وقعت رہتی ہے نہ عزت و آبرو کی۔ اس کے بعد پھر اس میں بڑائی اور تفاخر اور ریاست کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جو پہلے جذبوں پر غالب آجاتا ہے۔ یہ سب دنیاوی لذات ہیں۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کی معرفت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جس کے مقابلہ میں ہر چیز لغو بن جاتی ہے۔ یہی اصل جذبہ ہے جو سب سے زیادہ قوی ہے۔ پس ابتدائی زمانہ میں کھیل کود کی رغبت ہوتی ہے اور بلوغ کے شروع میں شہوت کا زور ہوتا ہے۔ بیس سال کی عمر کے بعد سے ریاست کا جذبہ شروع ہوتا ہے اور چالیس سال کی عمر کے قریب سے علوم اور معرفت کا جذبہ شروع ہوتا ہے۔ جیسا کہ بچپن میں بچہ کھیل کے مقابلہ میں عورتوں کے اختلاط اور ریاست کو لغو سمجھتا ہے، اسی طرح یہ دنیا دار ان لوگوں پر ہنستے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی معرفت میں مشغول ہوتے ہیں اور یہ اللہ والے سمجھتے ہیں کہ یہ بچے ہیں، بلوغ کے لطف کو جانتے ہی نہیں۔ (احیاء) اس آیت شریفہ میں دنیوی لذات کی سب انواع کو ذکر فرما کر اس پر تنبیہ فرمائی کہ ساری ہی لذتیں دھوکہ ہیں اور کام آنے والی صرف آخرت اور آخرت کی زندگی ہے۔ دنیا کی ساری لذتیں اس کھیتی کی طرح ہیں جو لہلہا کر خشک ہو جائے۔ پھر اُس کو ہوا اڑا کر فنا کر دے۔

میری امت کا فتنہ مال ہے اس بارے میں احادیث مبارکہ!

(عَنْ كَعْبِ بْنِ عِيَاضٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ لِكُلِّ أُمَّةٍ فِتْنَةً وَفِتْنَةُ أُمَّتِي الْمَالُ)

”حضرت کعبؓ فرماتے ہیں میں نے حضور اقدس ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر امت کے لئے ایک فتنہ ہوتا ہے (جس میں مبتلا ہو کر وہ فتنہ میں پڑ جاتی ہے) میری امت کا فتنہ مال ہے۔“ (مشکوٰۃ)

ف: حضور اقدس ﷺ کا پاک ارشاد بالکل ہی حق ہے، کوئی اعتقادی چیز نہیں ہے۔ روزمرہ کے مشاہدہ کی چیز ہے کہ مال کی کثرت سے جتنی آوارگی، عیاشی، سود خوری، زنا کاری، سینما بینی، جو بازی، ظلم و ستم، لوگوں کو حقیر سمجھنا، اللہ کے دین سے غافل ہونا، عبادات میں تساہل، دین کے کاموں کے لئے وقت نہ ملنا وغیرہ وغیرہ ہوتے ہیں، ناداری میں ان کا تہائی چوتھائی بلکہ دسواں حصہ بھی نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ایک مثل مشہور ہے ”زر نیست عشق ٹیں ٹیں“ پیسہ پاس نہ ہو تو پھر بازاری عشق بھی زبانی جمع خرچ ہی رہ جاتا ہے۔ اور یہ چیزیں نہ بھی ہوں تو کم سے کم درجہ مال کی بڑھوتری کی ہر وقت فکر، تو کہیں گئی ہی نہیں۔ صرف تین ہزار روپیہ کسی کو دے دیجئے، پھر جو ہر وقت اس کو کسی کام میں لگا کر بڑھانے کا فکر دامن گیر ہوگا تو کہاں کا سونا، کہاں کا راحت و آرام، کیسی نماز

روزہ، کیساج، زکوٰۃ، اب دن بھر، رات بھر دکان کے بڑھانے کی فکر ہے۔ دکان کی مشغولی نہ کسی دینی کام میں شرکت کی اجازت دیتی ہے، نہ دین کے لئے کہیں باہر جانے کا وقت ملتا ہے کہ دکان کا حرج ہو جائے گا۔ ہر وقت یہ فکر سوار کہ کونسا کاروبار ایسا ہے جس میں نفع زیادہ اور کام چلتا ہوا ہو۔ اسی لئے حضور اقدس ﷺ کا پاک ارشاد جو کئی حدیثوں میں آیا ہے کہ اگر کسی آدمی کے لئے دو وادیاں (دو جنگل) مال کی حاصل ہو جائیں تو وہ تیسری کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ آدمی کا پیٹ (قبر کی) مٹی ہی بھر سکتی ہے (مشکوٰۃ) ایک حدیث میں ہے، کہ اگر آدمی کے لئے ایک وادی مال کی ہو تو دوسری کو تلاش کرتا ہے اور دوہوں تو تیسری تلاش کرتا ہے۔ آدمی کا پیٹ مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھرتی۔

ایک حدیث میں ہے کہ آدمی کے لئے ایک جنگل کھجوروں کا ہو تو دوسرے کی تمنا کرتا ہے اور دوہوں تو تیسرے کی اور اسی طرح تمنا نہیں کرتا رہتا ہے۔ اس کا پیٹ مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھرتی۔ (کنز)

ایک حدیث میں ہے کہ اگر آدمی کو ایک وادی سونے کی دے دی جائے تو وہ دوسری کو تلاش کرتا ہے اور دوہوں تو تیسری کو تلاش کرتا ہے۔ آدمی کا پیٹ مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھر سکتی (بخاری)۔ مٹی سے بھرنے کا مطلب یہ ہے کہ قبر کی مٹی میں جا کر ہی وہ اپنی اس ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيدٍ﴾ کی خواہش سے رک سکتا ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے ہر وقت اس پر اضافہ اور زیادتی کی فکر رہتی ہے۔ ایک کارخانہ اچھی طرح چل رہا ہے اس میں بقدر ضرورت آمدنی ہو رہی ہے، کہیں کوئی دوسری چیز سامنے آگئی اس میں بھی اپنی ٹانگ اڑادی۔ ایک سے دو ہو گئیں، دو سے تین ہو گئیں۔ غرض جتنی آمدنی بڑھتی جائے گی، اس کو مزید کاروبار میں لگانے کی فکر رہے گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ اس پر قناعت کرے کہ کچھ وقت اللہ کی یاد میں مشغولی کا نکل آئے۔

بخاری شریف کی حدیث میں ہے۔ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ خدا کی قسم مجھے تمہارے اوپر تمہارے فقر و فاقہ کا خوف نہیں ہے بلکہ اس کا خوف ہے کہ تم پر دنیا کی وسعت ہو جائے جیسا کہ تم سے پہلی اُمتوں پر ہو چکی ہے۔ پھر تمہارا اس میں دل لگنے لگے جیسا کہ اُن کا لگنے لگا تھا۔ پس یہ چیز تمہیں بھی ہلاک کر دے جیسا کہ پہلی اُمتوں کو کر چکی ہے۔ (مشکوٰۃ)

### مال خود سے ناپاک اور عیب کی چیز نہیں!

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات میں مختلف عنوانات سے مختلف قسم کی تنبیہات سے مال کی کثرت اور اُس کے فتنہ پر متنبہ فرمایا۔ اس لئے نہیں کہ مال فی حد ذاتہ کوئی ناپاک یا عیب کی چیز ہے، بلکہ اس وجہ سے کہ ہم



لوگوں کے قلوب کے فساد کی وجہ سے بہت جلد ہمارے دلوں میں مال کی وجہ سے تعفن اور بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص اس کی مضرتوں سے بچتے ہوئے، اس کی زیادتی سے احتراز کرتے ہوئے شرائط کے ساتھ اس کو استعمال کرے تو مضرتیں بلکہ مفید ہو جاتا ہے لیکن چونکہ عام طور سے نہ شرائط کی رعایت ہوتی ہے نہ اصلاح کی فکر ہوتی ہے اس بنا پر یہ اپنا اثر بہت جلد پیدا کر دیتا ہے۔

اس کی بہترین مثال ہیضہ کے زمانہ میں امروہ کا کھانا ہے کہ فی حد ذاته امروہ کے اندر کوئی عیب نہیں۔ اس کے جو فوائد ہیں وہ اب بھی اس میں موجود ہیں لیکن ہوا کے فساد کی وجہ سے اس کے استعمال سے، بالخصوص کثرت استعمال سے بہت جلد اس میں تغیر پیدا ہو کر مضرت اور ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے علی العموم ڈاکٹر ہیضہ کے زمانہ میں امروہ کی سختی سے ممانعت کر دیتے ہیں۔ ٹوکری کے ٹوکری ضائع کر دیتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اگر معمولی حکیم یا ڈاکٹر کسی چیز کو مضرت بتاتا ہے تو طبعاً ہمارے قلوب اس سے ڈرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹروں کے ان اعلانات کے بعد اچھے اچھے سو ماؤں کی ہمت امروہ کھانے کی نہیں رہتی۔ لیکن وہ ہستی جس کے جوتوں کی خاک تک بھی کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں پہنچ سکتا۔ جس کی تجویزات نور نبوت سے مستفاد ہیں، اس کے اعلان، اس کی تجویز پر ذرا بھی خوف پیدا نہ ہو؟ حضور اقدس ﷺ جب بار بار اس کے فتنوں اور اس کی مضرتوں پر تنبیہ فرما رہے ہیں تو یقیناً ہر شخص کو بہت زیادہ اس کی مضرتوں سے ڈرتے رہنا چاہئے۔ اس کے استعمال کے لئے شرعی قوانین کے ماتحت جو اس کے لئے ایسے ہیں جیسا کہ امروہ کے لئے نمک مرچ لیموں وغیرہ مصلحات ہیں۔ ان کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہئے۔ اللہ کے حقوق کی ادائیگی کی بہت زیادہ فکر کرتے رہنا چاہئے۔ خود حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ غنی میں اس شخص کے لئے نقصان نہیں جو اللہ سے ڈرتا رہے۔ (مشکوٰۃ)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں فتوحات!

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں فتوحات کی کثرت سے عام طور پر ان حضرات کی مالی حالت اچھی ہو گئی دنیا اور ثروت ان کے جوتوں سے لپٹی تھی، یہ اس کو پھینکتے تھے اور وہ ان سے چمٹتی تھی لیکن اس سب کے باوجود اس کے ساتھ ان کی وابستگی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغولی کیا تھی ”فضائل نماز“ اور ”حکایات صحابہ رضی اللہ عنہم“ میں ان حضرات کے کچھ واقعات ذکر کئے گئے ہیں۔ ان کو عبرت اور غور سے دیکھو۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بہت زیادہ دولت کے باوجود جب نماز کو کھڑے ہوتے تو جیسے ایک کیل کہیں گاڑ دی ہو۔ سجدہ اتنا لمبا ہوتا کہ چڑیاں کمر پر آ کر بیٹھ جاتیں اور حرکت کا ذکر نہیں۔ جس زمانہ میں خود ان پر چڑھائی ہو رہی تھی اور ان پر گولہ باری ہو رہی تھی، نماز پڑھ رہے تھے۔



ایک گولہ مسجد کی دیوار پر لگا جس سے اس کا ایک حصہ گرا، اُن کی داڑھی کے پاس سے گزرا مگر اُن کو اس کا پتہ بھی نہ چلا۔ ایک صحابی ؓ کا باغ کھجوروں کا خوب پک رہا تھا، یہ اس باغ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز میں باغ کا خیال آ گیا۔ اس کا رنج اور صدمہ اس قدر ہوا کہ نماز کے بعد فوراً باغ کو حضرت عثمان ؓ کی خدمت میں، جو اس وقت امیر المؤمنین تھے پیش کر دیا۔ انہوں نے پچاس ہزار میں اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت دینی کاموں میں خرچ کر دی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں دو بوریاں درہم کی نذرانہ میں آئیں جن میں ایک لاکھ سے زیادہ درہم تھے۔ طباق منگا کر اور بھر بھر کر سب تقسیم کر دیں۔ افطار کے وقت جب باندی نے افسوس کیا کہ اگر ایک درہم کا گوشت منگا لیتیں تو آج ہم بھی گوشت سے کھانا کھا لیتے۔ تو فرمایا اب افسوس سے کیا ہوتا ہے، جب یاد دلادیتی تو میں منگا دیتی۔

یہاں ایک بات خاص طور سے قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ ان حضرات میں متمول صحابہ کرام ؓ کے ان احوال سے مال کی کثرت کے جواز پر استدلال تو ہو سکتا ہے کہ خیر القرون اور خلفائے راشدین ؓ کے دور میں یہ مثالیں بھی ملتی ہیں، لیکن ہم لوگوں کو اس زہر کے اپنے پاس رکھنے میں ان کی اتباع کو آڑ بنانا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی تپ دق کا بیمار کسی جوان، قوی تندرست کی اتباع میں روزانہ صحبت کیا کرے کہ وہ تین چار دن میں قبر کا گڑھا ہی دیکھے گا۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ مال بمنزلہ ایک سانپ کے ہے جس میں زہر بھی ہے اور تریاق بھی ہے اور اس کے فوائد بمنزلہ تریاق کے ہیں اور اس کے نقصانات بمنزلہ زہر کے، جو اس کے فوائد اور نقصانات سے واقف ہو جائے وہ اس پر قادر ہو سکتا ہے کہ اس کے فوائد حاصل کرے اور نقصانات سے محفوظ رہے۔ اس میں فوائد تو دو قسم کے ہیں دنیوی اور دینی۔ دنیوی فوائد تو ہر شخص جانتا ہے، انہی کی وجہ سے سارا جہان اس کے کمانے میں مر مٹ رہا ہے۔

دینی فوائد تین ہیں۔ اول یہ کہ بواسطہ یا بلا واسطہ عبادت کا سبب ہے۔ بلا واسطہ تو جیسے حج، جہاد وغیرہ کہ یہ روپیہ ہی سے ہو سکتے ہیں۔ اور بواسطہ یہ کہ اپنے کھانے پینے اور ضروریات میں خرچ کرے، کہ یہ ضرورتیں اگر پوری نہ ہوں تو آدمی کا دل ادھر مشغول رہتا ہے جس کی وجہ سے دینی مشاغل میں اشتغال کا وقت نہیں ملتا۔ اور جب یہ بواسطہ عبادت کا ذریعہ ہے تو خود بھی عبادت ہوا۔ لیکن صرف اتنی ہی مقدار جس سے دینی مشاغل میں اعانت ملے۔ اس سے زیادہ مقدار اس میں داخل نہیں۔

دوسرا دینی فائدہ اس کو کسی دوسرے پر خرچ کرنے کے متعلق ہے اور یہ چار قسم پر ہے۔

(الف) صدقہ جو غرباء پر کیا جائے۔ اس کے فضائل بے شمار ہیں۔ جیسا کہ پہلے گزر چکے۔

(ب) مروت جو اغنیاء پر دعوت، ہدیہ وغیرہ میں خرچ کیا جائے کہ وہ صدقہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ صدقہ فقراء پر ہوتا ہے۔ یہ قسم بھی دینی فوائد لئے ہوئے ہے کہ اس سے آپس کے تعلقات قوی ہوتے ہیں، سخاوت کی بہترین عادت پیدا ہوتی ہے۔ بہت سی احادیث ہدایا اور کھانا کھلانے کے فضائل میں وارد ہوئی ہیں اس قسم میں ان لوگوں کے فقر کی قید نہیں ہے جن پر خرچ کیا جائے۔

(ج) اپنی آبرو کا تحفظ یعنی مال کا ایسی جگہ خرچ کرنا، جس میں اگر خرچ نہ کیا جائے تو کمینے لوگوں کی طرف سے بدگوئی، فحش وغیرہ مضرتوں کا اندیشہ ہے۔ یہ بھی صدقہ کے حکم میں آجاتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ آدمی اپنی آبرو کی حفاظت کے لئے جو خرچ کرتا ہے، وہ بھی صدقہ کرتا ہے۔

(د) مزدوروں کی اجرت دینا کہ آدمی بہت سے کام خود اپنے ہاتھ سے نہیں کر سکتا اور بعض کام ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو آدمی خود تو کر سکتا ہے۔ لیکن ان میں بہت ساعزیز وقت صرف ہوتا ہے۔ اگر ان کاموں کو اجرت پر کرا لے، تو اپنا یہ وقت علم و عمل، ذکر و فکر وغیرہ ایسے امور میں خرچ ہو سکتا ہے جن میں دوسرا نایب نہیں ہو سکتا۔ تیسرا دینی فائدہ عمومی اخراجات خیر ہیں۔ جن میں کسی دوسرے معین شخص پر تو خرچ نہیں کیا جاتا کہ یہ دوسرے نمبر میں گزر چکے ہیں۔ البتہ عمومی فوائد اس سے حاصل ہوتے ہیں جیسا مساجد کا بنانا، مسافر خانے، پل وغیرہ بنانا، مدارس، شفا خانے وغیرہ ایسی چیزیں بنانا، جو اپنے مرنے کے بعد بھی اُن کے اجر و ثواب اور ان سے فوائد حاصل کرنے والے صلحاء کی دعائیں پہنچتی رہیں۔

یہ تو اجمال ہے اس کے فوائد کا اور سارے فوائد جو اس سے حاصل ہو سکتے ہیں، وہ ان میں آگئے۔ حضرت اقدس شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں، (جو کہ ان میں آگئے)۔ سات طرح سے عبارت ہے۔ (۱) زکوٰۃ، جس میں عشر بھی داخل ہے۔ (۲) صدقہ فطر۔ (۳) نفل خیرات، جس میں مہمانی بھی داخل ہے اور قرضداروں کی اعانت بھی۔ (۴) وقف، مساجد، سرائے، پل وغیرہ بنانا۔ (۵) حج فرض ہو یا نفل یا کسی دوسرے کی حج میں مدد ہو، توشہ سے یا سواری سے۔ (۶) جہاد میں خرچ کرنا کہ ایک درہم اس میں سات سو درہم کے برابر ہے۔ (۷) جن کے اخراجات اپنے ذمہ ہیں، اُن کو ادا کرنا جیسا کہ بیوی کا اور چھوٹی اولاد کا خرچ ہے اور اپنی وسعت کے بعد محتاج رشتہ داروں کا خرچ وغیرہ۔ (تفسیر عزیزی)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مال کے نقصانات بھی دو قسم کے ہیں، دینی اور دنیوی۔ دینی نقصانات تین قسم پر ہیں۔

(الف) معاصی کی کثرت کا سبب ہوتا ہے کہ آدمی اکثر و بیشتر اسی کی وجہ سے شہوتوں میں مبتلا ہوتا ہے اور ناداری اور فقر ان کی طرف متوجہ بھی نہیں ہونے دیتا۔ جب آدمی کو کسی معصیت کے حصول سے ناامیدی ہوتی ہے تو دل اس طرف زیادہ متوجہ بھی نہیں ہوتا اور جب اپنے کو اس پر قادر سمجھتا ہے تو کثرت سے ادھر توجہ رہتی ہے اور مال، قدرت کے بڑے اسباب میں سے ہے۔ اسی وجہ سے مال کا فتنہ فقر کے فتنہ سے بڑھا ہوا ہے۔

(ب) جائز چیزوں میں تنعم کی کثرت کا سبب ہے، اچھے سے اچھا کھانا، اچھے سے اچھا لباس وغیرہ۔ بھلا مالدار سے یہ کب ہو سکتا ہے کہ جو کی روٹی کھائے اور موٹا کپڑا پہنے۔ اور ان تنعمات کا حال یہ ہے کہ ایک چیز دوسرے کو کھینچتی ہیں اور شدہ شدہ اخراجات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور آمدنی جب ان کو کافی نہیں ہوتی تو ناجائز طریقوں سے مال حاصل کرنے کی فکریں پیدا ہونے لگتی ہیں اور جھوٹ نفاق وغیرہ بری عادات کی بنیاد اسی سے پڑتی ہے کہ مال کی کثرت کی وجہ سے ملاقاتی بھی کثیر ہوں گے اور ان کے تعلقات کی بقا اور حفاظت کے واسطے اس قسم کے امور کثرت سے پیدا ہوں گے اور تعلقات کی کثرت میں بغض و عداوت، حسد، کینہ وغیرہ امور طریفین میں کثرت سے پیدا ہوں گے۔ اور ایسے بے انتہا عوارض آدمی کے ساتھ لگ جائیں گے جن سے مال کے ہوتے ہوئے خلاصی دشوار ہے۔ اور غور کرنے سے یہ مضرتیں وسیع پیمانہ پر پہنچ جاتی ہیں اور ان سب کا پیدا ہونا مال ہی کے سبب سے ہوتا ہے۔

(ج) اور کم سے کم اس بات سے تو کوئی بھی مال دار خالی نہیں ہو سکتا کہ اس کا دل مال کی صلاح و فلاح کے خیال میں اللہ کے ذکر و فکر سے غافل رہے گا اور جو چیز اللہ جل شانہ سے غافل کر دے وہ خسارہ ہے۔ اسی واسطے حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ مال میں تین آفتیں ہیں۔ اول یہ کہ ناجائز طریقہ سے کمایا جاتا ہے۔ کسی نے عرض کیا کہ اگر جائز طریقہ سے حاصل ہو، تو آپ نے فرمایا کہ بے جگہ خرچ ہوتا ہے۔ کسی نے عرض کیا اگر اپنے محل ہی پر خرچ کیا جائے، تو آپ نے فرمایا کہ اس کی اصلاح کی فکر اللہ جل شانہ سے تو مشغول کر ہی دے گی اور یہ علاج بیماری ہے کہ ساری عبادات کا لب لباب اور مغز اللہ جل شانہ کا ذکر و فکر ہے۔ اور اس کے لئے فارغ دل کی ضرورت ہے۔ اور صاحب جائداد شخص دن بھر، رات بھر کاشتکاروں کے جھگڑوں کی سوچ میں رہتا ہے۔ ان سے وصولی کے حساب کتاب میں رہتا ہے۔ شریکوں کے معاملات کی فکر میں رہتا ہے۔ کہیں ان کے حصوں کا جھگڑا ہے، ان سے پانی کی بانٹ پر جھگڑا ہے، کہیں ڈول بندیوں میں لڑائی ہے اور حکام اور ان کے اہلچلیوں کا قصہ علیحدہ ہر وقت کا ہے، نوکروں مزدوروں کی خبر گیری ان کے کام کی نگرانی ایک مستقل مشغلہ ہے۔ اسی

طرح تاجر کا حال ہے کہ اگر شرکت میں تجارت ہو تو شرکاء کی حرکتیں ہر وقت کی ایک مستقل مصیبت اور مستقل مشغلہ ہے اور تنہا تجارت ہو تو نفع کے بڑھانے کی فکر، ہر وقت اپنی محنت میں کوتاہی کا خیال، تجارت میں نقصان کی فکر، ایسے امور ہیں جو ہر وقت مسلط رہتے ہیں۔ مشاغل کے اعتبار سے سب سے کم وہ خزانہ ہے جو نقد کی صورت میں اپنے پاس ہو، لیکن اس کی حفاظت اور اضاعت کا اندیشہ، چوروں کا فکر اور اس کے خرچ کرنے کے مصارف کا فکر، اور جن لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف لگی رہتی ہیں اُن کا خیال، ایسے تفکرات ہیں کہ جن کی کوئی انتہا نہیں ہے اور یہی وہ سب دنیوی مضرات ہیں جو مال کے ساتھ لگی رہتی ہیں اور جس کے پاس بقدر ضرورت ہو وہ ان سب افکار سے فارغ۔

لنگی زیر لنگی بالا  
نے غم و زود، نے غم کالا

”ایک لنگی نیچے ایک لنگی اوپر، نہ چور کا ڈرنہ پونجی کا۔“ (کہ اس کی کس طرح حفاظت کروں، روز افزوں اخراجات کس طرح پورے کروں) پس مال کا تریاق اس میں سے بقدر ضرورت اپنے ذاتی مصارف میں خرچ کرنے کے بعد جو کچھ بچے، اس کو خیر کے مصارف میں خرچ کر دینا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے، وہ زہری زہر ہے، آفت ہی آفت ہے۔ اس کی مثال بالکل سانپ کی سی ہے کہ جو لوگ اس کے پکڑنے کے ماہر ہیں، اس کے طریقوں سے واقف ہیں، اُن کے لئے اس کے پکڑنے میں کوئی نقصان نہیں، بلکہ وہ اس سے تریاق بنا سکتے ہیں اور دوسرے فوائد حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن کوئی ناواقف ان ماہروں کی حرص کر کے سانپ کو پکڑے گا تو ہلاک ہوگا۔ اسی طرح متمول صحابہ کرام ؓ کی حرص کر کے ہم لوگ اگر اس زہر کا استعمال کثرت سے کریں تو ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور ان حضرات کرام ؓ کے متعلق محض اعتقادی بات نہیں، اُن کی زندگی کا ایک واقعہ اس کی کھلی شہادت دیتا ہے کہ ان کے یہاں اس کی وقعت ایندھن سے زیادہ نہ تھی، ان کے لئے اس کا وجود حق تعالیٰ شانہ سے ذرا سی توجہ بھی ہٹانے والا نہ تھا اور اس کے باوجود اس سے ڈرتے تھے جیسا کہ اُن کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے۔

مال کی مثال دیتے ہوئے حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

”مال میں نفع بھی ہے اور نقصان بھی ہے۔ اس کی مثال سانپ کی سی ہے کہ جو شخص اس کا منتر جانتا ہے وہ سانپ کو پکڑ کر اس کے دانت نکال دیتا ہے۔ پھر اس سے تریاق تیار کرتا ہے، اور اس کو دیکھ کر ناواقف شخص محفوظ رہ سکتا ہے بشرطیکہ جو پانچ چیزوں کا اہتمام کرے۔ (۱) یہ غور کرے کہ مال کا مقصد کیا ہے۔ کس غرض سے یہ

پیدا کیا گیا۔ تاکہ صرف وہی غرض اس سے وابستہ رکھی جائے۔ (۲) مال کے آنے اور حاصل کرنے کے طریق کی سختی سے نگرانی کرے، کہیں اس میں ناجائز طریقہ شامل نہ ہو جائے مثلاً ایسا ہدیہ جس میں رشوت کا شائبہ ہو، یا ایسا سوال جس میں ذلت کا اندیشہ ہو۔ (۳) حاجت کی مقدار سے زائد اپنے پاس نہ رہنے دے۔ جتنی مقدار کی واقعی ضرورت ہے وہ تو مجبوری ہے اس سے زیادہ کو فوراً خرچ کر دے۔ (۴) خرچ کے طریق کی نگرانی کرے کہیں بے محل خرچ نہ ہو جائے، ناجائز موقع پر خرچ نہ ہو جائے۔ (۵) مال کی آمد میں، خرچ میں، اور بقدر ضرورت روکنے میں، ہر چیز میں نیت خالص رہے۔ محض اللہ کی رضا مقصود ہو جو رکھے یا استعمال میں لاوے وہ محض اس نیت سے کہ اس سے اللہ کی اطاعت میں قوت ہو، جو ضرورت سے زائد ہو اس کو لغو و بے کار سمجھ کر جلد خرچ کر دے۔ اس کو ذلیل سمجھ کر خرچ کرے۔ وقوع نہ سمجھے۔ ان شرائط کے ساتھ مال کا ہونا مضرب نہیں ہے۔ اسی لئے حضرت علیؓ کا ارشاد ہے۔ اگر کوئی شخص ساری دنیا کا مال محض اللہ تعالیٰ کے واسطے لیتا ہے (اپنی غرض سے نہیں) تو وہ زاہد ہے۔ اور اگر بالکل ذرا سا بھی نہیں لیتا اور یہ نہ لینا اللہ کے واسطے نہیں ہے (بلکہ کسی دنیوی غرض حب جاہ وغیرہ کی وجہ سے ہے) تو وہ دنیا دار ہے۔ (احیاء)“

غرض بہت سی روایات میں یہ مضمون وارد ہوا ہے کہ مال فی حد ذاته بری چیز نہیں ہے اچھی چیز ہے۔ کارآمد ہے اور بہت سے دینی اور دنیوی فوائد اس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اسی لئے روزی کے کمانے کی، مال کے حاصل کرنے کی ترغیبات بھی احادیث میں وارد ہوئی ہیں۔ لیکن چونکہ اس میں ایک زہریلا اور مسمی مادہ ہے اور قلوب عام طور سے بیمار ہیں۔ اس لئے کثرت سے قرآن پاک کی آیات اور احادیث شریفہ میں اس کی زیادتی اور کثرت سے بچنے کی ترغیبیں آئی ہیں۔ مال کی کثرت سے عموماً نقصانات زیادہ پہنچتے ہیں۔ اور یہ اس وجہ سے ہے کہ ہمارے قلوب ایسے صاف نہیں ہیں کہ وہ اس کے نشہ سے متاثر نہ ہوں۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ کا پاک ارشاد ہے کہ تم میں سے کوئی شخص ایسا ہے جو پانی پر چلے اور اس کے پاؤں پانی میں تر نہ ہوں؟ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ایسا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہی حال دنیا دار کا ہے کہ اُس کا گناہوں سے بچنا مشکل ہے (مشکوٰۃ)۔ اور مشاہدہ بھی یہی ہے کہ بخل، حسد، کبر، عجب، کینہ، ریا، تفاخر وغیرہ قلبی امراض اور گناہ جتنے ہیں وہ مال کی وجہ سے بہت جلد اور بہت کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح آوارگی، شراب نوشی، قمار بازی، سود خواری وغیرہ اور مختلف قسم کے سوہانی گناہ بھی اس کی وجہ سے بہت کثرت سے ہوتے ہیں۔ اور پھر اس کی طبعی محبت قلوب میں اس درجہ جگہ پکڑے ہوئے ہے کہ آدمی کے پاس جتنا بھی مال زیادہ سے زیادہ ہو جائے، اس پر ہمیشہ

زیادتی کا طالب اور اس کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ اور تجربہ ہے کہ کوئی شخص کسی مقدار پر بھی قناعت کرنے والا نہیں ہے الا ماشاء اللہ۔ اسی وجہ سے قرآن پاک اور احادیث میں کثرت سے قناعت کی ترغیبات دی گئی ہیں کہ یہ جو عالبقر کچھ کم ہو۔ اسی وجہ سے دنیا کی حقیقت اور اس کی گندگی اور ناپائیداری واضح کی گئی کہ اس سے محبت میں کمی ہو، کہ جو چیز ہے بہر حال بہت جلد زائل ہونے والی ہے اس سے آدمی کیا دل لگائے۔ دل لگانے کی چیز صرف وہی ہے جو ہمیشہ رہنے والی اور ہمیشہ کام آنے والی ہو اور اسی وجہ سے صبر کی تاکید اور ترغیب کثرت سے وارد ہوئی کہ آدمی اس کی کمی کو مطلقاً مصیبت نہ سمجھے، بلکہ اس میں بھی بسا اوقات اللہ کی بڑی حکمتیں مضمر ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا پاک ارشاد ہے:

﴿وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ﴾

”اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں رزق کی زیادتی (وسعت) فرمادے تو لوگ زمین میں سرکشی شروع

کردیں۔“ (سورہ شوریٰ: ۲۷)

چنانچہ تجربہ بھی یہی ہے کہ جہاں اس کی کثرت ہے وہیں حد سے زیادہ فسادات ہیں اور چونکہ اس کی فراوانی مقصود نہیں اور لوگوں کے دل اس کی طرف طبعاً متوجہ ہوتے ہیں، اسی وجہ سے سوال کرنے کی ممانعت، اس کی قباحت کثرت سے ذکر کی گئی، کہ آدمی مال کی محبت اور کثرت کی فکر میں بلا مجبوری بھی سوال کرنے لگتا ہے کہ اس میں محنت تو کچھ کرنی نہیں پڑتی، ذرا سی زبان ہلانے سے کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے، جس سے مال میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

**اللہ تعالیٰ کی بندگی سے قلبی غنی حاصل ہوتا ہے!**

( عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ص قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى يَقُولُ ابْنُ آدَمَ

تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِي أَمْلاً صَدَرَكْ غِنًى وَأَسَدُ فَقْرِكَ وَإِنْ لَا تَفْعَلْ مَلَأْتُ يَدَكَ شُغْلًا وَلَمْ أَسَدُ فَقْرِكَ )

”حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ شانہ عم نوالہ کا فرمان ہے کہ اے آدم کی اولاد! تو میری عبادت

کے لئے فارغ ہو جا۔ میں تیرے سینہ کو غنا سے پر کر دوں گا اور تیرے فقر کو زائل کر دوں گا اور اگر تو ایسا نہیں کرے گا

تو میں تجھے مشاغل میں پھانس دوں گا اور تیرا فقر زائل نہیں کروں گا۔“ (رواہ احمد وابن ماجہ کذا فی

المشکوٰۃ۔ وزاد فی الترغیب الترمذی وابن حبان والحاکم صححه وفی الباب عن عمران وغیرہ

فی الترغیب)

ف: متعدد احادیث میں مختلف الفاظ سے یہ مضمون وارد ہوا ہے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جو شخص ہمہ تن اللہ جل شانہ کی طرف متوجہ ہو جائے، اُسی کا بن جائے تو حق تعالیٰ شانہ، اُس کی ہر ضرورت کو خود پورا فرماتے ہیں اور ایسی جگہ سے اُس کو روزی عطا فرماتے ہیں کہ اُس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور جو شخص دنیا کے پیچھے پڑ جاتا ہے، اُسی کی فکر میں ہر وقت رہتا ہے، حق تعالیٰ شانہ اُس کو دنیا کے حوالے کر دیتے ہیں کہ تو دنیا سے بٹ لے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جس شخص کی پوری توجہ اور آخری مقصد دنیا کمانا ہو، اسی کے لئے سفر کرتا ہے، اُسی کا خیال دل میں رہتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ فقر و فاقہ (کا خوف) اس کی آنکھ کے سامنے کر دیتے ہیں (ہر وقت اس سے ڈرتا رہتا ہے کہ آمدنی تو بہت کم ہے کیا ہوگا۔ کیونکر گزر چلے گا) اور اس کے اوقات کو (اسی فکر و تردد میں) پریشان کر دیتے ہیں۔ اور ملتا اتنا ہی ہے جتنا کہ مقدر ہوتا ہے۔ اور جس شخص کی توجہ اور حقیقی مقصد آخرت ہوتی ہے، اُسی کے کاموں کے لئے سفر کرتا ہے اسی کا خیال دل میں رہتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ (دنیا سے بے نیازی اور بے فکری اور) استغناء اُس کے سامنے کر دیتے ہیں اور اس کے احوال کو مجتمع کر دیتے ہیں۔ اور دنیا خود بخود ذلیل ہو کر اُس کے پاس آتی ہے۔ (ترغیب)

خود بخود ذلیل ہو کر آنے کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز مقدر ہے وہ تو آ کر رہے گی۔ اس لئے کہ بہت سی احادیث میں یہ مضمون گزر چکا ہے کہ روزی خود آدمی کو ایسے تلاش کرتی ہے جیسے کہ موت آدمی کو تلاش کرتی ہے۔ جب وہ خود اس کی تلاش میں ہے، اس کے پاس آنے پر مجبور ہے اور اس کی طرف سے استغناء ہے تو وہ بہر حال اس کے پاس آ کر رہے گی۔ اس سے زیادہ ذلت کیا ہوگی کہ وہ خود اس کے پاس آئے اور یہ لا پرواہی برتے۔

ایک اور حدیث شریف میں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد خیف (منیٰ کی مسجد) میں وعظ فرمایا۔ اس میں حمد و ثناء کے بعد ارشاد فرمایا کہ جس شخص کا مقصد دنیا بن جائے، حق تعالیٰ شانہ اس کے احوال کو پریشان اور منتشر کر دیتے ہیں اور فقر (کا خوف) ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اور دنیا تو جتنی مقدر ہے اس سے زیادہ ملتی نہیں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جو شخص دنیا کے پیچھے پڑ جائے اُس کا حق تعالیٰ شانہ سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور جس کو مسلمانوں کی (ان کی بھلائی کا، خیر خواہی کا) فکر نہ ہو، اس کو مسلمانوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور جو (دنیوی اغراض کے لئے) اپنے آپ کو خوشی سے ذلیل کرے اُس کا ہم سے کوئی تعلق



نہیں) محض چار پیسے کے واسطے یا کسی اور دنیوی غرض کے لئے اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے ذلیل کرنا، یقیناً اپنی قدر و قیمت کا نہ پہچانا ہے۔ اور اپنے اُن بزرگوں کے نام کو دھبہ لگانا ہے جن کی طرف اپنی نسبت ہے اور سب سے اونچی نسبت فخر الرسل کی امت میں ہونا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضور اقدس ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ چار چیزیں بد بختی کی علامت ہیں:

آنکھوں کا خشک ہونا (کہ اللہ کے خوف سے کسی وقت بھی آنسو نہ ٹپکے) دل کا سخت ہونا (کہ اپنی آخرت کے لئے یا کسی دوسرے کے لئے کسی وقت بھی نرم نہ پڑے) آرزوؤں کا لمبا ہونا اور دنیا کی حرص۔ (ترغیب)

جو شخص دنیا سے محبت رکھتا ہے وہ اپنی آخرت کو تباہ و برباد کرتا ہے!

(عَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ أَحَبَّ دُنْيَاهُ أَضَرَّ بِآخِرَتِهِ وَمَنْ أَحَبَّ آخِرَتَهُ أَضَرَّ بِدُنْيَاهُ فَاتَرَوْا مَا يَنْفَعُنِي عَلَى مَا يَنْفَعُنِي)

”حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص دنیا سے محبت رکھتا ہے وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچاتا ہے، اور جو اپنی آخرت سے محبت رکھتا ہے وہ (صورت کے اعتبار سے) دنیا کو نقصان پہنچاتا ہے۔ پس (جب یہ ضابطہ ہے تو) جو چیز ہمیشہ رہنے والی ہے (یعنی آخرت) اس کو ترجیح دو، اس چیز پر، جو بہر حال فنا ہو جانے والی ہے۔“ (مشکوٰۃ)

ف: دنیا کی زندگی چاہے کتنی ہی زیادہ ہو جائے، بہر حال ختم ہونے والی ہے اور اس کا مال و متاع چاہے کتنا ہی زیادہ سے زیادہ ہو جائے ایک دن چھوٹے والا ہے۔ موت سے چھوٹ جائے چاہے ضائع ہو جانے سے چھوٹ جائے۔ اور آخرت کی زندگی کبھی بھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ اس کی نعمتیں ہمیشہ، ہمیشہ رہنے والی ہیں۔ ایسی حالت میں کھلی ہوئی بات ہے کہ آدمی میں اگر ذرا سی بھی عقل ہو تو ایسی چیز کو اختیار کرے جو ہمیشہ اپنے پاس رہے گی۔ ایسی چیز کے پیچھے پڑنا جو کسی طرح بھی اپنے پاس ہمیشہ نہیں رہ سکتی، بے وقوفی کی انتہا ہے۔ مگر ہم لوگوں کی عقل پر غفلت کا پردہ پڑا ہوتا ہے۔ اس اسٹیشن کے ویٹنگ روم کی زیب و زینت پر دل لگائے بیٹھے ہیں اور قیام صرف اتنا ہے کہ جب ریل گاڑی آجائے، اس پر سوار ہو جانا ہے۔ اتنے ذرا سے وقت میں اگر آدمی اپنے سفر کی تیاری میں مصروف رہے، اپنے سامان سفر کو تیار کر لے، جو چیزیں وطن میں پہنچ کر کام آنے والی ہیں اُن کو فراہم کر لے تو یقیناً اس کے لئے کارآمد ہیں اور اگر وہ اپنا یہ قیمتی وقت اور تھوڑی سی فرصت وہاں کے سیر سپاٹے میں خرچ کر دے، اپنا سامان بکھر اڑا رہے اور خود ویٹنگ روم کی صفائی اور اس کے فرنیچر کو قرینہ سے رکھنے میں لگ جاوے یا اس سے بڑھ کر حماقت یہ کرے کہ اس میں لٹکانے کے واسطے آئینے اور نقشے خریدنے میں لگ جائے تو اپنا سامان

بھی کھوئے گا اور اپنی متاع بھی ضائع کرے گا۔

اس حدیث پاک میں دنیا سے محبت نہ کرنے پر تنبیہ ہے کہ محبت ایسی سخت چیز ہے کہ جس کے ساتھ بھی لگ جائے، رفتہ رفتہ آدمی کو اُسی کا بنادیتی ہے۔ اسی لئے آخرت کے ساتھ محبت پیدا کرنے کی ترغیب فرمائی ہے اور دنیا سے ترک محبت پر تنبیہ ہے کہ دنیا سے محبت رکھنے والا اگرچہ آخرت کے اعمال اس وقت کرتا ہو لیکن اس ناپاک دنیا کی محبت رنگ لائے بغیر نہ رہے گی اور آہستہ آہستہ آخرت کے کاموں میں تساہل اور حرج اور نقصان پیدا کر دے گی۔ بزرگوں کا ارشاد ہے کہ جو شخص دنیا کو محبوب رکھتا ہے، سارے پیر و مرشد مل کر بھی اس کو ہدایت نہیں کر سکتے۔ اور جو شخص دنیا کو ترک کر دیتا ہے (اُس سے نفرت کرتا ہے) اُس کو سارے مفسد مل کر بھی گمراہ نہیں کر سکتے۔ (مظاہر حق)

حضرت براءؓ، حضور اقدس ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جو شخص دنیا میں اپنی شہوتوں کو پورا کرتا ہے وہ آخرت میں اپنی خواہشات کے پورا کرنے سے محروم ہوتا ہے۔ اور جو شخص دنیا میں ناز پروردہ (رئیس) لوگوں کی زیب و زینت کی طرف (الچائی ہوئی) آنکھوں سے دیکھتا ہے وہ آسمانوں کی بادشاہت میں ذلیل سمجھا جاتا ہے اور جو شخص کم سے کم روزی پر صبر و تحمل کرتا ہے وہ جنت الفردوس میں اعلیٰ ٹھکانا پکڑتا ہے۔ (درمنثور)

حضرت انسؓ، حضور اقدس ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ کا کلمہ اللہ کی ناراضی سے بندوں کو محفوظ رکھتا ہے جب تک کہ دنیا کی تجارت کو آخرت کی تجارت پر ترجیح نہ دیں۔ اور جب دنیا کی تجارت کو آخرت کی تجارت پر ترجیح دینے لگیں، پھر لا الہ الا اللہ کہیں تو یہ کلمہ اُن پر یہ کہہ کر لوٹا دیا جاتا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ (یعنی تمہارا اقرار جھوٹا ہے، محض زبانی جمع خرچ ہے)

ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ دنیا اُس شخص کا گھر ہے جس کا (آخرت میں) گھر نہیں۔ اور دنیا اُس شخص کا مال ہے جس کا (آخرت میں) مال نہیں۔ اور دنیا کے لئے وہ شخص مال جمع کرتا ہے جس کو بالکل عقل نہیں ہے۔ (درمنثور)

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ دنیا خود ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے وہ سب ملعون ہے بجز اس کے کہ جو حق تعالیٰ شانہ کے لئے ہو۔ (جامع الصغیر)

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ بعض لوگ قیامت کے دن اتنے زیادہ اعمال لے کر آئیں گے جیسا کہ ملک عرب کے پہاڑ، لیکن وہ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے کسی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! کیا یہ لوگ نمازی ہوں گے؟ حضور

ﷺ نے فرمایا۔ نمازی بھی ہوں گے، روزہ دار بھی ہوں گے بلکہ تہجد گزار ہوں گے لیکن جب دنیا کی کوئی چیز (دولت عزت وغیرہ) اُن کے سامنے آجائے تو ایک دم اس پر کود پڑتے ہیں (جائز ناجائز کی بھی پروا نہیں کرتے)۔

### حضرت لقمان علیہ السلام کی نصیحت!

بیٹا جاہل سے دوستی نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ اس کی جہالت کی باتیں تمہیں اچھی معلوم ہونے لگیں اور حکیم سے دشمنی مول نہ لو ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے اعراض کرنے لگے (اور پھر اُس کی حکمتوں سے تم محروم ہو جاؤ) بیٹا اپنا کھانا متقی لوگوں کے سوا کسی کو نہ کھلاؤ۔ (۱) دنیا میں اپنے آپ کو فقط اتنا ہی مشغول رکھنا جتنی زندگی باقی ہے (اور وہ آخرت کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں)۔ (۲) حق تعالیٰ شانہ کی طرف جتنی تمہیں احتیاج ہے اتنی ہی اس کی عبادت کرنا (اور ظاہر ہے کہ آدمی ہر چیز میں اسی کا محتاج ہے)۔ (۳) آخرت کے لئے اس مقدار کے موافق تیاری کرنا جتنی مقدار وہاں قیام کا ارادہ ہو (اور ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد تو وہاں کے علاوہ کوئی مقام ہی نہیں)۔ (۴) جب تک تمہیں جہنم سے خلاصی کا یقین نہ ہو جائے اس وقت تک اس سے خلاصی کی کوشش کرتے رہنا۔ (ظاہر ہے کہ جب کوئی کسی سنگین مقدمہ میں ماخوذ ہو تو جب تک اس کو مقدمہ کے خارج ہو جانے کا یقین نہ ہو، ہر وقت کوشش میں لگا رہتا ہے)۔ (۵) گناہوں پر اتنی جرأت کرنا جتنا جہنم کی آگ میں جلنے کا حوصلہ اور ہمت ہو (کہ گناہوں کی سزائے عذاب کی چیز ہے اور مر احم خسروانہ کی خبر نہیں)۔ (۶) جب کوئی گناہ کرنا چاہو، ایسی جگہ تلاش کر لینا جہاں حق تعالیٰ شانہ اور اس کے فرشتے نہ دیکھیں (کہ خود حاکم کے سامنے، سی ڈی کے عمل کے سامنے بغاوت کا انجام معلوم ہے)۔ (تنبیہ الغافلین)

یہ چند نصائح حضرت لقمان علیہ السلام کی مبعاً ذکر کر دی گئیں۔ مقصود ان کی نصائح میں سے بھی وہی مضمون ہے جو پہلے سے میں لکھ رہا تھا۔ کہ جو شخص دنیا سے محبت رکھتا ہے وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچاتا ہے۔

### دنیا حضرات اولیاء کرام کی نظر میں!

مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ تو جس قدر دنیا کا غم کرے گا اتنا ہی آخرت کا غم تیرے دل سے نکل جائے گا۔ اور جتنا تو آخرت کا غم کرے گا اتنا ہی دنیا کا غم تیرے دل سے نکل جائے گا۔ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو حق تعالیٰ شانہ کی بندگی کرنے کے باوجود صرف دنیا کی محبت نے بت پرستی تک پہنچا دیا تھا۔ اُن کا یہ بھی ارشاد ہے کہ آدمی اپنے مال کو تو ہمیشہ کم سمجھتا ہے مگر اپنے عمل کو کبھی کم نہیں سمجھتا۔ دین میں

کوئی مصیبت آجائے تو خوش رہتا ہے، دنیا میں کوئی مصیبت پیش آجائے تو گھبرا جاتا ہے۔  
حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ دنیا میں داخل ہونا تو بہت آسان ہے لیکن اس سے نکلنا بہت مشکل ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں تعجب ہے اس شخص پر جس کو موت کا یقین ہو کہ وہ بہر حال آنے والی ہے، نہ معلوم کب آجائے، پھر بھی کسی بات سے کیونکر خوش ہوتا ہے۔ تعجب ہے اس شخص پر جس کو اس کا یقین ہو کہ جہنم حق ہے (اور اپنا حشر معلوم نہیں) پھر کس طرح وہ کسی بات پر ہنستا ہے۔ تعجب ہے اس شخص پر جو دنیا کے ہر وقت کے انقلابات دیکھتا ہے، پھر کیسے دنیا کی کسی بات پر مطمئن ہوتا ہے تعجب ہے اُس شخص پر جس کو یقین ہے کہ تقدیر برحق ہے (جو کچھ مقدر میں ہے، وہ مل کر رہے گا) پھر کیوں مصیبتیں اٹھاتا ہے۔

وہب بن منہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جو شخص دنیا کی کسی چیز سے خوش ہوتا ہے وہ حکمت کے خلاف کرتا ہے۔ اور جو شخص شہوتوں کو اپنے قدم کے نیچے دبا لیتا ہے کہ اُن کو سر بھی نہیں اٹھانے دیتا، شیطان ایسے شخص کے سایہ سے بھی ڈرتا ہے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک دینی بھائی کو نصیحت فرمائی کہ دنیا ایسا کچڑ ہے جس میں پاؤں پھسل جاتے ہیں (لہذا بیچ بیچ کر قدم رکھنا چاہئے اور پاؤں کی لغزش سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہئے) دنیا ذلت کا گھر ہے۔ اس کی آبادی کا منتہا، بربادی ہے۔ اس میں رہنے والوں کو تنہا قبروں تک جانا ہے۔ اس کا اجتماع، افتراق پر موقوف ہے۔ اس کی وسعت فقر کی طرف لوٹا دی گئی۔ اس کی کثرت مشقت میں پڑنا اور اس کی تنگی سہولت میں پہنچنا ہے۔ پس ہمہ تن اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف متوجہ رہو۔ اور اللہ جل شانہ نے جتنا رزق عطا فرمادیا، اس پر راضی رہو۔ اپنی آخرت میں سے دنیا کے لئے قرض نہ لو۔ (یعنی ایسی چیزیں اختیار نہ کرو جن کا بدلہ آخرت میں ادا کرنا پڑ جائے۔ اور وہاں ضرورت کے موقع پر کمی پڑ جائے) اس لئے کہ یہاں کی زندگی بمنزلہ ایک سایہ کے ہے جو عنقریب ختم ہونے والا ہے۔ اور بمنزلہ ایک دیوار کے ہے جو جھک گئی اور عنقریب گرنے والی ہے۔ نیک عمل کثرت سے کرتے رہو اور اُمیدیں بہت کم باندھو۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص سے دریافت کیا کہ تمہیں اگر خواب میں کوئی شخص ایک درہم (ساڑھے تین آنے) دے، وہ زیادہ پسند ہے یا کوئی شخص تمہیں جاگنے کی حالت میں ایک دینار (اشرافی) دے وہ زیادہ پسند ہے۔ اُس نے عرض کیا کہ (یہ تو کھلی بات ہے) جاگتے ہوئے دینار زیادہ محبوب ہے۔ حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، کہ تم جھوٹ کہتے ہو۔ اس لئے کہ جس چیز کو تم دنیا میں محبوب رکھتے ہو، اس کو تم

گویا خواب میں پسند کر رہے ہو۔ اور آخرت کی جس چیز کو پسند نہیں کر رہے ہو، اس سے گویا جاگنے میں اعراض کر رہے ہو۔

یحییٰ بن معاذ کہتے ہیں کہ تین آدمی عقل مند ہیں۔ ایک وہ شخص جو دنیا کو اس سے پہلے خود چھوڑ دے کہ دنیا اس کو چھوڑے۔ دوسرا وہ شخص جو اپنی قبر کی تیاری اس سے پہلے کر لے کہ اُس میں داخل ہونے کا وقت آجائے۔ تیسرے وہ شخص جو اپنے مولیٰ کو اس سے پہلے پہلے راضی کر لے کہ اُس سے ملاقات کرے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ مذمت دنیا کی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ تمام تعریفیں اور حمد ایسی پاک ذات کے لئے ہیں جس نے اپنے دوستوں کو دنیا کے مہلکات اور اُس کی آفات سے واقف کر دیا اور دنیا کے عیوب اور اس کے رازوں کو اپنے دوستوں پر روشن کر دیا۔ یہاں تک کہ ان حضرات نے دنیا کے احوال کو پہچان لیا اور اس کی بھلائی اور برائی کا موازنہ کر کے یہ جان لیا کہ اس کی برائیاں اس کی بھلائی پر غالب ہیں اور جو امیدیں دنیا سے وابستہ ہیں وہ اُن اندیشہ ناک چیزوں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو اُس پر مرتب ہیں۔ دنیا ایک چٹ پٹی عورت کی طرح سے لوگوں کو اپنے حسن و جمال میں گرفتار کرتی ہے۔ اور اپنی بدکرداری سے اپنے وصال کے خواہشمندوں کو ہلاک کرتی ہے۔ یہ اپنے چاہنے والوں سے بھاگتی ہے، اُن کی طرف توجہ کرنے میں بڑی بخیل ہے۔ اور اگر متوجہ بھی ہوتی ہے تو اس کی توجہ میں بھی آفت اور مصیبت ہے امن نہیں ہے۔ اگر ایک دفعہ احسان کرتی ہے تو ایک سال تک برائیاں کراتی رہتی ہے۔ جو اس کے دھوکہ میں آجاتا ہے اس کا انجام ذلت ہے۔ اور جو اس کی وجہ سے تکبر کرتا ہے وہ آخر کار حسرت و افسوس کی طرف چلتا ہے۔ اس کی عادت اپنے عشاق سے بھاگنا ہے اور جو اُس سے بھاگے، اُس کے پیچھے پڑنا ہے۔ جو اس کی خدمت کرے اس سے علیحدہ رہتی ہے۔ اور جو اس سے اعراض کرے اس کی ملاقات کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی صفائی میں بھی تکدر ہے، اس کی خوشی میں بھی رنج و غم لازم ہیں۔ اس کی نعمتوں کا پھل حسرت و ندامت کے سوا کچھ نہیں۔ یہ بڑی دھوکہ دینے والی مکار عورت ہے۔ بڑی بھگورٹی اور ایک دم اُڑ جانے والی ہے۔ یہ اپنے چاہنے والوں کے لئے نہایت زیب و زینت اختیار کرتی ہے اور جب وہ اچھی طرح اس میں پھنس جاتے ہیں تو دانت دکھانے لگتی ہے اور اُن کے منظم احوال کو پریشان کر دیتی ہے اور اپنی نیرنگیاں اُن کو دکھاتی ہے، پھر اپنا زہر قاتل اُن کو چکھاتی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی دشمن ہے، اس کے دوستوں کی دشمن ہے۔ اُس (اللہ) کے دشمنوں کی دوست ہے اللہ تعالیٰ کی دشمنی اس طرح سے کہ اس کی طرف چلنے والوں کی رہزنی کرتی ہے۔ اس کے دوستوں کے ساتھ دشمنی اس طرح

کرتی ہے کہ اُن کے دل بھانے کے لئے طرح طرح کی زینتیں اپنے اوپر لادتی ہے جس سے وہ اس کی طرف ملتفت ہو کر اس سے قطع تعلق پر صبر کا کڑوا گھونٹ پیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے دوستی اس طرح کرتی ہے کہ اپنے مکرو فریب سے اُن کو شکار کرتی ہے۔ اور جب وہ اس کی دوستی پر بھروسہ کرنے لگتے ہیں تو یہ ایسے وقت اُن کو ایک دم اَدھر (لٹکی ہوئی) میں چھوڑ دیتی ہے جس وقت کہ وہ اس کے سخت محتاج ہوں، جس سے وہ دائمی حسرت اور دائمی عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

قرآن پاک کی آیات کریمہ اور احادیث شریفہ میں کثرت سے اس کی مذمت وارد ہوئی ہے۔ بلکہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت اسی پر تنبیہ کے لئے ہوئی ہے کہ اس سے دل نہ لگایا جائے۔ حضور اقدس ﷺ ایک مرتبہ ایک مردہ بکری کے پاس سے گزرے۔ حضور اقدس ﷺ نے صحابہ ﷺ سے خطاب فرما کر ارشاد فرمایا۔ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ اس مری ہوئی بکری کی کوئی وقعت اس کے مالک کے یہاں ہوگی؟ صحابہ ﷺ نے عرض کیا کہ اس کی بے وقعتی اسی سے معلوم ہوتی ہے کہ اس کو پھینک دیا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شانہ کے نزدیک دنیا اس سے بھی زیادہ ذلیل اور بے وقعت ہے جتنی یہ مردہ بکری اپنے مالک کے نزدیک ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ شانہ کے نزدیک دنیا کی وقعت ایک چھھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو اس میں سے ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ ملتا حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ دنیا کی محبت ہر خطا کی اساس اور بنیاد ہے۔

### دنیا کی محبت حضرات انبیاء علیہم السلام کی نظر میں!

حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ ایک حقیقی بات تم سے کہتا ہوں کہ جیسے بیمار آدمی کو تکلیف کی شدت کی وجہ سے کھانے میں لذت نہیں آتی، اسی طرح دنیا دار کو عبادت میں لذت نہیں آتی۔ اور جس طرح جانور پر اگر سواری کرنا چھوڑ دیا جائے تو اس سے اس کا مزاج سخت ہو جاتا ہے اور سواری کی عادت اس کو نہیں رہتی۔ اسی طرح اگر موت کے ذکر اور عبادت کی مشقت کے ساتھ دلوں کو نرم نہ کیا جائے تو وہ سخت ہو جاتے ہیں، ان میں قساوت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک حق بات کہتا ہوں کہ مشکیزہ جب تک پھٹے نہیں، وہ شہد (پانی وغیرہ) کا برتن بنتا ہے۔ لیکن جب وہ پھٹ جاتا ہے تو پھر شہد اس میں نہیں رکھا جاتا۔ اسی طرح دل کو جب تک شہوتوں سے پھاڑا نہ جائے یا طمع سے اس کو خراب نہ کیا جائے یا نعتوں سے اس کو سخت نہ کیا جائے تو وہ حکمت کا برتن بنتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ دنیا کی شہوتیں اس وقت بڑی لذیذ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن منتہا کے اعتبار سے موت کے وقت اتنی ہی مکروہ اور ناگوار ہوں گی۔

حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ دنیا کو اپنا سردار نہ بناؤ وہ تمہیں اپنا غلام بنا لے گی۔ اپنا خزانہ ایسی پاک ذات کے پاس محفوظ کر دو، جہاں ضائع ہونے کا اندیشہ نہیں ہے۔ دنیا کے خزانوں میں اضاعت کا اندیشہ ہر وقت ہے اور اللہ تعالیٰ شانہ کے خزانہ پر کوئی آفت نہیں ہے۔

حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ دنیا کی خباثت کے آثار میں سے یہ بات بھی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جاتی ہے۔ اور اس کی خباثت کی علامات میں سے یہ بھی ہے کہ آخرت اس کو چھوڑے بغیر نہیں ملتی۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ دنیا کی محبت ہر خطا کی جڑ ہے۔ اور تھوڑی دیر کی خواہش بہت طویل زمانہ کے رنج و عذاب کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

ان کا یہ بھی ارشاد ہے کہ دنیا بعضوں کی طالب ہوتی ہے، بعضوں کی مطلوب ہوتی ہے۔ جو آخرت کے طالب ہیں اُن کی تو یہ خود طالب ہوتی ہے کہ جھک مار کر اُن کی روزی اُن کو پہنچاتی ہے۔ اور جو اس کی طلب میں لگ جاتے ہیں آخرت اُن کو خود طلب نہیں کرتی حتیٰ کہ موت آ کر اُن کی گردن دبا لیتی ہے۔

حضرت سلیمان علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام ایک مرتبہ اپنے لشکر کے ساتھ تشریف لے جا رہے تھے۔ پرند اُن پر سایہ کئے ہوئے تھے۔ اور جن و انس دائیں بائیں تھے۔ ایک عابد پر گزرے۔ اُس نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے بہت بڑی سلطنت آپ کو عطا فرما رکھی ہے (کہ جن و انس، چرند و پرند سب پر آپ کی حکومت ہے) حضرت سلیمان علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ مسلمان کے اعمال نامہ میں ایک مرتبہ سبحان اللہ سلیمان کے سارے ملک سے زیادہ افضل ہے۔ اس لئے کہ یہ ساری سلطنت بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ اور سبحان اللہ کا ثواب ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

### حرص کی مذمت اور زہد و قناعت کی فضیلت!

مجھے بغیر محبت کی ستر برس کی عبادت سے زیادہ محبوب ہے۔ (احیاء)

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَزَالُ قَلْبُ الْكَبِيرِ شَائِبًا فِي النَّيْنِ فِي حُبِّ الدُّنْيَا وَطُولِ الْأَمَلِ.)

”حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ بوڑھے آدمی کا دل ہمیشہ دو چیزوں میں جوان رہتا ہے۔ ایک دنیا کی محبت

میں، دوسرے آرزوؤں اور اُمیدوں کے طویل ہونے میں۔“ (مشکوٰۃ)

ف: پہلی حدیث شریف کے ذیل میں مضمون تفصیل سے گزر چکا ہے کہ اصل دنیا جس کی برائی قرآن پاک



اور احادیث وغیرہ میں بہت کثرت سے آئی ہے، وہ مال کی محبت ہے۔ اس حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے اسی سلسلہ کی ایک خاص چیز پر تنبیہ فرمائی ہے۔ جو تجربہ میں بھی بہت صحیح ثابت ہوئی کہ بڑھاپے میں دنیا کی محبت اور لمبی لمبی اُمیدیں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ اور جتنا بھی مرنے کا زمانہ بڑھاپے کے لحاظ سے قریب آتا جاتا ہے اتنی ہی اولاد کی شادیوں کی اُمنگیں، اچھے اچھے مکانات تعمیر کرنے کا ولولہ، جائداد کے بڑھانے کا جذبہ وغیرہ وغیرہ زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے ایسی حالت میں آدمی کو اپنے نفس کی خاص طور سے نگہداشت کرنے کی ضرورت ہے۔

ایک اور حدیث میں حضور ﷺ کا پاک ارشاد ہے کہ آدمی بوڑھا ہوتا رہتا ہے اور دو چیزیں اس میں جوان ہوتی رہتی ہیں۔ ایک مال کی حرص، دوسری زیادہ عمر ہونے کی حرص۔ (مشکوٰۃ) زیادہ عمر ہونے کی حرص بھی وہی اُمیدوں کا طویل ہونا ہے کہ وہ مرنے کے قریب ہوتا جا رہا ہے لیکن مرنے کی تیاری کے بجائے دنیا میں ہمیشہ رہنے کی تیاری میں مشغول رہتا ہے۔ حضور ﷺ نے ایک مربع (چار لکیروں والی) شکل کھینچی اور اس کے درمیان میں ایک دوسری لکیر کھینچی۔ جو اس مربع شکل سے آگے نکلی چلی گئی۔ پھر اس مربع شکل کے اندر چھوٹی چھوٹی لکیریں بنائیں، جس کی صورت علماء نے مختلف لکھی ہے۔

پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ درمیانی لکیر تو آدمی ہے اور جو لکیر (مربع) اس کو چاروں طرف سے گھیر رہی ہے وہ اس کی موت ہے کہ آدمی اس سے نکل ہی نہیں سکتا اور جو لکیر باہر نکل رہی ہے وہ اس کی اُمیدیں ہیں کہ اپنی زندگی سے بھی آگے کی لگائے بیٹھا ہے۔ اور یہ چھوٹی چھوٹی لکیریں جو اس کے دونوں طرف ہیں وہ اس کی بیماریاں حوادث وغیرہ ہیں جو اس کی طرف متوجہ ہیں۔ ہر ایک چھوٹی لکیر ایک آفت ہے۔ اگر ایک سے بچ جائے تو دوسری مسلط ہے۔ اور موت کے اندر گھرا ہوا ہے کہ وہ تو چاروں طرف سے اس کو گھیرے ہوئے ہے۔ لیکن اُمید کی لکیر موت سے بھی آگے نکلی ہوئی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اپنے سر مبارک کے پچھلے حصہ پر اپنا دست مبارک رکھ کر فرمایا کہ یہ تو آدمی کی موت ہے جو اس کے سر پر ہر وقت سوار ہے۔ اور دوسرے ہاتھ کو دور تک پھیلا کر ارشاد فرمایا، کہ یہ دور تک اس کی اُمیدیں جا رہی ہیں۔

ایک حدیث میں حضور ﷺ کا پاک ارشاد ہے کہ اس اُمت کی بھلائی کی ابتداء آخرت کے یقین اور دنیا سے بے رغبتی کے ساتھ ہوئی ہے۔ اور اس کے فساد کی ابتداء مال کے نخل اور لمبی اُمیدوں سے ہوگی (مشکوٰۃ)۔ ایک اور

حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اس امت کے ابتدائی حصہ نے اللہ کے ساتھ یقین اور دنیا سے بے رغبتی کے ساتھ نجات پائی۔ اور اس کے آخری حصہ کی ہلاکت بخل اور امیدوں کی وجہ سے ہے۔ (ترغیب)

ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد وارد ہوا ہے کہ عنقریب ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ لوگ تمہارے (مسلمانوں کے) کھا جانے کے واسطے ایک دوسرے کو اس طرح دعوت دیں گے جیسا کہ دسترخوان پر بیٹھنے والا دوسرے کی تواضع کرتا ہے (کہ ہر قوم دوسروں کو اس کی ترغیب اور دعوت دے گی کہ ان مسلمانوں کو کسی طرح پہلے ہلاک کر دو) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ! کیا اس وقت ہماری تعداد بہت ہی کم ہوگی (جس کی وجہ سے کافروں کا یہ حوصلہ ہوں گا) حضور ﷺ نے فرمایا نہیں تمہاری تعداد اس زمانہ میں بہت زیادہ ہوگی لیکن تم لوگ اس زمانہ میں سیلاب کے جھاگ کی طرح سے (بالکل بے جان) ہو گے اور تمہارے دشمنوں کے دل سے تمہارا خوف جاتا رہے گا اور تمہارے اپنے دلوں میں ”وہن“ پیدا ہو جائے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! ”وہن“ کیا چیز ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ دنیا کی محبت اور موت سے ڈرنا۔ (مشکوٰۃ)

اُم ولید رضی اللہ عنہا (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی) فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ شام کے وقت اندر سے باہر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا۔ تم لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ! کیا بات ہوئی؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اتنی مقدار جمع کرتے ہو جتنا کھاتے نہیں ہو اور اتنے مکانات بنا لیتے ہو، جن میں رہتے بھی نہیں ہو اور ایسی امیدیں باندھ لیتے ہو جن کو پورا بھی نہیں کر سکتے۔ کیا ان باتوں سے تم شرماتے ہیں ہو۔ (ترغیب)

یعنی ضرورت سے زائد مکان بنالیتے ہو۔ مکان اتنا ہی بنانا چاہئے جتنے کی ضرورت ہو۔ اسی طرح خزانہ جمع کرتے جاتے ہو، جو اپنی حاجت سے زائد ہے وہ جمع کرنے کے لئے نہیں ہے، وہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے لئے ہے۔

### اللہ تعالیٰ سے حق حیا کرنا کیا ہے؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس ﷺ ایک مرتبہ منبر پر تشریف رکھتے تھے اور مجمع سامنے حلقہ بنائے ہوئے تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا لوگو! اللہ تعالیٰ شانہ سے ایسی شرم کرو جیسا کہ اس سے شرم کرنے کا حق ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! حق تعالیٰ شانہ سے تو ہم حیا کرتے ہی ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص تم میں سے حق تعالیٰ شانہ سے حیا کرے، اس کے لئے ضروری ہے کہ کوئی رات اس پر ایسی نہ گزرے کہ اس

کی موت اس کی آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ حفاظت کرے پیٹ کی اور اس چیز کی جس کو پیٹ نے گھیر رکھا ہے اور حفاظت کرے سر کی اور اس چیز کی جس کو سر نے گھیر رکھا ہے۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ موت کو یاد رکھے اور اپنی بوسیدگی کو (کہ مرنے کے بعد یہ بدن سارا کا سارا شکستہ ہو کر خاک ہو جائے گا) اور ضروری ہے کہ دنیا کی زینت کو چھوڑ دے۔ (ترغیب)

علماء نے لکھا ہے کہ سر کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کے علاوہ کسی کے سامنے نہ جھکے۔ نہ عبادت کے لئے نہ تعظیم کے لئے حتیٰ کہ جھک کر سلام بھی نہ کرے۔ اور جن چیزوں کو سر نے گھیر رکھا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ آنکھ، کان، زبان یہ سب چیزیں سر کے تحت میں داخل ہیں، ان سب کی حفاظت کرے۔ اسی طرح پیٹ کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ مشتبہ مال سے حفاظت کرے اور ”جس چیز کو پیٹ نے گھیر رکھا ہے“ سے مراد وہ چیزیں ہیں جو پیٹ کے قریب ہیں جیسے شرمگاہ ہاتھ پاؤں اور دل کہ ان سب چیزوں کی حفاظت کرے۔ امام نوویؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کو کثرت سے پڑھنا مستحب ہے۔ (مظاہر حق)

### دنیا کی حرص کا علاج موت کی یاد ہے!

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ لوگو! اللہ تعالیٰ شانہ سے ایسی حیا کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔ ہم نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم لوگ حق تعالیٰ شانہ سے سب کے سب حیا کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا نہیں، یہ معمولی حیا نہیں، بلکہ حق تعالیٰ سے حیا کا حق یہ ہے کہ آدمی سر کی حفاظت کرے اور اس چیز کی جس کو سر نے گھیر رکھا ہے۔ اور پیٹ کی حفاظت کرے اور ان چیزوں کی حفاظت کرے جن پر پیٹ حاوی ہو رہا ہے (شرمگاہ وغیرہ)۔ اور ضروری ہے کہ موت کو کثرت سے یاد رکھا کرے، اور شکستگی (مرنے کے بعد سب ٹوٹ پھوٹ کر خاک ہو جانے) کو یاد رکھا کرے۔ اور جو شخص آخرت کا ارادہ کرتا ہے وہ دنیا کی زینت کو چھوڑ دیتا ہے۔

چونکہ موت کو کثرت سے یاد کرنے کو دنیا سے بے رغبتی اور امیدوں کے اختصار میں بہت زیادہ دخل ہے۔ اسی وجہ سے حضور اقدس ﷺ نے موت کو کثرت سے یاد کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ! سب سے بڑا زہد کون شخص ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ جو موت کو اور اپنے مر، گل کر پانا ہو جانے کو نہ بھولے۔ اور دنیا کی زینتوں کو چھوڑ دے اور

آخرت کو دنیا پر ترجیح دے اور آئیوا لے کل کی زندگی کو یقینی نہ سمجھے اور اپنے آپ کو مردوں میں سمجھتا رہے کہ عنقریب مر کر اُن میں شامل ہو جاؤں گا۔ (ترغیب)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضور ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ ان لذتوں کو توڑنے والی چیز یعنی موت کو بہت کثرت سے یاد کیا کرو۔ جو شخص تنگی کی حالت میں اس کو یاد کرتا ہے تو یہ اُس پر وسعت اور سہولت کا سبب ہوتی ہے (یہ اطمینان ہوتا ہے کہ موت بہر حال آنے والی ہے اس سے ساری تکلیفوں کا خاتمہ ہے) اور جو شخص فراخ دستی میں اس کو یاد کرتا ہے اس کے لئے اخراجات میں تنگی کا سبب ہوتی ہے (کہ موت کی فکر سے زیادہ عیش و عشرت کو دل نہیں چاہتا)۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ مسجد میں تشریف لائے، تو بعض لوگوں کے ہنسی کی وجہ سے دانت کھل رہے تھے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم لذتوں کے توڑنے والی موت کو کثرت سے یاد کرتے تو وہ ان چیزوں میں مشغول ہونے سے روک دیتی جن سے ہنسی آئی۔ ہر شخص کی قبر روزانہ اعلان کرتی ہے کہ میں بالکل تنہائی کا گھر ہوں، میں سب سے علیحدہ رہنے کا گھر ہوں، میں کیڑوں کا گھر ہوں۔ جب نیک مؤمن دفن ہوتا ہے تو قبر اس سے کہتی ہے کہ تیرا آنا بڑا مبارک ہے تیرے آنے سے بڑی خوشی ہوئی۔ جتنے لوگ میری پشت پر چلتے تھے، اُن میں تو مجھے بہت پسند تھا۔ آج تو میری ماتحتی میں آیا ہے تو میں اپنا طرز عمل تجھے دکھاؤں گی۔ اس کے بعد وہ اتنی وسیع ہو جاتی ہے کہ جہاں تک مردہ کی نظر جائے وہاں تک زمین کھل جاتی ہے۔ اور ایک کھڑکی جنت میں کھل جاتی ہے۔ (جس سے وہاں کی خوشبوئیں، ہوائیں وغیرہ آتی رہتی ہیں)۔

اور جب کوئی بدکار کا فر دفن ہوتا ہے تو زمین اس سے کہتی ہے، کہ تیرا آنا بڑا مبارک ہے۔ تیرے آنے سے بہت جی بُرا ہوا۔ جتنے لوگ میری پشت پر چلتے تھے، تو ان میں مجھے بہت ہی برا لگتا تھا۔ آج تو میری ماتحتی میں آیا ہے، تو میں اپنا طرز عمل تجھے دکھاؤں گی۔ یہ کہہ کر وہ ایسی ملتی ہے (یعنی اس کو پھینکتی ہے) کہ مردہ کی ہڈیاں پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ میں ڈال کر بتایا کہ اس طرح ہڈیاں پسلیاں ایک جانب کی دوسری جانب میں گھس جاتی ہیں۔ اور ستر اڑدھا اس کو ڈسنا شروع کر دیتے ہیں اور وہ ایسے زہریلے ہوتے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی زمین کے اوپر پھونک مار دے، تو قیامت تک زمین پر گھاس اُگنا بند ہو جائے۔ یہ سب کے سب قیامت تک اس کو کاٹتے رہیں گے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا کہ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک

گڑھا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! سب سے زیادہ سمجھدار اور سب سے زیادہ محتاط آدمی کون ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص موت کو کثرت سے یاد رکھتا ہو اور موت کے لئے ہر وقت تیاری میں مشغول رہتا ہو۔ یہی لوگ ہیں جو دنیا کی شرافت اور آخرت کا اکرام حاصل کرنے والے ہیں۔ (ترغیب)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے میرا مونڈھا پکڑ کر ارشاد فرمایا کہ دنیا میں اس طرح زندگی گزار دو جیسا کہ کوئی مسافر، کوئی راستہ چلنے والا ہے اور ہر وقت اپنے آپ کو قبرستان والوں میں سمجھا کرو۔ اس کے بعد حضورؐ نے مجھ سے فرمایا۔ اے ابن عمر (اور بعض روایات میں ہے کہ یہ مقولہ ابن عمرؓ کا ہے) جب صبح ہو جائے تو شام تک کی زندگی کا یقین نہ کرو اور جب شام ہو جائے، تو صبح تک کی زندگی کی اُمید نہ باندھو۔ اپنی صحت کی حالت میں بیماری کے زمانہ کے لئے نیک عمل کر رکھو (کہ بیماری کے زمانہ میں جو کوتاہی ہو اس کا جبر پہلے سے ہو جائے یا صحت میں جن اعمال کا عادی ہوگا، بیماری کی وجہ سے اُن کے نہ ہو سکنے پر بھی ان کا ثواب ملتا رہے گا) اور اپنی موت کے لئے اپنی زندگی ہی میں تیاری کر لو، کل کو معلوم نہیں کہ تمہارا نام کیا ہو جائے (یعنی کن لوگوں میں شمار ہو جائے، نیک لوگوں میں، یا بد لوگوں میں فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَ سَعِيدٌ)

حضرت معاذؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! مجھے کچھ نصیحت فرمادیجئے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ شانہ کی عبادت اس طرح کیا کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، وہ تمہارے سامنے ہے۔ اور اپنے آپ کو ہر وقت مردوں کی فہرست میں شمار کیا کرو اور ہر پتھر اور درخت کے قریب اللہ تعالیٰ شانہ کا ذکر کیا کرو (تا کہ قیامت میں اس کی گواہی دینے والے بہت کثرت سے ہو جائیں) اور جب کوئی بری حرکت ہو جائے تو اس کی تلافی کے لئے کوئی نیک عمل کرو۔ اگر برائی چھپ کر کی ہے، تو اس کی تلافی میں نیک عمل بھی چھپ کر کرو اور برائی اعلانیہ ہوئی ہے تو اس کی توبہ اور تلافی بھی اعلانیہ کی جائے۔“

زائد اللہ تعالیٰ کو بھی محبوب ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی!

(عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ذَلَّنِي عَلَى عَمَلٍ إِذَا عَمِلْتُهُ أَحَبَّنِي اللَّهُ وَأَحَبَّنِي النَّاسُ قَالَ ارْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبُّكَ النَّاسُ.)

”ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسا عمل بتادیجئے جس سے اللہ جل شانہ بھی مجھ سے محبت

فرمادیں اور آدمی بھی مجھ سے محبت کرنے لگیں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دنیا سے بے رغبتی پیدا کر لو حق تعالیٰ شانہ تم کو محبوب رکھیں گے اور لوگوں کے پاس جو چیزیں ہیں (مال وغیرہ) اُن سے بے رغبتی پیدا کر لو، وہ بھی تم سے محبت کرنے لگیں گے۔“ (مشکوٰۃ)

ف: دنیا سے بے رغبتی پر حق تعالیٰ شانہ کی محبت، آخرت کا اعزاز و اکرام وغیرہ امور تو پہلی روایات میں بہت کثرت سے گزر رہی چکے ہیں۔

دوسرا مضمون کہ لوگوں کے اموال پر نگاہ نہ رکھی جائے، اسی سے اُن کے دلوں میں بھی محبت پیدا ہوتی ہے۔ بڑے تجربہ کی بات ہے۔ ہر شخص کو ہر وقت اس کا تجربہ ہوتا رہتا ہے۔ کہ جتنے بھی آپس میں بہترین تعلقات ہوں، لیکن جہاں کسی چیز کے سوال کا ذکر آجاتا ہے سارے ہی تعلقات اور عقیدتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابو خلاۃ رضی اللہ عنہ دونوں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جب تم کسی بندہ کو اس حال میں دیکھو کہ اس کو زہد اور کم بولنے کی صفت اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمائی ہے تو اس کے پاس اور اس کی صحبت میں رہا کرو کیونکہ جس بندہ کا یہ حال ہوتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکمت القا ہوتا ہے۔“ (بیہقی)

اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ دو حریص آدمیوں کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔ ایک وہ شخص جو علم کا حریص ہو (اس کو علمی چمک لگ گیا ہو، کسی وقت اس کا دل نہیں بھرتا) دوسرا وہ شخص جو مال کا حریص ہو۔ اور چونکہ آدمی کی جبلت میں یہ مہلک چیز ہے، اسی بناء پر حق تعالیٰ شانہ نے اور حضور اقدس ﷺ نے قناعت کی بڑی تعریف فرمائی ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ مبارک ہے وہ شخص جس کو حق تعالیٰ شانہ نے اسلام کی دولت سے نوازا ہو اور صرف ضرورت کے بقدر اس کی روزی ہو۔ اور وہ اس پر قانع ہو۔ حضور ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ قیامت کے دن کوئی شخص غریب ہو یا امیر، ایسا نہ ہوگا جو اس کی تمنا نہ کرتا ہو کہ کاش دنیا میں اس کو صرف ضرورت کے درجہ کی روزی ملتی، اس سے زیادہ نہ ملتی۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ نے طمع سے اور مال کمانے میں زیادہ کوشش کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ لوگو! مال کے حاصل کرنے میں اچھا طریقہ اختیار کیا کرو۔ (برے طریقوں سے نہ کماؤ) اس لئے کہ آدمی کو مقدر سے زیادہ تو ملتا نہیں اور جو مقدر ہے وہ بہر حال مل کر رہے گا۔ آدمی اُس وقت تک مر ہی نہیں سکتا، جب تک اس کا جو مقدر حصہ ہے وہ ذلیل اور مجبور ہو کر اس تک نہ پہنچ جائے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ تو متقی بن جا، سب سے بڑا عبادت کرنے والا ہو جائے گا اور (کم سے کم مقدار پر)

قناعت کرنے والا بن جا، تو سب سے زیادہ شکر گزار ہو جائے گا۔ اور اپنے بھائی کے لئے بھی اس چیز کو پسند کر، جس کو اپنے لئے پسند کرتا ہے تو کامل مؤمن بن جائے گا۔

حضرت ابو ایوب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ! مجھے مختصری نصیحت کر دیجئے (تاکہ میں اس کو مضبوط پکڑ لوں)۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ جب نماز پڑھو تو ایسی پڑھو جیسا کہ عمر کی آخری نماز یہی ہو (جب آدمی کو یہ خیال ہو جائے کہ یہ بالکل آخری نماز ہے تو پھر جس قدر زیادہ اہتمام اور خشوع و خضوع سے پڑھے گا وہ ظاہر ہے) اور کوئی ایسی بات زبان سے نہ نکالو، جس کی معذرت کرنا (اور معافی چاہنا) پڑے۔ اور اپنے دل کو یکے طور سے اس چیز سے مایوس کر لو جو دوسرے کے پاس ہو (کہ اس کی طرف ذرا سا بھی تمہیں التفات نہ ہو)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ طمع کرنا فقر (اور محتاجی) ہے اور نا اُمیدی غنا ہے جو شخص ایسی چیزوں سے نا اُمید ہو جائے جو دوسروں کے قبضہ میں ہیں وہ ان سے مستغنی رہتا ہے۔ ایک حکیم سے کسی نے پوچھا کہ غنا کیا چیز ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ تمناؤں کا کم کرنا اور جو اپنے لئے کافی ہو جائے اس پر خوش رہنا۔ محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ سوکھی روٹی کو پانی میں بھگو کر کھالیا کرتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے، کہ جو اس پر قناعت کر لے وہ کسی کا بھی محتاج نہیں۔

ایک حکیم سے کسی نے پوچھا۔ تمہاری مالیت کیا ہے؟ فرمانے لگے ظاہر میں خوشحال رہنا، باطن میں اختصار اور میانہ روی اختیار کرنا اور دوسروں کے پاس جو چیزیں ہیں، اُن سے اُمید نہ رکھنا۔

علم ضائع کرنے والی چیزیں!

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا علماء کے قلوب سے علم کو کیا چیز ضائع کر دیتی ہے۔ حالانکہ پڑھتے وقت انہوں نے سمجھ کر پڑھا تھا، اس کو یاد رکھا تھا۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ طمع اور حرص اور لوگوں سے اپنی حاجتوں کا مانگنا۔

کسی شخص نے حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت کعب رضی اللہ عنہ کے کلام کی شرح پوچھی۔ تو انہوں نے فرمایا کہ جب عالم کسی چیز کی طمع کرنے لگتا ہے تو اس کی طلب میں لگ جاتا ہے جس سے اس کا دین برباد ہو جاتا ہے (کہ اس کی طلب مشغولی، دین کی مشغولی کو کھودیتی ہے) اور حرص اُس کو ہر چیز کی طرف کھینچتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کا ہر چیز کو یہ دل چاہتا ہے کہ یہ بھی مجھے مل جائے یہ بھی مل جائے، پھر لوگوں سے اس کے پورا کرنے



کا طالب ہوتا ہے۔ جو شخص اس کی طلب کو پورا کر دیتا ہے اس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے اس کا مطیع ہونا پڑتا ہے، وہ جدھر چاہے کھینچ کر لے جائے۔ تمہیں جھک مار کر اُس کا کہنا ماننا پڑتا ہے۔ جب وہ گزرے تو اس کو سلام کرنا پڑتا ہے، بیمار ہو جائے تو عیادت کرنا پڑتی ہے اور یہ سلام اور عیادت اللہ کے واسطے نہیں ہوتی بلکہ دنیا کی محبت کی وجہ سے ہوتی ہے (اور جب دنیا کی وجہ سے ہوئی تو اس کا ثواب معلوم ہے) اس کے بعد حضرت فضیلؒ نے فرمایا: یہ حدیث (عمل کے لئے اور کارآمد ہونے کے لئے) سوحديثوں سے بڑھ کر ہے۔ (احیاء)

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں۔ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ! مجھے مختصر سی نصیحت فرما دیجئے (تاکہ میں اس کو مضبوط پکڑ لوں) حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو چیز دوسروں کے پاس ہے اس سے اپنے کو بالکل مایوس بنا لو۔ (ذرا بھی اس کی طرف التفات نہ کرو) اور طمع سے اپنے کو بالکل محفوظ رکھو۔ اس لئے کہ طمع فوری فقر ہے (یعنی اس چیز کی ضرورت تو جب ہوگی، لیکن اس کی طرف تو احتیاج ابھی سے ہوگی) اور اپنے آپ کو ایسی چیز سے بچاؤ جس کی معذرت کرنا پڑے۔ (ترغیب)

### حضور اقدس ﷺ کی طرز زندگی !

(عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ مَا شَبِعَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ خُبْزٍ شَعِيرٍ يَوْمَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ حَتَّى قَبِضَ.)

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے تمام عمر میں اپنی وفات تک کبھی جو کی روٹی بھی دو دن لگا تار پیٹ بھر کر نوش نہیں فرمائی۔“ (شمائل ترمذی)

ف: یہی حضور ﷺ کی زندگی تھی۔ دو چار حدیثوں میں نہیں سینکڑوں احادیث میں حضور اقدس ﷺ کی زندگی کا یہی نقشہ موجود ہے۔ آج مسلمانوں کے فقر و فاقہ کا اس قدر شور ہے کہ حد نہیں۔ مگر کتنے آدمی ایسے ہوں گے جن کی عمر بھر میں دو دن بھی پیٹ بھر کر معمولی روٹی نہ ملی ہو۔ شہل ہی کی ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کے سارے گھرانے کا یہی عمل نقل کرتی ہیں کہ حضور ﷺ کے گھر والوں نے حضور ﷺ کی وفات تک کبھی بھی دو دن لگا تار جو کی روٹی سے پیٹ نہیں بھرا۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ پر کئی کئی راتیں مسلسل ایسی گزر جاتی تھیں کہ حضور ﷺ کو اور حضور ﷺ کے گھر والوں کو شام کو کھانا میسر نہیں ہوتا تھا۔ رات بھر سب کے سب فاقہ سے رہتے تھے اور جو کی روٹی پر حضور ﷺ کا گزارہ تھا۔

حضرت سہل ؓ سے کسی نے پوچھا کہ حضور ﷺ کا معمول چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھانے کا تھا؟ حضرت سہل ؓ نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے وصال تک چھنے ہوئے آٹے کو دیکھا بھی نہ ہوگا۔ پھر اُس نے پوچھا۔ کیا حضور ﷺ کے زمانہ میں آپ حضرات کے یہاں چھلنیاں نہیں تھیں؟ حضرت سہل ؓ نے فرمایا کہ چھلنیوں کا دستور نہیں تھا۔ انہوں نے (تعجب سے) پوچھا کہ بغیر چھنے جو کے آٹے کو کیونکر کھاتے تھے؟ حضرت سہل ؓ نے فرمایا کہ آٹے (کو حرکت دے کر اس) میں پھونگ مار دیا کرتے تھے جس سے (موٹے موٹے) تینکے اڑ جاتے تھے، باقی کو پکالیا کرتے تھے (شمائل ترمذی)۔

فائدہ: آج گیتوں کی روٹی بغیر آٹا چھنے کی کھانا مشکل سمجھا جاتا ہے۔ یہ حضرات جو کے آٹے کی روٹی بغیر چھنے نوش فرماتے تھے۔ وہ بھی پیٹ بھر کر نہ ملتی تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب پیٹ بھر کر کھانا کھاتی ہوں تو میرا رونے کو (بے اختیار) دل چاہتا ہے۔ پس رونے لگتی ہوں۔ کسی نے عرض کیا۔ یہ کیا بات ہے؟ فرمانے لگیں، مجھے حضور ﷺ کا زمانہ یاد آ جاتا ہے، کہ گوشت سے یا روٹی سے کبھی بھی حضور اقدس ﷺ کو وصال تک دن میں دو مرتبہ پیٹ بھر کر تناول فرمانے کی نوبت نہیں آئی۔ (شمائل)

ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! آپ حق تعالیٰ شانہ سے روزی کی وسعت نہیں مانگ لیتے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں یہ کہہ کر اور حضور ﷺ کی بھوک کی شدت کو دیکھ کر رو پڑی۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عائشہ! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر میں اپنے رب سے یہ مانگوں کہ سونے کے پہاڑ میرے ساتھ ساتھ چلا کریں تو حق تعالیٰ شانہ ان کو بھی میرے ساتھ چلا دیں۔ لیکن میں نے دنیا میں بھوکا رہنے کو پیٹ بھرنے پر ترجیح دے رکھی ہے۔ میں نے دنیا کے فقر کو اس کی ثروت پر ترجیح دی ہے، میں نے دنیا کے غم کو اس کی خوشی پر ترجیح دی ہے۔ عائشہ! دنیا، محمد ﷺ اور اس کی آل کے لئے مناسب نہیں ہے۔ حق تعالیٰ شانہ نے اولوالعزم (یعنی ہمت والے اور اونچے درجہ کے) رسولوں کے لئے اسی کو پسند فرمایا ہے کہ دنیا کی تکلیفوں پر صبر کریں، دنیا کی راحتوں سے بچے رہیں۔ اور جو چیز ان کے لئے پسند فرمائی تھی اسی کا مجھے حکم ہے چنانچہ ارشاد ہے: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعِزِّمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ آپ بھی اسی طرح صبر کیجئے جس طرح اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا۔) میرے لئے اللہ کے حکم کی تعمیل کے سوا چارہ نہیں ہے۔ میں خدا کی قسم جہاں تک میری طاقت ہے ایسا ہی صبر کروں گا جیسا کہ انہوں نے کیا۔ اور طاقت تو اللہ تعالیٰ ہی کے دینے سے آتی ہے۔

### حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمرؓ کی طرز زندگی!

حدیث میں آیا ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں فتوحات کی کثرت بہت ہو گئی تو ان کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ اب تو آپ بھی جب دوسرے ملکوں کے قاصد آئیں تو باریک کپڑا پہن لیا کریں۔ اور کسی کو کھانا پکانے کا حکم فرمادیا کریں۔ تاکہ آپ ان لوگوں کو کھلائیں اور آپ بھی ان کے ساتھ کھالیا کریں۔ حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا۔ یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے کہ آدمی کے حالات سے اس کے گھر والے ہی اچھی طرح واقف ہوا کرتے ہیں۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا، بیشک۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ میں تم کو قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم نہیں کہ حضور اقدس ﷺ نبوت کے بعد اتنے سال زندہ رہے۔ اس زمانہ میں حضور اور حضور ﷺ کے گھر والے اگر رات کو کھانا نوش فرمالیتے تھے تو دن میں بھوکے رہتے تھے۔ اور دن میں کھالیتے تو رات کو بھوکے رہتے تھے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ نبوت کے بعد اتنے سال تک حضور ﷺ زندہ رہے لیکن حضور ﷺ نے اور ان کے گھر والوں نے خیبر کے فتح ہونے تک کبھی پیٹ بھر کر کھوریں بھی نہیں کھائیں۔ میں تم سے قسم دے کر پوچھتا ہوں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ایک مرتبہ تم نے اونچے خوان پر (میز کی طرح) کھانا رکھ دیا تھا تو حضور ﷺ کے چہرہ انور پر تغیر آ گیا تھا، یہاں تک کہ اس کو ہٹا کر زمین پر کھانا رکھا گیا (تب حضور ﷺ نے نوش فرمایا) میں تم سے قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم نہیں کہ حضور اپنی عبا (چادر کی ایک قسم) کو دوہرا کر کے اُس پر آرام فرمایا کرتے تھے۔ تم نے ایک مرتبہ اُس کو چوہرا (چار طے) کر کے بچھا دیا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم نے مجھے رات کے اٹھنے سے روکا (کہ چار طے ہو جانے سے بستر ازیم ہو گیا جس سے نیند اچھی طرح آگئی) اس کو دوہرا ہی کر دو جیسا کہ روزانہ ہوا کرتا تھا۔ میں تم سے قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم نہیں کہ حضور ﷺ اپنا کپڑا دھونے کے لئے بدن مبارک سے اتارتے اور اس کو دھوتے۔ ایسی حالت میں اگر بلال نماز کے لئے بلانے آجاتے تھے تو حضور ﷺ کے پاس دوسرا کپڑا نہ تھا جس کو پہن کر نماز پڑھاویں۔ حضور ﷺ اسی کو خشک کر کے پہن کر نماز پڑھایا کرتے تھے۔ میں تم سے قسم دے کر پوچھتا ہوں، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بنو ظفر کی ایک عورت نے حضور ﷺ کے لئے دو کپڑے تیار کئے۔ ایک لنگی ایک چادر۔ ان میں سے اُس نے ایک پہلے بھیج دیا، دوسرے کے بھیجنے میں دیر لگی۔ تو حضور ﷺ اسی کو بدن پر اس طرح لپیٹ کر کہ دونوں کونوں میں گردن پر گرہ لگالی تھی (کہ بدن کھل نہ جائے) پہن کر نماز کے لئے تشریف لے گئے۔ حضور ﷺ کے پاس دوسرا کپڑا نہ تھا جس کو پہن کر نماز کے لئے تشریف لے جاتے۔

اسی طرح اور واقعات گناتے رہے یہاں تک کہ ان واقعات کو یاد لا کر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو بھی رلایا اور خود بھی اتنے روئے کہ چیخیں مارنے لگے۔ ہمیں یہ اندیشہ ہوا کہ اس غم میں کہیں ان کی جان نہ نکل جائے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ میرے دورِ فتنہ تھے (حضور اقدسؐ اور حضرت ابوبکرؓ) وہ دونوں ایک ہی راستہ پر چلے۔ اگر میں اُن کا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کروں تو میرے ساتھ بھی وہ معاملہ نہیں کیا جائے گا جو اُن کے ساتھ کیا گیا۔ میں خدائے پاک کی قسم ان کی (دنیا کی) سخت زندگی پر اپنے آپ کو مجبور کروں گا تاکہ (آخرت کی) ان کی شاداب زندگی کو پاسکوں۔ (احیاء)

کم روزی اور اس پر قناعت حاصل کرنے کے لئے پانچ باتوں کا اہتمام!

(عَنْ عَلِيٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ رَضِيَ مِنَ اللَّهِ بِالْيُسْرِ مِنَ الرِّزْقِ رَضِيَ اللَّهُ مِنْهُ بِالْقَلِيلِ مِنَ الْعَمَلِ)

”حضور اقدسؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص حق تعالیٰ شانہ سے تھوڑی روزی پر راضی رہے، حق تعالیٰ شانہ بھی اس کی طرف سے تھوڑے عمل پر راضی ہو جاتے ہیں۔“ (مشکوٰۃ)

ف: اس حدیث پاک میں آمدنی کی کمی میں حق تعالیٰ شانہ کے ایک خاص احسان پر تنبیہ کی گئی ہے کہ اس صورت میں آدمی کی طرف سے اگر نیکیوں میں کمی ہوتی ہے، تو وہ مالک الملک بھی اس کمی کو بخوشی قبول فرما لیتے ہیں۔ اس کے بالمقابل جب اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے عطاء میں افراط ہو اور آدمی کسی چیز میں کمی کو بھی گوارا نہ کرے تو اس مالک کی طرف سے بھی یہی مطالبہ ہے کہ پھر اُس کے حقوق کی ادائیگی میں تمہاری طرف سے بھی افراط ہونا چاہئے۔ اور ظاہر ہے کہ جس ملازم کو تنخواہ منہ مانگی دی جائے پھر وہ اپنی منجھی خدمت میں کوتاہی کرے تو اس کی نمک حرامی میں کیا تردد ہے۔ لیکن ہمارا معاملہ اس کے برعکس ہے کہ غرباء کو تو اللہ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق بھی ہو جاتی ہے، ذکر اور نوافل کے لئے وقت بھی مل جاتا ہے، لیکن جہاں چار پیسے ہاتھ میں آئے یا اُن کے آنے کے اسباب پیدا ہوئے پھر فرض نمازوں کے واسطے بھی وقت نہیں ملتا۔ اور قلیل روزی پر قناعت تب حاصل ہو سکتی ہے جب آدمی پانچ باتوں کا اہتمام کرے:

(۱) اپنے اخراجات میں کمی کرے۔ ضرورت کی مقدار سے زیادہ خرچ نہ کرے۔ علماء نے لکھا ہے کہ تنہا آدمی ہو تو اس کو ایک جوڑا کافی ہے۔ کئی کئی جوڑے بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے ہی معمولی روٹی سالن پر گزر ہو سکتا ہے۔ حضور اقدسؐ کا ارشاد ہے کہ جو خرچ میں میانہ روی اختیار کرے وہ فقیر نہیں ہوتا۔

(۲) اگر بقدر ضرورت میسر ہو تو آئندہ کی فکر میں نہ پڑے۔ اور حق تعالیٰ شانہ کے وعدہ پر اعتماد کرے کہ حق تعالیٰ شانہ نے روزی کا ذمہ لے کے رکھا ہے۔ شیطان آدمی کو ہمیشہ آئندہ کی سوچ میں ڈالے رکھتا ہے کہ کچھ ذخیرہ فنڈ کے طور پر جمع رکھنا چاہیے آدمی کے ساتھ حرج بھی لگا ہوا ہے، بیماری بھی لگی ہوئی ہے، وقتی اخراجات بھی پیش آتے رہتے ہیں۔ پھر تجھے دقت اور مشقت ہوگی اور ان خیالات کی وجہ سے اس کو مشقت اور آئندہ کی فکر اور سوچ میں پریشان رکھتا ہے اور پھر آدمی کا مذاق اڑایا کرتا ہے کہ یہ بے وقوف آئندہ کی تکلیف کے ڈر سے جو موموم ہے اس وقت کی یقینی مشقت اور تکلیف اٹھا رہا ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ اپنے اوپر زیادہ غم سوار نہ کرو، جو مقدر ہے وہ ہو کر رہے گا اور جتنی روزی تمہاری ہے وہ آ کر رہے گی۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ شانہ اپنے مؤمن بندہ کو روزی اس جگہ سے عطا فرماتا ہے جہاں سے اس کا گمان بھی نہ ہو۔ اور قرآن پاک میں بھی یہ مضمون وارد ہے۔

(۳) اس امر میں غور کیا کرے کہ تھوڑے پر قناعت میں لوگوں سے استغناء کی کتنی بڑی عزت حاصل ہے اور حرص و طمع میں لوگوں کے سامنے کتنا ذلیل ہونا پڑتا ہے اس کو بہت اہتمام سے غور کیا کرے کہ اس کو ایک تکلیف ضرور برداشت کرنی ہے، یا لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ذلت کی یا اپنے نفس کو لذت چیزوں سے روکنے کی اور یہ دوسری تکلیف جو ہے اس پر اللہ کے یہاں ثواب کا وعدہ بھی ہے اور پہلی میں آخرت کا وبال ہے۔ اس کے علاوہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں آدمی اُن کو حق بات کہنے سے رک جاتا ہے۔ اکثر دین کے بارہ میں مداہنت کرنی پڑتی ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ آدمی کی عزت اُس کا لوگوں سے استغناء ہے۔ اسی وجہ سے مشہور مقولہ ہے کہ جس سے تو استغناء کرے تو اس کا ہمسر ہے (یعنی اسے دینے پر مجبور نہیں ہے) اور جس کی طرف احتیاج پیش کرے اس کا قیدی ہے۔ اور جس پر احسان کرے اس کا حاکم ہے۔

(۴) دنیا دار مالداروں کے انجام کو سوچا کرے۔ یہود، نصاریٰ اور بے دین ثروت والوں کا انجام سوچے، اور انبیاء اور اولیاء کا انجام سوچے۔ ان کے حالات کو غور سے پڑھے اور تحقیق کرے۔ پھر اپنے نفس سے پوچھے کہ اللہ کے مقرب لوگوں کی جماعت میں شریک ہونا پسند کرتا ہے یا حقوں اور بے دین لوگوں کی مشابہت پسند کرتا ہے۔

(۵) مال کے زیادہ ہونے میں جو خطرات پہلے بیان ہو چکے ہیں ان میں غور کیا کرے کہ کتنے مصائب اس کے ساتھ ہیں۔ جب آدمی ان پانچوں چیزوں کو غور کرتا رہے گا، تو تھوڑے پر قناعت آسان ہو جائے گی۔ (احیاء)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ حضور ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ وہ شخص فلاح کو پہنچ گیا جو مسلمان ہو اور تھوڑی روزی دیا گیا ہو اور حق تعالیٰ شانہ نے اس کو اسی پر قناعت عطا فرما رکھی ہو۔ حضرت فضالہ بن عبیدؓ حضور ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ مبارک ہے وہ شخص جس کو اسلام لانے کی توفیق ہو گئی ہو اور اس کی آمدنی بقدر ضرورت ہو اور اس پر وہ قانع ہو۔ (ترغیب)

حضرت ابوالدرداءؓ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جب بھی سورج نکلتا ہے اس کے دونوں جانب دو فرشتے روزانہ یہ اعلان کرتے ہیں۔ اے لوگو! اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ جو مال تھوڑا ہو اور وہ کفایت کر جائے وہ بہتر ہے اس کثیر مال سے جو اللہ تعالیٰ شانہ کے علاوہ دوسری طرف مشغول کرے۔

اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ناز و نعم میں لگنے والے نہیں ہوتے!

(عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ ص أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا بَعَثَ بِهِ إِلَى الْيَمَنِ قَالَ إِنَّا كُفَرْنَا وَالتَّعْنَمُ فَإِنَّ عِبَادَ اللَّهِ لَيَسُؤُنَا بِالْمُتَنَعِمِينَ.)

”حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ جب حضور اقدس ﷺ نے ان کو یمن (کا حاکم بنا کر) بھیجا تو یہ ارشاد فرمایا کہ اپنے آپ کو ناز و نعم میں پرورش کرنے سے بچاتے رہنا اس لئے کہ اللہ کے نیک بندے ناز و نعم میں لگنے والے نہیں ہوتے۔“ (مشکوٰۃ)

ف: حاکم اور گورنر ہو جانے کے بعد راحت و آرام کے اسباب کثرت سے مہیا ہو ہی جاتے ہیں۔ ہر قسم کی نعمتیں بھی آسانی سے میسر ہو جاتی ہیں۔ اس لئے حضور ﷺ نے جب کہ یہ حاکم بنا کر بھیجے جا رہے تھے۔ اس چیز سے بچنے کی خصوصی تنبیہ فرمائی۔ حضور ﷺ کے وصایا میں اسی طرح حضرات خلفائے راشدینؓ کے وصایا اور احکام میں اس چیز پر خاص طور سے تنبیہیں بڑی کثرت سے کی گئی ہیں۔

حضرت فضالہ بن عبیدؓ امیر معاویہؓ کی طرف سے مصر کے قاضی تھے۔ ان کی خدمت میں ایک صحابی کسی حدیث کی تحقیق کے لئے تشریف لے گئے انہوں نے جا کر دیکھا کہ قاضی صاحب کے بال بھی پراگندہ حال ہیں اور پاؤں بھی ننگے ہیں۔ انہوں نے دریافت کیا کہ تم اس زمین کے حاکم ہو۔ میں تمہارے بالوں کو بکھرا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ حضرت فضالہؓ نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے ہمیں زیب و زینت کی کثرت سے منع فرمایا تھا۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ میں تمہیں ننگے پاؤں دیکھ رہا ہوں حضرت فضالہؓ نے فرمایا کہ ہمیں حضور ﷺ کا یہ بھی ارشاد تھا کہ کبھی ننگے پاؤں بھی چلا کریں۔ عبداللہ بن مغفل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے بالوں میں روزانہ



کنگھا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد)

غنا، دل کا ہے نہ کہ مال و دولت کی کثرت!

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ الْغِنَى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلَكِنْ

الْغِنَى غِنَى النَّفْسِ .)

”حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ آدمی کا غنی ہونا مال کی کثرت سے نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقی غنا تو دل کا غنی ہونا ہے۔“

(مشکوٰۃ)

ف: مطلب حدیث پاک کا بالکل ظاہر ہے کہ اگر آدمی کا دل غنی نہیں ہے تو نصیب فرما دے اور یہی حقیقی زہد ہے۔ جس دل کے اندر مال کی محبت نہ ہو وہی غنی ہے، وہی زاہد ہے چاہے ظاہر میں اس کے پاس مال نہ ہو۔ اور جس دل میں دنیا کی محبت ہو وہ فقیر ہے وہ دنیا دار ہے چاہے کتنا ہی مال اس کے پاس ہو۔

فقیر ابو الیث رحمۃ اللہ علیہ ایک حکیم کا مقولہ نقل کرتے ہیں کہ ہم نے چار چیزیں تلاش کیں اور اُن کی تلاش کا غلط راستہ اختیار کیا۔ ہم نے غنا کو مال میں تلاش کیا حالانکہ وہ مال میں نہیں تھا بلکہ قناعت میں تھا۔ (ہم اس کو مال میں تلاش کرتے رہے۔ وہ جب وہاں تھا ہی نہیں تو کیسے ملتا) ہم نے راحت کو (جان و مال کی) کثرت میں تلاش کیا حالانکہ راحت ان کی کمی میں تھی۔ ہم نے اعزاز کو مخلوق میں تلاش کیا (کہ اُن کی خوشی کے اسباب اختیار کریں تاکہ اُن کے یہاں اعزاز ہو) مگر وہ تقویٰ میں ملا (اور بالکل صحیح ہے جس قدر آدمی میں تقویٰ زیادہ ہوگا اتنا ہی اس کا اعزاز زیادہ ہوگا) ہم نے اللہ کی نعمت کو کھانے اور پہننے میں تلاش کیا (اور یہ سمجھا کہ یہ اللہ کے بڑے انعامات ہیں) حالانکہ اللہ تعالیٰ شانہ کا بڑا انعام اسلام کی دولت اور گناہوں کی ستاری ہے (جس کو یہ دو نعمتیں حاصل ہیں اُس پر اللہ کا بڑا انعام ہے)۔

حضور ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا کہ جس شخص کا دنیا مقصد بن جائے حق تعالیٰ شانہ اس کے دل پر تین چیزیں مسلط کر دیتے ہیں۔ ایک ایسا غم جو کبھی ختم ہونے والا نہ ہو۔ اور ایسا مشغلہ جس سے فراغت نصیب نہ ہو اور ایسا فقر جس کا کبھی خاتمہ نہ ہو۔ (تنبیہ الغافلین)

حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب تم کسی ایسے شخص کو دیکھو جس کو حق تعالیٰ شانہ نے دنیا سے بے رغبتی اور

(مشکوٰۃ)

کم بولنا عطا فرمایا ہو تو اس کے پاس رہا کرو۔ اس کو حکمت دی گئی ہے۔

دنیا دار کے پاس جتنا مال بھی زیادہ ہو، وہ مال کے خرچ کرنے میں فقیروں سے زیادہ کم خرچ ہوگا اور جتنا بھی



مال اس کے پاس ہو وہ ہر وقت اس کے بڑھانے کی فکر میں محتاجوں سے زیادہ پریشان ہوگا۔ اور اگر اس کا دل غنی ہے تو تھوڑا سا مال بھی اس کو بے فکر رکھے گا۔ اور جتنا ہوگا اُس کے ہر وقت بڑھانے کی فکر سے آزاد ہوگا۔

امام راغب رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ غنا کئی معنی میں بولا جاتا ہے۔ ایک تو غنا کے معنی کسی قسم کی حاجت نہ ہونے کے ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے تو صرف حق تعالیٰ شانہ غنی ہے کہ اس کو کسی چیز کی احتیاج نہیں ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے: ﴿اَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ اِلَى اللّٰهِ ج وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾ ”تم سب کے سب اللہ تعالیٰ شانہ کے محتاج ہو، وہ پاک ذات بے احتیاج ہے، ہر قسم کی تعریف والا ہے۔“ دوسرے معنی حاجات کی کمی کے ہیں۔ اس معنی کے اعتبار سے حق تعالیٰ شانہ نے حضور ﷺ کے متعلق سورہ الضحیٰ میں ارشاد فرمایا: ﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰی﴾ ”اور حق تعالیٰ شانہ نے آپ کو فقیر پایا پھر آپ کو غنی بنا دیا۔“ اور اسی معنی کے اعتبار سے حضور اقدس ﷺ کا پاک ارشاد حدیث بالا میں ہے کہ اصل غنا دل کا غنی ہونا ہے۔ تیسرے معنی مال کی کثرت اور سامان کی فراوانی کے ہیں۔ جس کو قرآن پاک میں: ﴿يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ﴾ (بقرہ: ۲۷۳) میں ذکر فرمایا۔ اس آیت شریفہ کا مطلب یہ ہے کہ صدقات اصل حق ایسے لوگوں کا ہے جو اللہ کے راستہ میں گھر گئے ہوں اور نادانف آدمی اُن کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے اُن کو مالدار سمجھتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا۔ ابوذر! کیا تمہارا خیال ہے کہ مال کی کثرت غنا ہے؟ میں نے عرض کیا۔ بیشک۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ مال کی قلت فقر ہے؟ میں نے عرض کیا بیشک۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ غنا صرف دل کا غنا ہے اور فقر صرف دل کا فقر ہے۔ (ترغیب)

حقیقت یہی ہے کہ اصل غنا دل کا غنا ہے جس خوش قسمت کو حق تعالیٰ شانہ نصیب فرمادیں۔

دنیا کی چیزوں میں اپنے سے کم پر نظر رکھو تو قناعت اور شکر گزاری نصیب ہو جائیگی!

(عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا نَظَرَ أَحَدُكُمْ إِلَى مَنْ فَضَّلَ

عَلَيْهِ فِي الْمَالِ وَالْخَلْقِ فَلْيَنْظُرْ إِلَى مَنْ هُوَ أَسْفَلُ مِنْهُ.)

”حضور اقدس ﷺ کا پاک ارشاد ہے کہ جب آدمی کسی ایسے شخص کی طرف دیکھے جو مال میں یا صورت میں

اپنے سے اعلیٰ ہو تو ایسے شخص کی طرف بھی غور کر لے جو اُن چیزوں میں اپنے سے کم ہو۔“ (مشکوٰۃ)

ف: یعنی آدمی جب کسی لکھ پتی کو دیکھے اور اس کو دیکھ کر لپچائے اور افسوس کرے کہ یہ تو ایسا مال دار ہے، میں نہیں ہوں۔ تو کسی ایسے آدمی پر بھی غور کر لے جس کو ناداری کی وجہ سے فاقے کرنے پڑ رہے ہوں تاکہ پہلے افسوس کے ساتھ حق تعالیٰ شانہ کا اُس پر شکر ادا ہو سکے کہ اُس نے ایسا نہیں کر رکھا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ اپنے سے زیادہ مالداروں کی طرف نگاہیں نہ لے جایا کرو اپنے سے کم درجہ والوں کو سوچا کرو۔ اس سے اُس نعمت کی حقارت تمہارے دلوں میں نہیں ہوگی، جو اللہ جل شانہ نے تمہیں عطا کر رکھی ہے۔ (مشکوٰۃ)

حضرت ابو ذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے محبوب (ﷺ) نے سات نصیحتیں کی ہیں:

(۱) مجھے اس کا حکم فرمایا ہے کہ مسکینوں سے محبت کیا کروں اور ان کے قریب رہا کروں۔ (۲) مجھے اس کا حکم فرمایا ہے کہ میں اپنے سے اونچے لوگوں (زیادہ مالداروں پر) نگاہ نہ رکھا کروں، اپنے سے کم درجہ والوں پر نگاہ رکھوں (اُن پر غور کیا کروں)۔ (۳) مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں صلہ رحمی کیا کروں اگرچہ وہ مجھ سے منہ پھیرے (یعنی جس کے ساتھ صلہ رحمی کروں وہ مجھ سے غائب ہو، دور ہو، یا یہ کہ وہ میرے ساتھ توجہ سے پیش نہ آئے، بلکہ مجھ سے روگردانی کرے۔ ترغیب وترہیب کے الفاظ یہ ہیں کہ اگرچہ وہ مجھ پر ظلم کرے۔ اس سے دوسرے معنی کی تائید ہوتی ہے)۔ (۴) مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں کسی شخص سے کوئی چیز نہ مانگوں۔ (۵) مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں حق بات کہوں چاہے کسی کو کڑوی ہی لگے۔ (۶) مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ شانہ کی رضا کے مقابلہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کروں (یعنی جس چیز سے حق تعالیٰ راضی ہوں اس کو اختیار کروں، اگرچہ اس کے کرنے پر احمق لوگ ملامت کریں)۔ (۷) مجھے حکم فرمایا ہے کہ میں ”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ“ کثرت سے پڑھا کروں، اس لئے کہ یہ کلمات ایسے خزانہ سے اُترے ہیں جو خاص عرش کے نیچے ہے۔ (مشکوٰۃ)

”لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ“ کو کثرت سے پڑھنے کی ترغیب بہت کثرت سے روایات میں آئی ہے۔ ایک اور حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد وارد ہوا ہے کہ دو خصلتیں ایسی ہیں، کہ جس شخص میں یہ ہوں حق تعالیٰ شانہ اس کو صابرين اور شاکرین کی جماعت میں شمار کرتے ہیں۔ جو شخص دین کے بارے میں اپنے سے اونچے لوگوں کے احوال کو دیکھے اور ان کی اتباع کی کوشش کرے اور دنیا کے بارے میں اپنے سے کم درجہ کے لوگوں کو دیکھے اور اس پر اللہ تعالیٰ شانہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے (محض اپنے فضل سے) اُس کو اس سے بہتر حالت میں رکھا ہے، حق تعالیٰ شانہ اس کو صبر اور شکر کرنے والوں میں شمار فرمائیں گے۔ اور جو شخص دین کے بارے میں اپنے سے کم تر لوگوں کو دیکھے (کہ

فلاں تو اتنا بھی نہیں کرتا جتنا میں کرتا ہوں) اور دنیا کے بارے میں اپنے سے اونچے لوگوں کو دیکھے اور اس پر افسوس کرے کہ میرے پاس اتنا نہیں ہے جتنا فلاں کے پاس ہے وہ نہ صبر کرنے والوں میں شمار ہے نہ شکر گزاروں میں۔ (مشکوٰۃ)

عون بن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں اکثر مالداروں کے پاس بیٹھا کرتا تھا، تو میری طبیعت غمگین رہتی۔ کسی کا کپڑا اپنے کپڑے سے بہتر دیکھتا (تو اپنے کپڑے کے ادنیٰ ہونے پر اپنی ذلت محسوس کرتا جس سے رنج ہوتا) کسی کا گھوڑا اپنے گھوڑے سے اعلیٰ دیکھتا۔ پھر میں نے فقراء کے پاس اپنی نشست شروع کر دی تو مجھے اس رنج سے راحت مل گئی (کہ ان لوگوں سے اپنی چیزوں کو افضل دیکھتا ہوں)۔ (احیاء)

علماء نے لکھا ہے کہ نکاح بھی کسی غریب سے کرے، مالدار عورت سے نہ کرے۔ اس لئے کہ جو شخص مالدار عورت سے نکاح کرتا ہے، پانچ آفتوں میں گرفتار ہوگا۔

(۱) مہر زیادہ دینا پڑے گا۔ (۲) رخصتی میں دیر اور ٹال مٹول ہوگی (کہ اس کے جہیز کی تیاری ہی نہ ختم ہوگی)۔ (۳) اس سے خدمت لینا مشکل ہوگا۔ (۴) خرچ زیادہ مانگے گی۔ (۵) طلاق دینا چاہے گا تو اس کے مال کا لالچ طلاق نہیں دینے دے گا۔

کہتے ہیں کہ عورت چار چیزوں میں خاوند سے کم تر ہونی چاہئے۔ ورنہ خاوند اس کی نگاہ میں ذلیل ہوگا۔ عمر میں، قد کی لمبائی میں، مال میں، شرافت میں۔ اور چار چیزوں میں خاوند سے بڑھی ہوئی ہونی چاہئے۔ خوب صورتی میں، ادب میں، تقویٰ میں، عادتوں میں۔ (احیاء)

ایک بزرگ کی خدمت میں کسی شخص نے حاضر ہو کر اپنے فقر کی شکایت کی اور بڑی سخت پریشانی کا اظہار کیا کہ اس کے غم میں مرنے کی تمنا ظاہر کی۔ ان بزرگ نے دریافت کیا کہ تم اس پر راضی ہو کہ تمہاری آنکھیں ہمیشہ کیلئے لے لی جائیں اور تمہیں دس ہزار درہم مل جائیں؟ وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ پھر فرمایا۔ اچھا اس پر راضی ہو کہ تمہیں دس ہزار درہم دے کر تمہاری زبان لے لی جائے؟ وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا۔ پھر فرمایا کہ اس پر راضی ہو کہ تمہارے چاروں ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں اور تم کو بیس ہزار درہم دے دیئے جائیں؟ وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا۔ پھر فرمایا کہ اچھا اس پر راضی ہو کہ تمہیں مجنون بنا دیا جائے اور دس ہزار درہم دے دیئے جائیں؟ وہ اس پر بھی راضی نہ ہوا۔ وہ فرمانے لگے کہ تمہیں شرم نہیں آتی کہ تمہارے اقرار کے موافق پچاس ہزار سے زیادہ مالیت کا سامان تو حق تعالیٰ شانہ نے تمہیں عطا فرما رکھا ہے (اور یہ مثال کے طور پر چند چیزیں گنوائی ہیں) پھر بھی تم

شکوہ کر رہے ہو۔

ابن سماک رحمۃ اللہ علیہ ایک بادشاہ کے پاس گئے۔ بادشاہ کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ بادشاہ نے اُن سے درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ ابن سماک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ گلاس پانی کا اُسی ساری سلطنت کے بدلہ میں مل سکتا ہے جو تمہارے پاس ہے اور نہ خرید جائے تو پانی ملنے کی کوئی صورت نہیں، پیاسے ہی رہنا ہوگا کیا تم راضی ہو جاؤ گے کہ ساری سلطنت دے کر پانی خریدو، ورنہ پیاسے مر جاؤ۔ بادشاہ نے کہا۔ یقیناً راضی ہو جاؤں گا۔ ابن سماک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ایسی بادشاہت پر کیا خوش ہونا جس کی ساری قیمت ایک گلاس پانی ہو۔ ان مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کی ایک ایک نعمت ہر شخص کے پاس ایسی ہے کہ لاکھوں کروڑوں اس کی قیمت نہیں ہو سکتی۔

یہ تو عام نعمتیں ہیں جن میں ہر شخص کی شرکت ہے۔ اگر گہری نگاہ سے غور کیا جائے تو ہر شخص کو پاس خصوصی نعمتیں حق تعالیٰ شانہ کی ایسی ہیں جن میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ اور تین چیزیں تو ایسی ہیں کہ ان میں ہر شخص کو اعتراف ہے کہ وہ اس نعمت میں ممتاز ہے کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں۔ ان میں سے ایک تو عقل ہے کہ ہر شخص چاہے کتنا ہی بے وقوف ہو، وہ یہ سمجھا کرتا ہے کہ میں سب سے زیادہ عقل مند ہوں۔ دوسرے اس بات کو نہیں سمجھتے جس کو میں سمجھتا ہوں۔ ایسی حالت میں چاہے واقعہ کے اعتبار سے صحیح ہو یا غلط، لیکن اُس کے اپنے اعتقاد اور اقرار کے اعتبار سے اُس پر حق تعالیٰ شانہ کا ایک ایسا انعام ہے کہ یہ انعام کسی دوسرے پر نہیں ہے۔ ایسی حالت میں کیا یہ ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ شانہ کی اس نعمت میں سب سے زیادہ شکر گزار بنے (اور اگر کسی معمولی چیز روپیہ پیسہ وغیرہ میں کسی دوسرے سے کم ہو تو یہ سوچے کہ سب سے اشرف چیز عقل میں سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہوں)۔

دوسری چیز عادات ہیں کہ ہر شخص اپنے سوا دوسرے ہر شخص میں کوئی نہ کوئی ایسی عادت سمجھا اور پایا کرتا ہے جو اس کے نزدیک عیب ہوتی ہے۔ اور گویا اُس کے نزدیک اس کے سوا ہر شخص کے اندر کوئی نہ کوئی اخلاقی عیب ضرور ہے اور اپنی کسی عادت کو بھی (لفظوں میں چاہے مان لے مگر دل میں) عیب دار نہیں سمجھا کرتا۔ نہ اس کے چھوڑنے کے درپے ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کیا یہ ضروری نہیں کہ آدمی یہ سوچے کہ حق تعالیٰ شانہ نے اگر کسی ایک آدھ چیز میں دوسرے سے کم دے رکھا ہے تو عادات کی نعمتوں میں اس کو خاص طور سے سب سے بڑھا رکھا ہے۔

تیسری چیز علم ہے کہ ہر شخص اپنے ذاتی حالات اور اندرونی احوال سے اتنا زیادہ واقف اور ان کا جاننے والا ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کے احوال سے اتنا واقف نہیں ہوتا اور ان میں ایسی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں کہ

آدمی ہرگز یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کے ان عیوب پر کوئی دوسرا مطلع ہو۔ تو حق تعالیٰ شانہ کا یہ احسان کہ اس کو اپنے احوال کا علم عطا فرمانے کے باوجود دوسروں سے اس کی ستاری فرما رکھی ہے۔ اور اس کی یہ تمنا کہ میرے اس علم کی کسی کو خبر نہ ہو، پوری کر رکھی ہے، کہ ان میں دوسرا کوئی بھی اس کا شریک نہیں، کیا ایسی چیز نہیں ہے جس میں یہ سب سے ممتاز ہے اور اس کا شکر اس کے ذمہ ضروری ہے۔ ان کے علاوہ ہزاروں چیزیں ہر شخص میں ایسی ہیں، جن کے متعلق وہ کبھی اس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ وہ چیز اس سے لے کر اس کے بدلہ میں اس کی ضد یا کوئی دوسری چیز دے دی جائے۔ مثلاً انسان ہونا ہے، کوئی نہیں گوارا کرتا اس کو آدمی سے بندر بنا دیا جائے۔ مرد ہونا ہے، کوئی نہیں پسند کرتا کہ اس کو مرد سے عورت بنا دیا جائے۔ اسی طرح مؤمن ہونا ہے، حافظ قرآن ہونا ہے، عالم ہونا ہے، خوب صورت ہونا ہے، صاحب اولاد ہونا ہے۔ غرض اخلاق میں، صورت میں، سیرت میں، عزیز واقارب میں، اہل و عیال میں، عزت مرتبہ میں ہر شخص کے پاس ایسے خصوصی امور ملیں گے جن کے تبادلہ پر وہ کبھی بھی راضی نہ ہوگا۔ تو کیا پھر یہ بات صحیح نہیں کہ ہر شخص پر حق تعالیٰ شانہ کے ہزاروں ایسے خصوصی انعامات ہیں جو دوسرے کو نصیب نہیں۔ ایسی حالت میں ان سب سے آنکھ بند کر کے، اگر کوئی ایک دو چیزیں دوسرے کے پاس ہیں جو اُس کے پاس نہیں ہیں، اُن میں لپچائے اور ناشکری کرے، یہ انتہائی کمینہ پن نہیں ہے؟ اور اگر کسی کے پاس مال ہی زیادہ دیکھتا ہے تو اُن امور میں جو اوپر ذکر کئے گئے غور کرے کہ ان میں سے کتنی چیزیں ایسی ہیں جن میں یہ اُس شخص سے بڑھا ہوا ہے، جس پر رشک یا حسد کر رہا ہے۔ درآنحالیکہ مجموعہ احسانات میں یہ خود اس سے بڑھا ہوا ہے۔ (احیاء)

### ہوشیار لوگ کون ہیں؟

(عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَاشِرَ عَشْرَةِ فَقَامَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ فَقَالَ يَا نَبِيَّ اللَّهِ مَنْ أَكْبَسُ النَّاسَ وَأَحْزَمُ النَّاسَ قَالَ أَكْثَرُهُمْ ذِكْرَ الْمَوْتِ وَأَكْثَرُهُمْ اسْتِعْدَادَ الْمَوْتِ أُولَئِكَ الْأَكْبَسُ ذَهَبُوا بِشَرَفِ الدُّنْيَا وَكَرَامَةِ الْآخِرَةِ.)

”حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم دس آدمی جن میں ایک میں بھی تھا حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک انصاری نے حضور ﷺ سے سوال کیا کہ سب سے زیادہ سمجھ دار اور سب سے زیادہ محتاط آدمی کون ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جو لوگ موت کو سب سے زیادہ یاد کرنے والے ہوں اور موت کے لئے سب سے زیادہ تیاری کرنے والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جو دنیا کی شرافت اور آخرت کا اعزاز لے اُڑے۔“ (طبرانی، ترغیب)

ف: حضور اقدس ﷺ سے موت کو کثرت سے یاد کرنے اور یاد رکھنے کے بارے میں بہت مختلف عنوانات

سے بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں، جن میں سے بعض روایات اس رسالہ میں قریب ہی ”امیدوں کے مختصر کرنے“ کے ذیل میں گزر چکی ہیں۔ ان میں حضور ﷺ کا حکم بھی مختلف روایات میں گزر چکا ہے کہ لذتوں کے توڑ دینے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو۔ حضور ﷺ کے اس اہتمام ہی کی وجہ سے اس مضمون کو مستقل بھی ذکر کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ موت کو کثرت سے یاد رکھنا امیدوں کے مختصر ہونے کا بھی ذریعہ ہے، موت کی تیاری کا بھی سبب ہے، دنیا سے بے رغبتی پیدا ہونے کا بھی سبب ہے جو اصل مقصود ہے، مال کو جمع کر کے بے کار چھوڑ جانے سے بھی روکنے والا ہے، آخرت کے لئے ذخیرہ جمع کر لینے میں بھی معین ہے اور گناہوں سے توبہ کرتے رہنے پر بھی ابھارنے والا ہے۔ دوسروں پر ظلم و ستم اور دوسرے کے حقوق کو ضائع کرنے سے بھی روکنے والا ہے۔

الغرض یہ عمل بہت سے فوائد اپنے اندر رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے مشائخ سلوک کا بھی معمول ہے کہ اپنے مریدین میں سے اکثر کو جن کے مناسب حال ہو، اس کا مراقبہ خاص طور سے تلقین کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک جوان مجلس میں کھڑے ہوئے۔ اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ! مؤمنین میں سب سے زیادہ سمجھدار کون ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ موت کا کثرت سے ذکر کرنے والا اور اس کے آنے سے پہلے پہلے اس کے لئے بہترین تیاری کرنے والا (اتحاف)۔ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے قرآن پاک کی آیت: ﴿فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِإِسْلَامٍ﴾ (انعام: ۱۲۵) تلاوت فرمائی جس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

”حق تعالیٰ شانہ جس کو ہدایت فرمانے کا ارادہ فرماتے ہیں اسلام کے لئے اس کے سینے کو کھول دیتے ہیں۔“  
(کہ اسلام کے متعلق اس کو شرح صدر ہو جاتا ہے)

اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا کہ (اسلام کا) نور جب سینہ میں داخل ہوتا ہے تو سینہ اُس کے لئے کھل جاتا ہے۔ کسی نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! اس کی (کہ اسلام کا نور سینہ میں داخل ہو گیا) کوئی علامت ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ دھوکہ کے گھر (دنیا سے) بعد پیدا ہونا، ہمیشہ رہنے والے گھر (آخرت) کی طرف رجوع اور موت آنے سے پہلے اس کے لئے تیاری۔ (مشکوٰۃ)

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت مانگی تھی۔ مجھے اس کی زیارت کی اجازت مل گئی۔ تم لوگ قبرستان جایا کرو اس لئے کہ یہ چیز موت کو یاد دلاتی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اس سے عبرت ہوتی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ قبرستان جانے سے دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے اور آخرت یاد آتی ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ قبرستان جایا کرو، اس سے تم کو آخرت



یاد آئے گی اور مردوں کو غسل دیا کرو کہ یہ (نیکوں سے) خالی بدن کا علاج ہے اور اس سے بہت بڑی نصیحت حاصل ہوتی ہے اور جنازہ کی نماز میں شرکت کیا کرو شاید اس سے کچھ رنج و غم تم میں پیدا ہو جائے، کہ غمگین آدمی (جس کو آخرت کا غم ہو) اللہ تعالیٰ کے سایہ میں رہتا ہے اور ہر خیر کا طالب رہتا ہے (ترغیب)۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ بیماروں کی عیادت کیا کرو اور جنازوں کے ساتھ جایا کرو کہ یہ آخرت کو یاد دلاتے ہیں۔ ایک حکیم کسی جنازہ کے ساتھ جا رہے تھے۔ راستہ میں لوگ اُس میت پر افسوس اور رنج کر رہے تھے۔ وہ صاحب فرمانے لگے کہ تم اپنے اوپر رنج اور افسوس کرو تو زیادہ مفید ہے۔ یہ تو چلا گیا۔ اور تین آفتوں سے نجات پا گیا۔ آئندہ ملک الموت کے دیکھنے کا خوف اس کو نہیں رہا۔ موت کی سختی جھیلنے کی اب اس کو نوبت نہیں آئے گی برے خاتمہ کا خوف ختم ہو گیا (اپنی فکر کرو کہ یہ تینوں مرحلے تمہارے لئے باقی ہیں)۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ ایک جنازہ کے ساتھ جا رہے تھے۔ کسی راستہ چلنے والے نے پوچھا کہ یہ کس کا جنازہ ہے؟ فرمانے لگے کہ یہ تیرا جنازہ ہے۔ اور اگر تجھے یہ بات گراں گزرے تو میرا جنازہ ہے (مطلب یہ ہے کہ یہ وقت اپنی موت کے یاد کرنے کا ہے۔ اس وقت فضول بات کی طرف متوجہ ہونا بالکل نامناسب ہے)۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ تعجب اور بہت زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جن کو (آخرت کے) سفر کے لئے توشہ تیار کر لینے کا حکم ملا ہوا ہے اور روانگی عنقریب ہونے کا اعلان ہو چکا ہے۔ پھر بھی یہ لوگ (دنیا کے) کھیل میں مشغول ہیں۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ جب یہ کسی جنازہ کو دیکھتے تو ان کا ایسا حال رنج و غم سے ہوتا جیسا کہ ابھی اپنی ماں کو دفن کر کے آئے ہوں (تنبیہ الغافلین)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک یہودی عورت اُن کے پاس آئی اور (کسی احسان کے بدلہ میں) کہنے لگی کہ اللہ تعالیٰ شانہ تمہیں قبر کے عذاب سے بچائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ سے پوچھا کیا قبروں میں بھی عذاب ہوتا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا۔ بیشک قبروں میں بھی عذاب ہوتا ہے اور اس کے بعد سے (لوگوں کی تعلیم کے لئے) ہمیشہ حضور ﷺ ہر نماز کے بعد قبر کے عذاب سے پناہ مانگا کرتے تھے۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ مردوں پر قبر میں ایسا سخت عذاب ہوتا ہے کہ اس کی آواز چوپائے تک سنتے ہیں۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا کہ مجھے یہ ڈر ہے کہ تم (خوف کی وجہ سے) مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے۔ ورنہ میں اللہ تعالیٰ سے اس کی دعا کرتا کہ تمہیں قبر کے عذاب کی آواز سنا دے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو اتنا روتے کہ ڈاڑھی مبارک تر ہو جاتی۔ کسی نے پوچھا کہ آپ، اتنا زیادہ جنت اور جہنم کے ذکر سے بھی نہیں روتے جتنا قبر کے تذکرہ سے روتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے کہ قبر آخرت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل ہے جو اس سے سہولت سے چھوٹ گیا



اس کے لئے اس کے بعد کی منزلیں سب آسان ہیں۔ اور جو اس کے (عذاب میں) پھنس گیا۔ اس کے لئے اس کے بعد کی منزلیں اور بھی زیادہ سخت ہیں۔ اور میں نے حضور ﷺ سے یہ بھی سنا ہے کہ میں نے کوئی منظر ایسا نہیں دیکھا کہ قبر کا منظر اس سے زیادہ سخت نہ ہو۔ ایک اور حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا کہ قبر میں روزانہ صبح اور شام دو وقت میت کو اس کا وہ گھر دکھایا جاتا ہے جس میں وہ قیامت کے بعد جائے گا۔ اگر وہ جنت والوں میں ہے تو جنت کا مکان دکھایا جاتا ہے (جس سے اس کو قبر ہی میں فرحت اور سرور حاصل رہتا ہے) اور اگر وہ جہنم والوں میں ہوتا ہے تو جہنم کا مکان دکھایا جاتا ہے (جس سے اس کے رنج و غم فکر و خوف میں اضافہ ہوتا رہتا ہے)۔

### مال و متاع کی محبت کا علاج!

جب یہ بات معلوم ہوئی کہ مال کی محبت بہت ہی گھناؤنی چیز ہے تو ہر مسلمان کو یہ کوشش کرنی چاہئے کہ اس سے بچے اور اپنے دل سے اس کی محبت کو دور کر دے۔ اس کا علاج درج ذیل ہے:

(۱) موت کو کثرت سے یاد کرے اور یہ سوچے کہ یہ سب سامان ایک دن چھوڑنا ہے پھر اس میں جی لگانے سے کیا فائدہ بلکہ جس قدر دل لگے اسی قدر چھوڑتے وقت حسرت ہوگی۔

(۲) بہت تعلقات نہ بڑھائے ضرورت سے زیادہ سامان و جائیداد وغیرہ جمع نہ کرے، کاروبار، روزگار اور تجارت وغیرہ حد سے زیادہ نہ پھیلانے ان چیزوں کو ضرورت اور آرام تک رکھے۔

(۳) فضول خرچی نہ کرے اس سے آمدنی کی حرص بڑھتی ہے۔

(۴) غریبوں میں زیادہ بیٹھا کرے مال کے عاشقوں سے دور رہے، امیروں سے بہت کم ملے کیونکہ امیروں سے ملنے میں جو چیزیں ان کے پاس ہیں ان کی ہوس پیدا ہوگی۔

(۵) کسی وقت قبرستان جا کر آخرت کی یاد میں زیادتی کرے۔

(۶) حرام اور مشتبہ کمائی سے پرہیز کرے اور حلال جو ملے اس میں فقراء و مساکین کا حصہ رکھے اور ان پر خرچ کرے اور مال میں سے جس چیز سے زیادہ لگاؤ ہو اس کو اللہ تعالیٰ کے نام پر خیرات کر دے یا فروخت کر دے۔ ان شاء اللہ ان تدابیر پر بقاعدہ عمل کرنے سے دنیا کی محبت نہ رہے گی۔

### جاہ کی محبت!

حب جاہ اپنی شہرت کی خود خواہش کرنے کو کہتے ہیں اس کی حقیقت یہ ہے کہ لوگ اس کے لئے مسخر ہوں اور

اس کا تصرف لوگوں کے دلوں پر جاری ہوتا کہ لوگ اس کی تعظیم کریں اور اس کے عقیدت مند ہوں بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں مال سے زیادہ جاہ کی محبت ہوتی ہے۔ چونکہ اس مرض میں آدمی اپنی شہرت کا طالب اور خواہش مند ہوتا ہے اور مخلوق میں بڑا بننے کا شوق رکھتا ہے۔ تو یہ نہایت خطرناک مرض ہے، ایسا شخص کسی دوسرے شخص کے نام اور تعریف سے جلتا ہے اور حسد کرتا ہے اور دوسرے شخص کی برائی اور ذلت سن کر دل میں خوش ہوتا ہے اس سے دل میں نفاق پیدا ہوتا ہے اور ایسا شخص ہر وقت پریشانی میں مبتلا رہتا ہے غرض حب مال کی طرح حب جاہ کا مرض بھی نفاق، جھوٹ، ریاء، فریب، حسد اور غیبت وغیرہ جیسے عظیم گناہوں کو پیدا کر دیتا ہے بلکہ اس کے نقصانات اور گناہ، حب مال سے بھی زیادہ ہیں اور یہ مال کے مقابلہ میں دل پر زیادہ غالب آجاتا ہے۔

اسی بیماری کی وجہ سے آدمی حق بات قبول کرنے سے بھی محروم رہتا ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ: دو بھیڑیے اگر بکریوں کے ریوڑ میں آن پڑیں تو وہ اس قدر تباہ و برباد کرنے والے نہیں ہیں جس قدر مال اور جاہ کی محبت مسلمان کے دین کو تباہ و برباد کرتی ہے۔

### حب جاہ کی علامت!

حب جاہ اور ریاء کاری کی علامات قریب قریب ہیں اور ریاء کاری بھی بسا اوقات حب جاہ کی وجہ سے کی جاتی ہے اس لئے اس کا پورا بیان ریاء کاری کے بیان میں دیکھ لیجئے البتہ حب جاہ کی چند نشانیاں یہاں ذکر کرتے ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) تعریف سننے کا خواہش مند ہوگا۔

(۲) قوت ایمان، عبادات، سخاوت، صفائی معاملات اور اخلاق وغیرہ میں جس قدر زور لوگوں کے سامنے لگاتا ہے اتنی کوشش و احتیاط ایسی جگہ میں نہیں دکھائے گا جہاں پر کوئی نہ ہو یا کوئی اس کو پہچانتا نہ ہو۔

(۳) وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو ان کے صحیح مصرف میں لانے کی بجائے نمائش و نمود کی جگہوں میں لے یاد رہے کہ عزت و آبرو سے رہنایا اس کی طلب بری چیز نہیں لیکن بری تو وہ عزت کی طلب ہے جس سے کوئی یا دین کے معاملہ میں مداہنت میں پڑ جائے اگر لوگوں کی نظر میں بزرگ بننے کے لئے ریاء کاری نہ کرے اور نہ دوسروں کو حقیر اور چھوٹا قرار دے اور نہ غلط ذرائع سے عزت و جاہ بنانے کی کوشش کرے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عزت و جاہ ملتی ہے یا اسی عزت و جاہ اللہ تعالیٰ ہی سے طلب کرنا مذموم نہیں بلکہ جائز اور مستحسن ہے اسی طرح شہرت کی آرزو اگرچہ درست نہیں لیکن اگر اللہ تعالیٰ خود ہی مشہور فرما دے تو اللہ تعالیٰ ہی حفاظت فرماتے ہیں۔

خرچ کرے گا۔

(۴) دوسروں کی تعریف و نام سے جلتا ہوگا۔

### حب جاہ کا علاج!

حب جاہ اور ریاء کاری کا علاج قریب قریب ہے پھر بھی ذیل میں اس کے لئے چند تجاویز لکھ دیتے ہیں تاکہ آسانی رہے۔

(۱) یہ سوچے کہ اگر ساری دنیا میرے قدموں میں پڑ جائے تو یہ چند روز کے لئے ہے جن لوگوں میں ناموری اور تعریف ہوگی نہ وہ رہیں گے اور نہ میں رہوں گا پھر ایسی بے بنیاد نام آوری پر خوش ہونا نادانی ہے اور کل اسی وجہ سے آخرت میں انہی لوگوں بلکہ اول سے آخر تک کے سارے انسانوں کے سامنے رسوائی ہوگی اور سخت عذاب میں مبتلا ہوں گا۔

(۲) جب کوئی تعریف کر لے تو یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ کی ستاری ہے کہ اس نے ظاہری باطنی اور معنوی تمام نجاستوں کو چھپا رکھا ہے یہ اللہ تعالیٰ کی ستاری ہے کہ اس نے میرے گندے وساوس اور گندے اعمال پر مخلوق کو مطلع نہیں فرمایا ورنہ اگر یہ ستاری نہ ہوتی تو مخلوق نفرت کر کے مجھے پتھر مارتی۔

(۳) اور جو کوئی آپ کا عیب بیان کرے تو اس کے دفاع (البتہ اگر کوئی بہتان باندھے تو اس سے دفاع اور اس کی تردید کرنی چاہئے) کی کوشش نہ کرے بلکہ یک گونہ شکر کرے کہ بہت سے عیوب ایسے ہیں کہ اس کو معلوم نہیں اور جو اس نے بیان کیا ہے یہ تو بہت کم ہے۔

### سوال اور طمع کا بیان!

دنیا کی محبت اور زہد کے متعلق جو بیان پہلے گزر چکا ہے اس سے سوال اور طمع کے نقصانات خود بخود معلوم ہو سکتے ہیں۔ لیکن سوال کی عادت اور طمع دونوں چونکہ ایسی عادتیں ہیں جو کہ انسان کی صلاحیتوں اور اس کی رہی سہی ہمت کو ختم کر کے انسان کو دوسروں کا غلام بنا دیتی ہے جو کہ بالآخر دنیا و آخرت کی بربادی پر پہنچا دیتی ہے اس لئے ان دونوں پر مستقل طور پر مزید کچھ لکھ دیتا ہوں۔ شاید اس باب میں پہلے بیان کی ہوئی بعض حدیثوں کو پھر ایک بار سامنے لایا جائے، یہ بھی اس لئے تاکہ ہمارے اندر سوال و طمع کی گندگی اور بد بونہ رہے۔

### طمع و سوال اور مؤمن کی شان!

انسان کی سعادت و توکلری کا راز خدا کی تقسیم پر راضی رہنے میں پوشیدہ ہے ایک مؤمن کی حالت یہ ہوتی ہے

کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقسیم رزق اور عطا اور بخشش پر خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ راضی رہتا ہے یہ اس لئے کہ مسلمان کے پاس جو بھی نعمت موجود ہو وہ اس کو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کا فضل و احسان سمجھتا ہے اور جن نعمتوں سے وہ محروم ہو اس کے بارے میں اس کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ عالی و حکیم ذات ہے کہ جو کچھ بھی میرے پاس نہیں ہے وہ مہنی بر حکمت خداوندی ہے وہ خیر ہی خیر ہے اگرچہ یہ مال کا نہ ہونا بظاہر شکل و صورت کے اعتبار سے وہ برا اور مکروہ دیکھائی دے رہا ہو۔

﴿عَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ (سورة البقرة)

”ہوسکتا ہے کہ کسی چیز کو تم برا سمجھتے ہو اور وہی چیز تمہارے لئے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں اچھی لگتی ہو اور وہی چیز تمہارے حق میں بری ہو (کیونکہ حقیقت تو) اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے تم نہیں جانتے۔“ اس لئے ایک مسلمان کے دل میں مال و دولت اور دنیاوی چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے کبھی شکایت پیدا نہیں ہوتی وہ رزق حلال کے حصول میں پوری کوشش کرے گا لیکن اس محنت و کوشش کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو اس پر قانع رہتا ہے وہ اپنے سے زیادہ مال دار و دولت مند اور خوشحال لوگوں کی حالت پر جلتا نہیں بلکہ اپنی محنت اور کوشش سے حاصل ہوئے رزق حلال کو صبر، شکر کے ساتھ قبول کرتا ہے اور حرام اور مشتبہ ذرائع سے پرہیز کرتا ہے چاہے وہ وسائل کتنے ہی ارزاں و عام کیوں نہ ہوں کیونکہ اس کی خواہش کا رخ دنیا کی ناچیز اور ناپائیدار چیزوں سے ہٹ کر آخرت کی ابدی اور لازوال نعمتوں کی طرف ہوتا ہے وہ سوال و طمع و لالچ و حرص اور اسراف جیسی بری اور ناپسندیدہ عادات کے بجائے ایثار و قربانی اور دوسروں پر خرچ کرنا اور کفایت شعاری جیسی اعلیٰ اور بلند صفات کو اپنے اندر پیدا کرتا ہے یہی وہ چیز ہے جس کو زہد و قناعت اور استغناء کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے استغناء اور قناعت اخلاق الہی میں سے ایک خلق ہے جن اخلاق کی بدولت انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب اور اس دنیا میں بھی بلند ہو جاتا ہے اور دل کی بے چینی اور کڑھن کی سخت محنت و تکلیف سے اس کو نجات مل جاتی ہے ایسے لوگ جو تقدیر پر شاکر اور ابتلاء پر راضی ہوں ان کے نزدیک امیروں کے محلات، بادشاہوں کے خزانے اور عیش و عشرت میں پلنے والے لوگوں کے ساز و سامان مٹی کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں ہوتے اور بالعموم یہی لوگ وہ ہوتے ہیں جو اپنے موقف پر سب سے زیادہ ڈٹ جانے والے اور باطل سے ٹکرانے والے ہوتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو صحیح طور پر امر بالمعروف نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں ان کی قناعت و استغناء انہیں امراء و بادشاہوں سے بے نیاز کر دیتی ہے کہ

بڑے سے بڑے ظالم بادشاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کلمہ حق کہہ سکتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کو قناعت کی یہ دولت عطا فرمائے بلاشبہ اس کو بہت بڑی دولت عطا کی، حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”کامیاب اور بامراد ہو اوہ بندہ جس کو اسلام نصیب ہوا اور اس کی روزی بھی بقدر گزارہ کے ملی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اس قدر روزی پر قانع بھی بنادیا۔“ (مسلم و مشکوٰۃ)

اس میں شک نہیں کہ جس آدمی کو ایمان کی دولت نصیب ہوئی اس کو روزی اور دنیاوی سامان بھی بقدر کفایت کے ملا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو اس پر صابر و شاکر اور قانع بھی بنادیا ایسے شخص کی زندگی بہت ہی پرسکون اور خوشگوار گزرے گی اگر کسی کے پاس ڈھیروں مال و دولت ہو لیکن اس میں اور زیادہ کرنے کی لالچ و حرص ہو اور ہر وقت مال بڑھانے کی فکر اس کو دامن گیر رہتی ہو تو اسے قلبی سکون و طمانیت کبھی نصیب نہ ہوگی وہ باوجود مال و متاع کے حقیر ہوگا اس حقیقت کو حضور اقدس ﷺ نے ایک دوسری حدیث شریف میں ارشاد فرمایا ہے کہ ”غنی“ مال و دولت اور اسباب سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اصل غنی اور تو نگری دل کا غنی اور بے نیازی ہے۔ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ)

الغرض تو نگری اور محتاجی و خوشحالی اور بد حالی کا تعلق مال و اسباب کی زیادتی اور کمی سے نہیں بلکہ اس کا تعلق دل سے ہے اگر دل قانع، غنی اور بے نیاز ہے تو آدمی خوشحال رہتا ہے اور اگر دل میں حرص و لالچ فقر و فاقے کا ڈر ہے تو دولت ساز و سامان کے ڈھیروں کے باوجود خوشحال و پرسکون و خوشگوار زندگی سے محروم رہے گا، پس اس سے سوال و طمع کی برائی اور مذمت بھی نکل آئی جب ایک شخص مخلوق کے سامنے دست دراز کرتا ہے تو وہ مخلوق کے سامنے اپنے آپ کو رسوا اور ذلیل کرتا ہے اور دوسرے لوگ اس کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں حالانکہ مسلمان کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل و رسوا نہیں کرتا۔ دوسری خرابی سوال کرنے سے یہ ہوتی ہے کہ گویا وہ اللہ تعالیٰ کی تقسیم اور عطا پر راضی نہیں۔ تیسری برائی اس میں یہ ہوتی ہے کہ سوال کرنے والا دوسروں کو تکلیف پہنچاتا ہے دنیا کی حرص و لالچ طمع و سوال پر اسلام نے بہت سخت مذمت کی ہے اور قرآن و حدیث میں ایسی بری عادتوں پر سخت وعیدیں موجود ہیں یہاں مختصر اچند احادیث پر اکتفاء کیا جاتا ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اس لئے لکڑیاں چن چن کر لکڑی کا گٹھ باندھ کر پشت پر اٹھالائے اور اس کو فروخت کر دے اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کی آبر و یعنی ذلت و رسوائی سے جو مانگنے سے ہوتی ہے اسے بے آبرو ہونے سے بچائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے مانگتا پھرے کسی کا دل چاہے دیدے اور

چاہے انکار کر دے۔ (بخاری و مسلم مشکوٰۃ)

ایک حدیث شریف حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے وہ نقل کرتے ہیں کہ ”جس شخص کو فقر و فاقہ کی نوبت آجائے اور وہ اس کو لوگوں کے سامنے پیش کر دے اس کا فاقہ (یعنی احتیاج) بند نہ ہوگا (یعنی اگر ایک ضرورت کے واسطے بھیک مانگ لی ہے اور وہ صورت کے اعتبار سے پوری بھی ہوگی تو کل کو اس سے اہم کوئی ضرورت پیش آئے گی تو احتیاج بدستور باقی رہے گا) اور جو شخص اپنے فقر و فاقے (یعنی احتیاج) کو اللہ تعالیٰ پر پیش کرے (یعنی اسی ہی سے مانگ لے) تو اللہ تعالیٰ جلد اس کو روزی عطا فرماتا ہے خواہ فوراً مل جائے یا کچھ تاخیر سے۔“ (ترمذی وغیرہ)

حضرت کبشہؓ نے حضورؐ سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے اس میں حضورؐ نے قسم کھا کر چند باتیں ارشاد فرمائی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ:

”جو شخص لوگوں سے مانگنے کا دروازہ کھولے گا حق تعالیٰ شانہ اس پر فقر (یعنی احتیاج) کا دروازہ کھول دیتا ہے۔“ (ترمذی مشکوٰۃ)

اور رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ:

”جو شخص مال بڑھانے کے لئے سوال (یعنی بھیک) مانگتا ہے وہ جہنم کے انگارے جمع کر رہا ہے جس کا دل چاہے تھوڑا مانگ لے یا دل چاہے زیادہ مانگ لے یعنی اس کی اپنی مرضی ہے کہ جتنے انگارے اپنے لئے جمع کرنا چاہے جمع کر لے۔“ (مسلم و مشکوٰۃ)

ایک حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص لوگوں سے سوال اس لئے کرتا ہے کہ مال میں زیادتی کرے تو اس کے منہ پر قیامت کے دن زخم ہوں گے اور جہنم کے انگارے یعنی آگ کھا رہا ہوگا جس کا دل چاہے زیادہ سوال کرے اور جس کا دل چاہے کم کرے یعنی اس کی مرضی کہ جتنے انگارے کھا سکے کھا لے۔ (ترمذی مشکوٰۃ)

ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ آدمی لوگوں سے سوال کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ قیامت کے دن اس کے چہرے پر ایک بوٹی (ذرا سا) بھی گوشت نہ رہے گا۔ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ)

حضرت سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ بنی آدم کی نیک بختی میں سے ایک یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقرر فرمایا ہے اس پر وہ راضی ہو اور بنی آدم کی بد بختی میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جو کچھ مقرر فرمایا ہے وہ اس پر خوش نہ ہو۔ (احمد، ترمذی، مشکوٰۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ انسان میں سب سے بری خصلت گڑھا دینے والی حرص اور گھبرا دینے والی بزدلی ہے۔ (ابوداؤد)

حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے مختصر سی نصیحت کیجئے تاکہ میں اس پر مضبوطی سے عمل کر سکوں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب نماز پڑھو تو ایسی پڑھو کہ عمر کی آخری نماز یہی ہے اور کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالو جس کی معذرت کرنا پڑے اور اپنے دل کو پکے طور پر اس چیز سے مایوس کرلو جو دوسروں کے پاس ہے کہ (اس کی طرف ذرا سا بھی تمہیں التفات نہ ہو)۔ (مشکوٰۃ)

حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جس سے اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت فرمائے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کرنے لگیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا سے بے رغبتی پیدا کرلو اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے اور لوگوں کے پاس جو کچھ (مال و اسباب وغیرہ) ہے ان سے بے رغبتی پیدا کرلو تاکہ لوگ تم سے محبت کرنے لگیں۔ (ترمذی وابن ماجہ و مشکوٰۃ)

### حرص و لالچ بہت بری ہیں!

رسول اللہ ﷺ نے ایک خطبہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ حرص و طمع سے بچو کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص و لالچ سے تباہ ہوئیں۔ اس (حرص) نے بخل کرنے پر ان کو آمادہ کیا۔ تو انہوں نے بخل اختیار کیا۔ اسی نے ان کو قطع رحمی پر اکسایا تو انہوں نے قطع رحمی کی اختیار کی اس نے ان کو بدکاری پر ابھارا تو انہوں نے بدکاریاں کیں۔ (ابوداؤد)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس بات کا ضامن کون ہوتا ہے کہ وہ کسی شخص سے کچھ سوال نہ کیا کرے گا تو میں اس کے لئے جنت کا ضامن ہوتا ہوں تو انہوں نے عرض کیا کہ میں، اس کے بعد وہ کسی سے کوئی چیز بھی مانگا نہیں کرتے تھے۔ (ابوداؤد)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلایا اور مجھ سے یہ شرط کی کہ دیکھنا کسی سے کچھ سوال نہ کرنا میں نے کہا قبول ہے آپ نے فرمایا اگر تمہارے ہاتھ سے کوڑا گر پڑے تو اپنا کوڑا بھی نہ مانگنا یہاں تک کہ اترنا اور اس کو خود اٹھا لینا۔ (مسند احمد)

ان احادیث میں ایک مؤمن کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ وہ کسی انسان سے سوال کرنے کا خیال بھی اپنے دل سے نکال ڈالے سوچئے کہ جس شریعت میں ادنیٰ سے ادنیٰ چیز مانگنے کے لئے ایک رب العزت ہی دروازہ بتایا گیا ہو



اس میں غیر اللہ سے ایسی ایسی مرادیں مانگنا جن کے پورا کرنے کی ان میں طاقت بھی نہ ہو تو کب گوارہ ہو سکتا ہے۔

بلاشبہ حرص و لالچ انتہائی بد اخلاقی ہے اور یہی حرص و لالچ بہت سی برائیوں کو جنم دیتی ہے اس سے اور کئی بد اخلاقیات پیدا ہوتی ہیں، مثلاً ریاکاری، حسد و بغض وغیرہ جیسی خطرناک روحانی امراض اور برائیاں اس سے پھوٹی ہیں لوگوں سے سوال و طمع جیسی ذلیل اور رسوا کن افعال اسی حرص و لالچ کے برگ و بار ہوتے ہیں اور جو شخص جس آدمی سے طمع رکھتا ہے وہ اس کے سامنے چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے اور عبادت میں ریاکاری کا مظاہرہ کرتا ہے اور وہ اس کی غلط اور ناحق باتوں پر صرف چشم پوشی نہیں کرتا بلکہ اس کی تائید بھی کرتا ہے یہی طمع ایمان کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے چونکہ اس کے دل کی لودنیاء و مال و متاع یا جاہ، شہرت کے بڑھانے سے لگی رہتی ہے اس لئے اس کا دل و دماغ اللہ رب العزت و الجلال والا کرام کے بجائے لوگوں کی طرف جھانکتے ہیں جیسا کہ بلی چوہے کی تاک میں بیٹھی رہتی ہے اور یہی حرص و طمع انسان کو مال و دولت یا شہرت کا بندہ بنا کر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور پھینک دیتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

(لَعْنَ عَبْدُ الدُّنْيَا وَلَعْنَ عَبْدُ الدَّرَاهِمِ)

”درہم و دینار (مال و دولت) کا بندہ ملعون اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہے۔“ (ترمذی، مشکوٰۃ)

مال و دولت کی بندگی اور پرستش یہی تو ہوتی ہے کہ انسان مال و دولت اور جاہ کی چاہت اور طلب میں ایسا گرفتار ہو جائے کہ اس کے حصول میں اللہ تعالیٰ کے احکامات اور حدود کا پابند نہ ہو حلال و حرام کی تمیز کئے بغیر جس طرح بھی حاصل ہو ایسا چھپٹ کر لیتا ہے جیسا کہ بھوکا بازاری کتا گوشت کے ٹکڑے پر گر پڑتا ہے۔

غرض حرص و طمع نہایت خطرناک برائیوں کو جنم دیتی ہے کہ اس کی وجہ سے معاشرہ میں ایسی گمراہ کن اور تباہ کن خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو بالآخر ملکوں و قوموں کو تباہ کر دیتی ہیں اس لئے چاہئے کہ اس خطرناک اور تباہ کن مرض سے اپنے دلوں اور سینوں کو پوری طرح حفاظت میں رکھیں۔

### سوال کا حکم!

(۱) سوال حرام ہے اور جو مال و دولت بصورت سوال حاصل ہوا ہو، وہ بھی حرام ہے جس شخص نے ایسا مال

حاصل کیا ہو اس پر واجب یہ ہے کہ وہ اس مال کو فقراء و مساکین پر بانٹ دے اور اس بانٹنے کو کوئی کمال نہ سمجھے بلکہ

یوں سمجھے کہ جو گندگی لگی ہوئی تھی اس کو دور کیا جیسا کہ کپڑوں پر گندگی لگ جاتی ہے تو اس کو صاف کرنے میں کوئی آدمی یہ نہیں سمجھتا کہ میں کوئی کارخیز کرتا ہوں اگر اس کو پاکیزگی جنابت سے اجر ملتا ہے لیکن اپنی طرف سے اس کی کوئی ایسی نیت نہیں ہوتی، اس میں بھی ایسا ہی ہے۔

### سوال کی صورتیں!

بھیک مانگنے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں کبھی تو صریح الفاظ میں سوال ہوا کرتا ہے اور کبھی صریح عمل سے سوال ہوا کرتا ہے۔ مثلاً مسجد کے باہر چادر بچھا رکھی ہے یا بیٹھا ہوا ہے یا ہاتھ پھیلا یا ہے وغیرہ یا کسی کے در پر جائے اور کچھ نہ کہے لیکن گھر والوں کو تجربہ ہے کہ جب اس وقت میں یہ شخص آتا ہے تو اس کا مقصد بھیک مانگنا ہوتا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قول و فعل سے صراحۃً سوال نہیں کرتا لیکن تعریفاً سوال کرتا ہے یعنی اپنی حالت کو کسی پر اس لئے پیش کرتا ہے تاکہ وہ اس کے حال پر ترس کھا کر اس کو کچھ دے دیں۔

مثلاً کوئی کسی مالدار شخص سے یوں کہتا ہے کہ مجھ پر بہت سارا قرضہ تھا ایک لاکھ سے تجاوز تھا لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ ہی دینے والا ہے فلاں فلاں مالدار نے اتنی مدد کی فلاں نے اتنا مال دیا فلاں نے اتنی رقم دی اب کچھ زیادہ باقی نہیں۔

(۱) مثلاً کسی شخص نے کوئی بوجھ و ضمان اپنے ذمہ لے لیا ہو وہ اس پر آپڑے یا مثلاً کسی شخص کو حادثہ پیش آئے جس سے سارا مال ہلاک ہو جائے، گھر میں آگ لگ جائے یا کوئی آفت اچانک ٹوٹ پڑے جس سے سب کچھ ختم ہو جائے تو ایسے شخص کو جائز ہے کہ اتنی مقدار میں سوال کرے جس سے ضمان ادا ہو جائے اور زندگی کا سہارا ہو سکے پھر سوال سے رک جائے اس سے زیادہ سوال کا حق نہیں۔

(۲) درمیانی درجہ بھی سخت احتیاج کا ہے لیکن حالت اضطراری سے کم ہے مثلاً کوئی شخص بیمار ہے اور دوائی کے لئے رقم نہیں لیکن مرض ایسا نہ ہو جو ہلاکت کا باعث بنے یہ بھی ایسا ہے کہ اس میں سوال کرنے کی گنجائش ہے لیکن سوال ترک کرنا یہاں بھی بہتر اور اولیٰ ہے۔

(۳) ادنیٰ درجے کی حالت یہ ہے کہ حاجت زیادہ نہ ہو مثلاً اس کے پاس روٹی کے دام تو موجود ہیں لیکن سالن کے دام نہیں یا پھٹے پرانے کپڑے ہیں وہ ایک جوڑا ایسا بنانا چاہتا ہے کہ باہر جانے کی وجہ سے پہن لیا کرے تاکہ لوگوں پر اس کا فقر اور بوسیدہ کپڑے ظاہر نہ ہوں تو ایسے شخص کے لئے سوال جائز مگر مکروہ ہے اس کے علاوہ جس شخص کے پاس بقدر ضرورت سامان موجود ہے وہ سوال کرتا ہے تو یہ حرام ہے۔

اور جہاں جہاں سوال جائز ہے وہاں بھی شرط یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ سوال نہ کرے مثلاً ننگا ہوا اس کی وجہ سے سوال کیا تھا کپڑا مل گیا ستر ڈھانپ لیا لباس کی ضرورت نہ رہی تو پھر کپڑے کا سوال نہیں کرے گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ سوال اس طرح نہ کریں جس سے اللہ تعالیٰ کی شکایت ٹپکتی ہو تیسری بات سوال کرنے میں کسی کو تنگ نہ کرے اور نہ کسی کو اذیت پہنچائے چوتھی شرط یہ ہے کہ سوال ایسی جگہ کریں جہاں زیادہ ذلت و رسوائی نہ اٹھانی پڑے۔ صرف دس ہزار بقایا ہے وہ بھی کہیں سے اللہ تعالیٰ دلوادے گا تو اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ یہ مالدار بھی کچھ دے یا کوئی شخص کہیں مہمان ہوتا ہے وہ میزبان سے کہتا ہے کہ فلاں شخص کے پاس مہمان ہوا اُس نے ایسا اکرام کیا ایسا کھانا کھلایا فلاں فلاں چیز ہدیہ دی یا کوئی بظاہر دین دار کسی مال والے سے یہ کہتا ہے کہ الحمد للہ ویزہ لگ گیا ہے عمرہ کی تیاری ہے کچھ رقم کی کمی ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ دے دیگا۔ غرض اسی طرح کئی صورتیں سوال کی بن جاتی ہیں۔

### بھیک مانگنا کیا ہے؟

جو چیز اپنی ملک میں لانے کی غرض سے ذلت اٹھا کر مانگی جائے وہ بھیک اور سوال میں داخل ہے اگر کوئی کسی فقیر کی امداد کے لئے لوگوں سے کہہ دے یا مدرسہ یا مسجد اور جہاد وغیرہ کے لئے چندہ مانگے تو یہ سوال میں داخل نہیں بلکہ یہ تعاون اور امداد ہے جو مخلوق کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی دوست دوسرے دوست سے خوش طبعی سے کوئی چیز مانگ لے یا بیٹا اپنی ماں سے محبت کے طور پر مانگ لے تو یہ سوال میں داخل نہیں اسی طرح اگر کوئی چیز اپنے ملک میں لینے کے لئے نہیں بلکہ اس سے صرف فائدہ اٹھا کر واپس کر دینے کی غرض سے مانگی جائے تو یہ بھی اس رسوا کن سوال میں داخل نہیں بلکہ وہ قرض ہے یا ایسی مانگی ہوئی چیز ہے جس کو پھر اپنے مالک کو واپس کر دینا ہوتا ہے۔

### سوال کی جائز صورتیں اور اس کی حدود!

سوال صرف مجبوری کی حالت میں یا ایسی حاجت جو مجبوری کے قریب ہو جائز ہے۔

(۱) اعلیٰ درجہ (۲) درمیانی درجہ (۳) کم درجہ

۱۔ البتہ اضطراری حالت میں کہ بھوک و پیاس کی شدت سے مرنے کا خوف ہو بغیر اجازت کے لینا بھی اس قدر جائز ہے جتنی مقدار بھوک و پیاس کی شدت نہ رہے۔

(۱) اعلیٰ درجہ سخت مجبوری اور حالت اضطراری کا ہے۔ مثلاً بھوک سے مرض لاحق ہوا جس سے ہلاکت اور مرنے کا اندیشہ ہو یا ننگا ہو کہ ستر چھپانے کے لئے کوئی چیز نہیں تو ایسے شخص کے لئے سوال کرنا جائز بلکہ بعض حالات میں واجب ہے بلکہ بعض شدید حالات میں بن مانگے بھی کچھ لینا جائز ہے کہ اس سے اضطراری حالت ختم ہو جاوے۔

جس سے مانگا جائے اس کے لئے احکام!

یہ جو کچھ لکھا گیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ فقراء اور بھیک مانگنے والوں کو ڈانٹنے اور پیٹنے کا کام شروع کیا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سخت مجبور نہ ہو تو وہ سوال سے بچ جائے ورنہ اس کا سوال حرام اور اس کا کمایا ہوا مال بھی حرام ہے اور جس شخص سے سوال کیا جائے۔ اس کے احکام جدا ہیں۔

آج کل کی غفلت!

لیکن آج کل ایک عجیب فضا چل پڑی ہے کہ جس شخص کے اپنے اوپر جو فرائض اور حقوق دوسروں کے عائد ہوتے ہیں ان کی ادائیگی سے تو غفلت برتا ہے مگر دوسروں کے ذمہ جو حقوق واجب ہوتے ہیں اور دوسروں کے لئے جو احکام ہیں ان کو ڈھونڈتا پھرتا ہے منبر پر جو باپ کے حقوق کا بیان ہوگا تو باپ یہ نہیں سوچتا کہ میرا بھی باپ ہے یا تھا اس کے لئے بھی یہی حقوق ہیں لیکن وہ اپنے باپ کے حقوق کی ادائیگی کے بجائے اپنے بیٹے سے اپنے حقوق کا طالب ہوتا ہے اور پھر اپنے بیٹے کے حقوق کی ادائیگی کے بجائے اپنے بیٹے سے اپنے حقوق کا طالب ہوتا ہے اور پھر جب بیٹے کے حقوق کے بیان کا نمبر آتا ہے تو باپ بیٹے کے حقوق سے غفلت برتا ہے لیکن بیٹے کی نظریں اپنے باپ کی تلاش میں رہتی ہیں کہ وہ بھی یہ بیان سنے تاکہ میرے حقوق ادا کرے۔ تو جب ہر کوئی اپنی ذمہ داری کو چھوڑ کر دوسروں سے اپنے حقوق مانگتا رہے تو معاشرہ میں بگاڑ اور بے چینی کا ہونا لازمی ہے اور آج کل معاشرہ میں جو خرابیاں دیکھی جا رہی ہیں اکثر اسی طرز اور طریق کی پیداوار ہیں عرض یہ کرنی تھی کہ ساری وعیدات اور برائیاں تو اس شخص کیلئے ہیں جو بغیر ضرورت کے سوال کرتا ہے اور جس شخص سے مانگا جاتا ہے اس کیلئے یہ حکم ہے کہ وہ کسی سائل فقیر و مسکین کو نہ جھڑکے بلکہ اس پر شفقت فرمائے جو بس میں ہے دے دے کچھ نہیں دے سکتا تو اس سے نرمی سے بات کر کے اچھی طرح رخصت کر دے۔ جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (یعنی سائل کو مت جھڑکو) (سورۃ الضحیٰ: ۱۰)

جس کا مطلب یہ ہے کہ جو کوئی سوال کرے خواہ مالی ہو یا عملی اس کو نہ جھڑکوا اگر سوال پورا کرنے کی قدرت ہے تو پورا کرو بشرطیکہ ناجائز سوال نہ ہو اور اگر پورا نہیں کر سکتے تو نرمی سے عذر کر دیجئے اور اگر اس کو کچھ دیدیا تو بھی طعن و تشنیع نہ کریں بہر حال سائل کی دل شکنی سے پرہیز کرنا چاہئے البتہ اگر سائل کسی طرح نہ مانے اور بہت تنگ کرتا ہے تو بوقت ضرورت جبر بھی جائز ہے۔

صاحب مشکوٰۃ نے ترمذی اور نسائی سے ایک لمبی حدیث نقل کی ہے اس میں یہ ہے کہ تین آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے ان میں سے ایک اس شخص کا بھی ذکر آیا ہے کہ وہ ایک آدمی کسی مجمع سے سوال کرے یا کرنے آیا محض اللہ تعالیٰ کے واسطے سوال کرتا ہے کہ اس کی لوگوں سے کوئی قرابت اور رشتہ داری (وغیرہ) نہ تھی ایک شخص مجمع سے اٹھا اور چپکے سے سائل کو کچھ دے دیا جس کی خبر بجز اللہ تعالیٰ کے اور اس سائل کے کسی اور کو نہ ہوئی (تو یہ دینے والا شخص اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے)۔ (مشکوٰۃ)

نیز حضرت حسین بن علیؑ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(للسَّائِلِ حَقٌّ وَإِنْ جَاءَ عَلَى فَرَسٍ) (احمد و ابوداؤد و مشکوٰۃ)

یعنی ”سائل کے لئے اس کا حق ہے کہ اس کو دیا جائے اگرچہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔“

مطلب یہ ہے کہ سائل یعنی مانگنے والا ہر صورت میں کچھ دیئے جانے کا مستحق ہے اس کو خالی ہاتھ واپس نہ کرنا چاہئے اگرچہ گھوڑے پر سوار ہو کر تمہارے پاس مانگنے آئے کیونکہ اگر اس کو سوال کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ اپنے آپ سے سوال کر کے ذلیل و خوار نہ ہوتا تو ضرور اس کی کوئی ضرورت ہوگی ایسی جس کا آپ کو علم نہیں۔ یہاں مسلمان کو حسن ظن کی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ کسی پر خواہ مخواہ بدگمانی نہ کرے بلکہ لوگوں پر اچھا گمان رکھیں۔

غرض جب تک یقینی طور پر کسی کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ یہ شخص بغیر ضرورت کے سوال کر رہا ہے تو اس کو کسی طرح نہ جھڑکے، محض شک و گمان پر کہ یہ سائل پیشہ ور ہوگا یا اس کو بظاہر تندرست دیکھ کر اس سے منہ نہ موڑے ہو سکتا ہے اس پر بھاری ضمان آیا ہو یا مسافر ہوگا کسی ظالم نے اس کا مال چرایا ہوگا یا اس پر کوئی اور ایسی مصیبت آئی ہوگی جس نے اس کو سوال پر مجبور کیا ہوگا تو جب تک کسی سائل شخص کے بارے میں قطعی طور پر معلوم نہ ہو کہ یہ بغیر ضرورت کے سوال کرتا ہے اس وقت تک سوال کرنے والے کو سچا سمجھ کر اس کی مدد و خدمت کیجئے ورنہ کم از کم اس کی دل آزاری اور دل شکنی سے تو ضرور بچئے البتہ کسی کے متعلق تحقیق اور یقین ہو جائے کہ اس نے سوال کو پیشہ بنالیا ہے صحت مند و تندرست بھی ہے اور بغیر ضرورت کے سوال کر رہا ہے تو ایسے سائل کو دینا اور اس کو سوال سے نہ روکنا

دوسرے لوگوں کو بیکار اور نکما بنا دیتا ہے اور ایسے لوگوں کو کچھ دینا اور جو حقیقت میں حاجت مند ہیں لیکن شرم کے مارے سوال نہیں کرتے ان کو نہ دینا بڑا ظلم ہے۔

**لوگوں سے طمع کرنا کیا ہوتا ہے اور ہدیہ کو قبول کرنا چاہئے!**

اس کی حقیقت یہ ہے کہ لوگوں سے دل میں کسی ایسی چیز کا طلب گار ہونا جس کو اگر ان سے مانگا جائے تو اس میں ذلت و شرمندگی اٹھانی پڑے پس اگر کسی کو بہت قریبی دوست کے پاس جانا ہے یا عزیز واقارب کے پاس جانا ہوا اور راستہ میں مثلاً چائے اس لئے نہیں پی کہ دوست یا رشتہ دار پلائے گا تو یہ طمع میں داخل نہیں کیونکہ اگر اس دوست و رشتہ دار سے چائے مانگ بھی لے تو اس سے شرمندگی اور رسوائی اٹھانی نہیں پڑے گی البتہ جہاں اس کے اظہار میں رسوائی و ذلت اٹھانی پڑتی ہے یا چیز ایسی ہے کہ اگر اس کو بظاہر مانگا جائے تو دوست اور رشتہ دار کے سامنے بھی ذلت و رسوائی ہوگی مثلاً بڑی رقم مفت مانگنا یا کوئی اور قیمتی چیز کا لوگوں سے دل میں طلب کرنا طمع میں داخل ہے بغیر کسی طمع و لالچ کے کسی کو مل جائے تو اس کے لینے میں مذافقہ نہیں چنانچہ حضرت حکیم بن حزام رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دے دیا پھر مانگا پھر مجھے دے دیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے حکیم یہ مال سبز و شاداب ہے جو شخص اس کو بغیر طمع اور نفس کی بے پرواہی سے لے اس کیلئے اس میں برکت ڈالی جاتی ہے اور جو نفس کے طمع کے ساتھ لیتا ہے اس کے واسطے اس میں برکت نہیں ہوگی اس کی مثال اس شخص کی سی ہے (جس کو جوع البقر کا مرض لاحق ہو) جو کھاتا ہے وہ سیر نہیں ہوتا اوپر کا ہاتھ (یعنی دینے والا ہاتھ) نچلے ہاتھ (یعنی پھیلانے والے) سے بہتر ہے (حضرت حکیم رحمہ اللہ کہتے ہیں) کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے کسی حال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سوال نہیں کروں گا (یعنی کسی سے سوال نہیں کروں گا) یہاں تک کہ میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ (متفق علیہ، مشکوٰۃ)

حضرت خالد بن علی رضی اللہ عنہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جس شخص کو بغیر سوال کے اور بغیر اشراف نفس (طمع و حرص) کے اپنے بھائی کی طرف سے کوئی چیز پہنچے تو اسے قبول کر لینا چاہئے اور اس کو رد نہ کرنا چاہئے یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روزی ہے جو اس کو بھیجی گئی ہے۔ (احمد بن حبان)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ بے مانگے کوئی چیز دلوائے اس کو قبول کرنا چاہئے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو روزی بھیجی گئی ہے۔ (ترغیب: ج ۱ ص ۵۹۹)

البتہ ضروری یہ ہے کہ وہ مال حرام نہ ہو اگر وہ مال یقینی طور پر حرام ہے یا اس شخص کی غرض رشوت ہے یا زکوٰۃ کی

نیت سے دے رہا ہے اور زکوٰۃ آپ پر لگتی نہیں یا اپنی شہرت یا اپنی نمود کی غرض سے دے رہا ہے یا کسی اور فاسد نیت سے دے رہا ہے ایسی صورتوں میں لینا جائز نہیں البتہ اگر محض ہدیہ ہے تو اس کا قبول کرنا سنت ہے اور اگر ہدیہ کی مقدار میں لے لینے والے پر منت و احسان اور بوجھ ہو تو اس میں سے کچھ مقدار لینے میں اور کچھ مقدار واپس کر دینے میں بھی مضائقہ نہیں۔

### طمع کا علاج!

(۱) اپنی استطاعت کے مطابق خود کام کیا کریں تاکہ دوسروں کی طرف نظر نہ ہو۔  
 (۲) جو ضرورت پیش آئے اللہ تبارک و تعالیٰ سے مانگ لیا کریں دو رکعت نفل صلوٰۃ الحاجت پڑھیں۔  
 (۳) اللہ تبارک و تعالیٰ سے یوں دعا کرتے رہیں کہ یا اللہ میری ہر طرح کی جائز حاجات کو اپنے فضل سے پورا فرما اور جاہ و منصب اور حرص و طمع اور عیش و عشرت سے حفاظت فرما۔ جہاں پر طمع ہو یا وہ زہد و قناعت کے رنگ میں رنگا ہو جاہ و منصب اور عیش و عشرت ہو اس سے دور رہے اور مادی قوتوں اور دنیا کے جاہ و منصب کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھائے ہماری اسلامی تاریخ پر نظر دوڑائیں، تو اول سے لیکر آج تک جن شخصیتوں نے بڑے بڑے اصلاحی انقلابات پیدا کئے کفر، شرک کے طوفان و ظلم و فحاشی کے سیلاب کے رخ کو موڑ دیا وہ اس زہد و قناعت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے، وہ اپنی نفسانی خواہشات پر قابو حاصل کر چکے تھے مادی قوتوں اور دولت مندوں مالداروں دنیاوی جاہ و منصب رکھنے والوں کا رعب اور ان کی طرف کشش ان کے اندر سے ختم ہو چکی تھی اس لئے وہ کسی بھی طاغوتی قوت کے سامنے جھکنے کے بجائے اس کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے تھے اور دنیا میں بڑے بڑے اصلاحی انقلابات لاتے تھے اور زہد و قناعت کی یہ دولت اور اسی طرح کے دوسری اچھی خصلتیں عموماً ان لوگوں کو ملتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر کو اپناتے ہیں اور یہی وہ راہ ہے جس کو سلوک و احسان، تقویٰ، تصوف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جس کے مٹانے اور ختم کرنے کے لئے طاغوتی اور شیطانی قوتیں پورے منظم طور پر کوشش کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو زہد و قناعت وغیرہ جیسے اچھے اخلاق و خصلتوں کی دولت سے مالا مال کر کے دنیا و آخرت میں کامیاب کر دے۔ اور جہاں سے میرا وہم و گمان نہ ہو وہاں سے روزی کا انتظام فرمائیے۔

(۴) اگر کسی سے طمع ہو جائے کہ کوئی چیز وہ دیدے اگر اس نے کچھ دے دیا تو اس کو ایسی جگہ خرچ کر دے مثلاً آپ کا اس دینے والے پر کچھ قرض ہے وہ ہدیہ اس غرض سے دے رہا ہے کہ تاکہ کچھ وقت قرضہ لینے کا تقاضہ کرے تو یہ سود کے ساتھ رشوت بھی ہے یہی حال حاکم کا ہے اس کا بیان ”قاضی کے بیان“ میں موجود ہے۔



جس سے آپ کی کوئی ضرورت پوری نہ ہو اور نہ آپ کی شہرت ہو، مثلاً کسی اندھے کو خفیہ دے دیں کہ اس اندھے کو پتہ بھی نہ چلے ورنہ کسی دوسرے شخص کو یا مثلاً کسی چندہ والے صندوق میں ڈال دیں کہ کسی کو اس کا پتہ نہ چلے۔  
(۵) کفایت شعاری سے کام لیا کریں یعنی ہر چیز میں اسراف سے بچیں۔

### زہد و قناعت کے فوائد کا خلاصہ!

خلاصہ یہ کہ دنیا کی محبت حرص و لالچ، سوال و طمع اور اس کے برعکس زہد و قناعت مخلوق سے استغناء دنیا سے بے رغبتی کے متعلق تفصیلی بحث آپ کے سامنے آگئی جس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی محبت اور نفسانی خواہشات کی بے راہ روی انسان کے دل و ضمیر کو مردہ کر دیتی ہے انسان کے اندر خسیس خصلتیں پیدا کرتی ہے اور یہی حرص و محبت تمام برائیوں کی بے اطمینانی بے چینی کی بنیاد بنتی ہے اور انسان کی دنیا و آخرت کو برباد کر دیتی ہے اور اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ و آخرت سے محبت اور دنیا سے بے رغبتی زہد و قناعت انسان کے اندرونی قوتوں کو جگا کر اس کے اندر عظیم صلاحیتیں پیدا کرتی ہیں اور روحانی ترقیوں میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور انسان کی دنیا و آخرت کو سنوارتی ہیں اس کی وجہ سے دنیا و آخرت میں چین و سکون پالیتے ہیں اور یہی زہد و قناعت ہے جو کہ قائدین اسلام کے لئے سخت ضروری بلکہ شرط اول ہے کیونکہ یہ صفت نہ ہو تو وہ اسلام اور مسلمانوں کو دنیا میں بیچ ڈالے گا یا کم از کم وہ مادی قوتوں اور مال و دولت والوں کے سامنے بھٹکے گا۔

### زہد و قناعت کے فوائد!

آخر میں مختصر طور پر زہد و قناعت کے فوائد کو لکھ دیتے ہیں۔

(۱) زہد و قناعت سے جو چیز حاصل ہوتی ہے ان میں سے پہلی چیز ذہنی یکسوئی ہے دنیا کی چیزوں دنیا کی راحت و عزت اور لذت سے جتنا زیادہ تعلق ہوگا اتنے ہی زیادہ خیالات منتشر ہوں گے اور یہ تعلق جتنا کم ہوگا اتنے ہی خیالات مجتمع اور یکجا ہوں گے۔

(۲) خیالات کی یکسوئی جس مسئلہ پر مرکوز ہوگی وہ اس کا حل تلاش کر کے آپ کے سامنے رکھ دے گی۔

(۳) اس سے روح میں لطافت پیدا ہوتی ہے، انسان جس قدر دنیا کی عزت و منصب اور مال وغیرہ سے دل لگائے رکھتا ہے اور جتنا اس میں مشغول ہوتا ہے اس کی روح میں اسی قدر کثافت پیدا ہوتی ہے اور جتنا اس سے اپنے آپ کو دور رکھے گا اتنی ہی اس کی روح پاک و خالص ہوگی۔

(۴) حقائق غیر مادی اشیاء ہوتے ہیں اور جو روح دنیا کی الائنسوں میں پھنسی ہوئی ہو وہ حقائق کو بے نقاب حالت میں نہیں دیکھ سکتی اس کا مشاہدہ ہمیشہ دھندلا ہوتا ہے ایسے لوگ اپنے اور اپنی عادتوں اور لذت وغیرہ کے حصول کے معاملہ میں تو نہایت حساس ہوتے ہیں مگر ایسے معاملات جو اللہ تعالیٰ اور آخرت سے تعلق رکھتے ہیں جو اس کی ابدی زندگی کو بہتر یا بدتر بنانے والے ہیں ان کو وہ اس طرح نظر انداز کرتے ہیں گویا ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں اس کے برعکس زہد و قناعت کی وجہ سے روح دنیا کی کشافتنوں اور الائنسوں سے دور رہتی ہے اور اس کے نازک اور لطیف احساسات بیدار رہتے ہیں اور یہی لطیف احساسات اعلیٰ ترین حقائق کا ادراک کرتے ہیں۔ اور بندے پر ابدی زندگی کے حقائق کو کھول دیتے ہیں۔

(۵) زہد اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان و یقین کا ایک فطری اظہار ہے جب کوئی شخص اعلیٰ حقیقتوں کو پالیتا ہے تو ادنیٰ حقیقتیں اور دنیا کا منصب و لذت وغیرہ خود بخود اس کی نگاہ میں حقیر بن جاتے ہیں اور اخروی اور ابدی قدروں کی اہمیت کا احساس دنیوی قدروں کو غیر اہم بنا دیتا ہے اور یہی وہ پیشگی جنت اور اطمینان والی زندگی ہے جو قانع اور زہد کو اس دنیا میں ملتی ہے اور آخرت کی ابدی جنت کی نعمتوں کا تو اس دنیا میں تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔

(۶) نیز زہد ضروریات زندگی میں کمی پیدا کر دیتا ہے اور یہی چیز اطمینان بخش با مقصد زندگی پیدا کرتی ہے ہر با مقصد آدمی فطرۃً ایک تضاد میں مبتلا کیا گیا ہے ایک طرف اس کا ایک مقصد ہے جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ساری توجہ اس کی طرف لگا دی جائے اس توجہ کو بالکل ختم نہیں کیا جاسکتا ایسی صورت میں بہترین عقلمندی یہ ہے کہ ضروریات زندگی میں کمی کر دی جائے اور ضروریات زندگی کی اس کمی کی وجہ سے ایک تو آدمی مقصد میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کے قابل بن جاتا ہے اور جس قدر ضروریات زندگی میں کمی ہوگی اسی قدر زیادہ سوز و اخلاص پیدا ہوگا اور دنیا میں بھی حقیقی معنوں میں زیادہ طاقتور وہی ہوتا ہے جس کی ضروریات مختصر ہوں جس کی آرزوئیں محدود ہوں جو لذت و جاہ کا طالب نہ ہو اور یہی وہ اچھی اور اطمینان بخش زندگی ہے۔ اچھی زندگی اس کا نام نہیں کہ آدمی کے پاس زندگی کے ساز و سامان کی کثرت اور بہتات ہو بلکہ اچھی زندگی کا راز قناعت ہے قناعت کی دولت اس کو ملتی ہے جو بقدر ضرورت چیز پر راضی اور خوش رہے اور جو شہرت و منصب سے بے نیاز ہو کر جینا جانتا ہو اور بقدر ضرورت روزی پر مطمئن نہ ہونا حرص و لالچ کی بنا پر ہوتا ہے اور حریص آدمی کو کبھی اطمینان نصیب نہیں ہوتا کیونکہ بقدر ضرورت کی تحدید ہے مگر حرص کی کوئی حد نہیں۔

(۷) نیز انسان کی خواہش لامحدود ہیں اور دنیا کی چیزیں محدود، آدمی دنیا کی چیزیں اور لذتیں کتنی ہی زیادہ

حاصل کر لے وہ اس کے اطمینان و تسکین کے لئے ہمیشہ ناکافی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ پانے والا حریص شخص بھی اس دنیا میں اسی طرح پریشان رہتا ہے جتنا کہ کم پانے والا حریص شخص، لہذا اس دنیا میں اگر کوئی چیز آدمی کے اطمینان و تسکین کا ذریعہ بن سکتی ہے تو وہ زہد و قناعت ہے۔

(۸) خلاصہ یہ کہ زہد و قناعت آدمی کو دنیا میں غیر ضروری طور پر الجھنے سے بچاتا ہے اور اس طرح وہ اس کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی قوت کو زیادہ سے زیادہ آخرت کے کاموں میں لگا سکے اور یہی چیز ایک طرف آدمی کے لئے دنیا میں پیشگی جنت کا سبب اور آخرت میں ابدی جنت کا سبب بنتی ہے۔

☆.....☆.....☆

www.daruleeman.com

## حسد کا بیان!

حسد ایک خطرناک اور تباہ کن روحانی اور باطنی بیماری ہے اور اس بیماری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی بربادی ہے۔

## حسد کے معنی!

حسد ایک ایسی ذہنیت ہے جس کی رو سے تمنا کی جاتی ہے کہ دوسرے پر اللہ تعالیٰ کا جو کچھ دینی یا دنیوی فضل و کرم و انعام ہوا ہے، وہ اس سے چھین کر مجھے مل جائے اور اگر مجھے نہ بھی ملے تو کم از کم اس سے ضرور چھین جائے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو علم و فضل یا مال و دولت اور عزت و شہرت یا صحت یا منصب و اقتدار یا کوئی اور دینی و دنیوی نعمت دی ہے، اب دوسرے شخص کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ نعمت اسکو کیوں ملی؟ اور وہ اس نعمت کو دوسرے کے لئے پسند نہیں کرتا اور اسکی خواہش یہ ہوتی ہے کہ یہ نعمت اس سے چھین جائے اور مجھے مل جائے یا اگر مجھے نہیں بھی ملتی تو کم از کم اس کے پاس تو نہ رہے۔ اس لئے جب اس شخص پر کوئی مصیبت آتی ہے یا اسکے خلاف کوئی بات آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اور اگر اس کو نعمت میں ترقی ملتی رہتی ہے تو اسکے دل میں جلن ہوتی ہے کہ یہ کیوں آگے بڑھ رہا ہے۔

## عجبطہ اور رشک!

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ دوسرے کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر صرف اسکی خواہش کرنا حسد نہیں بلکہ اسکو عربی میں 'منافسہ' یا 'عجبطہ' اور اردو میں رشک کہا جاتا ہے۔ رشک یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت دیکھ کر دل میں یہ خواہش پیدا ہو کہ جس طرح اس شخص پر اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہوا ہے اور اسکو یہ نعمت ملی ہے، ایسی نعمت اللہ تعالیٰ مجھے بھی عطا فرمائے اور اسکو اس نعمت کے حاصل کرنے کی خواہش ہو۔

رشک کا خلاصہ یہ ہے کہ صرف کسی نعمت کے حاصل کرنے کی خواہش اور اسکے حاصل کرنے کی کوشش تو ہو لیکن اسکے ساتھ اسکے دل کے کسی گوشے میں بھی یہ تمنا نہ ہو کہ یہ نعمت دوسرے سے چھین کر مجھے ملے۔ اور یہ رشک کوئی بد اخلاقی نہیں بلکہ دینی اور آخرت کے امور میں یہ پسندیدہ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ آخرت میں جنت کی نعمتیں بیان کر کے فرماتا ہے کہ:

﴿وَفِي ذَلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ﴾

”اور یہ چیز ہے کہ جس کی رغبت کرنے والوں کو رغبت کرنا چاہئے“۔ (التطہیف: آیت ۲۶)

مطلب یہ کہ جنت ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی طلب میں طالبوں کو سرگرم ہونا چاہئے اس میں ایمان والوں

کو تشویق و ترغیب ہے کہ مسلمانوں کو خیر و آخرت کے امور میں حریص ہونا چاہئے اور ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ﴾ (الحمدید: آیت ۲۱)

”تم مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور ایسی جنت کی طرف جس کا عرض آسمان و زمین کے عرض کے برابر ہے۔“ اس آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ اہل ایمان کا نصب العین اپنے رب کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہونی چاہئے اور ایمانداروں کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور اس کی جنت کے حصول کیلئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔ دینی امور میں رشک اور مسابقت کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا فَاسْلَطَهُ عَلَىٰ هَلَكَةٍ فِي الْحَقِّ وَرَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يُقْضَىٰ بِهَا وَيُعْلِمُهَا) (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ: کتاب العلم)

”دو اشخاص کے بارے میں حسد کرنا درست ہے، ایک تو وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور پھر اسے راہ حق میں خرچ کرنے کی توفیق عنایت فرمائی اور دوسرا شخص وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت دی تو وہ اس علم و حکمت کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے۔“

اس حدیث میں حسد سے مراد یہی وہ غطبہ اور رشک ہے جس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

دنیاوی امور میں بھی زیادہ رشک نہیں ہونا چاہئے!

اس حدیث میں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ رشک دینی امور، علم و حکمت اور سخاوت وغیرہ میں تو پسندیدہ ہے مگر دنیاوی امور میں زیادہ پسندیدہ نہیں اگرچہ دنیاوی امور میں بھی رشک حرام و ناجائز نہیں لیکن اس کا زیادہ استحضار اور سوچنا پسندیدہ نہیں کیونکہ یہی چیز انسان کو بالآخر حد و حسد میں داخل کرتی ہے۔

حسد کا حکم!

حسد کرنا شریعت مطہرہ میں حرام ہے اور اس سے بچنا فرض ہے۔

حسد کے درجات!

ادنیٰ اسے لیکر اعلیٰ تک حسد کے تین درجات ہیں:

۱۔ حسد کا پہلا اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ دل میں اس کی یہ خواہش ہو کہ ایسی نعمت مجھے حاصل ہو جائے اب اگر اسکے پاس رہتے ہوئے مجھے مل جائے تو بہت اچھا ہے ورنہ اس سے چھین کر مجھے مل جائے تو اس صورت میں اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کو حاصل کرنا ہوتا ہے لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین نہ لی جائے اسکو نہیں مل سکتی اس لئے اس وقت اسکی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے چھین جائے اور اسکو مل جائے۔ حسد کی یہ صورت بھی ناجائز اور ممنوع ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ﴾

”اور تم ایسی چیز کی تمنا نہ کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی“۔ (النساء: آیت ۳۲)

اس سے معلوم ہوا کہ جو نعمت کسی کو حاصل ہو یعنی نہ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہیں۔

۲۔ حسد کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ جو نعمت دوسرے کو ملی ہوئی ہے وہ نعمت اس سے چھین جائے اور مجھے مل جائے۔ حسد کا یہ درجہ پہلے درجے کی نسبت زیادہ مذموم ہے کیونکہ پہلے درجے میں مقصود بالذات نعمت کا حاصل ہونا تھا اور دوسرے کا محروم کرنا مقصود نہ تھا۔ اس درجے میں تو پہلے ہی سے یہ خواہش ہے کہ وہ اس نعمت سے محروم ہو جائے اور یہ نعمت اسکے بجائے مجھے مل جائے، چونکہ یہاں نعمت کا حصول اور دوسرے کی محرومی دونوں بالذات مقصود ہیں اس لئے حسد کا یہ درجہ پہلے درجے کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہے۔

۳۔ حسد کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ دل میں یہ خواہش ہو کہ جو نعمت دوسرے کو ملی ہوئی ہے، وہ اس سے کسی طرح چھین جائے اور اس نعمت کی وجہ سے جو مقام و اعزاز وغیرہ اس کو حاصل ہوا ہے وہ اس سے محروم ہو جائے پھر چاہے وہ نعمت مجھے ملے یا نہیں۔ یہ حسد کا سب سے زیادہ ذلیل ترین، خبیث ترین اور تباہ کن درجہ ہے کیونکہ اس میں اصل مقصود دوسرے کو نعمت سے محروم اور گرا دینا ہوتا ہے۔

### حسد کے اسباب!

(۱) حسد کا پہلا سبب بغض، کینہ اور دشمنی ہے۔ جس شخص کیساتھ دشمنی ہو یا کسی سے دل میں بغض و کینہ پیدا ہو گیا تو ایک دشمن کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اسکے دشمن پر مصیبت آئے اور جب اس پر مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، اسکے برعکس اگر اس پر اللہ تعالیٰ کا کوئی فضل و احسان ہوتا ہے تو اس کو پسند نہیں کرتا اور اسکی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح اس سے یہ نعمت چھین جائے۔

(۲) دوسرا سبب حسب و نسب اور ذاتی فخر کا غلط خیال ہوتا ہے۔ بعض خاندان یا قوم ایسے ہوتے ہیں کہ وہ

ملک و قوم میں معزز سمجھے جاتے ہیں اور ان میں قیادت، سیادت اور سرداری چلی آرہی ہوتی ہیں تو ایسا خاندان یا قوم عزت اور سیادت و سرداری کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھنے لگتا ہے۔ اس لئے جب وہ کسی غیر شخص کو دیکھتے ہیں کہ وہ بلند منصب اور عزت والے مقام پر پہنچ گیا ہے تو یہ منصب و مقام اس خاندان یا قوم کی آنکھوں میں کاٹنا بن جاتا ہے اور وہ اس ترقی اور بلندی کو پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب و مقام کسی طرح اس سے چھن جائے، جیسا کہ عرصہ دراز سے بنی اسرائیل کے خاندان میں نبوت چلی آرہی تھی۔ بالآخر جب یہ عظیم منصب بنی اسرائیل سے نکل کر بنی اسماعیل علیہ السلام یعنی سیدنا محمد الرسول اللہ ﷺ کو مل گیا تو ان کے علماء اور لیڈروں کی اکثریت حسد کی آگ میں جل بھن گئے۔ چنانچہ ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَى مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾

”کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں اس پر جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دیا ہے۔“ (النساء: ۵۴)

اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل اور یہود کی دشمنی کا راز بتلایا گیا ہے کہ ان کو مسلمانوں کے ساتھ جو دشمنی، بغض و کینہ ہے یہ سب کچھ اس حسد کا نتیجہ ہے جو یہ مسلمانوں سے رکھتے ہیں۔ ان کو یہ غم و غصہ ہے کہ نبوت تو ان کے خاندان کا حصہ تھی اور دین کے اجارہ دار تو ہم تھے تو دوسرے کسی شخص کو دین کی نمائندگی کیسے مل گئی اور یہ ان کے خاندان سے نکل کر بنی اسماعیل علیہ السلام کے اندر کیسے چلی گئی؟ اور ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

﴿وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُّوْكُمْ وَنَحْمُكُمْ ۚ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنْفُسِهِمْ ۚ

بَعْدَ مَا بَيَّنَّ لَهُمُ الْحَقُّ﴾

”بہت سے اہل کتاب دل سے چاہتے ہیں کہ تمہارے مومن ہو جانے کے بعد وہ کسی طرح تم کو کافر (دین حق کے منکر) بنادیں اپنے حسد کی وجہ سے باوجود یہ کہ حق ان کے سامنے واضح ہو چکا ہے۔“ (البقرة: ۱۰۹)

مطلب یہ کہ بہت سے اہل کتاب اور یہودیوں کی یہ دلی آرزو ہے کہ کسی طرح تم کو اسلام سے پھیر کر پھر کافر بنادیں حالانکہ ان پر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مسلمانوں کا دین ان کی کتاب اور سیدنا محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر ﷺ ہیں لیکن پھر بھی یہی کرتوت اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے سینوں میں حسد کی آگ سلگتی رہتی ہے جس کی وجہ سے وہ خود بھی دین حق سے محروم ہیں اور دوسروں کے بارے میں بھی یہی چاہتے ہیں کہ وہ بھی اس عظیم نعمت



سے محروم ہو جائیں۔

(۳) حسد کا تیسرا سبب کسی کا کسی کے حلقہ اثر سے یا اسکی جماعت سے نکل جانا ہے۔ جب کوئی شخص کسی کا مطیع اور فرمانبردار اور زیر اثر یا کسی جماعت کا رکن اور اس کے زیر اثر ہوتا ہے، وہ جب کسی وقت کسی شرف و امتیاز کی وجہ سے اس کے حلقہ اطاعت اور فرمانبرداری سے نکل جاتا ہے یا اسکی جماعت سے نکل جاتا ہے تو ایسی صورت میں وہ شخص یا جماعت یہی چاہتی ہے کہ کسی طرح اس کا یہ شرف اور اس کی یہ عزت و شہرت ختم ہو جائے۔

(۴) حسد کا چوتھا سبب یہ ہے کہ جس شخص کو لوگ اپنے غلط خیال میں مال یا خاندان کے لحاظ سے معمولی سمجھتے ہیں، جب ایسے شخص کو کوئی بڑی عزت و شہرت کا مقام و منصب مل جائے تو لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اس کے اس شرف اور اس مقام عزت کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ مقام اس سے چھین جائے جیسا کہ بنی اسرائیل طالوت کو اپنی قوم میں ایک معمولی آدمی سمجھتے تھے جبکہ ان کے نبی شموئیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے طالوت کو ان کا بادشاہ اور سپہ سالار مقرر فرمایا تو انہوں نے ان کیلئے بادشاہت اور سپہ سالاری کو صرف اس بنیاد پر پسند نہیں کیا کہ وہ مال و دولت وغیرہ جیسی دنیوی اسباب کی رو سے معمولی آدمی سمجھے جاتے تھے، چنانچہ انہوں نے کہا کہ:

﴿قَالُوا اِنِّیْ یُحْسِنُ لَہُ الْمُلُکُ عَلَیْنَا وَنَحْنُ اَحْسَنُ بِالْمُلُکِ مِنْہُ وَلَکُمْ یَوْمٌ سَعَۃٌ مِّنَ الْمَالِ﴾

”کہ اس کو ہمارے اوپر بادشاہی کیسے مل سکتی ہے حالانکہ اس کے مقابلے میں ہم بادشاہی کے زیادہ حقدار ہیں اور اسکو زیادہ مال و دولت بھی حاصل نہیں۔“ (البقرة: آیت ۲۴۷)

یہاں طالوت کی بادشاہی پر بنی اسرائیل کا یہی اعتراض تھا کہ وہ چھوٹے خاندان کا آدمی ہے اور اسکے پاس مال و دولت کی فراوانی بھی نہیں، اس لئے ایسے شخص کا ہم پر بادشاہی کرنے کا کوئی حق نہیں بنتا اور اس وجہ سے وہ اس نعمت کو اس کے لئے پسند نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ نعمت اس سے چھین جائے اور بڑے خاندان اور مال و دولت والے کو مل جائے۔

(۵) حسد کا پانچواں سبب دو شخصوں کا مقصد ایک ہی چیز کا حصول ہو، ایسی صورت میں جب ایک شخص دیکھتا ہے کہ دوسرے کو اس چیز کے حصول میں کامیابی ہو رہی ہے تو وہ اسکا بدخواہ ہو جاتا ہے، مثلاً ایک آدمی کی دو بیویاں ہیں، ہر ایک چاہتی ہے کہ شوہر مجھ سے زیادہ محبت کرے۔ اسلئے اکثر یہی ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی بدخواہ ہوتی ہیں، پھر جب کسی ایک کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو دوسری کا حسد اور بڑھ جاتا ہے۔ یہی حال

ایک حلقہ میں الیکشن کے دو امیدواروں کا اور ایک ہی گاہک پر دو تاجروں کا اور ایک ہی لڑکے کے یا لڑکی کے رشتہ پر دو امیدواروں کا ہوتا ہے۔ اسی طرح جو دو شخص بھی کسی ایک چیز کو حاصل کرنا چاہتے ہوں تو دونوں کے درمیان رشک و حسد پیدا ہوتا ہے۔

(۶) حسد کا چھٹا سبب جاہ پرستی اور سیادت و شہرت کی حد سے بڑھتی ہوئی بھوک ہے۔ جس شخص کو کسی لائن سے عزت و شہرت حاصل ہو تو ایسے شخص کو جب معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ اس عزت و شہرت اور سیادت و سرداری میں اس کا شریک ہو گیا ہے تو یہ بات اس کو سخت گراں گزرتی ہے۔ اور اسکی خواہش ہوتی ہے کہ جس شرف اور شہرت و سیادت میں دوسرا شخص اسکے ساتھ برابر اور مساوی ہو رہا ہے کسی طرح یہ شرف اور مقام عزت اس سے چھین جائے تاکہ اس لائن میں اس میدان میں کوئی اس کے برابر نہ رہے۔ اور اس لائن میں صرف میری ہی سیادت، سرداری اور امتیازی اور سب سے بڑھی ہوئی شہرت قائم رہے۔ ایک علاقے کے دو ہم پلہ علماء اور دو خوانین اور دو سرداروں اور پیروں وغیرہ کے درمیان جو حسد ہوتا ہے وہ اکثر اسی جاہ پرستی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک عالم کسی تاجر پر اور ایک تاجر کسی عالم و پیر وغیرہ سے حسد نہیں کرے گا بلکہ ہر لائن والا اپنے ہی لائن والوں کے ہم پلہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں۔

(۷) حسد کا ساتواں سبب نفس کی خباثت ہے۔ بعض لوگ اس قدر اپنی فطرت کو مسخ کر دیتے ہیں کہ وہ ہر کسی کے بدخواہ ہوتے ہیں۔ جب بھی کسی پر ذلت و رسوائی یا مصیبت کی حالت آ جاتی ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں اور جب بھی کسی پر نعمت کو دیکھتے ہیں تو انہیں یہ نعمت ناگوار ہوتی ہے اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح اس سے یہ نعمت زائل ہو جائے۔ حسد کی اس قسم میں صرف حسد کی خباثت نفس ہی کام کرتی ہے اور اسی وجہ سے وہ ہر شخص سے حسد کرتا ہے۔

حسد کے اسباب اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔

اسباب حسد کا خلاصہ!

اگر حسد کے اسباب کو سوچا جائے تو یہ سمٹ کر تین ہو جاتے ہیں:

(۱) دشمنی اور عداوت۔

(۲) دنیاوی مال و جاہ اور منصب کی محبت۔

(۳) تکبر کی وجہ سے نفس کا انتہائی درجہ غیث ہونا۔

## ظلم و فسق کے خاتمے کیلئے ظالم و فاسق سے نعمت کے زوال کی خواہش حسد نہیں!

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ جو نعمت مثلاً مال و دولت یا منصب و اقتدار کسی ظالم اور فاسق کو ملے اور وہی دولت و مال اقتدار وغیرہ نعمت اسکے فسق و ظلم کا باعث بنے تو ایسی نعمت کا زوال چاہنا حسد نہیں بلکہ یہ دراصل ظلم و فسق کے خاتمہ کا چاہنا ہے کہ ظلم و فسق مٹ جائے جیسا کہ حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام بالآخر اللہ تعالیٰ کے سامنے گر گڑے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فرعون اور اسکے ساتھ ظلم و فسق میں شریک مددگار فرعونوں کے حق میں بددعا کی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَقَالَ مُوسَىٰ رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَآئِهِ زِينَةً وَأَمْوَالًا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا رَبَّنَا لِيُضِلُّوهُنَّ عَنْ سَبِيلِكَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوُ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ﴾

”اور موسیٰ (علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) نے دعا کی کہ اے ہمارے رب! تو نے فرعون اور اسکے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں رونق (شان و شوکت) اور مال و اسباب دیا ہے، اے ہمارے رب، وہ تیری راہ سے لوگوں کو بھٹکائیں۔ اے ہمارے رب انکے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ وہ ایمان نہ لائیں یہاں تک کہ دیکھ لیں دردناک عذاب کو۔“ (الیونس: آیت ۸۸)

مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار فرعون اور اسکے مددگاروں کو تو نے دنیا کی زیب و زینت، شان و شوکت اور مال و اسباب سے مالا مال کر دیا ہے، یہ سب کچھ تو ان کو اس لئے دیا گیا کہ وہ اس کو حق کی خاطر خیر کے کاموں میں خرچ کریں اور ان نعمتوں کی وجہ سے منعم حقیقی اللہ رب العالمین کو پہچانیں اور شکر گزار بندے بنیں، مگر یہ شان و شوکت اور مال و اسباب آخر کار شکر گزاری کے بجائے سرکشی اور فساد کا سبب بنے اور انہوں نے ان نعمتوں کو صرف اس لئے استعمال کیا کہ ان کے ذریعے ظلم و فسق کو پھیلانیں اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ سے دور کریں اور ان کو راہ حق سے بھٹکائیں۔ ہمارے پروردگار ان کو مزید مہلت نہ دے کہ تیری مخلوق کو مزید گمراہ کر دیں۔

## پیغمبر کی بددعا اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا اعلان و ترجمان ہوتی ہے!

یہاں اس بات کو بھی یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور اسکے پیغمبر کی بددعا اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا اعلان و ترجمان ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام دراز مدت تک فرعون اور اسکے ساتھیوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہے، ان کو دینی دعوت پیش کرتے رہے اور آسمان و زمین وغیرہ کی قدرتی نشانیاں اور دلائل نبوت

دکھائیں، حتیٰ کہ ان کو خود بھی یقین ہو گیا کہ یہ حق ہے اور ان پر حق کا حق ہونا پوری طرح واضح کر دیا لیکن پھر بھی وہ تکبر، ضد و عناد کی وجہ سے ظلم سے باز نہیں آئے، بالآخر جب وہ فرعون اور اس کی قوم سے مایوس ہو گئے، یہی وہ مرحلہ ہے جس کے بعد قومیں تباہ و برباد ہو جاتی تھیں۔ اور اس وقت نبی جو بددعا کرتا ہے وہ عین اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا اعلان ہوتی ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگا دی جائے اور ان کے اندر قبول حق کی ادنیٰ صلاحیت بھی باقی نہیں رہی ہے، اب اس کے بعد بھی وہی اگر اللہ تعالیٰ کی زمین پر باقی رہے تو دوسروں کی گمراہی کا ذریعہ تو ہو سکتے ہیں لیکن ان کے اندر سے کسی خیر کے پیدا ہونے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اور یہی وہ مرحلہ ہے جس میں حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوم کے ظالم اور متکبر لوگوں کیلئے ان الفاظ میں بددعا کی تھی:

﴿وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْنِي عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا إِنَّكَ إِن تَذَرْنِي يَضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا﴾

”اور نوح (علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) نے دعا کی اے میرے رب! تو زمین پر (ان) کافروں میں سے کسی کو نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان سے جو بھی پیدا ہوگا وہ بدکار اور سخت (ناشکرا) کافر ہی ہوگا۔“ (النوح: آیت ۲۶-۲۷)

اور نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ بددعا کب کی؟ اس کا جواب بھی قرآن مجید میں موجود ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ لَّنْ يُؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدَّامَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ وَاصْنَعْ الْفُلَكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحِينَا وَلَا تَخَاطِبُنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُمْ مُّغْرَقُونَ﴾

”اور نوح (علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کی طرف وحی کی گئی کہ اب تمہاری قوم میں سے ہرگز کوئی ایمان نہیں لائے گا سوائے اس کے کہ جو (اب سے پہلے) ایمان لا چکا ہے، پس تم ان کاموں پر غمگین نہ ہو جو وہ کر رہے ہیں اور ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق تم کشتی بناؤ اور ظالموں کے حق میں مجھ سے (کوئی) بات نہ کرو، بیشک یہ لوگ غرق ہو کر رہیں گے۔“ (الہود: آیت ۳۶-۳۷)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے اندر ایمان و حق کو قبول کرنے کی صلاحیت تھی، وہ ایمان لا چکے ہیں اور اب کوئی ایمان لانے والا باقی نہ رہا ہے اور وہ جو کثرت کر رہے ہیں اس سے غمگین اور دل شکستہ نہ ہو، اب سنت الہی

کے مطابق ان کے فیصلے کا وقت آچکا ہے اور اب یہ لوگ غرق ہو کر رہیں گے۔

### ظلم و فسق مٹانے کی علامات!

خلاصہ یہ ہوا کہ جہاں صرف ظلم و فسق مٹانا ہی مقصود ہو، کسی کی بدخواہی مد نظر نہ ہو، مثلاً ظالم فاسق حکمران سے اقتدار کے چھن جانے کی خواہش کرنا یا ایسے شخص سے مال اور شان و شوکت کے چھن جانے کی آرزو کرنا جو اپنے مال اور شان و شوکت کا بے جا استعمال کرتا ہے اور وہ اس کے ذریعے لوگوں پر ظلم ڈھاتا ہے یا اسکے ذریعے سے بے حیائی پھیلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ سے دور کرتا ہے اور اسکے ذریعے اللہ تعالیٰ کے دین میں رکاوٹیں ڈالتا رہتا ہے تو ایسے شخص سے مال و دولت اور شان و شوکت و اقتدار وغیرہ کا چھن جانا حسد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے خیر خواہی اور ظلم و فسق کے مٹ جانے کی خواہش ہے کیونکہ یہی مال و دولت اور شان و شوکت اسکے ظلم و فسق کا سبب بنا ہوا ہے اور حسد وہ ہوتا ہے جس میں اپنی خیر خواہی اور دوسرے کی بدخواہی صرف اس لئے مراد ہوتی ہے تاکہ اسکو جو نعمت حاصل ہے وہ اسے چھن کر مجھے مل جائے اور اگر مجھے نہ بھی ملے، اس سے تو بہر حال چھن جائے۔ حاسد اور ظلم و فسق کے مٹ جانے کی خواہش میں فرق یہ ہے کہ ظالم یا فاسق جب توبہ کر لے تو پھر یہ نیک خواہ آدمی اسکے بارے میں زوال نعت کی خواہش سے باز آ جاتا ہے اور پھر وہ اس کا نیک خواہ بن جاتا ہے اور حاسد تو آخر تک اس کا بدخواہ ہی رہتا ہے۔

### دنیا و آخرت میں حسد کی تباہیاں!

قرآن و حدیث نے حسد کو بڑی تخریبی ذہنیت قرار دیا ہے اور یہ ایک ایسی بیماری ہے کہ حاسد کی نیکیوں اور اخلاق کو بھی برباد کرتی رہتی ہے اور اسکی زندگی کو بے چینی اور پریشانی کی آگ میں ڈال دیتی ہے۔ حاسد تمام عمر حسرتوں میں گھلتا رہتا ہے اور بعض لوگ اس نفسیاتی بیماری کی وجہ سے سخت مایوس ہو جاتے ہیں اور اس سے اجتماعی زندگی میں عداوت، باہمی کشمکش اور فساد پیدا ہوتا ہے۔

### پہلا حاسد شیطان اور حسد کی وجہ سے اپنے بھائی کو قتل کرنے والا قابیل ہے!

سب سے پہلے حسد کرنے والا ابلیس اور شیطان ہے، اس نے حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ حسد کیا کہ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو میری موجودگی کے باوجود زمین کا خلیفہ کیوں بنایا گیا؟ اور وہ ان سے جل گیا اور اسی وقت سے لیکر قیامت تک تخریبی کاروائیوں میں مصروف رہے گا، اسی طرح پہلے ناحق

خون کا سبب بھی یہی حسد تھا جسکی بنیاد پر قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر ڈالا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے سورہ مائدہ: آیت ۲۷ تا ۳۰)

**حاسد اپنی نیکیاں محسود کے کھاتے میں ڈالتا رہتا ہے!**

جس کے دل میں حسد کی آگ سلگتی رہتی ہے اور اس کے درپے ہوتا ہے کہ جس خوشحال پر اسکو حسد ہے کسی طرح اس کو نقصان پہنچائے، اس کو بے آبرو کرے کس طرح وہ لوگوں میں ذلیل و رسوا ہو جائے، پھر اگر کچھ بس نہیں چلتا تو اسکی غیبت ہی کر کے اپنے دل کی آگ کو بجھانا چاہتا ہے اور اس طرح وہ اپنی نیکیاں اپنے محسود کے نامہ اعمال اور کھاتے میں ڈالتا رہتا ہے اور خود اپنے آپ کو آبروریزی کے بدترین سودا اور چغلی کے بدترین عذابِ قبر میں مبتلا کرتا رہتا ہے اور جہنم کا عذاب تو بہت ہی سخت اور پائیدار ہے۔

**حاسد کا یا تو تقدیر پر کامل ایمان نہیں، یا پھر وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر معترض ہوتا ہے!**

حاسد کا یا تو تقدیر پر کامل ایمان نہیں ہوتا، یا پھر وہ اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی تقدیر پر معترض ہوتا ہے۔ ایک مسلمان کا تو یہ ایمان ہوتا ہے کہ نفع و نقصان، عزت و ذلت، کامیابی و ناکامی، خیر و شر، اسبابِ راحت و نعمت اور اسبابِ تکلیف و مصیبت اور درد سب کا خالق اور مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس نے اپنے بے انتہا رحم و عدل اور حکمت و قدرت کے تحت ہر چیز کی تقدیر بنائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اب جو شخص اپنے دل میں یہ کہتا ہے کہ فلاں نعمت فلاں کو کیوں ملی، وہ اس سے چھن کر مجھے مل جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر کامل ایمان نہ ہونے کی وجہ سے ہوگا یا پھر اللہ تعالیٰ ہی کی تقدیر پر اعتراض کرتا ہے اور یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت اور اسکے عدل و رحم پر ہی اعتراض ہے۔ اللہ ہم سب کو اپنی ذات و صفات اور اپنی قدرت و اختیار پر کامل یقین نصیب فرمائے۔

**حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے!**

حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا:

(يَا كُفُّمُ وَالْحَسَدُ فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ)

”حسد کی بیماری سے سخت پرہیز کرو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا

جاتی ہے“۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ)

حسد کا نیکوں کے کھا جانے کا مطلب یہی ہے کہ ایک طرف حاسد ہر وقت اپنی نیکیاں محسود کے کھاتے میں ڈالتا رہتا ہے دوسری طرف یہی حسد آدمی کی ایمانی قوت کو چاٹتا رہتا ہے جس کی وجہ سے بالآخر خود اس کی اپنی نیکیاں بے روح اور بے نور ہو کر رہ جاتی ہیں۔

### حاسد بالآخر ملعون ہو جاتا ہے!

حسد کی بیماری کا خاصہ یہ ہے کہ بالآخر حاسد محسود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور اسکے ساتھ مکر و فریب کا رویہ اختیار کرتا ہے اور اسکے لئے جگہ جگہ گڑھا کھودنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ایسے شخص کے متعلق سخت وعید آئی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر صدیق ؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَلْعُونٌ مِّنْ ضَرَّاءٍ مُّؤْمِنًا وَمَكْرِبٍ)

”وہ شخص ملعون ہے جو کسی مسلمان کو ضرر پہنچائے یا اس کے ساتھ مکر و فریب کرے۔“ (ترمذی و مشکوٰۃ)

### حسد دین کا صفایا کرتا ہے!

حسد ایک ایسی خطرناک بیماری ہے جو بالآخر دین کا صفایا کر دیتی ہے، چنانچہ حضرت زبیر ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(دَبَّ إِلَيْكُم دَاءُ الْأَمَمِ قَبْلُكُمُ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ لَا أَقُولُ تَخْلُقُ الشَّعْرَ وَلَكِنْ تَخْلُقُ

الدِّينِ)

”پہلی امتوں کی بیماری تمہاری طرف چلی آرہی ہے، وہ بیماری حسد اور بغض ہے جو مونڈنے والی (صفایا کر نیوالی) ہے، میرے کہنے کا مطلب (کہ حسد و بغض مونڈنے والی ہے) یہ نہیں ہے کہ یہ بالوں کو مونڈنے والی ہے بلکہ یہ مونڈتی ہے دین کو۔“ (احمد، ترمذی، مشکوٰۃ)

### صحابہ کرام ؓ بغض اور حسد جیسی بیماریوں سے پاک تھے!

یاد رکھیں کہ صحابہ کرام ؓ بغض و حسد جیسی بیماریوں سے پاک و صاف تھے اور اس حدیث میں مسلمانوں کو اس عظیم و خطرناک بیماری سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اس حدیث کو نقل کر کے حضرت مولانا منظور احمد نعمانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب معارف الحدیث میں لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام ؓ کے متعلق اللہ حلیم وخبیر کی یہ شہادت قرآن مجید میں محفوظ ہے کہ وہ ایک دوسرے پر شفیق اور مہربان ہیں ﴿رَحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ دوسری جگہ فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے خاص کرم



نے ان کے دل ملا دیئے ہیں اور وہ پرانے جھگڑوں کو بالکل بھلا کر آپس میں بھائی بھائی ہو گئے ہیں۔ ﴿فَالْفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَاصْبِرْتُمْ بِنِعْمَةِ إِخْوَانِكُمْ﴾ (آل عمران: ۱۰۳)۔ ایک دوسری جگہ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ خاص انعام ہے کہ اس نے تم پر ایمان لانے والوں کے دل ملا دیئے ہیں، اگر تم اس مقصد کیلئے دنیا کی ساری دولت اور سارے خزانے بھی خرچ کر ڈالتے تو بھی ان کے دلوں میں یہ الفت و محبت پیدا نہ کر سکتے۔ (الانفال: ۶۳)۔

بہر حال قرآن مجید کی ان واضح شہادتوں سے معلوم ہوا کہ جہاں تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تعلق ہے، ان کے دل ایک دوسرے کی محبت و الفت سے بھر دیئے گئے تھے اور ان میں باہم بغض و حسد کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اس لئے اس حدیث (ذَبَّ إِلَيْكُمْ دَاءُ الْأَمِّ قَبْلَكُمْ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ) کا منشاء یہی ہو سکتا ہے کہ بعد کے دوروں میں بغض و حسد کی جو مہلک بیماری مسلمانوں میں آنے والی تھی، رسول اللہ ﷺ پر وہ منکشف ہوئی اور آپ ﷺ نے امت کو اس آنے والی بلا سے خبردار کیا اور بتلایا کہ بغض و حسد کی جس مہلک بیماری نے اگلی بہت سی امتوں کے دین و ایمان کو برباد کیا ہے، وہ میری امت کی طرف بھی چلی آ رہی ہے۔ لہذا اللہ کے بندے ہوشیار رہیں اور اس لعنت سے اپنے دلوں اور سینوں کی حفاظت کی فکر کریں۔ (دیکھئے معارف الحدیث: ج ۲، ص ۲۱۷ تا ۲۱۸)

### حسد کا علاج!

جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ حسد ایک ایسی خطرناک اور مہلک بیماری ہے جس کی وجہ سے انسان کی دنیا اور اس کا چین و سکون اور آخرت سب کچھ برباد ہو جاتے ہیں تو آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے علاج میں کسی قسم کی تاخیر نہ کرے اور فوراً اسکے علاج کی طرف متوجہ ہو جائے، کوئی پتہ نہیں کہ موت کب آئیگی، اگر موت آگئی اور آپ نے اپنا علاج نہیں کیا ہے تو قبر اور آخرت میں کیا کرو گے۔ پھر تو نجات کا کوئی راستہ نہیں کیونکہ آخرت کی نجات کے لئے صرف یہاں اسی دنیا ہی سے کچھ نجات و فلاح کا سامان ہو سکتا ہے اور موت کے بعد تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہاں تو اپنے ایمان و اخلاق اور کردار و اعمال کے نتائج سامنے آئیں گے۔ نیکو کاروں کے حصہ میں نعمتیں اور بدکاروں کے حصہ میں عذاب اور مصیبتیں آئیں گی۔

حسد کی تباہیوں اور فانی دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی فکر کریں!

حسد کا بہت بڑا اور اصل سبب دنیا کا مال و دولت اور اس کی عزت و شہرت ہوتی ہے۔ جب انسان دنیا کے مال و

جاہ کی بے جا محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اسکی وجہ سے وہ تکبر، حسد و بغض جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور تمام بیماریوں کی جڑ اور اصل بھی دنیا کی محبت ہے اور اسکو نکالنے کے لئے دنیا کی بے ثباتی اور عارضی ہونے کو سوچے کہ دنیا میں چند دن تو رہنا ہے پھر یہاں سے جانا ہے اور دنیا کی دولت و شہرت اس میں رہ جانی ہیں۔ اور یہاں سے چلا جاؤں گا اور دنیا کی یہ ساری نعمتیں و راحتیں و لذات وغیرہ یہیں رہ جائیں گی۔ اصل زندگی آخرت کی ہے جو نہ ختم ہونے والی ہے۔ اصل عزت اور حقیقی انعامات اور نعمتیں اور لذات اور بادشاہت اور سلطنتیں وہیں ملیں گی اور میں ان دنیاوی چیزوں و نعمتوں پر حسد کر کے آخرت کو برباد کر رہا ہوں۔

### حسد میں کیا فائدہ ہے؟

پھر یہ سوچیں کہ آخر حسد میں میرا کیا فائدہ ہے؟ میرے حسد کرنے سے تو محسوس کا تو کچھ نہیں بگڑے گا، اس کو جو نعمت ملی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے مطابق ملی ہے اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں اس نعمت کی ایک مدت مقرر ہے، پھر اسکے حسد و بغض میں مجھے کیا ملے گا بلکہ اس میں تو میرا ہی نقصان ہے کہ میں اس کی وجہ سے بے چین ہوں، جلتا رہتا ہوں، بلا وجہ رنج و غم میں مبتلا رہتا ہوں اور میں جس قدر حسد کرتا ہوں اور اسکی غیبت کرتا ہوں، چغلی کرتا ہوں تو اس کے نامہ اعمال کے اندر اپنی نیکیاں ڈالتا رہتا ہوں اور اس طرح وہ دنیا و آخرت کے لحاظ سے ترقی کر رہا ہے اور میں لمحہ بہ لمحہ گرتا رہتا ہوں اور اپنے آپ کو کی ہوئی نیکیوں سے بھی محروم کرتا رہتا ہوں۔

### دنیاوی لحاظ سے ہمیشہ کمتر لوگوں کو مد نظر رکھو!

حسد ناشکری ہے کیونکہ حاسد کو جو کچھ ملا ہے اس پر وہ شاکر و قانع نہیں رہتا۔ اسلئے وہ دوسروں کو دیکھ کر جلتا رہتا ہے اس لئے اسکو چاہئے کہ وہ ہمیشہ دنیاوی اعتبار سے اپنے سے کم درجہ لوگوں کو دیکھا کرے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں حسن ظن رکھے کہ وہ میرا خالق ہے، مالک و پروردگار ہے۔ اس نے میرے لئے جو کچھ مقدر کیا ہے اسی میں میری خیر و فائدہ ہے اور یہی ان شاء اللہ میرے لئے آخرت کیلئے مفید ہے۔ شکر کا پورا بیان شکر کے باب میں پڑھ لیجئے۔

### حسد کے تقاضوں کو پورا نہ کریں!

حسد کے علاج کیلئے آپ کو جو فوری اقدام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ حسد کے تقاضوں پر عمل نہ کریں اور جب دل میں کسی کے بارے میں حسد ہے یا جب پیدا ہو جائے تو دل میں حسد کی برائی لے آئیں اور فوراً توبہ و استغفار کریں

اور سوچیں کہ شیطان کا اشارہ ہے اور کسی قول و فعل اور ادا سے اس حسد کو دوسروں پر ظاہر نہ کریں، یعنی نہ اسکی غیبت کریں، نہ چغلی کریں اور نہ اسکی بدخواہی کی کوشش کریں اور نہ اس سے اس نعمت کے چھن جانے کی دعا کریں۔ اگر آپ مذکورہ بالا پر عمل کریں گے تو آپ اس حسد کے شر سے بھی بچ گئے اور ان شاء اللہ اس حسد کا گناہ بھی ختم ہو جائیگا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ کوئی شخص شگون، بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ان سے نکلنے کی کیا صورت ہے تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا۔ جب شگون کا خیال پیدا ہو تو جو کام کرنا چاہتے ہو (مثلاً سفر پر جانا ہے) تو اس شگون کی وجہ سے اس کام کو نہ چھوڑو (بلکہ کر گزرو) اور جب بدگمانی پیدا ہو تو اسکو بچ مت سمجھو اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم (یعنی غیبت، چغلی، بدخواہی) پر آمادہ نہ ہو جاؤ۔

(مصنف عبد الرزاق، دیکھئے فتح الباری، شرح بخاری: کتاب الاداب، باب النہی عن التماسد، ج ۱۰، ص ۴۹۸)

**حسد کے تقاضوں کو پورا کرنے اور نہ کرنے کے لحاظ سے حسد کے درجات!**

یہاں اس بات کی نشاندہی بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ حسد کے تین درجات ہیں:

(۱)۔ ایک یہ کہ حسد کے تقاضوں کو قطعاً پورا نہ کیا جائے، حسد کی برائی کو سامنے لائے، پھر نادام ہو کر توبہ استغفار کریں تو اس صورت میں پیدا ہونے والے حسد اور جلن کا گناہ ختم ہو جاتا ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے بھی گزر چکا ہے۔

(۲)۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ حسد کے ظاہری تقاضوں پر تو عمل نہ کیا جائے، مثلاً نہ اسکی غیبت کریں اور نہ کسی قسم کی بدخواہی۔ مگر اس حسد پر ندامت اور توبہ نہ ہو اور دل یہی چاہتا ہو کہ اس سے نعمت چھن جائے یا اس پر کوئی آفت پڑے۔ تو اس کا بھی گناہ ہے۔ اگرچہ اس درجے والا شخص غیبت، چغلی اور بدخواہی کی عملی کوشش سے بچنے کی وجہ سے ان ظالمانہ اور مجرمانہ گناہوں سے بچ جاتا ہے۔ اس لئے حاسد کو چاہئے کہ وہ اپنے حسد کی برائی کو سامنے لائے اور نادام ہو کر تائب ہو جائے۔

(۳)۔ حسد کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ اندرونی حسد اور جلن کے ساتھ ساتھ حسد کے تقاضوں پر عمل بھی کیا جائے جیسے غیبت، چغلی، طعن و تشنیع اسکو ملی ہوئی نعمت اور خوشحالی کے چھیننے کے لئے عملی کوششیں اور اس کو قتل کرنا وغیرہ۔ تو ایسی صورت میں حاسد اللہ تعالیٰ کے اور اسکے بندوں کے حقوق کو تلف کرنے والا بڑا ظالم اور مجرم بن جاتا ہے۔ اس تیسری صورت میں اس حاسد سے بندوں کی جو حق تلفی ہو چکی ہے، اس کیلئے ضروری ہے کہ بندوں کو ان کے حقوق واپس کر دیں یا ان سے معاف کرائیں۔

### محسود کی ترقی کیلئے دعائیں کریں!

مذکورہ بالا تجاویز کے ساتھ مندرجہ ذیل چند امور کا اہتمام بھی کیا جائے تو ان شاء اللہ دل سے حسد کا مرض ختم ہو جائیگا ورنہ کم از کم حسد کے شر اور گناہ سے بچ جائے گا:

- (۱)۔ حسد کے تقاضوں پر قطعاً عمل نہ کریں، جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔
- (۲)۔ دوسرا کام یہ کریں کہ محسود کی ترقی کیلئے ہر روز یہ دعا کریں کہ یا اللہ اس پر آپ نے جو نعمت کی ہے اس میں ترقی اور برکت فرما۔ آپ جب اس طرح دعا کریں گے تو نفس بہت ہی چپخے گا لیکن یہ مجاہدہ ہے، اس کا ثواب بھی آپ کو ملے گا اور آپ کا علاج بھی ہو جائیگا۔ نیز اس دعا کے ساتھ ساتھ اپنے لئے بھی یہ دعا کریں کہ یا اللہ میرے دل میں اس کی نعمت کی وجہ سے جو حسد اور جلن پیدا ہو رہا ہے اپنے ہی فضل سے اس کو ختم کر دے اور مجھے اپنا صابروشا کر بندہ بنادے۔
- (۳)۔ تیسرا کام یہ کریں کہ اپنی مجلسوں میں اس کی تعریف کریں اور اس کی خوبیاں بیان کریں۔ یہ بہت ہی مشکل کام ہے لیکن اس مجاہدہ پر اس کا ثواب آپ کو ملے گا اور علاج بھی ہوگا۔
- (۴)۔ کبھی کبھی اس کو تحفہ دہد یہ بھیجنا اور کبھی اس کی دعوت کرنا۔
- (۵)۔ جب کسی لمبے سفر پر جانا ہو تو اس سے ملاقات کر کے جانا اور سفر سے واپسی پر اس کے لئے کوئی تحفہ بھی لے آنا۔

### اندرونی بیماریوں کے علاج کا آسان طریقہ!

باطن اور اندرونی بیماریوں کا آسان اور صحیح علاج کا طریقہ یہ ہے کہ کسی روحانی طبیب اور کسی صادق تجربہ کار شیخ و صوفی کی طرف رجوع کیا جائے، جس نے باقاعدہ کسی روحانی طبیب و شیخ سے اپنی اصلاح کی کوشش کی ہو اور پھر انہوں نے اس پر اعتماد کیا ہو کہ وہ دوسروں کا علاج کر سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تصوف اور اخلاق کی کتابوں میں روحانی بیماریوں کبر، حسد، دنیا کی محبت وغیرہ کے علاج لکھے ہوتے ہیں لیکن ان کی مثال ہو بہو ایسی ہے جیسے کہ جسمانی طب کی کتابوں میں بیماریوں کے علاج لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کتابیں ڈاکٹروں اور طبیبیوں کیلئے تو مفید ہوتی ہیں لیکن اگر عوام ان سے استفادہ کرنا شروع کریں تو بیماریاں کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جائیں گی۔ کیونکہ عوام تو بیماریوں کو اور بیماریوں کے اسباب کو نہیں جانتے۔ کتاب میں کسی بیماری کے اسباب کو

پڑھنا اور چیز ہے اور جب مریض سامنے ہو تو اس کی بیماری کے اسباب کو معلوم کرنا بالکل دوسری چیز ہے۔ اس لئے لوگ دوائیوں اور طب کی کتابوں سے اپنا علاج نہیں کرتے بلکہ ڈاکٹر اور طبیب کے سامنے بیٹھ کر اپنا علاج کراتے ہیں اور ڈاکٹر اسکی بیماری کے سبب کو معلوم کرتا ہے، پھر اس کے مطابق اسکے لئے علاج تجویز کرتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو بیمار محسوس کیا ہوتا ہے حالانکہ بیمار نہیں ہوتا بلکہ اسکو بیماری کا وسوسہ ہوتا ہے تو پھر وہ اسکے مطابق علاج تجویز کر کے اس پر مطمئن ہوتا ہے۔ اسی طرح روحانی بیماریوں کا علاج معالجہ بھی ہے۔ صرف کتابوں کے دیکھنے سے آدمی اپنی روحانی اور نفسیاتی بیماریوں کا علاج نہیں کر سکتا بلکہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی میں نہ تکبر ہوتا ہے اور نہ حسد اور نہ ریاء وغیرہ۔ لیکن اسکو صرف تکبر و حسد اور ریاء وغیرہ کا وسوسہ لگ جاتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ حقیقی بیماری اور بیماری کا وسوسہ ان دونوں کے علاج میں بہت زیادہ فرق ہے، البتہ جن لوگوں کو اس لائن سے کچھ مناسبت ہو اور وہ اس میں عملاً وقت لگا چکے ہوں اور کسی درجے میں روحانی طبیب بن چکے ہوں تو وہ ایسی کتابوں سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اسکی وجہ سے وہ اس فن میں ترقی بھی کر سکتے ہیں اور علاج بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ عام لوگ جو خود ہی اپنا علاج شروع کر دیتے ہیں تو وہ بہت کم ہی کامیاب ہوتے ہیں بلکہ بہت بار ایسا ہوتا ہے کہ وہ شدید نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے میرا خیر خواہانہ مشورہ یہی ہے کہ روحانی بیماریوں کے خاتمے کیلئے کسی روحانی معالج کی طرف رجوع کیا جائے۔

## توکل کا بیان!

وَكُلَّ وُكُولٍ، سپرد کردینے، کسی کے بھروسے کام چھوڑ دینے کو کہتے ہیں اور اس سے لفظ توکل نکلا ہے۔ جس کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں، یعنی اپنے عجز و بیچارگی کو ظاہر کرنے اور دوسروں پر بھروسہ و اعتماد کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں اللہ تعالیٰ پر اور اسکے احکامات و ہدایات پر بھروسے اعتماد کو توکل کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام معاملات، اعمال اور احوال میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا جائے۔ یا بالفاظ دیگر صرف اللہ تعالیٰ ہی کو وکیل ٹھہرایا جائے اور وکیل اس شخص کو کہا جاتا ہے جس پر بھروسہ و اعتماد کر کے کام اور معاملہ اس کے سپرد کیا جائے۔ پس توکل کی حقیقت بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وکیل و کارساز بنایا اور ٹھہرایا جائے اور اللہ تعالیٰ کی دیئے ہوئے اسباب و تدبیر وغیرہ کو بروئے کار لا کر نتائج اور معاملہ اسکے سپرد کیا جائے۔

## ظاہری اسباب کی حیثیت!

توحید کے باب میں یہ تفصیل آچکی ہے کہ کائنات اور آسمان و زمین میں جو کچھ ہوتا ہے اور جس کو جو کچھ ملتا ہے یا نہیں ملتا ہے اور عزت و ذلت، نفع و نقصان صرف اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے اور یہ سب کچھ براہ راست اللہ تعالیٰ کے حکم اور فیصلے سے ہوتا ہے اس لئے ظاہری اسباب کی حیثیت اسکے سوا کچھ نہیں کہ وہ نفع و نقصان، عزت و ذلت وغیرہ کے ہم تک پہنچانے کیلئے اللہ تعالیٰ ہی کے مقرر کردہ راستے ہیں۔ جس طرح پانی و بجلی جن نلوں اور تاروں کے ذریعہ ہم تک پہنچتے ہیں وہ پانی و بجلی پہنچانے کے صرف راستے ہیں۔ پانی و بجلی کی تقسیم میں ان کا اپنا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسی طرح کائنات اور تمام دنیا میں جو ہم کو نظر آ رہا ہے وہ اسباب کی کارفرمائی نہیں بلکہ اصل کارفرما صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کا حکم ہے۔

اور جس شخص کے دل پر یہ حقیقت کھل گئی ہو وہ اپنے تمام معاملات اور اپنے کاموں میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات و ہدایات پر اعتماد کرے گا۔ ہر کام کے شروع اور کرنے کے بعد صرف اسی سے لولگائے گا اور اسکی نظر صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت و قوت اور اسکے کرم پر ہوگی، اسی سے امید کرے گا اور اسی سے خوف رکھے گا اور اسی سے دعا کریگا۔ پس مومن کے اس طرز عمل کا نام توکل ہے۔

## ظاہر پرستوں کا عقیدہ!

دنیا میں بہت سے لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مادی ذرائع و اسباب ہی حصولِ نتائج کا واحد سبب اور ذریعہ

ہیں، مثلاً وہ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی دوا خود شفاء دیتی ہے یا مثلاً انسان کی کوشش و جدوجہد ہی کسی مقصد کو حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط اور واقعہ کے خلاف ہے، ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات تمام اسباب و ذرائع موجود ہوتے ہیں لیکن مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ ایک ڈاکٹر کے پاس ایک ہی مرض کے دو مریض جاتے ہیں اور وہ ان دونوں کو ایک ہی قسم کی دوائیاں دیتا ہے لیکن ان میں سے ایک تندرست ہو جاتا ہے اور دوسرا بیمار رہتا ہے یا مر جاتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص کئی بار دوا استعمال کرتا ہے لیکن اس کو شفاء حاصل نہیں ہوتی بلکہ کبھی الٹا نقصان بھی ہو جاتا ہے۔

ایک کاشتکار زمین کو اچھی طرح کاشت کرتا ہے اور بہترین بیج استعمال کرتا ہے، اچھی طرح کھاؤ ڈالتا ہے اور اسے پوری طرح سیراب کر دیتا ہے لیکن شدید گرمی یا سخت آندھی یا سخت سیلاب آ جاتا ہے یا مسلسل بارش ہو جاتی ہے اور تو اس کی تمام کوشش، تدبیر اور محنت و مشقت ضائع ہو جاتی ہے۔

بہت بار ایسا ہوا کہ دونوں جوں کے درمیان مقابلہ اور جنگ ہوتی ہے اور وہ فوج جیت جاتی ہے جو تعداد اور اسلحہ وغیرہ کے لحاظ سے بہت ہی کم ہوتی ہے اور اسکے مقابلے میں دوسری فوج عددی اکثریت اور اسباب و اسلحہ کی فراوانی کے باوجود ہار جاتی ہے۔

اس سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ محض اسباب و ذرائع اور محنت و تدابیر نتائج کا سبب نہیں بلکہ نفع و نقصان کا مالک اور نتائج کو پیدا کرنے والا وہی اللہ تعالیٰ ہے جس نے ان تمام اسباب کو پیدا کر دیا اور اسکے قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔ اس لئے ایک مسلمان اور ایمان والے کا اعتماد و بھروسہ اسباب و ذرائع اور اپنی کوشش و محنت اور تدبیر پر نہیں ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی پر ہوتا ہے۔

### توکل کے فضائل و فوائد!

اللہ تعالیٰ پر اعتماد و بھروسہ وہ چیز ہے جو دنیا و آخرت کی نجات و فلاح کا ذریعہ ہے۔

(۱) چنانچہ جو شخص صحیح معنوں میں اللہ تعالیٰ پر توکل و بھروسہ کرے گا اللہ تعالیٰ اسکی کفایت کرے گا۔

(۲) ایک اللہ تعالیٰ کی غلامی اسکو تمام مخلوق و اسباب کی محتاجی اور غلامی سے نجات دلائے گی۔

(۳) چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے امید نہ لگائے گا، اس لئے وہ نہ کسی قسم کے دنیاوی حرص و لالچ

اور کسی مصیبت میں گرفتار ہوگا اور نہ مخلوق کی کسی چیز کا طمع رکھے گا۔ نہ مخلوق و اسباب سے خوف اور نہ اس پر ذلت و کمزوری کے داغ دھبے پڑتے ہیں، بلکہ اسکی پوری زندگی عزت و اطمینان اور بے خوف و خطر گزر جاتی ہے، وہ کبھی



خود غرضی کا شکار نہیں ہوتا۔

(۴) اللہ تعالیٰ اسکو ضائع ہونے سے بچائے گا اور رزق اسکی طرف خود دوڑ کر آئیگا۔

(۵) کسی قسم کا حرص و لالچ اسکو حق بات کہنے اور حق کام کرنے سے نہیں روکے گا۔

(۶) اللہ تعالیٰ اسکی مدد فرمائے گا اور اسے قناعت اور غنائے قلبی کی دولت نصیب فرمائے گا اور مخلوق کی محتاجی سے

بچائے گا۔

(۷) اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتا ہے۔

(۸) اور اسکی محبت کا مرکز صرف اللہ تعالیٰ بن جاتا ہے۔

(۹) چونکہ اسکا حقیقی محبوب اسکا کارساز اسکے ساتھ ہوتا ہے اس لئے ہر وقت مطمئن رہتا ہے اور جب کوئی

ضرورت پیش آجاتی ہے تو دل کی گہرائیوں سے اسے پکارتا ہے، وہ اسکی بگڑی بنا لیتا ہے اور اسکی حاجت پوری

کرتا ہے اور اگر کبھی اسکو مانگی ہوئی چیز فی الحال نہ ملے تو مطمئن رہتا ہے کہ اگر اس چیز میں میرا فائدہ ہے تو ضرور

دے گا ورنہ اس کے بدلے دوسری نعمت عطا فرمائے گا، جس میں میری خیر ہوگی۔

(۱۰) متوکل اپنے توکل کے بقدر دنیا و آخرت کی خوشیوں اور ترقیوں کو پالیتا ہے۔

اب آپ توکل کے فضائل کے متعلق قرآن، حدیث سے بطور نمونہ کچھ پڑھ لیجئے۔

توکل ایمان اور اسلام کے لئے شرط ہے!

حق تعالیٰ شانہ نے مسلمانوں کو توکل اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کا حکم دیا ہے اور اسے ایمان کیلئے شرط قرار

دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾

”اور صرف اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھو، اگر تم مومن ہو“۔ (المائدہ: آیت ۲۳)

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَقَالَ مُوسَىٰ يَقَوْمِ إِن كُنْتُمْ مَآئِمَّةً بِاللَّهِ فَاعْلَمُوا أَن كُنْتُمْ مُسْلِمِينَ﴾

”اور موسیٰ نے (اپنی قوم سے) کہا کہ اے میری قوم! اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لاکچے ہو تو اسی پر بھروسہ رکھو،

اگر تم مسلمان ہو“۔ (یونس: آیت ۸۴)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بار بار اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

﴿وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾

یعنی ”ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔“ (آل عمران: آیت ۱۶۰، ۱۶۲)

**متوکل اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے!**

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں سے پیار

کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾

یعنی ”جو شخص اللہ تعالیٰ پر توکل کرتا ہے، اسکے واسطے اللہ تعالیٰ کافی ہے۔“

اسی طرح توکل کی فضیلت پر بہت سی آیاتِ کریمہ قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اب توکل کی فضیلت پر چند

احادیث شریفہ ملاحظہ فرمائیے۔

**متوکل بلا حساب و کتاب جنت میں جائیگا!**

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ فرماتے تھے کہ اگر تم لوگ اللہ

تعالیٰ پر ایسا توکل اور بھروسہ کرو جیسا کہ اس پر توکل کرنے کا حق ہے تو تم کو وہ اس طرح روزی پہنچائے گا جس طرح

(بغیر زیادہ محنت و مشقت کے سہولت کے ساتھ) پرندوں کو دیتا ہے، وہ صبح کو بھوکے (اپنے گھونسلوں سے) نکلتے

ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس آ جاتے ہیں۔ (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

ایک اور حدیث شریف میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس

کے سب کاموں کی نگرانی کرتا ہے اور اسکے لئے کافی ہو جاتا ہے اور ایسی جگہ سے روزی پہنچاتا ہے جہاں سے اس کا

وہم و گمان بھی نہیں ہوتا اور جو شخص دنیا کی پناہ لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

میری امت میں سے ستر ہزار لوگ بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے اور یہ وہ لوگ ہونگے جو منتر نہیں

کراتے اور نہ بدفالی اور بدشگونی لیتے ہیں اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔ (بخاری و مسلم)

**اللہ تعالیٰ جل شانہ متوکل کی دنیا و آخرت کے ہر کام میں ہر حالت میں کافی ہے!**

اس حدیث میں جنت میں بے حساب داخل ہونے والوں کی تعداد رسول اللہ ﷺ نے ستر ہزار بتلائی ہے اور

ایک دوسری حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ ان میں سے ایک کے ساتھ ستر ہزار اور بھی بلا حساب جنت میں داخل کئے جائیں گے اور یہ ایک بات پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ ستر کی تعداد سے مراد اگرچہ خاص عدد ہے لیکن عربی کے محاوروں میں اکثر یہ ستر کا لفظ غیر معمولی بہتات کیلئے استعمال کیا جاتا ہے اور یہاں بھی شاید بہت زیادہ کثرت مراد ہے، واللہ اعلم۔

### توکل ہر پریشانی کا علاج ہے!

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انسان کا دل ہر قسم کی فکر میں الجھتا رہتا ہے، جس کا دل ان تمام افکار کے پیچھے لگا رہتا ہے اللہ تعالیٰ کو اس کی پرواہ نہ ہوگی کہ اس کو کسی (پریشان کن جنگل اور) وادی میں ہلاک کرے اور (اس کے برعکس) جو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ساری (پریشانیوں اور) غموں سے بچائے گا۔ (ابن ماجہ)

تفکرات انسان کو پریشان اور سرگرداں رکھتے ہیں اور اس کو چین و سکون سے محروم کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ و توکل سے زیادہ کارگر اس کا کوئی علاج نہیں۔

### توکل دل کی حالت کا نام ہے!

اس بات کو پھر دہرائیں گے کہ توکل دل کی حالتوں میں سے ایک حالت ہے جو ایمان و یقین اور عقیدہ توحید و تقدیر کا ثمرہ و نتیجہ ہے کیونکہ جس شخص کو اس حقیقت پر ایمان و یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ رحمان و رحیم و کریم ذات ہے اور یہ کہ کارخانہ ہستی میں جو کچھ ہوتا ہے اور جس کو جو کچھ ملتا ہے یا نہیں ملتا ہے سب براہ راست اللہ تعالیٰ کا حکم اور فیصلے سے ہوتا ہے اور ظاہری اسباب کی حیثیت اسکے سوا کچھ نہیں کہ وہ چیزوں کو ہم تک پہنچانے کیلئے اللہ تعالیٰ ہی کے مقرر کردہ ذرائع اور راستے ہیں، جس طرح بجلی کی تاروں کے ذریعہ پہنچتی ہے وہ بجلی پہنچانے کے صرف راستے ہیں یا گھروں میں پانی جن نلوں کے ذریعے پہنچتا ہے وہ پانی پہنچانے کے صرف راستے اور ذرائع ہیں، بجلی اور پانی کی تقسیم میں تاروں اور نلوں کا اپنا کوئی دخل نہیں اور نہ کوئی حصہ ہے، اسی طرح اس عالم کائنات میں کارفرمائی اسباب کی بالکل نہیں بلکہ کارفرما اور موثر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کا حکم ہے تو جس شخص کو اس حقیقت اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت پر مکمل یقین ہو اور جس بات کے متعلق اس کو معلوم ہو جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم اور تعلیم ہے تو وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر اس حکم اور تعلیم پر سختی سے عمل کرے گا نیز تمام مقاصد اور کاموں میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرے گا، اسی کی قدرت اور اسی کے کرم پر نظر رکھے گا، اسی سے امید یا خوف اور اسی سے دل اور لو لگائے گا

اور اسی سے دعا کرے گا۔

### توکل کی صورتیں اور شکلیں!

عملی طور پر توکل کی بڑی بڑی دو شکلیں اور دو صورتیں بن جاتی ہیں۔ ایک قسم اور صورت کا تعلق اللہ تعالیٰ کی باتوں، وعدوں اور تعلیمات کے ساتھ اور دوسری قسم کا تعلق اسباب کے اختیار اور ترک کرنے کے ساتھ ہے اور ان دونوں قسموں اور صورتوں کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

توکل کی پہلی شکل، اللہ تعالیٰ کی باتوں یعنی اس کی تعلیمات اور وعدوں وغیرہ پر مکمل بھروسہ اور عمل! اللہ تعالیٰ کی باتوں یعنی اس کی تعلیمات و احکامات اور وعدوں وغیرہ پر مکمل بھروسہ اور عمل کرنا ہے۔ دنیا میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ بادشاہوں وغیرہ کے وعدوں پر اعتماد و بھروسہ کرتے ہیں۔ اسلئے ان وعدوں کی وجہ سے طرح طرح کی تکلیف برداشت کرتے ہیں، نیز یہ بھی دیکھتے ہیں کہ لوگ حاذق اور تجربہ کار طبیب و ڈاکٹر کی بات پر اعتماد و بھروسہ کرتے ہیں اس لئے اگر وہ سخت کڑوی دوا پینے یا آپریشن کے متعلق کہتا ہے تو اس سختی کو جھیلنے کیلئے تیار بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر یہی طبیب اور ڈاکٹر اسے مرغوب اور پسندیدہ چیزوں سے منع کرتا ہے تو وہ آسانی سے اپنی مرغوبات اور پسندیدہ چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے کیونکہ وہ ڈاکٹر کی رہنمائی اور تعلیم اور اسکے علاج پر بھروسہ اور اعتماد کرتا ہے، حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ ماہر سے ماہر تجربہ کار طبیب اور ڈاکٹر کے علاج اور اسکے بتلائے ہوئے علاج و پرہیز سے بیمار درست نہیں ہوتا بلکہ بعض مرتبہ مرض اور بڑھ جاتا ہے لیکن اللہ صرف وہی ایک ہستی ہے کہ جو لامحدود خزانوں کا مالک ہر چیز کے کرنے پر قادر اور مختار کل ہے، وہ جو بھی وعدہ کرتا ہے وہ پورا ہو کر رہتا ہے، وہی فیصلہ کرنے والا ہے کوئی نہیں جو اس پر اپنا فیصلہ نافذ کر سکے یا اس کے فیصلے میں رد و بدل کر سکے۔ آخر وہی تو ہے جو ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے۔ طبیب اور ڈاکٹر کی باتوں پر اور اسکے بتلائے ہوئے علاج پر اس وجہ سے اعتماد اور بھروسہ کیا جاتا ہے کہ اسکے علاج سے بعض بیماروں کو اللہ تعالیٰ نے صحت دی ہے تو اللہ رب العالمین حکیم ذات، جو نہ بھولتا ہے، نہ دھوکہ کھاتا ہے، جس کا علم اور حکمت اور بادشاہی کائنات کے ذرے ذرے پر محیط ہے، وہ ہر چیز کی ابتداء اور انتہاء کو خوب جانتا ہے، وہ صرف روحانی اور جسمانی بیماریوں کے اسباب اور انکے علاج کو جاننے والا نہیں بلکہ بیماری و صحت کے اسباب کو پیدا کرنے والا بھی وہی ہے۔ اسی نے اپنی قدرت سے انسان کو بنایا اور اسکے لئے آسمان و زمین کی چیزیں پیدا کی ہیں، تو وہی ذات ہے جو خوب جانتا ہے کہ انسان کی دنیا اور آخرت کی کامیابی کس چیز میں

ہے اور کون سی چیزیں ہیں جن کے اختیار کرنے کے بغیر ایک انسان کی دنیا و آخرت برباد ہو جاتی ہے۔

ایمان والوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کے لئے دنیا کی مصیبتیں کیوں جھیلیں!

یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کا اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے اور اللہ تعالیٰ کی باتوں، اسکی تعلیم و ہدایت اور اس کے وعدوں وغیرہ پر کامل اعتماد اور بھروسہ ہوتا ہے تو وہ دنیا کی ہر تکلیف، ہر مصیبت کو برداشت کر کے اللہ تعالیٰ کی تعلیم اور حکم کو پورا کرتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کی پوری جماعت اور ان کی پیروی کرنے والوں کے بہت سے ایمانداروں کو دیکھئے کہ پوری دنیا میں ان کو اللہ تعالیٰ کے ایک حکم سے بھی نہ ہٹا سکے اور ان کو اگر اللہ تعالیٰ کے صرف ایک حکم کے مقابلے میں پوری دنیا کی مال و دولت اور بادشاہی دیدی جاتی یا ان کو سخت سے سخت موت کی دھمکی دی جاتی، پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ کے صرف ایک حکم کے چھوڑنے یا اس میں ذرہ برابر ترمیم کرنے کا تصور تک بھی نہیں کر سکتے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کو سمجھانے کے لئے دو مثالیں پیش کر ہوں۔

فرض کرو کہ ڈاکٹروں، طبیعوں کی ایک جماعت نے ایک چیز کے متعلق یوں کہہ دیا کہ اگر اس کو کھایا جائے تو انسان ہزار سال زندہ رہ سکتا ہے لیکن اس بوٹی کا اثر اس قدر تلخ ہے کہ اس کو کھاتے ہی انسان پریشان ہو جاتا ہے اور اس پر سخت قسم کی خارش مسلط ہو جاتی ہے اور زندگی کے ہر ایک لمحہ کے بعد پریشانی بڑھ جاتی ہے اور خارش تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے تو جس شخص کو ڈاکٹروں اور طبیعوں پر کچھ اعتماد ہو کہ یہ ٹھیک بول رہے ہیں تو اگر پوری دنیا میں اس شخص کو مال و دولت کی پیشکش کریں یا اس کو آروں سے چیرنے پر یا تیل میں جلانے کی دھمکی دے تو بھی وہ شخص کبھی اس بوٹی کو کھانے کا تصور نہیں کرے گا کیونکہ وہ یہی سمجھے گا کہ ہزار سال تک ہر لمحہ کی نئی نئی مصیبت اور نئی نئی موت سے بہتر یہی ہے کہ ایک بار مر جاؤں۔

دوسری مثال یوں سمجھئے کہ دنیا کا کوئی بادشاہ ایسا ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دے رکھا ہے اور اس نے اپنی رعایا سے جو وعدے کئے ہیں وہ ان کو حتیٰ الوسع پورا کرتا ہے وہ کسی شخص کو کہہ دیتا ہے کہ فلاں علاقے میں جاؤ اور وہاں کے ڈاکوؤں کو گرفتار کرو، اگر آپ نے گرفتاری میں پوری کوشش کی تو گرفتار ہونے کی صورت میں آپ کو کروڑوں روپے دیئے جائیں گے، اگر آپ کو فوج کی ضرورت پڑی تو فوج بھی بھیج دی جائے گی، اگر زخمی ہوئے تو علاج بھی کیا جائے گا، اگر مارے گئے تو پھر بھی آپ کی اولاد اور اہل و عیال کے لئے لاکھوں روپے کے وظائف مقرر کئے جائیں گے اور ان کو اچھے عہدوں پر فائز کیا جائے گا، تو ایسی صورت میں وہ جان کی پرواہ کئے بغیر ڈاکوؤں کا تعاقب کرے گا اور سخت سے سخت تکلیفیں جھیلے گا۔ اگر رعایا اپنی طرح کمزور انسان کے وعدے پر اس قدر اعتماد

کر سکتی ہے اور اپنے آپ کو سخت مشقت اور موت کے منہ میں ڈال سکتی ہے تو اللہ تعالیٰ جو ہر قسم کی نعمتوں اور خزانوں کا مالک ہے اور جس کی راہ میں جو قتل یا مارا جائے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس دنیا سے اچھی زندگی اور ابدی بادشاہی سلطنت دے دیتا ہے تو اس کی باتوں اور وعدوں پر کیونکر بھروسہ نہیں کیا جائیگا البتہ یہ سعادت صرف ایمانداروں کو حاصل ہے۔

ایمانداروں کو ایک طرف تو اللہ تعالیٰ سے سخت محبت ہوا کرتی ہے جس کی وجہ سے وہ پوری دنیا اور اسکی نعمتوں کو خیر باد اور محبوب حقیقی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں ہر قسم کی تکلیف پر لبیک کہتے ہیں، دوسری طرف ان کو اللہ تعالیٰ کی باتوں پر اور وعدوں پر اعتماد اور بھروسہ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کی تکلیف اور مصیبت کو خوشی سے برداشت کر لیتے ہیں، وہ خوب سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اسکا حکم چھوڑنا ایک ایسی بوٹی اور ایک ایسا زہر ہے کہ جس کو اختیار کرنے اور کھانے کے بعد میری ابدی اور ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی تباہ و برباد ہو جائیگی اور میری ہمیشہ کی زندگی کا ہر لمحہ نئے نئے اور سخت سے سخت ترین عذاب کی طرف بڑھتا چلا جائیگا اور اسکا حکم پورا کرنا اور اسکی رہنمائی پر چلنا ہر مصیبت اور ہر تکلیف کو راحت و سکون میں تبدیل کرتا ہے اور انسان کی ہمیشہ کی زندگی ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی نئی نئی اور لذیذ سے لذیذ ترین نعمتوں کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے۔ لہذا توکل کی پہلی صورت اور شکل یہی ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی باتوں اور اسکی تعلیم اور رہنمائی اور اسکے وعدوں وغیرہ پر کامل بھروسہ ہو کہ زندگی گزارنے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو تعلیم اور ہدایت دی ہے، بس وہی حق ہے۔

جن اخلاق اور جن اعمال اور جن چیزوں کے اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے وہی برحق ہیں، اسی میں انسان کی خیر ہے اور جن بد اخلاقیوں اور جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دے کر ان سے منع فرمایا ہے، وہی چیزیں انسان کی دنیا اور آخرت کی تباہی کا سبب ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ہر بات پوری ہو کر رہے گی۔

### توکل کی پہلی صورت کے متعلق قرآن مجید کی چند آیات!

اب توکل کی اسی پہلی صورت کے متعلق چند آیات کو پڑھ لیجئے:

(۱) چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

(۱) ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ط إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ط وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝﴾

”اے نبی ﷺ (حسب سابق) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہئے اور کافروں و منافقوں کے پیچھے نہ چلئے، بے شک اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے اور آپ ﷺ (اس وحی (اور بات) کی پیروی کرتے رہئے جو آپ کے رب کی طرف سے آپ کو کی جاتی ہے، یقیناً جو کچھ تم لوگ کرتے رہتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے اچھی طرح باخبر ہے، اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرو، اللہ تعالیٰ ہی وکیل ہونے کیلئے کافی ہے۔“ (الاحزاب: آیت ۳۱ تا ۳۲)

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ تعلیم دی ہے کہ کفار و منافقین کے مخالفانہ و معاندانہ کوششوں، پروپیگنڈوں اور دھمکیوں سے قطعاً بے پروا ہو کر اپنے کام میں لگے رہیں اور بتلایا جاتا ہے کہ کسی مصلحت وغیرہ کی بناء پر ان کی بے جا فرمائشوں اور مکارانہ مشوروں کو نہ مانیں بلکہ آپ اپنی تعلیمات اور ہدایات پر چلیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتلائی جاتی ہیں کیونکہ وہ علیم و خیر اور بڑی حکیم ذات ہے جو حالات کو جاننے والا ہے اور ہر چیز اور ہر کام و عمل کے نتیجے اور انجام کو خوب جانتا ہے اور اس کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ بندوں کی مصلحت اور فائدہ کس چیز اور کس کام میں ہے، لہذا اللہ تعالیٰ اور اسکی رہنمائی اور اس کے وعدوں پر توکل اور مکمل بھروسہ کریں اور وہ ہر کام بنانے کو کافی ہے۔

(۲) ﴿وَقُلْ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ أَعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ ط إِنَّا عَمِلُونَ ۝ وَانْتَظِرُوا إِنَّا مُنْتَظِرُونَ ۝ وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأُمُورُ كُلُّهَا فَاَعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ط وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝﴾

”جو لوگ ایمان نہیں لائے، آپ ﷺ ان سے کہہ دیجئے کہ تم اپنی جگہ اور اپنی حالت اور طریقے پر عمل کرتے رہو اور ہم بھی (اپنے طریقہ) پر عمل کرتے رہتے ہیں اور تم بھی (نتائج کے) منتظر رہو اور ہم بھی انتظار کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہیں اور سارے امور اسی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں، پس (اے پیغمبر ﷺ) آپ ﷺ اس کی بندگی کیجئے اور اس ذات پر اسکی رہنمائی اور وعدوں (وغیرہ) پر توکل (اور بھروسہ) رکھئے اور جو کچھ تم کرتے ہو، آپ کا رب اس سے بے خبر نہیں ہے۔“ (الہود: آیت ۱۲۱ تا ۱۲۳)

(۳) ﴿وَإِذْ عَشِيرَتُكَ الْأَقْرَبِينَ ۝ وَخُفِضَ جَنَاحُكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ۝ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝﴾

”اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرایا کریں اور جو لوگ مومنین (کی جماعت) میں داخل ہو کر تمہاری پیروی اختیار کریں، ان کیلئے (شفقت کے) پروں کو جھکا دیجئے (یعنی ان کے ساتھ شفقت اور تواضع سے پیش آئیں)



پھر اگر وہ تمہاری نافرمانی کریں تو ان سے کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اس سے میں بیزار ہوں اور اس غالب (زبردست) اور رحیم (ذات) پر توکل کرو۔ (الشعراء: آیت ۲۱۴ تا ۲۱۷)

ان آیات میں بھی دوسرے امور کے ساتھ اس بات کی تعلیم دی جاتی ہے کہ کسی طاقت اور سخت مشکلات کی پروا کئے بغیر اپنا کام کرو اور اللہ تعالیٰ کے احکامات پر سختی سے جھے رہو اور اسی کی رہنمائی و تعلیم اور وعدوں وغیرہ پر بھروسہ کیا کرو جو غالب ہو کر رہے گا اس کو دنیا کی کوئی طاقت مغلوب نہیں کر سکتی۔

(۴) ﴿وَأَنذَرُ عَلَيْهِمْ نَارُوحَ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَقُومُ إِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذَكِيرِي بِأَيْتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنظِرُونِ﴾

”(اے پیغمبر ﷺ) ان کو نوح علیہ السلام کا حال سنائیے جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم اگر (تمہارے درمیان وعظ و دعوت کیلئے) میرا کھڑا ہونا اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے وعظ و نصیحت کرنا تم پر گراں گزرتا ہے (تو ہوا کرے، مجھے اس کی کوئی بھی پروا نہیں کیونکہ) میں تو صرف اللہ تعالیٰ (پر اور اس کی تعلیم و رہنمائی اور وعدوں) پر بھروسہ رکھتا ہوں لہذا تم (میرے خلاف اور میری ضرر رسانی اور ختم کرنے کیلئے) اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے مل کر اپنی تدبیر (اور متفقہ فیصلہ) کو خوب مضبوط کر لو اور پھر تم پر تمہاری تدبیر چھپی نہ رہے (اور تدبیر و فیصلے کا کوئی پہلو اور کوئی جز نظر سے ہٹنے نہ پائے) پھر میرے ساتھ (جو کچھ کرنا چاہتے ہو) کر گزرو اور مجھ کو (ذرا بھی) مہلت نہ دو۔ (یونس: آیت ۷۱)

ایک پیغمبر کا اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی باتوں اور اسکے وعدوں پر یقین و توکل کو دیکھ لیجئے کہ پوری قوم کو لا کار کر اعلان فرماتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور نافرمانی کے خوف کے مقابلے میں کسی کا ڈر نہیں، ان کو اللہ تعالیٰ کے وعدوں اور اسکی تعلیمات اور اسکی نصرت پر اس قدر کامل بھروسہ اور اعتماد ہے کہ پوری دنیا کی طاقتیں اور قوتیں اس کے خلاف جمع ہو جائیں ان کی یہ تدابیر اور قوتیں و طاقتیں پاش پاش ہو کر آخری جیت ان کی ہوگی اور یہی ہوا کہ بالآخر نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف پوری قوم غرق ہو گئی اور نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ و السلام اپنے چند امتیوں کے ساتھ غالب آگئے اور نجات پا گئے۔

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں اسی قسم کا مضمون ہے جن میں سے چند آیتوں کو پیش کیا گیا ہے یہ اس بات کو سمجھنے کے لئے کافی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم و رہنمائی اور اسکے کئے ہوئے وعدوں وغیرہ پر مکمل اعتماد و بھروسہ کر کے

اور انکے مطابق عمل کرنا اللہ تعالیٰ پر توکل کہلاتا ہے اور توکل کی یہی وہ صورت ہے جو توکل کے باب میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور اسکے علاوہ توکل کی جس قدر اقسام یا صورتیں بیان کی جاتی ہیں، وہ اسی توکل کی شاخیں یا اجزاء ہیں اور یہی وہ توکل ہے جس کو یقین بھی کہا جاتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ پر اور اسکی باتوں پر اور وعدوں وغیرہ پر مکمل یقین کرنا۔

توکل کی دوسری صورت یا قسم، کہ اسباب کے بجائے مالک اور ان کے بنانے والے اللہ تعالیٰ

پر بھروسہ ہو!

توکل کی دوسری قسم یا صورت یہ ہے کہ آدمی کا بھروسہ اسباب و وسائل اور اپنی قابلیت اور تدبیروں یا دوسروں کی نصرت پر نہ ہو بلکہ ہر معاملہ میں اسکا اعتماد و بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر ہو۔

اسباب کو اختیار کرنا اور چیز ہے اور اسباب پر بھروسہ کرنا بالکل دوسری چیز ہے!

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اسباب پر بھروسہ نہ کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اسباب و وسائل یا تدبیروں کو بالکل چھوڑ دیا جائے بلکہ اسکا مطلب یہ ہے کہ اسباب اور تدبیروں کو اختیار کرنے کے وقت بھی اور بروئے کار لانے کے وقت بھی مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کیلئے بھروسہ اسباب و تدبیروں کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ پر ہو۔ مثلاً کفر اور باطل سے لڑنے کے لئے ہتھیار اور جسمانی قوت و ہنر حاصل کرتے وقت یہ خیال ہو کہ میری کوششوں اور تدبیر سے جنگ کے اسباب و آلات اور قوت وغیرہ حاصل نہ ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ ہی اسباب اور قوت و مہارت دینے والا ہے، تو جنگی اسباب و مہارت حاصل کرنے کی کوشش کو اختیار کرتے وقت اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہو۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت نہ ہو تو مضبوط سے مضبوط اسباب و آلات اور چالیں بھی طوفان کے سامنے مکڑی کا جال بن جاتی ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت شامل ہو جائے تو مکڑی کے جالے جیسے کمزور اسباب بھی دشمن کی عقل کو خراب اور اسکی قوتوں کو مفلوج کر سکتے ہیں جیسا کہ غارِ ثور میں یہ معاملہ پیش آیا اور جب ہتھیار وغیرہ حاصل بھی ہو جائیں اور مقابلہ شروع ہو جائے پھر بھی قوت جنگی چالوں اور ہتھیاروں پر کوئی اعتماد اور بھروسہ نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ ہو کہ یہ تمام اسباب و ذرائع اللہ تعالیٰ نے بنا دیئے ہیں اور وہی ان میں تاثیر، برکت اور قوت ڈال دینے والا اور فتح دینے والا ہے، وہی باطل کے مقابلہ میں ہماری مدد فرمائے گا۔

اسی طرح ایک متوکل شخص قرض بھی مانگتا ہے اور حکومت کے کارندوں سے پاسپورٹ وغیرہ بھی بنوا لیتا ہے لیکن اس کا بھروسہ و اعتماد اپنی کوشش یا اپنے منصب یا اپنے تعلقات وغیرہ پر نہیں ہوتا بلکہ وہ اس وقت بھی صرف و

صرف اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ یہی سمجھتا ہے کہ میرا کام بنانا اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوگا۔

جوتے کا تمہ بھی ٹوٹ جائے تو بھی اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہئے!

بلکہ جوتے کا تمہ بھی ٹوٹ جائے تو بھی اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنا چاہئے، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(لَيْسَ أَلَا أَحَدُكُمْ رَبَّهُ حَاجَتَهُ كُلَّهَا حَتَّى يَسْأَلَ شَيْعَ نَعْلِهِ إِنْ انْقَطَعَ)

”تم کو چاہئے کہ اپنی تمام حاجات اللہ تعالیٰ سے مانگا کرو یہاں تک کہ جوتے کا تمہ بھی جب ٹوٹ جائے (تو

وہ بھی صرف اللہ تعالیٰ سے مانگا کریں) اور ایک روایت ثابت بنانی سے مرسل طور پر ذکر ہے جس میں اتنا اور اضافہ

بھی نقل کیا گیا کہ تمک بھی اس سے مانگو“۔ (ترمذی)

دیکھئے اس حدیث کا یہ مطلب تو نہیں کہ جوتے کا تمہ جب ٹوٹ جائے تو اسکو موچی کے پاس سے نہ بنوایا

جائے یا نہ خود بنایا جائے بلکہ اس کا مطلب یہی ہے کہ تمہ بنانے کے اسباب اختیار کرتے وقت بھی اللہ تعالیٰ سے

مانگا کریں تاکہ وہ اس کے بنانے کو آسان بنائے اور اچھے اسباب میسر فرمائے اور اچھی طرح بن جائے۔ جیسا کہ ایک

روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ:

(فَإِنَّهُ لَمْ يَتَيَسَّرْ لَمْ يَتَيَسَّرْ)

کیونکہ اللہ تعالیٰ اگر آسان نہ بنائے تو بے شک (جوتے کا تمہ بھی) میسر نہ ہو سکے گا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ایک متوکل کی نظر اور اس کا بھروسہ اور اعتماد ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے، اس لئے وہ ہر

حال میں اسی سے ہی مانگتا ہے اور مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لئے جن اسباب کو حاصل کرنا چاہئے ان اسباب کو

حاصل کرنے کے وقت بھی اللہ تعالیٰ ہی سے جائز اسباب مانگے گا اور اسکے لئے اللہ تعالیٰ کا نام لیکر اس کے بھروسہ

پر کوشش شروع کریگا اور ناجائز اسباب سے بچنے کی کوشش کریگا نیز وہ اسباب کے حصول میں اس قدر مشغول نہ ہوگا

جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام سے غافل ہو جائے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ اسباب عطا فرمائے، پھر بھی

اللہ تعالیٰ کا شکر کرے گا اور برابر اللہ تعالیٰ سے مطلوبہ نتائج مانگے گا اور جب مطلوبہ نتائج حاصل ہو جائیں پھر بھی فخر،

تکبر اور اترانے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر کرے گا اور تواضع کو اختیار کریگا۔ اور یہی تعلیم اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں جگہ جگہ

مختلف انداز میں دیتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿فَابْتَغُوا عِنْدَ اللَّهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ وَاشْكُرُوا لَهُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾

”پس تم اللہ تعالیٰ ہی سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کا شکر ادا کرو، اسی کی طرف (قیامت میں) لوٹائے جاؤ گے۔“ (العنکبوت: آیت ۱۷)

توکل کی دوسری قسم کے متعلق قرآن مجید کی چند آیات اور چند احادیث شریفہ! توکل کی دوسری قسم کو سمجھنے کے بعد اسکے متعلق قرآن مجید کی چند آیات اور رسول اللہ ﷺ کے چند ارشادات پیش کرتے ہیں:

(۱) نبی کریم ﷺ کو ارشاد کیا جاتا ہے:

﴿...وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ طَائِفًا لِّلَّهِ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾  
 ”آپ ﷺ ان (صحابہ کرام ﷺ) سے اپنے امور (یعنی جہاد وغیرہ کاموں) میں مشورہ لیجئے، پھر (مشورہ وغیرہ کے بعد) جب تم نے (کسی بات کا) عزم (یعنی پکا ارادہ) کر لیا تو اللہ تعالیٰ پر توکل (بھروسہ) کر لیجئے، بے شک اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کیساتھ محبت رکھتا ہے۔“ (آل عمران: آیت ۱۵۹)  
 مذکورہ بالا آیت کریمہ میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ تدبیر اور عقل و فکر کو دوڑا کر کوشش کے بعد جو بات طے ہو جائے اور جب بات ٹھان لی جائے تو اس پر کاربند ہو کر معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں اور اسی پر بھروسہ رکھیں۔

(۲) حضرت یعقوب علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے بیٹوں کو مصر بھیجتے وقت جو نصیحت کی، اس کو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا:

﴿وَقَالَ يٰٓإِسْحٰقُ لَا تَدْخُلُوا مِٔنَ بَابٍ وَاحِدٍ وَّادْخُلُوا مِٔنْ أَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ وَمَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِّنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ طَائِفًا لِّلَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ﴾

”اور (یعقوب علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے) کہا، اے میرے بیٹو! ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا اور تم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھی بات اور تقدیر سے میں ذرہ بھی نہیں بچا سکتا۔ حکم (اور فیصلہ) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لئے نہیں (اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مقابلہ میں کسی کی طاقت اور حکم نہیں چلتا) میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی پر توکل کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہئے۔“ (الیوسف: آیت ۶۷)  
 اس آیت کریمہ میں حضرت یعقوب علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے بیٹوں کو جو نصیحت کی، اس میں اگر

ایک طرف اسباب اور تدبیر کو اختیار کیا اور بتایا کہ حکومتِ مصر کے ایک ہی دروازے سے سب کے سب داخل نہ ہو جاؤ تا کہ حکومت وغیرہ کی طرف سے کوئی مصیبت پیش نہ آجائے اور پھر بتایا کہ کائنات میں فیصلہ اور حکم صرف اللہ تعالیٰ کا چلتا ہے، اسکے حکم اور فیصلہ کے مقابلہ میں تمام تر قوتیں، طاقتیں اور تدبیریں ہیچ ہیں لہذا جو کچھ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور تقدیر ہو وہی پیش آئے گی اور میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے ذرہ برابر بھی نہیں بچا سکتا، البتہ ظاہری اسباب اور تدبیر کو اختیار کرنا چاہئے مگر بھروسہ اسباب و تدبیر پر نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ پر کرنا چاہئے اور یہی متوکلین کا شیوہ اور عادت ہے۔

(۳) نبی کریم ﷺ نے اسباب اور تدبیر کو اختیار کر کے اس کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل کی تعلیم فرمائی۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں اپنی اونٹنی کو باندھ کر توکل کروں یا اس کو چھوڑ دوں اور توکل کروں (کہ میری اونٹنی مجھ مل جائے گی) تو آپ ﷺ نے فرمایا:

(أَعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ)

یعنی اونٹنی کو باندھ کر توکل کر۔ (ترمذی: ابواب صفۃ القیامۃ)

### توکل کے متعلق افراط و تفریط!

قرآن کی بہت سی آیات اور نبی کریم ﷺ کی بہت سی احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ اسباب و تدبیر کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں بلکہ اسباب و وسائل کو کس حد تک اختیار کرنا چاہئے اور کس حد تک اس میں ڈوبنا چاہئے، اسکے متعلق لوگوں میں افراط و تفریط پایا جاتا ہے اور اسکے متعلق علمی طور پر عموماً تین قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں:

(۱) ان میں سے ایک قسم کے لوگ تو وہ کفار اور دہریہ وغیرہ ہیں جو سرے سے تقدیر و توکل کے قائل ہی نہیں، انہوں نے تو مادی اسباب و وسائل کو ہی خدا بنا رکھا ہے، اسلئے وہ اسباب کو حاصل کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریقے کو اختیار کر لیتے ہیں۔

(۲) دوسری قسم ایسے لوگوں کی ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں۔ تقدیر و توکل کے قائل ہیں لیکن انہوں نے توکل کا مطلب یہ لے لیا ہے کہ سب کسب و محنت و مزدوری اور تدبیروں کو چھوڑ چھاڑ کر سارے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کئے جائیں اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں اور یہ سمجھیں کہ جو قسمت میں ہوگا وہ ہو جائے گا اور ملتا

رہے گا۔ اس کے لئے وہ تقدیر اور توکل کے متعلق رسول اللہ ﷺ کے بعض ارشادات کو بھی پیش کرتے ہیں۔

### بدفالی اور شرکیہ و ناجائز دم کی مذمت و ممانعت!

جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”میری امت سے ستر ہزار لوگ بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے، یہ وہ لوگ ہیں جو منتر نہیں کراتے، بدشگون اور بدفال نہیں لیتے اور (اپنے تمام امور میں) صرف اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں“۔ (بخاری و مسلم)

اس حدیث سے وہ یہ مطلب لیتے ہیں کہ گویا ہر قسم کے اسباب و معاش زندگی کا ترک کرنا گویا توکل ہے، حالانکہ اس سے مراد نفس و دوا علاج اور تدبیر کے چھوڑ دینے کی ترغیب نہیں دلائی گئی بلکہ مراد یہاں جاہلیت کی تمام برائیوں کی نجات ہے۔ ان میں سے ایک جھاڑ پھونک وغیرہ تھی اور زمانہ جاہلیت میں لوگ انہی جھاڑ پھونک کو دکھ درد، بیماری کو ختم کرنے کا ایک آسان طریقہ سمجھتے تھے اور یہ منتر اور جھاڑ پھونک بھی عموماً مشرکانہ اور ناجائز ہوتے تھے اور دوسری برائی ان میں یہ بھی تھی کہ وہ اپنے نفع و نقصان وغیرہ کے لئے پرندوں کے اڑ جانے اور آواز وغیرہ سے شگون و فال لیتے تھے، اگر شگون و فال برانگتا تھا تو سمجھتے تھے کہ اس کام میں فائدہ نہیں ہوگا یا نقصان ہوگا، اس لئے اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ آپ ﷺ نے دونوں برائیوں کی مختلف موقعوں پر مذمت فرمائی ہے، جھاڑ پھونک جائز و ناجائز کا بیان ان شاء اللہ آگے آجائے گا، البتہ بدفالی کی مذمت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت رسول اللہ ﷺ کا ارشاد پڑھ لیجئے:

(لَا طَيْرَ وَخَيْرَ هَالِفَالٍ قَالُوا وَمَا الْفَالُ قَالَ الْكَلِمَةُ الصَّالِحَةُ تَسْمَعُهَا أَحَدٌ)

”بدشگونی (کی کوئی حقیقت) نہیں ہے اور اس سے بہتر تو (اچھی) فال ہے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ وہ فال کیا چیز ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ اچھی بات جس کو تم میں سے کوئی شخص سنے“۔ (بخاری و مسلم)

طیرہ بدشگونی اور بدفالی کو اور فال نیک شگون اور نیک فالی کو کہتے ہیں۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بدشگونی اور بدفالی ایک بے حقیقت چیز ہے، اس کا نفع و نقصان سے کوئی تعلق نہیں اور نہ شریعت مطہرہ نے اس کو نفع و نقصان حاصل کرنے کا کوئی سبب مقرر فرمایا ہے، لہذا اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس لئے بدفالی لے کر اپنے آپ کو خواہ مخواہ خوف، رنج اور ناامیدی میں مبتلا نہ کیا جائے اور ایک حدیث میں بدشگونی کے متعلق فرمایا گیا کہ بدشگونی اور بدفالی شیطان کا کام ہے۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ)

اور ایک حدیث میں بدشگونی اور بدفالی کو شرک کہا گیا ہے۔ (ابوداؤد، ترمذی، مشکوٰۃ)

جس کا مطلب یہی ہے کہ یہ مشرکین کے طور طریقوں اور ان کی عادات میں سے ہے اور یہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے ناامید کر کے اللہ تعالیٰ پر توکل کو ختم کر دیتا ہے، اس لئے نبی کریم ﷺ نے بدشگونی اور بدفالی کے وقت تعلیم دیدی کہ اسکی وجہ سے کسی کام و سفر کو نہ چھوڑو بلکہ اس موقع پر اگر بتقاضائے بشریت دل و دماغ میں کوئی وہم اور تردد پیدا ہو جائے تو اس وہم و تردد پر قطعاً بھروسہ و اعتماد نہ کیا جائے بلکہ اللہ تعالیٰ پر یقین و توکل رکھے اور اپنے کاموں اور سفر وغیرہ کو جاری رکھیں۔ چنانچہ عروہ بن عامر (تابعی) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے بدشگونی اور بدفالی کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

(احسنہا الفال وَلَا تَرُدُّ مُسْلِمًا فَاذْرَأْ أَحَدُكُمْ مَا يَكْرَهُ فَلْيَقُلْ اللَّهُمَّ لَا يَأْتِنِي بِالْحَسَنَاتِ إِلَّا أَنْتَ وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَاتِ إِلَّا أَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ)

”اس کی بہترین صورت (اچھی) فال ہے اور (یاد رکھو) کسی مسلمان کو بدشگونی اور بدفالی (اپنے مقصد و ارادے سے) باز نہ رکھے اور جب تم میں سے کوئی شخص ایسی چیز کو دیکھے جس کو وہ ناپسند کرتا ہے (یعنی ایسی چیز جس سے بدشگونی اور بدفالی لی جاتی ہے اور جو دل و دماغ میں وہم پیدا کرتی ہے) تو چاہئے کہ یہ دعا پڑھے:

(اللَّهُمَّ لَا يَأْتِنِي بِالْحَسَنَاتِ إِلَّا أَنْتَ وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَاتِ إِلَّا أَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ)

”اے اللہ! اچھائیوں کو لانے والا صرف تو ہے اور صرف تو ہی خرابیوں کو دور کرنے والا ہے اور برائی سے بچنا اور نیکی کی قوت و توفیق صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔“ (ابوداؤد مرسل، مشکوٰۃ)

**نیک فال امید دلاتی ہے اور مستحب ہے!**

مذکورہ بالا حدیثوں میں نیک فال کو اچھا اور مستحب قرار دیا گیا ہے اور نیک فال کیا ہے کہ کسی شخص کو ایسا جملہ سنائی دے جس سے اسکے دل میں اپنے مطلوب و مقصود کو حاصل ہو جانے کی امید پیدا ہو جائے اور اس جملہ کو گویا وہ اپنے حق میں ایک اچھی پیشگوئی سمجھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ جب کسی کام کے لئے باہر نکلتے تو آپ ﷺ کو یہ اچھا معلوم ہوتا کہ کسی کی زبان سے یہ سنیں، ”اے راشد“، ”اے نجج“۔ (ترمذی، مشکوٰۃ)

بہر حال نیک فال لینا اچھا اور مستحب ہے اور بدشگونی اور بدفالی لینا مذموم اور ممنوع ہے، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ نیک اور اچھی فال دل میں اطمینان اور خوشی پیدا کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے اچھائی اور بھلائی کی امید آوری ہوتی ہے اور یہ انسان کے عمل و کسب اور نیک ارادوں کے پورا کرنے میں اور زیادہ تقویت دینے والا ہے اور



اس کے برعکس بدفالی دل میں غم ورنج پیدا کرتی ہے اور ناامیدی کو پیدا کرتی ہے اور عمل و کسب و سفر وغیرہ سے روک دیتی ہے۔

غرض یہ کہ جو لوگ ترک اسباب کے لئے جنت منتر اور بدشگون کو چھوڑنے کو دلیل میں پیش کرتے ہیں، یہ دلیل ان لوگوں کیلئے راست نہیں آسکتی بلکہ یہاں تو ان اسباب اور تدبیروں کو توکل کے خلاف بتایا جاتا ہے جو اسباب و تدابیر اللہ تعالیٰ کو ناپسند اور شریعت مطہرہ نے جن کو غلط قرار دیا ہے نیز ایسے لوگ ترک اسباب کے متعلق اس حدیث کو بھی پیش کرتے ہیں جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ:

”اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایسا توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو اللہ تعالیٰ تم کو ایسی روزی پہنچاتا جیسے پرندوں کو پہنچاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں۔“

(۳) اور تیسری قسم وہ ہے جو شریعت میں مطلوب ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے کہ اسباب اختیار کئے جائیں لیکن بھروسہ اسباب پر نہیں بلکہ مسبب الاسباب پر ہو۔

اسباب نہ ہوں یا نہ رہیں تو اللہ تعالیٰ بلا مقررہ اسباب کے دوسرے ذرائع سے روزی پہنچا

دیتا ہے!

اگر معمولی غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہاں بھی اسباب و ذرائع کو بالکل نظر انداز نہیں کیا گیا ہے کیونکہ پرندے اپنے آشیانوں اور گھونسلوں سے نکلتے ہیں تو پھر ان کے سیر ہونے کا بندوبست کیا جاتا ہے لہذا ترک اسباب کا اثبات اس حدیث سے اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ اگر نبی کریم ﷺ یوں فرماتے کہ پرندے صبح و شام خالی پیٹ اپنے آشیانوں میں بیٹھے رہتے ہیں اور سیر ہو جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں جہاں اور چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے چلنے پھرنے جیسے اسباب نہیں دیئے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی غذا اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے پہنچا دیتا ہے جیسا کہ پتھروں کے اندر کیڑے یا گھونسلوں میں پرندوں کے بچے کہ ان کو ان کی مائیں روزی لا کر گھونسلوں میں کھلایا کرتی ہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اسباب مہیا فرمائے ہیں تو وہاں اس قدر اسباب کو اختیار کیا جائیگا جس قدر اللہ تعالیٰ کی طرف سے میسر ہیں۔ تو اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم لوگ ایسا توکل کرنے لگو جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو اللہ تعالیٰ زیادہ محنت و مشقت کے بغیر سہولت کے ساتھ روزی پہنچائے گا، جس طرح پرندوں کو بغیر زیادہ محنت و مشقت کے خوشی اور سہولت کے ساتھ روزی عطا فرماتا ہے۔

غرض یہ کہ اس طرح کی حدیثوں کو توکل کے باب میں لا کر ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقررہ اور جائز اسباب کو چھوڑنے کو توکل کہنا صحیح نہیں اور نہ یہ بحث و تحقیق کا طریقہ ہے کہ کسی مسئلہ کے متعلق قرآن و حدیث میں ایک آدھ آیت و حدیث لے لی جائے اور اسکے متعلق آئی ہوئی تمام آیات و احادیث کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اب مقررہ اسباب کو اختیار کرنا کہ یہ توکل کے خلاف نہیں، اسکے متعلق دلائل سن لیجئے۔

### تذہیر اور اسباب کو اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں، مزید دلائل!

اس مسئلہ کی وضاحت تقدیر کے باب میں بھی کی جا چکی ہے نیز مذکورہ بالا دو آیات اور ایک حدیث سے بھی یہ بات اچھی طرح ثابت ہو گئی ہے کہ تذہیر اور اسباب کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں لیکن پھر بھی اس کے متعلق چند دلائل اور پیش کرتے ہیں تاکہ یہ مسئلہ بلا شک و شبہ ایسا واضح ہو جائے کہ کمزور ذہن والے لوگ بھی اچھی طرح سمجھ جائیں۔

(۱) اگر عمل و کسب تذہیر کا چھوڑنا ہی توکل ہوتا تو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو نہ بھیجتا اور نہ وہ نماز، روزہ، اللہ تعالیٰ کی راہ میں جدوجہد اور کوشش اور جہاد وغیرہ کی تعلیم دیتا۔

(۲) نماز اہم ترین عبادت ہے اور اسلام کا عظیم رکن ہے لیکن اسکے متعلق جنگ وغیرہ کے وقت حکم ہے کہ اگر دشمن کی طرف سے یہ خوف ہو کہ وہ حملہ کریں گے یا تکلیف پہنچائیں گے تو ﴿فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ﴾ یعنی چاہئے کہ ان (صحابہ کرام) میں سے ایک حصہ (نماز میں) آپ ﷺ کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور اپنے اپنے ہتھیار لئے رہیں۔

اسی طرح خوف (جنگ) کی نماز کا طریقہ بتلا کر آخر میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح نماز کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ:

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَيُغْفَرْنَ عَنْهُمْ وَأَمْ تَعْنَتُمْ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَاحِدَةً﴾

”(یا درکھو) کافروں کی دلی تمنا ہے کہ اگر تمہیں اپنے ہتھیاروں اور سامان سے (ذرا برابر) غافل پائیں تو

یکبارگی تم پر ٹوٹ پڑیں۔ (النساء: آیت ۱۰۲)

دیکھئے یہاں خوف و خطرہ کے وقت تذہیر کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، سب کے سب نماز میں مشغول ہو کر اللہ تعالیٰ پر توکل کریں اس کی تعلیم نہیں دی گئی بلکہ فوج کے ایک حصہ کو نگہبانی پر لگائے جانے کا حکم اور نماز میں بھی اپنے اپنے ہتھیار لئے رکھنے کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ پر توکل کی تعلیم دینے والا قرآن مجید خود مسلمان کو ہر طرح کے سامان اور آلات جنگ سے لیس ہونے کی تاکید کر رہا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاعِدُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخِرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ﴾

”اور جہاں تمہارے بس میں ہے۔ ان (دشمنان اسلام کے مقابلے) کیلئے قوت و طاقت بندھے ہوئے گھوڑوں کو تیار رکھو تا کہ تم ان (جنگی تیاریوں اور سامان جنگ) کے ذریعے خوف زدہ کرو اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کو اور اپنے دشمنوں کو اور ان (کھلے دشمنان اسلام) کے علاوہ دوسرے (خفیہ) دشمنوں (اور منافقوں) کو جنہیں تم نہیں جانتے (البتہ ان خفیہ دشمنوں کو) اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔“ (الانفال: آیت ۶۰)

اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو جنگی تیاریوں اور اپنے مقدور بھر کوشش و محنت اور جنگی قوت پیدا کرنے کا حکم ہے تا کہ ان کے ذریعے اسلام کے کھلے اور خفیہ دشمنوں کو مغلوب اور مرعوب کیا جاسکے۔ یہاں یہ بھی یاد رکھیں کہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جب تک ہر اعتبار سے مکمل قوت اور طاقت یکجا نہ ہو جائے اس وقت تک میدان میں نہ جائیں بلکہ اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ جس قدر ممکن ہو سکے اور جس قدر بس چلے، اسی قدر قوت و طاقت پیدا کریں اور دشمنان اسلام کے مقابلے کیلئے تیار رہیں۔

(۳) اسی طرح نبی کریم ﷺ نے بھی اپنے ارشادات میں جنگی تیاریوں کا حکم دیا ہے اور خود بھی اپنی حفاظت کے لئے زرہیں اور خو د پہنتے تھے، جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ جہاد کے بیان میں آئیگا۔

(۴) نماز جمعہ کی اذان پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ حکم دیا ہے کہ دنیا کا کاروبار چھوڑ کر خطبہ و نماز میں شامل ہونے کا اہتمام کریں اور نماز ختم ہونے کے بعد ان الفاظ میں اجازت دی ہے:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

”پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کا فضل (یعنی روزی) تلاش کرو اور اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔“ (جمعہ: آیت ۱۰)

چونکہ اس سے پہلے کی آیت کریمہ میں کاروبار کو چھوڑنے کا حکم دیا گیا، اس لئے اس آیت کریمہ میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد زمین میں پھیل جانے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم و روزی تلاش کرنے اور کاروبار کی اجازت دی گئی کہ پورا دن کاروبار بند کرنا ضروری نہیں البتہ نماز کے وقت کاروبار بند کیا کریں اور نماز کے بعد روزی کو تلاش کریں لیکن روزی کی تلاش میں بھی اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کیا کریں۔

(۵) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(طَلَبُ كَسْبِ الْحَالِلِ فَرِيضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ)

”حلال روزی کمانا فرض کے بعد ایک فرض ہے۔“ (مشکوٰۃ)

نبی کریم ﷺ نے سچائی اور دیانتداری کے ساتھ کاروبار اور تجارت کرنے والے کے متعلق فرمایا کہ وہ قیامت میں نبیوں اور صدیقیوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔ (ترمذی، مشکوٰۃ)

(۶) نیز نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

(مَا أَكَلَ أَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلٍ يَدِيهِ وَإِنَّ نَبِيَّ اللَّهِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَأْكُلُ

مِنْ عَمَلٍ يَدِيهِ)

”کسی نے کبھی اپنے ہاتھ کی روزی سے بہتر کوئی کھانا نہیں کھایا اور اللہ تعالیٰ کے نبی (حضرت) داؤد (علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) اپنے ہاتھوں کی محنت سے کمانی ہوئی روزی کھاتے تھے۔“ (بخاری، مشکوٰۃ)

اس حدیث میں آپ ﷺ نے اپنی روزی خود اپنی صنعت و حرفت کے ذریعے پیدا کرنے پر مسلمانوں کو ترغیب دی ہے اور بتلایا ہے کہ اپنی روزی اپنے ہاتھوں سے خود پیدا کرنا انبیاء علیہم السلام کی سنت میں سے ہے۔

(۷) دنیا کی ضروریات اور معاملات میں کم ہمتی اور نادانی کا اختیار کرنا توکل نہیں بلکہ یہ ایک قسم کی برائی ہے اور شریعتِ مطہرہ نے اسکی مذمت فرمائی ہے چنانچہ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مقدمہ کا فیصلہ فرمایا تو ہارنے والا شخص کہنے لگا ”حسبی اللہ و نعم الوکیل“ یعنی مجھے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى يُلْوَ عَلَى الْعَجْزِ وَلَكِنْ عَلَيْكَ بِالْكَسْبِ فَإِذَا غَلَبَكَ أَمْرٌ فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ)

”اللہ تعالیٰ نادانی اور کم ہمتی پر ملامت کرتا ہے (یعنی اس کو پسند نہیں کرتا) پس دانائی کو لازم پکڑو (یعنی ہوشیاری اور عقل سے کام لو) اور کوشش و تدبیر میں کم ہمتی نہ کرو، پھر جب کوئی معاملہ تمہارے قابو سے باہر ہو جائے پھر جسبی اللہ و نعم الوکیل کہو۔“ (ابوداؤد، مشکوٰۃ: باب الاقضية والشهادات)

(۸) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَا أَنْزَلَ اللَّهُ دَاءً إِلَّا أَنْزَلَ لَهُ شِفَاءً)

”اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی بیماری نہیں اتاری جس کیلئے شفاء نازل نہ کی ہو (یعنی ہر مرض کے ساتھ اس کا علاج

بھی پیدا کیا ہے۔“۔ (بخاری، مشکوٰۃ)

اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

”ہر بیماری کی دوا ہے، جب دوا بیماری کے موافق ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے مریض صحت یاب ہو جاتا ہے۔“ (مسلم، مشکوٰۃ)

اور حضرت اسامہ بن شریکؓ کا بیان ہے کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ کیا ہم (بیماری میں) دوا اور علاج کیا کریں تو آپؐ نے جواب میں فرمایا:

(نَعَمْ يَا عَبْدَ اللَّهِ تَدَاوُوا فَإِنَّ اللَّهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً إِلَّا أَوْضَعَ لَهُ شِفَاءً غَيْرَ دَاءٍ وَاحِدٍ الْهَرَمُ)

”ہاں، اے اللہ کے بندو، علاج کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی بیماری پیدا نہیں کی ہے جس کی شفاء مقرر نہ رکھی ہو سوائے ایک بیماری کے اور وہ بڑھاپا ہے۔“ (احمد، ترمذی، ابوداؤد، مشکوٰۃ)

نبی کریمؐ خود بھی علاج کرتے تھے، چنانچہ ابوبکثہ انصاریؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ اپنے سر مبارک پر اور اپنے دونوں مونڈھوں کے درمیان نیکی کھنچواتے تھے۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ)

وہ دم جائز ہے جس میں شرکیہ الفاظ نہ ہوں اور ٹھیک مقصد کیلئے ہو!

اس طرح بہت سی حدیثیں ایسی پیش کی جاسکتی ہیں جس میں آپؐ نے دوسروں کو علاج کرنے کا حکم فرمایا بلکہ بعض وقت کوئی علاج خود بھی بتلادیا اور آپؐ خود بھی علاج کیا کرتے تھے۔ بلکہ نبی کریمؐ سے یہ بھی ثابت ہے کہ وہ جائز دم، جھاڑ پھونک کی بھی اجازت دیتے تھے بلکہ خود بھی کیا کرتے تھے۔ (جھاڑ پھونک کے مسائل کا بیان اس کتاب میں گزر چکا ہے۔) چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ:

(أَمَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ نَسْتَرْقِيَ مِنَ الْعَيْنِ)

”نبی کریمؐ نے حکم دیا کہ ہم نظر بد سے (یعنی نظر بد کے اثر کو دور کرنے کے لئے) دم کرائیں۔“۔ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ)

اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ دم کے ذریعہ نظر بد، ڈنک (یعنی زہریلی چیز جیسے سانپ، بچھو وغیرہ کے ڈنک) اور نملہ (یعنی وہ پھوڑا جو آدمی کے پہلو میں ہوتا ہے) کا علاج کرنے کی اجازت دی ہے۔ (مسلم، مشکوٰۃ)

اسی طرح نبی کریمؐ نے ہر بیماری کے لئے جھاڑ پھونک اور دم کی اجازت دیدی ہے البتہ شرط یہ ہے کہ اس

دم میں غیر شرعی اور شرکیہ الفاظ نہ ہوں اور نہ وہ غلط مقصد کے لئے کئے جائیں۔ جیسا کہ حضرت عوف رضی اللہ عنہ بن مالک اشجعی کہتے ہیں کہ ہم زمانہ جاہلیت میں (جھاڑ پھونک کے ذریعہ) منتر پڑھا کرتے تھے۔ تو (اسلام کے بعد) ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ، آپ ﷺ ان منتروں کے متعلق کیا حکم فرماتے ہیں؟

آپ ﷺ نے فرمایا:

(أَعْرِضُوا عَلَيَّ رُقَاكُمْ لَا بَأْسَ بِالرُّقَى مَا لَمْ يَكُنْ فِيهِ شِرْكٌ) (مسلم، مشکوٰۃ)

”تم ان منتروں کو پڑھ کر مجھے سناؤ، منتر (دم جھاڑ پھونک) میں کوئی حرج نہیں، جب تک ان میں شرک نہ ہو۔“

نبی کریم ﷺ نے صرف دوسروں کو اجازت نہیں دی بلکہ خود بھی دم کر لیا کرتے تھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب بیمار ہوتے تو معوذات پڑھ کر اپنے اوپر دم کرتے اور اپنا ہاتھ جہاں تک پہنچتا پھیرتے، پھر جب آپ ﷺ اس بیماری میں مبتلا ہو گئے جس میں آپ ﷺ نے وفات پائی تو میں معوذات پڑھ کر آپ ﷺ پر دم کرتی تھی جیسا کہ آپ ﷺ خود معوذات پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا کرتے تھے اور میں نبی کریم ﷺ کا ہاتھ آپ ﷺ کے بدن پر پھیرا کرتی تھی۔ (بخاری و مسلم)

اور مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ جب آپ ﷺ کے گھر والوں میں سے کوئی بیمار ہوتا تو آپ ﷺ معوذات پڑھ کر اس پر دم کیا کرتے تھے۔ (مشکوٰۃ: کتاب الجنائز)

معوذات سے مراد ”قل اعوذ برب الفلق“ اور ”قل اعوذ برب الناس“ سورتیں ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ان دونوں کے ساتھ سورۃ الاخلاص بھی مراد ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ چار قل یعنی ”قل یا ایہا الکفرون، قل هو اللہ احد، قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس“ مراد ہیں۔ واللہ اعلم۔

بہر حال مذکورہ بالا روایات سے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہوئی کہ آپ ﷺ نیک مقصد کے لئے خود بھی قرآن مجید کی آیات سے دم کیا کرتے تھے۔

اسباب و تدبیر کو چھوڑنے کو توکل کہنا جہالت اور کم ہمتی ہے!

بہت سے دلائل میں سے مذکورہ بالا جو دلائل لکھے گئے ہیں، یہ اس بات کو اچھی طرح ثابت کرتے ہیں کہ اسباب و ذرائع اور تدابیر کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں۔ اس لئے جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ روزی کی تلاش کے لئے محنت، مزدوری اور کوشش کرنا یا دوا اور جائز دم کیساتھ علاج کرنا یا کفار کے مقابلے میں جنگی تیاریاں کرنا اور اپنی حفاظت کے لئے اپنے ساتھ اسلحہ لئے رہنا وغیرہ چیزیں توکل کو ختم کرتی ہیں یا اس میں رخنہ و خلل ڈالتی ہیں

تو یہ ان لوگوں کی کم علمی اور جہالت ہے۔

یہ لوگ گویا ان چیزوں اور اسباب کو معطل اور بیکار اور مہمل بنا دیتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے اپنی حکمت اور قدرت سے بنا رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ انسان کو عقل اور اسی طرح کی دوسری صلاحیتیں دی ہیں اور اسکے ارد گرد چیزیں اور اسباب بنا کر اس سے فائدہ اٹھانے کے طریقے سکھلائے ہیں۔ آخر اسباب و وسائل اور تدبیر کو چھوڑ کر اس کو توکل کا نام دینے کا مطلب اور نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں اور ارد گرد کے اسباب کی ناقدری اور تحقیر کرتا ہے اور ان کو بالکل بیکار اور مہمل بنا کر خود اپنے آپ کو اور اپنے ماننے والوں کو پانچ، لوہے، لنگڑے، پست ہمت اور اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اسباب کو چھوڑنے والے اور اللہ تعالیٰ کے بھروسے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے بندوں کو طمع کرنے اور ان کی طرف دست دراز کرنے جیسی بیماریوں میں گرفتار کر لیتے ہیں۔

اگر کوئی ترک اسباب کو توکل تو نہیں کہتا لیکن کسی وجہ سے اسبابِ معاش کو ترک کر دے تو قابلِ

ملامت نہیں!

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ بعض نیک و صالح اور صاحبِ یقین لوگ حصولِ معاش کے ظاہری اسباب کو ترک کر دیتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ ترک اسباب کو توکل کہتے ہیں بلکہ وہ یا تو غلبہ حال کی وجہ سے اسباب کو ترک کر دیتے ہیں یا دوسروں کو اس کا مشاہدہ اور تجربہ کرانے کیلئے یہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور یا اس کو ابتدائی حالت میں اس لئے اختیار کیا جاتا ہے تاکہ اسباب و وسائل یا مال و دولت کے ساتھ قلبی تعلق اور ان پر اعتماد کو ختم کیا جاسکے اور اس بات پر کامل یقین حاصل کرے کہ ظاہری کسب و عمل اور اسباب و ذرائع اگر اختیار نہ بھی کئے جائیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھا ہوا رزق پہنچ جائے گا اور ایسے لوگوں میں سے بعض اسبابِ معاش اختیار کر بھی لیتے ہیں لیکن کسب و عمل میں مشغول ہونے کے وقت بھی ان کے توکل اور اللہ تعالیٰ پر یقین اور بھروسہ میں ذرہ برابر فرق نہیں آتا اور ایسے اشخاص کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کے سامنے اگر عادت کے مطابق چوزہ نکل آئے یا خلافِ عادت انڈے کے بجائے پتھر سے چوزہ نکل آئے۔ دونوں صورتوں میں اس کا یقین و اعتماد یکساں رہتا ہے۔ یہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس بحث سے مقصد صرف اتنا ہے کہ نیک اور صاحبِ یقین لوگوں پر اعتراض بھی درست نہیں کہ جس کو دیکھا کہ اس نے ذرائعِ معاش کو ترک کر دیا ہے یا علاجِ معالجہ کی طرف زیادہ التفات نہیں کرتا تو اس پر طعن شروع کر دی۔ البتہ اگر کوئی ترک اسباب کو توکل سمجھتا ہے یا توکل کیلئے اسباب کا چھوڑنا شرط قرار دیتا ہے تو یہ



اس کی جہالت ہے اور قرآن و سنت سے بے خبری کی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی ناقدری اور ناشکری ہے۔

### اسباب کے متعلق علمی توکل فرض ہے!

البتہ مذکورہ بالا بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ایک مسلمان پر یہ بات فرض ہے کہ وہ اسباب کے متعلق علمی توکل کو اختیار کرے وہ یہ کہ ہر کام اور ہر امر میں حقیقی متصرف اور حقیقی مختار کل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو سمجھے اور اپنے آپ کو ہر حال اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ کا محتاج سمجھے اور اسباب کے بجائے اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد و بھروسہ رکھے کہ میرا کام وہی کریگا اور وہی مجھے فائدہ پہنچائے گا اور ضرر سے بچائے گا۔

### ترک اسباب توکل کے منافی نہ ہونے کے پس پردہ اسباب کی بندگی!

یہاں تک تو ان لوگوں کی جہالت کو واضح کیا گیا ہے جو علمی طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ اسباب و تدبیر کو اختیار کرنا توکل کے خلاف ہے۔ اب ان لوگوں کی حالت کو سمجھ لیجئے جو مسلمان ہونے بلکہ اپنے آپ کو متوکل کہنے کے باوجود اسباب کی بندگی میں مبتلا ہو چکے ہیں انہوں نے جب علمی طور پر اس بات کو سمجھ لیا کہ اسباب کا اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں تو وہ اسباب پر اس قدر مطمئن اور اس قدر ان پر بھروسہ کرنے لگے کہ حقیقت ان کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی، صحابہ کرام ؓ وغیرہ متوکلین کی زندگی کے بجائے ان کی زندگی اور معاملات کفار و مشرکین کی طرح ہوگئی ہے بلکہ ان میں اور غیر مسلموں کی زندگی و معاملات میں کوئی خاص فرق نہیں رہا۔ وہ اپنے مقصد اور مطلوبہ نتائج کے حصول کیلئے ہر جائز اور ناجائز طریقوں اور اسباب کو اختیار کرنے لگے۔ عین نماز کے وقت ان کی دکان کھلی رہتی ہے اور کاروبار جاری رہتا ہے اور دنیاوی کاروبار میں اس قدر ڈوب گئے ہیں کہ حق کی خاطر جان و مال خرچ کرنا ان کو مال و جان کا ضیاع نظر آتا ہے۔ قناعت و سخاوت وغیرہ جو توکل کے ثمرات ہیں (جیسا کہ ان کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا) ان کا تو نام ہی نہیں۔ تو آخر یہ اللہ تعالیٰ کے بجائے اسباب و ذرائع وغیرہ پر اعتماد نہیں تو اور کیا ہے بلکہ آج کل تو عام مسلمانوں کا کافروں کی طرح اس بات پر ایمان راسخ ہو چکا ہے کہ اخلاق اور اچھے کردار کے مقابلے میں مادی اسباب و ذرائع اور مادی طاقت ہی فیصلہ کن چیز ہے اور اس لئے وہ دینی اداروں کی حفاظت و بقاء کیلئے حرام و حلال کو جمع کرتے ہیں اور اخلاق اور اچھے کردار اور تربیت کے بجائے شاگردوں، اپنے متعلقین اور کارکنوں کا ذہن کچھ اس طرح بناتے ہیں کہ اس کا یقین بن جاتا ہے کہ مادی اسباب اور طاقت سب سے پہلے ہے

۔ اسلئے مسلمانوں کی تمام حکومتیں اور تقریباً مسلمانوں کی ہر جماعت، ہر دینی ادارہ اصلاح و تربیت کے بجائے لوگوں سے زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے اور مادی طاقت کو اپنانے میں لگ گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ پر اعتماد و بھروسہ اور اسکے حکموں اور وعدوں پر بھروسہ اور اعتماد کا جو ہر گم ہو گیا ہے۔

مسلمانوں کی حکومتیں جن کے حکمران تقریباً سب کے سب مغرب، امریکہ وغیرہ کے ایجنٹ ہیں، اگر کسی کا ذہن اسلامی بھی ہے اور اسلام کے ساتھ وفادار بھی ہے تو ان کا بھروسہ بھی عددی اکثریت اور جنگی پوزیشن، اسلحہ کی پیداوار اور ایٹمی طاقت وغیرہ پر ہے۔ چونکہ یہ چیزیں بظاہر مغرب میں زیادہ نظر آتی ہیں تو ان کو دیکھ کر ان کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بھروسہ اور اعتماد اور اسکے بتائے ہوئے سیرت و کردار اور اخلاق و عمل سے مغرب وغیرہ کی مادی طاقت اور اسکی قیادت کو چیلنج کر دے۔ اس لئے یہ نیک دل لوگ بھی بس یہی سمجھتے ہیں کہ ہم تا قیامت مغرب کے غلام اور دست نگر رہیں گے اور جو وہ جائز و ناجائز حکم اور تہذیب ان کی طرف سے آئیگی ان کو اپنے اوپر لاگو کریں گے۔ اگرچہ مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو مغرب کے اقتدار اور اس قوت کو زیر کرنے کا سوچتے ہیں اور زبان سے بھی مغرب کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں لیکن ان کی یہ صدا اور چیلنج صرف زبانی حد تک ثابت ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہی طریقے اختیار کرتے ہیں جو اسلامی تعلیمات سے ٹکراتی ہیں اور اسکے ساتھ وہ مغرب سے دشمنی طور پر اس قدر مرعوب اور متاثر ہوتے ہیں کہ اپنی اصطلاحات کو مغرب کی اصطلاحات کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں۔

بہر حال اسباب اور طاقت کو اولیت دے دینا اور اسکو معیار و میزان بنانا اور یہ دونوں خرابیاں اور کمزوریاں بھی انہیں اسباب و ذرائع کو سب کچھ جاننے سے پیدا ہوتی ہیں۔ حالانکہ اسباب و طاقت کو اولیت دینا اور اسکو معیار و میزان بنانا وہ طریقہ فکر اور رویہ ہے جس کو ختم کرنے اور اسکی تردید کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے۔ حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوم کو اور حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوم اور جابر بادشاہ نمرود کو اور حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے بے سروسامانی کے باوجود فرعون کی طاقت کو اور اقتدار کو چیلنج کیا اور اللہ تعالیٰ کی تعلیمات پر کامل بھروسہ اور اللہ تعالیٰ کی پوری اطاعت کر کے باطل قوتوں کو شکست دی۔ نبی کریم ﷺ نے بے سروسامانی کے ساتھ جو ہتھیار مہیا ہو سکے، چند تلواروں اور چند صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ قریش کو شکست دی۔

مجھے امید ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ بہت سے مسلمانوں سے غلامی کی ذہنیت ختم ہو جائیگی اور لوگ حق اور سچائی کی راہ کو اختیار کریں گے جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ پر اور اسکی تعلیمات پر اور اسکے رسول ﷺ کی تعلیمات پر

بھروسہ کر کے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی پوری اطاعت کو اختیار کریں گے۔ جس کی وجہ سے وہ مغرب وغیرہ اور ہر باطل کی قوت و اقتدار کو چیلنج کر کے شکست دیں گے اور حق اور اسلام کا بول بالا کریں گے۔

غرض یہ کہ ایک طرف توکل کے متعلق بعض لوگوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے یہ نظریہ پھیلا نا شروع کیا کہ اسباب کا ترک کرنا ہی توکل ہے جس کی وجہ سے امت مسلمہ کو پابجوں، لنگڑے، لولوں اور دوسروں کے کندھوں پر سوار ہو کر زندگی گزارنے والی جماعت بنا دیا اور دوسری طرف ان کے برعکس بعض لوگوں نے توکل کا کچھ ایسا مفہوم بیان کیا کہ گویا اسباب و ذرائع ہی سب کچھ ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کا دین دار طبقہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کیلئے اللہ تعالیٰ کی تعلیم و ہدایت کو چھوڑ کر بعینہ انہی اسباب و تدابیر کو اختیار کرنے لگے جو غیر مسلم اختیار کرتے ہیں اور جو اسلام کے اصولوں سے ٹکراتے ہیں۔

لہذا اسباب وغیرہ کو چھوڑنے کو توکل کہنا اور اس کے برعکس اسباب میں غلو وغیرہ، دونوں ہی توکل کے مفہوم میں افراط و تفریط ہے۔ اس سے علمی اور عملی طور پر بچنا ضروری ہے۔

### کون سا توکل فرض ہے؟

اب اس کے بعد اس بات کو سمجھ لیجئے کہ کون سا توکل فرض ہے اور کون سا واجب ہے، وغیرہ۔

- (۱) اللہ تعالیٰ کی تعلیم و ہدایت اور اس کے وعدوں پر مکمل یقین و بھروسہ رکھنا جیسا کہ اس کا بیان گزر چکا ہے۔
- (۲) اسباب کے متعلق علمی و اعتقادی توکل کہ اسباب کے بجائے بھروسہ و اعتماد صرف اللہ تعالیٰ پر ہو جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

### عملی توکل میں فرض، واجب وغیرہ!

اور عملی لحاظ سے اللہ تعالیٰ پر بھروسہ و توکل کا تعلق ترک اسباب یا اسباب کے اختیار کرنے کے ساتھ ہے، اس لئے اسکے متعلق اسباب کو قدر تفصیل سے سمجھ لیجئے۔

- (۱) جو اسباب حرام ہیں جیسے سود، سٹہ یا بلا ضرورت سوال یا جھوٹ اور قسم سے تجارت چلانا اور حرام چیزوں سے فائدہ اٹھانا مثلاً شرکیہ جھاڑ پھونک کے ذریعہ سے علاج کرنا یا وہی اسباب اختیار کرنا جیسے پرندوں سے بدفالی، بدشگونی لینا اور حرام دواؤں کو بلا شدیدی ضرورت کے استعمال کرنا وغیرہ وغیرہ۔ تو ایسے تمام حرام اسباب کو چھوڑ کر توکل کرنا فرض ہے اور مکروہ اسباب کو چھوڑ کر توکل کرنا بھی واجب اور ضروری ہے۔

(۲) وہ اسباب جو حلال ہیں اور ان پر نفع اور فائدہ یقینی نہیں بلکہ شک اور گمان کے درجہ میں ہوتا ہے کہ کبھی ان سے فائدہ ہوتا ہے اور کبھی نہیں جیسے بعض قسم کے علاج کے بعد کبھی صحت ہو جاتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی یا جیسے بعض دنیاوی مشقتیں اور محنتیں کہ کبھی ان سے فائدے مرتب ہوتے ہیں اور کبھی نہیں۔ تو ایسے اسباب کو ترک کرنا قوی ایمان والے کے لئے تو جائز ہے لیکن کمزور ایمان والے کے لئے جائز نہیں اور اگر کہیں علاج وغیرہ یقین کی صورت اختیار کر لے تو مضبوط ایمان والے کے لئے بھی اس کا ترک کرنا جائز نہیں بلکہ یہ نفس کی حق تلفی اور اللہ تعالیٰ کے دئے ہوئے اسباب کو غیر مفید بنانا ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

(۳) وہم یہ اسباب جو حلال ہیں یعنی جس پر نفع و فائدہ کا مرتب ہونا صرف وہم ہوتا ہے جیسے کوئی حاکموں کی خدمت صرف اسلئے کرتا ہے کہ کل کو خدا نخواستہ مجھے کوئی مشکل پیش آئی تو یہ میری مدد کرے گا، اسی طرح اور وہ کام جو اہل حرص اور طمع لوگ اختیار کرتے ہیں۔ دور دور کے اسباب صرف اسلئے اختیار کرتے ہیں کہ شاید کسی وقت کام آئیں یا اسباب میں بہت ہی اٹھاک کرتے ہیں تو ایسے طرز عمل حریصوں اور طویل امید والوں کا شیوہ ہوتا ہے، اسلئے ایسی لمبی امیدیں اور حرص اور ان کے اسباب کو ترک کرنا کامل مومن بننے کیلئے ضروری ہے جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ مزید وضاحت کے ساتھ آئے گا۔

(۴) وہ اسباب جن کو شریعت مطہرہ نے رشد و ہدایت اور آخرت کی نجات و فلاح کیلئے ضروری قرار دیا ہے ان اسباب کو ترک کرنا بعض اوقات حرام اور گمراہی یا مکروہ ہے جیسے نماز، روزہ کو اسلئے چھوڑ دینا کہ اللہ تعالیٰ بہت ہی مہربان ہے وہی بخش دے گا یا سنت کاموں کو چھوڑنا وغیرہ۔ اسے توکل نہیں کہتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور تعلیم پر بے یقینی اور بے اعتمادی ہے جو کہ بے ایمانی اور نافرمانی و معصیت ہے اور اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی تعلیم و ہدایت پر عمل کرنا ہی اللہ تعالیٰ پر توکل و بھروسہ کرنا توکل کہلاتا ہے پھر جو تعلیم جس قدر ضروری ہے، اسی قدر توکل بھی ضروری ہے۔

(۵) وہ حلال اسباب جن پر یقیناً نفع یا ضرر مرتب ہوتا ہے جیسے پانی پینے کے بعد پیاس کا کم ہونا، کھانے کے بعد آسودگی وغیرہ یا جھکی ہوئی دیوار کے پاس سے ہٹ جانے سے ضرر سے بچاؤ کرنا تو ایسے اسباب کو ترک کر کے توکل کرنا جائز نہیں اور نہ شرعاً اسے توکل کہتے ہیں بلکہ ایسا کرنا اللہ تبارک و تعالیٰ کے دیئے ہوئے اسباب و آلات اور صلاحیتوں کو معطل کرنا ہے۔

توکل کا خلاصہ!

توکل کی دوسری صورت کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے تمام امور کا وکیل اور اپنی بھلائی و بہتری کا ضامن جان کر بس صرف اسی پر اور اسکی تعلیمات و ہدایات اور اسکے وعدوں پر اور اسباب وغیرہ کے حصول اور اختیار کرنے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم نہ ٹوٹے پائے اور اسی پر مکمل بھروسہ و اعتماد کریں اور کسب معاش اور دفع بلا و مصیبت کے جو اسباب و آلات اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں اور اپنے مقاصد اور نتائج کیلئے اللہ تعالیٰ نے جو قوت و توانائی اور جو اسباب و آلات میسر کئے ہیں، ان سب کو استعمال کریں اور ان قوتوں و وسائل و ذرائع اور کسب و عمل کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ نظام کائنات کا سلسلہ اور نعمتوں کے پہنچانے کا ایک ظاہری سبب جانے، اس لئے ان مادی اور ظاہری اسباب و ذرائع وغیرہ میں زیادہ غلو نہ کیا جائے اور نہ ان میں زیادہ مشغول ہوں اور نہ مطلوبہ نتائج و مقاصد کے لئے ناجائز اسباب و ذرائع اور تدابیر کو اختیار کریں اور اسباب وغیرہ کے حصول اور اختیار کرنے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم نہ ٹوٹے پائے۔

اور جائز اسباب و تدابیر اور کسب و عمل کو اختیار کرنے کے بعد اپنے کام اور معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے اسی پر بھروسہ رکھیں کہ وہی میرا کام کرے گا اور نیز یہ بھی یقین و بھروسہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ان مقررہ اسباب و ذرائع وغیرہ کی پابندی نہیں اگر کوئی سبب و ذریعہ اور عمل نہ بھی ہو تو پھر بھی اللہ تعالیٰ مطلوبہ نتائج اور نعمتوں کے پہنچانے پر قادر ہے اور پہنچائے گا۔

### متوکل اور غیر متوکل میں فرق!

سچا مومن بھی عالم اسباب میں ساری تدابیر قانون فطرت کے مطابق اس طرح اختیار کرتا ہے جس طرح اہل دنیا اور غیر متوکل اختیار کر لیتے ہیں مگر پھر بھی متوکل اور غیر متوکل میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے کیونکہ متوکل کا بھروسہ ان تدبیروں پر نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ اس کی کوئی تدبیر نہ ٹوٹیک طرح شروع ہو سکتی ہے نہ چل سکتی ہے اور نہ آخر مطلوب پر پہنچ سکتی ہے جب تک اللہ تعالیٰ کا فضل اور احکام و کرم شامل حال نہ ہو۔ اسلئے وہ کسی مقصد کے حصول کیلئے نہ تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اور نہ وہ اسباب میں اتنا زیادہ انہماک کرتا ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے احکامات میں کوتاہی اور سستی آئے اور اگر اسباب و ذرائع مہیا نہ ہو سکے یا نہ رہے تو پھر بھی وہ مایوس اور ناامید نہیں ہوتا بلکہ اسکا بھروسہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بجائے اور قسم کے اسباب سے میرے کام چلائے گا اور ہر مطلوبہ نتائج عطا فرمائے گا۔ اسلئے متوکل شخص ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مانگنے والا اور اسکے حکم میں چست اور چوبندر ہوتا ہے، سخی اور شجاع، میدان میں کود پڑنے والا ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ہر

بات اور ہر وعدے پر بھروسہ کر کے پورے دین پر چلنے میں سراسر خیر اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں ہلاکت اور بربادی کا مشاہدہ کر لیتا ہے اور اسکے برعکس غیر متوکل کو یہ نعمتیں میسر نہیں اور وہ صرف مادی اسباب پر بھروسہ کرتا ہے، اس لئے وہ صرف اسباب کو ہی پوجتا ہے اور جو حلال و حرام اختیار کرنا پڑے وہ اپنے مقصد کے حصول کیلئے اختیار کر لیتا ہے اور اسباب مہیا نہ ہو سکنے یا نہ رہنے کی صورت میں مطلوبہ نتائج کے حصول سے مایوس اور ناامید ہو کر اسکی زندگی پر اگندہ اور پریشان ہو جاتی ہے۔

### توکل کے ثمرات اور علامات!

ہر چیز اپنی علامت اور اپنے پھل سے پہچانی جاتی ہے اس لئے توکل کے ثمرات اور علامات لکھ دیتے ہیں کہ توکل کے ثمرات و علامات معلوم ہو جائیں تاکہ کسی کو اپنے متعلق متوکل ہونے میں غلط فہمی نہ رہے اور متوکلین کی صفات اپنے اندر لانے کی کوشش کرے۔

(۱) توکل اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات پر آدمی کو کاربند رکھتا ہے۔ اس میں صبر، تقویٰ وغیرہ، تمام تعلیمات اور ہدایات داخل ہیں اور ان میں سے بعض کا بیان اس کتاب میں گزر چکا ہے اور بعض کا بیان ان شاء اللہ بعد میں آئے گا۔

(۲) توکل، حرام و ناجائز و مکروہ بلکہ نامناسب اسباب و ذرائع کو بروئے کار لانے سے بچا لیتا ہے یعنی متوکل ظاہری نفع و نقصان اور لذت کو نہیں دیکھتا۔ اسکی نظر اللہ تعالیٰ کی تعلیم اور ہدایت پر ہوتی ہے۔ اسلئے وہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کرتا ہے۔ اگر ظاہری طور پر اس کو کسی چیز میں فائدہ ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے تو وہ اسکو سراسر نقصان سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے۔

(۳) توکل سخاوت پیدا کرتا ہے اور بخل سے بچا لیتا ہے۔

(۴) توکل شجاعت پیدا کرتا ہے۔ بزدلی وغیرہ جیسے امراض سے نجات دیتا ہے۔

(۵) توکل صبر و قناعت اور مخلوق سے استغناء پیدا کرتا ہے، مخلوق سے سوال، طمع، حرص، چالپوسی وغیرہ جیسے

امراض اور بے مروت کاموں سے بچا لیا کرتا ہے۔

### توکل کا اعلیٰ مقام یا رضا بالقضاء!

توکل کا خلاصہ تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی کو نفع و نقصان، عزت و ذلت، کامیابی و ناکامی، خیر و شر، لینے اور دینے

والا، دل سے یقین کر کے اپنے تمام تر مقاصد اور حاجتوں اور کاموں میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کرنا اور اسی کی قدرت اور اسی کے رحم و کرم پر نظر رکھنا اور اسی سے لو لگانا اور اسی سے خوف و امید رکھنا اور اسی سے دعا کرنا اور مانگنا اور اسی کی ہدایات و احکامات پر بھروسہ و اعتماد رکھنا اور عمل کرنا اور انہی میں نفع و بھلائی اور خیر کا یقین کرنا اور ان تمام تر اسباب اور کاموں کو خوشی سے چھوڑنا جو اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اسی کو توکل کہتے ہیں۔

اور جب بندے کو توکل میں رسوخ اور پختگی حاصل ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو توکل کا اعلیٰ مقام یعنی رضا بالقضاء نصیب فرماتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس میں بندہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کی طرف سے پیش آنے والے تمام اچھے اور برے حالات پر دل سے راضی رہتا ہے۔ توکل کے اس اعلیٰ مقام کو اصطلاح میں رضا بالقضاء کہا جاتا ہے۔ تقدیر اور قضائے الہی پر راضی رہنا بہت بڑا اور بلند مقام ہے اور اس مقام پر بندے کی دنیا کی زندگی ایک قسم کی جنتی زندگی بن جاتی ہے۔

### رضا بالقضاء کا مقام اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت کا نتیجہ ہوتا ہے!

رضا بالقضاء کا یہ مقام اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے ساتھ شدید محبت کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ مقام اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کمال رحمان و رحیم، علیم و حکیم اور ودود و عظیم، حمید و کریم وغیرہ پر پورا پورا ایمان و یقین اور ان کی معرفت حاصل ہو، پھر اس معرفت اور اس ایمان و یقین کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت کا اسکے دل میں رچ بس جانا ہے۔ اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان کو توکل کا اعلیٰ مقام یعنی رضا بالقضاء حاصل ہو جاتا ہے۔

### مقام رضا میں بندے کی حالت!

اس مقام پر پہنچ کر بندہ دنیا کی حقیقی راحتوں اور چین و سکون کو پالیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان پر دنیا کی زندگی میں قسم قسم کے حالات آتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر اچھے اور خوشگوار حالات آتے ہیں اور بعض اوقات اس پر ایسے حالات آتے ہیں جو اس کی طبیعت اور چاہت کے خلاف ہوتے ہیں اور عام انسانوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ مصائب کے وقت گھبراتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے گلے شکوے کرتے ہیں اور اپنی تقدیر پر راضی نہیں ہوتے، مگر جس بندے پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہو جاتا ہے اور اس کو رضا بالقضاء کی دولت سے



نوازتا ہے تو ایسے بندے پر جو بھی اچھے یا برے حالات آتے ہیں، ان کے بارے میں اسکا پختہ ایمان و یقین ہوتا ہے کہ یہ احوال اللہ تعالیٰ رحمن و رحیم اور حکیم و علیم و کریم ذات کی طرف سے آتے ہیں، وہ میرا مولیٰ و مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ انہی احوال میں میرے لئے عظیم خیر و بھلائی کے راستے اور صورتیں پیدا فرمائیں گے۔

نیز جب بندہ اس بات کو پالیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اسی میں ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور فیصلے پر راضی رہے تو یہ بندے محتاجی و بیماری، مصیبت اور تکلیف و مشقت اور برے حالات میں اللہ تعالیٰ سے اسی طرح راضی اور اسی طرح شکر گزار و خوش رہتا ہے جس طرح وہ اللہ تعالیٰ سے راحت اور عافیت اور خوشگوار حالات میں خوش اور شکر گزار ہوتا ہے۔

رضا بالقضاء کا مقام اور قرآن مجید اور احادیث!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

﴿قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُمْ مَوْلَانَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾

”آپ (ﷺ) کہہ دیجئے کہ ہمیں ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لکھ دیا ہے وہ ہمارا مولیٰ

(خیر خواہ اور کارساز) ہے اور اللہ تعالیٰ ہی پر چاہئے کہ مومن بھروسہ رکھیں۔“ (التوبہ: آیت ۵۱)

اس آیت کریمہ میں مومن کا حال بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر پورا پورا بھروسہ رکھتا ہے اور وہ اس حقیقت کو خوب جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم عبث اور خلاف حکمت نہیں ہوتا، وہ خواہ مخواہ اپنے بندوں کو مصیبت میں مبتلا نہیں کرتا۔ وہ تو ہمارا مولیٰ، خیر خواہ اور کارساز ہے اور ستر ماؤں سے بھی زیادہ مہربان اور شفیق ہے۔ اس نے جو کچھ ہمارے لئے لکھ رکھا ہے، اسی میں ہماری دنیا و آخرت کی خیر اور بہبود ہے اور اسی میں ہمارے لئے بہتری ہوگی۔ بلاشبہ سچے مومن کیلئے مصیبت و راحت، تکلیف و آرام اور موت و زندگی دونوں ہی میں خیر ہے۔ اسکو اگر کوئی مصیبت اور تکلیف پہنچتی ہے تو مومن اس پر صبر کرتا ہے اور اس سے اس کی کمزوریوں کی اصلاح ہوتی ہے اور اس کے اندر پختگی و استقامت پیدا ہوتی ہے اور یہ اس کے اندر انابت الی اللہ اور توبہ کی کیفیت کو بڑھا دیتی ہے اور خوشحالی، فتح اور کامرانی وغیرہ جیسے خوشی کے اسباب اس کے اندر احسان مندی کے جذبات کو ابھارتے ہیں اور اس سے اس کے اندر شکر اور حقوق العباد کی ادائیگی اور احسان و ایثار کے جذبات اور زیادہ بھرک اٹھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑتا ہے تو غازی ہوتا ہے اور مرتا ہے تو شہید ہوتا ہے۔ بیماریاں اور تکالیف اس کے لئے رفع درجات اور گناہوں کے جھڑنے کا سبب بنتے ہیں۔ غرض یہ کہ سچے مومن کیلئے اس دنیا میں ناکامی کا سوال ہی نہیں

کیونکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو اور یہ رضائے الہی اسکو ہر حالت میں خواہ دکھ ہو، سکھ ہو، مصیبت ہو یا راحت ہو، ملتی رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی اور خوش ہوتا ہے اور عین مصیبت کے وقت وہ اللہ تعالیٰ سے بڑی خیر کا متوقع ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا﴾

”پس ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ نے اسی میں (تمہارے لئے) خیر کثیر رکھ دی ہو“۔

(النساء: آیت ۱۹)

جس کو رضا بالقضاء کا مقام نصیب ہو جائے، وہ نیک بخت ہے!

بلاشبہ جس کو یہ رضا بالقضاء کا مقام کسی درجہ میں بھی نصیب ہو جائے، یہ اسکی نیک بختی کی علامت ہے اور جو شخص تقدیر الہی پر ناراض اور اس پر شکایت کرتا رہتا ہو وہ بہت بڑا بد بخت ہوتا ہے۔ ان دونوں کے نیک بختی اور بد بختی کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے یوں ارشاد فرمایا (حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے):

(مَنْ سَعَادَةِ ابْنِ آدَمَ رِضَاهُ بِمَا قَضَى اللَّهُ لَهُ وَمَنْ شَقَاوَةِ ابْنِ آدَمَ تَرْكُهُ اسْتِعَاذَةَ اللَّهِ وَمَنْ شَقَاوَةِ ابْنِ آدَمَ سَخَطُهُ بِمَا قَضَى اللَّهُ لَهُ)

”آدمی کی نیک بختی اور خوش نصیبی میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ اس پر راضی رہے اور آدمی کی بد بختی اور بد نصیبی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے خیر و بھلائی مانگنا چھوڑ دے اور اس کی بد بختی اور بد نصیبی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اسکے مقدر میں لکھ دیا ہے، وہ اس سے ناراض و ناخوش ہو“۔ (احمد، ترمذی، مشکوٰۃ)

اس حدیث میں جن باتوں کا ذکر آیا ہے اس کی مختصر تشریح یہ ہے:

(۱) پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ

”آدمی کی نیک بختی اور خوش نصیبی میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے مقدر میں جو کچھ لکھ دیا ہے، وہ اس

پر راضی رہے“۔

یہ وہی رضا بالقضاء کا مقام ہے، جس کی تفصیل اوپر لکھی گئی ہے۔

(۲) دوسری بات یہ فرمائی گئی کہ آدمی کی بد بختی اور بد نصیبی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے خیر و بھلائی کا

مانگنا چھوڑ دے۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ خیر و بھلائی کے طالب ہونے اور مانگنے کے لئے جس طرح دلی تڑپ

اور دعا کی ضرورت ہے، اسی طرح اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ خیر و کامیابی کے اسباب یعنی ایمان اور اعمالِ صالحہ کو بھی اختیار کیا جائے۔ تو حدیث کے اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہوا کہ نیک اور خوش نصیب وہ شخص ہے جو برابر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا طالب اور اسکی رضا کے کاموں ایمان اور خیر و بھلائی اور اعمالِ صالحہ میں لگا رہے اور برابر اللہ تعالیٰ سے خیر و بھلائی کا طالب رہے اور آدمی کی بڑی بد نصیبی اور بد بختی یہ ہے کہ وہ خیر و بھلائی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے کاموں کو چھوڑ دے اور اللہ تعالیٰ سے خیر و بھلائی کا طالب نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی شخص ہوتا ہے جو نفس اور دنیا پرست اور اسباب پرست انسان ہوتا ہے۔ وہ خیر و بھلائی کو اللہ تعالیٰ اور اسکے دین کے بجائے اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اسباب میں تلاش کرتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے بجائے اسباب سے خیر و بھلائی کا طالب رہتا ہے۔ بلاشبہ ایسا شخص بہت بڑا بد نصیب اور دنیا میں سرگرداں رہتا ہے۔

(۳) تیسری بات یہ فرمائی گئی کہ:

”آدمی کی بد بختی اور بد نصیبی یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اسکے لئے مقدر میں لکھ دیا ہے، وہ اس سے ناراض اور ناخوش ہے۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتقاد نہیں رکھتا یا تقدیر الہی پر راضی نہیں ہوتا، وہ بہت بڑا بد نصیب ہوتا ہے کیونکہ وہ ذرا ذرا سی مصیبت اور حادثات پر متفکر ہوتا ہے، اس کا دل اور ذہن منتشر رہتا ہے کہ یہ مصیبت کیوں آگئی، فلاں حادثہ کیسے پیش آیا اور یہ بات کیوں اس طرح نہ ہوگئی، وغیرہ وغیرہ اور یہی پراگندگی، بے چینی اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر ناراضگی اس کو اپنے مقاصد و معاملات اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت سے یا کم از کم عبادات میں سکون و اطمینان سے بھی محروم رکھتی ہے۔ تو اس طرح یہ بندہ دنیا و آخرت دونوں کے اعتبار سے بے چینی اور بے قراری اور اللہ تعالیٰ کے غضب میں گرفتار رہتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہتا ہے، وہ بہت بڑا خوش نصیب ہوتا ہے۔ اسکو دنیا میں قلبی سکون، ذہنی فراغت، اطمینان اور دلجمعی کی دولت نصیب ہو جاتی ہے اور اسی کی وجہ سے وہ کاروبار، معاملات اور عبادات اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ کرتا ہے اور اپنی آخرت کی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے میں مصروف رہتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ سے خوش اور راضی رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے راضی اور خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ دنیا و آخرت کی خوشیوں، کامرانیوں اور فلاح و نجات کو پالیتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہر حالت میں قضاء و قدر پر راضی رہنا بہت ہی اعلیٰ مقام ہے۔ ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ اس مقام

کو حاصل کرنے کے لئے انتہائی کوشش کرے۔ اور اللہ تعالیٰ سے خیر و بھلائی کا اور اس عظیم مقام کا طالب رہے اور اس مقام کے حصول کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو اسباب مقرر فرمائے ہیں جیسا کہ اس کا بیان باب توکل میں گزر چکا ہے، ان کو اپنائے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو تقدیر الہی پر راضی رہنے کی دولت نصیب فرمائے۔ (آمین)

☆.....☆.....☆

www.daruleeman.com

صبر کا بیان!

صبر لغت میں باندھنے، روکنے اور قابو کرنے کو کہتے ہیں یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور

اس کو اپنی جگہ پر باندھنا ثابت قدم رکھنا اور اصطلاح شرع میں اپنے نفس (یعنی خواہشات و جذبات اور میلانات) کو قابو کر کے ہر حال میں حق یعنی دین اسلام پر قائم اور دین اسلام کو تھامے رکھنے کو صبر کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنے آپ کو ناگوار یوں کی برداشت کا عادی بنانا خواہ وہ ناگواریاں اختیار کرنے سے متعلق ہوں یا چھوڑنے سے متعلق ہوں۔ لہذا اس کے بنیادی معنوں میں استقامت، ثابت قدمی اور مسلسل کوشش داخل ہیں۔

### دین حق اور صبر!

صبر ایک عظیم الشان خلق ہے اور صفت ہے اور یہی صفت برائیوں سے بچانے کے لئے ڈھال کا کام دیتی ہے اور اس کی وجہ سے انسان اپنے نفس کو گناہوں اور نافرمانیوں سے باز رکھتا ہے اور اسے حق اور دین اسلام پر باندھے رکھتا ہے۔ بلاشبہ صبر انسان کی اعلیٰ ترین صفت ہے جس شخص کے اندر صبر کی صفت نہیں اس کی دینی عمارت تمام تر ریت کے ٹیلے پر بنی رہتی ہے جب خواہشات کی آندھی چلتی ہے تو اس کی دینی عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔

### صبر کی نعمت مخلوق میں انسان اور جن کو حاصل ہو سکتی ہے!

جہاں اور جس امر میں نفس کو گرائی اور ناگواری ہوتی ہے ایسی حالت میں راہ راست پر ثابت قدم صرف وہی رہ سکتا ہے جو نفسانی خواہشات کے ساتھ عقل اور دینی شعور بھی رکھتا ہو اسی لئے فرشتوں کو تو صبر کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ شہوات اور خواہشات نفسانیہ سے بالکل پاک ہیں اور حیوانات میں اس کی قوت نہیں ان میں صرف خواہشات اور شہوات ہیں۔ عقل اور دینی شعور سے وہ خالی ہیں یہ نعمت صرف انسان کو اللہ تعالیٰ شانہ نے عطا فرمائی ہے کہ اس کو شہوات اور خواہشات نفس بھی دی ہیں اور ساتھ ہی عقل اور دینی شعور کی اہلیت بھی دی ہے۔ تو انسان ہی عقل کے ذریعے اپنے جذبات اور خواہشات کو راہ راست کے مطابق کر کے مفید نتائج حاصل کر سکتا ہے ورنہ جو کوئی اپنی خواہشات اور جذبات کو شتر بے مہار کی طرح آزاد چھوڑ دے وہ رفتہ رفتہ حرص، طمع، خود غرضی، شہوت پرستی، کمینہ پن، غیظ و غضب وغیرہ جیسی خصلتوں میں ایسا غرق ہو جاتا ہے جس کی بدولت وہ انسانیت کے مقام سے گر کر اخلاقی حیثیت سے جانوروں اور درندوں سے بھی نیچ ہو کر رہ جاتا ہے۔

### خواہشات اور جذبات کو کنٹرول کرنے کی مثالیں!

اب اس سلسلے میں خواہشات اور جذبات کو روکنے اور کنٹرول کرنے کے بارے میں چند مثالیں ذکر کرتے

ہیں اس سے صبر کے مختلف پہلو سامنے آئیں گے۔

(۱) کوئی شخص کسی بھی نشہ کا عادی ہے نشہ کو چھوڑنا اور پھر جب کبھی وہی نشہ آور چیز دیکھے اور نفس اس کو چاہے تو اپنی خواہشات کو قابو کر کے اپنے آپ کو نشہ سے بچانا۔

(۲) ایک حسین لڑکے، لڑکی یا ایک شاندار عمارت پر نظر پڑی اور دل میں اس کے لئے کوئی لالچ پیدا ہوگئی تو اپنی نظروں کو قابو میں رکھنا اور اپنے دل اور نفس کو اس سے پھیر کر اپنی نظر کو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر جمائے رکھنا۔

(۳) آپ کو یقین ہو کہ اگر میں نے فلاں معاملہ میں ذرہ برابر جھوٹ بولا یا بدعہدی کی چغلی کھائی تو مجھے منوں برابر سونا ملے گا اور یہ بھی یقین ہو کہ میری خیانت اور جھوٹ کا راز رہتی دنیا تک کوئی کھول نہیں سکے گا یا تھوڑی سی بدعہدی کی وجہ سے آپ پوری جنگ جیت سکتے ہیں پھر بھی اپنے نفس کو کنٹرول کر کے جھوٹ، بدی، خیانت اور جعلی بدعہدی سے اپنے آپ کو بچانا۔

(۴) آپ کو یقین ہو کہ مجھے اعلیٰ سے اعلیٰ منصب اور دنیا میں عزت کا مقام ایسی صورت میں مل سکتا ہے کہ میں فلاں شخصیت کو داغدار کروں اس کی غیبت کروں پھر بھی اپنے جذبات اور خواہشات کو قابو کر کے اپنے آپ کو حق پر جمائے رکھنا۔

(۵) غصہ آجائے تو اس کو کنٹرول کرنا اور عین غصہ کی حالت میں حق وعدل سے نہ ہٹنا۔

(۶) اگر آپ کے رشتہ دار یا دوست وغیرہ کا ایک ایسے شخص کے ساتھ معاملہ آئے جس کے ساتھ آپ کی عداوت، دشمنی اور بغض و کینہ ہے تو آپ کا ان دونوں کے درمیان فیصلہ کے وقت اپنے جذبات اور خواہشات کو کنٹرول کر کے عدل و حق کے مطابق فیصلہ کرنا۔

(۷) آپ پر لوگوں کے مالی حقوق ہیں یا ان کی خدمت آپ کے ذمہ ہے ایسی صورت میں اپنے جذبات اور خواہشات کو قابو کر کے اپنی لذت اپنی راحت اور اپنے مال و دولت کو قربان کر کے لوگوں کے حقوق ادا کرنا۔

(۸) عبادات نماز، ذکر، روزہ وغیرہ کا اہتمام اور ان پر دوام کرنا نفس نہ بھی چاہے پھر بھی اپنی خواہش نفس کو کنٹرول کر کے پوری ہمت و یکسوئی کے ساتھ ٹھیک وقت پر خشوع و خضوع اور سکون اور ظاہری و باطنی آداب کے ساتھ نماز وغیرہ عبادات کی پابندی کرنا۔

(۹) فقر و تنگی کی حالت میں بھی لوگوں سے طمع و سوال سے اپنے نفس کو روکنا۔

(۱۰) بیماریوں، رشتہ داروں کی موت پر جزع و فزع، گریبان پھاڑنے وغیرہ ناجائز امور سے اپنے آپ کو بچانا۔

(۱۱) جب اللہ تعالیٰ کا کوئی بندہ حق کا داعی بن کر میدان میں اترتا ہے تو اس وقت مخالف کے پروپیگنڈوں لوگوں کے طعن اور رشتہ داروں اور پرانے دوستوں اور عام لوگوں کی ملامت کا سامنا ہوتا ایسی صورت میں مالی و جانی ایذا رسانیوں کی مشکلات اور مصائب سامنے آجاتے ہیں ان تمام ایذا رسانیوں مشکلات کو حق کی خاطر برداشت کرنا اور اپنے نفس اور جذبات کو قابو کر کے حق اور راہ حق پر ڈٹے رہنا۔

(۱۲) باطل سے مقابلے کی صورت میں اپنے آپ کو گھبراہٹ اور مایوسی اور پست ہمتی سے بچانا اور مشکل اور سخت حالات میں میدان جنگ میں ڈٹے رہنا۔

(۱۳) ہنگامی اور جذباتی حالات ہوں یا عام حالات، خواہش نفس کے مطابق احکام ہوں یا نفس پر سخت شاق گزرنے والے احکامات سب میں اپنے مرکز حق کے فیصلوں کا پابند رہنا۔

(۱۴) جوش اور جذباتی حالات میں نفس کو لگام لگا کر اس کو حق کے تابع بنانا کہ کوئی اقدام اس کے صحیح اور ٹھیک وقت و حالات سے قبل نہ کیا جائے۔

### صبر کی شاخوں کے مختلف نام!

صبر کے چند پہلو بطور نمونہ پیش کئے گئے تاکہ اس سے صبر اور صابر کی پہچان ہو سکے اب اس کے بعد اس بات کو جان لیجئے کہ جن امور کے متعلق صبر اختیار کیا جاتا ہے ان کے اعتبار سے صبر کے بہت سے نام ہیں یا یوں کہئے کہ صفت صبر کے بہت سی شاخیں ہیں جن کو جدا جدا ناموں سے یاد کیا جاتا ہے اب یہاں ان شاخوں کی موٹی موٹی صورتیں اور اقسام لکھ دیتے ہیں۔

(۱) دولت و ثروت اور مال اور اولاد کی کثرت و زیادتی پر صبر کرنا اس کا نام ”ضبط نفس“ ہے اور اس کے ضد کا نام ”بطر“ یعنی اترانا اور فخر ہے۔

(۲) فرائض اور احکامات پر صبر۔

(۳) برائیوں سے اپنے نفس کو روکنا مثلاً غیبت نہ کرنا جھوٹ نہ بولنا، چوری نہ کرنا اور خیانت وغیرہ سے نفس کو روکنا اسی طرح مختلف گناہوں کی وجہ سے صبر کے مختلف نام ہو جاتے ہیں مثلاً اگر خواہشات نفس پر قابو رکھنا پیٹ اور شرمگاہ کے مقابلہ میں ہو تو اس کا نام ”عفت“ ہے جھوٹ سے پرہیز کرنے والے کو ”سچا“ کہتے ہیں۔

(۴) میدان جنگ اور خطرناک حالات میں صبر یعنی تحمل و برداشت کا نام ”شجاعت“ ہے اور اس کے ضد

کا نام ”جبن“ بزدلی اور ”نامردی“ ہے۔



(۵) فضول عیش پسندی سے اجتناب اور دنیا کے مال و منصب اور جاہ سے بے رغبتی اور صبر کا نام ”زہد“ ہے اور اسکی ضد کا نام ”حب الدنیا“ (دنیا کی محبت اور عیش پسندی ہے)۔

(۶) نفسانی اور جنسی خواہش کے مقابلہ میں صبر کا نام ”عفت“ ہے اور اس کے ضد کا نام شہوت پرستی فحش اور بے حیائی ہے۔

(۷) اور تھوڑی سی چیز پر خوش ہو کر صبر کرنا یا جو کچھ مل جائے اس پر خوش ہونا اور کم سے لذت اور راحت بخش چیز پر رضا اور خوش ہونے کا نام ”قناعت“ ہے اور اس کی ضد کا نام حرص و طمع ہے ان چیزوں کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ اپنی جگہ پر آئے گا۔

(۸) غیظ و غضب کے حالات پر صبر کرنا اور درگزر کرنا اس کو اصطلاح میں ”حلم“ کہتے ہیں۔

(۹) مصائب کے مقابلہ میں صبر کرنا اس کو اصطلاح میں ”صبر“ کہا جاتا ہے اور اس کی ضد کا نام جزع و فزع ہے۔

صبر کی یہ چند موٹی قسمیں ہیں۔ ان میں سے بعض کے فضائل تو یہاں ذکر کئے جائیں گے اور بعض کے فضائل اس کتاب کے مختلف ابواب میں آچکے ہیں اور بعض کے ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ آئیں گے۔

نیز ان میں سے بعض کی تشریح ضروری ہے وہ ان شاء اللہ پیش کروں گا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے متعلق قرآن و حدیث سے بھی کچھ پیش کیا جائے گا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ”صبر“ بے بسی اور کمزوری کا نام نہیں بلکہ یہ نفس کو ہر حال میں گھبراہٹ سے بچانے اور اس کو شریعت مطہرہ کے مطابق قابو رکھنے اور ہر حال میں راہ حق پر ثابت قدم اور ڈٹ جانے کو کہتے ہیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کی مدد اور معیت نصیب ہوتی ہے۔

### صحت، مال و ثروت وغیرہ پر ”صبر“ ضبط نفس!

جب کسی شخص کو اللہ تعالیٰ صحت، مال و دولت کی فراوانی یا زیادہ اولاد عطا فرماتا ہے تو ایسے خوشی کے حالات میں خواہشات نفس انسان کو طرح طرح کی فضول خرچیوں میں پھنساتا ہے فخر و غرور وغیرہ پر اس کو اکساتا ہے اور ایسے حالات میں ”صبر“ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا شکر کرے اللہ تعالیٰ کو بھول نہ جائے اور نہ یاد الہی میں کوتاہی کرے غریبوں اور فقیروں کو حقیر نہ جانے ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتا رہے فخر و غرور، فضول خرچی اور بخل وغیرہ دوسرے مظالم سے اپنے نفس کو قابو میں رکھے اس کو ”ضبط نفس“ بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جب انسان پر تکلیف کی حالت آتی ہے تو انسان بد دل ہو جاتا ہے اور مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے اپنے نفس کو قابو میں رکھنا اور راہ حق پر ثابت قدم رہنا ان لوگوں کا کام ہے جن میں صبر و استقلال ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَعِنَ اَذْقَنَا الْاِنْسَانَ مِّنَ اَرْحَمَةٍ ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ اِنَّهُ لَيُؤْسُ كَفُوْرٌۙ وَلَعِنَ اَذْقَنُ نَعْمَاءَۙ بَعْدَ ضَرَّآءَۙ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاَتُ عَنْيْ اِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌۙ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌۭ وَّاَجْرٌۭ كَبِيْرٌۙ﴾ (سورہ ہود: آیت ۱۱ تا ۹)

یعنی ”اگر کبھی ہم انسان کو اپنی طرف سے رحمت چکھا دیتے ہیں پھر اس سے اس (مہربانی) کو چھین لیتے ہیں تو وہ بڑا مایوس اور ناشکرا بن جاتا ہے اور اگر کسی مصیبت کے بعد جو اس پر آئی تھی ہم اسے نعمت چکھا دیتے ہیں تو بول اٹھتا ہے کہ مجھ سے ساری برائیاں (یعنی سختیاں اور تکلیفیں) دور ہو گئیں بے شک وہ بڑا ہونے اور اترانے والا ہے مگر (اس کمزوری اور قبیح خصلت سے پاک صرف) وہ لوگ ہیں جو صبر کرتے ہیں (یعنی جو خوشی اور تکلیف دونوں حالتوں میں مستقل مزاج اور نفس پر قابو رکھنے والے ہوتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں وہی لوگ ہیں جن کے لئے بخشش بھی ہے اور بڑا اجر بھی ہے۔“

مذکورہ بالا آیتوں میں مومن کی شان بتلائی گئی کہ کفار و مشرکین کی طرح نہیں کہ غم و مصیبت کے وقت مایوس بد دل اور ناشکرے ہوتے ہیں اور خوشی و آرام کی حالت میں فخر و غرور میں مبتلا ہوتے ہیں بلکہ مومن اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی تقدیر پر ایمان اور اس کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی و پکی محبت و تعلق کی وجہ سے وہ نہ تو مصیبتوں اور تکلیفوں میں پڑ جانے کی حالت میں مایوسی نا امیدی بد دل اور ناشکری کا شکار ہوتا ہے اور نہ خوشی کی حالت میں نازاں اور مغرور ہوتا ہے وہ ہر حال میں راہ حق پر قائم رہتا ہے اور ”صبر و“ کے بعد ”عملوا الصلحت“ کا ذکر کر کے شاید اس طرف اشارہ دے دیا گیا ہے کہ جب انسان ہمیشہ نیک اعمال کرتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہتا ہے تو اس میں صبر، ثبات و استقامت اور استقلال کا جو ہر پیدا ہو جاتا ہے اور بڑھ جاتا ہے۔ واللہ اعلم

### فرائض و احکامات پر صبر!

فرائض و احکامات پر صبر کا مطلب ہے کہ فرائض کی ادائیگی کو عمر بھر مضبوطی اور استقلال کے ساتھ ادا کیا جائے یہ نہیں کہ جب دل نے چاہا تو کچھ دن خوب نماز وغیرہ ادا کی نوافل پڑھے اور خوب ذکر کیا پھر جب نفس پر گراں گزرا تو چھوڑ دیا یا اس میں کوتاہی شروع کی بلکہ نیک کاموں کو دل چاہے یا نا چاہے مضبوطی اور استقامت کے ساتھ کرنا یہ ”صبر“ ہے جو پوری بندگی کو اور انسان کے تمام اعمال کو محیط ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا﴾ (طہ: آیت ۱۳۲)

”اور اپنے اہل و عیال کو نماز کا حکم کیجئے اور خود بھی اس پر جمے رہو۔“

اور ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ﴾ (مریم: آیت ۶۵)

یعنی ”وہ پروردگار ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان ہیں پس اس کی بندگی کرو اور اسی کی بندگی پر ثابت قدم (اور جمے) رہو۔“

کار خیر پر دوام اللہ تعالیٰ کو پسند اور محبوب ہے!

کسی کار خیر یا نیک عمل کو کچھ دن کرنا زیادہ کٹھن اور مشکل کام نہیں البتہ اس پر دوام کرنا اور پختگی کے ساتھ اس پر عمل کرنا نفس پر بہت گران گزرتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے اس کو کسی کام کا پابند کیا جائے اور دوام میں یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے کہ بندہ یہ کار خیر خواہش نفس کے لئے نہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کرتا ہے کیونکہ بہت بار ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو عمل نفل وغیرہ یا دوسرے کار خیر میں لذت محسوس ہوتی ہے تو کسی نیک عمل کو جذباتی طور پر اختیار کر لیتا ہے، لیکن جب وہ ”بسط“ (قبض و بسط ”تصوف“ کی اصطلاح ہے بسط کے حالات میں عبادت اور نیکیوں میں دل لگتا ہے اور قبض کی حالت میں عبادت ذکر وغیرہ میں دل نہیں لگتا، اس کی بھی بہت سی اقسام ہیں) کی حالت نہیں رہتی تو نفس پر عمل کرنا گران گزرتا ہے تو عمل کو چھوڑ دیتا ہے اور اس میں کوتاہی کرنے لگتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ پہلے وہ عمل جو کرتا تھا وہ خالص نہیں تھا، اس میں نفس لذت پارہا تھا اور جوں ہی لذت اور نفس کی خوشی نہ رہی تو اسے چھوڑ دیا یا اس میں کوتاہی کرنے لگا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ کو وہ عمل اور نیک کام زیادہ پسند اور محبوب ہوتے ہیں جن پر دوام اور استقامت ہو چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللَّهِ أَدْوَمُهَا وَإِنْ قَلَّ) (بخاری و مسلم)

”اللہ تعالیٰ کو اعمال (اور نیکیوں) میں وہ عمل زیادہ محبوب ہے جس پر دوام اور ہمیشگی کی جائے اگرچہ وہ عمل کم ہو۔“

اس بات کو بھی یاد رکھیں کہ جب انسان کوشش کرتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس ہی کی یاد پر دوام اختیار کر لیتا ہے، نفس کی خوشی اور ناخوشی دونوں حالتوں میں وہ برابر نیکیوں کو کرتا رہتا ہے تو بالآخر یہی کار خیر اور نیکیاں اس کی طبیعت ثانیہ بن جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے انسان کے اندر صبر و استقامت کا جو ہر پیدا ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہو جاتی ہے اور دنیا میں بے قراری گھبراہٹ سے محفوظ، اطمینان و سکون کی زندگی گزارتے ہیں اور آخرت میں بھی عظیم اور ابدی انعامات پا جاتے ہیں جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ ”صبر کے فضائل“ میں آجائے گا۔

شجاعت یعنی حق کی خاطر تکلیفوں پر صبر اور میدان جنگ میں صبر و استقامت اختیار کرنا! حق کی خاطر تکلیفوں کو خاطر میں لانا اور ان کو برداشت کرنا تو صبر ہی ہے بلکہ میدان جنگ میں بہادری سے لڑنا اور ثابت قدمی سے لڑنا اور دشمن کے حملوں سے نہ گھبرانا اور نہ بھاگنا بھی صبر کے مفہوم میں داخل ہے اور قرآن مجید نے اس کے لئے بار بار ”صبر“ کے لفظ کو استعمال فرمایا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ سچے اور پرہیزگاروں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝﴾

(بقرہ: آیت ۱۷۷)

”اور جو صبر کرنے (یعنی ثابت قدم رہنے) والے ہیں مصیبت میں اور سختی میں اور (حق کی خاطر) جنگ کے وقت یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ پرہیزگار ہیں۔“  
نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عَشْرُونَ صَبِرُوا يَغْلِبُوا مِائَتِينَ ۝﴾

(انفال: آیت ۶۵)

”اے نبی مومنوں کو (دشمنوں کی) لڑائی پر ابھارو اگر تم میں سے بیس آدمی صبر کرنے والے (یعنی ثابت قدم) ہوں تو وہ دوسو پر غالب ہوں۔“

اور ایک جگہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ:

﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمِ الصَّابِرِينَ ۝﴾ (آل

عمران: آیت ۱۴۲)

”کیا تم گمان رکھتے ہو کہ (یونہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ نے (انہما کر) تم میں سے ان لوگوں کو الگ نہیں کر دیا ہے جو جہاد کرنے والے ہیں اور جو صابر (یعنی جہاد میں ثابت قدم رہنے والے) ہیں۔“  
نیز اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

﴿وَكَايْنِ مَنْ نَبِيٍّ قَتَلَ مَعَهُ رِيثُونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا ۖ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۝﴾ (آل عمران: آیت ۱۴۶)

یعنی ”اور کتنے نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے (باطل کے ساتھ) جنگ کی پس اللہ

تعالیٰ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑی ان (تکلیفوں و مصیبتوں) کی وجہ سے نہ انہوں نے ہمت ہاری اور نہ کمزوری دیکھائی اور اللہ تعالیٰ (ہر تکلیف و مشکل میں ثابت قدم رہنے والے ایسے ہی) صابرین سے محبت رکھتے ہیں۔“

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی معیت و نصرت فقط ان لوگوں کی شامل ہوتی ہے جو حق کی خاطر لڑتے ہوں اور جو پورے دین اسلام پر پختگی سے عمل کرنے والے اور تمام مشکلات اور مصائب کا مردانگی اور جرأت کے ساتھ مقابلہ کرنے والے ہوں اور ہمارے اسلاف ایسے ہی تھے اور یہی اہل ایمان کی نشانی ہے کہ وہ راہ حق پر استقامت کے ساتھ چلتے ہیں اور راہ حق میں پیش آنے والی ہر تکلیف اور مصیبت کو خوشی سے برداشت کرتے ہیں اور حالات کی سنگینیاں ان کو دبائیں سکتیں اور نہ ہی کمزور کر سکتیں ہیں بلکہ وہ ان کے جوش ایمان کو اور بڑھاتی ہیں۔

**حلم یعنی غیظ و غضب کے حالات پر صبر درگزر کرنے کی فضیلت!**

غیظ و غضب اور غصہ پر صبر کا مطلب یہ ہے کہ غصہ پر قابو رکھنے اور بلا ضرورت غیظ و غضب کے تقاضے پر عمل نہ کیا جائے، بلاشبہ لوگوں کی خطاؤں اور غلطیوں سے درگزر کرنا انسانی اخلاق میں ایک بڑا درجہ رکھتا ہے اور غیظ و غضب اور غصہ میں بے اعتدالی اور حد سے تجاوز بہت بڑی برائی اور ہلکا پن ہے غصہ میں عقل ٹھکانے نہیں رہتی اور انجام سوچنے کا ہوش نہیں رہتا اس لئے انسان اکثر اوقات غصہ اور غضب کی حالت میں ایسی باتیں یا ایسے کام کر جاتا ہے جس کے بعد وہ نادم اور پشیمان ہوتا ہے اور بے جا غصہ نکالنے کی وجہ سے دنیا و آخرت کو برباد کر دیتا ہے اس لئے ایک مسلمان کو چاہئے کہ وہ اپنے غصہ کو قابو میں رکھے اور اچھا مسلمان تو وہ ہے جو تکلیف دینے والوں کے قصور کو نظر انداز کر کے ان کو معاف کرے چنانچہ اللہ تعالیٰ ایک جگہ متقیوں اور پرہیزگاروں کی چند صفات بیان کرتے ہوئے ان کی ایک خاص صفت اور علامت یہ بھی بتلائی ہے کہ:

﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾

یعنی ”(متقی لوگ) غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں کے قصور کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں کو محبوب رکھتا ہے“ کظم ”خوب بھری ہوئی مشک کے منہ باندھنے کو کہتے ہیں تو یہاں مطلب یہ ہے کہ جب ایسی صورت پیش آجائے جس کی وجہ سے غیظ و غصہ سے جسم بھر جائے تو غصہ کو بند اور ضبط کرو تا کہ گالی گلوچ یا کوئی انتقامی جذباتی اور ضرر رسان چیز زبان و ہاتھ سے نہ نکل جائے بلکہ تکلیف پہنچانے والے کی خطا و قصور کو نظر انداز کر کے اسے معاف کیا جائے یہ بلاشبہ بہت بڑی ہمت کا کام ہے۔

غصے دلانے والے کام پر غصہ آنا برا نہیں بلکہ آپے سے باہر باہر ہو جانا اور بے جا استعمال برا ہے! اس آیت کریمہ میں اور اس طرح دوسری قرآنی آیات اور حدیثوں میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ غصہ کے کام پر غصہ آنا کوئی برا کام نہیں بلکہ ”غیظ و غصہ“ انسان کے اندر ایک قوت ہے جو اگر صحیح سبب اور صحیح علم سے آجائے تو اسے بے جا غصہ نہیں کہا جاسکتا بلکہ غصہ کے کام پر غصہ نہ آنا یہ بے علمی اور بے وقوفی یا بے حمیتی اور بے غیرتی کی وجہ ہوتی ہے اس لئے قرآن وحدیث میں یہ تعلیم نہیں دیدی گئی کہ غصہ کو ختم کرو یا وہ لوگ متقی ہیں جن کو غصہ نہ آئے بلکہ تعریف اُن لوگوں کی جاتی ہے کہ جن کو غصہ آئے اور غصہ نکالنے پر قادر بھی ہوں تو ایسی صورت میں وہ غصہ نہ نکالیں تو یہ ہمت کا اور اجر و ثواب کا کام ہے ورنہ اگر غصہ آیا ہی نہ ہو یا غصہ نکالنے پر قدرت نہیں ہے جیسے جابر اور ظالم بادشاہ وغیرہ کو اکثر جواب نہیں دیا جاتا کہ وہاں وہ غصہ نکالنے پر قادر نہیں ہوتا تو ایسی صورتوں میں غصہ نہ نکالنے کے کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ غصہ نہ نکالنا تو اس وقت سمجھا جائے گا کہ سخت غصہ بھی آیا ہو اور پھر اس کے نکالنے پر قدرت بھی حاصل ہو جیسا کہ ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کے لئے آخرت کی خوشیاں اور نعمتیں رکھی ان کی صفات بیان کر کے ان کی ایک صفت یہ بھی بیان کی ہے کہ:

﴿وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ﴾ (شوری: آیت ۳۷)

”اور جب وہ غضب ناک ہوتے ہیں تو وہ معاف کر دیتے ہیں۔“

غصہ پی جانے والے کا دل سکون و ایمان سے بھر جاتا ہے!

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ”الكاظمين الغيظ“ کی تفسیر میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَىٰ إِفَادِهِ مَلَأَ اللَّهُ جَوْفَهُ أَمْنًا وَإِيمَانًا) (مسند احمد کذا فی ابن کثیر)

”جس شخص نے غصے کو ضبط کیا باوجودیکہ وہ غصہ نکالنے پر قدرت رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے پیٹ (یعنی دل) کو سکون اور ایمان سے بھر دے گا۔“

غصہ کو پی جانے والا روحانی اور اعصابی پہلوان ہوتا ہے!

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

(لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرْعَةِ إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ) (بخاری و مسلم)

یعنی ”(حقیقی) پہلوان وہ شخص نہیں جو (کسی پہلوان یا طاقتور شخص کو) چچاڑے بلکہ پہلوان وہ شخص ہے جو

غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔“ (یعنی غصہ کو نہ نکالے)۔

### اعصابی کمزوری کا علاج غصہ پی جانے کی مشق میں ہے!

سب سے بڑا دشمن انسان کا اپنا نفس ہے اور جو چیز انسان کے مقابلے میں سب سے بڑا طاقتور ہے تو وہ بھی خود اس کا نفس ہے اس لئے اصل کمال بہادری اور پہلوانی یہی ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کو زیر کر دے اور یہی وہ اعصابی اور روحانی پہلوانی ہے جو دنیا و آخرت اور ہمیشہ کے لئے سرخروئی کا ذریعہ بن جاتی ہے اور اس حدیث سے بھی اور تجربہ و مشاہدہ سے بھی یہ ثابت ہے کہ جو شخص غصہ پی جانے کی مشق کرتا ہے تو وہ بالآخر اپنے نفس اور غصہ پر خوب قابو پالیتا ہے اور وہ اعصابی طور پر سخت مضبوط ہو جاتا ہے اور وہ مصائب اور مشکلات وغیرہ جیسے حالات میں بھی گھبراہٹ اور اضطراب کا شکار نہیں ہوتا۔ نیز اعصابی قوت اور مضبوطی ہی ایسی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسان کو بلند و بالا کر دیتی ہے۔

### غصہ پی جانے کا گھونٹ سب سے افضل ہے!

حضرت عبداللہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَاتَجَرَّعُ عَبْدٌ أَفْضَلَ عِنْدَ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ جُرْعَةٍ غَيِظٍ يَكْظُمُهَا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ تَعَالَى)

یعنی ”کسی بندہ نے کوئی گھونٹ ایسا نہیں پیا جو اللہ عز و جل کے نزدیک غصہ کے اس گھونٹ سے افضل ہو جس

کو وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے پئے۔“ (احمد و مشکوٰۃ)

### غصہ پی جانے والے شخص کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے عذاب سے بچائے گا!

حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ خَزَنَ لِسَانَهُ سَتَرَ اللَّهُ عَوْرَتَهُ وَمَنْ كَفَّ غَضَبَهُ كَفَّ اللَّهُ عَنْهُ عَذَابَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَنْ

اعْتَذَرَ إِلَى اللَّهِ قَبْلَ اللَّهِ عُذْرَةً) (بیہقی مشکوٰۃ)

”جو شخص اپنی زبان کو (دوسروں کی بدگوئی وغیرہ بری باتوں سے) بند رکھتا ہے اللہ اس کے عیوب کو ڈھانپ لیتا ہے اور جو شخص اپنے غصے کو ضبط کرتا ہے (اور انتقام لینے سے باز رہتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن اپنے عذاب سے بچائے گا اور جو شخص (اپنے گناہوں پر نادم ہو کر) اپنی تقصیر کی معذرت اللہ تعالیٰ کے حضور میں کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی معذرت کو قبول کرتا ہے۔ (یعنی جو شخص اپنے گناہوں پر نادم ہو کر اللہ تعالیٰ سے معافی



ماں لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرماتے ہیں۔“

### قیامت کے دن غصہ پی جانے والے کا اعزاز!

حضرت سہل بن معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَى أَنْ يُنْفِذَهُ دَعَاهُ اللَّهُ عَلَى رُؤُسِ الْخَلَائِقِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتَّى

يُخَيَّرَهُ فِي أَيِّ الْحُورِ شَاءَ) (ابوداؤد)

”جو شخص اپنے غصہ کو ایسی حالت میں پی جائے کہ وہ اپنے غصے کے تقاضے کو پورا کرنے پر قدرت اور طاقت رکھتا ہو (لیکن پھر بھی اپنے غصہ کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے پی جاتا ہے اور انتقام نہیں لے لیتا) تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمام مخلوق کے سامنے بلائیں گے اور اس کو اختیار دیں گے کہ جنت کی حوروں میں سے جس حور کو چاہے اپنے لئے انتخاب کر لے۔“

### غصہ قوت ہے اور حلیم شخص طاقتور ہوتا ہے!

بلاشبہ غصہ آدمی کے اندر ایک قوت ہے اور اس کا بلاوجہ استعمال اور بے جا نکالنا ضیاع قوت ہے اور اس کا پینا اعصابی قوت کو بڑھانا اور اعصابی ٹانک ہے اس لئے غصے کے مریض کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اعصابی کمزور سمجھ کر غصہ پینے کی خوب مشق کرے اور اپنے اندر حلم اور بردباری پیدا کرنے اور اس کو بڑھانے کے لئے اس ٹانک اور قوت یعنی غصہ کو محبت سے پیئے اور حلیم شخص ہی درحقیقت بڑا طاقتور ہوتا ہے۔

### حلم کے معنی!

حلم کے معنی یہ ہے کہ انتقام قدرت کے باوجود کسی ناگوار بات یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کر لیا جائے اور قصور وار سے اس کے لئے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔

### حلم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے!

قدرت و طاقت کا اصل سرچشمہ صرف اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے اور انتقام کی اصل اور سب سے زیادہ قدرت اسی کو حاصل ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بندوں کی بہت سے برائیوں اور خطاؤں سے چشم پوشی فرماتا ہے اور وہ اپنے بندوں کے گناہوں پر ان کو بار بار مہلت دے دیتا ہے اور بخشش مانگنے والوں کو بار بار معاف کرتا رہتا ہے اور اس حلیم ذات نے اپنی اسی صفت کو قرآن مجید میں جگہ جگہ بیان فرمایا ہے اور جہاں جہاں اسی

صفت کا اظہار فرمایا ہے اکثر بیشتر اس کے ساتھ ہی اپنے علم و بخشش کا بھی ذکر کر دیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ حلم اس کے علم کے باوجود صرف اس کی بخشش اور درگزر کا نتیجہ ہے۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں۔

(۱) ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾

(۲) ﴿اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا﴾

(۳) ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا﴾

اسی طرح کی آیتوں میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ پورے علم اور ہر بات اور ہر نتیجہ سے باخبر ہو کر بردباری فرماتا ہے اور ایک جگہ اپنی بردباری کے ساتھ اپنی صفت استغناء کا بھی ذکر کے یوں فرمایا ہے کہ:

﴿وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ﴾

اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حلم بندوں کی طرح کسی دنیوی یا اخروی احتیاج و فائدے یا کسی کمزوری کی بنا پر نہیں بلکہ اس کا یہ حلم کامل استغناء کے ساتھ ہے، ان آیتوں میں اس طرف بھی رہنمائی ملتی ہے کہ بندوں کو چاہئے کہ اپنے اندر حلم و بردباری کی صفت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

بندوں میں حلم اور بردباری کی صفت اور اس کی فضیلت!

”حلم“ بردباری کی ابتداء غصے پینے سے ہوتی ہے جب غم و غصہ کو زبردستی دبایا جاتا ہے تو یہ حلم اور بردباری کا ابتدائی مرحلہ ہوتا ہے یا یوں کہئے کہ حلم کا ادنیٰ درجہ ہوتا ہے اور جب اس میں پختگی حاصل ہو جاتی ہے اور غم و غصہ آجانے کے بعد اس کو آسانی سے پی جاتا ہے گویا یہی صفت اس کی طبیعت بن جاتی ہے تو اس کا نام ”حلم“ ہے اور حلم و بردباری انسان کی ایسی فضیلت ہے جو انسان کے لئے کمال عقل اعصابی قوت اور مردانگی کی علامت ہوتی ہے، اس فضیلت کے ساتھ اگرچہ ہر شخص کو متصف ہونا چاہئے لیکن جو لوگ قوم کے رہنما، قائد اور مصلحین ہیں ان میں اس صفت کا کمال درجے میں ہونا بہت ضروری ہے اور یہ صفت حلم اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے خلیل سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝﴾ (سورہ ہود: آیت ۷۵)

”بے شک ابراہیم (علیہ السلام) بڑے بردبار (اور تحمل والے) نرم دل (اور رحم دل) اور (ہر حال میں

ہماری طرف) رجوع کرنے والے تھے۔“

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ

سے عرض کیا:

(يَا رَبِّ مَنْ أَعَزُّ عَبْدًاكَ عِنْدَكَ قَالَ مَنْ إِذَا قَدَّرَ غَفَرَ) (بیہقی مشکوٰۃ)

”اے میرے پروردگار تیرے بندوں میں سے کون بندہ تیرے نزدیک زیادہ عزیز ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا جو بندہ قدرت رکھنے کے باوجود عفو و درگزر کرے۔“

اور حضرت عبداللہ بن عباس ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قبیلہ عبدالقیس کے سردار الشیخ کو فرمایا:

(إِنَّ فَيْنَكَ لَخَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمُ اللَّهُ الْحِلْمُ وَالْأَنَاءَةُ) (مسلم)

”تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو محبوب اور پیاری ہیں ایک حلم (بردباری) اور دوسری جلد بازی نہ کرنا۔“

غصہ عبادت کو بے مزہ، زندگی کو بے چین اور ایمان کو خراب و برباد کر دیتا ہے!

جب انسان کو غصہ آتا ہے تو پھر اس کی عقل مغلوب ہو جاتی ہے اور ایسی حالت میں نہ اس کو اپنے نفع کا خیال رہتا ہے اور نہ نقصان کا اور نہ یہ دیکھتا ہے کہ میں کون ہوں یا یہ کہ میرا پروردگار مجھے دیکھ رہا ہے اور نہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ میری ماں ہے یا باپ یا یہ میرا استاد ہے یا کوئی اور محترم شخصیت غرض یہ کہ غصہ کی حالت میں نہ کسی کا لحاظ ہوتا ہے اور نہ کسی کے موجودگی کا بلکہ جو زبان پر آ جاتا ہے بک جاتا ہے یا جو ہاتھ سے ہو سکتا ہے کر جاتا ہے اور حدود شریعت سے تجاوز کر جاتا ہے اور جب بے جا غصہ اتارنے کی عادت بن جاتی ہے تو اطمینان و سکون درہم برہم ہو جاتا ہے ہر وقت دل غم و غصہ اور کینہ سے بھرا رہتا ہے جس کی وجہ سے نہ عبادت میں مزہ آتا ہے اور نہ کسی دوسرے کار خیر میں اور نہ اس میں ایمانی ذوق اور مزہ باقی رہتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

(إِنَّ الْغَضَبَ لَيُفْسِدُ الْإِيمَانَ كَمَا يُفْسِدُ الصَّبْرُ الْعَسَلَ) (بیہقی مشکوٰۃ)

یعنی ”غصہ ایمان کو اس طرح خراب و برباد کرتا ہے جس طرح ایلاء شہد کو خراب (اور کڑوا) کر دیتا ہے۔“ ایلاء ایک نہایت کڑوی دوا ہے اگر بہت سے شہد میں تھوڑا سا ڈال دیا جائے تو بھی شہد کو کڑوا کر دیتا ہے یہاں بھی مطلب یہی ہے کہ غصہ ایمان کی مٹھاس کو ختم کر کے کڑوا اور برباد کر دیتا ہے۔

غصہ کے وقت انسان گویا شیطان کی مٹھی میں ہوتا ہے اور اس کا علاج!

جب انسان کو غصہ آ جاتا ہے تو ایسی صورت میں یہ شیطان کی مٹھی میں ایک کھلونا بن سکتا ہے اور غصہ کی آگ بھڑک کر دنیا ہی نہیں بلکہ اس کے اعمال و ایمان تک کی بربادی کا سبب بن سکتا ہے اور اس لئے غصہ کو قابو میں رکھنے

کی سخت ضرورت پڑتی ہے اور ایسی صورت میں آپ ﷺ نے غصہ پر قابو پانے کا علاج بھی بتلایا ہے جیسا کہ حضرت عطیہ بن عروہ سعدیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(إِنَّ الْغَضَبَ مِنَ الشَّيْطَانِ وَإِنَّ الشَّيْطَانَ مِنَ النَّارِ وَأَنْتُمْ تُطْفَأُ النَّارُ بِالْمَاءِ فَإِذَا غَضِبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ) (ابوداؤد مشکوٰۃ)

یعنی ”بلاشبہ (ناحق اور بے جا) غصہ شیطان (کے اثر) سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے لہذا جب تم میں سے کسی کو غصہ آجائے تو اس کو چاہئے کہ وضو کر لے۔“

مطلب یہ ہے کہ ناحق اور بے جا غصہ اتارنا شیطان کے مشتعل کرنے اور اس کے فریب میں آجانے کا نتیجہ ہوتا ہے، اس لئے چاہئے یہ کہ اگر غصہ آجائے تو فوراً وضو کے کام میں لگ جائے اور حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(إِذَا غَضِبَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ قَائِمٌ فَلْيَجْلِسْ فَإِنَّ ذَهَبَ عَنْهُ الْغَضَبُ وَالْأَفْلَیْضُ طَجِعَ) (احمد ترمذی مشکوٰۃ)

”جس وقت تم میں سے کسی کو غصہ آجائے اور وہ اس وقت کھڑا ہو تو فوراً بیٹھ جائے اگر غصہ جاتا رہا (یعنی قابو ہو گیا) تو ٹھیک ہے ورنہ پھر لیٹ جائے۔“

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کے روشنی میں غصہ کو قابو رکھنے کی ترتیب یوں ہے۔

(۱) غصہ کے اتارنے اور غصہ پر صبر کے انجام کو سوچے اور اس حقیقت کو سامنے رکھے کہ جب کوئی کسی ظلم اور اشتعال انگیزی کے جواب میں فوری اقدام کرتا ہے تو اس وقت اس کا یہ اقدام ایک متاثر ذہن سے نکلا ہوا اقدام اور عمل ہوتا ہے اور اس کے جواب میں اس وقت وہ جو کارروائی کرتا ہے تو وہ اس کے اہل حق ہوتے ہوئے اور سفلی جذبات کی وجہ سے ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے وہ لازماً ایسی غلطیاں کر دیتا ہے جس کی وجہ سے مظلوم ہونے کی بجائے ظالم بن جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد اس سے ہٹ کر مظلوم کے ساتھ ہو جاتی ہے اور جو شخص فوری جواب دینے کی بجائے اپنے معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ابدی قوانین میں ہے کہ ظالم شکست کھاتا ہے یا بالآخر تباہ و برباد ہو جاتا ہے اس لئے اگر میں بھی اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے اپنے معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کروں گا تو اللہ تعالیٰ میری مدد فرمائے گا اور میرے اس صبر سے مفید نتائج پیدا کرے گا اور مجھے دنیا و آخرت کی سعادتیں نصیب فرمائے گا، یہ سوچ کر اس بات کا خوب عزم کر لے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ غصہ کو قابو رکھنے کا پورا پورا اہتمام کروں گا۔

(۲) پھر جب غصہ آجائے تو بالکل خاموش ہو کر فوراً بیٹھ جائیں اور چپکے سے اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم

پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے شیطان پر پناہ مانگیں اگر اس سے کام نہ بنے تو فوراً لیٹ جائیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ غصہ قابو میں ہو جائے گا۔

(۳) اگر شدید غصہ آیا ہے اور بیٹھنے اور لیٹنے سے کام نہیں بنتا تو پھر ایسی صورت میں اگرچہ با وضو ہو پھر بھی فوراً وضو کے لئے جائیں اور اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ پڑھیں اور وضو کر لیں بلکہ اچھا یہ ہے کہ دو رکعت نفل پڑھے اور بار بار اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ پڑھ کر یہ سوچیں کہ جس قدر یہ شخص میرا قصور وار ہے اس سے زیادہ میں اللہ تعالیٰ کا قصور وار ہوں اور جس طرح میں چاہتا ہوں اور مانگتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے قصور اور گناہوں کو معاف کر دے اور اللہ تعالیٰ معاف فرماتے ہیں اسی طرح مجھے بھی چاہئے کہ اس کو معاف کر دوں۔

(۴) اگر قصور پر سزا دے دینا مناسب معلوم ہو مثلاً یہ کہ سزا دینے میں اس کے لئے بھلائی ہے جیسے اپنی اولاد جن کی تربیت ضروری اور لازمی ہے یا مثلاً سزا دیئے جانے میں کسی دوسرے کا فائدہ اور خیر ہو جیسے کسی ظالم نے کسی شخص پر ظلم کیا اب مظلوم کی مدد کرنا بھی ضروری ہے تو ایسی صورتوں میں بھی اتنی ہی سزا دینا یا بدلہ لینا چاہئے جتنی اس کی خطا تھی اور یہ بھی اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ عقل ٹھکانے آجائے یعنی غصہ کی حالت جاتی رہے پھر شریعت کے مطابق جس قدر سزا اسے دینی چاہئے اتنی دے دی جائے۔

(۵) بعض بزرگوں نے یہ بھی بتلایا ہے کہ اگر کوئی نماز کے بعد اکیس بار بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اور کھانے سے پہلے تین بار بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھا کرے یا کم از کم تین بار ہر نماز کے بعد اور ایک ایک بار کھانے پینے سے پہلے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کا خوب اہتمام کیا جائے تو اس سے غصہ قابو میں آجائے گا۔ نیز بعض حضرات فرماتے ہیں کہ:

(لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ)

”یعنی گناہ سے بچنے کی طاقت ہے اور نہ نیک عمل کرنے کی طاقت مگر اللہ تعالیٰ کی مدد تو نیک سے (گناہ سے

بچاؤ اور نیک ہو سکتا ہے) یہی الفاظ بار بار پڑھیں۔“

جب کسی پر بے جا غصہ اتارا جائے تو اس سے معافی مانگیں اور جو یادتی کی ہے اس کا پورا پورا بدلہ دے دیں بلکہ مجمع عام میں ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگیں ورنہ جن لوگوں کے سامنے غصہ اتارا ہے ان لوگوں کے سامنے اپنی غلطی اور زیادتی کا اعتراف کر کے اس سے اپنے آپ کو معاف کروائے اگر ان مذکورہ بالا علاج پر عمل کیا جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ غصہ قابو میں ہو جائے گا اور بے جا اور ناحق غصہ اتارنے کی نوبت بہت کم آئے گی اور اس سے اعصابی قوت

حاصل ہو جاگی اور غصہ کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں مصیبتیں اور پریشانیاں آ جاتی ہیں ان سے بھی بچ جائیں گے۔

### غصے کی ضرورت اور اس کی حدود!

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ غصہ بذات خود بری چیز نہیں بلکہ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کی وجہ سے انسان اپنی جان و مال اور اپنی عزت اور اپنے دین کی حفاظت کرتا ہے نیز یہ کہ غصہ کے صحیح اسباب موجود ہوں پھر غصہ آ جانا بھی بری چیز نہیں بلکہ اگر کسی کو غضب و غصہ پیدا کرنے والی چیز بری ہی معلوم نہیں ہوتی تو یہ کوئی کمال و فضیلت نہیں بلکہ ”ذلت نفس“ ”بے حیثی“ اور بے غیرتی ہے۔ غرض یہ کہ غصہ ایک ایسا جذبہ ہے جسے مٹایا نہیں جاسکتا ہے البتہ دبایا جاسکتا ہے اور اس کا فائدہ کرنا بھی درست نہیں کیونکہ اسی جذبہ کو حدود میں رکھ کر اس سے بہت بڑے کام بھی لئے جاتے ہیں البتہ بے جا غصہ یا غصہ میں اندھا ہو کر حواس کھو بیٹھنا اور ایسا کام اور ایسی بات کرنا جو نہ کرنے کی ہو اور جو دین اسلام اور اخلاق کی نگاہ میں قابل نفرت ہو یہ غصہ قابل مذمت ہے کیونکہ غصہ سے مغلوب ہو جانا اعصابی مریضوں کا خاصا ہے اور درست جذبات اور توانا اعصاب کے لوگ غصہ اور غضب سے مغلوب نہیں ہوتے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

### غصہ کی برائی کب ظاہر ہوتی ہے!

خلاصہ یہ ہوا کہ غصہ آ جانا اس وقت برا ہوتا ہے کہ غصے کے اسباب موجود نہ ہوں بلکہ اعصابی اور دماغی کمزوری اور جلد بازی کی وجہ سے بلا وجہ غصہ آ جاتا ہو یا غصہ سے اس قدر مغلوب ہو جاتا ہو کہ عقل و حواس کام چھوڑ دیں اور اس کی برائی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب غصہ کی وجہ سے راہ حق چھوٹ جائے اور احکام شریعت پر پابندی ترک ہو جائے اور غصہ میں آ کر شریعت کی مقررہ حدود سے تجاوز کر جائے اور شریعت میں جس غصے کی ممانعت ہے وہ یہ کہ غصہ نفسانیت کی وجہ سے نہ ہو اور جس سے مغلوب ہو کر اللہ تعالیٰ کے حدود اور شریعت کے احکام کی پابندی ترک ہو جائے اور جو غصہ اللہ تعالیٰ کے لئے آئے اور حق کی بنیاد پر آئے اور اس کے اتارنے میں حدود سے تجاوز بھی نہ ہو اور ہو بھی موقع محل کے مناسب تو پھر ایمان کی نشانی ہے اور یہی حال بغض اور کینہ کا ہے جیسا کہ حضرت ابو امامۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ وَابْغَضَ لِلَّهِ وَأَعْطَى لِلَّهِ وَمَنَعَ لِلَّهِ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ) (ابوداؤد و ترمذی، مشکوٰۃ)

”جو شخص اللہ کے لئے محبت رکھے اور اللہ تعالیٰ کے لئے بغض اور کینہ رکھے اور اللہ تعالیٰ کے لئے دیدے اور

اللہ تعالیٰ کے لئے روکے تو اس نے اپنے ایمان کو مکمل کیا۔“

### اللہ تعالیٰ کے لئے بغض اور کینہ اور آج کل!

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے بغض اور کینہ رکھنا یا غصہ آنے میں یا اتارنے میں یہ دیکھنا چاہئے اور اس بات کی خوب تحقیق کرنی چاہئے کہ واقعی یہ کینہ اور غصہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے دین اسلام کے لئے ہے یا ناجائز بات یا کام کے ارتکاب کی وجہ سے ہے یا دین اسلام کے نام پر اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ہے، آج کل بظاہر دیندار لوگ یہ بات بہت کثرت سے کر رہے ہیں کہ فلاں کے ساتھ یا فلاں جماعت کے ساتھ میری دشمنی میرا بغض اور اس پر غصہ اتارنا اللہ تعالیٰ کے لئے، دین کی خاطر ہے، ناجائز امور کی روک تھام کے لئے ہے۔ حالانکہ ہم کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کے بنیادی عقائد اور اصول پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں یعنی اجماعی مسائل جیسے ختم نبوت، عصمت انبیاء علیہم السلام مجروح ہو رہے ہیں، یہودیت، عیسائیت اور دھرمیت کے طوفان ہمارے اساسی عقائد کے قلعوں میں شگاف ڈال کر اسلام کا حلیہ بگاڑنے میں مصروف ہیں اور مسلمانوں کو اپنے اندر جذب کر کے ختم کرنے کے درپے ہیں، کفر و نفاق اور الحاد کہیں قادیانیت، کہیں پرویزیت اور کہیں انکار حدیث وغیرہ اسلامی لباس پہن کر ہمارے ایمانوں پر ڈاکہ ڈال کر دین اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر سب و شتم اور ان کی توہین کرنے والے فتنے اسلام دشمن تحریکوں کے مہلک اثرات سے ہم بخوبی واقف ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کا مذاق اڑانے کا بھی ہمیں بخوبی علم ہے مگر جتنے غیظ و غضب اور غم کا اظہار ہم اپنے مخالف مسلمان بھائی جو ہمارے ساتھ صرف فروعی مسائل میں کچھ اختلاف رکھتا ہے، اس پر ہم کو جو غیظ و غضب اور غصہ ہے اس کا ایک فی صد بھی دوسرے بے دینوں، ملحدوں اور دوسرے یقینی ممنوعات کے پھیلانے والوں پر نہیں اور نہ ان پر غصہ اتارا جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ ہمارا بغض و کینہ اور غصہ اللہ تعالیٰ کی خاطر نہیں بلکہ نفسانیت اور اپنے ذاتی مفادات اور گروہی نظریات کی وجہ سے ہے اور اس پر مزید ظلم یہ کہ اس پر دین کا نام رکھ کر خود اپنے ہاتھوں گلستان اسلام کو برباد کرتے ہیں۔

### مصائب پر صبر کرنا!

(۱) مصائب پر صبر کرنا یعنی فقر و تنگ دستی بیماری زخم اور رشتہ داروں کے موت پر صبر، انسان جب بیمار ہو جاتا ہے یا اس کا مال ضائع ہو جاتا ہے یا اس کا کوئی رشتہ دار مر جاتا ہے یا زخمی ہو جاتا ہے یا کسی اور مصیبت میں



پھنس جاتا ہے تو ایسی صورتوں میں نفس کی خواہش اور جذبہ یہ ہوتا ہے کہ واویلا کرے، گلہ شکوہ کرے وغیرہ وغیرہ مصائب کے وقت صبر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر بدگمانی نہ کرے اور نہ اللہ تعالیٰ اعتراض کرے مثلاً یہ نہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مصیبت ہم پر کیوں نازل کی؟

نہ یہ خیال دل میں لائے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہی دیکھا ہے کہ بلائیں اور مصیبتیں ہم پر نازل کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور نہ مصیبت کے وقت گریبان پھاڑے نہ ماتم اور چہرے وغیرہ کو مارے۔ مصائب کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھنے اور نفس کو حق پر ثابت اور باندھے رکھے جانے کو عام اصطلاح میں ”صبر“ کہا جاتا ہے اور اس کی ضد کو ”جزع فزع“ کہتے ہیں۔

### مصائب پر صبر کی فضیلت!

اب صبر کی اسی صورت کے بہت سے فضائل میں سے قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات واقعات میں سے بطور نمونہ کچھ پڑھ لیجئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ط وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاغِبُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝﴾ (بقرة: آیت ۱۵۵ تا ۱۵۷)

”اور (یاد رکھو) ہم کسی قدر خوف و خطر بھوک کی تکلیف (یعنی فقر فاقہ) مال و جان کے اور پھلوں (یعنی پیداوار وغیرہ) کے نقصانات میں (بتلا کر کے) ضرورت میں آزمائیں گے اور (ان حالات میں جو لوگ حق پر استقامت اختیار کر کے صبر کریں گے تو) آپ ایسے صابرین کو (فتح و کامرانی فلاح و نجات کی) خوشخبری سنا دیجئے (جن کا حال یہ ہے کہ) جب ان پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو وہ (دل و زبان سے یہی کہتے ہیں) کہ ”اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاغِبُوْنَ“ (یعنی ہم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں اور یقیناً ہم سب اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے طرح طرح کی عنایتیں اور رحمت ہیں اور یہی لوگ سیدھی راہ پر ثابت قدم ہیں۔“

حضرت ابوامامہ ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

(يَا اِبْنَ آدَمَ اِنْ صَبَرْتَ وَاحْتَسَبْتَ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُولٰٓئِ لَمْ اَرْضَ لَكَ ثَوَابًا دُونَ الْجَنَّةِ) (ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

یعنی ”اے بنی آدم اگر تو نے صدمہ (یعنی تکلیف اور مصیبت) کے ابتدائی مرحلہ میں صبر کیا اور (اس صبر میں)

میری رضا اور ثواب کی نیت کی تو یہ تیرے لئے جنت سے کم کسی اجر و ثواب پر راضی نہیں ہوتا۔“  
مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان کسی مصیبت اور تکلیف کے پہنچنے کے ابتدائی وقت میں اللہ تعالیٰ کی رضا و ثواب کی نیت سے صبر کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس بندہ کو جنت دینے بغیر راضی اور خوش نہیں ہوں گے تو اس کو اس صبر کے بدلے میں جنت میں ضرور داخل فرمائیں گے۔

**رنج و غم کا پہنچنا گناہوں کو دھو ڈالتا ہے!**

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابوسعیدؓ دونوں سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:  
(مَا يَصِبُ الْمُسْلِمُ مِنْ نَصَبٍ وَلَا وَصَبٍ وَلَا هَمٍّ وَلَا خُزْنٍ وَلَا أَدَى وَلَا غَمٍّ حَتَّى الشُّوْكَةِ يُشَاكُهَا إِلَّا كَفَّرَ اللَّهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ) (بخاری مشکوٰۃ)  
”مسلمان کو جب کوئی رنج، دکھ، فکر، خزن، تکلیف اور غم پہنچتا ہے یہاں تک کہ کانٹا چھبتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔“ (بخاری و مسلم)

**کون سی تکلیف و مصیبت باعثِ رحمت ہے؟**

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:  
(مَنْ يَرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُصِيبُ مِنْهُ)  
”اللہ تعالیٰ جس شخص کو خیر و بھلائی پہنچانے کا ارادہ کرتا ہے وہ (اس خیر کے حصول کے لئے) مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ (بخاری)

مصیبت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کو دل پسند نہ کرے اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مصیبتیں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے قہر اور عذاب ہی کے طور پر نہیں آتیں بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس بندہ پر اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم کرنا چاہتا ہے اور اسے خیر و بھلائی کی راہ پر ڈالنا چاہتا ہے تو اسے کسی مصیبت میں مبتلا فرما دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کے گناہ ختم ہو جاتے ہیں اور اس کے دل و دماغ کو اس مصیبت کی سختی سے پاک و صاف کر کے اس کے اندر خیر و بھلائی کی صلاحیت کو پیدا کر دیتا ہے لیکن یہاں یہ بات یاد رکھیں کہ بندہ پر جو مصیبت و تکلیف آتی ہے یہ اس وقت رحمت الہی سمجھی جائے گی جبکہ اس پر صبر کیا جائے اور نفس کو واویلا، جزع، فزع اور نافرمانی سے بچا لیا جائے ورنہ اگر گلے شکوے ہیں واویلا ہے جزع فزع ہے تو یہ مصیبت اس کے حق میں رحمت نہ ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہوگا۔

یاد رہے کہ کسی مصیبت پر صبر کرنے کے وقت اس صدمہ اور مصیبت کا ابتدائی مرحلہ ہوتا ہے ورنہ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد ہر کوئی صبر کر کے چیخنا چلانا اور واویلا کو بند کر دیتا ہے اس لئے ایک واقعہ میں آپ ﷺ نے فرمایا:

(اِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُولٰی) (بخاری و مسلم)

یعنی ”صبر تو (وہی کہلائے گا جو) صدمہ کے ابتدائی وقت میں ہو۔“

### اولاد کے انتقال پر صبر کرنے کا اجر و ثواب!

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کسی مومن بندے کا بچہ مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے کہ تم نے میرے بندے کے بچے کی روح قبض کی ہے وہ عرض کرتے ہیں کہ ”ہاں“ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم نے اس کے دل کا پھل لے لیا وہ عرض کرتے ہیں کہ ہاں پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس (مصیبت) پر میرے بندے نے کیا کہا؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ اس نے تیری تعریف کی اور ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ پڑھا اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے کے لئے (اس مصیبت پر صبر کے بدلے) جنت میں ایک بڑا گھر بناؤ اس کا نام ”بیت الحمد“ رکھو۔ (احمد و ترمذی، مشکوٰۃ)

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(مَالِ الْعَبْدِ الْمُؤْمِنِ عِنْدِي جَزَاءٌ اِذَا قَبَضْتُ صَفِيَّةً مِنْ اَهْلِ الدُّنْيَا ثُمَّ احْتَسَبَهُ اِلَّا الْجَنَّةَ) (بخاری مشکوٰۃ)

یعنی ”جب میں اپنے مومن بندے کے عزیز و محبوب کو جو اہل دنیا میں سے ہوا اٹھالیتا ہوں اور وہ بندہ اس پر ثواب کا طلبگار ہوتا ہے (یعنی صبر کرتا ہے) تو میرے پاس اس کے لئے جنت (سے کم) کوئی جزاء نہیں ہے۔“

(یعنی ایسے بندے کو میں جنت دے دیتا ہوں)۔

### فقر و بیماری اور دوسری مصیبتیں اور پریشانیاں گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہیں!

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

(وَعَزَّتِي وَجَلَالِي لَا اُخْرِجُ اَحَدًا مِنَ الدُّنْيَا يَدُ اَعْفَرُهُ حَتَّى اسْتَوْفِيَ كُلَّ خَطِيئَةٍ فِيْ عُنُقِهِ بِسَقَمٍ

وَاقْتَارٍ فِيْ رِزْقِهِ) (بخاری و مسلم)

”میری عزت و جلال کی قسم جس بندے کو میں بخشنا چاہتا ہوں اسے میں دنیا میں اس وقت تک نہیں اٹھاؤں گا جب تک کہ اس کے بدن کو بیماری میں مبتلا کر کے اور اس کو رزق کی تنگی میں ڈال کر اس کے ہر گناہ کا بدلہ نہ دوں جو

اس کے ذمہ ہوں گے۔“

مطلب یہ ہے کہ جس بندہ کو آخرت کی ابدی سعادت سے نوازا جاتا ہے تو اس کے گناہوں کی سزا دنیا ہی میں اس طرح دے دیتا ہوں کہ کبھی اسے بیماری میں مبتلا کر دیتا ہوں کبھی رزق کی تنگی اس پر مسلط کر دیتا ہوں تو وہ بخشا جاتا ہے اور عذاب آخرت سے نجات پاتا ہے اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ مصیبتیں فقر و فاقہ بیماری وغیرہ تمام پریشانیاں گناہوں کو دور کرتی ہیں، جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(مَمْنٌ مُسْلِمٌ يُصِيبُهُ أَذًى مِنْ مَرَضٍ فَمَا سِوَاهُ إِلَّا حَطَّ اللَّهُ بِهِ سَيِّئَاتِهِ كَمَا تَحُطُّ الشَّجَرَةُ وَرَقُهَا)

(بخاری و مسلم)

”جس مسلمان کو بیماری کی وجہ سے یا اس کے علاوہ کسی اور وجہ سے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ

سے اس کے گناہ (اسی طرح) دور کر دیتا ہے جیسے درخت اپنے پتے جھاڑتا ہے۔“

**بیٹائی سے محرومی پر صبر کا بدلہ جنت ہے!**

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

(إِذَا ابْتَلَيْتُ عَبْدِي بِحَبِيبَتِهِ ثُمَّ صَبَرَ عَوَّضْتُ مِنْهَا الْجَنَّةَ. يُرِيدُ عَيْنِيهِ) (بخاری)

یعنی ”جب میں اپنے کسی بندے کو اس کی دونوں پیاری چیزوں میں مبتلا کر دیتا ہوں وہ اس پر صبر کرتا ہے تو

میں ان دونوں کے بدلے میں اسے جنت دیتا ہوں (راوی کہتے ہیں کہ اس کے دونوں پیاری چیزوں سے) آپ ﷺ

کی مراد اس کی دونوں آنکھیں ہیں۔“

**بیماری پر صبر کی فضیلت!**

حضرت مقداد بن اسود اور حضرت ضابطی رضی اللہ عنہما کے بارے میں روایت ہے کہ یہ دونوں ایک بیمار شخص

کے پاس گئے اور اس کی عیادت کی دونوں نے مریض سے پوچھا کہ تم نے صبح کیسی گزاری؟

مریض نے کہا کہ میں نے نعمت کے ساتھ صبح کی (یعنی مرض و تکلیف کی وجہ سے جزع و فزع میں مبتلا نہیں

ہوا بلکہ رضا بقدر صبر کے دامن کو پکڑے ہوئے ہوں جس سے میرا دل خوش اور مطمئن ہے) تو اس پر حضرت

شداد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ گناہوں کے جھڑنے اور خطاؤں کے دور ہونے کی بشارت سے خوش ہو، کیونکہ میں نے رسول

اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ عز و جل فرماتا ہے کہ:

(إِذَا إِنَّا ابْتَلَيْتُ عَبْدًا مِنْ عِبَادِي مُؤْمِنًا فَحَمِدَ فِي عَلَى مَا ابْتَلَيْتُ فَإِنَّهُ يَقُومُ مِنْ مَضْجَعِهِ ذَلِكَ كَيَوْمٍ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ مِنَ الْخَطَايَا وَيَقُولُ الرَّبُّ تَبَارَكَ وَتَعَالَى أَنَا قَدِ ابْتَلَيْتُ عَبْدِي وَابْتَلَيْتُهُ فَأَجْرُ وَالْهُ مَا كُنْتُمْ تَوْجِرُونَ لَهُ وَهُوَ صَحِيحٌ) (احمد و مشکوٰۃ)

”جب میں اپنے بندوں میں سے کسی مؤمن بندے کو (بیماری و مصیبت میں) مبتلا کر دیتا ہوں اور وہ بندہ اس پر میری تعریف کرتا ہے تو وہ اپنے بستر علالت سے ایسا (گناہوں سے پاک و صاف ہو کر) اٹھتا ہے جیسا کہ وہ اس دن گناہوں سے پاک صاف تھا جس روز اس کی ماں نے اسے جنا تھا نیز پروردگار اللہ تبارک و تعالیٰ (فرشتوں سے فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندے کو قید میں ڈالا ہے) یعنی وہ بیماری اور مصیبت کی وجہ سے نیک کاموں میں محنت و کوشش اور دوڑ دھوپ نہیں کر سکتا ہے) اور اسے آزمائش میں مبتلا کیا ہے لہذا تم (اس کے نامہ اعمال میں) وہ نیک اعمال جاری رکھو جو تم اس کے تندرستی کے زمانہ میں لکھنا جاری رکھتے تھے۔“

**مصیبتوں اور تکلیفوں پر صبر کرنے میں دنیوی فائدے!**

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب کوئی بھی مسلمان کسی (چھوٹی یا بڑی) مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق یہ الفاظ (دل و زبان سے) کہتا ہے کہ ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ (بے شک ہم اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں اور یقیناً اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں) پھر اس کے بعد یہ کہے کہ:

(اللَّهُمَّ أَجِرْنِي فِي مُصِيبَتِي وَاخْلُفْ لِي خَيْرًا مِنْهَا)

”اے اللہ میری مصیبت پر مجھے اجر دیدے اور (اس مصیبت میں جو چیز میرے ہاتھ سے نکلی گئی ہے خواہ وہ صحت ہو یا مالی جانی نقصان ہو حتیٰ چراغ بجھ کر کچھ عرصہ کے لئے روشنی نہ رہے وغیرہ وغیرہ) اس کا مجھے اس سے بہتر بدلہ دیدے تو اللہ تعالیٰ اس چیز کا بہتر بدلہ عطا فرماتا ہے۔“ (مسلم)

حضرت ام المؤمنین فرماتی ہیں کہ جب (میرے پہلے شوہر) ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو میں نے (دل میں کہا) کہ ابو سلمہ سے بہتر مسلمان کون ہوگا؟ کیونکہ انہوں نے سب سے پہلے مع اہل و عیال کے آپ ﷺ کی طرف ہجرت کی اور پھر میں نے مذکورہ بالا کلمات کہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کے بدلے میں رسول اللہ ﷺ کو عطا فرمایا (یعنی میں آپ ﷺ کے نکاح میں آئی)۔

یاد رہے کہ ہر وہ چیز مصیبت میں داخل ہے جو انسان کے دل کو ناگوار گزرے خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی حتیٰ کہ چراغ

بھی بجھ جائے یا بجلی چلی جائے یا کاٹا چھ جائے جو تے کا تسمہ ٹوٹ جائے ان سب کا شمار مصیبتوں میں ہوتا ہے چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

(اِذَا انْقَطَعَ شَيْءٌ اَحَدِكُمْ فَلْيَسْتَرْجِعْ فَإِنَّهُ مِنَ الْمَصَائِبِ) (مشکوٰۃ)

”جب کسی شخص کے جو تے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ پڑھے کیونکہ یہ بھی مصیبتوں میں سے ایک مصیبت ہے۔“ لہذا ہر چھوٹی بڑی مصیبت اور ناگواری کے وقت ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ کہے دل سے اس کے معنی سمجھ کر پڑھنا بہت ہی اجر و ثواب کا باعث اور مفید اور دلی اطمینان و سکون کا ذریعہ ہے اس کے معنی یہ ہے کہ ہم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں اور اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری جانیں و مال اور اہل و عیال وغیرہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور مالک کو اپنی ملکیت میں ہر طرح کے تصرف کا حق ہے وہ جس طرح چاہے تصرف کرے اور ہم سب مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں اور دنیا کے نقصانات اور تکالیف کا بدلہ اور ثواب بہت زیادہ وہاں ملے گا تو جو شخص دل میں اس کے معنی سوچ کر مذکورہ بالا کلمات پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا و آخرت میں اس کا بدلہ دے دے گا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کا ایک بیٹا بیمار ہو گیا اور وہ گھر سے باہر نکلے تو بچہ کا انتقال ہو گیا جب وہ رات کو واپس آئے تو اپنی بیوی ام سلیم رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ بیٹے کا کیا حال ہے؟ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے جواب میں کہا کہ وہ پہلے سے سکون میں ہے اور ان کے سامنے شام کا کھانا پیش کیا اور کھانا کھانے کے بعد ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے ام سلیم رضی اللہ عنہا سے حاجت انسانی بھی پوری کی جب وہ فارغ ہو چکے تو اس کے بعد ام سلیم رضی اللہ عنہا نے حقیقت حال بتلائی (کہ وہ بیماری سے سکون پا کر انتقال کر گئے لہذا) اپنے بیٹے کو دفن کیجئے جب صبح ہوئی تو حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا واقعہ سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے آج رات ہم بستر کی ہے حضرت ابو طلحہ نے عرض کیا ”ہاں“ آپ ﷺ نے فرمایا کہ شاید کہ اللہ تعالیٰ ان دونوں یعنی ام سلیم رضی اللہ عنہا اور ابو طلحہ کے لئے ان کی رات میں برکت عطا فرمائے۔ چنانچہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے بیٹا دے دیا اور جس کے لئے آپ ﷺ نے کھجوروں کو چبا کر اور ان کو اپنے دہن مبارک سے لے کر بچے کے منہ میں ڈال کر اس کے اوپر کے تالو سے چپکایا (اس کو اصطلاح میں تحنیک کہتے ہیں۔) اور اس کا نام عبداللہ رکھا، سفیان رضی اللہ عنہ راوی کہتے ہیں کہ ایک انصاری نے بیان کیا کہ میں نے ان کی نواؤں کو دیکھا ہے وہ سب کے سب قرآن

مجید کے قاری تھے (یعنی عالم) تھے۔ (اس کی تفصیل کے لئے دیکھئے بخاری: ج ۴ ص ۱۷۱۔ اور ج ۲ ص ۸۲۲)

خلاصہ یہ کہ مصائب پر صبر کرنا عظیم اجر و ثواب کا باعث اور دنیا اور آخرت میں سعادت مندی کا ذریعہ ہے اور بے صبری میں انسان کو کچھ ملتا نہیں بلکہ اُلٹا دنیا و آخرت کا نقصان کرتا ہے۔

### جزع فزع کی ممانعت اور مذمت!

کسی مصیبت میں چیخنا چلانا گریبان پھاڑنا یا پگڑی یا ٹوپی اتار پھینکنا یا بال نوچنا وغیرہ یا ناشکری کے الفاظ نکالنا یہ سب کچھ شریعت مطہرہ میں حرام و ناجائز ہے چنانچہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نوحہ (ماتم) کرنے والی عورت اور نوحہ (کو ناپسند کر کے اس) کو سننے والی عورت دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (ابوداؤد مشکوٰۃ)

اور ایک حدیث میں ہے کہ ”نوحہ اور ماتم کرنے والی عورت نے اگر مرنے سے پہلے توبہ نہیں کی تو وہ قیامت کے دن اس حال میں کھڑی کی جائیگی کہ اس کے جسم پر گندھک اور خارش کا کرتا ہوگا۔“ (مسلم)

مطلب یہ کہ اگر نوحہ کرنے والی عورت اس برے عمل سے توبہ کئے بغیر مر گئی تو قیامت کے روز اس پر سخت قسم کی خارش کو مسلط کیا جائے گا تو اس پر گندھک ملے جائے گی تاکہ اس کی خارش میں اور زیادہ سوزش اور جلن پیدا ہو جائے، جس کی وجہ سے وہ سخت تکلیف میں مبتلا ہوگی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

(لَيْسَ مِنْ أَصْرَبِ الْخُدُودِ شَقُّ الْجَبِيبِ وَدَعَابُ دَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ) (بخاری و مسلم)

”جو شخص (مصیبت کے وقت) رخساروں کو پیٹے گریبان چاک کرے اور ایام جاہلیت کی طرح (رونے میں) آواز بلند کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“

### مصیبت کے وقت بلا جزع فزع کے رونا ممنوع نہیں!

البتہ اگر جزع فزع نہ ہو چیخنا چلانا نہ ہو واویلا نہ ہو اور نہ گریبان پھاڑنا اور بال نوچنا وغیرہ نہ ہو تو کسی مصیبت کے وقت آنسو بہنا یا رونا حرام و ناجائز نہیں بلکہ یہ دل کی غمگینی کی وجہ سے ہوتا ہے اور دلوں میں رحم و محبت کی وجہ سے ہوتا ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی اولاد میں سے کسی کا (یعنی رسول اللہ ﷺ کی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا) انتقال ہوا تو عورتیں جمع ہو گئیں اور ان پر (آہستہ آہستہ) رونے لگیں یہ دیکھ کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور ان کو رونے سے منع کیا اور ان کو بھگانے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ:



(دَعُوهُنَّ يَا عَمْرُ فَإِنَّ الْعَيْنَ دَامِعَةٌ وَالْقَلْبُ مُصَابٌ وَالْعَهْدُ قَرِيبٌ) (احمد و نسائی مشکوٰۃ)

”اے عمر! نہیں (اپنے حال پر) چھوڑ دو کیونکہ آنکھیں رورہی ہیں اور دل مصیبت زدہ ہے اور صدمے کا وقت قریب (یعنی صدمے کا ابتدائی وقت) ہے۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر عورتیں چلا چلا کر اور گریبا پھاڑ کر اور منہ وغیرہ کو مار مار کر نہیں رورہی تھیں بلکہ کچھ آواز کے ساتھ رورہی ہوں گی اس لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس احتیاط کے پیش نظر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آگے بڑھ کر یہ عورتیں نوحہ اور ماتم وغیرہ نہ کرنے لگیں ان عورتوں کو رونے سے منع کرنا چاہا مگر آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو روک دیا اور ان کی طرف سے عذر بیان فرمایا اور بتلایا کہ ایسے سخت حادثہ غمناک موقع پر رنج و غم کا اظہار ہونا انسانی فطرت کا تقاضا ہے البتہ رنج و غم کے اظہار میں شریعت کی حدود سے تجاوز کرنا ممنوع ہے جو کہ چیخنا چلانا گریبان پھاڑنا وغیرہ اور زبان سے نازیبا الفاظ نکالنا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ کسی کے مرنے اور مصیبت پر دل کا غمگین ہونا انسانی فطرت کا تقاضا بلکہ رحم دلی کی علامت ہے اور لوگوں کے مرنے اور ان کو مصیبت پہنچنے پر آپ رضی اللہ عنہ کی مبارک آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ابو یوسف لوہار کے گھر گئے (ابو یوسف لوہار آپ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی دایہ کے شوہر تھے اور حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ انہی کے گھر میں بیمار ہو گئے تھے اور انہی کے گھر میں انتقال کر گئے۔) تو آپ رضی اللہ عنہ نے (اپنے صاحبزادے) حضرت ابراہیم کو گود میں لے کر بوسہ لیا اور سونگھا (یعنی اپنا منہ اور ناک ان کے منہ پر اس طرح رکھا جیسے کوئی خوشبو سونگھتا ہے) اس واقعہ کے کچھ دنوں کے بعد ہم پھر ابو یوسف کے ہاں گئے جبکہ حضرت ابراہیم حالت نزع میں تھے تو ان کی حالت دیکھ کر آپ رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے (اس کو دیکھ کر) حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ (بھی) رورہے ہیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

(يَا بْنَ عَوْفٍ إِنَّهَا رَحْمَةٌ)

”اے بن عوف! آنسو کا بہنا (رحمت کی علامت) ہے۔“

اس کے بعد پھر آپ رضی اللہ عنہ کی مبارک آنکھیں آنسو بہانے لگیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

(إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبُ يَحْزَنُ وَلَا نَقُولُ إِلَّا مَا يَرْضَى رَبُّنَا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيمُ إِنَّ الْمَحْزُونُونَ)

”آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں مگر اس کے باوجود ہماری زبانوں پر وہی الفاظ ہیں جن سے ہمارا پروردگار راضی

رہے، اے ابراہیم ہم تیری جدائی میں یقیناً غمگین ہیں۔“ (بخاری و مسلم)

اسی طرح آپ ﷺ کے نواسے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے بیٹے کے نزع کی حالت میں جب آپ ﷺ نے انہیں گود میں اٹھایا تو آپ ﷺ کی مبارک آنکھیں آنسو بہانے لگیں تو اس پر حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

(هَذِهِ رَحْمَتٌ جَعَلَهَا اللَّهُ فِي قُلُوبِ عِبَادِهِ فَإِنَّمَا يَرُحِمُ اللَّهُ مِنَ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ) (بخاری)

”یہ رحمت ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا فرمایا ہے (یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے صرف ان ہی لوگوں پر رحمت (اور مہربانی) کرتا ہے جو جذبہ رحم رکھنے والے ہیں۔“

مذکورہ بالا روایتوں کے علاوہ دوسرے مواقع میں آپ ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ کسی قابل رحم واقعہ کو دیکھ کر آپ ﷺ کے آنسو مبارک بہہ جاتے اور اس کو آپ ﷺ نے جذبہ رحم کی علامت بتلایا اور مذکورہ بالا حدیثوں میں اس بات کا واضح اشارہ موجود ہے کہ جو شخص ایسے موقعوں پر غمگین نہ ہو تو اس کے سینے میں دھڑکتا ہوا دل نہیں ہے بلکہ پتھر کا ایک ٹکڑا ہے اور یہ بتلادیا کہ یہ کوئی ضبط نہیں ہے بلکہ احساس محبت و مروت اور جذبہ رحم کا فقدان ہے اور یہی حال اہل کمال کے نزدیک بہ نسبت کامل تر ہے جن کے چہروں پر ایسے غم ناک واقعات میں بھی غم کا اثر نہ ہو جیسا کہ بعض صاحب حال لوگوں کو یہ حالت پیش آ جاتی ہے کہ ایسے مواقع میں بھی ان کے چہروں پر بشارت کی لہریں دوڑ رہی ہوتی ہیں یہ حالت ان کی دل کی سختی کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ یہ ان حضرات کا ایک حال ہوتا ہے جو بہتر ضرور ہے لیکن کامل ترین نہیں ہے۔ واللہ اعلم

صابرین یعنی صبر کرنے والے کون لوگ ہیں؟

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوئی کہ ”صبر“ بے بسی کمزوری اور ناتوانی کا نام نہیں بلکہ ہر دور اور ہر حال میں حق پر ثابت قدم رہنے اور جمنے کا نام ہے یا یوں کہئے کہ نفس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے حکم پر مستقل اور ثابت قدم رہنے کو کہتے ہیں لہذا صابر وہی شخص کہلاتا ہے جو زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات میں اپنے ذہن اپنے قول و عمل کو شریعت کے مطابق برقرار رکھے اور پورے دین اسلام پر استقامت کے ساتھ قائم رہے اور ہر اس فائدہ اور لذت سے بیزار ہو جائے جو حرام اور ناجائز طریقوں سے حاصل ہو، وہ غم اور دکھ میں بے تاب ہو کر گلے شکوے چیخ و پکار نہیں کرتا اور نہ وہ خوشی اور فراوانی وغیرہ جیسی حالات میں پھول جاتا ہے اور نہ تنگی کی حالات سے بے حوصلہ اور بے ہمت ہو جاتا ہے بلکہ وہ سخت فقر و فاقہ کی حالت میں بھی اپنی قناعت اور خودداری پر حرف نہیں

آنے دینا کوئی اس کو غصہ دلائے تو وہ بے قابو ہو کر آپے سے باہر نہیں ہوتا عمل اور دعا کے ثمرات کا صبر و سکون سے انتظار کرتا ہے اور مشکلات و تکالیف کا بامردی سے مقابلہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے لوگا کر اس کی نصرت و مدد کا منتظر رہتا ہے وہ ہر اس خطرے اور تکلیف کو برداشت کر لیتا ہے جو اسے راہ حق پر چلنے میں پیش آئے، اگر حالات تقاضا کریں تو دشمن کے مقابلہ میں اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے، غرض وہ ہر حال میں اور ہر گردش میں شریعت کی حدود کا پابند رہتا ہے کوئی حالت اور گردش اس کے قدموں کو حق یعنی شریعت پر سے ذرہ برابر نہیں ہلا سکتی اور یہ سب کچھ وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کرتا ہے اور اپنے اچھے اعمال کے مفید نتائج و ثمرات کے لئے جلد بازی نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے وہ آخرت کا انتظار کرتا ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ”صابرین“ کہا جاتا ہے اور یہی وہ صبر ہے جس کی فضیلت سے قرآن مجید اور حدیث شریف کی کتابیں پُر ہیں اور اب صابرین اور صبر کے فضائل میں سے کچھ پڑھ لیجئے۔

### دنیا و آخرت میں صبر و استقامت کے فضائل و فوائد!

(۱) ﴿قُلْ يٰعِبَادِ اللّٰهِ اٰمِنُوْا اَتَقْوٰ رَبَّكُمْ لِّلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّارْضُ اللّٰهُ وَاَسَعَةُ

اَنْمَآئُوْفِی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرُهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ (زمر: آیت ۱۰)

”اے نبی ﷺ! آپ کہہ دیجئے! اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو اپنے رب سے ڈرتے رہو جن لوگوں نے دنیا میں نیک رویہ اختیار کیا ان کے لئے بھلائی ہے اور (اگر ایک شہر یا علاقہ یا ملک میں اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنی سخت مشکل ہو جائے تو دوسری جگہ چلے جاؤ) کیونکہ اللہ (تعالیٰ) کی زمین وسیع ہے، صبر کرنے والوں (یعنی ہر حال اور گردش میں راہ راست پر قائم رہنے والوں) ہی کو اجر بے حساب دیا جائے گا۔“

(۲) ﴿مَاعِنْدَكُمْ يَنْفَدُوْا مَعِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَّ اللّٰذِيْنَ صَبَرُوْا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

﴾ (نحل آیت ۹۶)

یعنی ”جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ (ایک دن) ختم ہو جائے گا اور جو اللہ (تعالیٰ) کے پاس ہے وہ کبھی نہ ختم ہونے والا ہے۔ اور جو لوگ (ہر حال میں راہ راست پر) صبر کرنے (ثابت قدم رہنے والے ہیں) ہم ان کو ان کے اچھے اعمال کے عوض ان کا اجر ضرور دیں گے۔“

فرشتے جنت میں صابرین کا استقبال کریں گے!

(۳) فرشتے جنت میں صابر لوگوں کا استقبال کریں گے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝﴾

یعنی ”اور فرشتے ان (جنتی) لوگوں کے استقبال کے لئے ہر دروازے سے آئیں گے اور انہیں کہیں گے تم پر سلامتی ہو (یہ سب کچھ) اس وجہ سے ہے کہ تم نے (دنیا میں) صبر کیا تھا (یعنی دین پر مضبوطی سے قائم رہے تھے) پس کیا ہی اچھا ہے یہ آخرت کا گھر (جوان صابر لوگوں کے حصہ میں آیا)۔“ (رعد: آیت ۲۴-۲۳)

آخری جیت حق پر صبر و استقامت والوں کو ہوتی ہے!

(۴) آخری جیت حق پر صبر کرنے والوں کو ہوتی ہے اور ان کو زمین والوں پر اقتدار ملتا ہے۔

﴿وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضَعُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَعَارِبَهَا الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا ط وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا ط وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ ۝﴾ (سورہ اعراف: آیت ۱۳۷)

یعنی ”اور ہم نے اس قوم (یعنی بنی اسرائیل) کو جسے بالکل کمزور خیال کیا جاتا تھا اس سرزمین کے مغرب و مشرق کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھ دی تھی اور (اسی طرح) پورا ہو گیا وہ نیک وعدہ آپ کے پروردگار کا بنی اسرائیل کے حق میں صبر کرنے کا اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کا وہ سب کچھ درہم برہم کر دیا جو وہ بنایا کرتے تھے اور وہ بلند مکان جو وہ تعمیر کیا کرتے تھے۔“

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دیا اور ان کی ہدایت اور تعلیم کے مطابق فرعونین کی سخت ایذا رسانیوں اور سخت تکلیف دینے پر صبر کر کے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنی شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے جو نیک وعدہ ان سے کیا وہ پورا کر کے اُس ملک کی پوری سرزمین پر ان کو قابض بنایا اور ان کے مخالفین اور دشمنوں کو ان کی تکبر اور ظلم کی وجہ سے تباہ و برباد کیا۔

(۵) نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اِثْمَةً يُهْدُونَ بِأَمْرِنَا لِمَا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ۝﴾ (سورہ سجدہ: آیت ۲۴)

یعنی ”اور جب انہوں (بنی اسرائیل) نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ہم نے انہی میں سے (ایسے) پیشوا پیدا کئے جو ہمارے حکم سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔“

جس کا حاصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل قوم کا عروج اللہ تعالیٰ کی آیات اور احکامات پر یقین اور اس پر صبر و

استقامت پر تھا جو انہوں نے احکام الہی میں دیکھایا اور خود بنی اسرائیل کے اندر بھی امامت اور پیشوائی کے اعلیٰ منصب کے لئے وہی لوگ چنے گئے جو کتاب اللہ کے سچے مومن تھے جو ان کو مان کر پوری طرح حق کی پیروی کرتے تھے وہ دنیوی فائدوں اور لذتوں کی طمع میں پھسل جانے والے نہ تھے انہوں نے جب راہ راست پر قائم رہنے میں ہر خطرے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہر نقصان اور تکلیف کو برداشت کیا اور اپنے نفس اور دشمنان حق کے ساتھ مجاہدے کا حق ادا کیا تب ہی وہ دنیا کے پیشوا اور امام بنے۔

شجاع بہادر یعنی جنگ اور خطرات کے مقابلے میں صبر و استقامت والے لوگ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں!

(۶) شجاع و بہادر لوگ یعنی وہ لوگ جو دشمن اور خطرات کے مقابلہ میں ثابت قدم رہتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَكَايْنٍ مِّنْ نَّبِيٍّ قُتِلَ مَعَهُ رِثْيُونٌ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَسِرَافِنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبَّتْ أقدامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۝ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝﴾ (آل عمران: ۱۷۶ تا ۱۷۸)

یعنی ”اس سے قبل کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے (راہ حق میں) جنگ کی (لیکن اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے) وہ بے ہمت نہیں ہوئے اور نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ وہ (باطل کے آگے) سرنگوں ہوئے اور اللہ (تعالیٰ) انہی صابروں کو محبوب رکھتا ہے (جو راہ راست پر ثابت قدم رہنے کے لئے پیش آنے والے مصائب اور مشکلات کو برداشت کرتے ہیں) اور (نخیتوں اور مصیبتوں کے باوجود) ان کی زبانوں سے اس کے سوا کچھ نہیں نکلتا تھا کہ: ”اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہ بخش دے اور ہمارے کام میں ہم سے جو زیادتیاں ہو گئیں (انہیں معاف فرما) اور ہمارے قدموں کو (راہ حق پر) جما دے اور قوم کفار (یعنی دشمنان حق کے مقابلہ میں) ہمیں فتح دیدے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں (دنوں جہانوں میں) کامران و کامیاب کر کے (دنیا کا ثواب (یعنی دنیا کی خوشیاں اور فتح و کامیابی) بھی دے دیا اور (اس سے) بہتر و عمدہ آخرت کا ثواب بھی دے دیا اور اللہ تعالیٰ (ایسے) نیکو کاروں سے محبت کرتا ہے۔“

وہن ایسی سستی اور بزدلی کو کہا جاتا ہے جو موت سے اور دنیا کی عیش اور زندگی سے پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ وہن کی یہ تفسیر ایک روایت میں خود نبی کریم ﷺ سے منقول ہے۔ چنانچہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عنقریب ایسا وقت آنے والا ہے جبکہ (دوسری اُمّیں اور قومیں) آپس میں ایک دوسرے کو (تمہارے خلاف لڑنے کے لئے) بلائیں گی اور تمہاری شان و شوکت کو مٹائیں گی جیسا کہ کھانے کے دسترخوان پر جمع ہونے والے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو کھانے کے قاب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یہ سن کر کسی صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ (ان کا ہمارے خلاف جمع ہونا اور ہم پر غالب ہو جانا) کیا اس سبب سے ہوگا کہ اس وقت ہم تعداد میں کم ہوں گے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ اس وقت تمہاری تعداد تو بہت ہوگی لیکن تمہاری حیثیت پانی کی اس جھاگ کی سی ہوگی جو دریا و نالوں کے کناروں پر پایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہاری ہیبت اور رعب نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں وہن پیدا کر دے گا۔ اس پر کسی صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ یہ ”وہن“ کیا چیز ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”حب الدنيا و كراهة الموت“ دنیا کی محبت اور موت سے بیزاری۔ (ابوداؤد، بیہقی، مشکوٰۃ: باب تغیر الناس فصل دوم)

ضعف سے مراد یہاں بدنی اور جسمانی کمزوری نہیں بلکہ دل میں وہ کمزوری ہے جو وہن سے پیدا ہو جاتی ہو۔ ”استکانت“ اس دبنے اور اس ہار ماننے کا نام جو دل کے ضعف کا نتیجہ ہو۔ جب کسی شخص کے اندر موت سے سخت نفرت اور زندگی اور دنیا کی عیش سے شدید محبت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے اندر ”وہن“ اور بزدلی پیدا ہو جاتی ہے اور یہی بزدلی اس کے ارادے اور عمل میں کمزوری پیدا کرتی ہے اور پھر اسی کمزوری اور ضعف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی حریف کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور ہار مان لیتا ہے اس آیت میں صبر کی اُس حقیقت پر بھی پوری روشنی پڑی جس کا بیان پہلے گزر چکا۔

### صبر عزم کی بلندی اور بہت بڑی ہمت کا کام ہے!

صبر عزم کی بلندی اور بہت بڑی ہمت ہے چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿لَتَبْلُوَنَّ فِيْ أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعَنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيْرًا ط وَأَنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ۝﴾ (آل عمران: آیت ۱۸۶)

”تم اپنے مال و جان میں ضرور آزمائے جاؤ گے اور تم ضرور بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے ان لوگوں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے اور ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے شرک کیا اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار

کرو تو بے شک یہ بڑے حوصلہ (اور ہمت) کے کاموں میں سے ہے۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت حق کے لئے نکلنا اور آزمائش کا ہونا ضروری ہے اس کام میں تمہیں ایسے شدید حالات آئیں گے جن میں مال و جان کا نقصان ہوگا اور اہل کتاب اور مشرکین وغیرہ اور منکرین حق سے بڑے دکھ درد پہنچانے والی دل آزار باتیں سننا پڑیں گی۔ یہ دراصل تمہارے صبر و تقویٰ کا امتحان ہے اگر ان باتوں کے باوجود تم حق پر ڈٹے رہے اور ان تمام مشکلات کا مقابلہ ثابت قدمی سے کیا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچتے رہے تو بڑی یہ عزیمت، ہمت کا کام اور اولوالعزم شخصیتوں کا مقام ہے حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو یہی تلقین اور وصیت فرمائی تھی جس کا ذکر قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا ہے:

﴿يُنْصِيْ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاَصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْر ۝﴾ (لقمان: آیت ۱۷)

”اے میرے بیٹے نماز قائم کرو اچھے کاموں کی نصیحت کیا کرو اور برائیوں سے روکو اور (اس کام میں) جو مصیبت تم کو پہنچے اس پر صبر کرو بے شک یہ حوصلہ (اور ہمت) کے کاموں میں سے ہیں۔“

دین پر خود عمل کرنا اور دوسروں کو دین حق کی طرف بلانا یہ دونوں صبر چاہتے ہیں ان دونوں میں نفس و شیطان کے ایجنٹوں کی طرف سے رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں اور قسم قسم کی ایذا رسانیوں، مشکلات مال و جان کے نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلاشبہ جو شخص نفس و جذبات کو کنٹرول کر کے تمام تر مشکلات کو برداشت کرتا ہے اور خطرات کا مقابلہ کر کے حق پر ڈٹا رہتا ہے تو یہ بہت ہی عزیمت اور حوصلہ کا کام ہے۔

شجاعت اور بہادری کیا ہے؟

مذکورہ بالا آیتوں میں جنگ کے وقت دشمن کے مقابلے میں میدان جنگ میں ڈٹے رہنا اور دشمن کے سامنے جان دینے اور جنگ میں بھاگ جانے سے اپنے آپ کی حفاظت کرنے اور تمام خطرات کا مقابلہ حق اور دعوت حق پر ڈٹے رہنے کو صابر کہا گیا ہے اور اس عزم کو بلندی اور ہمت کا کام کہا گیا ہے صبر کی اس قسم کا اصطلاحی نام شجاعت اور بہادری ہے یعنی شجاعت اور بہادری یہ ہے کہ دشمن اور خطرات و مصائب کا مقابلہ استقامت سے کیا جائے۔

بے خوفی کا نام شجاعت نہیں!

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شجاعت اور بہادری بے خوفی کا نام نہیں کہ کوئی شخص ڈرے ہی نہیں بلکہ خوف سے



نڈر ہو کر ضبط نفس اور موقعہ محل کے مناسب عمل کے لئے اقدام کرنا شجاعت ہے۔ مثلاً کوئی شخص نتائج پر نگاہ رکھے اور ان کے پیش آنے سے خوف زدہ ہو مگر جب وہ نتائج سامنے آجائیں تو وہ استقامت سے ان کا مقابلہ کرے تو وہ شجاع اور بہادر بلکہ وہ ایسی حالت میں بھی بہادر سمجھا جائے گا کہ نتیجہ پر نگاہ رکھنے کے بعد وہ حکمت عملی کے تحت یہ فیصلہ کرے کہ گھمسان کی لڑائی کے موقعہ سے اس وقت بچنا ہی بہترین طریقہ کار ہے اور اس کی ذمہ داری اور فریضہ اس کو یہ حکم دیتا ہے کہ اس کے لئے یہ ہی ہے کہ اپنے لشکر کو خطرے سے بچا کر پسپا ہو جائے یا ایک وقت تک چھپ جائے یا ہجرت کر کے دشمن کے مقابلہ کی تیاری کرے غرض جب تک کوئی شخص موقع محل کے مناسب خطرات اور مصائب کا مقابلہ کر کے بہترین کار گزار ثابت ہو تو وہ شجاع اور بہادر ہے اور اگر اس نے موقع محل کے مناسبت کے وقت بھی مقابلہ کر چھوڑ دیا پھر جس جگہ مقابلہ کرنا چاہتا تھا وہ وہاں سے بھاگ نکلا یا جس جگہ اس کو فرار اختیار کرنا چاہئے تھا وہاں فرار نہ ہوا تو ان تمام صورتوں میں اس شخص نے بے صبری اور بزدلی دکھلائی بس سب سے بڑی بہادری اور شجاعت مصیبت کے وقت دل کا اطمینان اور حاضر حواسی ہے اور بہادر وہ ہے کہ جب اس پر سختی آئے تو وہ اپنے اطمینان اور بیداری حواس کو نہ کھو بیٹھے بلکہ ہوشیاری اور استقامت سے اس کا مقابلہ کرے ایک شخص دیکھتا ہے اس کے سامنے اس کا بھائی کنویں میں گر رہا ہے یا اس کے گھر میں چور گھسے ہوئے ہیں یا اس کے مکان میں آگ لگ گئی ہے پس اس طرح کے خطرات اور حالات میں اس کی عقل گم ہوگئی اور وہ حواس باختہ ہو گیا اور حیران رہ گیا اور یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ اس حالت میں کیا کرے تو وہ شخص نامرد اور بزدل ہے اگر وہ اپنے نفس کو قابو کرے اور ان امور کیلئے بہترین طریقہ کار کو عمل میں لائے تو یہ شخص بلاشبہ بہادر ہے خواہ اس طریقہ کار کے اپنانے کے وقت وہ ڈر رہا ہو لیکن اس کے باوجود وہ خوف و خطر کے نتائج سے نڈر ہو کر اپنے نفس کو قابو کرے اور موقعہ محل کی مناسبت عملی اقدام کرے۔

### ظلم اور بے رحمی کا نام بہادری نہیں!

اس سے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہوگی کہ ظلم اور بے رحمی کا نام شجاعت اور بہادری نہیں بلکہ بہادر اور شجاع وہ ہے جو ضعیفوں، یتیموں، مسکینوں، مظلوموں پر مہربان ہو اور جو لوگ بے رحم اور سنگدل ہوتے ہیں وہ بہادر نہیں وہ ظالم اور ڈرپوک ہوتے ہیں وہ اپنی جان کے خطرے یا اپنے فقر و فاقے میں مبتلا ہو جاتے ہیں اس میں ظالم جابر کے مقابلے کی قوت نہیں ہوتی بلکہ کمزوروں پر ظلم و ستم کر کے سنگدلی اور اپنی بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

## صابر متقی ہوتا ہے!

جس شخص کے اندر صبر کی صفت ہوگی وہی حقیقی معنوں میں متقی اور پرہیزگار بن سکتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مقام پر سچے ایمانداروں اور وفاداروں کی جو خوبیاں بیان فرمائی ہیں اُن میں صبر کا ذکر خصوصیت کے ساتھ بیان فرمایا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ ط أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (بقرہ:

آیت ۱۷۷)

”اور خاص کر وہ لوگ جو سختی اور تکلیف اور جنگ میں (دشمن سے مقابلے) کے وقت صبر کرنے والے ہیں یہی لوگ ہیں (دعوائے ایمان میں) سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو (حقیقی معنی میں) متقی ہیں۔“

اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں اور صابرین ہی پر اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں ہو سکتی ہیں!

اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت ہمیشہ حق پر جتنے والوں کے ساتھ ہوتی ہے اور ایسے صابرین پر ہی اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور مہربانیاں برسی ہیں اور یہی لوگ منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ط بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ۚ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۚ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۚ أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾ (بقرہ: آیت ۱۵۳ تا ۱۵۷)

”اے ایمان والو صبر اور نماز (کے ذریعے اللہ تعالیٰ) سے مدد طلب کیا کرو بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کئے جائیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم (اسے) سمجھتے نہیں اور ہم ضرور آزمائیں گے تم کو کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مالوں سے اور جانوں سے اور پھلوں کے نقصانات سے اور آپ ایسے صابرین کو (دنیا و آخرت کی فتوحات ترقیوں اور فلاح کی) خوش خبری سنا دیں جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں اور ہم اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی شاباشیں ہیں اور رحمت ہے اور یہی لوگ راہ (حق کو) پانے (اور کامیاب) ہونے والے (اور اپنی منزل مقصود کو پہنچنے والے) ہیں۔“

ان آیتوں میں راہ حق کے خطرات و مشکلات بھی بتائے گئے ہیں اور راہ حق کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت اور قانون بھی بتایا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان آزمائشوں اور مشکلات و مصائب سے نمٹنے کے لئے اصل اسباب کیا ہیں اور اس کا علاج کیا ہے۔

### مشکلات اور مصائب سے نجات کا حل!

چنانچہ پہلے یہی بتایا کہ اس راہ میں مشکلات خطرات اور رکاوٹیں آئیں گی اس کا علاج یہ ہے کہ صبر اور نماز کو اپناؤ اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کو حاصل کرو ہر مشکل ہر خطرے ہر مصیبت سے نجات کا واحد حل اللہ تعالیٰ (ہی کو پکارنا) ہے (چاہے نماز کے ذریعے ہو یا صبر کر کے اللہ تعالیٰ کی مدد کو پکارا جائے) یہ دنیا اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے ظاہر ہے کہ وہی شخص اس میں سکون اور اطمینان سے زندگی گزارے گا جو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی دنیا میں ایسی زندگی بسر کرتا ہو جو دنیا کے خالق و مالک کو خوش کرنے والی ہو اور یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ دنیا تو اللہ تعالیٰ کی ہو اور اسباب و وسائل کسی اور کے ہوں اسباب اور وسائل بھی تمام تر اللہ تعالیٰ ہی مہیا فرماتے ہیں پھر بھی جو شخص اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے کسی قانون و دستور کے خلاف چلے وہ خوش و خرم رہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں لہذا ہر مشکل اور ہر مصیبت کا علاج صرف ایک ہی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ سے پلٹا جائے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کی جائے نماز یعنی فرض واجب نماز تہجد اور نفل نمازیں پڑھیں اور ہر مشکل اور رکاوٹ آفت اور مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی مدد کو حاصل کیا جائے نیز یہ کہ اپنے نفس کو قابو میں کر کے اللہ تعالیٰ کے احکامات و ہدایات کی پوری پابندی کی جائے اور اس کی نافرمانی سے قطعی اجتناب کیا جائے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت شامل حال ہوتی ہے اور ایسے لوگ عین مشکل و مصیبت کے وقت پر سکون اور مطمئن ہوتے ہیں اور دنیا و آخرت کی فتوحات، ترقیات، کامیابیاں انہی لوگوں کے ہاتھ آتی ہیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿ان الله مع الصابرين﴾ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، یہاں معیت سے مراد نصرت اور مدد و تائید کی معیت بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کا وہ قرب و محبت و الفت بھی جس کی ٹھنڈک لذت اور چاشنی کو دل کی آنکھ اور زبان پالیتے ہیں۔ اس کے بعد دوسری آیت میں اس حقیقت کا بیان ہے کہ حق کے قیام اور نفاذ میں جان کی بازی لگانی پڑتی ہے لیکن جو شخص اس جدوجہد اور دشمنانِ حق کے ساتھ جنگ میں جان دیتا ہے وہ مرتا نہیں اور نہ اس کو مردہ سمجھنا چاہئے بلکہ وہ دائمی حیات اور زندگی کو پالیتا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہترین رزق دیا جاتا ہے۔

موت کے بعد دوسری زندگی ہر انسان کو ملتی ہے لیکن...!

مؤمن اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ دنیا کی زندگی اصل زندگی نہیں بلکہ اصل زندگی اس وقت شروع ہو جاتی ہے جب دنیا کی یہ زندگی ختم ہو جاتی ہے یہ زندگی پہلے عالم قبر و برزخ میں اور پھر عالم آخرت میں حاصل ہوتی ہے اور یہ زندگی صرف مؤمن کو نہیں بلکہ ہر انسان کو ملتی ہے لیکن منکرین اور کفار کی یہ نئی زندگی چونکہ سخت عذاب والی ہوتی ہے اس وجہ سے وہ قابل ذکر نہیں البتہ ایمان والے لوگ قبر و برزخ کی زندگی میں بھی اپنے اپنے مراتب و مدارج کے مطابق اس نئی زندگی کے سرور اور خوشیوں کو حاصل کرتے ہیں اور اہل ایمان میں سے جو لوگ راہ حق میں شہادت کا مرتبہ حاصل کرتے ہیں ان کی قبر اور برزخ کی زندگی کی کامیابیوں اور خوشیوں کا تو کوئی اندازہ اور تصور بھی اس دنیا میں نہیں ہو سکتا، اندازہ لگائیے جس پسینے اور خون سے دین حق کی ایباری ہو جائے تو یہ پسینہ اور خون کس قدر قیمتی ہوگا۔

ایمان کے لئے آزمائش ضروری ہے!

اس کے بعد تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی ایک سنت کا بیان ہے وہ یہ کہ دنیا میں ہر شخص کی آزمائش ضرور ہوگی اللہ تعالیٰ نے اس سنت کی نشاندہی مختلف مقامات پر فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿أَحْسِبِ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۚ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ۝﴾ (عنکبوت: آیت ۲-۳)

”کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ محض یہ کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لائے انہیں چھوڑ دیا جائے گا (اگر انہوں نے ایسا سمجھا ہے تو یہ انہوں نے بالکل غلط سمجھا ہے ان سے ضرور امتحان لیا جائے گا) اور (یہ امتحان اور یہ آزمائش صرف ان کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ یہی ہوا) ہم نے ان لوگوں کو بھی آزمایا ہے جو ان سے پہلے گزرے ہیں (اور ان کو بھی ضرور آزمائیں گے) پس اللہ تعالیٰ ضرور ان لوگوں کو الگ (اور ظاہر) کر دے گا جو (اپنے دعویٰ ایمان اور عہد میں) سچے ہیں اور ضرور ان لوگوں کو بھی جدا (اور ظاہر) کر دے گا جو (اپنے دعویٰ ایمان میں) کھوٹے (اور) جھوٹے ہیں۔

آزمائش کے فوائد!

مذکورہ آیتوں میں بھی یہ معلوم ہوا کہ دنیا میں آزمائش ضرور ہوگی اور اہل حق کے لئے یہ امتحان اور آزمائش

ناگزیر ہے اور اس میں بہت فائدے ہوتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

- (۱) انسان کی پوشیدہ صلاحیتیں اور قوتیں آزمائش اور امتحان ہی سے پروان چڑھتی ہیں۔
- (۲) آزمائش سچے اور کھروں کے کردار، اخلاق کو پختہ اور بہتر سے بہترین بناتی ہے۔
- (۳) آزمائشوں کی وجہ سے خود پتھوں کے اندر جو کھوٹ اور آمیزش ہوتی ہے وہ پاک صاف ہو جاتی ہے جیسا کہ سونے کو آگ میں تپایا جاتا ہے تو اس کا نحش دور ہو کر چمک اٹھتا ہے۔
- (۴) انہی آزمائشوں سے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے اور یہی آزمائشیں عام لوگوں پر اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ کون کھرا ہے اور کون کھوٹا۔

- (۵) اور اس کی وجہ سے جماعت حقہ کھوٹے اور جھوٹے لوگوں سے پاک صاف ہو جاتی ہے۔
- (۶) اور آزمائشوں میں کھرے ثابت ہونے والوں کے لئے دنیا و آخرت کی کامیابی ترقی اور فلاح ہے، دائمی جنت ہے اور جو اس میں فیل ہو جاتے ہیں کھوٹے ثابت ہوتے ہیں وہ دنیا میں بالآخر نیست و نابود ہوتے ہیں اور آخرت میں جہنم کا ایندھن بنتے ہیں اس آیت میں جن چیزوں میں آزمائش کا بیان ہے اس میں پہلے خوف کو لایا گیا ہے۔ خوف سے مراد پروپیگنڈوں کا خوف، ملامت کرنے والوں کی ملامت کا خوف، تکلیفیں جھیلنے کا خوف اور دشمنوں کے حملوں کا خوف سب شامل ہیں۔

دوسری آزمائش ”جوع“ بھوک کی بھی ہے اس سے مراد معاشی مشکلات ہیں جو دشمنوں کی طرف سے معاشی اور غذائی ناکہ بندیوں اور اقتصادی پابندیوں کی وجہ سے پیش آسکتی ہیں اور جو لوگ ملک کی تمام تجارت اور دوسرے معاشی وسائل اور ذرائع پر قابض ہوں ان کی مخالفت ان سے جھگڑنا اپنے اوپر گویا کہ بھوک کا دروازہ کھولنا ہے ایسی صورت میں دشمن ہر طرف سے معاشی اور غذائی ناکہ بندی کرے گا مثلاً نوکری سے نکال دیا۔ اقتصادی پابندی لگائی تجارت کو چلنے نہیں دیا، لین دین بند کر دیا وغیرہ وغیرہ۔

تیسری چیز اموال، جان اور ثمرات میں نقصان کی آزمائش ہے۔ جدوجہد اور جنگوں میں مال بھی لگتا ہے اور جان بھی، رشتے دار، بیٹے، بھائی، پوتے وغیرہ بھی شہید ہوتے ہیں اس طرح اپنے پورے مال اور اپنی جان اور اہل و عیال کو داؤ پر لگانا پڑتا ہے۔ گھر بار کو اور اپنی کچی فصلوں کو چھوڑنا پڑتا ہے اور اپنے اموال کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لگانا پڑتا ہے نیز جنگ اور بد امنی کی حالت میں اہل حق اپنے اموال کی نگہداشت سے یعنی فصلوں کی کاشت اور ان کی حفاظت اونٹ، گائے، بکری مال مویشیوں اور تجارت، لین دین اور کاروبار وغیرہ کی نگہداشت سے بھی رہ جاتے

ہیں اس وجہ سے بھی اموال اور ثمرات میں نقصان کرتے ہیں۔  
چوتھی آزمائش ”ثمرات“ میں نقصان کا ہے اور اس کو اموال کے بعد ذکر کیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اموال سے ایک زائد چیز ہے وہ اموال اور جان کا غلہ ہے تو اُس راہ کی جدوجہد اور جنگ کی وجہ اس نعمت میں بھی کمی آسکتی ہے۔

### آزمائشیں تمہاری ترقی کے لئے ہیں گھبراؤ نہیں!

مذکورہ بالا بیان سے جس طرح یہ بات ثابت ہوگئی کہ ایمانی زندگی کے لئے آزمائش ضروری ہے اس طرح اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی آزمائش سے ترقی ہوتی رہتی ہے اور اس طرح اس میں بہت سے فائدے ہیں اس لئے ان آزمائشوں سے گھبرانے کے بجائے ان سے بغل گیر ہو جانا چاہئے۔ ان آیتوں میں غور کریں تو ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ﴾ میں آزمائش کے بعد اور خوف وغیرہ سے پہلے ﴿بَشْيٍ﴾ کو لایا گیا اس میں مومن کو تسلی اور خوش خبری ہے کہ ان آزمائشوں پر جو تر قیاں اور جو مستقبل کی نعمتیں اور خوشیاں ملتی ہیں ان کے مقابلے میں یہ بہت قلیل ہیں اس وجہ سے ان آزمائشوں سے دل شکستہ اور پست ہمت نہ ہوں بلکہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے اور اس آیت کے آخر میں واضح طور پر ان لوگوں کو خوشخبری دیدی گئی جو ان تمام آزمائشوں کے باوجود حق پر جمے رہیں۔

مذکورہ آیتوں میں سے چوتھی آیت میں مومن کی ایک صفت اور اس کی حالت کو بیان کیا ہے کہ جب اس کو مشکل اور مصیبت پہنچ جاتی ہے تو یہ کیا کرتا ہے چنانچہ فرمایا:

﴿الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾

”یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔“

### مومن کے قول کی حیثیت!

اس آیت میں مومن اور صابرين کا یہ قول نقل ہوا کہ وہ کہتے ہیں کہ ”اناللہ وانا الیہ راجعون“ تو یہ مومن کا قول کسی قسم کے زبانی تلفظ کا نام نہیں بلکہ وہ ایک حقیقی قول اور بات ہوتی ہے جو مومن کے اندرونی جذبات اور احساسات اور عقیدہ کی ترجمانی کرتی ہے اور وہ اس کی پوری ہستی کی نمائندگی کرتی ہے وہ اس کی شخصیت اور عملی

زندگی کی بولتی ہوئی آواز ہوتی ہے اور اس آیت میں یہ قول بھی مؤمن کے عقیدے کا اظہار ہے کہ اس کو ایک اس بات پر ایمان ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ ہی کا ہے اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے۔ دوسرا اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ مرنے کے بعد اس کو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف لوٹنا ہے ظاہر ہے کہ جو شخص ان دو حقیقتوں پر ایمان رکھتا ہے کوئی بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کو راہِ حق سے نہیں ہٹا سکتی۔ جب کوئی اس حقیقت کو جان لیتا ہے کہ ہم اس دنیا میں اللہ تعالیٰ ہی کے بھیجے ہوئے ہیں اور اس کے لئے مرنا اور جینا ہے اور پھر اسی کی طرف لوٹنا ہے اور وہاں ہم کو ان تکالیف اور مصیبتوں اور آزمائشوں پر انعامات ہی انعامات ملنے ہیں اور جنہوں نے ہم کو ایذا اور تکلیف پہنچائی ہے وہیں ان سے پورا پورا انتقام بھی لینا ہے تو پھر مؤمن کیوں گھبرائے؟ مؤمن تو اللہ تعالیٰ کی خاطر ہر مصیبت کا بہت اطمینان و سکون سے استقبال کرتا ہے اور یہی کلمہ مومنین کی ڈھال اور سپر ہے اس پر وہ ہر مصیبت اور ہر مشکل کا مقابلہ کرتے ہیں۔

### صابرین پر اللہ تعالیٰ کی شاباشیں برکتیں اور رحمتیں برستی رہتی ہیں!

مذکورہ آیتوں میں سے آخری پانچویں آیت میں مومنین کو جو خوش خبری دیدی گئی اس کی وضاحت اور تفصیل یہ ہے کہ ان پر ان کے رب کی طرف سے صلوات اور رحمت برستی رہتی ہے۔ ”صلوات“، ”صلوٰۃ“ کی جمع ہے اس سے دنیا و آخرت میں قسم قسم کی عزت و تکریم درجات کی بلندی فتح مندی، کامیابی، تائیدات و نصرتیں برکتیں، شاباشیں، اُلفت اور طرح طرح کی نوازشیں مہربانیاں ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خاص توجہ کا ہونا مراد ہے رحمت سے خاص خاص مہربانیاں، صلاحیتوں اور روح کی خاص نشوونما و ترقیات مراد ہیں اور ان کے بارے میں بتایا کہ یہی لوگ ہیں جن کو صراطِ مستقیم کی ہدایت حاصل ہوتی ہے اور ان کی کوششیں کامیاب ہوتی ہیں اور وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان خوش نصیبوں میں کر دے۔ آمین

### علم اور دنیا کی امامت صبر پر ملتی ہے!

جس قوم کو اللہ تعالیٰ کی کتاب ملتی ہے گویا اس کو امامت اور پوری دنیا پر خلافت کی کنجی مل گئی مگر عالم اور دنیا کی امامت اور پیشوائی کسی قوم اور جماعت کو اس وقت ملتی ہے جبکہ وہ حق اور اللہ تعالیٰ کی کتاب کی خاطر مشکلات اور مصائب برداشت کر کے اس پر جمی رہے۔

چنانچہ بنی اسرائیل کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فرماتے ہیں کہ:



﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ﴾

”اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) میں پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے (یہ سب کچھ اس وقت ہوا) جبکہ انہوں نے صبر کیا (اور اللہ تعالیٰ کی کتاب پر نہایت استقامت سے جبرے رہے) اور وہ ہماری آیتوں ہی پر یقین رکھتے تھے۔“ (السجده: ۲۴)

اس آیت کریمہ میں صبر کی اساس اور بنیاد بھی بتائی گئی کہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور اس کی کتاب اور آیتوں کی سچائی اور بہترین نتائج اور انجام پر پختہ عقیدہ اور یقین تھا اس لئے وہ صبر کے امتحانات اور آزمائشوں میں پورے اترے اور نہایت استقامت سے کتاب الہی پر جبرے رہے۔ اس سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ عروج اور قوموں کی صحیح قیادت اور امامت کتاب الہی کے ثمرات اور نتائج میں سے ہے اور بنی اسرائیل میں سے بھی امامت اور پیشوائی کے لئے وہی لوگ چنے گئے جو کتاب الہی پر مکمل اعتماد اور سچا یقین رکھتے تھے اور وہ نہایت استقامت کے ساتھ اس کی پیروی کرتے تھے اور یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی دنیاوی عارضی لذتوں، راحتوں اور خوشیوں کو ٹھکراتے ہیں اور خطرات و مشکلات اور مصیبتوں کو برداشت کر کے حق پر جبرے رہتے ہیں تو لوگوں کو بالآخر بطور انعام یہی صلہ مل جاتا ہے کہ ان کو دنیا میں قیادت اور پیشوائی ملتی ہے اور آخرت میں ابدی ترقیاں اور خوشیاں و نعمتیں نصیب ہوتی ہیں اور یہ نعمتیں اس قوم کو اس وقت تک ملتی رہتی ہیں اور ان کے دشمن ذلیل خوار ہوتے ہیں جب تک وہ قوم کتاب الہی پر قائم رہتی ہے اور جب وہ قوم کتاب الہی پر عمل کو چھوڑ دیتی ہے تو وہی قوم بالآخر بحیثیت مجموعی دنیا میں بھی ذلیل ہو جاتی ہے اور آخرت میں وہی لوگ ذلیل کن عذاب سے دوچار ہوتے ہیں جنہوں نے کتاب الہی پر عمل اور اس پر صبر و استقامت کو چھوڑ کر اس کو نظر انداز کیا ہو۔

**حق کی خاطر صبر کرنے کا صلہ جنت ہے!**

حق کی خاطر صبر کرنا اور استقامت کے ساتھ حق پر ڈٹے رہنے کا صلہ آخرت میں جنت ہے۔ چنانچہ سورہ فرقان میں اللہ تعالیٰ رحمن کے ”بندگان کی صفات اور ان کے کردار کو ذکر کر کے آخر میں فرماتا ہے۔“

﴿أُولَئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ فِيهِمَا تَجِئَةٌ وَسَلَامٌ ۝ خُلِدِينَ فِيهَا حَسُنَتْ

مُسْتَقَرًّا أَوْ مَقَامًا ۝﴾ (الفرقان: آیت ۷۵)

”یہی لوگ ہیں جنہیں ان کے صبر کے بدلے (جنت کے) بالا خانے ملیں گے اور ان میں ان کا دُعا اور سلام

کے ساتھ استقبال کیا جائے گا وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے وہ خوب جگہ ٹھہرنے کی اور خوب جگہ ہے رہنے کی۔“ اس

آیت سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ اچھے اوصاف پیدا کرنا اور ان کو برقرار رکھنا کوئی آسان کام نہیں بلکہ اس کے لئے صبر و استقامت کی ضرورت ہے۔

**صبر کرنے والوں کو بے حد و حساب اجر ملے گا!**

صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا رَبَّكُمْ ط لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَّارْضُ اللّٰهُ وَاَسْعَةً ط اِنَّمَا يُؤْتِى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝﴾ (سورہ زمر آیت ۱۰)

”(اے پیغمبر) کہہ دو کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو اپنے رب سے تقویٰ اختیار کرو (اور یاد رکھو کہ) ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اس دنیا میں اچھے اعمال کئے نیک صلہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی زمین بڑی وسیع ہے بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔“

اس آیت کریمہ میں ایمان والوں کو ایمان و تقویٰ اور صبر کی ترغیب اور اس میں ان کو تسلی اور خوشخبری دیدی گئی ہے کہ جو لوگ ایمان و تقویٰ کو اپنا شعار بنائیں گے اور اس دنیا میں نیکی اور بھلائی کی زندگی بسر کریں گے تو ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں اچھا اور نیک صلہ ہے اور اس راہ میں جو مصائب اور مشکلات پیش آئیں ان کو عزم اور ہمت سے برداشت کروا کر تم دیکھو کہ تمہارا ملک اور تمہارا وطن تمہارے اوپر تنگ کر دیا گیا ہے اور اس وطن اور ملک میں تمہارے لئے اللہ کے دین پر قائم رہنا ناممکن بنا دیا گیا ہے تو پھر بھی شکستہ دل اور مایوس نہ ہو اللہ تعالیٰ کی زمین بڑی وسیع ہے کسی ایسی جگہ ہجرت کرو جہاں تم بے خوف و خطر اپنے رب کی پوری بندگی کر سکو بلاشبہ یہ راہ بڑی سخت آزمائشوں کی ہے لیکن اطمینان رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے جو بندے ان آزمائشوں میں حق پر ثابت قدم رہیں گے تو ان کو ان کا صلہ اور اجر بھی ان کے توقعات اور ان کے اندازوں سے بڑھ کر بے حساب ملے گا جس کا تم کوئی تصور بھی نہیں کر سکتے۔

یہ چند آیتیں بطور نمونہ پیش کی جس سے یہ اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ صبر و استقامت میں دنیا و آخرت کی کامیابی ہے صبر میں انسان تکلیف اور کم نقصان کو برداشت کر کے اس کے بدولت بڑی تکلیف اور زیادہ نقصان و خسران سے بچ جاتا ہے اور بہت بڑے آرام و سکون اور ابدی خوشیوں کو حاصل کر لیتا ہے۔ صبر ہی ایسی نعمت ہے جس کی بدولت انسان کو قوت برداشت غصہ پر قابو اور لوگوں کو ایذا رسانی سے حفاظت وغیرہ جیسی عظیم نعمتیں ملتی ہیں اور یہی صبر ہے جو انسان کو جلد بازی اور زور و درنجی سے محفوظ کر کے اور اسے بردباری، سنجیدگی اور نرمی کا خوگر بناتا ہے اور اسی صبر کے بدولت اللہ تعالیٰ کی معیت اور نصرت و مدد ملتی ہے اور صابر شخص پر ہر آنے والی تکلیف و مصیبت اس

کے گناہوں کی لائیشوں کو دھو دیتی ہے اور اس کے لئے قرب الہی کا ذریعہ بنتی ہے اور اس کے جوہر کھلتے ہیں اور یہی تکالیف و مصائب اس کے لئے ترقیات اور دنیا و آخرت کے سرخروئی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

### صبر کون کر سکتا ہے؟

صبر کے متعلق چند فضائل سامنے لائے گئے اس سے اگر ایک طرف صبر کی فضیلت اور اہمیت سامنے آئی تو دوسرے طرف اس سے صبر اور صابر کی شکل و صورت بھی سامنے آئی۔ اب اس کے بعد اس بات کو جان لیجئے کہ صبر صرف وہی شخص کر سکتا ہے کہ جس کی خواہشات اس کی عقل کے تابع ہوں اور جو شخص جذبات و خواہشات کا اندھا ہو وہ بدترین جانور ہے اور حقیقی معنوں میں صبر وہی شخص کر سکتا ہے جس شخص کا اللہ تعالیٰ پر اس کے قانون دستور اور اس کے وعدوں پر یقین ہو تو یہی لوگ صبر کر سکتے ہیں اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک چھوٹا بچہ یاد دہانہ ہے جس کو اپنی صحت اور علاج کی کوئی قدر و قیمت معلوم نہیں۔ اس کے مقابلے میں ایک سمجھدار نوجوان ہے جس کو اپنی صحت اور علاج کی اہمیت اور پوری قدر معلوم ہے دونوں ایک قسم کی بیماری میں مبتلا ہوئے دونوں کے لئے ڈاکٹر نے کسی انجیکشن، کڑوی دوا کا علاج اور سخت پریہیز تجویز کیا اب ظاہر ہے کہ بچہ یاد دہانہ اپنے اختیار سے نہ انجیکشن لگوائے گا نہ پریہیز کرے گا اور یہ نوجوان خود انجیکشن لگوانے جائے گا اور کڑوی دوائی بھی کھائے گا اور پریہیز بھی کرے گا۔

لیکن یہ نوجوان یہ کڑوی دوائی کھائے گا اور سخت انجیکشن اس وقت لگوائے گا جبکہ اس کو ڈاکٹر اور طبیب پر بھی اعتماد ہو ورنہ اگر اس کو ڈاکٹر اور طبیب پر کوئی اعتماد نہیں تو وہ بھی قطعاً کڑوی دوا کے کھانے اور انجیکشن لگوانے اور پریہیز کی سختی کو برداشت نہ کر سکے گا۔ اس طرح جو لوگ جذبات کے اندھے ہوں اور جن کو اللہ تعالیٰ کے قانون اور اس کے وعدوں پر کامل یقین نہیں ہے تو وہ حق کی خاطر نہ اپنے نفس و جذبات کو کنٹرول کر سکتے ہیں اور نہ وہ حق کی خاطر اندرونی اور خارجی نفس و شیطان کی مزاحمتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ لہذا صبر اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون اور اس کے وعدوں پر اعتماد اور یقین ہی کا ثمرہ اور نتیجہ ہے جس کا اللہ تعالیٰ پر یقین نہیں تو اس کا دین اس کے جذبات اور خواہش نفس کے تابع ہو گا نہ کہ دین حق کے۔

انسان جس چیز کو اپنا نصب العین بناتا ہے تو اس کیلئے استقامت کو اختیار کرتا ہے!

انسان جس موقف کو اختیار کرتا ہے یا جس چیز کا وہ طالب ہوتا ہے یا جس چیز کو اپنا نصب العین بنالیتا ہے تو وہ

اس چیز کے حصول کے لئے برابر مصروف رہتا ہے اور اس مطلوبہ چیز کی راہ میں جس قدر مشکلات اور مصائب آئیں ان کو برداشت کر کے اپنے نفس کو اپنے مقصد اور موقف پر جمائے رکھتا ہے اس جتنے کا نام صبر ہے اور صبر ایسی استقامت اور ثابت قدمی اور نفس کے اندر ایسی قوت کا نام ہے جو نفسانی خواہشات اور مشکلات اور مصائب کے جھیلنے سے مغلوب نہ ہو اور اپنی مطلوبہ چیز یا اپنے پسندیدہ موقف پر اپنے آپ کو جمائے رکھے۔ تو یہاں صبر کا خلاصہ یہ ہوا کہ نفسانی خواہشات اور مشکلات اور مصائب کا مقابلہ کر کے اپنے نفس کو مسلسل حق یعنی قرآن و سنت پر جمائے رکھنا اور یہ قوت کسی انسان کے اندر اس وقت پیدا ہو جاتی ہے کہ جب انسان کو حق اس قدر محبوب ہو کہ اس کے مقابلے میں نفسانی خواہشات اور اس راہ میں جس قدر مشکلات اور مصائب بھی پیش آئیں وہ ان کو ذرہ برابر اہمیت نہ دے اور حق سے اس قدر محبت انسان کے اندر تب پیدا ہو سکتی ہے کہ انسان کو یہ یقین ہو کہ یہ حق ہے اس کا تعلق علم سے ہے دوسری بات یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں پر یقین ہو جو اس نے حق کے اپنانے پر کئے ہیں اور ان نقصانات اور خسارے و تباہی کا یقین ہو جو حق کے چھوڑنے کی وجہ سے بالآخر وجود میں آنے والے ہیں اور انسان کے اندر جو صبر کا خلق ہے اس کو باقی رکھنے اور اس کو ترقی دینے کا علاج نماز و ذکر روزے اور ریاضت سے ہو سکتا ہے اور جس شخص کے اندر صبر کی قوت نہیں اس کی دینی عمارت ریت کے ٹیلے پر ہے اس کی یہ عمارت نفس کی خواہش کی ترغیب اور اس راہ میں مشکلات اور مصائب پیش آنے کی وجہ سے دھڑام سے گر جاتی ہے اور جس شخص کے اندر صبر کی یہ قوت موجود نہ ہو وہ دنیا میں کوئی اعلیٰ کام تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا۔

**صبر، عجز اور رونے کا نام نہیں!**

مذکورہ بالا بیان سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ صبر وعزم جزم اور استقامت اور اس مردانگی کا نام ہے جو مرد مؤمن کا شیوہ اور صفت ہے اور اس کے برعکس ذلت کی زندگی اختیار کرنا باطل سے دہنا، باطل کے سامنے گڑ گڑانا اور ظالموں اور باطل پرستوں کے ظلم و زیادتی کو دیکھ کر مجبور اور بے بس بن کر آنسو بہانا یہ صبر نہیں بلکہ یہ وہ حالت ہے جو کمزوروں بے بسوں، مجبوروں کو پیش آتی ہے اور بے بسی اور مجبوری کی حالت میں ان کے پاس آنسو بہانے کے سوا کوئی چیز نہیں ہوتی اے مومنو! اٹھو سیدھے سیدھے مومن بنو بد اخلاقیوں، برائیوں، برے جذبات سے اپنے آپ کو پاک کرو اور ذکر واذکار سجدوں اور رکوع اور ریاضت سے اپنے آپ کو آراستہ کرو خود بھی ہر ذی حق کو اپنا حق پورا دو اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید و تلقین کرو اور اس راہ میں مشکلات اور مصائب سے قطعاً نہ گھبراؤ اور صبر کرو اور صبر کی تلقین کو اختیار کرو ان شاء اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں کامیاب ہو جاؤ گے۔

## ایمانی زندگی اور صبر!

مذکورہ بحث میں صبر کی حقیقت اور صبر کے فضائل بیان ہوئے اور اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ایمانی زندگی، زندگی کے ہر لمحہ میں صبر کا تقاضہ کرتی ہے خواہ انسان انفرادی اعمال میں ہو یا اجتماعی سب میں صبر و ہمت کی ضرورت پڑتی ہے طاعات و عبادات ہوں معاملات کی صفائی ہوں حقوق کی ادائیگی مال و جان کی قربانی ہو میدان جنگ میں ثابت قدمی ہو جھوٹ خیانت غیبت، بد نظری وغیرہ گناہوں سے پرہیز ہو تنظیمی اور جماعتی زندگی میں سمع و طاعت ہو اور جماعت کے جماعتی فیصلے اور ان کو بروئے کار لانا سب کے سب بغیر صبر و ثبات کے ناممکن ہوتے ہیں۔

**صبر کا حصول، نفس کو کچلے بغیر حقیقی معنوں میں صابر ہونا ناممکن ہے!**

یہ بات تو معلوم ہو گئی کہ صبر جذبات و خواہشات کو قابو کر کے نفس کو حق پر جمائے رکھنے کا نام ہے تو اس سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ نفس کو کچلے بغیر حقیقی معنوں میں صابر ہونا ناممکن ہے۔

**نفس کو قابو کرنے یا کچلنے کا طریقہ!**

اور نفس کو قابو کرنے یا کچلنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو قابو کرنے کی مشق اور تمرین کو برابر جاری رکھا جائے اور اس کو مجاہدات و ریاضات کے ذریعے کنٹرول کیا جائے کثرت سے روزے رکھے جائیں نوافل اور ذکر کی کثرت ہو اور نماز کو بتکلف صبر و سکون اس کے ظاہری و باطنی آداب کے ساتھ ادا کرنے کی کوشش کرنا۔ بتکلف اللہ تعالیٰ کی خاطر مخلوق کی نفع رسانی کے لئے اپنے آرام اور اپنی لذت کو چھوڑنا اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی عزت کرنا۔ جماعتی فیصلوں کی پابندی کرنا اور بتکلف موت کو کثرت سے یاد کرنا آخرت کو سامنے رکھنا اور دین پر چلنے والوں کے حق میں اللہ تعالیٰ نے جنت اور انعامات کے جو وعدے کئے ہیں اور خلاف چلنے والوں کے لئے جو سزائیں ہیں ان کو بار بار بار سامنے لانا اور کم باتیں کم کھانا کم بولنا کم سونے کی عادت ڈالنے کی کوشش کرنا اور صالح لوگوں کی صحبت کو ادب و احترام کے ساتھ اختیار کرنا، یہ چند چیزیں صبر کی بنیاد بنتی ہیں اگر ان چیزوں کا اہتمام کیا جائے اور ان کو سنجیدگی سے اختیار کیا جائے تو نفس کا کچلنا شروع ہوگا اور دل میں سوز اور یاد الہی پیدا ہوگی اور یہی یاد الہی آپ کو اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگ دے گی پھر یہی ریاضت مجاہدات وغیرہ آپ کی طبیعت ثانیہ بن جائیں گے اور حقیقی معنوں میں تواضع و انکساری کے پیکر بن جائیں گے اور اس بات کو یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور حقیقی یاد اس دل میں آسکتی ہے جو متواضع ہو اور جس میں ذرہ برابر کبر، بڑائی نہ ہو اور جس دل میں کبر اور بڑائی عجب خود پسندی کی نفسیات ہوں

وہ دل معرفت الہی اور حقیقی یاد الہی سے محروم رہے گا۔

تواضع اور انکساری اور بے نفسی کا تجربہ خاص حالات میں ہوتا ہے!

اور یہ بھی یاد رہے کہ بہت بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کبھی اپنے بارے میں اس دھوکے میں پڑ جاتا ہے کہ اس کے اندر عاجزی اور بے نفسی آپکی ہے حالانکہ ہنوز اس میں بہت کچھ کبر اور بڑائی کا مرض اور خواہشات کا غلبہ موجود ہوتا ہے اور اس کا تجربہ ایک تو خاص حالات میں ہوتا ہے کہ کوئی بے نفس اور متواضع بنا ہے یا نہیں وہ یہ کہ اکثر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ عام حالات میں متواضع اور بے نفس نظر آتے ہیں مگر جب کوئی خاص حالت پیش آئے تو اچانک وہ جادہ حق سے ہٹ جاتے ہیں کبھی محبت یا نفرت کا مسئلہ اور کبھی عزت اور ذاتی مالی نقصان کا سوال ان کے اوپر چھا جاتا ہے مثلاً کسی کی محبت نے اس کو عدل اور حدود شرعیہ سے ہٹا کر دوسروں کے معاملے میں ظلم اور نا انصافی میں مبتلا کر دیا یا کسی کے ساتھ دشمنی اور نفرت اس کو ظلم اور نا انصافی پر اکساتی ہے اور اس کے معاملہ میں ظلم اور نا انصافی کا مرتکب ہو جاتا ہے یا مثلاً اختلافی اور باہمی تنازعات میں حق دوسری طرف ہو لیکن عزت و وقار کا سوال اس کو حق کے اعتراف سے روک دیتا ہے اسی طرح خاص اور غیر معمولی حالات میں یہ خدا پرست اور متواضع وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ اور آخرت سے غافل اور بے دین لوگ عام حالات میں کرتے ہیں حالانکہ جنت کی قیمت بے نفسی اور صبر ہے جس میں حق کی خاطر مال و جان اور اپنی راحت و لذت خواہشات و جذبات اور عزت کو قربان کرنا پڑتا ہے۔

بے نفسی اور صبر کا بڑا تجربہ جماعتی اور تنظیمی زندگی میں ہوتا ہے!

بے نفسی اور صبر کا بڑا تجربہ جماعتی اور تنظیمی زندگی میں ہوتا ہے جماعتی اور تنظیمی زندگی میں وہی شخص اپنے آپ کو اچھی طرح پابند کر سکتا ہے جس کی خواہشات و جذبات اس کے قابو اور کنٹرول میں ہوں وہ لوگوں کی تنقید، ملامت اور تعریف سے بے پرواہ ہو، اس کی رائے پر عمل ہو یا نہ ہو اس سے مشورہ لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو جماعتی اور تنظیمی زندگی میں وہ دوسروں سے زیادہ بھاگ دوڑ کرتا ہے اور زیادہ مال و جان اور وقت اور عزت کو داؤ پر لگاتا ہے لیکن اس کو عزت کا منصب نہ ملا ہو یا ملا ہو وہ اس طرح کی باتوں میں قطعاً نہیں الجھتا اور جو شخص جماعتی اور تنظیمی کاموں میں سستی دکھاتا ہے اور اپنے نجی اور ذاتی مفاد کے کاموں میں دلچسپی یا لوگوں کی تنقید، ملامت یا تعریف کی طرف کان لگائے رکھتا ہے اور ان چیزوں میں پوری طرح متاثر ہوتا ہے یا اس کو سب سے اپنی رائے اچھی لگتی ہے

اور منصب وغیرہ جیسی چیزوں میں الجھ گیا تو ایسا شخص ہرگز بے نفس اور صابر نہیں ایسا شخص ہر وقت جماعت اور تنظیم میں بگاڑ پیدا کر دے گا۔

### طاقتور اور جنت کے مستحق لوگ!

اس کے برعکس جو لوگ اس قدر بے نفس ہو چکے ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر اپنی انانیت کو ختم کر کے اجتماعیت اور جماعت کے بندھن میں اپنے آپ کو باندھیں اور اس کے پابند ہو جائیں اور جماعت حقہ کے تحت اپنی دینی، اخلاقی اور معاملاتی تمام زندگی کو منظم کریں۔ جو لوگ اپنی انانیت کو ختم کر کے اس طرح اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے دین کے حوالے کر دیں یہی لوگ ہیں جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید و آخرت میں جنت کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

### بے پناہ قوت والی جماعت!

ایسے لوگوں کی جماعت جو اپنی انانیت کو ختم کر کے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے حوالے کر چکے ہوں اور اپنی تمام تر دینی و اخلاقی زندگی کو جماعت حقہ کے تحت منظم کئے ہوں تو ایسی جماعت کے اندر عظیم قوت پیدا ہو جاتی ہے ایسے لوگوں کے درمیان تمام وہ اسباب ختم ہو جاتے ہیں جو ایک کو دوسرے سے توڑنے والے ہوں کیوں کہ جماعت اور اجتماعیت کو توڑنے والی چیز نفس پرستی، انانیت اور اپنی رائے پر اصرار ہے اور جہاں یہ انانیت موجود ہو وہ اسلام برائے نام ہوگا ریاکاری و نمائش ہوگی اس جماعت کے اندر اپنی غلطیاں دیکھنے کے بجائے دوسروں کی غلطیاں دیکھنا اور دوسروں کے احتساب کا رجحان غالب ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جماعت باہمی اختلافات اور ٹکراؤ کا شکار ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس جب کسی جماعت میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور آخرت کی فکر و طلب پیدا ہو جاتی ہے تو اس جماعت کے اندر انانیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ جماعت ایک دوسرے کی خیر خواہی میں کوشاں اور شکایتوں سے درگزر کرتی ہے اس کی توجہ تعمیری کاموں، اچھے کاموں، حقوق کی ادائیگی اور ظلم کے روکنے کی طرف ہو جاتی ہے ایسی جماعت میں ہر فرد کے اندر اپنی ذمہ داری کا احساس بیدار رہتا ہے اور ہر ایک پوری ذمہ داری سے اپنا کام کرتا ہے اور اس کا ہر فرد دوسروں سے زیادہ اپنے عیوب کی طرف اور دوسروں کے احتساب سے زیادہ اپنے احتساب اور اصلاح کی طرف متوجہ رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی بے نفس اور ذمہ دار جماعت آپس میں



پوری طرح متحر رہتی ہے اور جس ملک اور جس قوم میں ایسے لوگ قابل لحاظ تعداد میں بیدار ہو جائیں تو وہ خود بخود اس قوم اور اس ملک میں بلند مقام حاصل کرتے ہیں اور ایسی جماعت بالآخر پوری زمین پر حاکم اور غالب ہو کے رہتی ہے۔

### جماعتی صبر کا بیان!

جہاں تک جماعت حقہ کے افراد کے صبر کا تعلق ہے اور دین کی خاطر اور اجتماعی طور پر سختیوں کے جھیلنے اور اس کی فضیلت کا بیان ہے تو اس کی کچھ ضروری تفصیل دعوت کے باب میں بھی اور مذکورہ بالا قریب کے بیان میں بھی گزر چکی ہے۔ اگرچہ اس میں جماعتی صبر کے لئے بہت کچھ موجود تھا لیکن جماعتی صبر کی اہمیت کو مد نظر رکھنے کی خاطر اس کے بعض گوشوں اور پہلوؤں کو واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ جماعت پھونک پھونک کے قدم رکھے اور کبھی بھی عاجلانہ اقدام نہ کرے۔

### دین حق کو دنیا کے سانچے میں ڈھالنا جماعتی بے صبری ہے!

جب کوئی جماعت اپنی دعوت میں ایسے مواد کو بڑھادی ہے جن کا تعلق دنیوی مفادات یا شان و شوکت یا لذت سے ہو تو یہ جماعت کی بے صبری کی دلیل ہے ایسی صورت میں تھوڑے وقت میں اگرچہ لوگوں کا ہجوم تو بن جائے گا لیکن اس کا دینی نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔

### دنیوی مفادات وغیرہ کی چند مثالیں!

اب سوال یہ ہے کہ یہ دنیوی مفادات کیا ہیں؟ اور دنیاوی لذت و شان و شوکت کی کیا صورت ہوتی ہے؟ اس کے لئے چند مثالیں بیان کی جاتی ہیں مثلاً بیانات میں اس پر زور دیا جائے کہ موجودہ اقتدار کو ہٹا کر اسلامی نظام کو نافذ کریں گے یا یوں کہا جائے کہ غریبو! اٹھو اقتدار کو چھین لو اور اپنی غریبی کو دور کرو یا جس دعوت میں انتخابی اور ووٹ کی سیاست کی چاشنی اور کسی کا اُتار چڑھاؤ کا نشہ موجود ہو یا اسلام کو عشق بازی کی صورت میں پیش کیا جائے یا مثلاً ان سے کوئی دین کا ایسا مطالبہ کیا جائے جس میں ان کی عزت بھی بنتی ہے اور اپنا مقررہ دنیاوی ڈھانچہ بھی باقی رہتا ہے اور وہ ان کی دنیا دارانہ زندگی سے کوئی ٹکراؤ بھی پیدا نہیں کرتا ہے مثلاً کوئی معمولی سی سبیل کھولنا یا کسی دینی ادارے میں کچھ چندہ دنیا یا کبھی چھوٹی موٹی خیرات کرنا وغیرہ۔ ایسے امور کی وجہ سے عوام اپنے محبوب دنیاوی مشاغل اور اپنی من چاہی زندگی میں مشغول ہوتے ہیں اور ان کو یہ بھی اطمینان ہوتا ہے کہ انہوں نے یہ سبیل اور

چندہ وغیرہ کی وجہ سے اپنی نجات اور کامیابی کا یقینی انتظام کر لیا ہے اس لئے ایسی دعوت اور ایسے بیانات عوام میں بہت جلد مقبول ہوتے ہیں اور ایسی تحریکوں کے ارد گرد عوام کی بھیڑ لگ جاتی ہے لیکن ایسی تحریکات اور ایسے کاموں سے خاطر خواہ نتائج نہیں ملتے ایسی تحریکوں ایسے بیانات وغیرہ میں شور اور دھوم دھام زیادہ ہوتی ہے لیکن ان کی وجہ سے اسلام غالب آجائے اور لوگوں میں حقیقی معنوں میں اسلام آجائے یہ ناممکن ہے۔

**عوام میں مقبول تحریک کے لئے ضروری نہیں کہ وہ حق بھی ہو!**

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی بھی تحریک عوام میں مقبول ہو جائے تو اس کا لازمی مطلب یہ نہیں کہ وہ حق و صداقت پر مبنی ہوگی بالکل ممکن ہے کہ اس وجہ سے لوگوں میں مقبول ہو کہ وہ ان کی ذہنی سطح اور ان کے دنیاوی مفادات کی سطح سے قریب ہو۔

**اسلام میں زندگی کا مادہ پرستانہ نقشہ توڑنا پڑتا ہے!**

خلاصہ یہ ہوا کہ اسلام میں مادہ پرستانہ نقشہ زندگی کو توڑنا پڑتا ہے اور خالص خدا پرستانہ سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالنا ہوتا ہے اگر دین اور مذہب کو صرف ایک ضمیمہ کے طور پر پیش کیا جائے جس میں ان کی مادہ پرستانہ زندگی کا سانچہ سالم رہے یا دین اسلام کو عشق بازی کی صورت میں یا مذہب کے نام پر اقتدار کے اتار چڑھاؤ کا سلسلہ سامنے لایا جائے یا کسی قوم کے خلاف قوم و ملک کو اکسایا جائے تو ایسی تحریکات بہت جلد مقبول ہو جاتی ہیں لیکن ان تحریکات کی وجہ سے ایک آدمی بھی حقیقی معنوں میں نہ مسلمان بن سکتا ہے اور اسلام کا احیاء تو بہت دور کی بات ہے کیونکہ اسلام اچھل کود کا نام ہے نہ دھوم دھام کا اور نہ وہ بڑے بڑے القاب اور نعروں کا اور نہ اسلام عشق بازی ہے بلکہ یہ اسلام تو محبوب حقیقی کی محبت میں اپنے مال و جان و عزت اور خواہشات و جذبات کے قربان کرنے کا نام ہے اور یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور آخرت طلبی کی تحریک ہے اس لئے جماعت حقہ کو چاہئے کہ کمزور بنیادوں سے اپنی دعوت کا آغاز نہ کریں بلکہ خالص توحید و آخرت و رسالت کی بنیاد پر دعوت کو چلائیں اور اسی دعوتی بنیاد اور اسلام کے باقی مراحل کو تعمیر کریں جیسا کہ اس کا پہلے یہاں ذکر ہو چکا ہے۔

**احیائے اسلام کے نام پر اٹھائی گئی تحریکات کا حال!**

ذرا غور کیجئے کہ ایک عرصہ سے مسلمانوں نے احیائے اسلام کے لئے بہت سی تحریکات اٹھائیں اور ان تحریکوں کو بڑی مقبولیت بھی حاصل ہوئی مگر ان تمام تحریکات میں سے بعض تو اپنے اصل مقصد میں سو فی صد ناکام ہیں اور بعض

سے اگرچہ اُمت مسلمہ کو فائدہ حاصل ہوا ہے اور ہو رہا ہے لیکن اصل مقصود کہ اسلام کا احیاء ہو جائے اس میں تقریباً تمام کی تمام تحریکات ناکام رہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ان تحریکوں نے احیائے اسلام کے لئے اسی ضابطہ کو اختیار نہیں کیا جو فطری ضابطہ ہے اور جو اللہ تعالیٰ نے احیائے اسلام کے لئے مقرر فرمایا ہے ان میں سے بہت سوں نے بہت اخلاص کے ساتھ کام کیا ہے لیکن ان میں سے بعض نے خاموش تدبیر کے بجائے دھوم دھام سے اور شور کے ذریعے سے اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ بعض نے فطری رفتار سے چلنے کے بجائے عاجلانہ اقدام کر کے منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کی اور تدریج کے بجائے چھلانگ کا طریقہ اختیار کیا بعض نے بنیادی کام کئے بغیر اور بنیادی مراحل سے گزرے بغیر آسمان میں یوں ہی آرزوؤں کے محلات تعمیر کئے بعض نے مراحل کا لحاظ کیا تدریج بھی اختیار کی مگر یہ سب برائے نام تھیں اس لئے وہ اپنی قوت و طاقت کو منظم کئے بغیر بڑی بڑی کاروائیاں کرنے لگے بعض تھوڑے سے زیادہ کی طرف بڑھنے کے بجائے پہلے دن سے زیادہ حاصل کرنے کے درپے ہو گئے اور اس کے لئے انہوں نے دعوت کا آغاز ہی دنیا کی عزت و مال وغیرہ سے کیا یا باطل اور ظالم سے اتفاق و اتحاد کو مقصد کے لئے اصل مانا غرض یہ ہے کہ انہوں نے فطری ضابطوں کے بجائے شوق و جذبات یا لوگوں کے جذبات اور خواہشات کا لحاظ کیا اور فطرت کے خلاف ضابطوں پر چل نکلے جس کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے۔

### کامیابی کا راز صبر و استقامت میں ہے!

حالانکہ اللہ تعالیٰ کی یہ بنائی ہوئی دنیا مقررہ ضابطہ پر چل رہی ہے اور اس میں وہی شخص اور وہی جماعت کامیاب ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقررہ ضابطہ پر چل رہی ہو اور اللہ تعالیٰ نے کامیابی کا راز اپنی کتاب اور اپنے نبی کریم ﷺ کی بات ماننے اور صبر کے ساتھ فطرت کے مطابق چلنے میں رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس فطرت کو قرآن مجید میں واضح طور پر بیان فرمایا کہ اور خود نبی کریم ﷺ نے اس کو اپنے عمل کے ذریعے دکھایا ہے۔

### معقول تعداد میں افراد کی اصلاح سے پہلے قومی اصلاح بے صبری ہے!

جو لوگ معقول تعداد میں افراد کی اصلاح کئے بغیر قومی اصلاح اور قومی انقلاب لانا چاہتے ہیں وہ بے صبری کا ثبوت دیتے ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قومی اصلاح کا راز افراد کی اصلاح اور نیک کردار کی تعمیر میں رکھا ہے، قرآن مجید اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اور خود نبی کریم ﷺ کی پوری دعوت اور عملی زندگی اس پر شاید ہے۔ اس لئے جو لوگ اجتماعی ہنگاموں اور اچھل کود وغیرہ کے ذریعے قومی اصلاح تک پہنچنا چاہتے ہیں یہ ناممکن ہے۔

لہذا افراد کی اصلاح اور ان کے کردار کی تعمیر پر زور دیں۔

**اقدامات میں صبر اور عاجلانہ اقدام سے پرہیز کیا جائے اور جلد بازی کیا ہے؟**

دین حق کی جدوجہد کے لئے ضروری ہے کہ عاجلانہ اقدام سے قطعی پرہیز کیا جائے عاجلانہ اقدام اور جلد بازی کیا ہے وہ یہ ہے کہ جس مقصد کو پانے کے لئے جو ابتدائی چیزیں اور شرائط ضروری ہوں ان کی تکمیل کے بغیر قبل از وقت اس کو پانے اور حاصل کرنے کی کوشش کی جائے اس بات کو چند مثالوں سے واضح کرتا ہوں۔

(۱) اگر کوئی کاشتکار اس خوف سے کہ کہیں میری فصل کو ایلے ڈالہ باری یا طوفان برباد نہ کر دے یہ عاجلانہ اقدام کرے کہ وہ فصل کو اس کے پکنے سے پہلے تھریشر میں ڈال دے تو ایسا کاشتکار اس فصل کے مقصد اور غلہ سے محروم ہو جائے گا۔

(۲) اگر کوئی شخص شکار پر نشانہ لگائے بغیر یوں ہی گولی کو چلاتا ہے تو ایسا شخص ایک طرف شکار کو بھگاتا ہے اور دوسری طرف گولی کا نقصان کر کے اپنے مال کو ضائع کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فائدے کے بجائے اپنا نقصان کرتا ہے۔ غرض یہ کہ جب کسی چیز کی ابتدائی ضروری چیزوں اور شرائط کی تکمیل کئے بغیر اس چیز کو پانے کی کوشش کی جائے تو یہ ایک عاجلانہ اقدام ہوگا جس کا نقصان بھگتنا پڑے گا۔

**حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہ طور پر وقت سے پہلے حاضر ہونا!**

اس کی ایک واضح مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہ طور پر قبل از وقت حاضر ہونا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دینے کے لئے کوہ طور پر بلایا اور اس حاضری کے لئے میعاد مقرر فرمائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا شوق و محبت حد سے بڑھ گیا اور محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے آپ نے کوہ طور پر جانے میں عجلت سے کام لیا اور بنی اسرائیل کی دیکھ بھال اور نگرانی کی ذمہ داری اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے ذمہ سپرد کر دی وقت سے کچھ پہلے کوہ طور پر پہنچے مگر یہی تھوڑا سا عاجلانہ اقدام جو تمام رضائے الہی کے شوق و محبت اس کی خوشنودی کے جذبے سے تھا وہ بھی آپ کی قوم کی قیادت ابھی تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کر رہے تھے اس قوم کے اندر شریر اور مفسد لوگ موجود تھے اور قوم کے اجتماعی نظم و ضبط پر حضرت ہارون علیہ السلام کی گرفت مضبوط نہیں ہوئی تھی چنانچہ قوم کے شریر اور مفسد لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس جدائی اور غیابت سے فائدہ اٹھایا اور قوم کو گوسالہ پرستی میں مبتلا کر دیا اس واقعہ کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا أَغْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يَمُوسَىٰ قَالَ هُمْ أَوْلَاءُ عَلَيَّ اثْرَىٰ وَعَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَىٰ قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ﴾ (طہ: آیت ۸۳ تا ۸۵)

”اور اے موسیٰ اپنی قوم کو چھوڑ کر جلدی آنے پر تم کو کس چیز نے ابھارا موسیٰ علیہ السلام نے کہا وہ لوگ بھی میرے پیچھے ہی ہیں (اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری قوم میرے پیچھے ٹھیک ٹھیک میرے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ واللہ اعلم) اور اے میرے رب میں تیری طرف جلدی فرط شوق و محبت سے آیا ہوں تاکہ تو راضی ہو اللہ تعالیٰ نے فرمایا پس ہم نے تمہارے (نکل جانے کے بعد) تمہاری قوم کو (صبر و استقامت کی) آزمائش میں ڈال دیا اور سامری نے ان کو گمراہ کر دیا ہے۔“

غور سے دیکھئے اللہ تعالیٰ کے ایک جلیل القدر نبی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کلام اور اس کے احکامات اور ہدایات کے حاصل کرنے کی محبت شوق و جذبہ اور محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کے لئے کوہ طور پہنچے لیکن یہ اقدام آپ کا وقت سے کچھ پہلے تھا مگر نہ تو اللہ تعالیٰ نے وقت سے پہلے آپ کو تورات کی تختیاں عنایت فرمائیں اور نہ ایسا ہوا کہ عاجلانہ اقدام کا جو نتیجہ نکلتا تھا وہ اخلاص وہ نیک نیتی کی وجہ سے نہ نکلتے۔

غزوہ اُحد میں قبل از وقت گھاٹی چھوڑنے کا انجام!

عاجلانہ اقدام کی ایک دوسری مثال اُحد کی جنگ میں قبل از وقت گھاٹی چھوڑنے کا واقعہ ہے۔ جنگ اُحد کے موقع پر اُحد کے پہاڑ کے ایک درہ سے دشمنوں کے حملے کا خوف تھا اس لئے نبی کریم ﷺ حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں پچاس تیر اندازوں کی جماعت اس درہ کی حفاظت اور نگرانی کے لئے مقرر فرمادی اور انہیں ہدایت فرمائی کہ خواہ ہم کو فتح حاصل ہو یا شکست تم لوگ اپنی جگہ کو نہ چھوڑنا جب اس جنگ میں کفار نے شکست کھائی اور اپنا مال و سامان چھوڑ کر میدان جنگ سے بھاگ نکلے تو عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے انہیں روکنے کی کوشش بھی کی مگر انہوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ کا حکم تو لڑائی کے وقت کے لئے تھا اب لڑائی ختم ہو چکی ہم یہاں کھڑے ہو کر کیا کریں؟ اس کے بعد یہی ہوا کہ اس درہ کی طرف کفار مکہ کا شدید حملہ ہوا اور مسلمانوں کی جیتی ہوئی جنگ شکست میں تبدیل ہو گئی اس واقعہ میں غور کریں امیر کی نافرمانی اور خود نبی کریم ﷺ کی نافرمانی غلطی سے ہو گئی اور اس جماعت کی اکثریت سے عاجلانہ اقدام صادر ہوا تو اس کی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ شکست میں تبدیل ہو گئی۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عاجلانہ اقدام سے قلعہ پر ہیڑ کریں اور اقامت و جدوجہد کی راہ میں صبر اور انتظار کی روش کو اپنائیں ورنہ بعض اوقات نیک سے نیک ارادے اور نیت کے ساتھ بھی جو عاجلانہ اقدام

کیا جاتا ہے وہ عظیم نقصان کا سبب بن جاتا ہے۔

راہ حق میں غلطی سے عاجلانہ اقدام ہو تو گھبرائیں نہیں!

اس کے ساتھ اس بات کو بھی یاد رکھیں کہ راہ حق میں ناکامی کا سوال ہی نہیں اس میں بندہ جو کچھ کرتا ہے آخرت ہی کے لئے کرتا ہے اور جو شخص قاعدے کے مطابق آخرت کے لئے کام کرتا ہے وہ ہر حال میں کامیاب ہے البتہ اگر کبھی عاجلانہ اقدام سے نقصان ہو جاتا ہے لیکن وہ آزمائش اور نقصان بھی بہت بڑی بڑی خیر و خوبی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے مثلاً اس کی وجہ سے کھرے اور کھولے کی تمیز ہو جاتی ہے جماعت سے ایسے لوگوں کو پھینک دیا جاتا ہے ورنہ اگر آزمائش نہ ہو تو کھرے اور کھولے کا کوئی پتہ نہ چلے گا اور اس سے کھروں اور بچوں کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں اور جس غلطی کی وجہ سے آزمائش آئی آئندہ کے لئے ایسی غلطیوں سے بچنے کا اہتمام ہوتا ہے اور آزمائشوں کی وجہ سے بچوں کے کردار میں پختگی آ جاتی ہے ان کے اندر دکھ، درد، مال و دولت کے نقصان برداشت کرنے کی قوت بڑھ جاتی ہے پھر وہ اس طرح کی تکلیفوں وغیرہ سے گھبراتے نہیں وغیرہ لہذا جب بھی کوئی ایسی بات پیش آئے تو مایوس نہ ہوں اور نہ گھبرائیں بلکہ استقامت سے اپنے کام کو جاری رکھیں سابقہ خطاؤں پر ندامت اختیار کریں اور توبہ و استغفار کریں۔

قوت اور طاقت بڑھانے میں بے صبری سے بچیں اور اغیار اور بے دینوں کے تعاون سے کام کو ہرگز نہ چلائیں! قوت اور طاقت کے بڑھانے میں بے صبری سے پرہیز کریں اس باب کی بے صبری یہ ہے کہ قوت اور طاقت بڑھانے کے لئے ایسے اسباب کو اختیار کرنا جو تمہاری طاقت و قوت کو اپنے حق میں استعمال کریں جیسا کہ غیر اسلامی قوتوں سے امداد حاصل کرنا۔ لہذا اغیاروں، بے دینوں کے تعاون سے کام کو ہرگز نہ چلائیں اگر آپ نے ایسا کیا تو یہ آپ کی بے صبری اور جلد بازی ہوگی کہ آپ اپنے اور اپنی جماعت کے اندر قوت پیدا کرنے کا انتظار نہیں کرتے اور اسی وجہ سے دوسروں کا سہارا اور تعاون حاصل کر کے کام چلاتے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اس طرح جماعت جلد قوت پکڑے گی اور جلد ہی دشمنان حق سے لڑے اور مقابلہ کر سکے گی لیکن یہ آپ کی خام خیالی ہوگی یہ بے صبری ہے کیونکہ ایسی صورت میں آپ کو اسباب جنگ اور مال و دولت وغیرہ تو مل سکے گا لیکن اس کی وجہ سے ایک تو خود جماعت کے اندر قوت و استحکام پیدا نہ ہوگی اور نہ وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکے گی وہ ہمیشہ دوسروں کی بیساکھیوں پر چلے گی غیروں کے چندوں سے کام کو چلائے رکھے گی نیز اس طرح جماعت مقصد حق کے حصول سے رہ جائے گی اور اس کا انجام یہ ہوگا کہ اس جماعت کی وجہ سے کفر اور بے

دینی کو فروغ ہوگا۔

مسلمانوں کی افواج اور ان کی عسکری تنظیمیں اغیار کے کام آتی ہیں!

اس بات کو اچھی طرح جاننا چاہتے ہیں تو مسلمانوں کی فوج اور مسلمانوں کی عسکری تنظیموں کا حال دیکھیں اس میں کوئی شک نہیں کہ جس قوم میں ایمان و تقویٰ کے ساتھ عسکری ہو تو وہ قوم غالب ہوتی رہے گی لیکن آج کل مسلم حکومتوں کی افواج غیر مسلم حکومتوں سے تعاون مانگتی ہیں اور ان کے تحت اپنا فوجی فریضہ سرانجام دیتی ہیں نیز مسلمانوں کے اندر بہت سے درد مند دل ایسے ہیں جنہوں نے عسکری تنظیمیں بنائی ہیں لیکن وہ بھی انہی مسلم افواج سے تعاون حاصل کرتی ہیں اور ان کے ماتحت اپنی عسکری تنظیم کو منظم کرتی ہیں جو غیر مسلم حکومتوں کے سہارے جیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی افواج اور مسلمانوں کی نیک دل عسکری تنظیمیں دشمن کے کام آتی ہیں یہ جو ان مرد اور یہ بہادر ہر جگہ اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے ہیں لیکن ان کی بہادری سے غیر مسلم حکومتیں پھیلتی پھولتی ہیں۔

اغیار کی امداد کو زہر قاتل سمجھو!

غرض یہ کہ غیروں کی وفاداری کے وعدوں اور ان سے امداد حاصل کرنے کی قطعاً لالچ نہ کریں اغیار کی امداد کو ایسی مسلم افواج جو غیر مسلم حکومت کے سہارے جیتی ہو ان کی امداد کو جماعت حقہ اور احیائے دین کے لئے زہر قاتل سمجھیں، درختوں کے پتے کھائیں پیٹ پر پتھر باندھیں مگر غیروں کے سہارے نہ جئیں اگر تعاون حاصل کرنا ہو تو صرف نیک مسلمان افراد سے اور اپنی جماعت کے افراد سے تعاون حاصل کریں کبھی تمہارے دل مخلوق پر سہارا اور بھروسہ نہ کریں بھروسہ اور اعتماد صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت پر رہے، نماز و ذکر ریاضت اور صبر کے ہتھیار کو بنیادی ہتھیار قرار دیں اور انہی بنیادوں پر ایسے ہمدردانہ عادلانہ عسکری نظام کو بروئے کار لائیں جو صاف صاف قرآن مجید کے تابع ہو جو سب سے زیادہ انسانیت کے لئے نافع اور مفید ہو اور ہمیشہ اپنے آپ کو انسانیت کے لئے نفع کیلئے مفید ترین ثابت کرتا رہے اور کسی کا خون بلا سخت ضرورت کے نہ بہائے اور نہ جذباتی طور پر کوئی عاجلانہ اقدام کرے۔

بہت سی عسکری تنظیمیں خود اپنی جماعت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہیں!

اگر ایسا نظام قائم ہو تو منزل آپ کے سامنے ہوگی اسلام اور مسلمان اللہ تعالیٰ کی زمین پر غالب ہو کے رہیں گے ورنہ اگر اغیار کے سہارے جینا شروع کیا اور انہی بنیادوں پر عسکری تنظیمیں بنائیں تو یہ عسکری تنظیمیں خود



جماعت کے مسلمانوں کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیں گی اور ایسی تنظیمیں مسلمانوں کے بجائے غیروں کے کام آئیں گی اور مسلمان پہلے سے بھی زیادہ ٹکڑیوں اور ریاستوں میں تقسیم ہو کے رہ جائیں گے اور اسی طرح وہ دشمنان اسلام کے لئے پہلے سے زیادہ نوالہ تر بنیں گے اور وہ پہلے سے زیادہ مقدار میں مسلم قوم کے خون کو چوس کر پھلتے پھولتے رہیں گے۔ اگر آپ کا واقعہ آنکھ، کان، دل و دماغ موجود ہے تو ذرا عرب ممالک جو اسلام کا مرکز ہیں ان کی طرف نظر اٹھائیں تو مذکورہ بالا حقائق سورج سے زیادہ واضح ہو جائیں گے۔ جب انہوں نے ایمان و تقویٰ کی راہ میں کمزوری دکھائی نماز و ذکر اور صبر کے اہتمام کو چھوڑا اور آخرت کے بجائے دنیا کی طرف بڑھ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں کو ان پر اس طرح مسلط کیا کہ ان کو خبر بھی نہ رہی پھر خود انہیں مکر و فریب سے ان پر فوج کشی جاری رہی اور یہ نادان انہی انہیں پر اعتماد کرتے رہے اور ان سے امداد حاصل کرتے رہے جنہوں نے اپنے ہاتھوں یہ جنگیں اٹھائی تھیں جس کا نتیجہ یہی ہوا کہ وہ اپنی دجالیت مکر و فریب سے جزیرہ عرب میں داخل ہو گئے ہیں اور اب وہ حکمرانوں کے بعد عرب عوام کے ایمانی و اخلاقی اقتدار کو بھی لوٹ رہے ہیں اور اب جزیرہ عرب کے تمام مال و دولت اور ان تمام ذرائع آمدنی میں سے رس نکال کر خود ان سے اپنے قومی وجود کو بڑھا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح معنوں میں صبر اور شکر کرنے والا بنائے اور ایمان و تقویٰ کی راہ پر قائم و دائم رکھے۔ آمین

☆.....☆.....☆

### رحم اور ترس و مہربانی کا بیان!

رحم اور مخلوق پر ترس کھانا انسان کے بنیادی اخلاق میں سے ہے۔ 'رحمن' بے حد مہربان اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور صرف وہی 'رحمن' و رحیم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت 'رحمانیت' کا فیضان پوری کائنات پر ہو رہا ہے اور جس میں جس

قدر فیضان اور تجلی رحم اور مہربانی کی اپنے اندر جذب کرنے کی استعداد اور صلاحیت اور قوت ہے یا جو انسان اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی قدر اس میں رحم و مہربانی کے کام نظر آرہے ہیں اور یہ رحم صرف انسانوں میں نہیں بلکہ جانوروں میں بھی دکھائی دے رہا ہے اور بدترین سے بدترین جانور اور درندہ بھی اپنے بچوں پر رحم کرتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی صفت رحم کا فیضان ہے اور اس پوری کائنات کا وجود اور اس کا حسن و کمال اور بقاء سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مظاہر اور جلوے ہیں اور جس شخص میں اللہ تعالیٰ کی اس صفت رحم اور شفقت کا جتنا سکس پایا جاتا ہے وہ اتنا ہی مبارک ہے اور اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے رحم کا مستحق ہے اور جو جس قدر سخت دل اور بے رحم ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور احسان سے اسی قدر محروم اور دور ہے۔

### رحم کیا ہے؟

عربی میں رحم دل کی ایسی رقت اور نرمی کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے دوسروں کے لئے شفقت اور احسان کا ارادہ جوش میں آجائے اور اسی چیز کو ہم ترس اور مہربانی کہتے ہیں اور جس شخص میں یہ چیز پائی جاتی ہے اسے رحمدل کہتے ہیں اور جس کا دل اس صفت سے خالی ہو اس کو بے رحم اور سنگدل کہا جاتا ہے۔

### اسلام اور رحمدلی!

دین اسلام کی تعلیمات اور احکامات میں اگر نظر کی جائے تو ان میں دو قسم کی تعلیمات نمایاں طور پر نظر آجائیں گی۔ ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جوڑنے والے اور اس سے محبت اور اس کے تعظیمی احکام، جن کو حقوق اللہ کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم ہے اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی مخلوق پر مہربانی اور احسان کرنے کے احکامات، جن کو حقوق العباد کہتے ہیں۔ اور یہ دونوں باہم مربوط اور جڑے ہوئے ہیں۔ لہذا نماز، روزہ، حج، ذکر و اذکار وغیرہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق، تقویٰ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت بڑھانے کے احکام ہیں اور اس کا ثمرہ اور پھل اور نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی محبت میں اس کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اس کی مخلوق پر مہربانی کرے اور ان کے حقوق کی پوری ادائیگی کرے۔ مثلاً ماں باپ کو حکم ہے کہ وہ اولاد کے حقوق ادا کریں اور اولاد کو حکم ہے کہ والدین کے حقوق ادا کریں، حتیٰ کہ جانوروں پر ترس کھانے کی تعلیم اور ان کے حقوق بھی دین اسلام نے بتلائے ہیں۔ تو ان تمام حقوق کی ادائیگی کما حقہ اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ انسان کا دل رحم، مہربانی اور ترس کھانے کی صفت سے متصف ہو، ورنہ سنگدل شخص اپنا حق تو وصول کرنے میں پیش پیش ہوتا ہے لیکن حقوق کی ادائیگی سے وہ جی

چرائے گا اور یہ بھی یاد رہے کہ جو شخص حقوق العباد کی ادائیگی نہیں کرتا ہے اگرچہ وہ حقوق اللہ کے پورا کرنے میں پورا اہتمام دکھلاتا ہے تو اس شخص کے حقوق اللہ کے اس اہتمام میں ضرور کوئی کھوٹ اور دھوکہ ہے اور یہ صرف نمائشی دینداری ہے نہ کہ حقیقی دینداری۔

قرآن مجید، حدیث شریف میں رحم دلی اور مہربانی کی ترغیب و فضیلت اور سنگدلی کے بدنتائج! اب اس کی تفصیل اور مہربانی کی فضیلت اور سنگدلی کی مذمت میں قرآن مجید اور حدیث شریف سے کچھ پیش کرتے ہیں:

(۱) قرآن مجید کی سورتوں کی ابتداء میں ﴿بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾ لکھی گئی ہے، یہ اگر ایک طرف اس بات کا اشارہ دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مہربان ذات کے نام سے اور اس کے بھروسے پر کوئی کام شروع کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس پر رحم اور مہربانی فرمائے گا، کہ وہی انتہائی اور بے حد مہربان ہیں، نیز ان سورتوں میں جس قدر تعلیمات ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ انسان ہی کے فائدے کے لئے ہیں۔ تو دوسری طرف یہ ”بسم اللہ“ یہ اشارہ بھی دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مہربان ہیں تو اس کے بندے بھی مہربان ہونے چاہئیں۔ اگر آپ کسی کو کہتے ہیں کہ ”سختی کے بیٹے“ یا ”غیرت مند کے بیٹے“ تو اس جملے میں یہ ترغیب ہوتی ہے کہ ”تو بھی سخاوت کر“ اور ”تو بھی غیرت کر“۔ اسی طرح سورہ فاتحہ کی ابتداء تو دیکھ لیجئے، وہاں بھی ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ کے فوراً بعد ﴿الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ﴾ ہے، نیز قرآن مجید میں بعض مرتبہ جب اچھے بندوں کی صفت اور مدح بیان کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿عِبَادَ الرَّحْمَنِ﴾ یعنی ”رحمان کے بندے“۔ اس میں بھی یہی ترغیب ہے۔

(۲) نیز سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات پر نظر ڈالیں، اس میں ہے:

﴿الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ﴾

”جو غیب (کی حقیقتوں) پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے (اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر) خرچ کرتے ہیں“۔ (البقرہ: آیت ۳)

اللہ تعالیٰ کے مذکورہ بالا ارشاد میں نجات و فلاح کی جو راہ بتلائی گئی ہے وہ غیبی حقائق پر ایمان لانے کے بعد نماز کا حکم ہے، جس کا شمار حقوق اللہ میں ہوتا ہے اور جس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور محبت بڑھ جاتی ہے اور دوسرا حکم، یعنی (جو کچھ مال وغیرہ اللہ تعالیٰ نے دے دیا ہے، اس میں سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر خرچ کرتے ہیں) تو یہ حقوق العباد کے متعلق ہے اور مخلوق پر مہربانی کرنا ہے۔ زکوٰۃ کا حکم آیا ہے ان میں بھی اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کے

حق کی ادائیگی اور اللہ تعالیٰ سے تعلق بڑھانے کا حکم ہے تو دوسری طرف مخلوق پر مہربانی کا۔

(۳) ﴿وَإِذَا خَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَآئِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ ۖ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ﴾

”اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی بندگی نہیں کرنا اور ماں باپ سے احسان (اور اچھا سلوک کرنا)، نیز رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں سے بھی (اچھا سلوک اور مہربانی کرنا) اور لوگوں سے اچھی اور بھلی بات کہنا اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دے دینا“۔ (البقرہ: آیت ۸۳)

مذکورہ بالا آیت کریمہ میں دیکھیں، گزشتہ آسمانی کتابوں میں بھی ایک طرف اللہ تعالیٰ کی بندگی اور تعلق اور محبت بڑھانے والی چیز یعنی نماز وغیرہ کا حکم ہے دوسری طرف مخلوق الہی پر مہربانی اور اس کے ساتھ اچھے سلوک کا حکم ہے۔

(۴) ﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنُ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ﴾

”یہی نیکی نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کر لو یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی تو لوگوں کی راہ ہے جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر اور آسمانی کتابوں پر اور سب پیغمبروں پر ایمان لائے اور اسکی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ نیز نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں“۔ (سورۃ البقرہ: آیت ۱۷۷)

اس آیت کریمہ کی پوری کی پوری تشریح صداقت کے بیان میں گزر چکی ہے، اس آیت کریمہ میں غور کریں تو یہی معلوم ہوگا کہ سارا کمال یہ نہیں ہے کہ کوئی کس طرف منہ پھیر لے اور نماز پڑھے بلکہ اس کے ساتھ چند بنیادی چیزوں کی ضرورت ہے، وہ یہ غیبی حقائق پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ نماز وغیرہ جیسی عبادات کا اہتمام کیا جائے اور دوسرا حقوق العباد کی ادائیگی کرے، مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور ان پر ترس کھائے۔

(۵) ﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۖ آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُحْسِنِينَ ۖ

كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الْأَلْبِلِ مَا يَهْجَعُونَ ۖ وَلَا سَحَابٍ مِّنْهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ۖ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلْسَائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۖ

”متقی لوگ یقیناً جنتوں اور چشموں میں ہوں گے، ان کے رب نے جو عطا کیا ہوگا، وہ اس کو (خوش خوشی) لے رہے ہوں گے، وہ اس (دن) سے پہلے (دنیا کی زندگی میں) نیکو کار تھے، (وہ خوش بخت لوگ راتوں کو اللہ تعالیٰ

کے سامنے کھڑے ہو کر عبادت کرتے تھے اور) بہت کم سوتے تھے اور (پھر) آخری رات میں (اللہ تعالیٰ سے) معافی مانگا کرتے تھے اور ان کے مالوں میں سوال کرنے والے اور محروم لوگوں کا حق تھا (یعنی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مال و دولت میں صرف اپنے آپ اور اپنی اولاد کو حق دار نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے محتاج بندوں اور جو اس کی مدد کے محتاج ہوں، ان کو بھی وہ حق دار سمجھ کر ان پر مہربانی کرنے کا التزام کیا کرتے تھے)۔ (الذاریات: آیت ۱۹ تا ۲۵)

مذکورہ بالا آیات میں غور کریں تو یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگی کہ جنت کے مزے ان لوگوں کو ملیں گے جو ایک طرف حقوق اللہ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور محبت بڑھانے والی بدنی عبادات کا اہتمام کرتے ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی محبت میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر مہربانی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں۔

(۶) ﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرُونَ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ۖ عَيْنَايَا شَرِبُوا بِهَا عِبَادَ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا ۖ يُؤْفُونَ بِالْأَنْدَادِ وَيَجْأَفُونَ يَوْمًا كَانَ شَرْهُهُ مُسْتَطِيرًا ۖ وَيُطْعَمُونَ عَلَىٰ حَبِّهِ مَسْكِينًا وَتِيمًا وَسِيرًا ۖ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نَرْيَدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۖ﴾

”بے شک نیک لوگ (جنت میں) ایسی شراب کے جام پئیں گے جن میں کافور کی آمیزش ہوگی وہ ایک چشمہ ہے جس میں سے اللہ تعالیٰ کے بندے پئیں گے (اور جہاں جہاں چاہیں گے) اور اس چشمہ کو آسانی سے بہا کر لے جائیں گے (یہ وہ لوگ ہونگے) جو اپنی نذریں اور نیتیں پوری کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں اس دن سے کہ اسکی برائی پھیلی ہوئی ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں اور (اپنی زبان یا زبان حال سے) کہتے ہیں کہ ہم تو تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے کھلا رہے ہیں، ہم تم سے نہ تو بدلہ لینا چاہتے ہیں، نہ کسی طرح کی شکرگزاری (اور شاباش وغیرہ)۔“ (الدھر: آیت ۹ تا ۱۵)

یہاں دیکھئے ایک طرف اللہ تعالیٰ پر ایمان اور آخرت پر ایمان و یقین اور تعلق مع اللہ کا ذکر ہے، دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر مہربانی کا۔

جہنمیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

(۷) ﴿إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ۖ وَلَا يَحْضُ عَلَىٰ طَعَامِ الْمَسْكِينِ ۖ﴾

”اس لئے کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی جو عظمت والا ہے پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔“ (الحاقة: آیت ۳۳ تا ۳۴)

یہاں بھی جہنمی شخص کے جہنم میں پھینک دیئے جانے کی دو جوہات بتلائی گئی ہیں، ایک یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم ذات پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور دوسرا یہ کہ وہ صرف بخیل کنجوس ہی نہ تھا بلکہ اتنا سنگدل تھا کہ دوسروں کو بھوکے مسکین کے کھانا کھلانے اور مخلوق پر مہربانی کی ترغیب نہیں دیتا تھا۔

(۸) ﴿وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ۖ كَلَّا بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ۖ وَلَا تَحْضُونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمُسْكِينِ ۖ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا ۖ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝﴾

”اور جب اللہ تعالیٰ انسان کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے، میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کر دیا (ایسا) ہرگز نہیں۔ بلکہ (اس کی وجہ یہ کہ) تم یتیم کی عزت نہیں کرتے اور مسکین کے کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتے اور میراث کا مال سارا سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے بہت ہی محبت رکھتے ہو۔“ (الفجر: آیت ۱۶ تا ۲۰)

یہاں ذلت و رسوائی اور تنگی اور (دلی پریشانیوں) کی ایک وجہ یہ بھی بتلائی گئی ہے کہ یتیم اور مسکین کا اور دوسرے لوگوں کا حق مارا جائے اور مہربانی کی راہ چھوڑ کر بخل اور سنگدلی کی راہ جس میں سود، سٹہ، چوری، بخل وغیرہ سب داخل ہیں، اپنائی جائے۔

(۹) ﴿وَمَا أَذْرَكَ مَا الْعَقَبَةُ ۖ فَكُّ رَقَبَةٍ ۖ أَوْ اطْعَمَ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۖ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۖ أَوْ مَسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۖ ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝﴾

”اور کیا آپ (ﷺ) سمجھتے ہیں کہ وہ دشوار گزار گھاٹی (جس پر چل کر انسان حقیقی بلند یوں پر پہنچ جاتا ہے وہ کٹھن راستہ) کیا ہے؟ وہ کٹھن اور نجات و ترقی کی راہ (یہ ہے کہ) کسی کی گردن (کو غلامی سے) چھڑانا ہے یا بھوک کے دن میں کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا ہے پھر (اس کے ساتھ یہ کہ) ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے ہوں اور جو ایک دوسرے کو صبر کی وصیت اور نصیحت کرتے ہیں اور (اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر) رحم و مہربانی کرنے کی وصیت اور نصیحت کرتے ہیں۔“ (البلد: آیت ۱۲ تا ۱۷)

مذکورہ بالا آیات میں اس کٹھن راستے کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے جس میں انسان اپنے نفس کی خواہشات اور شیطان سے لڑ کر حقیقی بلند یوں اور بلند یوں سے مزید بلند یوں پر پہنچتا ہے اور یہی وہ راستہ ہے جو انسان کی کامیابی کا راستہ ہے اور یہی اس کے لئے شایان شان ہے اور اس راستے کا خلاصہ یہ کہ انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھے اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور اسکی رضا میں مخلوق الہی پر رحم و مہربانی کی راہ اپنالے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کی

ادائیگی کا پورا اہتمام کرے۔ نیز یہ کہ دوسروں کو بھی یہ وصیت اور نصیحت کرے کہ وہ پورے دین پر صبر و استقامت سے چلیں اور مخلوق پر مہربانی کرنے میں کوئی کوتاہی نہ کرے اور یہ بھی ایک قسم کی مخلوق الہی پر رحم و مہربانی ہے۔

(۱۰) ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۖ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنِيْسِرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ۖ وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۖ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۖ فَسَنِيْسِرُهُ لِّلْعُسْرَىٰ ۖ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ۖ﴾

”پس جس نے (اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی میں مال) دیا اور (اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے) ڈرتا رہا اور جس نے اچھی بات کی تصدیق کی تو ہم اس کو آہستہ آہستہ پہنچا دیں گے آسانی (یعنی جنت) میں اور جس نے بخل کیا اور بے پرواہ رہا تو اس کو آہستہ آہستہ پہنچا دیں گے سختی (انتہائی عذاب) میں اور کام نہ دیگا اس کو اس کا مال جب وہ گرے گا۔ (الیل: ۱۱-۵)

مذکورہ بالا آیت میں دو مختلف گروہوں کا بیان ہے، ایک گروہ وہ ہے جو فطرت کے مطابق چل کر حقیقی بلندیوں یعنی جنت تک پہنچ جاتا ہے اور جنتوں میں داخل ہو جاتا ہے اس گروہ کی صفات یہ ہیں۔ ایک بات یہ کہ بخل و سنگدلی کے بجائے سخاوت اور رحم دلی کی راہ کو اختیار اور حقوق العباد کی ادائیگی کا اہتمام کرتا رہتا ہے اور اپنے مال کو نیک اور اچھے کاموں پر خرچ کر دیتا ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی مدد کرتا رہتا ہے، دوسری بات یہ کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہو اور اس کی زندگی کے تمام اعمال پر وہ اثر انداز ہو۔ اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتا ہو اور کی رضا تلاش کرتا ہو۔ تیسری بات یہ کہ اچھی بات یعنی کلمہ اسلام یا کلمہ توحید جس کے اندر اللہ تعالیٰ کی پوری ہدایت اور تعلیمات سمٹ کر آ جاتے ہیں اور اس اچھی بات اور مع اس کے پوری تفصیلات کی تصدیق کرتا ہو۔ اور سچ مانتا ہو، تو یہ لوگ ایسی فطری راہ پر چل رہے ہیں جو اس کو حقیقی بلندی، کامیابیوں اور جنت میں پہنچا دے گی اور اسکے برعکس دوسرا گروہ وہ ہے جو سنگدلی اور زر پرستی میں پوری طرح مبتلا ہے اور اچھی بات کی تکذیب کرتا ہے اور پرہیزگاری کے بجائے اللہ تعالیٰ سے بے نیازی اور بے پروائی کی راہ کو اختیار کرتا ہے تو یہ لوگ ایسی راہ پر چلتے ہیں جو انسان کو ذلت و پستی اور جہنم کے گڑھوں میں پھینک دیتی ہے۔

(۱۱) ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۖ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۖ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۖ لَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوثُونَ ۖ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۖ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۖ﴾

”بربادی ہے کمی کرنے والوں کے لئے جب وہ لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب (لوگوں کو) ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو (ان کو) گھٹا کر دیتے ہیں، کیا ان لوگوں کو اس بات کا یقین نہیں ہے کہ وہ



ایک بڑے سخت دن میں زندہ کر کے اٹھائیں جائیں گے، جس روز تمام لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہونگے۔ (التطفیف: آیت ۶۱ تا ۶۲)

اپنا حق پورا پورا لینا اور لوگوں کا حق نقصان کے ساتھ ادا کرنا، یہ رحم کے خلاف اور سنگدلی ہے تو قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جو لوگ مخلوق پر مہربانی نہیں کرتے اور لوگوں کا حق پورا پورا ادا نہیں کرتے تو یہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور یہ عذاب کے مستحق ہونگے۔

(۱۲) ﴿أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۚ فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتِيمَ ۚ وَلَا يَحْصُ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۚ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ۚ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۚ الَّذِينَ هُمْ يُرَآءُونَ ۚ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۚ﴾

”کیا آپ (ﷺ) نے اس شخص کو دیکھا ہے جو دین کو جھٹلاتا ہے، پس وہ وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ تو ایسے نمازیوں کیلئے ہلاکت ہے جو اپنی نماز سے غافل ہیں، جو دکھلاوا کرتے ہیں۔ اور معمولی ضرورت کی چیزیں (مثلاً کلہاڑی، ہانڈی، جیسی استعمال کی چیزیں یا نمک وغیرہ جیسی چھوٹی چھوٹی چیز) بھی (لوگوں کو) نہیں دیتے ہیں۔“ (الماعون)

’دین‘ سے مراد دین اسلام بھی لیا جاسکتا ہے اور اس سے مراد روزِ جزاء اور قیامت بھی لیا جاسکتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ یتیموں، محتاجوں اور بے کسوں کی خبر نہ لینا اور ان پر رحم نہ کرنا اور مخلوق الہی پر رحم کے بجائے ان پر بے رحمی کرنا اور سنگدلی کا مظاہر کرنا دین اسلام یا روزِ آخرت کے جھٹلانے کا نتیجہ اور پھل ہے اور اس طرح کا بخل اور سنگدلی ان لوگوں کا شیوہ ہے جو دین اسلام یا روزِ آخرت کو نہیں مانتے ہیں۔ نیز اگر آدمی اپنے آپ کو نمازی سمجھتا ہے یا نمازی کہلاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا اس قدر تعلق اور محبت بھی نہیں جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر رحم اور ان کے ساتھ ہمدردی نہیں رکھتا تو ایسا شخص نماز کی حقیقت سے بہت دور ہے اس کو نماز کا پھل اور نتیجہ ہی نہیں مل سکتا اور اس کے نتیجے اور پھل سے بالکل ناواقف ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کے لئے سخت تنبیہ موجود ہے جو اسلام کے نام لیوا ہیں اور نمازی بھی ہیں، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اخلاص اور مخلوق کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ نہیں رکھتے اور اس قدر بخیل اور سنگدل ہوتے ہیں کہ وہ مخلوق پر چھوٹی چھوٹی مہربانیوں سے بھی گریز کرتے ہیں اور وہ مخلوق کی حقیر سی خدمت بھی نہیں کرتے تو ایسے نمازیوں اور نمازی کہلانے والوں کا حال بھی گویا ان بد بختوں کی طرح ہے جو دین اسلام یا قیامت

کے دن سے انکار کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی یہ چند آیات نمونے کے طور پر پیش کی گئیں ہیں ورنہ قرآن مجید ایسی آیات سے بھرا پڑا ہے جن سے مخلوق کے ساتھ ہمدردی اور ان سے رحم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور نکل و سنگدلی سے منع کیا گیا ہے۔ اب اسکے بعد بطور نمونہ چند احادیث شریفہ کو بھی پڑھ لیجئے۔

**رحم و ہمدردی کی فضیلت اور بے رحمی اور سنگدلی کے متعلق چند احادیث!**

(۱) حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(لَا يَرْحَمُ اللَّهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ)

یعنی ”اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا“۔ (بخاری و مسلم)

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، وہ فرماتے تھے:

(لَا تَنْزِعُ الرَّحْمَةُ الْإِمِنْ شَقِيٍّ)

”رحمت (یعنی اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر رحم و شفقت کرنے کا جذبہ) کو کسی کے دل سے نہیں نکالا جاتا مگر بد بخت

کے دل سے (یعنی کافر یا فاجر شخص ہی ایسا ہے کہ جس کا دل سخت ہوتا اور اس کا دل مخلوق الہی کے درد سے خالی ہوتا ہے)۔“ (احمد و ترمذی)

(۳) حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمَنُ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمُكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ)

یعنی ”رحم کرنے والوں اور دوسروں پر ترس کرنے والوں پر رحمت“ رحم کرتا ہے لہذا تم زمین پر بسنے والوں پر رحم

کرو تو آسمان والا تم پر رحم کریگا“۔ (ابوداؤد و ترمذی)

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(الْخَلْقُ عِيَالُ اللَّهِ وَأَحَبُّ الْخَلْقِ إِلَى اللَّهِ مَنْ أَحْسَنَ إِلَى عِيَالِهِ)

یعنی ”مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مخلوق میں بہترین وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے کنبہ (یعنی

مخلوق) کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے“۔ (بیہقی و مشکوٰۃ)

یہ چند احادیث بطور نمونہ بیان کی گئی ہیں، ورنہ احادیث میں مخلوق پر رحم و مہربانی کی جو فضیلت اور اس پر ظلم

کرنے کی جو مذمت آگئی ہے اس کیلئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے اور مخلوق پر رحم کرنے اور زمین پر بسنے والوں

میں انسانوں کے تمام طبقات تو شامل ہیں بلکہ اس میں انسانوں کے ساتھ جانور بھی شامل ہیں اور بہت سی احادیث میں صراحۃً جانوروں پر ترس کھانے کا حکم بھی فرمایا ہے۔ حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ نے یہ بات بتلا دی ہے کہ جانور مثلاً کتے وغیرہ پر رحم کرنے والا شخص اس رحم اور مہربانی کی وجہ سے جنت کا مستحق ہو گیا اور اس کے برعکس بلی پر ظلم کرنے والی عورت جہنمی بن گئی، جیسا کہ اس کا بیان ”جانوروں کے حقوق“ میں پاؤ گے۔

### مخلوق پر رحم اور اسکی خدمت کا جذبہ بہت ہی اعلیٰ ہے!

بلاشبہ جذبہ رحم اور شفقت بہت ہی اعلیٰ جذبہ ہے۔ کسی غمگین اور مصیبت زدہ کو پا کر دل میں رقت پیدا ہو جانا، اس کے لئے تڑپنا، کسی پریشان حال یا غریب و مسکین کو دیکھ کر اس پر ترس آجائے، اس کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آنا، اس کی مدد و تعاون کرنا اور بلاغرض مخلوق کی خدمت کرنا وغیرہ یہ سب کچھ اس جذبہ رحم کی وجہ سے ہوا کرتا ہے۔ یہی جذبہ انسان کو مخلوق خدا کی ایذا رسانی سے دور رکھتا ہے اور نفع رسانی پر انسان کو ابھارتا ہے۔ اور مخلوق الہی کے جس قدر حقوق بیان کئے جاتے ہیں اور قرآن و حدیث میں ان کی ادائیگی پر جس قدر انعامات کا وعدہ کیا گیا ہے یا سخاوت کے جس قدر فضائل آئے ہیں، یہ سب حقوق اور سخاوت و خدمت اسی جذبہ رحم کے استعمال کی تفصیلات ہیں اور اس کے برعکس مخلوق الہی اور حقوق العباد میں کوتاہی کرنے پر جس قدر عذاب کی وعیدیں بیان کی گئی ہیں وہ سب کچھ اسی جذبہ کے نہ ہونے کی وجہ سے ہیں جو مخلوق الہی کے ساتھ ظلم اور اس کے حقوق ادا نہ کرنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

### رحم کے آثار و پھل یا علامات!

جب انسان کے دل میں رحم اور مہربانی کا جذبہ ہوتا ہے تو وہ اس سے ہر عمل میں ظاہر ہوگا۔ مثلاً مسکینوں سے محبت و شفقت سے پیش آنا، ان کے ساتھ حسن و سلوک کرنا اور ان کو کھانا کھلانا اور ان کے فقر و فاقہ کو دور کرنے کیلئے حتیٰ الوسع کوشش کرنا، یتیموں کی شفقت و محبت کے ساتھ پرورش کرنا، اچھائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا، ظالم کو دباننا اور مجرموں کو سزا دے کر ان کو جرم سے باز رکھنے کی کوشش کرنا اور ان کے جرائم اور ایذا رسانیوں سے شریف لوگوں کی حفاظت کرنا اور مظلوموں کی مدد کرنا اور ہر قسم کے ظلم کو ختم کرنے اور رحم اور عدل و انصاف والا معاشرہ بنانے کے لئے جدوجہد کرنا، مسلمانوں کی باہمی ناچاقیوں کو ختم کر کے ان کے درمیان صلح کرانا، چھوٹوں پر شفقت کرنا، بڑوں کی عزت کرنا، اچھا سلوک کرنا، انسان تو کیا جانوروں پر بھی رحم، ترس کھانا اور جانوروں کے ذبح اور

مارنے میں بھی احسان و رحمت کا ظاہر ہونا۔ غرض یہ کہ جب انسان میں مہربانی آجاتی ہے اور جذبہ رحم اس کے اندر جڑ پکڑ لیتا ہے تو اس سے تمام مہربانی والے کام خود بخود صادر ہونے لگتے ہیں۔

### اللہ تعالیٰ کی صحیح اور کامل بندگی کب ہوگی؟

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ جب تک خدمت گزاری نہ ہو اور مخلوق پر رحم اور ترس نہ آتا ہو، اس وقت تک صحیح معنوں میں آدمی کے اندر بندگی نہیں پیدا ہوتی اور کوئی شخص اس وقت تک مخلوق کی خدمت سچائی کے ساتھ نہیں کر سکتا ہے جب تک کہ وہ متواضع اور منکسر المزاج نہ ہو۔ مخلوق کی خدمت تو وہی کر سکتا ہے جس میں ”انانیت“ اور خود پسندی نہ ہو اور وہ یہ سمجھے کہ میں ان سب سے کم رتبہ ہوں۔ میرا فرض ہے کہ میں ان کی خدمت کروں اور جس کا خیال یہ کہ ”انسا خیر منه“، یعنی میں اس سے بہتر ہوں، تو اس شیطان کے بھائی کو کیا ضرورت ہے کہ وہ دوسروں کو ایذا رسانی سے بچانے کے لئے اپنے آپ کو تکلیف میں مبتلا کرے۔ وہ تو کہے گا کہ میں سب سے بہتر ہوں سب کو چاہیے کہ وہ میری خدمت کریں۔ میں کسی کی خدمت کیوں کروں؟ غرض صحیح معنوں میں بندگی تب ہی ہو سکتی ہے جب انسان میں دو چیزیں آجائیں، ایک یہ کہ شعائر اللہ یعنی اوامر و احکامات و حدود اور تمام اشیاء جن کو اللہ تعالیٰ سے خصوصی نسبت ہو، ان سب کی تعظیم و احترام ہو جو صرف اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور عظمت دل پر چھائی ہوئی ہو۔ دوسری بنیاد یہ ہے کہ مخلوق خدا پر شفقت کرنا یعنی اس پر ترس کھانا، اس کی خدمت کرنا وغیرہ ہے اور یہ سب کچھ اس وقت ہو سکتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے لئے تواضع کا جذبہ ہو اور یہ ان دونوں بنیادوں کی اصل اور بنیاد اللہ تعالیٰ سے صحیح اور قوی تعلق ہے، جس کو یہ نعمت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ کامل درجہ کا مؤمن اور اعلیٰ درجہ کا بندہ بن جاتا ہے اور جس شخص کا جس قدر اللہ تعالیٰ سے صحیح اور قوی تعلق ہوگا وہ اسی قدر مخلوق الہی پر شفقت کرنے والا اور ترس کھانے والا ہوگا۔ جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں گزر چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کا عیال ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب اپنی مخلوق میں وہ آدمی ہے جو اللہ تعالیٰ کے عیال (یعنی اس کی مخلوق) کے ساتھ احسان اور اچھا برتاؤ کرنے والا ہو۔ (بیہقی و مشکوٰۃ)

### رحم اور خدمت گزاری کے فوائد!

خلاصہ یہ ہے کہ مخلوق پر ترس کھانے اور اس کی خدمت کرنے میں بہت بڑے بڑے فوائد ہیں اور شریعت میں اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے اور اس پر بہت اجر و ثواب کے وعدے ہیں، مخلوق خدا پر مہربانی، رحم و شفقت

کرنے اور لوگوں کی خدمت کرنے میں کچھ ایسی خاصیتیں ہیں جو اور کسی عبادت میں نہیں، اس سے نفس کی سرکشی ختم ہو جاتی ہے اور بڑائی اور گھمنڈ دماغ سے نکل جاتا ہے، عاجزی اور تواضع آ جاتی ہے، اچھے اخلاق، تہذیب اور آداب آ جاتے ہیں اور خدا کی خاص رحمت کے مستحق بس وہی نیک دل بندے ہوتے ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے لئے رحم و شفقت ہو۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ خدا تک پہنچنے کا بہتر اور نزدیک تر راستہ مخلوق خدا کو راحت اور آرام پہنچانے سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں ہے اور سنگدلی اور مخلوق پر ترس نہ کھانا ایک زبردست روحانی مرض ہے اور انسان کی بدبختی کی بہت بڑی نشانی ہے۔ وہ ان تمام فائدوں سے محروم رہتا ہے جو ایک رحم دل انسان کے لئے ہیں اور ایسے لوگوں کیلئے سخت عذاب ہوگا اور اللہ رحمن کی رحمت سے محروم رہیں گے۔

### رحم کی صورت میں دوسروں پر ظلم!

یاد رہے کہ احسان و رحم اس وقت سمجھا جائے گا جبکہ کسی پر رحم کرنے میں کسی دوسرے شخص یا قوم کا حق نہ مارا جائے، ورنہ بصورت دیگر یہ رحم ظلم اور خیانت وغیرہ ہوگا، اس کے لئے چند مثالیں پیش ہیں:

(۱) مثلاً مدرسہ کا ایک فقیر مدرس اور معلم اپنے درس کے کام کو صحیح طور پر انجام نہیں دیتا، نہ صحیح پڑھاتا ہے اور نہ اس سے طلباء کو کوئی فائدہ ہے تو یہاں بظاہر اگرچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ رحم کا تقاضا یہ ہے کہ اس فقیر مدرس کو برقرار رکھا جائے لیکن اس کو باقی رکھنے میں طلباء پر ظلم اور بے رحمی ہے اور ایسی صورت میں مدرسہ کے طلباء کا حق مارا جاتا ہے، لہذا یہاں فقیر مدرس کو ہٹانا صرف طلباء پر رحم نہیں بلکہ مدرسہ کے مال کو بے جا اور ناحق خرچ سے بچانا بھی ہے اور خیانت سے بھی بچنا ہے، اگرچہ فقیر بھی ضرور اچھے سلوک کا مستحق ہے مگر اس کی امداد مدرسہ سے نہیں، کسی دوسرے جائز طریقے سے کرنا چاہئے۔ اسی طرح کسی منصب اور عہدے پر کسی ایسے شخص کو فائز کرنا جو اس کا اہل نہ ہو۔ یہ اگرچہ ایک فرد کے حق میں قابل رحم سمجھا جاتا ہے لیکن دوسری طرف یہ اپنے قوم و ملک اور دوسرے لوگوں پر ایک عظیم ظلم اور بے رحمی اور ان کے ساتھ خیانت ہے۔

(۲) اگر کوئی ہوٹل کا مزدور کسی شخص کو مالک ہوٹل کی اجازت کے بغیر مفت کھانا کھلاتا ہے تو یہ بھی اگرچہ اس شخص پر تو رحم و احسان کرتا ہے لیکن احسان اور رحم کا یہ طریقہ غلط ہے کیونکہ دوسری طرف یہ مالک کا حق مارنا اور اس پر ظلم کرنا ہے اور اس کے مال و نوکری میں خیانت کرنا ہے، اگر یہ مزدور کسی پر احسان کرنا چاہتا ہے تو اپنے پاس سے کرایہ وغیرہ ادا کر کے اس کے ساتھ احسان کرے نہ کہ دوسروں کی ملکیت میں ناجائز اور ناحق تصرف کرے۔ اسی

طرح تمام نوکروں اور ملازموں کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ گاڑی یا کمپنی یا دکان وغیرہ میں سے کسی کے ساتھ ایسا احسان کریں جس کی مالک دکان وغیرہ نے اجازت نہیں دی ہے اگر وہ اس طرح کوئی بے جا احسان کرتا ہے تو یہ مالک دکان وغیرہ کے ساتھ ظلم اور خیانت ہے۔

(۳) جس شخص کا اعلانیہ جرم اسلامی عدالت میں ثابت ہو جائے، ایسے مجرم کو سزا دینا اگرچہ مجرم پر رحم سمجھا جاتا ہے لیکن ایسے جرم کو معاف کرنا پوری قوم کے حق کو مارنا ہے اور پوری قوم کو جرائم کا شکار بنانا ہے، تو ایسے اعلانیہ جرم میں رحم کا تقاضا یہ ہے کہ بجائے ایک فرد کے پوری قوم پر رحم کھایا جائے اور مجرموں کو سخت سزائیں دے کر قوم اور ملک کے مال و دولت و عزت اور آبرو کی حفاظت کی جائے۔

سانپ، بچھو وغیرہ کو مارنا یا غلاموں کا ہاتھ ظلم سے روکنا بھی مخلوق پر رحم ہی ہے! غرض یہ کہ خدمت اور رحمدلی کے مختلف مواقع ہوتے ہیں، کبھی کسی کو سزا دینا اس کے ساتھ ہمدردی سمجھی جاتی ہے جیسا کہ اولاد کو یا شاگرد وغیرہ کو مناسب ڈانٹا البتہ حد سے زیادہ ڈانٹ بے رحمی اور ظلم میں شمار ہوگا۔ یا کسی کو اس لئے سزا دینا کہ دوسرے لوگ اس کے شر اور تکلیف سے بچ جائیں جیسے چور، ڈاکوؤں اور اسی طرح دوسرے مجرموں کو سزا دینا، قاتلوں کو قصاص میں قتل کرنا۔ تو یہ عوام اور رعایا کے ساتھ رحم ہی کا تقاضا ہے اگر مجرموں کو سزا نہ دی جائے تو بے چارے عوام ظالموں کے مظالم اور مجرمین کے جرائم کا اور زیادہ نشانہ بنیں گے اسی طرح سانپ، بچھو جیسے موذی جانوروں کو مار ڈالنے کا حکم شریعت مطہرہ میں موجود ہے، یہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کے بندوں کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں کفار کے ساتھ لڑنا جھگڑنا بے رحمی نہیں ہے بلکہ انسانیت کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ اس سے قوانین جاہلیت کو مٹایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو بلند کیا جاتا ہے، حکم الہی کے نفاذ سے مظلوم انسانیت کی دادرسی ہوگی اور رشد و ہدایت کی حفاظت اور اس کو آگے بڑھانے کے لئے وہ رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں جو کہ دعوت حق اور نفاذ حق کی راہ میں حائل ہوں، اس کے متعلق مزید تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ جہاد کے بیان میں آئیگی۔

### مہربانی کی تعلیم اور مسلمانوں کی اکثریت!

افسوس یہ ہے کہ مخلوق پر مہربانی اور اس پر ترس کھانے کی جس قدر اہمیت دین اسلام میں ہے، مسلمان اس سے غافل ہو گئے ہیں، بلکہ بظاہر دیندار لوگ بھی مخلوق الہی کیساتھ رحم اور شفقت کا معاملہ نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کی

مخلوق کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں اور ان میں نقصان کرتے ہیں جس کی وجہ سے مسلم قوم بحیثیت مجموعی ذلت اور پریشانیوں میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے اور ہمارے دلوں کو رحم سے بھر دے اور حقوق العباد کو پوری طرح ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

اب اس کے بعد سنگدلی اور بے رحمی کے علاج کو ذکر کیا جاتا ہے، اس کو بھی پڑھ لیجئے۔

### بے رحمی اور سنگدلی کا علاج!

(۱) مخلوق خداوندی کے ساتھ ہر قسم کی خیر خواہی کا اور اس کو ہر قسم کی سہولت پہنچانے اور انکی خدمت کرنے کا تکلف سے اہتمام کریں، البتہ خدمات مختلف ہیں اور استعداد اور قوتیں بھی مختلف ہوتی ہیں اور ضرورتیں بھی۔ اس لئے جو جائز خدمت اور جو جائز ضرورت آپ سے کسی دوسرے کی پوری ہو سکے اور جس قدر ہو سکے اسکو سرانجام دینے کی کوشش کریں، مثلاً آپ کو معلوم ہوا کہ فلاں جگہ ایک ایسا شخص رہتا ہے جو بہت غربت اور مسکنت میں وقت گزارتا ہے، لیکن کسی سے سوال نہ کرنے کی وجہ سے کسی کو اس کے حال کی خبر نہیں ہے تو اس کی غربت اور مسکنت دور کئے بغیر نہ چھوڑیں۔ یا تو خود اس کی مدد کریں اور اگر آپ خود بھی کمزور ہیں اور اسکی پوری خبر نہیں لے سکتے تو جتنا آپ سے ہو سکے وہ تو ضرور کریں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی اس کے حال سے خبردار کریں اسی طرح اگر کوئی محتاج، بے کس شخص ہے یا بیمار ہے تو اس کی یہ بھی خدمت ہے کہ اس کو علاج کے لئے کچھ رقم دی جائے اور یہ بھی خدمت ہے کہ اسے حکیم یا ڈاکٹر کے ہاں پہنچایا جائے اور یہ بھی خدمت ہے کہ اس کے ساتھ لگ جائے، پانی وغیرہ جس چیز کی ضرورت ہو وہ دیا کرے۔ حکیم یا ڈاکٹر کے لئے اس کی خدمت یہ کہ وہ اس کا علاج خیر خواہی سے کریں اور جس قدر ہو سکے، اس کے ساتھ تعاون کریں۔ غرض یہ کہ جس شخص کی قدرت میں جس قسم کی خدمت ہو، وہ اس خدمت کو کرنے میں دریغ نہ کرے۔ اگر کسی محتاج، مصیبت زدہ کی کچھ بھی خدمت کرنی آپ کے بس میں نہیں تو اس کے لئے دعا کرنا بھی اس کے ساتھ تعاون ہوگا۔ تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ یا اللہ! آپ ہی اپنے اس بندے پر رحم فرمائیں اور اس سے اس مصیبت کو رفع فرمادیں وغیرہ۔

لوگوں کی خدمت بیمار پرسی، خبر گیری وغیرہ بہ تکلف کریں، رفتہ رفتہ خدمت کی عادت پڑ جائیگی، اسی طرح دوسرے پر رحمہلی کے کام بہ تکلف کیا کریں تو دل میں رحم آ جائیگا۔ مثلاً یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرنا، ان پر شفقت کرنا، کسی محتاج کی رفع احتیاج کرنا، مساکین کو کھانا کھلانا، جو جذبہ رحم کے آثار ہیں۔ تو یہی اعمال اگر بہ تکلف کر لئے جائیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس کے کرنے والے کے دل میں رحم کی یہ کیفیات پیدا ہو جائیگی۔ اسی طرح کوئی بھی



کیفیت یا نیک جذبہ اگر پیدا کرنا ہو تو اس کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اس جذبے کے جو آثار و نتائج ہوں ان کو وہ بہ تکلف اختیار کر لے تو ان شاء اللہ تعالیٰ کچھ عرصہ بعد وہ جذبہ یا وہ کیفیت پیدا ہو جائیگی۔ جیسا کہ اس کا بیان پہلے بھی گزر چکا ہے اور یہی علاج نبی کریم ﷺ نے بھی بتلایا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے اپنی سنگدلی کی شکایت کی اور اس کا علاج پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

(امْسَحْ رَأْسَ الْيَتِيمِ وَأَطْعِمِ الْمِسْكِينَ)

”یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا کرو اور مسکین کو کھانا کھلایا کرو“۔ (مسند احمد)

یعنی مہربانی کے کاموں کو اپناؤ تو مہربانی دل میں جڑ پکڑ لے گی۔

(۲) حقوق العباد کی ادائیگی یعنی جو حقوق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے بتلائے ہیں، ان کو ٹھیک ٹھیک پورا

کرنے کا خوب اہتمام کریں، کسی کا حق نہ چھوٹنے پائے اور حقوق العباد کا بیان اسی کتاب میں موجود ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ سے رحم دلی اور مخلوق کی خدمت گزاری کی دعا کرنا اور جو مہربانی کا کام کرے تو اس پر فخر نہ

کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ مہربانی کا کام کرنے کی توفیق دی۔

کسی پر شفقت اور اس کی خدمت کے شرائط و آداب!

(۱) جو کام مخلوق کی فائدہ رسانی کے لئے کریں، اسے نیک دلی اور ہنسی خوشی کریں۔

(۲) خدمت میں کوئی دنیاوی غرض نہ ہو، نہ کسی پر احسان ہو اور نہ اس میں خود نمائی اور ریا ہو۔

(۳) جس کی خدمت کرنی ہو، اس کی طبیعت کے جائز رجحان کے مطابق ہو، مثلاً اگر اس کو کچھ پیش کرنا ہو تو

اس کی طبیعت و مزاج اور اس کی ضرورت کو مد نظر رکھیں، اس کا مزاج معلوم کریں یا اگر وہ بیمار ہے یا تھکا ہوا ہے، اس کو

آرام پہنچانے کے لئے دبانا ہو تو بھی اس کا مزاج معلوم کریں، غرض کسی کے ساتھ ہمدردی اور اس پر شفقت اور

اس کی خدمت ایسی کرنی چاہئے کہ اس سے وہ خوش ہو جائے اور اس کو فائدہ ہو اور اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔

(۴) مخلوق کی خدمت اور اس پر ترس کھانے والے کاموں کی انجام دہی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں اور جو

کوئی کوتاہی ہو جائے، اس پر پشیمان ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لیں۔ اگر کبھی خدمت اور رحم دلی کے

کام کے انجام دینے میں کسی کو ایذا یا نقصان پہنچے تو اس سے معافی مانگیں، معذرت کریں اور جو نقصان ہوا ہو اس کا

تاوان بھی دیں۔ البتہ اگر وہ معاف کر دے اور تاوان نہ مانگے تو ان کا اس اچھے برتاؤ پر شکریہ ادا کریں۔

(۵) مخلوق پر شفقت اور اس پر ترس کھانے اور خدمت کرنے والے کاموں کو سیکھیں، تاکہ صحیح طرح خدمت

کر سکیں اور بعض امور ایسے بھی ہیں کہ جن کو کوئی مخلوق کی خدمت سمجھتا ہے، لیکن وہ دنیا یا آخرت میں نقصان پہنچانے والے ہوتے ہیں، جیسا کہ کوئی کسی کی خدمت منشیات پلانے سے کر دے یا مثلاً کسی خطرناک مجرم کو سزا دیئے بغیر چھوڑ دے یا کسی یقینی بدعتی ملحد کی تکریم و تعظیم کی، جس کی وجہ سے دوسرے عوام اس کے دام تزویر اور بدعت میں پھنس جائیں، تو اس طرح کی خدمت کے بجالانے میں شریعتِ مطہرہ کی طرف رجوع کیا جائیگا اور اس کے بعض احکام اسی کتاب میں آچکے ہیں، ان کو ملاحظہ کیجئے۔

☆.....☆.....☆

سچائی اور امانتداری کا بیان!

صدق کسے کہتے ہیں؟

صدق، قول و عمل میں مطابقت کو کہتے ہیں اور صدیق عربی زبان و عمل میں سچائی ظاہر باطن اور راستبازی میں

درجہ کمال تک پہنچنے کے لئے مستعمل ہے یعنی سچ اور سچائی کا ایسا خوراک اور پیکر کہ اس سے جھوٹ کا امکان ہی نہ ہو۔

### جھوٹ کسے کہتے ہیں؟

جھوٹ صدق اور صداقت کی ضد ہے یعنی جھوٹ قول اور عمل میں عدم مطابقت کو کہتے ہیں، یعنی جو قول خلاف واقعہ ہو تو اسے جھوٹ کہا جاتا ہے اور جو عمل اندرون کے مطابق نہ ہو، اس کو جھوٹا عمل یا عملی جھوٹ کہا جاتا ہے، اس میں عہد و پیمان کی ضد، عذر، عہد شکنی وعدہ خلافی اور امانت کی ضد خیانت بھی شامل ہیں۔

### امانت داری کسے کہتے ہیں اور خیانت کسے؟

ہر وہ ذمہ داری جو کسی پر بھروسہ کر کے اس کے سپرد کی جائے یا بالفاظ دیگر ہر وہ ذمہ داری جو انسان اپنے ذمہ لے لیتا ہے، وہ اس کے پاس امانت ہے اور اس کو ٹھیک ٹھیک جوں کا توں ادا کرنا امانت داری ہے اور خیانت بالکل اس کی ضد ہے یعنی کسی کے حق کو ادا نہ کرنا یا ادا تو کرنا مگر ایمان داری سے ادا نہ کرنا بلکہ اس میں کوتاہی یا نقصان کر کے ادا کرنا یہ خیانت ہے۔

### وعدہ اور عہد و پیمان کسے کہتے ہیں؟

وعدہ اور عہد کے معنی قول و اقرار کرنے کے ہیں کہ مثلاً کوئی دوسرے کے ساتھ یہ اقرار کرے کہ میں فلاں وقت آؤں گا یا تمہارا فلاں کام کروں گا یا فلاں چیز دوں گا وغیرہ وغیرہ اگر وعدہ اور عہد دو طرفہ ہو جاتا ہے، مثلاً دو آدمی یا دو جماعتیں ایک دوسرے کے ساتھ یہ عہد کریں کہ فلاں کام کریں گے یا نہیں کریں گے، تو اسے معاہدہ کہتے ہیں۔

### جھوٹ اور خیانت کی تفصیل اور اس کی مذمت!

تمام رذائل اور برے اخلاق میں سے بدترین اور مذموم چیز جھوٹ ہے، خواہ یہ جھوٹ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر کیا جائے، کیونکہ انسان کے سارے اختیاری افعال اور اعمال پر اعتماد اور بھروسہ اس بنیاد پر کیا جاتا ہے، کہ اس کے افعال اعمال اس کے اندرون اور واقعہ کے مطابق ہوں اور جھوٹ ٹھیک اس کی ضد ہے، اس لئے جھوٹ ہی ہر قسم کی قوی اور عملی برائیوں کی بنیاد اور سرچشمہ ہے، کیونکہ انسان کی اندر کی بات تو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی یقینی طور پر نہیں جانتا، ایک شخص دوسرے شخص کے متعلق اگر جان سکتا ہے یا باور کر سکتا ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے قول اور عمل سے اسے ظاہر کر دے، اب اگر وہ اپنا اندر صحیح واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر ظاہر نہیں کرتا بلکہ اپنے قول یا عمل سے اس کے خلاف ظاہر کر رہا ہے۔ تو ایسی صورت میں وہ لوگوں کو فریب اور دھوکہ

میں مبتلا کرتا ہے جھوٹ اور خیانت کی خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو دوسرے جرائم اور خباثتوں پر آمادہ کرتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ منافقین کے متعلق فرماتے ہیں:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ۝ يُخَدِّعُونَ اللَّهَ وَالدِّينَ  
آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۝ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ  
بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ﴾ (بقرہ: آیت ۸ تا ۱۰)

”اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ (تعالیٰ) اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ ایمان دار نہیں (اپنے زعم میں اللہ تعالیٰ) اور ایمانداروں کو دھوکہ دیتے ہیں حالانکہ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں اور نہیں سمجھتے، ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر (ان کے برے کړتوت یعنی جھوٹ وغیرہ کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری بڑھادی اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔“

بلاشبہ کفر و نفاق کا جرم سب سے بڑا جرم ہے، مگر یہاں دردناک عذاب کا مستحق جھوٹ بولنے کو قرار دیا گیا، تو اس آیت کریمہ میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہی جھوٹ اصل جرم تھا جس نے بالآخر ان کو کفر و نفاق تک پہنچا دیا اور یہی جھوٹ وہ مرض اور خباثت ہے، جو تمام برائیوں کی جڑ اور بنیاد بن سکتا ہے اس لئے قرآن مجید میں جھوٹ کی گندگی کو بت پرستی کی گندگی کے ساتھ ملا کر دونوں سے سخت پرہیز کے تعلیم دیدی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ﴾

”بت پرستی کی نجاست سے بچو اور جھوٹ سے بچو۔“

بلکہ یہی جھوٹ کی بری خصلت ہے جو بالآخر انسان کے ضمیر کو ختم کر کے اسے راکھ بنا دیتی ہے اور جب ضمیر مرجاتا ہے تو حق کی قبولیت کی استعداد اور صلاحیت باقی نہیں رہتی جس کی وجہ سے پھر وہ حق اور ہدایت کی روشنی کو پانے سے محروم رہ جاتا ہے اور اس پر حق اور ہدایت کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ كَاذِبٌ كَفَّارٌ﴾ (زمر: آیت ۳)

”بے شک اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں کرتا جو جھوٹا ناشکر گزار ہو۔“

حضرت صفوان بن سلیم کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا مومن بزدل ہو سکتا ہے آپ ﷺ نے

فرمایا ”ہاں ہو سکتا ہے“ پھر آپ سے پوچھا گیا کہ مؤمن بخیل ہو سکتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا ”ہاں ہو سکتا ہے“ پھر آپ سے پوچھا گیا کہ مؤمن جھوٹا ہو سکتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا ”لا“ (نہیں ہو سکتا)۔“ (مشکوٰۃ: حفظ اللسان)

نیز حضرت ابو امامہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(يَطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَى الْخِلَالِ كُلِّهَا إِلَّا الْخِيَانَةَ وَالْكَذِبَ) (مشکوٰۃ: باب حفظ اللسان)

”مؤمن جھوٹ اور خیانت کے سوا ہر خصلت پر پیدا کیا جاسکتا ہے۔“

ایمان امانت سے مشتق ہے جو خیانت کی ضد ہے اس لئے ایمان اور خیانت جمع نہیں ہو سکتے اسی طرح دروغ گوئی کی عادت نفاق کا شعبہ ہے، ایمان یک رخ کا طالب ہے اس لئے درخا پن اسلام و ایمان کے ساتھ بن نہیں سکتا اس لئے مؤمن نہ خیانت کا عادی ہو سکتا ہے اور نہ دروغ گوئی کا، تو حدیث کا مطلب یہی ہے کہ جھوٹ اور خیانت کے سوا دوسری برائیاں کمزوریاں مؤمن میں ہو سکتی ہیں لیکن جھوٹ اور خیانت جیسی خالص منافقانہ عادتیں اس میں نہیں ہو سکتیں اور نہ یہ ایمان کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں۔

### جھوٹ کی اقسام اور صورتیں!

(۱) جب یہ بات معلوم ہو چکی کہ جو کچھ زبان سے کہا جائے یا عمل سے اس کا اظہار کیا جائے اگر وہ واقعہ اور اندرونی یقین کے مطابق نہ ہو تو یہ جھوٹ ہے، خلاف واقعہ بات اگر اندرونی یقین و علم کے مطابق ہے تو اس کو اصطلاح میں خطاء اور غلط کہتے ہیں اور عربی زبان میں اس کے لئے خطاء بھی مستعمل ہے اور اس کیلئے ”کذب“ ”جھوٹ“ کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں یہ اگرچہ اندرونی یقین کے مطابق ہے لیکن خلاف واقعہ ہونے کی وجہ سے اس کو خطاء یا نادانستہ جھوٹ کہا جاتا ہے اور اسی کو اردو زبان میں غلط کہا جاتا ہے۔ مثلاً مسجد میں سہیل کا بھائی زید آیا لیکن اس کو صادق نے سمجھا کہ یہ تو ”سہیل“ ہے اب صادق سے کوئی پوچھے کہ مسجد میں کون آیا ہے تو وہ کہہ دے کہ ”سہیل“ جب وہ دوسرے شخص مثلاً ”عادل“ سے پوچھتا ہے کہ صادق کہتا ہے کہ مسجد میں ”سہیل“ آیا ہے کہ یہ ٹھیک کہتا ہے تو وہ اس کے جواب میں یہ کہے گا کہ نہیں اس کو مغالطہ لگا ہے، بلکہ وہ سہیل کا بھائی ”زید“ ہے۔

اور اہل عرب یہاں بھی ”کذب“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اس کی مثالیں صحابہ کرامؓ کی باتوں میں ملتی ہیں کہ ان کو کسی نے کہا کہ فلاں صحابی نے تو فلاں بات کے متعلق یہ کہا ہے تو اس نے جواب میں کہا کہ ”کذب فلاں“ (یعنی فلاں سے خطا ہو گئی ہے) حالانکہ یہ بات ایسی نہیں تھی بلکہ ایسی تھی تو یہاں بات خلاف واقعہ تو ہے لیکن

صادق کے اندرونی یقین اور گمان کے خلاف نہ تھی بلکہ وہ یہی سمجھتا تھا کہ یہ سہیل ہے نہ کہ زید اور اس صورت میں اس کے دل و زبان میں تو ہم آہنگی ہے لیکن اس کی بات خلاف واقعہ ہونے کی وجہ سے غلط ہے۔ اگر خلاف واقعہ بات قصداً کی جائے یا کوئی عمل قصداً ایسا کیا جو اس کے اندرون کے مخالف ہے تو یہ سب جھوٹ ہے مثلاً زید نے سلیم کو کہا کہ آپ نے فلاں کام کیا ہے اس نے کہا ہاں حالانکہ اس نے وہ کام نہیں کیا تھا یا مثلاً کسی نے کہا کہ میں نے پہلے روز کا چاند دیکھا ہے حالانکہ اس نے دیکھا نہیں یا ایک شخص نے دوسرے شخص کے متعلق کہتا ہے کہ فلاں نے یہ نامناسب کام کیا ہے حالانکہ وہ اس بات کو سمجھتا ہے کہ اس نے نہیں کیا ہے، لیکن وہ اس پر جھوٹ باندھتا ہے یا کوئی زبان سے کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں حالانکہ وہ اسلام کو دل سے سچا اور حق مذہب ماننے میں متردد ہے یا نہیں مانتا پس عمل سے جس بات کا اظہار کیا جائے زبان سے جس بات کو کہا جائے اور وہ قول و عمل اس کے اندرون علم کے خلاف ہو تو یہ سب جھوٹ ہے لیکن بعض دفعہ جھوٹ کی شدت اور نوعیت ایسی ہوتی ہے کہ اس کا نام بدل جاتا ہے یا اس کے ساتھ دوسری صفت کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسا کہ جھوٹی شہادت، جھوٹی قسم، افتراء اور تہمت باندھنا (یعنی کسی پر جھوٹا الزام لگانا اور جھوٹ باندھنا) یا چغل خوری، وعدہ خلافی، امانت میں خیانت یہ ساری جھوٹ کی اقسام ہیں اب اختصار کے ساتھ ان کے متعلق قرآن مجید اور احادیث شریفہ سے کچھ ملاحظہ کیجئے۔

### زبانی اور بے ضرر جھوٹ کی مذمت اور بدبو و نجاست!

جھوٹ ایسی گندگی اور نجاست ہے کہ اگر کوئی خوش طبعی اور لوگوں کو ہنسانے کے لئے بھی جھوٹ بولتا ہے تو اس بے ضرر جھوٹ کی بھی حدیثوں میں سخت مذمت آئی ہے۔ چنانچہ حضرت یحییٰ بن حکیم اپنے دادا کے واسطے سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(وَيْلٌ لِّمَنْ يُحَدِّثُ فَيَكْذِبُ لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ وَيَلُّ لَّهُ وَيَلُّ لَّهُ) (امام احمد، ترمذی)

”یعنی افسوس اور ہلاکت ہو اس شخص پر جو بات کرے تو جھوٹ اس لئے بولے تاکہ اس سے لوگوں کو ہنسانے، افسوس اس شخص پر، افسوس اس شخص پر۔“

دیکھئے خوش گپی کے موقع پر محض لوگوں کو خوش کرنے کے لئے جو جھوٹ بولا جاتا ہے جس سے بظاہر کسی کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچتا ہے اس جھوٹ کی اس قدر مذمت آئی ہے تو ضرور وہ اور نقصان پہنچانے والی غلط بیانی اور جھوٹ کی گندگی کا حال کیا ہوگا، نیز حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(إِذَا كَذَبَ الْعَبْدُ تَبَاعَدَ عَنَّا الْمَلَكُ مِثْلَ مَنْ نَتْنٍ مَا جَاءَ بِهِ) (ترمذی، مشکوٰۃ: باب حفظ اللسان)

”جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے ایک میل دور چلا جاتا ہے۔“  
جس طرح مادی چیزوں کی تلخی و شیرینی اور بدبو ہوا کرتی ہے اسی طرح باتوں اور اعمال میں بھی تلخی و شیرینی خوشبو اور بدبو ہوتی ہے اور خوشبو، بدبو وغیرہ روحانیت کے عالم میں محسوسات میں سے ہیں اس لئے اس کو فرشتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے بعض صاحب روحانیت بندے بھی اسی طرح محسوس کرتے ہیں، جس طرح عام لوگ پھلوں، پھولوں وغیرہ کی خوشبو یا گندگی کی بدبو کو محسوس کرتے ہیں۔

### جھوٹ بولنا سخت خیانت ہے!

حضرت سفیان بن اسید حضری رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے میں نے یہ فرماتے ہوئے سنا:  
(كَبُرَتْ خِيَانَةٌ أَنْ تُحَدِّثَ أَخَاكَ حَدِيثًا وَهُوَ لَكَ بِهِ مُصَدِّقٌ وَأَنْتَ بِهِ كَاذِبٌ) (ابوداؤد مشکوٰۃ)  
”یعنی یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تم (مسلمان) بھائی کو کوئی بات بیان کرو اور وہ تم کو اس میں سچا جانے، جبکہ حقیقت میں تم نے اس سے جھوٹ بولا ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ جھوٹ تو گناہ ہی ہے مگر بعض صورتیں اس کی بہت ہی سنگین ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ ایک شخص تم پر اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے اور تمہیں بالکل سچا سمجھتا ہے اور تم اس کے اعتبار اور حسن ظن سے فائدہ اٹھا کر اس سے جھوٹ بولو۔

### بلا تحقیق سنی سنائی بات پھیلانا بھی جھوٹ ہے!

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان سچ، جھوٹ جو کچھ بھی سنے اس کو بلا تحقیق دوسروں سے کہتا پھرے، ایسا شخص جھوٹ کو پھیلانے کے جرم کے ساتھ لوگوں میں اسی طرح بے اعتبار ہو جاتا ہے جس طرح جان بوجھ کر جھوٹ بولنے والا شخص قابل اعتبار نہیں رہتا۔ نبی کریم ﷺ نے انسان کے اس فعل کو بھی جھوٹ بتلایا دیا ہے چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

(كَفَى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يَحْدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ) (مسلم)

”آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے (بلا تحقیق) کہتا پھرے۔“

### جھوٹی گواہی کی مذمت!

حضرت خریم بن فاتک رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن صبح کی نماز پڑھی جب اس سے فارغ



ہو گئے تو یکدم کھڑے ہو گئے اور فرمایا: (عَدَلْتُ شَهَادَةَ الزُّوْرِ بِالْأَشْرَافِ بِاللَّهِ تِلْكَ مَرَاتٍ ثُمَّ قَرَأَ ﴿فَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنْفَاءَ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ﴾) (ابوداؤد وابن ماجہ)

”جھوٹی گواہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک قرار دینے کے برابر کر دی گئی۔“ یہ بات آپ ﷺ نے تین بار (مکرر) ارشاد فرمائی اور پھر قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿فَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنْفَاءَ لِلَّهِ غَيْرَ مُشْرِكِينَ بِهِ﴾

”یعنی بتوں کی گندگی سے بچو، اور جھوٹی بات کہنے سے بچتے رہو صرف اللہ تعالیٰ کے ہو کر کسی کو اس کے شریک نہ کرتے ہوئے۔“

### جھوٹی قسمیں کھانا!

قسم کھانا حقیقت میں گواہی ہے جو آدمی کسی بات پر اللہ تعالیٰ کی قسم کھاتا ہے تو ہو دراصل اپنے بیان کی سچائی پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا دیتا ہے اور جب کسی بات یا معاملہ پر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہہ دیا جائے اور وہ خلاف واقعہ ہو، تو اس کے سنگینی کا حال کیا ہوگا، جبکہ قسم کے بغیر جھوٹ کی گندگی ہے اور اس کی بدبو اس قدر سخت ہے کہ اس سے فرشتے دور تک بھاگتے ہیں اب اس پر مرتب ہونے والے نتائج روحانی لحاظ سے اور آخرت کے اعتبار سے کس قدر گھناؤنے اور ذلیل کن ہوں گے۔ منافقوں کا حال بتلا کر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ۝﴾ (مجادلہ: آیت ۱۶)

”انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے، پس وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں تو ان کے لئے ذلیل کن عذاب ہے۔“

جھوٹی قسم کھا کر کسی دوسرے کے مال پر دعویٰ کرنے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يَكْلِمُهُمُ

اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يَزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝﴾ (آل عمران آیت ۷۷)

”بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اقرار اور اپنی قسموں پر (دنیا کا) حقیر معاوضہ لیتے ہیں آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں نہ اللہ تعالیٰ ان سے کلام کرے گا اور نہ ان کی طرف (نظر عنایت سے) دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(ثَلَاثَةٌ لَا يَكِلُ اللَّهُ إِلَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ قَالَ أَبُو ذَرٍّ خَابُوا وَخَسِرُوا بِمَنْ هُمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ الْمُسِبِلُ وَالْمَنَّانُ وَلَمْ يَنْفِقْ سِلْعَتَهُ بِالْحَلِفِ الْكَاذِبِ) (مسلم مشکوٰۃ باب المساهلة فى المعاملة)

”تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان پر نظر عنایت فرمائے گا اور نہ ان کو گناہ اور گندگیوں سے پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے حضرت ابو ذر غفاری ؓ نے عرض کیا، یہ لوگ تو نامراد ہوئے اور خسارے میں پڑے یا رسول اللہ یہ تین کون کون ہیں؟ آپ ؐ نے فرمایا: اپنا تہبند (متکبروں اور مغروروں کی طرح) حد سے نیچے لٹکانے والا اور احسان جتانے والا اور جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا سودا چلانے والا“

اور حضرت ابوامامہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا:

(مَنْ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِئٍ يَمِينِهِ فَقَدْ آوَجَبَ اللَّهُ لَهُ النَّارَ وَحَرَّمَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ وَإِنْ كَانَ شَيْئًا يَسِيرًا يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ وَإِنْ كَانَ قَضِيًّا مِنْ أَرَاكِ) (مسلمو مشکوٰۃ: باب الاقضية ولشهادات)

”جس شخص نے (عدالت میں) قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق ناجائز طور سے حاصل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کے لئے دوزخ کی آگ واجب کر دی ہے اور جنت کو اس پر حرام کر دیا ہے۔ (اہل مجلس میں سے) کسی شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اگرچہ وہ کوئی معمولی چیز ہو (پھر بھی یہی عذاب اور سزا ہوگی) آپ ؐ نے فرمایا اگرچہ پیلو کی ٹہنی ہی ہو (لیکن قسم کھا کر ناجائز طور سے حاصل کی ہو تو اس کے لئے یہی عذاب ہے)۔

بہتان اور کسی پر جھوٹ باندھ کر تہمت لگانے کی مذمت!

سب سے خطرناک جھوٹ وہ ہے جس سے لوگوں کے حقوق اور عزت و آبرو کو نقصان پہنچے اور اس سے معاشرتی نظام میں خلل پڑ جائے، یہ جھوٹ عام جھوٹ سے زیادہ سخت ہے اور اس سختی کی وجہ سے اس کا نام بدل دیا جاتا ہے اور اس کو ”بہتان“ (یعنی جھوٹی تہمت) کہا جاتا ہے، بلکہ بعض بہتان اور تہمتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہوتا بلکہ صرف شرارت کی وجہ سے کسی بے گناہ آدمی پر اس لئے تھوپنی جاتی ہیں تاکہ بدنام ہو جائے، قرآن مجید نے اس کا نام ”افک“ رکھ دیا ہے، دونوں یعنی بہتان اور افک جھوٹ ہونے کے علاوہ درجہ شرافت اور انسانیت سے گزرے ہوئے ہیں اور اس کا گناہ اور جرم اس قدر شدید ہے کہ جو لوگ جان بوجھ کر یا بغیر جانے بوجھے اس بہتان کے پھیلانے میں شریک ہو جاتے ہیں، تو وہ بھی گنہگار ہو جاتے ہیں۔

﴿وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بَغَيْرِ مَا كَتَبْنَا لَهُمْ مِنْ آيَاتِنَا﴾ (احزاب: ۵۸)  
 ”اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بغیر ان کے کسی گناہ کے (ان پر غلط الزام اور تہمت و جھوٹ باندھ کر اس کی وجہ سے ان کو) تکلیف دیتے ہیں (اور دل دکھاتے ہیں) تو وہ بہتان اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لیتے ہیں۔“

اور ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغُفْلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لَعُنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾  
 (نور آیت ۲۳)

”جو لوگ پاک دامن بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے اور ان کے لئے عظیم عذاب ہے۔“

**بہتان اور تہمت کا پھیلانا بھی ممنوع ہے!**

کسی مسلمان کے متعلق بری بات سن کر اس کو دوسروں تک بلا تحقیق آگے بڑھانا ممنوع ہے، ایسی بات کے متعلق قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمانوں کو دوسرے مسلمان بھائیوں کے معاملہ حسن ظن رکھنا چاہئے۔ ایک پاکیزہ مسلمان کے متعلق بری بات سن کر اس کی تردید کریں اور بلا تحقیق اس کو مانیں ہی نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ایسی بات کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

﴿وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَذَا أَفْكٌ مُّبِينٌ﴾ (نور: آیت ۱۲)  
 ”جب تم نے یہ (بری) بات سنی تھی تو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ نیک گمان کیوں نہ کیا اور یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ تو صریح بہتان ہے۔“  
 اور ایسی باتوں کے متعلق تعلیم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿إِذَا تَلَفَّظْتُمْ بِالْإِسْنَتِ كُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُمْ مَا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسِبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمٌ﴾ وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ بِهَذَا قُلْ صَبْرٌ عَلَيْكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ﴿يَعْظُمُ اللَّهُ﴾  
 (نور: آیت ۱۵ تا ۱۷)

”یعنی جب تم یہ (بے اصل) بات ایک دوسرے سے نقل کرنے لگے اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہنے لگے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا اور تم اسے ایک ہلکی اور معمولی بات سمجھتے تھے (کہ ہم نے جیسے سنا ویسے بلا تحقیق

دوسروں کو نقل کیا) حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی ہی سخت بات تھی (یعنی بہت بڑا گناہ تھا کہ بلا تحقیق ایسی بات کو چلایا جس سے دوسرے مسلمان کو تکلیف پہنچی) اور تم نے جب ایسی (بے اصل) بات سنی تو کیوں نہ (فوراً) بول اُٹھے کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا لائق نہیں، سبحان اللہ یہ تو ایک عظیم بہتان ہے اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر تم مومن ہو پھر کبھی ایسا نہ کرنا کہ بلا تحقیق اور علم لوگوں میں کسی غلط بات کو پھیلاؤ۔

مذکورہ بالا آیتوں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اور جب تک کسی معاملے کے متعلق پکا ثبوت نہ مل جائے اس وقت تک ہر مسلمان کو بے گناہ سمجھنا چاہئے اور جب تک کسی گناہ اور جرم کی دلیل معقول نہ مل جائے اس وقت تک کسی پر جرم اور گناہ کا الزام نہ لگایا جائے اور جب تک کسی کے متعلق کسی جرم اور گناہ کا پورا ثبوت مہیا نہ ہو اس وقت تک اس الزام کا دوسرے کو نقل کرنا نہیں چاہئے بلکہ اس کا انکار کرنا چاہئے اور یہ کہہ دینا چاہئے کہ ایسی بلا دلیل بات تو ہمارے لئے زبان سے نکالنا بھی لائق اور جائز نہیں یہ تو ایک بہت بڑی تہمت ہے کیونکہ ایک آدمی کا مسلمان ہونا خود بخود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اسلام کے حدود کا خیال رکھے گا اور گناہوں سے مکمل پرہیز کرتا ہوگا، ایک شخص کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی بات کافی ہے کہ اس نے بغیر کسی معقول شبہ اور دلیل کے ایک مسلمان پر بلا وجہ ایک گناہ کا الزام لگایا۔

### جھوٹا وعدہ یا وعدہ خلافی!

وعدہ خلافی یعنی زبان دے کر اس کے خلاف کرنا بہت بڑا گناہ جھوٹ اور خیانت ہے، ایفائے عہد اور وعدہ کو پورا کرنا یعنی زبان اور عمل کی ہم آہنگی کا نام سچائی ہے اور اس کی ضد اور مخالف کا نام عذر، دھوکا اور فریب ہے ایفائے عہد انسانیت کے مخصوص فرائض میں بہت بڑا فرض ہے اور جو شخص اپنے وعدہ اور عہد و پیمان کا لحاظ نہیں رکھتا، وہ درحقیقت شرف انسانیت سے محروم ہوتا ہے، ایفائے عہد اور وعدہ کو پورا کرنے کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کی عظیم خوبیوں اور خصوصیات میں اس کو بھی شمار کیا ہے چنانچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق قرآن میں ارشاد ہے:

﴿وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا﴾ (مریم: ۵۴)

”اور قرآن مجید میں (حضرت) اسماعیل (علیہ السلام) کا ذکر بھی کر بلاشبہ وہ وعدہ کا سچا تھا اور (اللہ تعالیٰ کا)

رسول و نبی تھا۔“

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا﴾ (اسراء: آیت ۳۴)

یعنی ”اپنے عہد کو پورا کرو بے شک عہد کی باز پرس ہوگی۔“

بلکہ اس طرح کے معاملات میں غیر جانبدارانہ رویہ بھی جائز نہیں ہے کہ آدمی اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر اس کو نظر انداز کرے کہ دوسرا مسلمان بھائی بدنام ہو رہا ہے مجھے اس مسئلے سے کیا سروکار بلکہ حتی الامکان اپنے مسلمان بھائی کی مدافعت کرنی چاہئے کیونکہ ہر مسلمان پر اپنے دوسرے مسلمان بھائی کی عزت اور آبرو کی حفاظت کرنا فرض ہے۔ ایک طرف قرآن و سنت کی تعلیم و ہدایت کو سامنے رکھیں دوسری طرف اپنے معاشرہ کو تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہمارا عمل بالکل بالکل قرآن و سنت کے برعکس جارہا ہے دوسری پارٹیوں اور لوگوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے والی افواہیں پھیلانا آج کل ایک مستقل فن اور ایک نہایت کامیاب پیشہ بن گیا ہے۔

اس عہد میں ہر قسم کے عہد و پیمان شامل ہیں اس میں وہ عہد و پیمان بھی شامل ہیں جو ہمارے رب نے ہماری فطرت سے عالم غیب میں لئے ہیں اور اس میں وہ بھی داخل ہیں جو اس نے اپنے نبیوں کے واسطے اپنی شریعت کی شکل میں ہم سے لئے ہیں اس میں وہ وعدے اور معاہدے بھی شامل ہیں جو ہم ایک دوسرے سے زبانی اقرار یا تحریر وغیرہ کی شکل میں کرتے ہیں اور وہ بھی عہد اور وعدے اس میں شامل ہیں جو بغیر کسی تحریر و اقرار کے معاشرے میں عرفاً اور عادتاً عہد مانے اور جانے جاتے ہیں (اس کی ایک مثال نبی کریم ﷺ کی طرف سے وہ بلا تحریر و اقرار معاہدے ہیں جو آپ ﷺ نے کیے اور آپ ﷺ نے انکو پورا فرمایا) ان تمام وعدے اور عہد و پیمان کے بارے میں قیامت میں باز پرس ہوگی، اور ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ (مائدہ: آیت ۱)

”اے ایمان والو! اپنے عہدوں کو پورا کرو۔“

یہاں ہر قسم کے ایقائے عہد مراد ہیں خواہ وہ خالق و مالک اللہ رب العالمین اور بندوں کے درمیان ہوں یا بندوں کے آپس میں ہوں خواہ ان کا تعلق دینی امور سے ہو یا دنیاوی معاملات سے ہو سب اس میں شامل ہیں سب کی پابندی کا ہمیں حکم دیا گیا ہے البتہ وہ وعدہ جس کے پورا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہے وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

عہد اور معاہدہ کیا ہوتا ہے؟

ان آیات کریمہ کا مطلب واضح ہے البتہ اس میں عہد کا لفظ بھی آیا ہے۔ جسے مسلمان کا امتیازی صفت

بتلایا گیا ہے۔ اس کی اسی قدر تشریح مناسب سمجھتا ہوں۔ عہد کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ معاہدہ ہے جو دو طرف سے کسی کام اور معاملہ کے سلسلہ میں قرار پائے۔ اس کا پورا کرنا فرض اور اس کے خلاف کرنا عذر اور دھوکہ ہے اور اس کی دوسری قسم وہ ہے۔ جسے وعدہ کہتے ہیں۔ مثلاً کسی سے کہے کہ میں تمہارا فلاں کام کروں گا یا تمہارے پاس آؤں گا۔ یا کوئی چیز دوں گا یا فلاں جگہ دونوں ملیں گے وغیرہ اسکا پورا کرنا بھی شرعاً لازم ہے۔ بلا عذر شرعی کے اس کے خلاف کرنا سخت گناہ ہے۔

### معاہدہ اور وعدہ میں فرق!

لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی قسم کے پورا کرنے پر دوسرا آدمی اس کو بذریعہ عدالت بھی مجبور کر سکتا ہے اور وعدہ پورا کرنے کے لئے کسی کو بذریعہ عدالت مجبور نہیں کیا جاسکتا البتہ دیاۃً اور شرعاً اس کا پورا کرنا بلا عذر شرعی ضروری ہے۔

### وعدہ خلافی اور عہد شکنی کا عذاب!

عہد شکنی کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ ۵۰ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاِيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ لَا خَلٰقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿ (سورہ آل عمران: آیت ۷۶ تا ۷۷)

یعنی ”ہاں کیوں نہیں؟ جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور پرہیزگار بن گیا۔ تو بے شک (وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بنے گا کیونکہ) اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے۔ بلاشبہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنی قسموں کو ایک حقیر قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، اُن کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف (نظر عنایت سے) دیکھے گا اور نہ انہیں (گناہوں کی آلودگیوں سے) پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔“

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عہد اور قسموں کو قیمت پر فروخت کرنا تو باعث دردناک عذاب ہے اور اگر کوئی منہ مانگے دام دے تو بیچنا جائز ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلے میں بہت عارضی اور حقیر ہے لہذا کسی قیمت پر بھی اللہ تعالیٰ کے عہد اور قسموں کو مت بیچو کیونکہ دنیا کے سارے خزانے بھی اس کے مقابلہ میں حقیر

ترین معاوضہ ہیں۔ عہد اللہ سے مراد کتاب و شریعت ہے اس لئے کہ کتاب و شریعت کی حیثیت اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان معاہدے کی ہوتی ہے ایمان سے مراد وہ عام عہد و پیمان ہیں جن پر اجتماعی زندگی کی بنیاد ہوتی ہے اور جن سے معاشرتی زندگی اور معاملات میں اعتماد اور حسن ظن کی خوشحال اور پر امن فضا بنتی ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اس کی پوری فرمانبرداری کر کے اس کی عائد کردہ حدود اور حقوق کی پوری رعایت کرتے ہیں اور بندوں کے اندر زندگی گزارتے ہوئے ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہیں تو ایسے لوگ متقی اور پرہیزگار ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ایسے پرہیزگاروں سے محبت رکھتے ہیں اور ان کو دوست رکھتے ہیں اس کے برعکس جو شخص نفسانی خواہشات دنیا کے حقیر مفادات و لذات مال و عزت و منصب وغیرہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عہد اور اس کے عائد کردہ حقوق اور حدود کو نظر انداز کرتا ہے تو یہ شخص دنیا اور آخرت میں ذلیل و رسوا ہوگا اور عذاب کا مستحق ہوگا۔

### قیامت کے دن عہد شکن لوگوں کی عظیم رسوائی!

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(إِنَّ الْغَادِرَ يُنْصَبُ لَهُ لَوَاءٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُقَالُ هَذِهِ غَدْرَةُ فُلَانٍ بْنِ فُلَانٍ) (صحیح بخاری، صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

”کہ قیامت کے دن عہد توڑنے والے (کی رسوائی کے لئے) ایک نشان کھڑا کیا جائے گا اور کہا جائے

گا کہ فلاں بن فلاں کی عہد شکنی کی علامت ہے۔“

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن

ہر عہد شکن کے لئے ایک نشان ہوگا۔ جس کے ذریعے وہ پہچانا جائے گا کہ یہ عہد شکن اور دھوکہ باز ہے۔ (دیکھئے صحیح بخاری، صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے

دن پر عہد شکن کی (ذلت اور رسوائی) کے لئے اس کے سرین کے ساتھ ایک نشان ہوگا۔ جو اس کے عہد شکنی کے

بقدر بلند کیا جائے گا (یعنی اس کی جتنی زیادہ عہد شکنی ہوگی۔ اس قدر وہ نشان اور اس کی تشہیر زیادہ ہوگی) اور رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خبردار کوئی عہد شکن عہد شکنی کے اعتبار سے امیر عام (یعنی حکمران وقت) سے زیادہ نہیں

(یعنی حکمران کی عہد شکنی سب سے بڑی عہد شکنی ہے)۔ (صحیح مسلم، مشکوٰۃ)



### بدعہدی نفاق پیدا کرتی ہے!

قرآن مجید یہ بتلاتا ہے کہ بدعہدی نفاق پیدا کرتی ہے چنانچہ منافقوں کے سلسلہ میں ارشاد ہے کہ:

﴿فَاعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِم إِلَى يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ﴾ (توبہ: آیت ۷۷)

یعنی ”نتیجہ یہ ہوا کہ اس دن تک کہ جس دن اللہ تعالیٰ سے ملیں گے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں نفاق

پیدا کر دیا اس لئے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کر کے خلاف کیا اس لئے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔“

اور نبی کریم ﷺ نے منافق کی جو نشانیاں بتلائی ہیں ان میں ایک نشانی یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ وعدہ کر کے اسے

پورا نہیں کرتا ہے۔

### ایفائے عہد اور وعدہ کی عملی تعلیم!

نبی کریم ﷺ کے عمل کو دیکھ کر ایفائے عہد اور وعدہ کی اہمیت کو سمجھ لیجئے چنانچہ حضرت عبداللہ بن ابی الحساء

کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے مبعوث ہونے سے پہلے میں نے آپ ﷺ سے (کسی چیز کو) خرید اور اس کے کچھ

حصہ کی ادائیگی مجھ پر باقی رہ گئی اور میں نے کہا کہ آپ یہاں تشریف رکھیں میں ابھی حاضر ہوتا ہوں لیکن مجھے اپنے

کاموں نے ایسا مشغول کر لیا کہ میں آپ کے معاملہ کو بالکل بھول گیا، تین روز کے بعد جب یاد آیا تو بقیہ مال لے

کر وہاں حاضر ہوا تو دیکھا آپ اس جگہ تین روز سے میرے انتظار میں بیٹھے ہیں، مجھے دیکھ کر ارشاد فرمایا (لقد

شفقت علیّ انا هلنما مذللت انتظرك) یعنی ”تم نے مجھے (وفائے عہد کی) زحمت اور محنت میں ڈال رکھا ہے

اور میں تین روز سے یہیں تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں۔“ (ابوداؤد، مشکوٰۃ: باب حفظ اللسان)

آپ ﷺ کا اتنے طویل انتظار کی مشقت کو برداشت کرنا صرف اس احساس کے تحت تھا کہ اس نے کہا ہے کہ میں

ابھی یہاں آتا ہوں، تو جب تک وہ یہاں نہ آئے اس وقت تک اس کا انتظار کرنا چاہئے کیونکہ جب وہ آئے گا اور مجھے نہ

پائے گا تو وہ مشقت اور پریشانی میں مبتلا ہو جائے گا لہذا نبی کریم ﷺ کا اس قدر طویل انتظار اپنی بقایا چیز وصول کرنے کے

لئے نہیں تھا بلکہ صرف اس لئے تھا کہ جب عبداللہ بن ابی الحساء نے پہلے آنے کا وعدہ کیا تو ان کے وعدہ کے مقابلے

میں گویا آپ کی طرف سے بھی یہ وعدہ تھا کہ وہ اس کے آنے تک مقرر جگہ پر انتظار فرمائیں گے۔

وعدہ خلافی اور بدعہدی بہت ہی بری عادت ہے بلکہ شریعت مطہرہ میں تو ایفائے عہد اور سچائی کو اس قدر

اہمیت حاصل ہے کہ بچوں کے معاملہ میں بھی اس سے پرہیز کی ترغیب دیدی گئی ہے چنانچہ عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا

بیان ہے کہ میں چھوٹا تھا ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر میں تشریف فرما تھے میری والدہ نے مجھے پکارا اور کہا آج میں تجھے کچھ دوں گی تو رسول اللہ ﷺ نے میری والدہ سے فرمایا تم نے اس کو کیا چیز دینے کا ارادہ کیا ہے؟ میری ماں نے عرض کیا میں نے اس کو کھجور دینے کا ارادہ کیا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یاد رکھو کہ اگر تم اس وقت اس بچے کو چیز نہ دیتیں تو تمہارے نامہ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ: باب الوعد)

بچوں کے بہلانے کے لئے جھوٹا وعدہ اور جھوٹ معمولی بات سمجھی جاتی ہے لیکن آپ ﷺ نے بتلایا کہ یہ بھی جھوٹ ہے اور زبان کو کسی طرح جھوٹ سے آلودہ نہیں کرنا چاہئے اس کے علاوہ اس میں اولاد کے اخلاق پر بھی بہت اثر ہوتا ہے ماں باپ اگر بچوں کے سامنے جھوٹ بولیں گے اگرچہ اس کا قصد صرف بہلاوا ہی ہو پھر بھی بچے جھوٹ بولنا سیکھیں گے اور جھوٹ بولنے میں کوئی قباحیت نہ سمجھیں گے یہی حال دوسری بد اخلاقیوں کا ہے بچوں کے سامنے گالیاں دینا یا بچوں کو گالیاں دینا یا ان کے سامنے دوسری بری حرکت کرنا بچوں میں بد اخلاقی پیدا کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔

**وعدہ پورا کرنا واجب ہے بشرطیکہ خلاف شریعت نہ ہو!**

خلاصہ یہ کہ ایفائے عہد اور وعدے کو پورا کرنا اسلامی اخلاق و آداب کا ایک بنیادی تقاضا ہے اور اس کے برخلاف وعدہ خلافی بد عہدی ایک بہت بڑا عیب ہے جو شخص اپنے وعدہ اور عہد کو پورا نہ کرے وہ اسلام اور معاشرہ دونوں کی نظر میں سخت ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ لہذا جو وعدے اور معاہدے شریعت مطہرہ کے خلاف نہ ہوں ان کو پورا کرنا واجب اور ضروری ہے اور جو شریعت کے خلاف ہوں ان کا فریق ثانی کو اطلاع کر کے ختم کرنا واجب اور لازم ہے۔

**امانت کی ضد خیانت کا بیان!**

امانت کی ضد خیانت ہے اور خیانت بھی جھوٹ کی ایک عملی قسم ہے، کیونکہ جس شخص کے پاس کوئی امانت رکھی جاتی ہے یا اسے کوئی ذمہ داری سپرد کی جاتی ہے، تو اس پر اعتماد اور بھروسہ کی بناء پر سپرد کی جاتی ہے ذمہ داری اٹھانے والا شخص اپنے آپ کو قابل اعتماد باور کراتا ہے، تو دوسرا اس پر اعتماد، بھروسہ کر کے اس کو کوئی ذمہ داری سپرد کر دیتا ہے، تو جب یہ شخص اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا ہے یا پورا کرنے میں کمی اور کوتاہی کرتا ہے تو یہ اپنے عمل سے اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو جس قدر قابل اعتماد ظاہر کیا تھا، وہ اس میں پورا جھوٹا یا ایک گونہ جھوٹا نکلا۔

**امانت کیا ہے اور خیانت کیا؟**

جو شخص اعتماد دلا کر کسی چیز کی ذمہ داری کو اٹھالیتا ہے تو وہ اس کے پاس امانت ہے اگر وہ اس ذمہ داری کو کما حقہ پورا کرتا ہے، تو ایسا شخص ”امین“ یعنی ”امانتدار“ کہلاتا ہے اگر وہ اس کو پورا نہیں کرتا ہے یا کسی قدر نقصان کے ساتھ پورا کرتا ہے تو پہلی صورت میں پوری خیانت کا اور دوسری صورت میں قدر خیانت کا مرتکب ہو کر ”خائن“ ”خیانت کرنے والا“ کہلاتا ہے۔

”امانت“ اور اس کی ضد ”خیانت“ کا مفہوم اس معنی کے لحاظ سے بہت وسیع ہے اس میں اللہ تعالیٰ کے حقوق اور بندوں کے وہ حقوق جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر واجب ہوتے ہیں، یا جو بھی ذمہ داری انسان اپنے ذمہ لے لیتا ہے خواہ وہ مالی ہو یا قانونی یا اخلاقی ہو سب کی سب امانت میں شامل ہے، امانت کے اس معنی کے لحاظ سے شریعت مطہرہ کی تمام تفصیلات سمٹ کر اسی کے اندر آ جاتی ہیں لہذا عبادات میں امانتداری یہ ہے کہ ان کو صحیح وقت میں شرائط و آداب اور پابندی کے ساتھ ادا کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں امانتداری یہ ہے کہ ان کو جوں کا توں ٹھیک ادا کیا جائے اگر کسی کا کوئی حق قرض وغیرہ آپ پر باقی ہے یا آپ کے پاس کوئی چیز امانت رکھی ہے تو اس کا جوں کا توں دے دینا بھی امانت ہے کسی کا کوئی بھید اور راز آپ کو معلوم ہے تو اس کو (بغیر شرعی ضرورت کے) نہ فاش کرنا اور اس کو چھپانا بھی امانت ہے آپ نے اگر کسی مجلس میں کوئی بات راز کی سن لی یا کسی کے متعلق کوئی بات سن لی تو اس کو اسی مجلس تک محدود رکھنا بھی امانت ہے، کسی نے آپ سے کوئی مشورہ مانگا تو اس کو صحیح مشورہ دینا اور اس کو اپنے تک ہی محدود رکھنا بھی امانت ہے، جس شخص پر منصب اور عہدہ کی تقسیم کی ذمہ داری ہو تو اس کو اس منصب اور عہدے کو اہل کے حوالے کرنا بھی امانت ہے اگر کسی کے پاس نوکری کرنی ہے تو اس کو نوکری کے شرائط کے مطابق انجام دینا بھی امانت ہے اور نوکری اور مزدوری میں بلاوجہ سستی کرنا یا دیر سے کام پر آنا یا وقت پورا ہونے سے پہلے چلا جانا اسی طرح کی کوتاہیاں کرنا بھی امانت کے خلاف ہیں، اسی طرح کسی بھی ذمہ داری میں کوئی کوتاہی یا کمی کرنا امانت کے خلاف ہے۔

مثلاً دو آدمیوں کے درمیان کوئی فیصلہ کرنا ہے تو عدل کے ترازو کو تمام تر مخالف رجحانات کے باوجود برابر رکھنا امانتداری ہے اور اس کے خلاف کرنا خیانت ہے اسی طرح حکومت کے عہدوں پر تقرر کے لئے رشتہ داری کنبہ پروری اور دوست نوازی کے بجائے صرف اہلیت اور قابلیت کو معیار قرار دینا امانت داری ہے اور اس کے خلاف کرنا خیانت ہے مثلاً کسی حاکم ذمہ داری کو یہ خوب معلوم ہے کہ زید کو جو یہ فلاں عہدہ دے رہا ہے اس سے زیادہ اس عہدے کا حقدار بکر ہے تو ایسی صورت میں یہ حاکم زید کو عہدہ دے کر امانت میں خیانت کا مرتکب ہوگا، جیسا کہ

قرآن مجید اور حدیثوں میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے اب اس کے متعلق قرآن مجید اور حدیث شریف میں سے کچھ نقل کیا جاتا ہے۔

### ادائے امانت کا حکم!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾ (نساء: آیت ۵۸)

”بے شک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں کو ادا کیا کرو۔“

امانت کا لفظ یہاں محدود مفہوم میں نہیں ہے بلکہ ہر ذمہ داری امانت ہے اور اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنا ضروری ہے اور تمام حقوق و فرائض خواہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہوں یا حقوق العباد سے، انفرادی نوعیت، کے ہوں یا اجتماعی نوعیت کے اپنوں سے متعلق ہوں یا بے گانوں سے متعلق ہوں مالی معاملات کی شکل میں ہوں یا حکومتی اور سیاسی معاہدات کی شکل میں ہوں غرض جس نوعیت اور جس درجے کے حقوق و فرائض ہوں وہ سب امانت کے مفہوم میں داخل ہیں اور ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنا اور تمام حقوق و فرائض کو پورا ادا کرنا ضروری ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ نماز امانت ہے وضوء امانت ہے وزن اور پیمانہ امانت ہے۔ (دیکھئے ترغیب و ترہیب: ج ۴ ص ۵)

خلاصہ یہ کہ جو شخص جس چیز کا حقدار ہو اس کے حق کا اعتراف کرو اور جو چیز جس کو ملنی چاہئے وہ اس کے سپرد کرو، اللہ تعالیٰ کے حقوق کو ادا کرو اور آنکھ کان زبان وغیرہ تمام چیزیں امانت ہیں ان کا غلط استعمال نہ کریں ماں باپ کے حقوق ہیں رشتہ داروں کے حقوق ہیں یتیموں اور مسکینوں کے حقوق ہیں قرض دار کا حق ہو امانت کی کوئی ذمہ داری سر پر آئی ہو قابلیت اور اہلیت رکھنے والے کے لئے منصب اور عہدہ کا تقرری کا حق ہو غرض جو جس کا حق ہے اور جو جس چیز کا اہل ہے وہ اس کے حوالے کر دیں۔

پوری شریعت اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور اس میں کوتاہی خیانت ہے!

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ پوری شریعت اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت ہے اور اس میں کوتاہی کرنا

خیانت ہے نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ

وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ (انفال: آیت ۲۷-۲۸)

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول سے خیانت (یعنی نافرمانی اور بے وفائی) نہ کرو اور اپنی آپس کی امانتوں (یعنی ایک دوسرے کے حقوق اور اپنی ذمہ داریوں) میں خیانت نہ کرو حالانکہ تم جانتے ہو اور جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک امتحان کی چیز ہے (جن کی وجہ سے انسان کو پرکھا جاتا ہے) اور یہ (بھی) جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے پاس (اس آزمائش اور امتحان میں پاس ہونے والوں کے لئے) اجر عظیم ہے۔“

﴿وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ﴾ یہ جملہ ﴿لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ﴾ کے تحت ہی ہے لیکن صرف نبی کا اعادہ نہیں فرمایا جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ سے خیانت اور بے وفائی ہی ایک ایسی چیز ہے جو امانتوں اور ذمہ داریوں میں خیانت کی راہ کو کھول دیتی ہے، اس کے بعد ﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا آمَنَوا لَكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ میں خیانت کی اصل وجہ بتا دیا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت و اطاعت میں کمزور ہوتے ہیں اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی اور امانتوں میں اپنی ذمہ داریوں میں خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں اصل میں ان پر دنیاوی مال اولاد کی محبت غالب ہوتی ہے لہذا اس بات کو خوب جان لو کہ یہ مال و اولاد بھی ایک امتحان اور آزمائش ہے جن کی وجہ سے انسان کو پرکھا جاتا ہے اور جو شخص اس امتحان اور کشمکش میں پاس ہو جائے وہ اس بات کو اچھی طرح جان لے کہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ یہاں اجر عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح معنوں میں اپنے اور اپنے رسول اللہ ﷺ کا وفادار اور امانتدار بنائے آمین۔

### بدن اور اعضاء و جوارح میں خیانت!

ہمارے تمام اعضاء اور جوارح اللہ تعالیٰ کی سوچنی ہوئی امانت ہیں اور ہم اس کے پابند ہیں کہ انہیں مالک حقیقی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق استعمال کریں اور جو کوئی ان کو غلط اور بے جا استعمال میں لاتا ہے اور جس قدر لاتا ہے تو وہ اس قدر امانت میں خیانت کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ﴾ (سورہ مؤمن: ۱۹)

”اللہ تعالیٰ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کاری اور (اس خیانت کو) جو سینوں میں چھپی ہے۔“

مذکورہ بالا قرآن مجید کی چند آیتیں اس کے بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ امانت اپنے وسیع مفہوم کے اعتبار سے صرف یہ نہیں ہے کہ کوئی شخص آپ کے پاس کوئی چیز رکھے اور آپ اس کو وہ چیز جوں کی توں واپس کر دیں بلکہ اس ضمن میں دین و شریعت کی تمام تفصیلات حقوق اللہ اور حقوق العباد وغیرہ سمٹ کر آ جاتے ہیں۔

قابلیت اور اہلیت کے بغیر عہدے اور منصب سپرد کر دینا خیانت ہے اور اس کا عذاب! عہدے اور منصب یہ سب امانتیں ہیں جن کے امین وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھوں میں یہ اختیارات ہوتے ہیں اگر وہ ان اختیارات کو صحیح استعمال نہیں کرتے ہیں اور اپنی ذمہ داری کو پوری نہیں کرتے ہیں تو یہ لوگ خیانت کے مرتکب ہوں گے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے لیکن یہاں اس کے متعلق نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں سے بھی کچھ سن لیجئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ اسْتَعْمَلَ رَجُلًا مِنْ عَصَايَةٍ وَفِيهِمْ مَنْ أَرْضَى لِلَّهِ مِنْهُ فَقَدْ خَانَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالْمُؤْمِنِينَ) ”یعنی جس (حاکم اور ذمہ دار) نے کوئی عہدہ اس شخص کے سپرد کیا حالانکہ (اس کے علم میں تھا) کہ اس جماعت میں ایسا آدمی تھا جو اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے والا (اور اس عہد و منصب کا زیادہ لائق اور مستحق) تھا تو اس (حاکم) اور ذمہ دار شخص نے اللہ تعالیٰ کے حق میں اور رسول اللہ ﷺ کے حق میں اور سب مسلمانوں کے حق میں خیانت کی۔“ (دیکھئے ترغیب و ترہیب: ج ۳ ص ۱۷۹)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت یزید بن ابی سفیان کو جب شام کی طرف بھیج رہے تھے تو ان کو نصیحت کی اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ الْمُسْلِمِينَ شَيْئًا فَأَمَرَ عَلَيْهِمْ أَحَدًا مَحَابَّةً فَعَلِيَّةٌ لَعْنَةُ اللَّهِ لَا يَقْبَلُ اللَّهُ مِنْهُ صَرْفًا وَلَا عَدْلًا حَتَّى يَدْخُلَهُ جَهَنَّمَ) (حاکم و احمد دیکھئے ترغیب و ترہیب: ج ۳ ص ۱۷۹)

”یعنی جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی پھر اُس نے کوئی عہدہ اور منصب کسی شخص کو محض دوستی و تعلق کے بنا پر (بغیر اہلیت اور قابلیت معلوم کئے ہوئے) دیدیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اللہ تعالیٰ اس سے نہ کوئی فرض (روزہ زکوٰۃ وغیرہ) کو قبول کرے گا اور نہ کسی نفل (اور دوسرا معاوضہ یا دینی محنت اور کوشش) کو قبول کرے گا یہاں تک کہ اس کو جہنم میں داخل کر دے گا۔“

### خیانت کی بعض باریک قسمیں!

خیانت کی بعض قسمیں تو ایسی ہیں جن کو ہر کوئی جانتا ہے لیکن اس کی بعض صورتیں ایسی بھی ہیں جن کو لوگ خیانت ہی نہیں سمجھتے رسول اللہ ﷺ نے ایسی خیانت کے متعلق ہمیں خبردار کیا ہے۔

اپنی عقل و فکر سے صحیح اور خیر خواہانہ مشورہ دینا امانت ہے!

ان میں سے ایک مشورہ ہے جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اس کو چاہئے کہ اپنی عقل و فکر اور تجربہ کے مطابق وہ مشورہ دے مشورہ لینے والے کے حق میں مفید اور بہتر ہو اور اگر جان بوجھ کر غلط مشورہ دے دیا تو امانت میں خیانت کا مرتکب ہو گیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر ابو الہیثم رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

(اِنَّ الْمُسْتَشَارَ مُؤْتَمِنٌ) (ترمذی، مشکوٰۃ)

”جس شخص سے کوئی مشورہ لیا جائے وہ اس میں امین ہے (یعنی اپنے عقل و فکر سے کام لے کر اس کی خیر خواہی کرتا اور اس کے راز کو خفیہ رکھنا اور نیک مشورہ دیدینا ضروری ہے)۔“

مطلب یہ ہے کہ جس سے کسی معاملہ میں مشورہ لیا جائے۔ تو اسے چاہیے کہ وہ اس بات کو جان لے کہ مشورہ طلب کرنے والے نے اس کو قابل اعتماد سمجھ کر اس سے مشورہ چاہا ہے اور اس کو چاہیے کہ ایک امانت کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرے۔ بلکہ اچھی طرح غور و فکر کر کے ایسا مشورہ دے۔ جو اس کے نزدیک مشورہ لینے والے کے حق میں مفید اور بہتر ہو اور پھر اس کی بات کو راز میں بھی رکھے ورنہ اگر جانتے ہوئے غلط مشورہ دیا یا اس کے راز کو فاش کر دیا۔ تو خیانت کا مرتکب ہوگا۔

مؤذن ایک ذمہ دار شخص امین ہے اور امانت اس کے سپرد کی جاتی ہے!

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ وَالْمَوْذُنُ مُؤْتَمِنٌ) (احمد، داؤد، ترمذی، مشکوٰۃ)

”یعنی امام ضامن ہے اور مؤذن امین ہے اور اس کے سپرد امانت کی جاتی ہے۔“

یعنی لوگ نماز کے اوقات اور روز کی سحری اور افطاری کے سلسلے میں مؤذن پر بھروسہ کرتے ہیں اب اگر مؤذن بلا تحقیق وقت کے اذان دے دیتا ہے تو وہ امانت میں خیانت کا ارتکاب کرتا ہے۔ اسی بات کی وضاحت نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ”دو چیزیں مؤذنوں کی گردنوں میں لٹکی ہوئی ہیں ایک تو مسلمانوں کے روزے اور دوسری ان کی نمازیں۔“ (ابن ماجہ مشکوٰۃ: باب بعض احکام الاذان)

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے دواہم بنیادی اعمال ایسے ہیں جو مؤذنوں پر موقوف ہیں اور مؤذن ان اعمال کی صحت اور تکمیل کے ذمہ دار ہیں پہلی چیز تو روزہ ہے کہ مسلمان مؤذن کی اذان پر اعتماد کر کے روزے کو بند



کرتے ہیں اور ان ہی کے اعتماد کرتے ہوئے روزہ افطار کرتے ہیں اور دوسری چیز نماز ہے جس کی ادائیگی مؤذنوں کی اذان کے تحت ہوتی ہے لہذا مؤذن کو چاہئے کہ وہ اپنی عظیم ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے بڑی احتیاط کے ساتھ اور اوقات کی پوری رعایت کرتے ہوئے اذان کہا کہے تاکہ مسلمانوں کے ان دونوں اعمال میں خلل واقع نہ ہو، ان روایتوں سے یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ ہر ذمہ داری امانت ہے اور ہر ذمہ دار اس وقت بری الذمہ قرار پاتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو کمال احتیاط کے ساتھ پورا کرتا رہے۔

جب کوئی ایسی بات آپ سے کہ دے جس کو وہ دوسروں سے چھپانا چاہتا ہے وہ بھی امانت ہے!

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(إِذَا حَدَّثَ الرَّجُلُ ثُمَّ التَفَتَ فِيهِ أَمَانَةٌ) (ترمذی ابوداؤد، مشکوٰۃ)

”جب کوئی شخص اپنی کوئی بات کہے اور پھر ادھر ادھر دیکھے تو وہ امانت ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تم سے اپنی بات کرے اور پھر ایسا کچھ نہ کہے کہ یہ بات امانت ہے یا اسے راز میں رکھنا، لیکن اس کے انداز سے یہ محسوس ہو رہا ہو کہ وہ اس بات کو عام لوگوں سے چھپا رہا ہے تو ایسی صورت میں اس کی یہ بات امانت ہے اور اس کو راز میں رکھنا چاہئے اگر یہی بات دوسروں تک پہنچائی تو یہ خیانت ہوگی۔

مجلس کی باتیں بھی امانت ہوتی ہیں!

مجلس میں جو بات ہوتی ہے وہ مجلس میں بیٹھنے والوں کے پاس امانت ہوتی ہے چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(الْمَجَالِسُ بِالْأَمَانَةِ) (ابوداؤد، مشکوٰۃ)

”مجلسوں میں امانتداری ضروری ہے۔“

یعنی مجلس میں راز کی باتیں اہل مجلس کے علاوہ کسی اور سے بیان نہیں کی جائیں گی یہ مجلس کی امانت ہے اور اس مجلس کی باتوں کو دوسروں سے بیان کرنا خیانت ہے، مطلب یہ ہے کہ مجلس میں جو بات ہو جائے وہ مجلس کی امانت ہے اور مجلس والے کی اجازت کے بغیر اس بات کو دوسروں سے کہہ دینا اور پھیلا کر ناجائز ہے اور خیانت ہے۔

مجلس میں یا کوئی آپ سے ایسی بات کہہ دے جو ظلم کے لئے سازش ہو تو اس کو متعلقہ لوگوں کو پہنچانا ہی امانت ہے! یہاں یہ بات بھی یاد رکھیں اگر کسی مجلس میں کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے یا کوئی شخص آپ سے ایسی بات کہہ

دے جس میں ظلم کے لئے سازش ہو مثلاً کسی شخص کے ناحق قتل کرنے کی سازش یا کسی کی آبروریزی یا اس کو مالی نقصان پہنچانے کی کوئی سازش ہو یا اسلام کے خلاف کوئی سازش ہو تو ایسی صورت میں شریعت مطہرہ کی تعلیم یہی ہے کہ ایسی بات کو ہرگز راز میں نہ رکھو بلکہ ایسی صورت میں دیانتداری اور امانتداری کا تقاضہ یہی ہے کہ اس گناہ اور ظلم والے منصوبے کو ناکام بنایا جائے اور جن کو اس سے خبردار کرنا ضروری سمجھو اس کو ضرور خبر کر دو اگر ایسا نہ کرو گے تو یہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حق میں خیانت ہوگی، چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(المجالس بالامانة الاثلاثة المجلّس سفك دم حرام أو خرج حرام أو اقنطاع مالي بغير حق) (

مشکوٰۃ: باب الحذر والثانی فی الامور الفصل الثانی)

یعنی ”مجلسوں میں امانتداری ضروری ہے (یعنی کسی مجلس میں رازداری کے ساتھ جو بات ہو اہل مجلس امانت سمجھ کر اس کو راز میں رکھیں) لیکن تین مجالس اس سے مستثنیٰ ہیں، ایک وہ جس میں کسی کے ناحق خون کی سازش اور مشورہ ہو دوسرے وہ جس میں کسی عصمت و عفت لوٹنے کا فیصلہ کیا گیا ہو اور تیسرے وہ جس میں بغیر کسی حق کے (ناجائز طور پر) کسی کا مال لوٹنے اور چھیننے کا فیصلہ ہو یہ تین چیزیں بطور مثال بیان کی گئی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ مجلس میں اگر کسی گناہ جرم اور ظلم کی کوئی سازش ہو اور اس کا فیصلہ کیا گیا ہو تو پھر امانت اور دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ اس ظالمانہ اور مجرمانہ منصوبے کو ناکام بنایا جائے اور جہاں خبر دینا ضروری ہو وہاں تک اس بات کو پہنچایا جائے۔

### قرآن مجید و حدیث میں اجتماعی اموال اور حقوق میں خیانت کی سزا!

﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَمَةِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (سورہ آل عمران: آیت ۱۶۱)

یعنی ”کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے اور جو کوئی خیانت کرے گا۔ تو وہ اپنی ہی کوئی خیانت کے ساتھ قیامت کے دن حاضر ہوگا۔ پھر ہر شخص کو اپنے کمائی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

لفظ غلول مطلق خیانت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور خاص کر مال غنیمت کی خیانت کے لئے بھی اور مال غنیمت اور اجتماعی اموال میں چوری اور خیانت کا گناہ عام چوریوں اور خیانتوں سے بھی زیادہ سخت ہے۔

چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ ہمارے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں مال غنیمت میں خیانت کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو بہت بڑا گناہ بتلایا اور بڑی اہمیت کے ساتھ اس کو بیان کیا۔ پھر اس کے بعد فرمایا کہ خبردار! میں تم سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنے

گردن پر بلبلاتے ہوئے اونٹ کو لاد کر (میدان حشر) میں لائے (یعنی جو شخص مال غنیمت سے اونٹ کی خیانت کرے گا۔ تو وہ شخص میدان حشر میں ایسی حالت میں پیش ہوگا کہ اس کے گردن پر وہی اونٹ سوار ہوگا اور بلبلارہا ہوگا) اور پھر مجھ سے کہے گا کہ یا رسول اللہ ﷺ میری شفاعت کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہدوں گا کہ میں اب تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ (یعنی میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے نجات نہیں دلا سکتا) کیونکہ میں نے تمہیں دنیا میں شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے۔ (یعنی تمہیں پہلے بتلادیا تھا کہ مال غنیمت میں خیانت یا کسی چیز میں تصرف بہت بڑا گناہ ہے)

اور خبردار! میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن ہر نہناتے ہوئے گھوڑے کو لاد کر حاضر ہوا اور پھر مجھ سے یہ کہے کہ یا رسول اللہ میری مدد اور (فریادری کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہدوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں، کیونکہ میں نے احکام شریعت پہنچا دیئے تھے اور خبردار! میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر مہیاتی ہوئی بکری لاد کر (میدان حشر میں آئے) اور پھر مجھ سے کہے کہ یا رسول اللہ میری (شفاعت) کیجئے اور میں اس کے جواب میں یہ کہدوں کہ میں (اب) تمہاری کسی چیز کی ذمہ دار نہیں ہوں۔ کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے اور خبردار! میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر کسی چلاتے ہوئے آدمی کو (یعنی اس غلام یا باندی کو جو اس نے غنیمت کے قیدیوں میں سے خیانت کر کے لے لیا ہو) لاد کر (میدان حشر میں) آئے اور کہے کہ یا رسول اللہ ﷺ میری مدد اور فریادری کیجئے اور میں اس کے جواب میں یوں کہدوں کہ میں اب تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں احکام شریعت پہنچا دیئے تھے اور خبردار! میں تم میں سے کسی کو ایسی حالت میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر لہراتے ہوئے کڑے رکھے ہوئے حاضر ہوا اور پھر مجھے کہے کہ یا رسول اللہ میری مدد اور فریادری کیجئے اور میں اس کے جواب میں کہدوں کہ میں تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں کیونکہ میں نے تمہیں احکام شریعت پہنچا دیئے اور خبردار! میں تم میں سے کسی کو قیامت کے دن اس حال میں نہ دیکھوں کہ وہ اپنی گردن پر سونا چاندی لاد کر حاضر ہوا اور پھر مجھ سے کہے کہ یا رسول اللہ میری مدد اور شفاعت کیجئے اور میں اس کے جواب میں کہدوں کہ میں تمہاری کسی چیز کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ کیونکہ میں نے تمہیں شریعت کے احکام پہنچا دیئے تھے۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

جس مال سے مسلمانوں کے حقوق وابستہ ہوں اس میں ناجائز تصرف کرنے والے شہید کا

## عبرت ناک واقعہ!

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک غلام بطور ہدیہ پیش کیا جس کا نام مدغم تھا ایک دن (غالباً میدان جنگ میں) وہ رسول اللہ ﷺ کا کجاوہ اتار رہا تھا کہ اچانک کسی نامعلوم شخص کا تیر آ کر اس کو لگا جس سے وہ جاں بحق ہو گیا لوگوں نے کہا کہ مدغم کو جنت مبارک ہو یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ”نہیں“ ”ایسا نہیں“ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے وہ چادر جس کو مدغم نے خیر کے مال غنیمت میں سے اس کو تقسیم سے قبل لے لیا تھا (وہ چادر) آگ بن کر مدغم پر شعلے برسا رہی ہے جب لوگوں نے یہ سخت وعید اور تنبیہ سنی (تو جن لوگوں نے مال غنیمت کے بارے میں یہ گمان کر رکھا تھا کہ اس میں سے چھوٹی موٹی اور حقیر چیز اس کو لے لینے پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا، تو وہ کانپ گئے اور انہوں نے جو چھوٹی موٹی چیزیں لے لی تھیں ان کو لالا کر واپس کرنے لگے یہاں تک کہ ایک شخص نے ایک یادوتسمے (نبی کریم ﷺ کی خدمت میں) واپس کئے آپ ﷺ نے (اس کو دیکھ کر) فرمایا کہ آگ کا ایک تسمہ ہے یا آگ کے دو تسمے ہیں۔ (بخاری و مسلم مشکوٰۃ: باب القائم....)

اس سے اندازہ لگائے کہ اوقات، بیت المال اور جماعت و مدرسہ وغیرہ کے اموال جن کے ساتھ مسلمانوں کے حقوق متعلق ہوں ان میں ذرہ برابر خیانت کس قدر عظیم جرم ہے، ایک شخص نبی کریم ﷺ کا غلام ہے اور خود نبی کریم ﷺ کے ساتھ جنگوں میں شریک رہا اور جب وہ نبی کریم ﷺ کا کجاوہ اتار رہا تھا تو اسی وقت تیر لگنے سے جاں بحق ہو گیا اور جس کے بارے میں مسلمانوں نے یہی گمان کیا کہ کس قدر خوش قسمت ہے کہ آپ ﷺ کی خدمت کرتے ہوئے شہید ہو گیا اور جنت کے باغوں میں داخل ہو گیا لیکن نبی کریم ﷺ کی گواہی اس کے برعکس تھی اور اس کا سبب اور وجہ صرف یہ بتائی گئی کہ انہوں نے اجتماعی مال یعنی مال غنیمت میں سے اس کی تقسیم سے پہلے ایک چادر لے لی تھی، جو اسپر آگ بن کر اسپر لپٹ رہی تھی، اس کا مطلب یہی ہے کہ خیانت کی چیز ہر حالت میں دوزخ کی آگ ہے خواہ وہ کتنی ہی معمولی اور حقیر کیوں نہ ہو۔

## اجتماعی مال میں خیانت کرنے والے آگ کے سزاوار ہوں گے!

حضرت حوالہ انصاریہ رضی اللہ عنہا کہتی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

(اِنَّ رَجُلًا يَتَخَوَّضُونَ فِي مَالِ اللَّهِ بِغَيْرِ حَقٍّ فَلَهُمْ النَّارُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ) (بخاری مشکوٰۃ: باب القائم)

”بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے مال (یعنی غنیمت بیت المال اور زکوٰۃ وغیرہ اجتماعی مال) میں ناحق (یعنی بغیر کسی

استحقاق کے) تصرف کرتے ہیں پس ایسے لوگوں کے لئے قیامت کے دن جہنم کی آگ ہوگی۔“  
 نیز حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ ایک شخص جس کا نام ”کرکرہ“ تھا جب اس کا انتقال ہوا تو رسول اللہؐ نے فرمایا کہ وہ (کرکرہ) جہنم کی آگ میں ڈالا گیا ہے (صحابہ کرام نے جب یہ سنا تو وہ سمجھ گئے کہ اس کا سبب مال غنیمت میں ناحق تصرف ہے) چنانچہ انہوں نے اس کے سامان کو دیکھنا شروع کیا تو اس میں ایک کمبلی پائی گئی جس کو اس نے مال غنیمت میں سے خیانت کر کے لیا تھا۔ (بخاری، مشکوٰۃ)

حضرت خولہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:  
 (اِنَّ هٰذِهِ الْمَالُ خَصِيْرَةٌ حُلُوْةٌ فَمَنْ اَصَابَهَا بِحَقِّهِ بُوْرِكَ لَهٗ فِيْهِ وَرُبُّ مُتَخَوِّصٍ فَيَمَاشَاتُ بِهٖ نَفْسُهُ مِنْ مَّالِ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ فَلَيْسَ لَهٗ اِلَّا النَّارُ)  
 ”بلاشبہ یہ مال ایک سرسبز اور میٹھی چیز ہے (یعنی وہ انسان کی نظر کو بھاتا ہے اور دل کو لہاتا ہے) جو شخص اس مال کو حق کے ساتھ (یعنی حلال ذریعہ سے) حاصل کرتا ہے اس کے لئے اس میں برکت ہوتی ہے اور (یاد رکھو) بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہؐ کے مال (یعنی مال غنیمت اور اجتماعی اموال) میں سے جس چیز کو ان کا نفس چاہتا ہے اپنے تصرف میں لے آتے ہیں قیامت کے دن ان کے لئے سوائے آگ کے کوئی چیز نہیں ہوگی۔“ (ترمذی، مشکوٰۃ)

### خائن قیامت میں رسوا ہوگا!

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ فرمایا کرتے تھے:  
 (اَذُوْا الْحِيَاظَ وَالْمُخِيْطَ وَاَيُّكُمْ وَالْغُلُوْلَ فَاِنَّهٗ عَارٌ عَلٰى اَهْلِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ) (دارمی و نسائی مشکوٰۃ:  
 باب القسمۃ الغنائم)  
 ”دھاگے اور سوئی کی بھی ادائیگی کرو (یعنی مال غنیمت میں سے) ایسی محدود (معمولی) چیزیں بھی چھپا کر نہ رکھو) اور تم خیانت سے اجتناب کرو کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خیانت کرنا قیامت کے روز خیانت کرنے والے پر ذلت اور رسوائی لانے والی ہوگی۔“

جس کے اندر صفت امانت نہیں اس میں ایمان نہیں!

جس شخص کے اندر امانتداری نہیں اس میں ایمان نہیں حضرت انسؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ

بہت کم ایسا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو خطبہ دیا ہو اور اس میں یہ نہ فرمایا ہو۔

(لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ) (مشکوٰۃ: کتاب الایمان)

”جس میں امانت نہیں اس کا ایمان بھی کچھ نہیں اور جس میں عہد کی پابندی نہیں اس کا دین بھی کچھ نہیں۔“

اسی روایت کو علامہ منذری رحمۃ اللہ علیہ نے مسند احمد و مسند بزار اور طبرانی سے بھی نقل کیا ہے اور اس میں ہے کہ ہمارے سامنے رسول اللہ ﷺ نے کوئی خطبہ ایسا نہیں دیا جس میں آپ ﷺ نے یہ نہ فرمایا ہو کہ جس شخص میں امانت نہیں

اس کا کوئی ایمان نہیں اور جس میں عہد کی پابندی نہیں اس کا کوئی دین نہیں۔ (ترغیب و ترہیب: ج ۴ ص ۱۱)

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

(لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ وَلَا صَلَوةَ لِمَنْ لَا طُهْرَ لَهُ) (ترغیب: ج ۴ ص ۵)

”جس میں امانت نہیں اس کا ایمان نہیں اور جس کا وضو نہیں اس کی نماز نہیں۔“

اس روایت میں یہ اشارہ بھی موجود ہے کہ جس طرح بغیر وضو اور طہارت کے نماز صحیح نہیں ہو سکتی اسی طرح جس شخص کے اندر امانتداری نہیں اس کا ایمان بھی صحیح نہیں اور جس شخص کا ایمان صحیح نہیں تو اس کی نماز و زکوٰۃ بھی صحیح نہیں ہو سکتی اور یہی بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت میں بھی موجود ہے کہ:

(أَنَّهُ لَا دِينَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ وَلَا صَلَوةَ لَهُ وَلَا زَكَاةَ لَهُ) (ترغیب: ج ۴ ص ۵)

”اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس شخص کا کوئی دین نہیں جس میں امانت نہیں اس کی نہ نماز صحیح اور نہ زکوٰۃ۔“

### ایمان کے منافی کوئی خیانت ہے؟

یہاں یہ بات یاد رکھئے کہ کسی شخص سے کوئی غلطی اور خیانت کی بات سرزد ہو جائے اس کی وجہ سے ایمان سلب نہیں ہوتا بلکہ ایمان کے منافی وہ خیانت ہے جو اس کی عادت بن جائے اور اس کے اندر سے امانتداری کا جو ہر ختم ہو جائے البتہ یہ صحیح ہے کہ خیانت کے بار بار ارتکاب سے بالآخر امانتداری کا جو ہر ختم ہو جاتا ہے لہذا جس قدر خیانت کا اب تک مرتکب ہوا ہے ان سے توبہ کریں اور حتیٰ الوسع ان کا تدارک کرے (یعنی جس کا حق مارا ہو ان کو ان کا حق لوٹانے کا اہتمام کریں یا اگر یہ ممکن نہ ہو تو صاحب حق سے معافی مانگیں جیسا کہ اس کا بیان توبہ کے باب میں موجود ہے۔) اور آئندہ کیلئے پورے عزم کے ساتھ امانتداری کی راہ کو اختیار کریں بے شک اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے، وہ سابقہ گناہوں اور خیانتوں کو معاف کرے گا اور ہم کو ان کے مضر اثرات سے محفوظ رکھے گا۔

جس کام میں بھی امانتداری اور ذمہ داری ہوگی اس میں برکت ہوگی!

امانت ہی ایک ایسا جوہر ہے جس کے اندر دنیا و آخرت کی کابیاں موجود ہیں اور جس کام میں امانتداری سچائی اور ذمہ داری ہوگی اللہ تعالیٰ اس میں خیر و برکت نازل فرماتے ہیں اس سلسلہ میں صرف ایک ہی حدیث بطور نمونہ پیش کرتا ہوں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ:

(إِنَّ اللَّهَ يَقُولُ أَنَا شَالِكُ الشَّرِיקَيْنِ مَا لَمْ يَخُنْ أَحَدُهُمَا صَاحِبَهُ فَإِذَا خَانَ خَرَجْتُ مِنْ بَيْنِهِمَا) (ابوداؤد)

، رزین، مشکوٰۃ: باب الشریکۃ)

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ غزوہ جل فرماتا ہے کہ میں دو شریکوں کا ایک تیسرا (نگہبان) ہوتا ہوں جب تک ان دونوں میں سے کوئی اپنے شریک کے ساتھ خیانت نہیں کرتا اور جب وہ خیانت اور بددیانتی پر اتر آتے ہیں تو میں ان کے درمیان میں سے ہٹ جاتا ہوں“

اس روایت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ معاملات میں اور خاص طور پر تجارت وغیرہ میں شراکت پسندیدہ ہے اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جس معاملہ اور کام کے شرکاء اور شریک کار جب تک دیانت، امانت اور ایمانداری کے ساتھ باہم شریک رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی محافظت اور خیر و برکت کا سایہ ان پر رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کو نقصان اور تباہی سے محفوظ رکھتا ہے اُن کے رزق اور کاروبار میں وسعت بخشتا ہے اور ان کے معاملات کو خیر و بھلائی کے ساتھ برقرار رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی مدد و نصرت فرماتا ہے اور جب شرکا میں بددیانتی کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ خیانت کرنے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی محافظت و برکت کا سایہ ان پر سے ہٹ جاتا ہے اور اس کے بجائے ان پر شیطان اپنا تسلط جمالیتا ہے، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ شرکاء کو مکمل نقصان اور تباہی کے کنارے لاکھڑا کر دیتا ہے اور ان کا جو کاروبار یا کام ہوتا ہے وہ درہم برہم ہو کر ختم ہو جاتا ہے مذکورہ بالا مختصر بیان سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ امانتداری کی صفت سے خالی ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شخص دین و ایمان کی اصل حقیقت اور اس کے اصل نور سے محروم ہے اور خیانت ایک ایسا قرض ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو پلٹ کر کے رکھ دیتا ہے اور خائن کی دنیا و آخرت کو تباہ و برباد کر دیتا ہے، اس کے برعکس امانتداری کی وجہ سے فرد اور معاشرہ دنیا میں ترقی، عروج اور عزت پالیتے ہیں اور آخرت میں بھی دائمی کامیابیوں کو حاصل کر لیتے ہیں جس شخص پر بھی امانتداری کا راز کھل گیا اور جس نے خیانت کے زہر اور سرانڈ کو محسوس کیا وہ ہر قسم کی خیانت سے اس قدر متغیر ہوتا ہے اور اس سے اس قدر دور بھاگتا ہے جیسا کہ شہد کی



مکھی زہریلی اور بدبودار چیز سے متنفر ہوتی ہے اور دور بھاگتی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو بے دینی، بددیانتی، خیانت اور بے ایمانی سے بچائے اور پکا مومن اور مسلمان رکھ کر ایمان اور اسلام پر موت نصیب فرمائے۔ آمین

### امانتداری بقدر ذمہ داری!

اب تک جس قدر بیان ہوا اس سے دو باتیں اچھی طرح ثابت ہو گئیں ایک یہ کہ ہر شخص پر اسی قدر بار امانت ہے جس قدر وہ ذمہ دار ہے اور جس کے پاس اسباب و وسائل اور اختیارات و اقتدار کی جتنی مقدار موجود ہے اس تناسب سے وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنے اعمال و افعال اور ذمہ داری کا جوابدہ ہوگا اور جس قدر وہ اپنی ذمہ داری اور شرعی امور میں غفلت کرے گا اس قدر وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی شریعت کی رو سے خائن اور جھوٹا ہوگا اور وہ اپنی خیانت اور جھوٹ کے بقدر سزا پائے گا۔

### بدعہدی بددیانتی وغیرہ سب جھوٹ کی مختلف صورتیں ہیں!

اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جھوٹ ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ریاء بدعہدی اور بددیانتی جنم لیتی ہیں اور پھر خیانت، بہتان، تکبر وغیرہ جیسے سنگین جرائم سرزد ہوتے ہیں اور یہی وہ بری خصلت ہے کہ جس میں یہ جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر وہ منافق ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(أَيُّهُ الْمُنَافِقُ ثَلَاثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا أُؤْتِمِنَ خَانَ) (بخاری و مسلم)

”منافق کی تین نشانیاں ہیں جب بات کرے تو جھوٹ بولے وعدہ کرے تو اس کو پورا نہ کرے اور جب اس

کو کوئی چیز (ذمہ داری یا مال وغیرہ) سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔“

یہ ظاہر تین چیزیں معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں ایک ہی حقیقت کی مختلف صورتیں ہیں، کوئی زبانی جھوٹ ہے اور کوئی عملی جھوٹ ہے اگر یہی جھوٹ عقیدہ میں آ جاتا ہے، تو انسان پکا کافر و منافق ہوتا ہے اور اگر صرف عمل میں پایا جائے تو اگرچہ ایسی صورت میں وہ عقیدہ کا منافق نہیں لیکن عمل اور سیرت میں منافق ہی ہے، جیسا کہ اس کا بیان مفصل اپنی جگہ پر گزر چکا ہے۔

بہر حال جھوٹ بہت ہی بڑی خباثت ہے یہ انسان کے ضمیر کو جلا کر رکھ دیتا ہے اور یہی جھوٹ و خیانت کی صفت ہے جو انسان کی پوری زندگی کو مسموم بنا دیتی ہے اور اس کو بالآخر جہنم میں پھینک دیتی ہے اس لئے تو رسول

اللہ ﷻ نے فرمایا:

”کہ مؤمن کی طبیعت اور فطرت میں ہر خصلت کی گنجائش ہے سوائے جھوٹ اور خیانت کے۔“ (کہ یہ ایمان کے منافی ہیں) (ابوداؤد، مشکوٰۃ: باب القسمۃ الغنائم)

اتفاقی طور پر اگر کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس کو اس غلطی کا عادی نہیں کہا جاسکتا!

پہلے بھی بتایا جا چکا ہے اور اب پھر یہ بات یاد کرائی جاتی ہے کہ کبھی اتفاقی طور پر خیانت اور جھوٹ ایک مؤمن سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں، لیکن وہ اس کا عادی نہیں ہو سکتا، اگر کسی میں یہ بری عادت بڑھ رہی ہے، تو پھر اب اس کو پورا علاج کرنا چاہئے۔ کیونکہ اب اس کا ایمان زخمی ہو چکا ہے اور اس میں نفاق کے جراثیم داخل ہونے لگے ہیں، اگر اس سے غفلت برتی جائے تو بالآخر یہی نفاق کے جراثیم اس کے پورے ایمان کو ایسا تباہ و برباد کر دیں گے جس کے بعد اس کا علاج بھی ناممکن ہو جائے گا۔

### صداقت اور سچائی کی تفصیل!

جھوٹ اور خیانت کی مذکورہ بالا تفصیل سے صداقت اور سچائی کی حقیقت اور اس کی فضیلت خود بخود سامنے آ جاتی ہے، لیکن صداقت اور سچائی کی غیر معمولی اہمیت اور فضیلت کی وجہ سے اس کی ضروری تفصیل کو بیان کرتا ہوں۔

### صداقت اور سچائی کی صورتیں!

آسانی اور سہولت کے ساتھ سمجھنے کے لئے سچائی کی چند صورتیں بیان کی جاتی ہیں۔

### زبان کی سچائی!

”زبان کی سچائی“، یعنی اندرونی علم و یقین کے مطابق بولنا مثلاً آپ دین اسلام کو حق جان کر مانتے ہیں اور اس کا اقرار زبان سے کرتے ہیں یا مثلاً آپ نے کسی معاملہ یا کسی جگہ میں جو کچھ دیکھا ہے یا سنا ہے یا کیا ہے یا نہیں کیا ہے یا اپنی اندرونی کیفیت اور جذبے (مثلاً غم یا خوشی) کو زبان سے ظاہر کرتے ہیں یا مثلاً آپ کے دل میں زید کا احترام ہے اور زبان سے اس کا اظہار کرتے ہیں وغیرہ تو ان سب چیزوں کو اسی طرح بیان کرنا جیسا کہ دیکھا ہے یا سنا ہے یا کیا ہے یا جو جذبہ ہے اسی طرح ہر وہ چیز جس کو انسان اپنے اندرونی علم و یقین کے مطابق حق جانتا مانتا ہے یا جس چیز کو ناحق اور باطل سمجھتا ہے یا جو کچھ دیکھتا یا سنتا ہے یا کرتا ہے اسی کو اسی طرح بیان کرنا جیسا کہ وہ اس کو مانتا یا سمجھتا ہے تو یہ تمام چیزیں سچائی کی اس صورت میں داخل ہیں جیسے ”زبان کی سچائی“

کا نام دیا گیا ہے اور اگر وہ اپنے اندرونی علم و یقین یا اندرونی جذبات یا اپنے دیکھنے سننے اور کرنے یا نہ کرنے کو اپنے علم و یقین اور سمجھ کے مطابق ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کرتا بلکہ اس کے بیان میں جان بوجھ کر زیادتی یا کمی کرتا ہے تو جس قدر کوتاہی نقصان اور زیادتی کرے گا اسی قدر اس کی سچائی میں نقصان اور کمزوری ہوگی۔

### عمل کی سچائی!

”عمل کی سچائی“، یعنی اندرونی علم و یقین کے مطابق عمل کرنا یا اپنی ”زبان کے مطابق عمل کرنا“ مثلاً آپ نماز کو اللہ تعالیٰ کا حکم مان کر پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے پڑھتے ہیں تو ایسی صورت میں آپ کی زبان نہیں بلکہ آپ کا عمل آپ کے اندرونی علم و یقین اور جذبہ کے مطابق ہے یا مثلاً آپ کے دل سے کسی عالم دین متقی کا احترام ہے تو آپ اس شخص کے سامنے بلا مبالغہ اسی قدر تواضع سے پیش آتے ہیں جس قدر آپ کے دل میں اس کا احترام ہے یا مثلاً اللہ تعالیٰ کی محبت میں یا اس کی نافرمانی کے خوف سے رو پڑنا یا آنسو بہانا یا مثلاً غم کی بات سن کر عملاً اداس ہو جانا مثلاً سر جھکانا یا چہرہ پر ناراضگی ظاہر کرنا وغیرہ اندرونی جذبات و صفات کے مطابقت ہے یا اپنی زبان کے مطابق عمل کرنا جیسا کہ وعدہ پورا کرنا عہد کی پابندی کرنا یا کسی ذمہ داری کو اٹھا کر اس کو مکمل حقہ پورا کرنا جیسا کہ امانت کی صورت میں کوئی خیانت نہ کرنا وغیرہ سب اس میں داخل ہیں اور وعدہ اور عہد کی پابندی کو عمل کی سچائی میں داخل کیا جانا کیونکہ عمل سے اپنی زبان کو سچا کر کے دیکھا یا غرض یہ کہ اندرونی علم و عمل اور زبان و عمل اور ظاہری و باطن کی یکسانیت یہ سب عمل کی سچائی میں داخل ہیں اور بعض خوش بخت ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا باطن ان کے ظاہر سے زیادہ اچھا اور بہتر ہوتا ہے اور ظاہر و باطن کی یکسانیت بلکہ باطن کو ظاہر سے بھی بہتر بنانے کے لئے نبی کریم ﷺ نے دعا بتلا کر گویا اس کی ایک قسم کی ترغیب بھی دے دی ہے چنانچہ رسول اللہ ﷺ سے یہ دعا بھی منقول ہے۔

(اللهم اجعل سریرتی خیراً من علی نیتی واجعل علی نیتی صالحۃً)

”اے اللہ میرے باطن (اندرون) کو ظاہر سے بہتر بنا اور میرا ظاہر بھی بہتر بنا۔“ (ترمذی)

غرض ہر وہ عمل جو آپ کے اندرونی علم و یقین کے مطابق ہو یا آپ کا ہر وہ عمل جو آپ کی باطنی کیفیت اور صفت کے مطابق ہو یا آپ کا ہر وہ عمل جو آپ کی دی ہوئی زبان یا قبول کی ہوئی ذمہ داری کے مطابق ہو تو یہ سب کچھ سچائی کی اس صورت میں داخل ہیں جسے عمل کی سچائی کا نام دیا گیا ہے اور جو عمل بھی اندرونی علم و یقین یا باطنی اوصاف، کہ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کے خلاف اور مخالف ہے تو یہ عملی جھوٹ ہے جسے ریا کاری اور نفاق بدعہدی خیانت وغیرہ کہا جاتا ہے اور اگر مخالف نہیں مگر اس میں کمی یا زیادتی ہے تو جس قدر نقصان اور کوتاہی ہوگی

اس قدر عملی جھوٹ اور سچائی میں نقصان اور کمزوری ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کے لئے تکلف سے عمل کرنا کارِ ثواب ہے اور سچائی کا طالب ہے لیکن یہ سچائی نہیں!

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اگر ایک شخص لوگوں کو دکھلانے اور نمائش کے لئے ایسا عمل کرتا ہے جو اس کی باطنی کیفیت اور اوصاف کے خلاف ہو مثلاً اندر کوئی خشوع و خضوع نہیں لیکن بظاہر لوگوں کے سامنے خشوع و خضوع والی صورت بنا کر نماز پڑھتا ہے یہ تو کھلا ہوا جھوٹ اور ریا کاری ہے، لیکن اگر یہ شخص لوگوں کے دکھلانے کے لئے ایسا نہیں کرتا بلکہ صرف اس لئے خشوع و خضوع کو تکلف کے ساتھ اختیار کرتا ہے تاکہ اس کے دل میں خشوع کی صفت جڑ پکڑ لے تو ایسی صورت میں اگرچہ اس کو ثواب بھی ملے گا بلکہ زیادہ محنت و مشقت کی وجہ سے شاید زیادہ اور دو گنا ثواب مل جائے نیز وہ سچائی کا طالب بھی ہے لیکن پھر بھی جب تک اس کے اندر خشوع کی صفت راسخ نہیں ہو جاتی ہے (بلکہ تکلف کے ساتھ وہ خشوع کی صورت بناتا ہے) اس وقت تک وہ مقام صداقت تک پہنچا ہوا نہیں کیونکہ ایسی صورت میں اس کے اعمال، باطن کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے صدق اور سچائی کی ان تمام صورتوں میں مذکورہ بالا دو قسم یعنی زبان کی سچائی اور ”عمل کی سچائی“ بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، زندگی کے تمام تر دنیوی اور دینی معاملات کی درستگی ان دو صداقتوں پر منحصر ہے، وعدہ، معاہدہ امانت وغیرہ گواہی، لین دین میں صفائی سب کچھ انہیں دو صداقتوں کے گرد گھومتی ہیں اور یہی دو قسمیں (صداقت اور سچائی) باقی تمام صورتوں کے لئے کسوٹی ہیں جو ان میں سچا ہوگا ان شاء اللہ تعالیٰ وہ باقی انواع صداقت پر پورا اتر سکے گا۔

نیت و ارادہ کی سچائی!

نیت اور ارادہ میں سچائی کا مطلب ہے کہ جس قول و عمل کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کا قرب و رضا تلاش کرتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی مقصد پیش نظر نہ ہو اسی کو اخلاص کہا جاتا ہے۔

لوگوں کے درمیان صلح اور ظلم کے دفاع کے لئے کوشش کرنا یہ اخلاص اور صدق میں داخل ہے!

صدق اور اخلاص کی اس قسم میں وہ قول و عمل بھی داخل ہیں جو مصالح دین یا لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے یا ظلم کو ختم کرنے کے لئے اختیار کئے جائیں اسی طرح اگر کوئی ایسی بات کرتا ہے جس کی وجہ سے ایک مسلمان کو مصیبت میں بلا وجہ گرفتار کر دیا جائے یا وہ دشمن کے ہاتھ آ کر ہلاک ہو جائے یا اس کو تکلیف پہنچائی جائے تو یہ سچائی کی راہ نہیں بلکہ بد نیتی یا حماقت کی راہ ہے جو سچائی کے خلاف ہے ایسی صورت میں ایسی بات کہنی چاہئے

جس سے مسلمان مصیبت اور تکلیف سے بچے اور وہ دشمن کے ہاتھ میں نہ آئے۔

غیبت اور چغلی اور کسی کو مصیبت میں مبتلا کرنا سچائی نہیں بلکہ بدینتی ظلم اور سچائی کے منافی ہے! مذکورہ بالا بحث سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ کسی کے عیوب بیان کرنا سچائی میں شامل نہیں بلکہ اس کا منشا یا تو تکبر ہوتا ہے یا کسی کے ساتھ بغض و حسد وغیرہ اور بدینتی ہوتی ہے اور یہ صداقت و اخلاص کے منافی چیزیں ہیں انسانوں کے معاملہ میں خیر خواہی اور اخلاص یہ ہے کہ ان کی پردہ پوشی کی جائے اور جو کام اس نے چھپ کر کیا ہے اور کام بھی ایسا ہے کہ اس میں اس نے اپنا نقصان کیا ہے تو اس کو چھپایا جائے اور مسلمان کی آبرو کی حفاظت ہی سچائی اور اخلاص کی راہ ہے یہی حال چغلی کھانے کا ہے کہ اس میں دوسروں کی وہ باتیں پہنچائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے ان کے درمیان افتراق اور دشمنی پیدا ہو جائے تو یہ بھی بدینتی اور مسلمانوں کے ساتھ بے وفائی اور ان کے حقوق میں خیانت ہے سچائی کے منافی ہے۔ ایسے امور میں سچائی اور اخلاص کی راہ یہی ہے کہ مصلحت آمیز اور صلح کی بات کی جائے جس کی وجہ سے لوگوں کے درمیان محبت اور الفت کی فضا قائم ہو جائے دشمنی اور عداوت دور ہو جائیں ان شاء اللہ چغلی اور غیبت وغیرہ کے متعلق اپنی جگہ مفصل بیان آجائے گا۔

کس مجبوری کے تحت تو یہ وغیرہ کیا جاسکتا ہے؟

اگر کسی نیک مقصد کا حصول اس کے بغیر ناممکن ہو جیسے دو مسلمانوں کے درمیان تعلقات کو بہتر بنانا، مظلوم کا دفاع وغیرہ تو ایسی صورت میں اس کو بوقت ضرورت اختیار کرنا جائز بلکہ مستحب ہے بلکہ اگر مقصود کا حصول واجب ہو جیسے کسی ظالم سے مظلوم کو بچانا تو وہاں بوقت ضرورت اس کا اختیار کرنا واجب ہے یعنی اگر آپ اس ظالم کے ظلم کے دفاع پر قادر نہیں تو تب واجب یہ ہے کہ کوئی تدبیر اختیار کریں تاکہ مظلوم اس کے شر سے بچ جائے اگر ایسے مواقع پر صاف جھوٹ بھی بولا جائے تو بھی جائز ہے لیکن ایسی ضرورت کے وقت جبکہ نیک مقصد کے حصول کی کوئی دوسری صورت ممکن نہ ہو یا اس کے بغیر ضرر کا دفاع ناممکن ہو تو ایسی صورت میں جو تدبیر و حیلہ کرنا ہو تو وہاں بھی اس بات کی رعایت کی جائے کہ کھول کر صاف جھوٹ اور غلط بیانی نہ ہو بلکہ ایسی بات یا عمل کرنا چاہئے جس سے مقصود بھی حاصل ہو جائے اور جھوٹ بھی نہ ہو مثلاً اگر کوئی ظالم کسی مظلوم شخص کو مارنے کے لئے اس کا پیچھا کرتا ہے اور وہ اس کے بارے میں پوچھے کہ آپ نے فلاں کو نہیں دیکھا ہے تو آپ کہہ دیجئے کہ یہاں تو نہیں یا یوں کہہ دیں کہ ان کو تو نہیں دیکھا یا کسی غلط جانب پر نظر دوڑائے اور اس کی تلاش شروع کریں کہ وہ اس سے یہ سمجھیں کہ شاید اس طرف مظلوم

فرار ہو گیا ہے اس لئے وہ اسی طرف اپنی نظریں دوڑا رہا ہے۔ ملحوظ رہے کہ جہاں جہاں اس کی گنجائش ہے تو وہاں بھی جہاں تک ممکن ہو ایسی تدبیر اور حیلوں سے بچنا چاہئے تاکہ جھوٹ کا دروازہ نہ کھل جائے کئی دفعہ دیکھا گیا کہ ضرورت کے وقت جتنی ضرورت ہوتی ہے اور جس طرح کہنا چاہئے لوگ اس ضرورت کو اپنی حد میں نہیں رکھتے بلکہ بظاہر دیندار لوگ بھی صاف جھوٹ بولنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں اس کو نماز کے برابر ثواب سمجھنے لگتے ہیں جبکہ یہ جھوٹ کو حلال کرنا ہے اور قطعی حرام کو حلال جاننا کفر ہے۔

### تورہ کی ایک مثال!

حضرت سوید بن حظلہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے ارادے سے نکلے ہمارے ساتھ وائل بن حجر رضی اللہ عنہ بھی تھے، راستے میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کو ان کے کسی دشمن نے پکڑ لیا ہمارے ساتھ اور لوگوں نے تو قسم کھانے میں جھجک (اور گناہ) محسوس کیا مگر میں نے قسم کھا کر یوں کہہ دیا کہ یہ میرا بھائی ہے اس نے میری وجہ سے ان کو چھوڑ دیا جب ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں نے سارا واقعہ عرض کیا کہ ان لوگوں نے تو قسم کھانے میں گناہ محسوس کیا مگر میں نے قسم کھائی کہ یہ میرا بھائی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

(صَدَقْتُ الْمُسْلِمُ أَخُ الْمَسْلِمِ) (ابوداؤد: کتاب الایمان والنذر)

”تم نے سچ کہا ہے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہی ہوتا ہے۔“

شرعی مجبوری کے وقت اگر مصلحت کے لئے کچھ کہنا پڑے تو بھی سچ بولنے کی کوشش کریں!

جب کبھی کسی اہم مصلحت کے لئے کچھ کہنا پڑے تو پھر بھی صاف جھوٹ کہنے کی بجائے ایسی بات کہہ دینی چاہئے جو اصل کے مراد کے لحاظ سے تو سچ ہو مگر بظاہر مخاطب اس سے دوسرا مطلب لے لے اسی کا نام ”تورہ“ ہے اور یہ دراصل صدق ہی کی ایک کذب نما صورت ہے لیکن وہ بھی ایسی مجبوری کی صورت میں جائز ہے مثلاً فساد کو اور فتنہ کو ختم کرنے کی نیت سے لیکن بلا ضرورت اور بغیر کسی حاجت کے ایسا کہنا بھی صدق کے منافی ہے بلکہ اگر اس سے مقصد کسی کی حق تلفی ہو تو پھر ایسی دو معنی والی بات بھی حرام ہے۔ ضرورت کے وقت ایسی بات جو دو معنی رکھتی ہو اسکے بارے میں دو روایات پیش کرتے ہیں۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کا ایک بچہ بیمار ہوا اور اس کا انتقال ہوا اس وقت یہ (یعنی ابو طلحہ) کہیں باہر گئے ہوئے تھے، جب حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ رات کے وقت گھر آئے تو انہوں نے پوچھا کہ بچے کی



طبیعت کیسی ہے تو ان کی بیوی یعنی حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا وہ خاموش ہو گیا ہے اور اب اس کو بالکل آرام آ گیا ہے، حضرت ابو طلحہ ؓ نے یہ گمان کیا کہ بچہ صحت یاب ہو چکا ہے (حالانکہ وہ مکمل خاموش تھے اور بیماری سے مکمل آرام پا کر وفات پا گئے تھے) بیوی نے ان کے سامنے کھانا پیش کیا انہوں نے کھانا کھایا اور مطمئن ہو کر اپنی بیوی کے ساتھ مہستری بھی کی، جب صبح ہوئی اور حضرت ابو طلحہ باہر جانے لگے تو ان کی بیوی (حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا) نے صاف بات بتلا دی کہ بچہ تو وفات پا گیا ہے انہوں نے صبح کی نماز نبی کریم ﷺ کے ساتھ پڑھی پھر اس کے بعد نبی کریم ﷺ کو سارا واقعہ سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ شاید اللہ تعالیٰ اس رات میں ان دونوں (یعنی ابو طلحہ ؓ اور ام سلیم رضی اللہ عنہا) کے لئے برکت فرمائے سفیان راوی کہتے ہیں کہ ایک انصاری نے بیان کیا ہے کہ میں نے ان کے نو بچوں کو دیکھا ہے وہ سب کے سب قرآن مجید کے قاری (یعنی عالم و حافظ) تھے۔ (بخاری: ج اول ص ۱۷۴)

اور بعض روایتوں میں اس واقعہ کو زیادہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ جب صبح ہوئی تو حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر ابو طلحہ ؓ سے پوچھا کہ بتاؤ اگر کسی نے کسی کے پاس اپنی کوئی چیز بطور امانت رکھی ہو پھر وہ اس سے واپس مانگ لے تو کیا اس شخص کو اس کے روکنے کا کوئی حق ہے انہوں نے کہا نہیں تو حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا پھر اپنے بچے پر صبر کرو۔ (مسلم)

اس مذہب اور دین اسلام میں رنگی ہوئی صحابیہ نے رات کے وقت اپنے شوہر کو اچانک ایسے غم کی خبر دے دینا بھی نامناسب سمجھا اور دوسری طرف صاف جھوٹ بولنے سے بھی پرہیز کیا بلکہ ایسے الفاظ کہہ دیئے جو اپنی جگہ درست بھی تھے اور شوہر نے اس کے دوسرے معنی سمجھ کر رات اطمینان سے گزاری۔

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِي يَصْلُحُ بَيْنَ النَّاسِ وَيَقُولُ خَيْرًا أَوْ يَنْصِي خَيْرًا)

”وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان صلح و صفائی کراتا ہے خیر و بھلائی کی بات کرتا ہے اور (ایک دوسرے کو ان کی) خیر اور اچھی باتیں پہنچاتا ہے۔“ (صحیح بخاری، صحیح مسلم)

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے باہمی نزاع اور فتنہ و فساد ختم کرانے کے لئے اور ان کے درمیان صلح و صفائی کرانے کے لئے اگر کوئی شخص ایک فریق کی طرف سے دوسرے فریق کو ایسی خیر اندیشی کی بات پہنچائے جس کی وجہ سے فتنہ و فساد کی آگ بجھ جائے اور ان کے درمیان صلح ہو جائے اگر یہ مخلص بندہ کسی ایک فریق کی طرف سے دوسرے فریق کو ایسی خیر و بھلائی کی باتیں بھی پہنچائے جو واقعہ میں اس فریق نے نہ کہی ہوں پھر بھی ایسا شخص



جھوٹا نہیں ہے بلکہ یہ مسلمانوں کا خیر خواہ اور مخلص ہے کہ لوگوں کو فتنہ و فساد اور باہمی نزاع سے بچا لیتا ہے اور ان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرتا ہے البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ بات خیر و بھلائی کی ہونہ یہ کہ وہ کسی برائی جیسے شرک و فسق وغیرہ پر مشتمل ہو۔

### ارادہ اور عزم کی سچائی اور تکمیل عزم کی سچائی!

ارادہ اور عزم میں سچائی اس کا مطلب یہ ہے کہ ارادہ اور عزم میں کوئی تردد اور ضعف نہ ہو مثلاً کوئی غریب اس بات کا ارادہ اور عزم کر لیتا ہے کہ میرے ہاتھ اتنا مال آجائے تو اس کو فلاں کار خیر میں لگا دوں گا یا یوں عزم کر لے کہ جب دشمنان اسلام کے ساتھ لڑنے کا موقع آجائے تو اس میں اپنی جان کی بازی لگا دوں گا اور جس وقت وہ یہ ارادہ کر رہا ہو اس وقت اس کا یہی ارادہ اور عزم ہو اور اس میں کوئی اضطراب اور تردد نہ ہو اس کو عزم کی سچائی کہتے ہیں لیکن اس عزم کے سچا ہونے کا علم اس وقت ہوگا کہ جب اس کو پورا بھی کر لے کیونکہ کسی بات کا عزم کرنا کوئی زیادہ کمال کی بات نہیں بلکہ انسان کا کمال یہ ہے کہ جو قول اور بات کرے یا جس نیک کام کا عزم و ارادہ کر لے اس میں وہ سچا بھی ہو اور پکا بھی یعنی اس عزم کو عملی جامہ پہنانے کی حتی الوسع کوشش کرے اور جو نبی اس کے عزم کی تکمیل کے اسباب مہیا ہو جائیں اس کو پورا کرے کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک نیک کام کا عزم کر لیتا ہے لیکن پھر اس کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کرتا تو ایسے انسان کا ارادہ بہت کمزور ہوتا ہے اور اس کے ارادے کو مرض اور بیماری لگ گئی ہوتی ہے اور ایسی صورت میں اس کا ارادہ نہیں ہوتا بلکہ صرف تمنا اور خواہش ہوتی ہے اور ایسے شخص کو اگر پورے اسباب بھی مہیا ہو جائیں پھر بھی وہ اس عزم کو پورا نہیں کرتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال کے خرچ کرنے کا عزم کیا ہے تو پھر مال ملنے کے وقت وہ اس کو خرچ نہیں کر سکے گا اور اگر جہاد کا عزم کیا ہے تو وقت آنے پر وہ جہاد سے جی چرائے گا تو ایسے شخص کا یہ ارادہ اور عزم سچا نہ تھا بلکہ یہ اس کی ایک خواہش تھی جس کو کسی دوسری خواہش نے ختم کر دیا اور عزم کا سچا اور پکا وہی شخص ہو سکتا ہے جو کامل مومن ہو اور منافق اور کمزور قسم کا مسلمان اس امتحان میں پورا نہیں اتر سکتا چنانچہ اللہ تعالیٰ ان دو قسم کے لوگوں (یعنی جو عزم کے پکے اور سچے ہیں اور جو اس میں پکے اور سچے نہیں) کو مندرجہ ذیل آیتوں میں یوں بیان فرمایا ہے:

﴿وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ فَإِذَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ مُحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ

فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشَىٰ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ ۝ (سورت محمد: آیت ۲۰)

”اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی جاتی تو جس وقت کوئی حکم

(اور واضح) سورت نازل ہوتی ہے اور اس میں قتال کا (بھی) ذکر ہوتا ہے تو جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہوتی ہے (تو اس اعلان کے وقت) تم ان کو دیکھو گے کہ تمہاری طرف (خوف اور بزدلی کی وجہ سے) ایسے دیکھتے ہیں جیسے ان پر موت کی غشی طاری ہو، پس ان لوگوں کی ہلاکت اور بربادی قریب ہے۔“

اور ایک دوسری جگہ عزم کے پکے اور سچے لوگوں کی تعریف کرتے ہوئے اور دوسری قسم لوگوں کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا ۝ لِيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنْفِقِينَ إِن شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا﴾ (احزاب: ۲۳-۲۴)

”مسلمانوں میں سے ایسے (جوان مرد) لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے کئے وعدے کو سچ کر دیکھا یا پھر ان میں سے بعض تو اپنی نذر اور کام پورا کر چکے (یعنی شہید ہو گئے) اور بعض ان میں (جام شہادت کو نوش کرنے) کے منتظر ہیں اور انہوں نے عہد میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے (بلکہ بے تابی سے وہ شہادت کے منتظر ہیں) تاکہ اللہ تعالیٰ سچوں کو ان کے سچ کا صلہ (بدلہ اور اجر و ثواب) دیدے اور منافقوں کو اگر چاہے عذاب دیدے یا چاہے ان کی توبہ قبول فرمائے بے شک اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔“

حضرت انس بن نصر ؓ کو غزوہ بدر میں شرکت کا موقع نہیں ملا تھا اور انہیں افسوس تھا کہ میں کفر اسلام کی پہلی جنگ میں شرکت سے محروم رہا، تو انہوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ کہہ دیا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ میں شرکت کا موقع ملا تو اپنی جان کی بازی لگا دوں گا پھر وہ غزوہ احد میں شریک ہوئے اور تلوار اور نیزے اور تیر کے (اسی ۸۰) زخم کھا کر شہادت حاصل کی اپنے عزم کو پورا کرنے اور سچا کر دکھانے والی یہ ایک بہترین مثال ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی شان میں اور ان جیسے لوگوں کے متعلق مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ (بخاری: تفسیر سورہ احزاب)

### طلب کی سچائی!

”طلب کی سچائی“ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جو اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے تو اس طلب میں وہ سچا بھی ہو مثلاً اولاد مانگتا ہے تو اس کے لئے شادی کی بھی کوشش کرے یا دین اسلام کے غلبہ کی دعا مانگتا ہے تو اس کے لئے حتیٰ الوسع کوشش بھی کرے اسی طرح اگر بہترین اخلاق اور اعلیٰ مقامات کا طالب ہو مثلاً زید، توکل، صبر و استقامت،

سخاوت و شجاعت اور امانت وغیرہ کے اعلیٰ مقامات کا طالب ہے جیسا کہ ہر مسلمان یہ شوق رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے مانگتا بھی ہے لیکن ان چیزوں کے حصول اور طلب میں سچا وہی شخص ہے جو ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے حتیٰ الوسع کوشش بھی کرتا ہے ورنہ اگر وہ ان کے لئے کوشش نہیں کرتا تو اس کی یہ طلب جھوٹی طلب ہے۔

### صدقات کا خلاصہ!

صدقات کا خلاصہ یہ ہوا۔

(۱) زبان کی سچائی۔

(۲) عمل اور کردار کی سچائی۔

(۳) نیت کی سچائی۔

(۴) عزم کی سچائی اور ایفاء عزم کی سچائی۔ (یعنی عزم کو پورا کر کے دکھانا)

(۵) طلب کی سچائی۔

### قرآن مجید اور صدقات!

جب صدقات اور سچائی کے خلاصہ کو معلوم کر لیا اب اس کے متعلق قرآن مجید کی چند آیتوں کو پیش کرتے ہیں:

(۱) ﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهِجَرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ط أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ (سورہ حشر: آیت ۸)

”وہ اموال (ان فقراء و مہاجرین کے لئے بھی ہیں جو اپنے گھر اور جائیدادوں سے نکال باہر کئے گئے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلب گار ہیں وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی حمایت میں لگے رہتے ہیں یہی لوگ سچے ہیں۔“

پورے دین اسلام پر سچائی کے ساتھ عمل کرنے والا سچا ہے!

(۲) ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ﴾ (حجرات: آیت ۱۵)

”یعنی مومن لوگ تو وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے (کوئی اور کسی

طرح) شک نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا یہی صادق (سچے) لوگ ہیں۔“

یہاں ان لوگوں کو اس لئے سچا فرمایا گیا کہ جس ایمان کا انہوں نے اقرار کیا تھا عمل سے اس کی تصدیق کردی اور ان کی یہی جدوجہد ان کی اندرونی کیفیت کی صحیح اور سچی ترجمان ہوئی۔

(۳) ﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ  
وَالسَّائِلِينَ وَفَى الرِّقَابَ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي  
الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ٥﴾ (البقرہ: آیت ۱۷۷)

یعنی ”پوری نیکی اور وفاداری اور سچائی کی راہ صرف یہی نہیں کہ تم نے اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لیا بلکہ وفاداری اور نیکی تو ان لوگوں کی ہے جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر (اور اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی) کتابوں پر اور (اللہ تعالیٰ کے تمام) نبیوں پر ایمان لائے ہیں اور اس کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں پر، مسکینوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے دیتے ہیں اور غلاموں کو آزاد کرنے کے لئے مال خرچ کرتے ہیں نیز نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور (اپنی بات کے پکے ہوتے ہیں) جب بھی وہ عہد اور قول و اقرار کرتے ہیں تو اسے پورا کرتے ہیں، تنگی اور جنگ کے وقت (یعنی ہر حال) میں صبر کرنے والے (اور ہر حال میں دین پر ثابت قدم رہتے ہیں) تو یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی اور پرہیزگار ہیں۔“

### صادق کون ہوتا ہے؟

مذکورہ بالا بحث سے صادق جاننا بہت آسان ہے کہ صادق وہی ہوتا ہے جو سچ بولتا ہو اور وعدہ کو پورا کرتا ہے امانتدار ہو، ذمہ دار ہو جو کہتا ہے اور جو عزم کرتا ہے اس کو کر کے دکھاتا ہے، حقوق اللہ اور حقوق العباد کو پورا کرنے والا ہو، منعم حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر کرنے والا ہو اور اس کا ہر عمل قول کا محرک اور باعث صحیح نیت یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اور خوشنودی کا حاصل کرنا ہوتا ہے اور ہر وقت حق اور سچ کا طالب اور اس کا متلاشی رہتا ہے، اس کے باطن اور ظاہر میں یکسانیت ہوتی ہے اور قول اور عمل میں مطابقت ہوتی ہے طلب میں سچا ہوتا ہے غرض پوری شریعت مطہرہ پر اخلاص اور سچائی کے ساتھ عمل کرنے والا ہوتا ہے۔

### صدیق کون ہوتا ہے؟

صدیق مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں نہایت سچا اور راست باز جو شخص ان پانچ چیزوں (یعنی ”زبان کی

سچائی، ”عمل و کردار کی سچائی“، ”نیت کی سچائی“، ”عزم اور وفائے عزم میں سچائی“ اور طلب میں سچائی) میں کمال حاصل کرے اس کا شمار صدیقیوں میں ہوا کرتا ہے، صدیق کی فطرت اور اس کا ظاہر و باطن ہر گرد و غبار سے یوں پاک و صاف ہوتا ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی سچ اور حق کو پالیتا ہے، تو بے ساختہ اس کو قبول کر لیتا ہے اس کے سامنے حق و باطل کو ملا کر پیش کریں تو وہ باطل سے حق کو اسی طرح جدا کرتا ہے جیسا کہ مقناطیس راکھ میں ملے ہوئے لوہے کے ذروں کو کھینچ کر جدا کر لیتا ہے اس لئے ایسے لوگوں کو خیر و شر کے درمیان التباس نہیں ہوتا، انسان کی ظاہری نگاہ جس طرح سفید و سیاہ کے درمیان بے تکلف امتیاز کر لیتی ہے۔ اس طرح اس کے دل کی آنکھیں اور نگاہ حق و باطل میں امتیاز کر لیتی ہے۔ پھر صدیقیوں کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ بہت سے درجات ہو سکتے ہیں اور حضرت ابو بکرؓ کو جو ”صدیق“ کے نام سے پکارا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ دوسرے صحابہ کرامؓ مقام صدیقیت کو نہیں پہنچتے بلکہ حضرت عمر فاروقؓ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ اور اسی طرح دوسرے صحابہ کرامؓ بھی مقام صدیقیت پر فائز تھے، لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے اعلیٰ مقام صدیقیت پر فائز تھے یہی وصف ان میں بہت ہی غالب تھا اس لئے ان کو صدیق کا لقب ملا، ورنہ جس شخص میں بھی مذکورہ صفات کمال درجہ میں پائی جائیں تو اس کا شمار صدیقین میں ہوگا۔

### صدقت اور سچائی کے فضائل!

﴿قَالَ اللَّهُ هَذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصَّادِقِينَ صِدْقُهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ (مائدہ: آیت ۱۱۹)

یعنی ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے یہ وہ دن ہے جس میں سچوں کو ان کی سچائی کا کم آئی گی ان (یعنی سچوں) کے لئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ان (جنتوں) میں ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان (یعنی سچوں) سے راضی ہو گئے اور وہ (یعنی سچے لوگ) اس (یعنی اللہ تعالیٰ) سے راضی ہو گئے یہی عظیم کامیابی ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آج کا دن تو ان راست بازوں کی فتح مند یوں اور کامیابیوں کے ظہور کا دن ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے عہد اخلاص و سچائی کے ساتھ پورے کئے ہیں۔ ان کے لئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو واوہ اللہ تعالیٰ سے راضی ہوئے یعنی ان کے رب نے جو کچھ ان سے چاہا انہوں نے اس کی رضا کے مطابق اس کو پورا کر کے دکھایا اور انہوں نے اپنے رب سے جو امیدیں رکھیں وہ ان کی توقعات اور تصورات سے اربوں درجہ اوپر پوری ہو گئیں بلاشبہ یہی عظیم

کامیابی ہے۔ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صدق و سچائی کی عظمت کے لئے یہ بہت کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی مدح میں سب سے پہلے اس فضیلت کا تذکرہ فرمایا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَإِذْ كَرَّمْنَا إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا﴾ (مریم آیت ۴۱)

یعنی ”(اور) کتاب (یعنی قرآن مجید) میں (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کا ذکر کیجئے بے شک وہ سچا نبی تھا۔“  
بلاشبہ عملی فضائل میں صداقت کو ایک طرح کی بنیادی حیثیت حاصل ہے، دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود کے تمام امور کا انحصار صداقت اور سچائی پر ہی ہے۔

### سچائی پر جنت کی ضمانت!

حضرت عبادہ بن صامت ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(أَصْمَنُوا لِي سِتَامِينَ أَنْفُسِكُمْ أَصْمَنُ لَكُمْ الْجَنَّةَ أَصْدُقُوا إِذْ حَدَّثْتُمْ وَأَوْفُوا إِذَا وَعَدْتُمْ وَأَذُوا إِذَا تُثِمِّنْتُمْ وَاحْفَظُوا فَرَاجَكُمْ وَغَضُّوا أَبْصَارَكُمْ وَكَفُّوا أَيْدِيَكُمْ) (احمد و بیہقی و مشکوٰۃ: باب حفظ اللسان)

یعنی ”تم چھ باتوں کے ضامن ہو جاؤ اور ان کی ذمہ داری لے لو تو میں تمہارے لئے جنت کی ذمہ داری لے لیتا ہوں۔ جب بات کرو تو ہمیشہ سچ بولو، جب وعدہ کرو تو پورا کرو اور جب تمہیں کوئی امانت سپرد کی جائے تو اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کرو اور (حرام کاری سے) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرو اور (نامناسب و ممنوعہ چیزوں سے) اپنی آنکھوں کو بند رکھو (یعنی کوشش کرو کہ کسی ممنوعہ چیز پر نظر نہ پڑے اور اپنے ہاتھوں کو ظلم اور ناجائز چیزوں کو لگانے سے) روکو۔“  
سچ بولنا، ایفاء عہد اور ادائے امانت اور آنکھیں ہاتھ اور تمام اعضاء و جوارح جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانتیں ہیں ان کو بغیر خیانت کے ٹھیک ٹھیک استعمال کرنا یہ سب کچھ صداقت اور سچائی کی مختلف صورتیں ہیں جیسا کہ اس کا مفصل بیان گزر چکا ہے، اور ایک حدیث شریف میں ہے کہ:

(مَنْ سُرَّهَ أَنْ يُحِبَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أَوْ يُحِبَّهُ اللَّهُ وَرَسُولَهُ فَلْيَصْذُقْ حَدِيثَهُ إِذَا حَدَّثَ وَالْيُؤَدِّ أَمَانَتَهُ

إِذَا أَتَمَّنَ وَلْيُحْسِنْ جَوَارِمَ جَارِهِ) (بیہقی مشکوٰۃ باب الشفقة والرحمة على الخلق)

”جس شخص کی یہ خوشی ہو اور وہ یہ چاہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ (ﷺ) سے سچی محبت ہو یا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اس سے محبت کریں تو اسے چاہئے کہ جب وہ بات کرے تو ہمیشہ سچ بولے اور جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو (اس میں ذرا برابر) خیانت کئے بغیر اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کرے اور جس کے پڑوس

میں رہتا ہوا اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔“

سچا بہترین شخص ہوتا ہے!

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ سب سے بہتر شخص کون

ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

(كُلُّ مَخْمُومٍ الْقَلْبِ صَدُوقُ اللِّسَانِ)

”ہر وہ شخص جو ”مخمووم القلب“ اور زبان کا سچا ہو۔“

صحابہ کرامؓ نے عرض کیا ”زبان کا سچا“ تو ہم سمجھ گئے ”مخمووم القلب“ کیا ہوتا ہے (یہ ہماری سمجھ میں نہیں

آیا) تو آپ ﷺ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

(هُوَ النَّقِيُّ التَّقِيُّ لَا اِثْمَ عَلَيْهِ وَلَا بَغْيٍ وَلَا غِلٍّ وَلَا حَسَدٍ) (ابن ماجہ و بیہقی مشکوٰۃ: کتاب الرقاق)

یعنی ”وہ دل کا صاف اور خدا ترس انسان ہے جس پر نہ گناہ کا بوجھ ہو، نہ ظلم و سرکشی کا بوجھ، نہ اس کے دل میں

کینہ ہو اور نہ حسد۔“

ظلم حسد کینہ وغیرہ صداقت اور اخلاق کے منافی چیزیں ہیں۔

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کے نزدیک بدترین اور مبغوض ترین چیز جھوٹ تھی!

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جھوٹ سے زیادہ کوئی چیز مبغوض نہ تھی اور جس

شخص کے متعلق یہ معلوم ہو جاتا کہ اُس نے کوئی جھوٹ بولا ہے تو اُس وقت تک آپ کے مبارک دل میں یہ بات

کھٹکتی تھی جب تک وہ اس سے توبہ نہ کر لینا۔ (مجمع الذوائد: ج اول ص ۱۳۲ و ترغیب و ترہیب: ج ۳ ص ۵۹۷)

اور بعض روایتوں میں صحابہ کرامؓ کے متعلق یہ بات منقول ہے کہ اصحاب رسول اللہ ﷺ کے لئے مبغوض

ترین چیز جھوٹ تھا۔ (مسند بزار رواہ البیہقی باسناد حسن و رواہ ابوداؤد و ترمذی و حسنہ دیکھئے ترغیب و ترہیب)

خوش طبعی میں بھی جھوٹ سے پرہیز کرو!

اور حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(اَنَا زَعِيمٌ بِبَيْتٍ فِي وَسْطِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْكَذِبَ وَإِنْ كَانَ مَازِحًا) (ترغیب و ترہیب)

”میں اس شخص کے لئے جنت کے درمیان گھر کا کفیل ہوں اور ضامن ہوں جس نے جھوٹ سے (بالکل اور



قطعاً) پرہیز کیا اگرچہ خوش طبعی کرنے والا کیوں نہ ہو (کبھی مزاح اور خوشی طبعی کے طور پر بھی خلاف واقعہ بات نہ کہے)۔“

### صداقت جنت میں پہنچانی والی چیز ہے!

حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے پوچھا یا رسول اللہ جنت (حاصل کرنے) کا عمل کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

(الصِّدْقُ وَإِذَا صَدَقَ الْعَبْدُ بِرَّوَاقِبِهِ آمَنَ وَإِذَا آمَنَ دَخَلَ الْجَنَّةَ)

”(سچ) اور جب بندہ سچائی کو اختیار کر لیتا ہے تو نیک بن جاتا ہے اور جب نیکو کار ہوتا تو ایماندار بن جاتا ہے اور جب ایماندار بن جاتا ہے تو جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔“

اس کے بعد پھر اس شخص نے آپ ﷺ سے دوبارہ پوچھا کہ یا رسول اللہ! جہنم کا عمل کیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

(الكَذِبُ إِذَا كَذَبَ الْعَبْدُ فَجْرًا وَإِذَا فَجَرَ كَفَرًا وَإِذَا كَفَرَ دَخَلَ يَعْنِي النَّارَ) (احمد دیکھئے الفتح الربانی: ج ۱ ص ۹۲)

(۹۲)

”(جھوٹ) جب بندہ جھوٹ کو اختیار کر لیتا ہے، تو فاسق اور شریعت کے حدود سے تجاوز کرنے لگتا ہے اور جب تجاوز کرنے لگتا ہے تو کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور جب کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے تو دوزخ کی آگ میں داخل ہو جاتا ہے۔“

### صداقت اور سچائی بلند درجات پر پہنچانے والی چیز ہے!

صداقت اور راستی ایسی چیز ہے جو انسان کو بلند سے بلند درجات پر پہنچاتی ہے چنانچہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت لقمان حکیم سے پوچھا گیا کہ یہ بلند مرتبہ آپ کو کیسے نصیب ہوا (یعنی اس کے ظاہری اسباب کیا تھے) تو انہوں نے ارشاد فرمایا:

(صِدْقُ الْحَدِيثِ وَأَدَاءُ لِّأَمَانَةٍ وَتَرْكُ مَالٍ يَعْنِي) (مؤطا امام مالک مشکوٰۃ باب حفظ اللسان)

”راست گوئی، اداۓ امانت اور بیکار اور فضول باتوں سے کنارہ کشی کی بنا پر۔“

بلاشبہ اصلی حکمت عقلمندی اور دانائی یہی ہے کہ انسان راست گفتار اور نیک کردار رہے اور یہی دو چیزیں ہیں (جو کہ صداقت کی دو مختلف صورتیں ہیں) جو انسانی زندگی کے اعلیٰ جوہر ہیں جس نے ان کو اختیار کیا اور اپنی پوری زندگی کو ان دو چیزوں کے مطابق پورا پورا ڈھال لیا تو انسانیت کے عظیم مراتب پر پہنچ جائے گا۔

### بچوں کے ساتھ رہنے کی تاکید!

ہم سچائی کی فضیلت اور اہمیت کو اس بات سے بھی معلوم کرتے ہیں کہ قرآن مجید اور حدیث میں صرف یہی نہیں کہ وہ ہر حال میں سچائی کا حکم دیتے ہیں بلکہ وہ اس بات کی بھی تاکید فرماتے ہیں کہ ہمیشہ بچوں کا ساتھ دیتے رہو اور بچوں کی صحبت اور ہم نشینی کو اختیار کرو، تاکہ ان کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے اور متقی بن جاؤ یا سچائی اور پرہیزگاری میں ترقی کر جاؤ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ (توبہ: آیت ۱۱۹)

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی (نافرمانی) سے ڈرتے رہو اور بچوں کے ساتھ رہو۔“

### مقام صدیقیت کی فضیلت!

جب مقام اور صداقت کی فضیلت اور اہمیت سامنے آچکی ہے تو اس سے مقام صدیقیت کا اندازہ خود بخود دلگ جاتا ہے کہ ”صدیق“ مبالغہ کا لفظ ہے یعنی انتہائی سچا اور راست باز اور اس مقام کی فضیلت کو اس سے بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ نبوت اور نبی کے بعد بس صدیقیت اور صدیق کا مرتبہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں نبیوں کے بعد صدیقین کا ذکر فرمایا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصَّادِقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ

ج وَحَسَنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا﴾

”اور جو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء (علیہم السلام) صدیقین صالحین (کے ساتھ ہوگا) اور وہ بہترین رفیق ہیں۔“

نیکی اور بس سچائی کو اپنے اوپر لازم کرو اسی میں دنیا و آخرت کی بڑائی اور بھلائی ہے!

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(عَلَيْكُمْ بِالصَّدَقِ الصَّدَقُ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَ

يَتَحَرَّرُ الصَّدَقُ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللَّهِ صِدْقًا وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبُ فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ وَإِنَّ

الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّرُ الْكَذِبُ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللَّهِ كَذِبًا) (بخاری مسلم)

”تم سچائی کو اپنے اوپر لازم کرو کیونکہ سچائی نیکی کے راستے پر ڈال دیتی ہے اور نیکی جنت (کے اعلیٰ درجات)

تک پہنچاتی ہے اور جو آدمی جب ہمیشہ سچ بولتا ہے اور (ہر قول و فعل میں حق اور) سچائی کو تلاش اور اختیار کر لیتا ہے تو وہ (مقام صدیقیت کو پہنچ کر) اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیقین میں لکھ دیا جاتا ہے اور تم جھوٹ سے ہمیشہ بچتے رہو، کیونکہ جھوٹ فسق اور بدکاری کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور آدمی جب جھوٹ بولنے کا عادی ہو جاتا ہے اور جھوٹ کو اختیار کر لیتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کذاب یعنی بڑا جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے (اور لعنتی بن کر رہ جاتا ہے کہ اس سے ہدایت کی صلاحیت اور استعداد ہی ختم ہو جاتی ہے)۔“

### سچائی نیکی کا میلان اور جھوٹ برائی کا میلان پیدا کرتی ہے!

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ سچائی کو اختیار کرنا صرف ایک نیکی ہی نہیں ہے بلکہ جب انسان اس کو اختیار کر لیتا ہے تو اس کی یہ خاصیت بھی ہے کہ وہ آدمی کو زندگی کے تمام شعبوں میں صالح اور نیک کردار بنا کر جنت کے اعلیٰ درجات کا مستحق اور قابل بنا دیتا ہے اور ہمیشہ سچ بولنے والا اور سچائی کو اختیار کرنے والا مقام صدیقیت (یعنی انتہائی راست بازی اور سچائی کے مقام) کو پہنچ جاتا ہے اسی طرح جھوٹ بولنا اور جھوٹ کو اختیار کرنا صرف ایک برائی نہیں بلکہ اس خبیث خصلت کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ آدمی کے اندر فسق و فجور کا میلان پیدا کر کے اور اس کی پوری زندگی کو مجرمانہ بنا کر جہنم میں پہنچا دیتی ہے بالآخر یہی خبیث عادت انسان کو کذابیت کے مقام پر لا کر پورا لعنتی بھی بنا دیتی ہے اور اس میں ہدایت کی روشنی پہنچنے کی استعداد ہی ختم ہو جاتی ہے، جس کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا ایندھن بن جاتا ہے۔

### علاج جھوٹ اور صدق!

یہاں اس حدیث میں صادق بلکہ صدیق بن جانے کا طریقہ بھی بتلایا گیا ہے کہ سچ بولنے اور ہر قول و فعل میں سچائی کی طلب اور سچائی کو اختیار کرنے کی وجہ سے بالآخر انسان صادق بلکہ صدیق بن جاتا ہے اور سچائی کی جو صورتیں آسانی کے لئے اوپر بیان کی گئی ہیں ان کو اپنایا جائے اور اس میں خوب کوشش کی جائے تو ان شاء اللہ انسان سچا بلکہ انتہائی سچا بن سکتا ہے۔

### بس سچائی کو اختیار کرنا ہی شرافت انسانی اور راہ نجات ہے!

مذکورہ بالا قرآن مجید کی آیتوں اور حدیثوں پر نظر کریں اور یہی مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ سچائی کی عادت انسان کو بلند سے بلند مقام پر پہنچا دیتی ہے اور اس کے مقابلہ میں جھوٹ کی عادت انسان کو انتہائی پستی اور ذلت کے بدبودار

گڑھوں میں پھینک دیتی ہے۔ اس لئے انسان کو چاہئے کہ وہ کسی حالت میں سچائی کو ہاتھ سے نہ جانے دے، ہمیشہ سچ بولے اور حق و سچ کا طالب رہے اور ہر قول و فعل تجارت اور اپنی پوری زندگی کے تمام شعبوں اور معاملات میں سچائی کو اختیار کرے ظاہر اور باطن میں یکسانیت اور یک رنگی کو اختیار کرے اپنے آخری سانس تک اپنے باطن اور اندرون کو صاف ستھرا اور پاکیزہ تر بنانے کی کوشش میں لگا رہے جھوٹ اور جھوٹی راہ سے قطعاً پرہیز کرے اگرچہ سچ بولنے اور سچائی کو اختیار کرنے میں بظاہر ہلاکت اور بربادی نظر آئے اور جھوٹ میں نجات لیکن یقین کریں کہ نجات سچ اور سچائی ہی میں ہے بلکہ اس کے متعلق ایک روایت بھی موجود ہے منصور بن معتمر ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

(تَحَرُّوا الصِّدْقَ وَإِنْ رَأَيْتُمْ أَنَّ الْهَلَكَهَ فِيهِ فَإِنَّ فِيهِ النِّجَاةَ) (ترغیب و ترہیب: ج ۳ ص ۵۹۰)

”صدق اور سچائی کو اختیار کرو اور اگرچہ تم اس میں (بظاہر) ہلاکت اور بربادی دیکھو پس اسی (سچائی) میں نجات ہے۔“

اللہ ہم کو بھی اپنے سچے بندوں میں شامل فرمائے آمین۔

☆.....☆.....☆

### انفاق کا بیان!

انفاق کا مطلب یہ ہے کہ اپنی قوت و توانائی اور کمائی میں سے اللہ تعالیٰ کے لئے خرچ کرنا جو دعوت اور نفاذ حق میں بھی اور جماعتی زندگی کے لئے انفاق فی سبیل اللہ کا ہونا ناگزیر ہے اور جس شخص کے اندر انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ نہ ہو وہ نہ تو دعوت حق اور نفاذ حق کے فرائض کو انجام دے سکتا ہے اور نہ وہ جماعت حقیقی معنوں میں جماعت حقہ بن سکتی ہے اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی خدمت کر سکتی ہے اس لئے ضروری سمجھا کہ اس کتاب میں انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت اور بخل کی مذمت کو بھی سامنے لایا جائے۔ اب اس مختصر تمہید کے بعد انفاق اور بخل کے متعلق جو کچھ پیش کیا ہے اس کو ملاحظہ کیجئے۔

اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی مخلوق کی نفع رسانی کے واسطے اپنی کمائی اور قوتوں کو خرچ کرنا! مختلف انداز میں بار بار ذکر ہو چکا کہ دین اسلام کی عملی بنیادیں صرف دو ہیں ایک نماز و ذکر دوسری اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال و دولت اور صلاحیتوں اور قوتوں میں سے مخلوق الہی کے نفع رسانی کے لئے خرچ کرنا۔ اللہ تعالیٰ کیلئے اس کی مخلوق کی نفع رسانی کے واسطے اپنی کمائی اور قوتوں کو خرچ کرنے کے فضائل و فوائد!

رحم اور جذبہ رحم کا تعلق اگرچہ انسان کے دل سے ہے لیکن اس رحم کا پھل اور لازمی نتیجہ مخلوق کی عملی طور پر خدمت اور انفاق یعنی اپنا مال و جان مخلوق کے فائدہ رسانی کے لئے لگانا ہے۔ مختلف انداز میں بار بار ذکر کر چکا ہوں کہ دین اسلام کی عملی بنیاد صرف دو ہیں ایک نماز و ذکر، دوسری اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے مال و دولت اور صلاحیتوں اور قوتوں میں سے مخلوق الہی کے نفع رسانی کے لئے خرچ کرنا۔

### انسانی نفس کی بیماریوں اور تزکیہ نفس میں انفاق کا کردار!

تزکیہ نفس کی طہارت اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے رنگ میں رنگنا جو کہ نبوت کا اصل مقصد ہے اور جس کا پورا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اس تزکیہ کے بنیادی رکن دو ہیں ایک نماز و ذکر وغیرہ، ان سے اللہ تعالیٰ کے خوف و محبت اور اس کے تعلق میں اضافہ اور ترقی ہوتی رہتی ہے اور دوسرا انفاق یعنی اپنے مال و دولت، اپنی قوت میں سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی مالی و جانی خدمت کرنا۔ اس کے ذریعے دنیا پرستی اور دنیاوی اسباب کی محبت کھرچتی رہتی ہے اور جب دل سے مال و دولت اور دنیاوی عزت و منصب کی محبت کھرچ جاتی ہے اور انسان میں یہی دو قسم کی بیماریاں پائی جاتی ہیں۔ ایک نفسانی خواہشات اور نفسانی بیماریاں۔ دوسری دنیاوی مال و اسباب کی حرص و لالچ۔ پہلی قسم کی بیماریوں کا علاج انفاق یعنی مخلوق کی مالی و جانی خدمت کرنے میں ہے اور جب ان دونوں بنیادوں پر سچائی کے ساتھ عمل ہوتا ہے تو انسان کا نفس دل پاک و صاف ہو جاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے رحم و عدل وغیرہ جیسی صفات سے رنگین ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ دنیا و آخرت میں فلاح پاتا ہے اور کامیاب و کامران ہو جاتا ہے۔

### اسلام عام رحمہ لی کی تعلیم دیتا ہے!

اسلام نے عام رحمہ لی کی تعلیم دی ہے۔ قرآن و حدیث نے اس بات کی پوری وضاحت کی ہے کہ اسلام سلامتی اور رحم و مہربانی کا دین ہے اور اسلام کی تمام تعلیمات و احکامات پر نظر ڈالیں تو یہی معلوم ہوگا کہ اس کا ہر حکم،

ہر تعلیم رحم و عدل پر مبنی ہے اور اسلامی تعلیمات کی یہ حمد لی تمام انسانوں بلکہ بے زبان جانوروں کو بھی شامل ہے۔ اگر کوئی ایمان کے ساتھ کتے سے بھی مہربانی کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا اور جو کوئی کسی جانور پر بھی ظلم کرے گا تو وہ اس کی پاداش میں سزا پائے گا۔ یہاں قرآن و حدیث کے مجموعے میں سے صرف چند آیات و احادیث کو پیش کیا جاتا ہے۔

### انفاق اور قرآنی آیات!

(۱) اللہ تعالیٰ نے مومنین اور فلاح پانے والوں کے اوصاف میں ان کی بڑی نمایاں صفت یہ بیان فرمائی ہے:

﴿وَمِمَّا زَكَّاهُمْ يَتَّقُونَ﴾

”اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔“ (البقرة: آیت ۱)

(۲) اللہ تعالیٰ مومنوں کو حکم فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِّن قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ

وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾

”اے ایمان والو! خرچ کرو ان چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ خرید و فروخت ہے اور نہ دوستی ہے اور نہ سفارش۔ اور جو آخرت کے منکر ہیں، وہی اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں۔“ (البقرة: آیت ۲۵۴)

انفاق اور خرچ سے مراد اپنے آپ کو اور اپنے مال و دولت کو دین کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے جو اپنی راہ میں خرچ کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے وہ تم پر گراں نہ گزرے۔ وہ تم سے وہی چیز مانگ رہا ہے جو اس نے تم کو بخشی ہے۔ پھر یہ بات نہیں کہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے اس سب کا مطالبہ کر رہا ہے بلکہ وہ اس میں سے کچھ خرچ کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اور پھر یہ مطالبہ خود تمہارے لیے ہی نفع بخش ہے کہ تمہیں اس دن کام آئے گا جس دن نہ خرید و فروخت کام آئے گی اور نہ کوئی دوستی کام آئے گی اور نہ کوئی بے جاسفارش۔ وہاں اگر کوئی چیز کام آسکتی ہے تو وہ صرف وہ نیکی ہے جو دنیا میں کی گئی ہو۔ اس کے سوا آخرت میں کوئی اور چیز کام آنے والی نہیں ہے اور جو لوگ آخرت کے معاملہ کو آسان سمجھتے ہیں اور باطل سفارشوں کو اپنی نجات کے لئے کافی سمجھتے ہیں، ایسے لوگ کل ادھار کے لئے آج نقد کو قربان نہیں کر سکتے اور یہ منکرین آخرت اپنے گمان میں اپنے آپ کو نفع پہنچا رہے ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ اپنی جانوں پر سب سے زیادہ بڑھ کر ظلم کرنے والے ہیں۔

## سچی وفاداری اور سچی نیکوکاری!

(۳) اللہ تعالیٰ ایک جگہ انفاق کے بارے میں ذکر فرماتے ہیں کہ:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ وَمِمَّا تَنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾

”تم ہرگز نیکی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ تم ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو اور جو چیز بھی تم خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو خوب جاننے والا ہے۔ وہ تم کو اس چیز کا پورا پورا اجر و ثواب دے گا۔“  
(آل عمران: آیت ۹۲)

اللہ تعالیٰ کی محبت میں اپنی محبوب چیزوں کو قربان کرنا ہی اللہ تعالیٰ کی محبت اور اسکے ساتھ وفاداری کی ایک کسوٹی ہے اور اس کے ذریعے لوگوں کی وفاداریاں پرکھی جاسکتی ہیں۔ جو شخص اپنی محبوبات کو اللہ تعالیٰ کی خاطر قربان کر سکتا ہے انہی پر نیکیوں کے راستے کھولے جاتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سچے وفادار بندے ہیں اور جو لوگ اپنی محبوب چیز کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں قربان کرنے کے لئے تیار نہیں تو وہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ یاد رکھیں جس چیز کی محبت بھی آدمی کے دل پر اتنی غالب آجائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں اس کی راہ پر قربان نہ کر سکے تو دراصل وہی چیز اس کا بُت ہے جب تک وہ اس کو نہ توڑے گا، اس وقت تک نیکی کے دروازے اس پر بند رہتے ہیں۔  
سچی بندگی کرنے والا لوگوں کے حقوق کو حسن خوبی کے ساتھ ادا کرتا ہے!

سچی بندگی کرنے والا لوگوں کے حقوق کو حسن خوبی سے ادا کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَلًا لِّلْفُخُورِ ۝ الَّذِينَ يَسْخُلُونَ وَايَا مَرْؤَ النَّاسِ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ۝﴾

”اور اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو (کسی طرح) بھی اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور چھا سلوک کرو والدین کے ساتھ اور رشتہ داروں کیساتھ، یتیموں اور مسکینوں اور رشتہ دار پڑوسی اور اجنبی پڑوس اور پاس بیٹھنے والے اور مسافر کیساتھ اور اپنے غلاموں (خادموں اور ماتحتوں) کیساتھ۔ (اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی کرتے ہیں اور حقوق العباد کا پورا لحاظ رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں، یہی لوگ اللہ تعالیٰ کو



محبوب ہیں اور جو لوگ حسن سلوک نہیں کرتے اور ادائے حقوق سے غافل ہیں، دراصل یہی لوگ مغرور و متکبر ہیں) اور اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں (اور بخل سکھاتے ہیں) اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں (دراصل یہی لوگ سخت ناشکرے اور منکر ہیں) اور اللہ تعالیٰ نے ایسے کافروں (اور ناشکروں) کیلئے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ (النساء: آیت ۳۶ تا ۳۷)

ان آیات میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی کے بعد بندوں کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور ان کو اس ترتیب سے بیان کیا گیا ہے:

- (۱) سب سے پہلے والدین کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔
- (۲) قرابت داروں، رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔
- (۳) یتیموں، بے کسوں، بے سہارا لوگوں کے ساتھ۔
- (۴) وہ پڑوسی جو قرابت دار بھی ہے۔
- (۵) وہ پڑوسی جو قرابت دار اور رشتہ دار نہیں ہے۔
- (۶) ہر وہ شخص جس سے اس کا واسطہ پڑتا ہے اور جو قریبی طور پر سفر میں یا حضر میں اس کا ساتھی اور ہم نشین بن جاتا ہے یا اسکے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والا ہوتا ہے۔
- (۷) وہ مسافر جس کے پاس زادراہ کی کمی ہو یا اس کو کوئی ضرورت پیش آئی ہو یا کسی طرح وہ اس کی مدد محتاج ہو۔
- (۸) غلاموں، خادموں اور وہ لوگ جو اسکے ماتحت ہوں، ان تمام کیساتھ حسن سلوک کی ہدایت اور حکم ہے اور حسن سلوک صرف اچھی اور میٹھی باتوں کا نام نہیں بلکہ اس سے مراد بندوں کی جانی و مالی امداد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی قوت اور اپنے بازوؤں کی قوت کو ان کی خدمت میں لگا دے اور اس کو ان پر خرچ کر دے۔ بندوں کے درجہ بدرجہ حقوق کے بعد فرمایا کہ:

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا﴾

اس میں اس طرف اشارہ دیا کہ جو لوگ ادائے حقوق اور حسن سلوک میں کوتاہی کرتے ہیں، دراصل یہی لوگ انانیت، بڑائی اور تکبر کے مرض میں مبتلا ہیں اور ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب سے بچ نہیں سکیں گے اور اس سے یہ بات خود بخود معلوم ہوگئی کہ جو لوگ حقوق کو ادا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود

کی حفاظت کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سامنے سچائی کے ساتھ جھکنے والے ہیں اور یہی لوگ حقیقی معنوں میں تواضع، انکساری اور سچائی کے ساتھ بندگی کرنے والے ہیں اور یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔

### ادائے حقوق میں کوتاہی کا سبب!

یاد رکھیں جو شخص اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی مال و دولت اور اس کی دی ہوئی عقل و علم و ہنر اور قوت سے اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی مخلوق پر خرچ نہیں کرتا تو اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مال و جان و عقل و علم و قوت اور اپنی کمائی کو اپنا اور اپنے عقل و تدبیر کا کرشمہ سمجھتا ہے اگرچہ وہ بظاہر لاکھ بار اللہ تعالیٰ کی طرف اپنے مال و جان کو منسوب کرتا ہے۔ لیکن اس کا جو رویہ ہے، وہ یہی بتاتا ہے کہ وہ اس کو اپنا کمال سمجھتا ہے اور یہی انانیت کا بت اور بہت بڑا شرک ہے ورنہ اگر اپنے مال و جان اور اپنی کمائی و قوت کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھتا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ان چیزوں کی وجہ سے تکبر و بخل میں مبتلا ہوتا لیکن چونکہ وہ ان چیزوں کو اپنی عقل و محنت و قوت کا کرشمہ سمجھتا ہے، اس لئے وہ ان چیزوں کو صرف اپنا حق سمجھتا ہے۔ اس لئے وہ تواضع اور انکساری اور انفاق فی سبیل اللہ کے بجائے فخر و بخل میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

### بخل کیا ہے؟ اور اترانے والوں کے اوصاف!

دوسری آیت میں اترانے اور فخر کرنے والوں کی مزید چند خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔ اور وہ یہ ہیں:

(۱) وہ خود بخیل ہوتے ہیں، بخیل اس شخص کو کہا جاتا ہے جو دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں تنگ دل ہو اور بخل کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے مال و اسباب اور کمائی کو اللہ تعالیٰ کے عطیہ کے بجائے خود اپنی تدبیر اور قوت کا کرشمہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے اندر تواضع اور شکرگزاری کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے جو سخاوت اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کے جان و مال کی مدد کا اصل محرک ہے۔

(۲) وہ دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں، دوسروں کو بخل کا سکھانا یہ ہے کہ ایک تو یہ کہ دوسرے لوگ اس کو دیکھ کر خود بھی حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے لگتے ہیں اور دوسروں کے اندر بھی ادائے حقوق کا جذبہ کمزور پڑ جاتا ہے، دوسرا یہ کہ کسی دینے والے اور خدمت کرنے والے کو یہ کہا جائے کہ اسے اتنے زیادہ دینے کی کیا ضرورت ہے؟ یا اس کو دوسروں کے حقوق مارنے کا ڈھنگ و طریقہ یا حیلہ سکھایا جائے۔ تیسرا یہ کہ ایسے بخل والے قوانین بنائیں جس کی وجہ سے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کے راستے بند ہو جائیں۔ یہ سب بخل کے مشورے ہیں اور بخل

سکھانے میں شامل ہیں۔ اور بخیل دوسروں کو اس لئے بخل کا مشورہ دیتا ہے تاکہ دوسروں کی فیاضی سے اس کے بخل کا پردہ نہ اٹھ جائے۔

(۳) جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے دے رکھا ہے اس کو چھپاتے ہیں، یہ آیت بخیل مالداروں کے اندرون کو سامنے لاتی ہے کہ ایک طرف تو اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کمزور اور غریب لوگوں پر اس کی ریاست اور امارت قائم رہے، دوسری طرف یہ کوشش کرتا ہے کہ ادائے حقوق کے معاملہ میں سستی کرتا رہے۔ اس کے لئے وہ یہ طریقہ نکالتا ہے اور وہ ہر طالب اور محتاج کے سامنے اپنے وسیع اخراجات اور کاروبار میں نقصانات وغیرہ کا رونا روتا ہے تاکہ لوگ سمجھ جائیں کہ اس قدر اخراجات اور ضروریات کے باوجود کس قدر سخی اور جود و کرم والا ہے کہ پھر بھی کچھ نہ کچھ دیتا ہے حالانکہ یہ اس کا بخل اور کتمانِ فضل اور تکبر ہوتا ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ذلیل کن عذاب دے گا۔

اللہ تعالیٰ کے لئے خرچ کرنے والے پر نہ خوف ہوگا اور نہ غم!

(۵) اللہ تعالیٰ کے لئے خرچ کرنے والے پر نہ خوف ہوگا اور نہ غم، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾

”جو لوگ اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں، رات دن پوشیدہ اور کھلم کھلا، ان کے لئے ان کے رب کے پاس اجر و ثواب ہے اور ان کے لئے نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے“۔ (البقرہ: آیت ۲۷۴)

دن رات، پوشیدہ اور کھلم کھلا میں جو مناسبت اور تقابل ہے اس سے سارے اوقات بھی احاطے میں آگئے اور حالتیں بھی اس میں جمع ہو گئیں۔ اور اس میں ایمان والوں کو جوش و خروش سے خرچ کرنے کی ترغیب ہے کہ دن رات، ہر وقت کھلے بندوں اور خاموشی سے ہر حالت میں اپنے مالوں کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے خرچ کریں اور ایسے لوگ آخرت کی ہولناکیوں اور اس کے خوف و خطر اور غمگینیوں سے بھی محفوظ رہیں گے اور دنیا میں بھی انھیں اس کی ٹھنڈک اور سکون ملے گا۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں کس قدر خرچ کرنا چاہئے؟

(۶) اللہ تعالیٰ کی راہ میں کس قدر خرچ کرنا چاہئے؟ اس سوال اور جواب کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں ذکر

کیا ہے:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ الْعَفْوَ﴾

”اور لوگ آپ (ﷺ) سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ تعالیٰ کی راہ اور اس کی خوشنودی کے لئے) کتنا خرچ کریں۔

آپ (ﷺ) فرمادیجئے، جو ضرورت سے زیادہ ہو“۔ (البقرة: آیت ۲۱۹)

”عفو المال“ کے معنی ہیں ضرورت سے زائد وہ مال جو فاضل بچے، مطلب یہ کہ مال تو خرچ کرنے کے واسطے ہے، جتنی ضرورت اور حاجت ہو اس کے مطابق اپنے پاس رکھ کر باقی کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر خرچ کریں۔ یہ بات یاد رکھیں کہ یہاں وہ انفاق زیر بحث نہیں ہے جو عام مستحقین کے لئے صدقات واجبہ اور زکوٰۃ وغیرہ کی صورت میں ہر مسلمان پر لازمی ہے بلکہ یہ وہ خرچ ہے جس کا تعلق دینی جدوجہد، جہاد اور اعلائے کلمۃ اللہ اور ملت و دین اسلام کے تحفظ سے ہے۔ ان مقاصد کے لئے ایک مسلمان پر انفاق کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کی یہ آخری حد بتائی گئی ہے کہ اگر ملت کی حفاظت و مدافعت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ضرورت پڑ جائے تو بیوی بچوں اور اہل و عیال کی ناگزیر ضروریات سے جو فاضل بچا سکے، تو وہ سب کچھ اس راہِ حق میں قربان کر دو۔

### اشتراکیت سے متاثرہ لوگوں کا جذبہ!

جو لوگ اشتراک کی نظریات سے بری طرح متاثر ہو چکے ہیں، وہ زکوٰۃ، مقدار و نصاب زکوٰۃ اور میراث کے کھلے اور واضح احکامات و ہدایات کو نظر انداز کر کے اس لفظ ”عفو“ سے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ناگزیر ضروریات سے بچی ہوئی آمدنی کو اسلامی حکومت کی تحویل میں لازماً دیا جائیگا اور ایک اسلامی حکومت فاضل آمدنی کو جبراً وصول کر سکتی ہے۔ حالانکہ آیت کریمہ میں غور و فکر کریں۔ سوال و جواب دیکھیں تو یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائیگی کہ یہاں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق حکومت سے نہیں بلکہ عام افراد سے ہے کہ وہ اپنی آزادی رائے اور اخلاص سے اس حد تک قربانی کیلئے تیار رہیں، دوسرے یہ کہ اس کا تعلق عام حالات سے نہیں بلکہ ایمر جنسی کے حالات سے ہے کہ جب دین و ملت کے تحفظ کا سوال سامنے کھڑا ہو، ایسے حالات میں تو غیرت مند لوگ خود بخود ہی طرح طرح کی قربانی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور اگر ایسے حالات میں کوئی پابندی عائد کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں مگر اسلام کا حقیقی رجحان یہی ہے کہ افراد کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان کے اندر خود انفاق کا ایسا جذبہ پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی نیکی قبول ہوتی ہے جو خلوص نیت اور اختیار کی آزادی کے ساتھ ہو اور کامل

ایمان اور اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ اخلاص اور اختیار کی آزادی کے ساتھ بقدر کفایت مال کو اپنے پاس روکے رکھے اور باقی فاضل مال کو اللہ تعالیٰ کے بندوں اور اللہ تعالیٰ کے دین کی راہ میں خرچ کر دیں اور اسی طرح کی ترغیب خود نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں بھی موجود ہے، جس کا بیان ان شاء اللہ آگے آرہا ہے۔

**انسان کا بخل آخرت میں اس کے گلے کا ہار عذاب بنے گا!**

انسان کا بخل آخرت میں اس کے گلے کا ہار عذاب بنے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا أَنَّهُمْ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرٌ لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ

مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾

”اور جو لوگ بخل کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل میں سے دی ہے وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ یہ بخل ان کے حق میں اچھا اور بہتر ہے بلکہ یہ ان کے حق میں بہت برا ہے جس چیز میں وہ بخل کرتے ہیں اس کا قیامت کے دن ان کو طوق پہنایا جائیگا اور اللہ تعالیٰ ہی وارث ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔“ (آل عمران: آیت ۱۸۰)

لوگ اپنے مال کو اس لئے بچاتے ہیں اور گن گن کر رکھتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح ان کا مال مستقبل میں ان کے کام آئیگا اور یہ لوگ ایسا کرنے کو بہت بڑا مفید کام جانتے ہیں حالانکہ حقیقی مستقبل تو وہ ہے جو آخرت میں سامنے آنے والا ہے اور آخرت میں ایسا بچایا ہوا مال جس میں اللہ تعالیٰ اور اسکے بندوں کے حقوق نظر انداز کئے گئے ہوں گے ان کے لئے صرف وبال ثابت ہوگا اور یہی سامان و اسباب جو آج زینت اور فخر کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں کل یہ سانپوں اور اژدھوں کی شکل میں تبدیل ہو جائیں گے اور سخت زہریلے آگ کے گنجے سانپ ان کے گلے کے ہار بن جائیں گے اور وہ ان کو ان کے دونوں جبرٹوں سے پکڑ کر ان سے کہیں گے کہ میں تیرا مال ہوں اور میں تیرا خزانہ ہوں اور اسی طرح وہ ان کو ابدی طور پر ڈستے رہیں گے۔ (دیکھئے بخاری: کتاب الزکوٰۃ)

آیت کے آخر میں اس صفت کو واضح فرمایا کہ آسمان وزمین کی ساری میراث اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور بالآخر سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے رہ جاتا ہے اور یہ سب کچھ اس کی طرف پلٹ جانے والا ہے۔ جس کو جو کچھ ملا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہے اور مقصود اس سے امتحان ہے، جو شخص اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی قوت اور مال و دولت کو اللہ تعالیٰ کیلئے خرچ کرتا ہے تو اس کو عظیم اجر و ثواب ملتا ہے اور جو اس میں دھاندلی کرے گا اور ان چیزوں کو بے جا خرچ کرے گا ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے کسی کی چھوٹی سی چھوٹی نیکی یا بدی، بخل یا سخاوت

چھپ نہیں سکتی۔ ہر ایک کو اسکے ارادے اور عمل کے مطابق جزایا سزا ملے گی۔

اس باب میں قرآن مجید کی مذکورہ چند آیات پر اکتفا کیا گیا ہے، ورنہ قرآن مجید میں انفاق اور باہمی ہمدردی کی اس قدر آیات ہیں کہ اگر ان تمام کو ان کے ترجمے کے ساتھ جمع کیا جائے تو ان سے ایک مستقل ضخیم کتاب بن جائیگی۔

### انفاق اور احادیث الرسول ﷺ!

قرآن مجید کی آیات کے بعد اب چند احادیث کو بھی پڑھ لیجئے۔

### انفاق اور صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا!

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ وَمَا زَادَ اللَّهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلَّهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللَّهُ)

”صدقہ دینا مال میں نقصان اور کمی نہیں کرتا اور جو شخص کسی کی خطا کو قادر ہونے کے باوجود معاف کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس (معاف کرنے والے) کی عزت بڑھاتا ہے اور جو شخص محض اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اور انکساری اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا مرتبہ بلند کرتا ہے۔“

### حلال مال کا صدقہ مسلسل بڑھتا رہتا ہے!

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدَلٍ تَمَرَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ وَلَا يَقْبَلُ اللَّهُ إِلَّا الطَّيِّبَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتَقَبَّلُهَا بِيَمِينِهِ ثُمَّ

يُرِيهَا صَاحِبَهَا كَمَا يُرِي أَحَدُكُمْ فَلَوْهَ حَتَّى تَكُونَ مِثْلَ الْجَبَلِ)

”جو شخص کھجور برابر حلال کی کمائی میں سے خرچ کرے اور (یہ بات اچھی طرح جان لو کہ) اللہ تعالیٰ صرف

حلال مال کو ہی قبول کرتا ہے اور پھر اس (کھجور برابر صدقہ) کو صدقہ دینے والے کے لئے اس طرح پالتا (اور

بڑھاتا) ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنا بچہ پالتا ہے یہاں تک کہ وہ (صدقہ) پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے۔“

(بخاری و مسلم، مشکوٰۃ)

کسب طیب سے مراد وہ مال ہے جو حلال ذرائع سے حاصل کیا جائے۔ ”فلو“ کے معنی گھوڑی کا بچہ، بچھڑایا

اونٹنی کا وہ بچہ جو دودھ چھڑانے کے قابل ہو عرب کے نزدیک گھوڑے اور اونٹ محبوب مال مولیٰ تھے اور وہ ان کو

بہت شوق و محبت سے پالتے تھے۔ اس حدیث میں ایک طرف صدقہ کی ترغیب ہے اور یہ کہ مقبول صدقہ کی مسلسل پرورش ہوتی ہے اور وہ بڑھتا رہتا ہے، دوسری طرف حلال کمائی کی ترغیب اور یہ کہ صدقہ وہی قبول ہوتا ہے جو حلال و پاک مال میں سے دیا جائے۔

### مسکینوں کی ضروریات پورا کرنے کا حکم!

(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(أَعْبُدُوا الرَّحْمَنَ وَأَطِيعُوا الطَّعَامَ وَأَفْشُوا السَّلَامَ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِسَلَامٍ)

”رحمن کی بندگی کرو، (محتاجوں کو) کھانا کھلاؤ اور سلام کو ظاہر کرو (اور اس کو پھیلاؤ) جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو گے۔“ (ترمذی، ابن ماجہ و مشکوٰۃ)

رحمن کی بندگی کرو، اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ رحمن کا بندہ مہربان ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ رحیم و رحیم کی بندگی کرنے والا سخت بخیل ہو اس کے بعد طعام کا ذکر ہے اور طعام اپنے وسیع معنوں میں ”ما یحتاج الیہ“ یعنی فقیر کی ضروریات زندگی کو شامل ہے۔ سلام کے اظہار اور تشہیر سے باہمی محبت اور الفت بڑھتی ہے اور یہ سلامتی کی دعا ہے، جس معاشرہ میں سلام ایک دوسرے کے لئے دعا ہو تو وہ معاشرہ بلاؤں، دشمنیوں اور باہمی عداوت سے محفوظ رہتا ہے اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی کریں اور مخلوق الہی پر رحم کریں، ان کی ضروریات کو پورا کریں اور تواضع کا رویہ رکھیں، دعا و سلام کو ظاہر کریں اور پھیلائیں، ان کے لئے جنت کا وعدہ ہے۔

### صدقہ میں مصائب کا علاج اور دنیا و آخرت کی کامیابی ہے!

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(إِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئَ غَضَبَ الرَّبِّ وَتَذْفَعُ مِيتَةَ السُّوءِ)

”صدقہ کرنا اللہ تعالیٰ کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور بری موت سے بچاتا ہے۔“ (ترمذی و مشکوٰۃ)

اللہ تعالیٰ کے غضب کو ٹھنڈا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر خرچ کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ دنیا میں عافیت و سکون کے ساتھ رکھتا ہے اور اس پر بلائیں نازل نہیں کرتا اور اس سے بلاؤں کو دور فرماتا ہے اور بری موت سے بچانے کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ خیرات کرنے والا موت کی بری حالت سے محفوظ رہتا ہے اور اس کا خاتمہ خیر و ابدی سعادت کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے



خرچ کرنے میں جلدی کرو کیونکہ بلا صدقے کو نہیں پھاند سکتی۔ (مشکوٰۃ)

اس کا مطلب یہ ہے کہ موت اور بیماری سے پہلے پہلے صدقہ کیا کرو کیونکہ صدقہ اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے سے بلائیں و مصیبتیں ٹل جاتی ہیں۔

مال میں زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات اور حقوق بھی ہیں!

(۵) آدمی اور اس کے مال و دولت میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے، چنانچہ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ

عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(إِنَّ فِي الْمَالِ لَحَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ ثُمَّ تَلَا: ﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾)

”مال و دولت میں زکوٰۃ کے علاوہ اور حق بھی ہیں، پھر آپ ﷺ نے (اپنے ارشاد کی تائید میں) یہ پوری آیت تلاوت فرمائی کہ: ﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ...﴾ اس حدیث شریف میں یہ بتایا گیا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں حق ہے اور حق سے مراد وہ حقوق ہیں جن کا ذکر مذکورہ بالا آیت میں بیان کیا گیا ہے:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّنَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ  
وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ﴾

”نیکی (اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی وفاداری) محض یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب (کو قبلہ سمجھ کر ان) کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی اور وفاداری اس شخص کی ہے جو اللہ تعالیٰ پر، روزِ آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب اللہ پر اور نبیوں پر (صدقہ دل سے) ایمان لائے اور اپنے مال کو اس کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور گردنوں (کے چھڑانے) پر خرچ کرے اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے۔“ (البقرہ: آیت ۱۷۷)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں وغیرہ پر مال خرچ کرنے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کے ذکر کے بعد زکوٰۃ کو مستقل علیحدہ ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوپر جس خرچ اور حسن سلوک کا ذکر ہے، وہ اس قانونی مطالبہ سے الگ چیز ہے۔ سچی وفاداری اور تقویٰ صرف ادائے زکوٰۃ سے نہیں بلکہ دن رات پوشیدہ اور کھلم کھلا فیاضانہ خرچ کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

### خرچ کرنے والوں کے لئے فرشتوں کی دعائیں!

(۶) خرچ کرنے والوں کے لئے فرشتے دعائیں کرتے ہیں اور جو خرچ نہیں کرتے ان کے لئے فرشتے بد

دعائیں کرتے ہیں، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَآ مِنْ يَوْمٍ يُصْبِحُ الْعِبَادُ فِيهِ إِلَّا مَلَكَانِ يُنْزِلَانِ فَيَقُولُ أَحَدُهُمَا اللَّهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلْفًا يَقُولُ الْآخَرُ اللَّهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكًا تَلْفًا)

”روزانہ صبح کے وقت دو فرشتے اترتے ہیں ان میں سے ایک فرشتہ تو یہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بدل عطا فرما اور دوسرا فرشتہ یہ بد دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! روک کر رکھنے والے کا مال برباد فرما“۔ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ: باب الانفاق)

### اللہ تعالیٰ کے لئے خرچ کرنے والوں کے لئے خاص انعام!

(۷) اللہ تعالیٰ خرچ کرنے والوں پر دنیا میں بھی خاص انعام فرماتا ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(أَنْفَقَ يَا ابْنَ آدَمَ أَنْفَقْ عَلَيْكَ)

”اے اولادِ آدم! (میری راہ میں) اپنا مال خرچ۔ میں تیرے اوپر خرچ کروں گا“۔ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ:

باب الانفاق)

اس حدیث میں انفاق پر خاص انعام کا وعدہ ہے وہ یہ کہ اس پر اللہ تعالیٰ خرچ کرینگے جو اللہ تعالیٰ کیلئے خرچ کریگا اور اللہ تعالیٰ اس پر کس قدر انعامات کی بارش کرے گا یہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، مگر جو لوگ خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی محبوب چیزوں کو خرچ کرتے ہیں وہ دنیا میں راحت قلبی، سکون اور ٹھنڈک محسوس کرتے ہیں۔ صدقہ پر اس کے سوا دنیا و آخرت میں کوئی اور چیز بھی نہ ملے تو پھر بھی یہ سکون اور لذت اس قدر عظیم نعمت ہے کہ جو اس کو پائے گا تو وہ دنیا کی تمام چیزوں کو اسکی خاطر آسانی سے قربان کر سکتا ہے۔

### ضرورت سے زائد مال خرچ کرنے کا حکم!

(۸) حضرت ابی امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(يَا ابْنَ آدَمَ إِنْ تَبَدَّلَ الْفَضِيلَ خَيْرُكَ وَإِنْ تُمْسِكَ شَرُّكَ وَلَا تَلَامُ عَلَى كَفَافٍ وَابِدْ مَنْ تَعُولُ)

”اے آدم کی اولاد! جو مال تمہاری ضرورت سے زائد ہو، اسے (اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے) خرچ کرنا تمہارے لئے (دنیا و آخرت کے لحاظ سے) بہتر ہے اور روکے رکھنا تمہارے لئے شر اور برا ہے۔ بقدر کفایت مال روکنے پر کوئی ملامت نہیں ہے اور (خرچ کے سلسلہ میں) اس سے ابتدا کرو جو تمہاری عیال میں ہے۔“ (مسلم مشکوٰۃ)

حقیقت یہ ہے کہ ضرورت اور احتیاج سے جو مال زائد ہو وہ جمع کرنے کے واسطے نہیں۔ اس لئے بہترین بات یہی ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی میں خرچ کیا جائے اور اس کو بذرِ آباد زندگی کیلئے محفوظ کیا جائے تاکہ وہ آخرت کی ضرورتوں اور حوائج کیلئے سرمایہ بنے۔ اس حدیث شریف میں دوسری بات یہ بیان کی گئی ہے کہ بقدر کفایت پر کوئی ملامت نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر واقعی ضرورت اور احتیاج ہو کہ اس کے بغیر گزر مشکل ہو، اس قدر روکنے پر کوئی الزام نہیں ہے اور حدیث شریف میں تیسری بات یہ بیان کی گئی ہے کہ خرچ کرنے میں ان سے ابتداء کرو جن کی روزی تمہارے ذمے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کی روزی تمہارے ذمہ ہے جیسے کہ اہل و عیال ہوں یا دوسرے لوگ، حتیٰ کہ جانور بھی جن کے چارہ کھلانے کی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے ان پر خرچ کرنا دوسروں سے مقدم ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ فضائل صدقات میں لکھتے ہیں کہ:

حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص ایک جنگل میں تھا اس نے ایک بادل سے یہ آواز سنی کہ فلاں شخص کے باغ کو پانی دے۔ اس آواز کے بعد فوراً وہ بادل ایک طرف چلا اور ایک پتھریلی زمین میں خوب پانی برسا اور وہ سارا پانی ایک نالے میں جمع ہو کر چلنے لگا۔ یہ شخص جس نے آواز سنی تھی اس پانی کے پیچھے چل دیا وہ پانی ایک جگہ پہنچا، جہاں ایک شخص کھڑا ہوا پیچھے سے اپنے باغ میں پانی پھیر رہا تھا۔ اس نے باغ والے سے پوچھا کہ تمہارا کیا نام ہے؟ انہوں نے وہی نام بتایا جو اس نے بادل میں سے سنا تھا۔ پھر باغ والے نے اس سے پوچھا کہ تم نے میرا نام کیوں دریافت کیا۔ اس نے کہا کہ میں نے اس بادل میں جس کا پانی یہ آواز سنی تھی کہ فلاں شخص کے باغ کو پانی دے اور تمہارا نام بادل میں سنا تھا تم اس باغ میں کیا ایسا کام کرتے ہو (جس کی وجہ سے بادل کو یہ حکم ہوا کہ اس کے باغ کو پانی دو) باغ والے نے کہا کہ جب تم نے یہ سب کہا تو مجھے بھی کہنا پڑا میں اس کے اندر جو کچھ پیدا ہوتا ہے اس کو (تین حصے کرتا ہوں) ایک حصہ یعنی تہائی تو فوراً اللہ کے راستے میں صدقہ کر دیتا ہوں اور ایک تہائی میں اور میرے اہل و عیال کھاتے ہیں اور ایک تہائی اسی باغ کی ضروریات میں لگا دیتا ہوں۔ (رواہ مسلم، مشکوٰۃ بحوالہ فضائل صدقات: حصہ اول صفحہ ۷۳)

### صدقہ ہر مسلمان پر لازم ہے!

(۹) سعید بن ابوبردہ اپنے باپ سے اور وہ سعید کے دادا یعنی حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ:

(عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ صَدَقَةٌ فَقَالُوا يَا نَبِيَّ اللَّهِ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَقَالَ يَعْمَلْ بِيَدِهِ فَيَنْفَعُ نَفْسَهُ وَيَتَصَدَّقُ قَالُوا فَإِنْ لَمْ يَجِدْ قَالَ يَعِينِ ذَا الْحَاجَةِ الْمَلْهُوفِ قَالُوا فَإِنْ لَمْ يَجِدْ قَالَ فَلْيَعْمَلْ بِالْمَعْرُوفِ وَالْيُمُسِكِ عَنِ الشَّرِّ فَإِنَّهَا لَهُ صَدَقَةٌ)

”ہر مسلمان پر صدقہ واجب ہے۔ تو یہ حکم سن کر نادار صحابہؓ نے عرض کیا کہ: جس کے پاس کوئی مال نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ آپؐ نے فرمایا: اپنے ہاتھ سے کام (اور محنت مزدوری کر کے) کمائے تو اس سے خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں پر صدقہ کرے۔ انہوں نے پھر گزارش کی کہ: جس میں اس کی بھی طاقت نہ ہو (کہ وہ محنت مزدوری کر سکے تو پھر کیا کرے) فرمایا کہ: فریادی کی (کسی طرح بھی) مدد کرے پھر عرض کیا: اگر اسکی بھی طاقت نہ ہو تو پھر کیا کرے؟ تو فرمایا: وہ نیکی اور بھلائی کا کام کرے اور اپنے آپ کو برائی سے بچائے رکھے، یہی اس کا صدقہ ہے۔“ (بخاری: کتاب الزکوٰۃ)

(..... فَلْيَعْمَلْ بِالْمَعْرُوفِ وَالْيُمُسِكِ عَنِ الشَّرِّ....) اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ خود بھلے کام کرے اور اپنے آپ کو بری باتوں سے بچائے اور دوسرا مطلب یہ کہ نیکیوں اور اچھے کاموں کی تلقین کرے اور برے کاموں سے لوگوں کو بچائے۔ بعض روایات میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی تصریح بھی آئی ہے لیکن ان دونوں روایتوں میں کوئی تضاد نہیں اور یہ دونوں روایات قریب قریب ہیں کیونکہ جو شخص نیکی کے وقت ہاتھ سے ہو یا زبان سے ہو اور ارادے و نیت کی حد تک ہو، تلقین نہ کرے اور برائی کے ارتکاب کو نہ روکے خواہ ہاتھ سے ہو یا زبان سے یا دل سے، تو ایسے شخص نے نیکی کا کام نہیں کیا اور نہ اس نے اپنے آپ کو شر سے بچایا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ انسان کا تزکیہ اور روحانی ترقی اور نجات کیلئے سخت ضروری ہے اور ہر انسان کو چاہیے کہ محنت مزدوری کر کے مال کمائے اور اس میں سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے۔ جو شخص محنت مزدوری کی طاقت بھی نہ رکھے تو وہ کسی فریادی حاجت مند کی کسی نہ کسی طرح مدد کرے۔ اگر اس سے بھی بالکل عاجز ہو چکا ہو تو کم از کم اتنا کرے کہ وہ ایسے نیک اور بھلے کام کرے، مثلاً نماز، ذکر وغیرہ جو اس کی قدرت میں ہو اور برائیوں مثلاً جھوٹ، غیبت اور گالی وغیرہ سے بچے اور جس قدر اس سے ہو سکے لوگوں کو نیک کاموں کی تلقین کرے اور برے کاموں سے روکے رکھے۔ صحابہؓ کی زندگی پر قرآن مجید اور نبی کریمؐ کے ان واضح ارشادات نے ایسا اثر کیا تھا کہ وہ صدقہ دینے

اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے بازار جا کر بوجھ اٹھاتے اور اس سے جو کچھ ملتا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر ڈالتے تھے۔ (دیکھئے بخاری: کتاب الزکوٰۃ، باب اتقوا النار ولو بشق تمرة...)۔

بخل، معاشرہ کے فساد و خونریزی اور تباہی کا سبب ہے!

(۱۰) جس طرح بخل کا مرض فرد کے اخلاق اور اسکے دل کے فساد اور بگاڑ کا سبب ہے اسی طرح جس قوم کے اندر بخل کا مرض پھیل جاتا ہے تو اس قوم کے اندر فساد اور خونریزی کی وبا پھیل جاتی ہے۔ بخیل قوم کا آخری انجام دنیا میں بھی تباہی اور بربادی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(اتَّقُوا الظُّلْمَ فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَاتَّقُوا الشُّحَّ فَإِنَّ الشُّحَّ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حَمَلَهُمْ عَلَى أَنْ يَفْكَوَادِمَاءَهُمْ وَاسْتَحِلُّوا بِمَحَارِمِهِمْ)

”ظلم سے بچو کیونکہ ظلم قیامت کے دن (ہولناک، دہشت ناک اور دردناک) اندھیروں کی شکل میں ہوگا جس میں ظالم بھٹکتا پھرے گا) اور بخل سے بچو (کیونکہ) بخل نے ان لوگوں کو ہلاک (تباہ و برباد) کیا جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ بخل ہی کی وجہ سے انہوں نے خونریزی کی اور حرام و ناجائز کاموں کو حلال اور جائز کرنا چاہا۔“ (مسلم، مشکوٰۃ: باب الانفاق)

ظلم کا اصل مفہوم ”وَضَعُ الشَّيْءِ فِي غَيْرِ مَحَلِّهِ“ کسی چیز کو اسکی غیر مناسب جگہ استعمال کرنا ہے اس میں تمام چھوٹے بڑے گناہ، بے انصافیاں، شرک و کفر داخل ہیں اور ”شُّحُّ“ بخل کا اعلیٰ درجہ ہے اور بخل بھی ظلم ہی کی ایک قسم ہے اور یہاں ظلم سے بچنے کا عام حکم فرماتے ہوئے ظلم کی ایک بہت بڑی قسم بخل کو خاص طور پر ذکر فرمایا کیونکہ یہی چیز اخلاق و معاشرے کے بگاڑ کا بہت بڑا سبب بنتی ہے اور اس بخل سے ایک دوسرے کا حق مارنا ہوتا ہے جس کی وجہ سے گھر اور قوم خونریزی اور فساد کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہی بخل خونریزی کا ایک بہت بڑا سبب بنتی ہے اور اسکی وجہ سے لوگ ناجائز اور حرام چیزوں اور کاموں کو حلال اور جائز کرنا چاہتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان حرام چیزوں کو حلال اور جائز قرار دیتے ہیں۔

اصلاح اور بگاڑ کی ابتداء!

(۱۱) جس شخص کو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر یقین ہو اس کا لازمی امر یہ ہوتا ہے کہ انسان دنیا سے بے رغبت ہو جاتا

ہے اور اسکے برعکس بے ایمانی کی وجہ سے انسان لمبی امیدوں اور بخل میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس حقیقت کو نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

عمر بن شعیب اپنے والد سے اور ان کے والد عمر کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(أَوَّلُ صَلَاحٍ هَذِهِ الْأُمَّةِ الْبَاقِيَّةِ وَالزُّهْدُ وَأَوَّلُ فُسَادِهَا الْبُخْلُ وَالْأَمَلُ)

”اس امت کی اصلاح کی ابتداء (اللہ تعالیٰ اور آخرت پر) یقین اور دنیا سے بے رغبتی ہوگی اور اس کے فساد کی ابتداء بخل اور لمبی لمبی امیدوں سے ہوگی۔“ (بیہقی، مشکوٰۃ: باب الامل والحرص)

حقیقت یہ ہے کہ سچے ایمان و یقین سے زہد یعنی دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے اور اس بے یقینی، بے ایمانی سے دنیا کی محبت اور لمبی لمبی امیدیں اور اپنی دنیاوی راحت و آرام اور لذت کے دور دور کے منصوبے بنانے شروع ہو جاتے ہیں اور اسی سے انسان کے اندر بخل پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

**بخل ایمان کی ضد ہے!**

(۱۲) بخل ایمان کی ضد ہے کیونکہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اللہ تعالیٰ ہی کی نعمت سمجھتے ہیں وہ لوگ کبھی بخل کے مرض میں مبتلا نہیں ہو سکتے اور یہی شکر و ایمان کا تقاضا ہے اور انسان کے بخل کی ایک بڑی وجہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی قوت، توانائی اور مال و دولت کو اپنا اور اپنی تدبیر و محنت کا ثمرہ جانتا ہے۔ اس لئے وہ بخل و تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ورنہ جو شخص ذرا عقل سے کام لے، اپنی پیدائش اور دنیا کی چیزوں اور ان کی پیدائش میں غور و فکر کرے تو وہ اس کو صرف اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھے گا اور ایسے شخص کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمت کی وجہ سے بخل اور تکبر میں مبتلا ہو جائے بلکہ ایسے شخص پر جس قدر اللہ تعالیٰ کے انعامات ہونگے اسی قدر وہ متواضع اور منکسر المزاج بندوں کے حقوق کو ادا کرنے والے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور لرزنے والا ہوگا، جیسا کہ اس کا بیان پہلے بھی گزر چکا ہے اور اسی حقیقت کو نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے، جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(خَصْلَتَانِ لَا تَجْتَمِعَانِ فِي مُؤْمِنٍ الْبُخْلُ وَسُوءُ الْخُلُقِ)

”دو خصلتیں ایسی ہیں کہ وہ مومن میں جمع نہیں ہو سکتیں، ایک بخل اور دوسری بد خلقی۔“ (ترمذی، مشکوٰۃ: باب

الانفاق)

اس حدیث کو نقل کر کے حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”یعنی کوئی شخص مومن ہو کر بخیل بھی ہو اور بد خلق بھی مومن کی شان ہرگز نہیں ایسے شخص کو اپنے ایمان کی بڑی فکر چاہئے خدا نخواستہ ایسا نہ ہو

کہ اسی سے ہاتھ دھو بیٹھیں کہ جیسا ہر خوبی دوسری خوبی کو کھینچتی ہے۔ ایسے ہی ہر عیب دوسرے عیب کو کھینچتا ہے دوسری حدیث میں اس سے بھی بڑھ کر حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ شُح (یعنی بخل کی اعلیٰ قسم) ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ (مشکوٰۃ) کہ ان دونوں چیزوں کا اجتماع گویا ضدین کا اجتماع ہے جیسا کہ آگ اور پانی کا جمع ہونا کہ جوئی چیز غالب ہوگی وہ دوسرے کو فنا کر دیگی اگر پانی غالب ہے آگ کو بجھا دے گا آگ غالب ہے تو پانی کو جلا دے گی ایسے ہی یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے منافی ہیں جو چیز غالب ہوگی رفتہ رفتہ دوسری کو فنا کر دے گی ایک حدیث میں آیا ہے کہ کوئی ولی ایسا نہیں ہوا جس میں اللہ جل شانہ نے دو عادتیں پیدا نہ کر دی ہوں ایک سخاوت دوسری خوش خلقی۔ (کنز) دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ کا کوئی ولی ایسا نہیں ہے جو سخاوت کا عادی نہ بنایا گیا ہو (کنز) اور بہت ظاہرات ہے کہ اگر اللہ جل شانہ سے تعلق اور محبت ہے تو اس کی مخلوق پر خرچ کرنے کو بے اختیار دل چاہے گا کہ محبوب کے عزیز و اقارب کی خاطر محبت کے لوازمات سے ہے اور جب مخلوق اللہ کی عیال ہے تو ان پر خرچ کرنے کو ولی کا دل ضرور چاہے گا اور اس کے عیال میں بھی جس کا تعلق اس کے ساتھ جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی اس پر خرچ کرنے کو زیادہ چاہے گا اور اگر نہ چاہے تو معلوم ہوا کہ مال کی محبت اللہ کی محبت سے زیادہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا دعویٰ جھوٹ ہے۔ (دیکھئے فضائل صدقات: حصہ اول ص ۱۶۱)

### بخیل جنت میں داخل نہیں ہوگا!

(۱۴) بخل بہت ہی بری خصلت ہے۔ جو شخص حقوق کی ادائیگی، بندوں کے ساتھ حسن سلوک کے معاملہ میں بخل کی روش کو اختیار کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ خَبٌّ وَلَا بَخِيلٌ وَلَا مَنَّانٌ)

”جنت میں نہ جھل ساز مکار (اور دھوکے باز) داخل ہوگا، نہ بخیل اور (نہ صدقہ خیرات دے کر) احسان جتانے والا۔“ (ترمذی، مشکوٰۃ: باب الانفاق)

### سختی اور بخیل کی دنیا اور آخرت!

جو شخص بھی عقل سے کام لے گا یا لوگوں اور قوموں کی تاریخ پر نظر کریگا یا قرآن و حدیث کا گہرا مطالعہ کرے گا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے خرچ کرنا لازمی ہے۔ اور سخاوت کی روش ایسا صحت بخش



رویہ اور کام ہے جو انسان کے دل کو جنت بناتا ہے اور اس کی جسمانی اور روحانی بیماریوں کا علاج بنتا ہے۔ اس کی وجہ سے دنیا میں جنتی معاشرہ بنتا ہے۔ یہ دنیا و آخرت میں عروج اور ترقی کا سبب ہے اور سخی قوم صرف لوگوں پر سیاسی غلبہ حاصل نہیں کرتی بلکہ وہ لوگوں کے دلوں پر اپنی عزت و بلندی کا اقتدار جمالیاتی ہے۔ یہ اس کے دنیاوی فائدے ہیں اور رحم و سخاوت پر جو کچھ آخرت میں ملنے والا ہے اس کا تصور بھی اس دنیا میں ناممکن ہے۔ اسکے برعکس بخیل شخص کا دل جہنم کا گڑھا ہوتا ہے اور یہ مرض اس کے روحانی و جسمانی امراض کا سبب بن جاتا ہے اور اس کی وجہ سے معاشرہ اور ملک میں خونریزی اور فساد پیدا ہو جاتا ہے اور ایسے افراد اور قوم دنیا کی نظروں سے گر جاتے ہیں اور بالآخر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور آخرت میں جہنم کا ایندھن بن جاتے ہیں۔

### مخلوقِ الہی پر رحم اور اسکے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت!

انفاق اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی قوت و توانائی، اپنی کمائی اور اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی دولت کو اللہ تعالیٰ کے لئے اس کے بندوں کی مدد اور ان کی خدمت میں خرچ کیا جائے اور انفاق کی فضیلت اور اس کے دنیاوی اور اخروی فائدے اور بخل کے نقصانات اور اس کی تباہیاں آپ کے سامنے آچکی ہیں اب اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر رحم و شفقت اور مسکینوں، یتیموں، بے کسوں اور مظلوموں کی مدد کے بارے میں صرف نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو پڑھ لیجئے۔

بہترین انسان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک کرے!

(۱) بہترین انسان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اسکے بندوں کے ساتھ حسن سلوک کرے، چنانچہ حضرت

انس ﷺ اور حضرت عبداللہ ﷺ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(الْخَلْقُ عِيَالُ اللَّهِ فَاحَبَّ الْخَلْقِ إِلَى اللَّهِ مَنْ أَحْسَنَ إِلَى عِيَالِهِ)

”مخلوق (خواہ انسان ہو یا جانور سب) اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے نزدیک مخلوق میں سے

بہترین وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے کنبہ کے ساتھ زیادہ حسن سلوک کرے۔“ (مشکوٰۃ: باب الشفقتہ)

جو لوگ مخلوقِ الہی کے ساتھ سب سے زیادہ اچھا سلوک کرنے والے ہوں ظاہر ہے کہ وہی انسانیت کے

لئے سب سے زیادہ مفید ہوں گے اور یہی لوگ اور جماعت اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین لوگ اور جماعت ہوتے

ہیں اور جو لوگ مخلوقِ الہی کے لئے مفید ترین ثابت ہوتے ہیں، وہی لوگ دنیا میں عروج پاتے ہیں، جیسا کہ ”بقائے

انفع“ کا قانون اللہ تعالیٰ کی دنیا میں جاری و ساری ہے اور جس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ بلاشبہ جو لوگ اور جو

جماعت اللہ تعالیٰ کے لئے اس کی مخلوق کے ساتھ سب سے زیادہ اچھا سلوک کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہترین لوگ اور جماعت ہیں۔ وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب و کامران ہوں گے۔

بد بخت کا دل رحم و شفقت کے جذبہ سے خالی ہوتا ہے!

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو القاسمؓ جو صادق اور مصدوق ہیں،

سے یہ فرماتے ہوئے سنا:

(لَا تُنَزَّعُ الرَّحْمَةُ إِلَّا مِنْ شَقِيٍّ)

”رحمت (یعنی اللہ کی مخلوق پر رحم اور مہربانی کے جذبے) کو کسی دل سے نکالا نہیں جاتا ہے مگر بد بخت کے دل

سے۔“ (احمد و ترمذی، مشکوٰۃ)

مطلب یہ ہے کہ وہ شخص بہت بڑا بد بخت ہوتا ہے جو اپنے کروت اور بے رحمیوں کی پاداش میں اللہ تعالیٰ کے

قانون کی زد میں آ جاتا ہے اور اسکے دل سے رحم و شفقت کا جذبہ نکل جائے۔

تم زمین والوں پر رحم کرو، اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے گا!

(۳) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

(الرَّاحِمُونَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمَنُ إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ فِي الْأَرْضِ يَرْحَمُكُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ) (ابوداؤد، ترمذی

و مشکوٰۃ)

”اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر رحم کرنے والوں پر اللہ رحم کرتا ہے۔ لہذا تم زمین والوں پر رحم کرو تا کہ تم پر وہ رحم کرے

جو آسمان میں ہے۔“

جو شخص اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر رحم نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے!

(۴) حضرت جریر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

(لَا يَرْحَمُ اللَّهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ)

”اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔“ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ)

خلاصہ یہ کہ قرآن وحدیث میں تمام مخلوق پر رحم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ لوگوں کی غنوار،

ان کی مالی وجانی امداد اور مظلوموں کی حمایت اور انفاق یعنی مخلوق کی نفع رسانی میں مال و جان خرچ کرنے اور اس کی

خدمت کرنے ہی سے مہربانی کے جذبے کا ظہور ہوتا ہے ورنہ جو نفع رسانی کے کام نہیں کرے اور مخلوق کی خدمت اور مدد نہ کرے پھر رحم کا دعویٰ کرے تو وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

**مومنوں اور مسلمانوں کی باہمی خیر خواہی و ہمدردی و معاونت!**

جب یہ بات معلوم ہے کہ مومن اور مسلمان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام مخلوق حتیٰ کہ جانوروں اور حیوانات پر بھی رحم کرے اور مخلوق کی خدمت کرے اور وہ تمام انسانیت کو نفع اور خیر پہنچائے۔ لوگوں سے شر اور ضرر کو دور کر نیکی کوشش کرے اور اس کو دنیا و آخرت کی ترقی اور فلاح کا خیال رہے تو ظاہر ہے کہ وہ تو ان لوگوں کا بہت ہی زیادہ ہمدرد اور خیر خواہ ہوگا جو اس کے ساتھ اس کام میں معاون بن گئے اور یہیں سے وہ باہمی تعاون اور خیر خواہی کی داغ بیل ڈالے گا اور اس کو نمونہ بنا کر پوری انسانیت کو اس خیر کی طرف دعوت دے گا۔ قرآن و حدیث نے مسلمانوں اور مومنوں کے مابین باہمی تعاون، الفت و محبت پر بہت ہی زیادہ زور دیا ہے۔ یہاں قرآن و حدیث میں سے بطور نمونہ کچھ پیش کر رہا ہوں، اس کو پڑھ لیجئے۔

**ہر مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے!**

(۱) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ (الحجرات: آیت ۱۰)

”بے شک مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں۔“

بھائی کا مطلب یہ نہیں کہ بس اس کو رواجی اور زبانی جمع خرچ کے طور پر کہا جائے کہ تم میرے بھائی ہو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گویا ایک مشترک گھرانہ ہوتا ہے، جن کا نفع و نقصان اور ان کے مفادات مشترک ہوں ایک کے نفع میں دوسرے کا نفع اور ایک کے نقصان میں دوسرے کا نقصان ہو۔ اسی طرح ان کا غم اور خوشی ایک ہو۔ وہ گویا ایک بدن کی مانند ہیں۔

**باہمی تعاون اخوت کی روح اور جان ہے!**

اور اسی اخوت کی جان باہمی تعاون ہے یعنی مشکل وقت میں ایک دوسرے کا ساتھ بلا کسی معاوضہ کے (مالی و جانی تعاون) ایک دوسرے کی مالی و جانی خدمت کرنا۔ اگر ایک دوسرے کے ساتھ مالی و جانی تعاون نہیں تو یہ نہ اخوت ہے اور نہ بھائی بندی۔ بلکہ ان کا صرف زبانی جمع خرچ ہے۔

مومن ایک دوسرے کا معاون اور دوست ہوتا ہے!

(۲) ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾

”مومن مرد اور مومن عورتیں (یہ سب آپس میں) ایک دوسرے کے دوست (اور معاون) ہوتے ہیں۔“

ولی دوست اور مددگار کو کہتے ہیں، مطلب یہ کہ مومن ایک دوسرے کے ساتھ، ایک دوسرے کے دست و بازو

، ہمدرد اور مددگار ہوتے ہیں۔

سارے مومن ایک دوسرے کی مدد کے ذریعے ناقابل تسخیر طاقت بن سکتے ہیں!

نبی کریم ﷺ نے مومنوں کی اس اخوت اور دوستی اور ننگساری کو اپنے ارشادات میں یوں واضح فرمایا ہے:

(۱) حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

(الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا شَبَكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ)

”ایک مومن دوسرے مومن کیلئے عمارت کی طرح ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط رکھتا ہے (یہ

کہہ کر) پھر آپ ﷺ نے سمجھانے کیلئے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کیں (کہ مومن اس

طرح ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں)۔ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ: باب الشفقه والرحمه)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح عمارت کی ساری اینٹیں اور اجزاء اور تمام حصے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر

ایک دوسرے کو مضبوط کرتے ہیں اور اسی طرح انہی اینٹوں وغیرہ سے مضبوط قلعہ بن جاتا ہے، اسی طرح سارے

مومنین ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور متحد ہوتے ہیں اور باہمی محبت اور امداد و تعاون کے ذریعے ایک ناقابل

تسخیر قوت بن جاتے ہیں۔

مومنین ایک بدن کی طرح ہوتے ہیں!

(۲) مومنین کے باہمی تعاون اور ہمدردی و محبت و اخوت کی مثال ایک ہی بدن سے دی جاتی ہے۔ چنانچہ

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(تَرَى الْمُؤْمِنِينَ فِي تَرَاخُمِهِمْ وَتَوَادُّهُمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا شَتَّى عَضُوهُ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ

الْجَسَدِ بِالسَّهْرِ وَالْحُمَى) (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ: باب الشفقه)

”(اے مخاطب) تم مومنوں کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رحمہ لی میں اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور تعلق رکھنے میں اور ایک دوسرے کیساتھ مہربانی و معانت کا سلوک کرنے میں ایسا پاؤ گے جیسا کہ بدن کا حال ہے کہ جب بدن کا کوئی عضو دکھتا ہے تو بدن کے باقی اعضاء اس ایک عضو کی وجہ سے ایک دوسرے کو پکارتے ہیں اور اسی طرح بیداری (بے خوابی) اور بیماری کے درد میں سارا جسم شریک رہتا ہے۔“

ایک بدن کے اعضاء پر نظر ڈالئے، تمام اپنا اپنا کام کرتے ہیں، آنکھ اپنا کام اور کان اپنا کام، پاؤں اپنا کام اسی طرح ہر عضو اپنی ذمہ داری پوری کر رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے کیلئے کام کر رہے ہیں اور خوشی و غم میں سارے اعضاء شریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح مومنین بظاہر تو اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہونگے لیکن وہ آپس میں ایک بدن کی طرح مربوط ہونگے۔ ایک مومن کی خوشی عام مومنین کے لئے خوشی ہے اور ایک مومن کو درد و مصیبت پہنچے تو اس کی مدد اور اس کی غمگساری اور اس کے ساتھ تعاون کیلئے سب ایک دوسرے کو بلاتے ہیں اور اس کے درد و غم اور تکلیف اور مصیبت میں اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنے پورے مال و جان سے اس کی مدد کرتا ہے اور اس کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس حدیث میں مومنین اور مسلمانوں کو اس بات کی ہدایت ہے کہ وہ ایک جسم کی طرح رہیں۔ اگر کسی ایک مسلمان پر مصیبت آئی، بھوک و افلاس میں مبتلا ہو یا اس کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہتا ہے تو سارے مسلمان مل کر اس کے دکھ درد اور اس کی تکلیف دور کرنے کی تدبیر کریں اور دکھ درد اور اس کی بھوک کو اپنا دکھ درد اور بھوک سمجھیں اور اس کے لئے ایسی دوڑ دھوپ کریں جس طرح اپنے درد و تکلیف کے لئے بھاگ دوڑ کرتے ہیں۔

مسلمان دوسرے مسلمان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا!

(۳) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(المُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُظْلَمُهُ مَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللَّهُ فِي حَاجَتِهِ وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللَّهُ بِهِ كُرْبَةً مِنْ كَرْبٍ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَمَنْ سَرَّ مُسْلِمًا سَرَّهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ)

”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ وہ اس پر زیادتی کرتا ہے اور نہ وہ اسے (ظلم فقر وغیرہ) مخالف کے حوالے

کرتا ہے۔ جو شخص کسی مسلمان بھائی کی حاجت روائی کے لئے کوشش کرتا ہے تو اللہ اس کی حاجت اور ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ جو شخص کسی مسلمان بھائی سے کوئی غم، پریشانی اور بے چینی وغیرہ دور کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پریشانیوں میں سے ایک بڑی پریشانی اور غم سے نجات دے گا اور جو شخص مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ: باب الشفقه)  
 اس حدیث میں مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ خود کسی مسلمان پر زیادتی نہ کرے اور نہ اس کو ظلم و فقر کے حوالے کر کے اس کو بے یار و مددگار چھوڑے بلکہ ظالم اور بھوک کے مقابلے میں اس کی مدد کرے اور اس کی ضروریات پورا کرنے کے لئے بھاگ دوڑ کرے اور اس کے عیبوں کی پردہ پوشی کرے۔

### مسلمان بھائی کی تذلیل و تحقیر نہ کرو!

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(المُسْلِمُ أَخُ الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ وَلَا يَحْقِرُهُ التَّقْوَىٰ هَهُنَا وَبِشِيرِ الْإِلَى صَدْرُهُ ثَلَاثٌ مَرَارٍ بِحَسَبِ أَمْرٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ حَرَامٌ دَمُهُ وَمَالُهُ وَعَرْضُهُ)

”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، لہذا وہ ان اس پر زیادتی کرتا ہے اور نہ (اس کی اعانت اور مدد کو ترک کر کے) اس کو بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور نہ اسے تحقیر سمجھتا ہے (یہ فرما کر) آپ ﷺ نے اپنے سینے کی طرف تین بار اشارہ کر کے فرمایا کہ تقویٰ تو یہاں (دل میں) ہے (نیز فرمایا) کسی آدمی کے شر اور برائی کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو تحقیر سمجھے (یاد رکھو) مسلمان پر مسلمان کی ہر چیز حرام ہے۔ اس کا خون، اس کا مال اور اس کی عزت۔“ (مسلم، مشکوٰۃ: باب الشفقه)

اس حدیث میں مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ وہ خود بھی مسلمان پر کوئی زیادتی و ظلم نہ کریں اور جو اس پر ظلم کرتا ہے یا اس کو بھوک و افلاس لاحق ہوئی، مقروض ہوا، غرض کسی صورت میں اس کو بے یار و مددگار نہ چھوڑے بلکہ اس کی مدد اور اعانت کرے اور کبھی اس کی تذلیل نہ کرے اور نہ اپنے دل میں اس کو تحقیر سمجھے۔ کون اچھا ہے اور کون افضل۔ اس کا تعلق تقویٰ سے ہے اور تقویٰ کا مرکز دل ہے اور جو متقی دل ہوگا وہ کبھی کسی کی تحقیر نہیں کرے گا اور نہ اس دل میں مسلمان کی حقارت ہوگی۔

### ہمسایہ اور پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرو!

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما دونوں نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ

آپ ﷺ نے فرمایا:

(مَا زَالَ جِبْرِئِيلُ يُوصِي بِالْجَارِ حَتَّى ظَنَنْتُ أَنَّهُ يُورَثُهُ) (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ: باب الشفقه)

”حضرت جبریلؑ (اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق) ہمیشہ مجھ کو پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ مجھے گمان ہوا کہ شاید پڑوسی کو وراثت میں حصہ دار بنائیں گے۔“

(۲) حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(يَا أَبَا ذَرٍّ إِذَا طَبَخْتَ مِرْقَةً فَاتَّخِذْ مَائِهَا وَتَعَاهِدْ جِيرَانِكَ) (مسلم)

”اے ابوذر! جب تو (گھر میں) شور باپکاے تو پانی زیادہ کر لے اور (اس میں) اپنے ہمسایہ کا خیال رکھ۔“

اور مسلم کی ایک روایت ہے کہ ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میرے خلیل نے وصیت فرمائی کہ جب تو شور باپکاے تو

پانی زیادہ ڈال۔ پھر ہمسایہ کے گھر والوں کو دیکھ اور ان کو اس شور بہ میں سے ایک معقول حصہ پہنچا دے۔

پڑوسی کو ایذا اور تکلیف پہنچانے والا یا اس کی خبر گیری نہ کرنے والا مومن نہیں!

(۳) چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(وَاللّٰهُ لَا يُؤْمِنُ وَاللّٰهُ لَا يُؤْمِنُ قِيلَ مَنْ يَّارَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ الَّذِي لَا يَأْمَنُ جَارَهُ بَوَاقِيَّةً)

”اللہ کی قسم وہ مومن نہیں، اللہ کی قسم وہ مومن نہیں، اللہ کی قسم وہ مومن نہیں۔ عرض کیا گیا، یا رسول اللہ ﷺ

کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا ہمسایہ امن میں نہ ہو۔“ (بخاری و مسلم و مشکوٰۃ)

(۴) اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَا يَأْمَنُ جَارَهُ بَوَاقِيَّةً) (مسلم و مشکوٰۃ)

”وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا جس کا پڑوسی اس کے شر اور ایذا رسانیوں سے محفوظ اور امن میں نہ ہو۔“

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(لَيْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِي يَشْبَعُ وَجَارُهُ جَائِعٌ) (مشکوٰۃ: باب الشفقه)

”وہ شخص مومن نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر کھانا کھائے اور اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا ہو۔“

پڑوسی اور ہمسایہ کے حقوق اور اس کے ساتھ حسن سلوک سے قرآن مجید اور احادیث کی کتاہیں بھری پڑی

ہیں لیکن افسوس آج کل ایمان اور اسلام کے دعویدار سب سے زیادہ اپنے پڑوسیوں اور اپنے پاس والوں کے ساتھ

بدسلوکی کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے پڑوسی کی آبروریزی کرتے ہیں اور ان کے گھر کھانا، سالن اور ان

کی مدد کرنا تو درکنار اپنے قول و فعل سے اس کو ایذا پہنچا رہے ہیں۔ دن رات ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ اور ٹیلی ویژن کی

پوری آواز کھول کر پڑوسی تو کیا پورے محلے کے بیمار، سوئے ہوئے اور دیندار لوگوں کو تکلیف پہنچا رہے ہیں اور ان



کی نیند کو ختم کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دین اور اسکے رسول ﷺ کی سنت سے کھل کر بغاوت کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ اور عذاب دنیا میں بے چینی اور بے اطمینانی اور افتراق و انتشار کی صورت میں دیکھا جا رہا ہے اور اس کا سخت دردناک انجام و عذاب، آخرت میں جہنم ہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔

کسی کو اپنے مومن بھائی کی غیبت جائز نہیں!

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ اغْتَيْبَ عِنْدَ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَى نَصْرِهِ فَنَصَرَهُ، نَصْرَهُ اللَّهُ تَعَالَى فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ  
فَإِنْ لَمْ يَنْصُرْ وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَى نَصْرِهِ أَذْرَكَهُ اللَّهُ بِهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ﴿﴾

”جس شخص کے سامنے اس کے بھائی کی غیبت کی جائے اور وہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد پر قادر ہو۔ پھر وہ اس مسلمان بھائی کی مدد کرے تو اللہ دنیا و آخرت میں اس کی مدد کریگا اور اگر وہ اسکی مدد نہ کرے حالانکہ اسکی مدد پر قادر ہو تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی گرفت کرے گا۔“ (مشکوٰۃ: باب الشفقه)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان نے اس کے مسلمان بھائی کی غیبت کی ہے اور اس کی حیثیت و عزت کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے اور اگر وہ اس پر قادر ہے کہ وہ مسلمان بھائی کی مدد کرے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمان بھائی کی مدد کرے اور اسکی عزت و حیثیت کو خراب نہ ہونے دے۔ اس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی نصرت فرمائے گا اور اگر وہ باوجود قدرت کے ایسا نہ کرے تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں اس کی گرفت فرمائے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو کسی مسلمان بھائی کی آبروریزی سے روکے اور اس کی غیبت سے روکے اور اسکی عزت و آبرو کا دفاع کرے تو اللہ تعالیٰ پر اس کا حق ہے کہ وہ اس کو قیامت کے دن دوزخ کی آگ سے بچائے۔ (مشکوٰۃ: باب الشفقه)

اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی اس موقع پر مدد نہ کرے اور غیبت کرنے والے کو غیبت سے نہ روکے جہاں اس کی بے حرمتی کی جاتی ہو اور اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچایا جا رہا ہو تو اللہ بھی (دنیا و آخرت) میں اس موقع پر اس شخص کی مدد نہیں کرے گا جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی مدد کو پسند کرتا ہو اور جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی اس موقع پر مدد کرے جہاں اس کی بے حرمتی کی جاتی ہو اور اس کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچایا جاتا ہو تو اللہ تعالیٰ بھی اس موقع پر اس کی مدد کرے گا جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی مدد کو پسند کرتا

ہو۔ (مشکوٰۃ: باب الشفقه)

مومن بھائی میں کوئی عیب دیکھو تو اس کو چھپاؤ!

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ رَأَى عَوْرَةً فَسَدَهَا كَانَ مِنْ أَحِبِّیْ مَوَدَّةً)

”جو شخص کسی مسلمان میں کوئی عیب (یا اس کی کوئی برائی) دیکھے اور پھر وہ اس کو چھپائے تو اس کا درجہ اس شخص

جیسا ہے جس نے زندہ دفن کی ہوئی لڑکی کو بچا لیا ہو“۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ: باب الشفقه)

مظلوم کی فریاد رسی اور اس کی مدد کرو!

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا فَقَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَنْصُرُهُ إِذَا كَانَ مَظْلُومًا فَكَيْفَ أَنْصُرُهُ

ظَالِمًا قَالَ فَمَنْعَهُ مِنَ الظُّلْمِ فَذَلِكَ نَصْرُكَ إِنِّيَاهُ)

”اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ تو ایک آدمی نے عرض کیا (یعنی صحابی رضی اللہ عنہ نے) یا

رسول اللہ ﷺ جب وہ مظلوم ہو تو میں اس کی مدد کروں گا مگر میں اس مسلمان کی کس طرح مدد کروں جب وہ ظلم کر رہا ہو۔

آپ ﷺ نے فرمایا تم اس کو ظلم سے روکو، بس یہی ظلم سے روکنا اس کی مدد ہے“۔ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ: باب الشفقه)

نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ آغَاثَ مَلْهُوًّا كَتَبَ اللَّهُ لَهُ ثَلَاثًا وَسَبْعِينَ مَغْفِرَةً وَاحِدَةً فِيهَا صَلَاحُ أَمْرِهِ كُلِّهِ وَثَنَتَانِ وَسَبْعُونَ

لَهُ دَرَجَاتٌ يَوْمَ الْقِيَمَةِ)

”جو شخص مظلوم کی فریاد رسی (اور امداد) کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے تہتر (۷۳) بخششیں (اور حفاظتیں

(لکھ دیتا ہے اور ان میں سے ایک بخشش (اور حفاظت) وہ ہے، جس میں اس کے تمام (دنیوی اور اخروی) امور کی

اصلاح ہے اور باقی بہتر (۷۲) بخششیں قیامت کے دن اس کے درجات کی بلندی کا سبب ہوں گی“۔ (مشکوٰۃ:

باب الشفقه)

اور ایک طویل حدیث میں ہے کہ:

(وَاللَّهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ) (مسلم، ریاض الصالحین، باب ۲۹)

”اور اللہ تعالیٰ بندہ کی مدد میں لگا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔“

### ظالم کی مدد ایمان کے منافی ہے!

حضرت اوس بن ثعلبہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

(مَنْ مَشَى مَعَ ظَالِمٍ لِيُقَوِّيهَ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْإِسْلَامِ)

”جو شخص کسی ظالم کی تقویت و تائید کے لئے اس کے ساتھ چلے اور وہ یہ جانتا ہو کہ (جس شخص کی وہ حمایت

کر رہا ہے) ظالم (ناحق پر) ہے تو وہ شخص اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔“ (مشکوٰۃ: باب الظلم)

### یتیم کے ساتھ حسن سلوک کی فضیلت!

حضرت سعد بن سہیلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ لَهُ وَلِغَيْرِهِ فِي الْجَنَّةِ هَكَذَا وَأَشَارَ بِالسُّبَابَةِ وَالْوَسْطَى وَفَرَجَ بَيْنَهُمَا شَيْئًا)

”میں اور یتیم کی کفالت اور پرورش کرنے والا خواہ وہ یتیم اس کا اپنا قریبی (رشتہ دار جیسے پوتا، بھتیجا وغیرہ) ہو یا

غیر (رشتہ دار اور اجنبی یتیم) ہو، جنت میں ایسے قریب قریب ہونگے اور آپ ﷺ نے اپنی شہادت کی انگلی اور بیچ کی

انگلی کے ساتھ اشارہ فرمایا اور آپ ﷺ نے دونوں کے درمیان کچھ کشادگی رکھی۔“ (بخاری و مشکوٰۃ: باب الشفقة)

اس حدیث میں آپ ﷺ نے یتیم کے ساتھ ہمدردی کرنے والے اور اسکی پرورش کرنے والے اور اسکی

ضروریات پورا کرنے والے کا درجہ بتلایا کہ جنت میں میرے اور یتیم کی کفالت کرنے والے کے درمیان اتنی

قربت ہوگی جتنا ان دونوں انگلیوں کے درمیان ہے، شاید یہ تھوڑا سا فرق وہ درجہ نبوت ہے کیونکہ امتی کبھی نبی کے

درجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو شخص کسی اور غرض اور

جذبہ کے تحت نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کسی یتیم بچے کے سر پر (پیار و محبت اور شفقت

کے ساتھ) ہاتھ پھیرے تو اس کے لئے یتیم کے سر پر ہر بال کے عوض جس پر اس کا ہاتھ لگا ہے، نیکیاں لکھی جاتی

ہیں۔ (الحديث: احمد، ترمذی، مشکوٰۃ)

### بیوہ عورت اور مسکین کی خدمت کا ثواب!

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(وَالسَّاعِي عَلَى الْأَرْمَلَةِ وَالْمَسْكِينِ كَالْمُجَاهِدِ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاطْنَهُ قَالَ وَكَالْقَائِمِ الَّذِي

لَا يَفْتَرُوا كَالصَّائِمِ الَّذِي لَا يَفْطُرُ

”بیوہ عورت اور مسکین کا خیال رکھنے اور خبر گیری کرنے والا (اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے والا اجر و ثواب میں) اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والے کی مانند ہے اور (راوی کہتا ہے کہ) میرا گمان یہ ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ اس عبادت گزار، شب بیدار کی مانند ہے جو عبادت اور نماز میں سست نہ پڑے اور اور روزہ دار کی طرح ہے جو نافع نہ کرے (بلکہ مسلسل روزے رکھے)۔“ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ)

جب یتیموں، مسکینوں اور بیواؤں کی ضروریات میں دوڑ دھوپ کرنے والے کا اجر و ثواب اس قدر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنے والا اور ایسا شب بیدار اور راتوں کو اللہ کے سامنے کھڑا ہونے والا جو کبھی شب بیداری میں سستی نہ کرے اور نہ اس میں کوئی نقصان اور کمزوری دکھائے اور بلا نافع مسلسل روزے رکھتا ہو، کے برابر ہو تو جو شخص خود بھی ان بے کسوں اور محتاجوں کی مدد کرے اور ان کے لئے یہ بھاگ دوڑ بھی کرے کہ منظم طور پر یتیموں، مسکینوں اور محتاجوں اور مظلوموں کی امداد ہو تو آپ اندازہ لگائیے کہ اس کا اجر و ثواب کس قدر عظیم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عنایت فرمائے کہ ہم خود بھی بے کسوں، یتیموں محتاجوں اور مظلوموں کی امداد کریں، ان کی ضروریات کا خیال رکھیں اور اس کے لئے دوسروں کو بھی دعوت دیں اور ظالم کے روکنے اور مظلوم کی مدد کرنے اور بے کسوں کی امداد کرنے کیلئے ایسا معاشرہ اور ایسی تنظیم تشکیل دیں جس میں ہر کسی کو عزت کی روزی مل سکے، جس میں ہر کسی کی عزت و آبرو محفوظ ہو اور جس میں پورا معاشرہ ظالم کے خلاف لڑے اور مظلوم کی پشت پناہی پورا معاشرہ اور پوری تنظیم کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسے معاشرے میں سب سے زیادہ کمزور وہ شخص ہوگا جو کسی کا حق دبائے اور سب سے زیادہ طاقتور وہ شخص ہوگا جو مظلوم ہو، جس سے حق چھینا گیا ہو۔

یتیموں، مسکینوں اور بے کسوں کی امداد اور خلاص!

آخر میں یہ گزارش کروں گا کہ یتیموں، بے کسوں، بیواؤں محتاجوں اور مظلوموں کے لئے بھاگ دوڑ کرنا اور دوسروں کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھ کر اس کو حل کرنا، دوسرے مسلمان بھائیوں کے دکھ درد میں شریک ہونا اور اسی طرح کے تمام اچھے اور نیک کام اس وقت مفید ہوتے ہیں اور ایسے اخلاق اور نیک کاموں سے اس وقت آخرت کی دائمی جنت اور دنیا کا جنتی معاشرہ بن جاتا ہے جب کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہوں اور آخرت کیلئے ہوں۔ اگر یہ خوش اخلاقی صرف ان لوگوں کے لئے ہو جن سے اس کا کوئی فائدہ وابستہ ہو اور اس کو یہ امید ہو کہ وہ اسے وقت پر کام آسکتے ہیں یا وہ اس لئے کام کرتے ہوں تاکہ لوگوں سے کٹ کر علیحدہ نہ رہ جائیں یا اس لئے کرتے ہوں تاکہ اس

طرح اس کی دنیاوی عزت، شان و شوکت بنے اور لوگ اس کو اچھا آدمی سمجھیں، وغیرہ وغیرہ تو اس طرح کے یہ تمام کام مفاد پرستانہ خوش اخلاقی ہے۔ اس کا راز اس وقت کھل جاتا ہے جب معاملہ ایسے شخص سے پڑے جس کیساتھ خوش اخلاقی برتنے کیلئے مذکورہ بالا محرکات میں سے کوئی محرک موجود نہ ہو۔ اس قسم کے نمائشی اخلاق سے نہ دنیا میں جنتی معاشرہ بن سکتا ہے اور نہ اس سے آخرت کی دائمی جنت اور ابدی خوشیاں مل سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاص کی دولت سے مالا مال فرمائیں، آمین!

☆.....☆.....☆

### زبان کی حفاظت کا بیان!

#### زبان کی حفاظت!

زبان کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ زبان کو قابو میں رکھا جائے اور اس کو جھوٹ غیبت چغلی فحش گوئی سخت کلامی اور بے فائدہ باتوں سے محفوظ رکھا جائے زبان کی شیرینی یا تلخی اور نرمی یا سختی اس کی درستی اور اس کی کجی کے دنیوی اور اخروی نتائج بہت دور رس ہوتے ہیں دنیا میں جھگڑے اور فسادات باہمی عداوتیں اور دشمنیاں اور رنجشیں زیادہ تر زبان کی بے احتیاطیوں اور بے باکیوں ہی سے پیدا ہوتی ہیں اور جو بڑے بڑے گناہ لوگوں سے سرزد ہوتے ہیں ان کا تعلق بھی اکثر زبان ہی سے ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ نے زبان کی حفاظت اس کی درستگی کی سخت تاکید فرمائی ہے اور مسلمانوں کو اس بات کی ہدایت فرمائی ہے کہ زبان کو قابو میں رکھیں

اور ہر قسم کی بری باتوں بلکہ بے ضرورت باتوں سے اپنے آپ کو روکیں اور جب بات کرنے کی ضرورت نہ ہو اور بات سے جزوی نفع کی امید نہ ہو تو خاموش رہیں۔ اس مختصر تمہید کے بعد زبان سے متعلق نبی کریم ﷺ کے چند ارشادات کو پڑھ لیجئے۔

### زبان کی استقامت!

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(إِذَا صَبَحَ ابْنُ آدَمَ فَإِنَّ الْأَعْضَاءَ كُلَّهَا تَكْفُرُ اللِّسَانَ فَنَعُولُ اتَّقِ اللَّهَ فَيُنَافِقَانَا نَحْنُ بِكَ فَإِنْ اسْتَقَمَّتْ اسْتَقَمْنَا وَإِنْ اعْوَجَجَتْ اعْوَجَجْنَا)

”جب ابن آدم صبح کرتا ہے تو اس کے سارے اعضاء (یعنی آنکھ، کان وغیرہ) زبان کے سامنے عاجزی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (اللہ کے لئے ہم پر رحم کر) اور ہمارے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈر کیونکہ ہم تیرے ہی ساتھ بندھے ہوئے ہیں اگر تو سیدھی اور درست رہی گی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے اور اگر تو ٹیڑھی ہوگی تو ہم بھی ٹیڑھے ہو جائیں گے۔“ (ترمذی، مشکوٰۃ)

زبان سے بقیہ اعضاء کی درخواست کا مطلب یہ ہے کہ ہماری صلاح و فلاح اور ہمارے انجام کی اچھائی برائی تجھ ہی سے بندھی ہوئی ہے اس لئے ہم پر رحم کر اور اللہ تعالیٰ سے بے خوف ہو کر بے احتیاطی اور بیباکی سے نہ چل ورنہ تیرے ساتھ ہم بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب میں گرفتار ہوں گے۔

### زبان کی بیباکی آدمی کو جہنم میں ڈالتی ہے!

نبی کریم ﷺ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ وہ کنسی چیز ہے جس کے سبب آدمی جہنم میں جاتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا:

(الْأَجْوَفَانِ الْفَمُ وَالْفَرْجُ)

”کھوکھلی چیزیں ایک منہ (یعنی زبان) دوسری شرمگاہ۔“ (سنن ابن ماجہ: باب الذنوب عن) ان دونوں کے گناہوں کے سبب اکثر لوگ جہنم میں جائیں گے۔

### زبان اور شرمگاہ کے فتنے اور شر سے بچنے والا جنتی ہے!

ایک روز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس آدمی کو اللہ تعالیٰ دو چیزوں کے شر سے بچائے وہ جنت میں داخل

ہوگا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کنسی چیزیں فرمایا:

(بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ) (موطا امام مالک)

”ایک وہ چیز جو دونوں داڑھوں کے درمیان (یعنی زبان) ہے اور دوسری چیز وہ جو دونوں پاؤں کے درمیان (یعنی شرمگاہ) ہے۔“

زبان اور شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے کو نبی کریم ﷺ کی طرف سے جنت کی بشارت!

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ يَضْمَنُ لِي مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَضْمَنُ لَهُ الْجَنَّةَ)

”جو شخص مجھے اس بات کی ضمانت دے کہ وہ اپنی اس چیز کی حفاظت کرے گا جو اس کے دونوں داڑھوں کے درمیان ہے اور جو اس کے دونوں پاؤں کے درمیان ہے تو میں اس کے لئے جنت کی ذمہ داری لیتا ہوں۔“ (بخاری، مشکوٰۃ)

خاموشی میں نجات ہے!

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ صَمَتَ نَجَا)

”جو چپ رہا وہ نجات پا گیا۔“ (مسند احمد، ترمذی و مشکوٰۃ)

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

(مَنْ حُسِنَ الْإِسْلَامَ الْمَرْءُ تَرَكَهُ مَالًا يَعْنِيهِ)

”آدمی کے اسلام کی خوبی میں سے یہ کہ وہ لایعنی (فضول) چیزوں کو ترک کر دے۔“

مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے بری فضول اور لایعنی باتوں سے زبان کو روکا وہ ہلاکت اور عذاب سے بچ گیا۔“

زبان کے فتنے سے بچو!

حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کو میرے بارے

میں جن چیزوں کا خطرہ ہو سکتا ہے ان سب سے زیادہ خطرناک اور خوفناک چیز کیا ہے؟

حضرت سفیان کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے (جواب میں) اپنی زبان مبارک پکڑ کے فرمایا کہ یہ چیز یعنی سب



سے زیادہ خطرہ اس سے ہے۔“ (ترمذی، مشکوٰۃ)

### خاموشی اور خوش خلقی کی فضیلت!

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے (حضرت) ابوذرؓ سے فرمایا کہ کیا میں تمہیں وہ دو خصلتیں نہ بتا دوں جو پیٹھ پر بہت ہلکی ہیں (کہ ان کے اختیار کرنے میں آدمی پر کچھ زیادہ بوجھ نہیں پڑتا) اور اللہ تعالیٰ کی میزان میں وہ بہت بھاری ہیں حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ ہاں ضرور بتلائیے آپؐ نے فرمایا:

(طُولُ الصَّمْتِ وَحُسْنُ الْخُلُقِ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ مَا عَمِلَ الْخَلَاءُ بِمِثْلِهِمَا)

”زیادہ خاموش رہنے کی عادت اور حسن اخلاق۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے مخلوقات کے اعمال میں یہ دونوں چیزیں بے مثل ہیں۔“ (بیہقی، مشکوٰۃ)

زیادہ خاموش رہنے کا مطلب یہ ہے کہ بے ضرورت اور بے فائدہ باتوں سے زبان کو روکا جائے جو شخص اپنے آپ کو نامناسب اور لائےنی باتوں سے بچائے گا تو وہ لازماً کم بولنے والا اور زیادہ خاموش رہنے والا ہوگا۔

### خاموشی کی عادت اختیار کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے!

حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ:

(مَقَامُ الرَّجُلِ الصَّمْتِ أَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ سِتِّينَ سَنَةً) (بیہقی، مشکوٰۃ)

”خاموشی کی عادت سے آدمی کو جو مرتبہ اور مقام حاصل ہوتا ہے وہ ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔“

مطلب یہ ہے کہ آدمی کا بری اور نامناسب و بے ضرورت باتوں سے خاموشی اختیار کرنا اور اس پر مداوت اور ہیبتگی کے ساتھ ثابت قدم رہنا اس شخص کی ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے جو کثرت کلام اور زبان کی بے احتیاطی میں مبتلا ہو۔

### نرم مزاجی اور نرم خوئی کا بیان!

اسلام کا مزاج نرم خو ہے اور وہ اس کے دل میں اچھی طرح پیوست ہوتا ہے جو نرم خو ہوتا ہے۔ نرم مزاجی اور

نرم خوئی کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) معاملات میں سخت گیری کے بجائے نرمی اور آسانی اختیار کی جائے۔

(۲) اپنے ساتھیوں وغیرہ عام لوگوں کے حق میں مہربانی اور نرم خوئی اختیار کی جائے اور ان کے ساتھ اچھی

طرح پیش آجائے۔

(۳) جو بات کی جائے نرمی سے سمجھائی جائے۔

(۴) جو مطالبہ کیا جائے وہ شیریں انداز میں کیا جائے کہ پتھر کو بھی موم کر دے۔

(۵) ایک دوسرے کے ساتھ بات کرنے میں ایک دوسرے کے ساتھ ادب و احترام اور لطف و شفقت

کا پہلو ملحوظ رہے۔

(۶) ہر کام اطمینان اور خوش اسلوبی اور وقار کے ساتھ کیا جائے۔

### نرم خوئی کی فضیلت!

نرم خوئی اور لطف و کرم اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے اور اللہ تعالیٰ کو وہ آدمی محبوب ہوتا ہے جو اس کے بندوں کے معاملہ اور برتاؤ میں نرمی کرتا ہو اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں اس لطف اور نرمی کا سب سے زیادہ اور وافر حصہ خاتم الانبیاء والرسل رحمۃ اللعالمین نبی کریم ﷺ کو عنایت فرمایا تھا۔

اللہ تعالیٰ خود نبی کریم ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد فرماتا ہے کہ:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾

”پس اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سبب آپ ان کے لئے نرم دل ہو گئے اور اگر تم درشت خواہ دل کے سخت ہوتے تو

یہ لوگ (یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) آپ سے تتر بتر ہو جاتے۔“ (آل عمران: آیت ۱۵۹)

بلاشبہ یہی نرم خوئی ہے جو کہ حلم و بردباری و غفور و درگزر چشم پوشی اور خوش کلامی غرض ان تمام اخلاق حسنہ کا عطر اور

نچوڑ ہے جن میں شان جمال پائی جاتی ہے۔

### نرمی پر جو کچھ ملتا ہے وہ سختی پر نہیں ملتا!

اور یہ نرمی خیر و برکتوں کو بھیجتی ہے اور اس پر جو کچھ ملتا ہے وہ سختی پر نہیں ملتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(إِنَّ اللَّهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ وَيُعْطِي عَلَى الرِّفْقِ مَالًا يُعْطَى عَلَى الْعَنْفِ وَمَالًا يُعْطَى عَلَى مَاسِوَا)

”اللہ تعالیٰ خود مہربان ہے اور نرمی و مہربانی اس کو محبوب ہے اور نرمی پر وہ اتنا دیتا ہے جتنا کہ دشتی اور سختی پر

نہیں دیتا اور نرمی و مہربانی پر وہ جتنا عطا فرماتا ہے وہ نرمی و مہربانی کے علاوہ کسی بھی دوسری چیز پر عطا نہیں فرماتا۔“

(مسلم، مشکوٰۃ)

عام لوگ سمجھتے ہیں کہ سخت گیری سے آدمی وہ کچھ حاصل کرتا ہے جو نرمی سے حاصل نہیں کر سکتا اس حدیث میں اس غلط خیال کی اصلاح فرمائی گئی ہے اس کی قدرے تفصیل یہ ہے۔

(۱) یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نفع و نقصان اور لینے اور دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے چونکہ نرمی و مہربانی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے ظاہر ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کو محبوب ہو تو اسی میں بندوں کے لئے خیر و برکت خوشی و اطمینان اور سکون حاصل ہوگا بلاشبہ جس معاشرے میں نرمی و مہربانی شفقت و مروت کے جذبات پھیل جاتے ہیں تو اس معاشرے پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں و برکتوں کا نزول ہوتا ہے اور جس معاشرے میں اس خصلت کا فقدان ہوتا ہے تو وہ ٹوٹ پھوٹ، افتراق و انتشار، مختلف قسم کی پریشانیوں اور سختیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ نرمی پر اس قدر دیتا ہے جس قدر سختی پر نہیں دیتا بلکہ نرمی کے علاوہ کسی چیز پر بھی اللہ تعالیٰ اتنا نہیں دیتا جتنا کہ نرمی پر دیتا ہے لہذا اپنے فائدہ اور دنیوی و اخروی خیر و برکات کے حصول کے لئے بندوں کو چاہئے کہ وہ اپنے تعلقات و معاملات اور کلام وغیرہ میں نرمی کریں اور نرمی کو اپنا وقار اور قانون بنائیں۔

نرمی ہر چیز میں حسن اور زینت پیدا کر دیتی ہے!

ایک دن نبی کریم ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا کہ نرمی اختیار کرو اور درشتی سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(اِنَّ الرَّفْقَ لَا يَكُونُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا زَانَهُ وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا شَانَهُ)

”بلاشبہ نرمی جس میں ہو اس کو حسن و زینت دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کر لی جائے اس کو بدنما بنا دیتی ہے۔“ (مسلم، مشکوٰۃ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام کو بنا دیتی ہے اور اس میں حسن و زینت پیدا کر دیتی ہے اور اس کے برعکس سختی اور درشتی ہر کام کو بگاڑتی اور عیب دار اور بدنما کر دیتی ہے البتہ جہاں قانون شریعت یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہے وہاں سختی کے بجائے نرمی کرنا حق و عدل سے ہٹی ہوئی بات اور مخلوق الہی پر ظلم ہے۔ شریعت کا قانون اور جماعت کی مصلحت جس سختی کا مطالبہ کرتی ہے اس کا موقع وہ ہے جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی حدود میں سے کسی کو توڑ ڈالے اور مسلمانوں کی جماعت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو تو ایسے لوگوں کے شر کو روکنے اور ان کی سازشوں کے ختم اور قلع قمع کرنے کے لئے ان پر پوری سختی کی جاسکتی ہے جیسا کہ اس کا بیان

شرعی حدود کے باب میں موجود ہے۔

سنگدل اور درشت خو، نیکی سے محروم رہتا ہے!

حضرت جریر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ يُحْرَمُ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الْخَيْرَ)

”جو آدمی نرمی و مہربانی سے محروم کیا گیا وہ نیکی اور خیر سے محروم کیا گیا۔“ (صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

جامع صغیر کی روایت میں ”خیر“ کے ساتھ ”حُكْلَةً“ کا لفظ بھی ہے لہذا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص نرمی

و مہربانی کی خوبیوں سے خالی ہوتا ہے وہ تمام بھلائیوں اور سارے کہ سارے خیر سے محروم رہتا ہے۔

دنیا و آخرت کی خیر حاصل کیجئے اور محرومی سے بچئے!

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ أُعْطِيَ حَظَّهُ مِنَ الرِّفْقِ أُعْطِيَ حَظَّهُ مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَنْ حُرِمَ حَظُّهُ مِنَ الرِّفْقِ حُرِمَ

حَظُّهُ مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ)

”جس شخص کو نرمی و مہربانی میں سے اس کا اپنا حصہ دیا گیا اس کو دنیا و آخرت کے خیر میں سے حصہ مل گیا

جو شخص نرمی و مہربانی میں سے اپنے حصے سے محروم کیا گیا وہ دنیا و آخرت میں خیر کے حصے سے محروم کیا گیا۔“ (ترمذی

ترغیب)

خوش کلامی کا حکم اور خوش کلامی کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾

”اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔“ (بقرہ: آیت ۸۳)

اچھی بات کہنے میں اچھی باتوں کی تعلیم کرنا، لوگوں کو نصیحت کرنا اور لوگوں کو ان کے فائدے اور کام کی باتوں

کا کہنا، باتوں میں ایک دوسرے کے ادب و احترام اور لطف و محبت کے پہلو کو ملحوظ رکھنا، سلام کرنا شکریہ ادا کرنا،

لوگوں کا حال احوال پوچھنا ایک دوسرے کو نیک دعائیں دینا مصیبت کے وقت تسلی کی بات کرنا، اچھی باتیں

سمجھانا یہ سب اسی ایک صفت قول حسن یعنی خوش کلامی کی مختلف جزئیات ہیں۔ خوش گوئی اور خوش کلامی آپس میں

میل ملاپ پیدا کرتی ہے اور اس سے خوشگوار تعلقات اور باہم مروت اور محبت وغیرہ جیسی بہت سی بھلائیاں پیدا ہوتی ہیں اس کے برعکس بدگوئی اور بدکلامی سے لوگوں میں افتراق و انتشار اور دلوں میں غصہ نفرت حسد وغیرہ جیسی برائیاں اور قلبی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کے بندوں کو چاہئے کہ اچھی بات کہیں نیک بولیں، نیک بات اچھے لہجے میں کہیں بدگوئی سے پرہیز کریں ایک دوسرے کو برے ناموں اور برے لفظوں اور نفرت اور تحقیر آمیز الفاظ کے ساتھ پکارنے اور بلانے اور خطابوں سے اپنی زبان کی حفاظت کریں لوگوں کا مذاق اڑانے اور ان کو طعنہ دینے ان کے درمیان چغلی کھانے اور غیبت اور درشت اور سخت گوئی اور فحش گوئی وغیرہ سے اجتناب کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مسلمانوں کو یہ حکم فرمایا ہے کہ وہ لوگوں کا مذاق نہ اڑائیں اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دیں اور نہ ایک دوسرے کو برے لفظوں اور برے ناموں سے پکاریں۔ (دیکھئے تفصیل کے لئے سورہ حجرات: آیت ۱۲)

بدکلامی شیطان کا کام ہے!

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَقُلْ لِعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ط إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزِعُ بَيْنَهُمْ ط إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِينًا﴾

”اور (اے پیغمبر) میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو سب سے اچھی ہو بے شک شیطان آپس میں لڑا دیتا ہے بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔“ (سورہ بنی اسرائیل: آیت ۵۳)

اس سے معلوم ہوا کہ بدگوئی شیطانی کام ہے شیطان اس کے ذریعے لوگوں میں نفرت حسد بغض وغیرہ کے بیج بوتا ہے۔

قیامت کے روز بدترین آدمی فحش گو اور بدگو ہوگا!

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

(إِنَّ شَرَّ النَّاسِ مَنْزِلَةً عِنْدَ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَمَةِ مَنْ دَعَا أَوْ تَرَكَهُ النَّاسُ لِاتِّقَاءِ فَحْشِهِ)

”اللہ تعالیٰ کے نزدیک درجہ کے لحاظ سے بدترین آدمی قیامت کے دن وہ شخص ہوگا جس کی بدزبانی اور سخت کلامی کے ڈر سے لوگ اس کو چھوڑ دیں۔“ (بخاری، مسلم، مشکوٰۃ)

بدزبانی اور سخت کلامی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اس سے ملنے جلنے اور بات کرنے سے گریز کرنے لگتے ہیں اور جس شخص کا یہ حال ہو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین آدمی ہے اور قیامت کے دن اس کا حال بھی بدترین ہوگا۔  
نرم اور میٹھی بات صدقہ ہے!

نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

(الْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ)

”اچھی اور میٹھی بات بھی ایک صدقہ (یعنی نیکی) ہے۔“ (بخاری)

کسی کے ساتھ اچھی بات میٹھی اور شیریں انداز میں کرنا اس کا دل خوش کرنے کا سبب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی بندے کا دل خوش کرنا اس پر صدقہ کرنا ہے اور بہت بڑی نیکی ہے۔

مومن لعن طعن کرنے والا اور بدگو نہیں ہوتا!

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِطَعَّانٍ وَلَا لَعَّانٍ وَلَا فَاحِشٍ وَلَا بَذِيٍّ)

”مومن بندہ نہ طعن کرنے والا ہوتا ہے نہ لعنت کرنے والا اور نہ فحش گوئی کرنے والا اور نہ گالی بکنے

والا ہوتا ہے۔“ (ترمذی)

آپس کی گالی گلوچ کا سارا گناہ گالی کی ابتداء کرنے والے پر ہوتا ہے!

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(الْمُسْتَبَانِ مَاقَالَ فَعَلَى الْبَادِي مَا لَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُومُ)

”دو شخص ایک دوسرے کو گالیاں دیں تو ان ساری گالیوں کا گناہ اس شخص پر ہوگا جس نے (گالیوں میں)

پہل کی جب تک مظلوم (یعنی جس کو گالیاں دیدی گئی ہیں) تجاوز نہ کرے۔“ (مسلم مشکوٰۃ)

مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے گالی دینے میں پہل کی ہے اس کو اپنی گالی گلوچ کا گناہ تو ہوگا ہی دوسرے شخص کی ان گالیوں کا گناہ بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے جبکہ وہ دوسرا شخص جواب میں زیادتی نہ کرے اگر اس دوسرے شخص نے جوابی گالیوں میں زیادتی کی کہ اس نے پہل کرنے والے کو زیادہ گالیاں دیں یا زیادہ سخت گالیاں دیں یا ابتداء کرنے والے نے جوابی اور تکلیف پہنچائی تھی اس نے پہل کرنے والے کو اس سے

زیادہ تکلیف پہنچائی تو اس صورت میں یہ دوسرا شخص بھی اپنے جرم کی مقدار کا گناہ اور عذاب پائے گا۔

جو شخص قابل لعنت نہ ہو اس پر لعنت کرنا خود اپنے آپ کو مبتلائے لعنت کرنا ہے!

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

(مَنْ لَعَنَ شَيْئًا لَيْسَ لَهُ بِأَهْلٍ رَجَعَتِ اللَّعْنَةُ عَلَيْهِ)

”جو شخص کسی چیز پر لعنت کرے جو اس لعنت کے قابل نہ ہو تو وہ لعنت اسی پر لوٹ کر آتی ہے۔“ (ترمذی)

ابوداؤد و مشکوٰۃ

جو چیز قابل لعنت نہ ہو یا جو شخص کافر یا فاسق نہ ہو اس پر لعنت کرنا یا اس کو کافر یا فاسق وغیرہ الفاظ سے گالی دینا

ایسا بدترین گناہ کہ یہی لعنت اور کفر و فسق وغیرہ اس کہنے والے پر لوٹ آتے ہیں جیسا کہ مسلم و بخاری وغیرہ کی صحیح

حدیثوں سے یہ ثابت ہے۔

### فحش گوئی کی مذمت!

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

(إِنَّ أَثْقَلَ شَيْءٍ يُوَضَّعُ فِي الْمِيزَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ خُلُقٌ حَسَنٌ وَإِنَّ اللَّهَ يُنْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِيَّ)

”قیامت کے دن مؤمن کی میزان اعمال میں رکھی جانے والی چیزوں میں بہت وزنی چیز اچھے اخلاق ہیں

اور اللہ تعالیٰ فحش بکنے والے بد زبان سے سخت نفرت اور بغض رکھتا ہے۔“ (ترمذی، ابوداؤد، مشکوٰۃ)

### نرم مزاج اور نرم خو، شخص کی فضیلت!

ایک روز رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا کہ:

(الْأَخْبَرُكُمْ بِمَنْ يَحْرُمُ عَلَى النَّارِ وَبِمَنْ تَحْرُمُ النَّارُ عَلَيْهِ عَلَى كُلِّ هَيْنٍ لِّبْنٍ قَرِيبٍ سَهْلٍ)

”کیا میں تمہیں وہ شخص نہ بتاؤں جو دوزخ کی آگ پر حرام ہوگا اور دوزخ کی آگ اس پر حرام ہوگی

(توسنو) دوزخ کی آگ ہر اس شخص پر حرام ہوگی جو مزاج کا سخت نہ ہو نرم ہو لوگوں سے قریب ہونے والا نرم

خو ہو۔“ (احمد و ترمذی عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، مشکوٰۃ)

عارد لانے والے کے بارے میں وعید!

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:





(مَنْ غَيَّرَ أَحَاهُ بِذَنْبٍ لَمْ يَمُتْ حَتَّى يَعْمَلَهُ يَعْنِي مَنْ ذَنْبٍ قَدَّتَابَ مِنْهُ)

”جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو کسی گناہ پر عار دلاتا ہے تو وہ عار دلانے والا مرنے سے قبل خود بھی اس گناہ میں (کسی نہ کسی طرح ضرور) مبتلا ہوتا ہے (راوی کہتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی) مراد اس گناہ سے متعلق تھی جس سے اس نے توبہ کر لی ہو۔“ (ترمذی عن خالد بن معدان، مشکوٰۃ)

کسی مسلمان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے وہ اس پر نادم ہو کر تائب ہو جائے یہ اس کی سلامت طبع اور حسن اسلام کی علامت ہے اس صورت میں کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس کو سابقہ گناہ پر ٹوکے اور اس کو عار اور شرم دلائے اور ملامت کرے البتہ جو شخص توبہ کئے بغیر کسی گناہ میں مبتلا رہتا ہے مثلاً داڑھی منڈاتا ہے یا کوئی نشہ کرتا ہے یا کسی غلط عقیدے میں مبتلا ہے تو اس کو تنبیہ کرنا اور اس کو ملامت کرنا درست ہے بشرطیکہ یہ ملامت وغیرہ درست طریقہ پر ہو اور بطریق تکبر اور بقصد تحقیر و تذلیل کے نہ ہو بلکہ مقصد صرف نصیحت خیر خواہی اور اس کو اس گناہ سے روکنا ہو۔

زبان کی لغزش نہایت خطرناک ہے!

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(إِنَّ الْعَبْدَ لَيَقُولُ الْكَلِمَةَ لَا يَقُولُهَا إِلَّا لِيُضْحِكَ بِهِ النَّاسُ يَهْوِي بِهَا الْعَبْدُ مِمَّا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَأَنَّهُ لَيَزِلُّ عَنْ لِسَانِهِ أَشَدَّ مِمَّا يَزِلُّ عَنْ قَدَمِهِ)

”بے شک جب بندہ ایک بات کہتا ہے اور صرف اس لئے کہتا ہے کہ اس کے ذریعے لوگوں کو ہنسائے تو وہ اس کی وجہ (دوزخ میں) جا گرتا ہے اور اتنی دوری سے گرتا ہے جو زمین و آسمان کے درمیانی فاصلہ سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بندہ اپنے قدموں کے ذریعے پھسلنے سے زیادہ سخت اپنی زبان کی وجہ سے پھسلتا ہے۔“ (بیہقی، مشکوٰۃ)

ہر آدمی کو چاہئے کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھے اور اس کو نامناسب اور بے فائدہ باتوں سے محفوظ رکھے۔

زبان کے قابو کرنے کا علاج و طریقہ!

نفس کو زیادہ بولنے میں مزہ آتا ہے اور اس سے سینکڑوں گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے جھوٹ غیبت، چغلی، کسی کا مذاق اڑانا کسی کو طعنہ دینا اپنی بڑائی جتنا خواہ مخواہ کسی سے بحث کرنا گالی گلوچ اور امیروں و منصب داروں وغیرہ کی خوشامد کرنا کسی کی تعریف میں مبالغہ کرنا سنی باتوں کو پھیلا نا وغیرہ تمام نامناسب اور بے فائدہ باتوں کی آفتوں

سے بچنا اس وقت ممکن ہے جبکہ زبان کو روکے اور زبان کو قابو میں رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جو بات منہ سے نکالنی ہو اس بات کے دل میں آتے ہی نہ کہو بلکہ پہلے خوب سوچ لو کہ اس بات میں گناہ ہے یا ثواب یا کہ نہ گناہ ہے نہ ثواب۔ اگر وہ بات ایسی ہے کہ جس میں ذرہ برابر بھی گناہ کی آمیزش ہو تو اپنی زبان بالکل بند کر لو اگر نفس اس بات کے کرنے کا تقاضا کرے تو اس کو یوں سمجھاؤ کہ اس وقت تھوڑا اپنے آپ کو مشقت میں ڈالنا اور صبر کرنا آسان ہے اور دوزخ کا عذاب بہت سخت ہے۔ نیز ہر اچھی بات کے بارے میں بھی یہ سوچو کہ اس بات کو کرنے کا میٹھا سے میٹھا اور شیریں انداز کیا ہے تو اپنی اچھی اور خیر کی بات کو شیریں اور بہترین انداز میں ادا کرنے کی کوشش کرو۔

### چغلی کی مذمت!

چغل خوری یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان جھوٹی سچی باتیں بیان کر کے ہر ایک کو دوسرے کے خلاف بھڑکایا جائے۔ حالانکہ مسلمانوں کو تو یہ حکم ہے کہ وہ مسلمانوں کے درمیان الفت، محبت کی فضا بنائیں اگر ان میں ناچاقی ہو تو ان کے درمیان صلح کرادیں اور چغلی کھانا بالکل اس کے خلاف اور ضد ہے جو لوگ اس بد اخلاقی میں مبتلا ہوتے ہیں وہ ناپسندیدہ باتوں کی طرف کان لگائے رکھتے ہیں اور پھر ایک کی بات کو دوسرے تک ایسے انداز میں پہنچاتے ہیں جس کے ذریعے مسلمانوں کے درمیان بغض و نفرت پیدا کرتے ہیں قوموں قبیلوں اور عزیز و اقارب وغیرہ میں فساد کو بھڑکادیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ بہت بڑی بد اخلاقی ہے اور اس بد اخلاقی کی وجہ سے دو شخصوں کے درمیان اور عزیز و اقارب اور دوست و احباب وغیرہ میں ناچاقی پیدا ہوتی ہے اور چغل خور لوگ معاشرہ میں بدترین کردار ادا کر کے معاشرہ میں اخوت اور باہمی محبت و الفت اور رحمت کی زندگی کو جلا کر درہم برہم کر دیتے ہیں۔ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے شریر اور برے لوگ کون ہیں پھر خود ہی آپ ﷺ نے فرمایا:

(الْمَشَاوُنَ بِالنَّمِيمَةِ الْمُفْسِدُونَ بَيْنَ الْأَحِبَّةِ) (مسند احمد دیکھئے مجمع الزوائد: جلد نمبر ۸ ص ۹۳)

یعنی ”جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں (عزیز وغیرہ) کے تعلقات خراب کرتے ہیں۔“

اور ایک حدیث شریف میں ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ ایک قبرستان کے پاس سے گزرے وہاں دو قبر والوں کو عذاب دیا جا رہا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان میں سے ایک کو عذاب اس لئے دیا جا رہا ہے کہ وہ پیشاب کے چھینٹوں سے نہیں بچتا تھا اور دوسرے کو اس لئے کہ وہ چغلی کھاتا پھرتا تھا۔ (بخاری و مسلم)

نیز حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

(لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَاتٌ)

”چغلی خور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔“ (بخاری و مسلم)

چغلی کھانا اور لوگوں کے درمیان نفاق اور دشمنی پیدا کرنا دین کو ختم کرتا ہے!

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(الْأَخْبِرُكُمْ بِأَفْضَلِ مِنْ دَرَجَةِ الصَّيَامِ وَالصَّدَقَةِ، الصَّلَاةِ، قَالَ قُلْنَا بَلَى قَالَ أَصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ

وَفَسَادُ ذَاتِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ)

”کیا میں تمہیں ایک ایسا عمل نہ بتاؤں جس کے ثواب کا درجہ روزے، صدقہ اور نماز کے ثواب سے زیادہ ہے؟“

(حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا کہ ”ہاں“ (ضرور بتلا دیجئے) آپ ﷺ نے فرمایا (آپس میں دشمنی

رکھنے والے) لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانا۔ (اور اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا) اور لوگوں کے درمیان فساد (یعنی

جدائی اور دشمنی) پیدا کرنا ایک ایسی خصلت ہے جو مونڈنے والی ہے (یعنی دین کو تباہ و برباد کر دیتی ہے)۔ (ترمذی)

چغلی خوروں کی باتوں کو ناقابل اعتبار قرار دیا جائے!

یہ بد اخلاقی چونکہ زیادہ تر ان لوگوں میں پائی جاتی ہے جو یا تو نہایت خبیث ہوتے ہیں یا ایسے لوگوں میں پائی

جاتی ہے جو کم ہمت اور پست حوصلہ ہوتے ہیں۔ تو اس قسم کے لوگ بغض و انتقام لینے یا کسی ذی وجاہت شخص کے

یہاں مقام حاصل کرنے یا معاشرہ میں اپنے لئے کوئی خاص جگہ بنانے کے لئے جب کوئی اور ذریعہ نہیں پاتے تو

چغلی خوری سے کام لیتے ہیں اس لئے ان کے شر و فساد سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان کی باتوں کو ناقابل اعتبار

قرار دے کر ان پر کوئی بھروسہ نہ کیا جائے اور ان کا کہنا نہ مانا جائے اور یہی قرآن مجید کی تعلیم ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَطْعُمْ كُلَّ حَلَافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَشَاءٍ بَنَمِيمٍ ۝ مَنَاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ ۝﴾ (سورہ قلم: آیت ۱۰ تا ۱۱)

”اور آپ ہر ایسے شخص کی بات نہ مانیں جو بہت قسمیں کھانے والا ہو ذلیل ہو طعنہ دینے والا اور چغلی کھانے

والا ہو۔“

سلیمان بن عبد الملک کی مجلس میں حضرت زہری رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے تھے کہ ایک شخص آیا اور سلیمان نے اس شخص

سے کہا میں نے سنا ہے کہ تو نے میری شکایت کی ہے اس شخص نے انکار کیا سلیمان نے کہا کہ میں نے معتد شخص سے

سنا ہے اس پر حضرت زہری بول اٹھے کہ اے سلیمان وہ شخص جس نے تمہارے سامنے کہا کہ فلاں شخص نے تمہاری

شکایت کی ہے چغل خور ہے اور چغل خور کبھی سچا نہیں ہوتا۔ (احیاء العلوم: باب النمیمۃ)

☆.....☆.....☆

### اللہ تعالیٰ کی محبت کا بیان!

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت و دود ہے اسکی تجلی اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر پڑتی ہے اور ہر ایک چیز اپنی خداداد صلاحیت و استعداد کے مطابق اس کے اثر کو قبول کر لیتی ہے اس محبت کی وجہ سے ہی دنیا کی یہ ساری چمک دمک اور سوز و گداز ہے، یہی وہ محبت اور رافت ہے جسکی بنا پر مائیں اپنی اولاد کی پرورش اور انکی حفاظت کرتی ہیں اور اسی کی بدولت ایک مخلوق دوسری مخلوق سے مربوط ہے اور محبت و عشق ہی وہ آگ ہے کہ جب یہ کسی ایک چیز پر مرکوز ہو جاتی ہے تو پھر انسان اسکے حصول کے لئے جان کی بازی لگا دیتا ہے، دنیا میں آج تک جتنے نمایاں کام انسانوں نے انجام دیئے ہیں یا دیئے جا رہے ہیں ان سب میں اسی جذبہ محبت کی قوت کا فرما ہے۔ جب کسی کو اپنے فرقے، اپنی جماعت سے یا کسی کو مال و دولت اور دنیاوی جاہ و حشم سے یا کسی کو کسی شخص یا کسی کو کسی عزم یا نصب العین یا کسی کو اپنی قوم یا وطن سے انتہائی محبت ہو جاتی ہے تو وہ اسکے لئے وہ نمایاں کام انجام دیتا ہے کہ عقل انسانی حیرت میں گم ہو جاتی ہے۔

غرض یہ کہ جب بھی انسان کی محبت کا مرکز و محور کوئی ایک چیز بن جائے تو وہ دل کی گہرائیوں سے اس کا غلام اور بندہ بن کے رہ جاتا ہے۔ یہی محبت انسان کی تمام پریشانیوں اور تکلیفوں کا سبب بھی بن جاتی ہے اور انسان کی ساری پریشانی و پرانگندگی کا حل و علاج بھی۔ اگر محبت دنیائے فانی سے ہے تو انسان پریشان حال، ناکام و نامراد ہو جاتا ہے اور یہی محبت اور تعلق اگر جمال لازوال، حسن ازلی وابدی خالق کائنات رب العالمین کے ساتھ اور اسکے لئے ہو تو انسان کو قلبی سکون و راحت میسر آ جاتی ہے اور انسان ابدی فلاح پا جاتا ہے۔

**مومن کا حقیقی محبوب صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے!**

انسان ہمیشہ فائدہ اور نفع بخش چیزوں اور حسن و کمال سے محبت کرتا ہے۔ جو شخص بھی حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ کو خالق و مالک، رب العالمین اور تمام صفات کمال کا مالک مانتا ہو اور یہ حقیقت کھل کر اسکے سامنے آچکی ہو کہ جملہ مخلوقات اور پوری کائنات کی چیزوں میں جو بھی حسن و خوبی اور کمال نظر آ رہا ہے یہ اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کمال کی تجلیات کی وجہ ہے تو یقیناً اسکی محبت کا واحد مرکز صرف اور صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات بن کر رہ جاتی ہے اور یہی اللہ تعالیٰ کا خاص حق بھی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت دوسری تمام چیزوں پر مقدم ہو اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسری تمام چیزوں کی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت کے تابع ہو اور جو محبتیں اللہ تعالیٰ کی محبت و خوشنودی سے نکراتی ہوں ان سے متنفر اور بیزاری ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ﴾ (البقرة: آیت ۱۶۵)

”اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو اس کا ہم پلہ اور مد مقابل بنا رکھا ہے جن سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی کہ اللہ تعالیٰ سے رکھنی چاہیے اور ایمان والے تو سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ ہی سے محبت رکھتے ہیں۔“

**محبت و عداوت متعدد صفات ہیں!**

جب یہ بات معلوم ہو چکی کہ دین اسلام میں محبت کا اصل مرکز و محور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے تو یہ بات بھی سن لیجئے کہ محبت و عداوت متعدی صفات ہیں جب کسی سے محبت پیدا ہو جاتی ہے تو محبت کی لہریں دوڑ کر خود بخود ان چیزوں سے بھی محبت پیدا کر دیتی ہیں جو چیزیں اس سے وابستہ ہوں یہی حال عداوت اور دشمنی کا بھی

ہے۔ کسی کہ ایک ہی شخص سے محبت یا دشمنی کی وجہ سے اس سے وابستہ لوگ اور چیزیں بھی محبوب یا مبغوض بن جاتی ہیں اور یہ ایک ایسی فطری بات ہے کہ جس سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ ایک سچا عاشق اپنے محبوب کے محبوب سے، اسکے گھر وطن سے، اسکی زبان اور باتوں سے اور اسکے طور طریقوں سے محبت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے خالص محبت رکھنے والا کون ہے؟

اس تمہید کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ بس اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچی اور خالص محبت کرنے والا شخص وہی ہے جسکی تمام محبتیں اور چاہتیں اللہ تعالیٰ کی محبت اور خوشنودی کے تابع ہوں، جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ﷺ اور آپ ﷺ پر اتری ہوئی تعلیمات و ہدایات سے ہوگی اور اسکے بعد ان لوگوں سے ہوگی جو رسول اللہ ﷺ اور انکی دعوت و تعلیمات پر مر مٹے کو تیار ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مومن وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے نام لگی ہوئی اور اسکی نامزد کردہ تمام چیزوں کیساتھ حسب مراتب محبت رکھے گا اور انکا دل سے ادب کرتا ہوگا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں علیہم السلام، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم، اولیا اللہ رحمہم، کتاب اللہ، اللہ تعالیٰ کے احکامات و تعلیمات، بیت اللہ، مساجد وغیرہ اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

﴿ذَٰلِكَ وَمَنْ يُعِظْمُ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾

”یہ بات ہو چکی اور جو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی تعظیم و احترام کرتا ہے تو یہ دلوں میں تقویٰ (ہونے کی وجہ) سے ہے۔“

کسی جذبہ کو پیدا کرنے کے لئے ایک اصولی بات!

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی محبت وہ عظیم نعمت ہے جسکی بدولت انسان دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی اور دائمی راحت و سکون پالیتا ہے۔ لیکن یہ نعمت حاصل کیسے کی جائے؟ تو اسکے حصول کے لئے پہلے ایک اصولی بات سمجھ لیجئے۔ وہ یہ کہ جس جذبے کے جو آثار و علامات ہوتے ہیں، انہیں آثار و علامات کو اس جذبے کے حصول کی خاطر بتکلف اختیار کیا جائے تو ان شاء اللہ وہی جذبہ نصیب ہو جائیگا۔ مثلاً دل میں رحم و مہربانی کے آثار پیدا کرنے سے تو بتکلف فقیروں سے ہمدردی کیا کریں اور یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیرا کریں اور یہی رحم و مہربانی کے آثار میں سے ہے کہ جس کے دل میں رحم ہو تو اس سے خود بخود ایسے مہربانی کے کام صادر ہو جاتے ہیں اور یہی اسکے حصول کا طریقہ بھی

ہے اگر دل میں رحم کم ہے تو بتکلف یتیموں کے سر پر ہاتھ پھیر لیا کریں اور بتکلف فقیروں کی امداد کریں تو ان شاء اللہ کسی وقت خود بخود اللہ تعالیٰ کے فضل سے دل میں رحم کا چشمہ ابل پڑے گا۔ اور پھر بے تکلف مہربانی کا کام صادر ہوتے رہیں گے۔

جب یہ قاعدہ معلوم ہو گیا تو اب پھر ایک بار ذرا تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت کے آثار و علامات کو لکھ دیتے ہیں کہ یہی اس محبت کی علامات اور آثار بھی ہیں اور اگر محبت کم ہے تو انہیں کو اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کی محبت کو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل بھی کیا جاسکتا ہے۔

### اللہ تعالیٰ کی محبت کے آثار و علامات!

- (۱)۔ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرنا۔
  - (۲)۔ اللہ تعالیٰ کے نام مبارک کو ادب سے لینا اور اس کا لکھا ہوا نام یا اسکی بات کو پاک صاف جگہ رکھنا۔
  - (۳)۔ اسی کی عبادت کرنا اور اسی کے ساتھ محبت رکھنا اور اسکی پرستش میں مشغول رہنا۔
  - (۴)۔ اللہ تعالیٰ کا ہر حکم اس طرح ماننا جس طرح اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے بتلایا ہو، نیز ان کتابوں کا احترام کرنا جن میں اللہ تعالیٰ کی تعلیمات اور ہدایات کی تشریح و تفصیل موجود ہو۔
  - (۵)۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں ممنوع فرمائی ہیں ان سے اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے بیزار ہونا۔
  - (۶)۔ آسمانوں اور زمین کی چیزوں میں غور و فکر کرنا اور اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور اسکے انعامات کو سوچنا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا۔
  - (۷)۔ انبیاء علیہم السلام کا احترام اور ان سے محبت رکھنا، انکے احترام میں ذرہ برابر کمی نہ کرنا۔
  - (۸)۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو محبت سے دیکھنا۔
  - (۹)۔ شعائر اللہ مثلاً بیت اللہ اور مساجد کا ادب و احترام کرنا اور ان میں کوئی بات اور کوئی ایسا عمل نہ کرنا جو ادب و احترام کے منافی ہو۔
  - (۱۰)۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم، اولیاء اللہ رحمہم اللہ عنہم، غرض ان تمام لوگوں سے محبت کرنا اور ان کا احترام کرنا جنکے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی تعلیمات اور ہدایات ہم تک پہنچی ہیں یا جن سے فسی زمانہ یہ تعلیمات و ہدایات سیکھی جاتی ہیں۔
- یہ چند علامات و آثار پیش کئے گئے ہیں لیکن ان تمام آثار و علامات میں سے رسولوں کی جوشان ہوتی ہے ان



کے ساتھ جو محبت کرنی چاہیے وہ تمام مخلوقات سے اعلیٰ اور برتر ہونی چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور تعلیمات لوگوں تک پہنچانے والی یہی ہستیاں ہوتی ہیں۔ اگر ان سے محبت نہیں اور ان کی قدر دانی اور ان کا ادب و احترام اور تعظیم نہیں پھر نہ اللہ تعالیٰ کی محبت ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی تعلیمات و ہدایات کی۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اپنی محبت کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ کی محبت کا ذکر کرتے ہیں اور انکی تعظیم اور تکریم پر بہت ہی زور دیتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَأَخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ ط وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَأَخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسْكَنٌ تَرْضَوْنَهَا حَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾

”اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیوں کو اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں اور تم میں سے جو بھی ان کے ساتھ (ایسی صورت میں) دوستی رکھے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔ آپ (ﷺ) کہہ دیجئے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری اور وہ مال جو تم نے کمایا ہے اور وہ مال تجارت جسکی کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو تمہیں اللہ اور اسکے رسول (ﷺ) اور اسکے راستے میں جہاد سے زیادہ پیارے ہیں تو انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ (یعنی سزا اور عذاب) بھیجے اور اللہ تعالیٰ فاسق قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔“ (التوبہ آیات ۲۳-۲۴)

دین اسلام حقوق العباد پر جس قدر زور دیتا ہے وہ تو سب کو معلوم ہے وہ تو کہتا ہے کہ والدین کو اف تک نہ کہو اور اسی طرح دوسرے رشتہ دار اور عزیزوں کے لئے بہت زیادہ حقوق مقرر فرمائے ہیں اور والدین کے حقوق سب پر مقدم ہیں۔ سب سے زیادہ حقوق والدین کے ہیں لیکن اگر والدین بھی اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول کی اطاعت میں رکاوٹ بنتے ہیں تو انکے حق اطاعت و محبت کو نظر انداز کیا جائیگا۔ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و محبت پر کوئی آنچ نہیں آنے دی جائیگی۔

ان آیات کا عام حکم تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیساتھ اس درجہ کی محبت لازم ہے جس پر کوئی بھی دوسری محبت اور تعلق غالب نہ آجائے اور محبت کے مقدم اور غلبہ محبت کے ہونے کا مطلب یہی ہے کہ اگر کسی موقع پر اللہ اور اسکے رسول کی وجہ سے اپنے والدین اور اپنی اولاد وغیرہ تمام محبوب چیزیں ترک کرنی پڑیں تو ان سب چیزوں کو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول کی محبت اور حکم پر قربان کر دیا جائے اور

رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے امت کو یہ تعلیم دی ہے کہ

(لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ)

یعنی تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسکو اپنے باپ اپنی اولاد اور تمام

لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ (بخاری و مسلم)

اس طرح متعدد صحیح احادیث میں یہ تعلیم موجود ہے کہ جب تک ایک امتی میں آپ ﷺ کی محبت دنیا کی ہر چیز حثیٰ کہ اپنی جان سے بھی زیادہ نہ ہو اس وقت تک وہ ایمان کی حقیقت اور اسکی لذت کو نہیں پاسکے گا اور صرف یہی نہیں کہ تمام چیزوں پر اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول کی محبت کو مقدم کرنا ضروری ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی محبت کے ساتھ اسکے دشمنوں کی محبت کو جمع نہ کر لیا جائے۔ کیونکہ اس بات کی وضاحت پہلے آچکی ہے کہ محبت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے دشمن کے ساتھ دشمنی کی جائے اور ایمان و اسلام کا تقاضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے دشمنوں اور گستاخوں کے ساتھ محبت نہ رکھی جائے اور یہی قرآن مجید کی تعلیم بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِنْهُ ط وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ط رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ط أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾

”آپ کبھی ایسی قوم کو نہ پاؤ گے (اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ) جو اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت رکھتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اسکے رسول کی مخالفت کی ہے اگرچہ یہ (مخالفت و عداوت رکھنے والے) انکے باپ، بیٹے، بھائی اور برادری ہی کے لوگ کیوں نہ ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان رکھ دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کو قوت بخشی اور ان کو ایسی جنتوں میں داخل کریگا۔ جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا گروہ (اور جماعت) ہے اور خبردار یقیناً اللہ تعالیٰ کا گروہ ہے فلاح پانے والا ہے۔“ (سورۃ مجادلہ: آیت ۲۲)

بلاشبہ وہی کامل مومن ہے اور وہی ایمان کی حلاوت اور لذت کو پاسکتا ہے جسکی محبت اور تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات اور اسکے رسول ﷺ سے اسقدر زیادہ اور مضبوط ہے کہ اس پر وہ تمام تعلقات اور محبتوں کو قربان کر سکتا ہے اور

اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے مقابلہ میں اور مخالفت میں جو تعلق اور محبت بھی آئے وہ بیزاری اور بغض میں تبدیل ہو جائے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

(ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ أَنْ يَكُونَ اللَّهُ وَرَسُولَهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ إِلَّا لِلَّهِ وَأَنْ يُكْرَهُ أَنْ يُعَوِّدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يُكْرَهُ أَنْ يُقَدَّفَ فِي النَّارِ)

”تین باتیں ہیں وہ جس شخص میں ہوں، ایمان کی (حقیقی) لذت پاسکتا ہے وہ یہ کہ (ایک) اسے اللہ اور رسول کی محبت تمام چیزوں سے زیادہ ہو (دوسرے) وہ جب کسی سے محبت کرے تو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کرے اور (تیسرے یہ کہ ایمان کے بعد) کفر میں واپس جانا اسکو اتنا ہی برا لگے جیسا کہ آگ میں داخل ہونا۔“ (بخاری و مسلم)

اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ وَأَبْغَضَ لِلَّهِ وَأَعْطَى لِلَّهِ وَمَنَعَ لِلَّهِ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ)

”جو شخص اللہ تعالیٰ ہی کے لئے محبت رکھے اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے بغض و عداوت رکھے اور اللہ ہی کے لئے خرچ کرے اور اللہ ہی کے لئے روکے تو یقیناً اس نے ایمان کامل کیا۔“ (ابوداؤد، ترمذی، مشکوٰۃ)

مذکورہ بالا آیات اور احادیث سے عقلی طور پر یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ اگرچہ دین اسلام افراد اور اشخاص سے نفرت کی تعلیم نہیں دیتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ ایمان اور ایمان والوں اور شعائر اللہ کی محبت اور اسکے برعکس کفر اور گناہوں، اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول اور دین اسلام کے دشمن فرقوں اور جماعتوں سے نفرت لازم و ملزوم قرار دیتا ہے جسکو ایمان، اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول سے محبت ہوگی اسکے دل میں لازماً شعائر اللہ کی تعظیم و محبت ہوگی اور وہ تمام امت مسلمہ سے بحیثیت امت محبت کرے گا۔ کفر سے اور دین اسلام کی ممنوع کردہ چیزوں اور دشمنان اسلام سے بیزار اور متنفر ہوگا۔ اگر اس کی حالت درمیانی ہے کہ اسلام سے بھی کچھ محبت ہے اور کفر سے بھی کچھ محبت، تو یہ نفاق ہے۔

تمام شعائر اللہ اور اللہ تعالیٰ کے نام سے لگی ہوئی چیزوں، خصوصاً رسول اللہ ﷺ کی توہین کفر ہے! مذکورہ بالا بیان سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ تمام شعائر اللہ کی تعظیم اور ان کے ساتھ محبت رکھنا یہ توحید، ایمان اور پرہیزگاری کی علامت اور نشانی ہے اور یہ سب کچھ ایمان اور توحید کے مفہوم میں داخل ہیں۔ ان کے بغیر نہ ایمان ہے اور نہ توحید۔ بلکہ شعائر اللہ خصوصاً رسول اللہ ﷺ کی توہین اور گستاخی تو ایسا کفر ہے کہ اس جرم کے

مرتکب کی سزا قتل ہے۔ اور اسکے متعلق علمائے اسلام میں کبھی دورائے نہیں ہوئیں۔ اور نہ ہو سکتی ہیں۔ البتہ اس سلسلہ میں اختلاف ہے کہ اگر کوئی مسلمان انبیاء علیہم السلام کی شان میں یا سیدنا محمد ﷺ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کا مرتکب ہوا اور پھر اس نے توبہ بھی کی تو پھر اسکی توبہ قبول ہوگی یا نہیں۔ کیا پھر بھی اسکو قتل کیا جائے گا یا نہیں۔ اسکے متعلق بعض فقہائے اسلام کہتے ہیں کہ اس کی توبہ قبول نہیں، ہر حال میں قتل کیا جائے گا اور بعض فقہائے اسلام کے نزدیک اسکی توبہ قبول ہے اور اسے قتل نہیں کیا جائے گا بشرطیکہ وہ سچی توبہ کرے اور اپنے آپ کو سچا اور پاک مسلمان اور محبت رسول ﷺ ثابت کرے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر اسے قتل کر دیا جائیگا۔

غرض یہ کہ انبیاء علیہم السلام اور رسول اللہ ﷺ کی شان اقدس میں توہین، گستاخی اور بے ادبی کرنا بالاجماع کفر ہے۔ البتہ قتل اور قبولیت توبہ کی تفصیلات میں علمائے اسلام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اصل مسئلہ میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ کیونکہ دین و ایمان کی پوری عمارت انبیاء علیہم السلام کی باتوں پر اعتماد کر کے کھڑی کی جاتی ہے اور ان کی توہین اور بے ادبی اللہ تعالیٰ ہی کی توہین اور بے ادبی ہے۔ یہی وجہ تو ہے کہ اگرچہ شاعر اللہ کی تعظیم کے حکم میں انبیاء علیہم السلام اور رسول اللہ ﷺ کی تعظیم و تکریم کا حکم بھی موجود ہے تاہم اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ساتھ صرف محبت رکھنے کی ترغیب نہیں بلکہ محبت کے ساتھ آپ کی تعظیم اور تکریم کا بھی بار حکم دیا ہے اور ہر اس چیز سے منع کیا جس سے آپ ﷺ کی توہین اور بے ادبی کا پہلو نکلے یا جس سے آپ ﷺ کی عزت مجروح ہوتی ہو یا آپ ﷺ کی شان گھٹتی ہو۔ اسکے متعلق قرآن مجید کے چند ارشادات سن لیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

﴿فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾

”پس جو لوگ اس (نبی ﷺ) پر ایمان لائے اور اسکی (محبت و تعظیم سے ساتھ) حمایت کی اور (مخالفین کے مقابلہ میں) اسکی مدد کی اس نور (قرآن مجید) کے تابع ہوئے جو اس کے ساتھ بھیجا گیا ہے، یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“ (الاعراف: آیت ۱۵۷)

(۲) ”اور وہ لوگ جو اللہ کے رسول (ﷺ) کو ایذا دیتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔“

(۳) ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ فَلِلَّتَقْوَىٰ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ﴾

”اے ایمان والو! اپنی آوازیں نبی (ﷺ) کی آواز سے بلند نہ کیا کرو اور نہ ان کے ساتھ اس طرح بلند آواز سے بات کیا کرو جس طرح (اونچی آواز) تم ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ (بے ادبی کی وجہ سے) تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ بلاشبہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے حضور میں اپنی آوازیں (رسول اللہ ﷺ کی عظمت اور احترام کی وجہ سے) پست کر لیتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے پرکھ لئے ہیں اور انہی کے لئے بخشش اور اجر عظیم ہے۔“ (الحجرات: آیت ۲-۳)

(۴) ﴿لَا تَجْعَلُوا عَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدَعَاءِ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ﴾

”تم لوگ رسول (کریم ﷺ) کے بلانے کو ایسا نہ بنا لو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔“ (النور: آیت ۶۳)

(۵) ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾

”اے ایمان والو! تم (لفظ) راعنا نہ کہا کرو اور ’انظرنا‘ کہا کر اور (آپ ﷺ کی بات) توجہ سے سنا کرو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔“ (البقرة: آیت ۱۰۴)

اس آخری آیت کے علاوہ اوپر کی آیات کے معنی اور مطلب تو بالکل واضح ہیں۔ اس آخری آیت کا مفہوم اور پس منظر یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور وہ جب کبھی آپ ﷺ کے کسی ارشاد مبارک کو اچھی طرح نہ سمجھ پاتے تو عرض کرتے یا رسول اللہ ﷺ راعنا یعنی ہماری رعایت فرمائیے (کیونکہ ہم پوری طرح نہیں سمجھ سکے ہیں، دوبارہ سمجھا دیجئے) لیکن چونکہ اس لفظ کے ایک اور معنی بھی ہو سکتے ہیں جس میں بے ادبی پائی جاتی ہے اور بد بطن اسی لفظ کو بے ادبی والے دوسرے معنی میں استعمال کر کے اپنی خباثت کا مظاہرہ کر سکتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو یہ حکم دیا کہ اس لفظ سے احتراز کریں، بلکہ اسکی جگہ ﴿انظرنا﴾ یعنی آپ ﷺ ہماری طرف التفات کریں یا آپ ﷺ ہماری طرف توجہ فرمائیں، کہا کریں۔

مذکورہ بالا آیات کو غور سے بار بار پڑھیں تو واضح طور پر چند موٹے موٹے احکام اور ہدایات سامنے آئیں گے:

(۱) حقیقی موحد اور مومن وہی ہے جسکے رگ رگ میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی محبت و عظمت کی روح دوڑ رہی ہو اور وہ رسول اللہ ﷺ کی تکریم و تعظیم میں کوئی کمی نہ کرے اور دل و جان سے آپ ﷺ پر اتنی روشنی یعنی قرآن و سنت کے احکام کو توجہ سے سن یا پڑھ کر اس کی مکمل اتباع کرے نیز انتہائی محبت و عظمت کے ساتھ دین کی

نصرت اور اس کی تائید کرے اور اسکے مقابلے میں ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو۔

(۲)۔ وہی لوگ متقی، پرہیزگار ہیں اور اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کے دلوں میں تقویٰ و پرہیزگاری کے لئے پرکھ لینے ہیں اور انہی کے دلوں کو تقویٰ کے لئے خاص کرتے ہیں جن کے دلوں میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے حقیقی عظمت و محبت ہو اور اس کا نتیجہ اور علامت یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کے حضور میں انکی آوازیں پست ہو جاتی ہیں۔

(۳)۔ جس کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی حقیقی عظمت و محبت ہو وہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت ہے اور انہی لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی بخشش ہے اور دنیا و آخرت کی فلاح و کامیابی اور بہت بڑا ثواب ہے۔

(۴)۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہر ایسے لفظ سے پرہیز کیا جائے جس میں بے ادبی اور تنقیص کا شائبہ ہو اور آپ ﷺ کے حضور میں ایسا عمل بھی ممنوع ہے جس میں بے ادبی کا شائبہ ہو، مثلاً آپ ﷺ کے حضور میں آواز کا اونچا کرنا۔

(۵)۔ انبیاء علیہم السلام اور سیدنا رسول اللہ ﷺ کی قصد اتوہین و تنقیص تو کفر ہے بلکہ آپ ﷺ کے بارے میں ایسا کلمہ کہنا یا آپ ﷺ کے حضور میں ایسا عمل کرنا جس میں آپ ﷺ کی توہین یا تنقیص یا بے ادبی کا ادنیٰ سا شائبہ بھی ہو تو یہ بھی ایک مسلمان کے لئے باعث کفر بن سکتا ہے اور اس کی وجہ سے ایک مسلمان کے سابقہ تمام اعمال برباد ہو سکتے ہیں اور اسے اپنے کفر اور بربادی اعمال کا کوئی پتہ بھی نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہی حفاظت فرمائے، آمین!

### توحید کے نام پر توہین کرنے والے!

آج کل بعض لوگ آپ ﷺ کی شان میں جو سوقیانہ باتیں کرتے ہیں ان کو اپنا انجام خود سوچ لینا چاہئے، وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر امت مسلمہ کے دلوں سے رسول اللہ ﷺ کی محبت و عظمت نکالنے کی جو مذموم تقریریں کرتے ہیں اور اسی کو وہ توحید الہی کہتے ہیں، حالانکہ وہ لوگوں کو توحیدی کے بجائے توہینی بناتے ہیں۔ بلکہ ان کی طرف بعض باتیں جو منسوب کی جاتی ہیں اگر واقعی وہ ایسی باتیں کرتے ہیں تو پھر ایسے مسلمانوں پر سخت افسوس ہے، ایسے لوگوں کی تقریریں سنتے ہیں، اگر وہ ایسی گستاخانہ باتیں سن لیتے ہیں تو وہ ایسے مقرر اور خطیب کا علاج کیوں نہیں کرتے؟

چونکہ وہ باتیں جو یقیناً کفر اور اس کا کہنے والا واجب القتل ہے، یقینی ذرائع سے ثابت نہیں اس لئے ان پر کوئی بحث نہیں کرتا اور نہ ان کو نقل کرتا ہوں۔



البتہ جو بات عام سننے میں آتی ہے وہ یہ کہ آپ ﷺ کا جسد اطہر قبر شریف میں سالم نہیں اور وہ (العیاذ باللہ) مٹی ہو گئے ہیں اور جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ آپ ﷺ کا جسد اطہر قبر شریف میں سالم ہے ان کو طرح طرح کے طعنے دیتے ہیں اور اس کو وہ بڑی تحقیق اور اس کو وہ اپنے زعم کے مطابق توحید الہی سمجھے ہوئے ہیں، حالانکہ نہ یہ تحقیق ہے اور نہ توحید، بلکہ ایسی باتوں کو جس انداز میں بیان کیا جاتا ہے اس میں کفر کا اندیشہ ہے۔

### اللہ تعالیٰ کی صفات میں شرکت پیدا ہونا محال ہے!

آپ ان کی اس بات پر ذرا غور کریں کہ آخر آپ ﷺ کے جسد اطہر کے سالم ہونے کا نظریہ رکھنے میں کیا بات توحید کے منافی ہے، کیا کسی شخص کا جسم اگر سالم ہو تو وہ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک ہو جاتا ہے، آخر جنت میں انسان کی جسمانی صلاحیتوں کا ذکر جو قرآن وحدیث میں موجود ہے مثلاً ہمیشہ زندہ رہنا، جسم جسم میں کوئی تغیر نہ ہونا ہمیشہ جوان رہنا اور اس قدر طاقت کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو دیکھ سکے اور جو چاہے وہ اس کو ملنا وغیرہ تو کیا وہ ان بہت سی صلاحیتوں اور خصوصیات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک ہو جاتے ہیں ایسا ہرگز نہیں کوئی کسی وقت بھی خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں کسی صلاحیت یا خصوصیت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی صفات میں شرکت نہیں کر سکتا۔

باقی رہی یہ بات کہ اس بات کا قائل ہونا علم غیب کا دعویٰ ہے یہ بھی بہت بڑی حماقت بلکہ الٹا چور کو تو ال کوڈانٹے کے مترادف ہے۔ کیونکہ ان کا یہ کہنا کہ آپ ﷺ کا جسد اطہر سالم نہیں یہ کون سے علم کی بنیاد پر ہے کیا قرآن مجید وحدیث سے واضح طور پر ثابت ہے؟ ایسا تو ہرگز نہیں بلکہ جو لوگ آپ ﷺ کے جسد اطہر کی سالمیت کے قائل ہیں ان کے لئے کچھ نقلی دلائل بھی موجود ہیں۔

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۝ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةِ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ ۝﴾

یعنی ”اور جو اللہ (تعالیٰ) کی راہ میں قتل کئے گئے ہیں انہیں ہرگز مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے ہاں رزق دیئے جاتے ہیں اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ انہیں دیا ہے اس پر خوش حال ہیں اور جو (مسلمان) ان کے پیچھے (دنیا میں) رہ گئے ہیں اور ابھی ان کے پاس (عالم قبر وبرزخ میں) نہیں پہنچے ہیں ان کے لئے (بھی یہ شہید لوگ) خوش ہو رہے ہیں کہ ان پر بھی نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل پر خوش ہوتے ہیں اور اس پر کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔“ (سورہ آل عمران: ۱۶۹ تا ۱۷۱)



### قبر اور برزخ کی زندگی اور اس میں درجات!

جو شخص بھی اس دنیا سے رحلت کر کے دوسرے عالم میں پہنچ جاتا ہے اس کو ایک نئی زندگی ملتی ہے جسے قبر اور برزخ کی زندگی کہتے ہیں اور یہ زندگی انبیاء علیہم السلام، غیر انبیاء، مومن، کافر اور صالح و فاسق وغیرہ ہر ایک کو ملتی ہے اور اس کی بدولت ہر کوئی قبر و برزخ، عذاب یا انعام کو محسوس کر لیتا ہے۔ لیکن قبر کی یہ زندگی بھی دنیا کی طرح قوت و ضعف، خوشی و غم، لطافت و کثافت وغیرہ وغیرہ کے لحاظ سے تقسیم ہے اور اسکے بہت سے درجات ہو سکتے ہیں، ہر ایک طبقہ جماعت کے لحاظ سے بھی اور طبقہ میں باہمی تفاضل کی رو سے بھی۔ پھر چونکہ طبقہ و جماعت شہداء کی زندگی قوت و انعام کے لحاظ سے عام لوگوں کے قوت و انعام پر ہر لحاظ سے اعلیٰ و برتر ہے اور ان کو ایک خاص قسم کی زندگی ملتی ہے اس لئے شہداء کے لئے خاص طور پر یہ بات بیان کی گئی ہے کہ ان کو مردہ نہ سمجھو، یہ زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے پاس رزق پارہے ہیں، خوش و خرم ہیں وغیرہ۔ اب یہ زندگی کیا ہے اور کیسی ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں البتہ دنیا میں جس طرح ریاضت، مجاہدے اور معصیت و گناہوں کے اثرات جسموں پر نمایاں ہوتے ہیں، اسی طرح طبقہ شہداء کی قوی ارواح کا اثر بسا اوقات ان کے جسم پر نمایاں ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ان کے اجسام بگڑنے اور متغیر ہونے سے بچ جاتے ہیں جیسا کہ تاریخی واقعات اور مشاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں ان کے بدن سالہا سال کے بعد بھی صحیح و سالم دنیا والوں نے دیکھ لئے۔ شائد ان کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی بابرکت روہیں اس قدر قوی ہوتی ہیں کہ وہ اپنے جسموں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہیں اور پھر اپنے اجسام سے دوری کے باوجود ان کی قوی روہوں کی شعاعیں ان کے اجسام پر پڑتی ہیں اور عام مردوں کی بہ نسبت ان کے روح کا تعلق جسموں سے زیادہ قوی ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کے جسم تغیر و تبدل اور بگڑنے سے بچ جاتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

بہر حال مذکورہ بالا قرآن مجید کی آیتوں میں طبقہ و جماعت شہداء کی حیات کا حال بیان کیا گیا ہے تو جب اس جماعت و طبقہ کی حیات کا یہ حال ہے تو انبیاء علیہم السلام اور اس جماعت و طبقہ کی روحانی اور حیات کا کیا حال ہوگا، جن کی عظمت، پرہیزگاری، سچائی و صداقت مسلمہ اور جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے وحی اور اپنی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے دنیا میں چن لیا تھا اور جن کی تعلیمات اور جن کے حکم پر لڑ کر یہ طبقہ شہداء اس عظیم حیات کے منصب پر فائز ہوتا ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ والدین کے حقوق بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتے ہیں:

﴿فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أَفٍ وَلَا تَنْهَرْهُمَا﴾

”تو انہیں اف (تک بھی) نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو“۔ (الاسراء، آیت ۲۳)

اس آیت کریمہ میں جب اف تک کہنے کی ممانعت ہے تو انہیں مارنے اور قتل کرنے کا تو بہت ہی بڑا عذاب ہوگا۔ لیکن اگر کوئی یہ کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ نے ’اف‘ کہنے اور جھڑکنے سے منع کیا ہے نہ کہ مارنے اور قتل کرنے سے تو بلاشبہ یہ شخص ایسی حماقت کرتا ہے جس حماقت کو بچے بھی سمجھ جائیں گے۔

اس طرح طبقہ شہداء کے متعلق خصوصی امتیازی حیات کو مان لینا اور طبقہ انبیاء علیہم السلام کو قوتِ ارواح اور انکی حیات کو شہداء سے بھی اعلیٰ وارفع نہ ماننا بہت بڑی جہالت ہے پھر سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی روح و حیات کا کیا حال ہوگا۔ جو تمام انبیاء علیہم السلام کے امام و سردار ہیں اور ان کے متعلق چمی گونیاں کرنا تو جہالت پر جہالت ہے اور اب عام انبیاء علیہم السلام کی جماعت کے متعلق رسول اللہ ﷺ کا ایک اور ارشاد مبارک بھی سن لیجئے۔

حضرت اوس رضی اللہ عنہ بن اوس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بلاشبہ تمہارے افضل ترین دنوں میں سے ایک جمعہ کا دن ہے، اسی میں حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے، اسی میں ان کی وفات ہوئی اور اسی میں صور پھونکا جائیگا، اور اسی دن میں صوری کی آواز سے لوگوں پر بے ہوشی طاری ہوگی، لہذا تم اسی جمعہ کے روز مجھ پر درود کی کثرت کیا کرو، کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کس طرح ہمارا درود آپ ﷺ پر پیش کیا جائیگا، جبکہ آپ ﷺ مٹی میں مل چکے ہونگے (یعنی ریزہ ریزہ ہونگے) تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا:

(إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ حَرَّمَ عَلَى الْأَرْضِ أَنْجَسَ الْأَنْبِيَاءِ) (ابوداؤد و نسائی وغیرہ)

”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء (علیہم السلام) کے اجسام کو حرام کر دیا ہے (کہ وہ ان کو کھائے)۔

یہ حدیث اگر ایک طرف اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ پیغمبروں کے اجسام صحیح سالم ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی حفاظت کی جاتی ہے تو دوسری طرف یہ بھی بتلاتی ہے کہ آپ ﷺ کی روح مبارک کا آپ ﷺ کے جسد اطہر سے ایسا تعلق ہے کہ درود شریف ان دونوں پر پیش کیا جاتا ہے۔ ورنہ آپ ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اوس جواب کے بجائے کہ ”پیغمبروں کے جسموں کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے“ یہ جواب دیتے کہ اس میں جسد کا کیا سوال، درود شریف تو روح پر ہی پیش کیا جاتا ہے اور روح ایک غیر مادی چیز کا جس کا ریزہ ریزہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔



قبر میں انبیاء علیہم السلام کی ممتاز حیات ایک مسلمہ حقیقت ہے!

یہاں انبیاء علیہم السلام کی ممتاز اور خاص قسم کی حیات مقصود نہیں کیونکہ اس مسئلہ کے حق میں قرآن مجید اور احادیث میں صرف یہ ایک آیت اور یہ حدیث نہیں بلکہ آپ ﷺ کی تعلیمات میں اس کے لئے بہت سے دلائل موجود ہیں۔

مثلاً انبیاء علیہم السلام کا اپنی قبروں میں نمازیں پڑھنا اور حج پر جاتے ہوئے لبیک کہنا اور معراج شریف کے موقع پر متعدد انبیاء علیہم السلام کے ساتھ آپ ﷺ کا ملاقات کرنا، ان کے ساتھ آپ ﷺ کا بات چیت کرنا اور آپ ﷺ کے پیچھے تمام انبیاء علیہم السلام کا مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنا۔

اسی طرح کی بہت کچھ باتیں آپ ﷺ کی تعلیمات و ارشادات میں موجود ہیں جن سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں اور نہ یہ مسئلہ ایسا ہے جس میں کسی نے اختلاف کیا ہو، بلکہ یہ تو مسلمہ حقیقت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو قبر و برزخ میں ایک خاص قسم کی ممتاز حیات و زندگی حاصل ہے، البتہ علماء اسلام کے درمیان اس خاص قسم کی حیات و زندگی کی نوعیت میں اختلاف موجود ہے۔

لیکن چونکہ یہ قبر و برزخ کا معاملہ ہے اور ہم اس کی نوعیت کو معلوم کرنے سے عاجز ہیں اس لئے بہتر راہ یہی ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور متقدمین کی طرح ایسے مسائل میں اپنی طرف سے کوئی کمی یا زیادتی نہ کی جائے اور جیسا کہ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے اس کو دل و جان سے قبول کر کے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا جائے، کیونکہ ایسے مسائل کی تفصیلات اور ان کی نوعیت معلوم کرنا نہ تو ضروری ہے اور نہ اس کے ہم مکلف ہیں، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ شہداء کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ط بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ﴾

”اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل کئے جاتے ہیں انہیں مردہ مت کہو بلکہ وہ تو زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے“۔

(البقرة: آیت ۱۵۴)

البتہ علماء اسلام باطل اور دہریوں کو جواب دیتے وقت مختلف جواب دیتے ہیں یا بعض حضرات کو کشف یا خواب کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کچھ بتلا دیتے ہیں وہ بالکل دوسری بات ہے اس کا نہ انکار ہے اور نہ اس سے بحث۔

برزخی زندگی کو دنیا پر قیاس نہ کیا جائے اور یہ شرعی مسائل کا حل نہیں!

نیز یہ بات بھی یاد رکھیں کہ قبر اور برزخ کی زندگی کو دنیا پر قیاس نہیں کرنا چاہیے کیونکہ انسان کے ادراکات اور محسوسات میں ترقی جاری ہے۔ ماں کے پیٹ میں ہمارے جو ادراکات اور احساسات تھے، ظاہر ہے کہ وہ اس عالم دنیا کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ اسی طرح قبر کی زندگی کے احساسات و ادراکات کچھ اور ہوں گے اور قیامت میں تو انسان اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکے گا۔

لہذا اگر کوئی مردوں کے سننے کا قائل ہو تو اسکی تردید میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کسی زندہ شخص کو گڑھے میں دفنائیں پھر اس کے جانے پہچانے لوگ ایک ایک آ کر سلام کریں پھر اسے گڑھے سے باہر نکال دیں اگر انہوں نے سلام سنا ہوگا اور آدمیوں کی آواز کو پہچانا ہوگا تو مردوں کا سننا صحیح و نہ غلط۔ کیونکہ جب وہ مرا نہیں تو صرف زندہ شخص کو گڑھے میں دفنانے سے نہ اس پر قبر، برزخ کا عذاب آتا ہے اور نہ اسکو برزخ کے احساسات و ادراکات حاصل ہو سکتے ہیں۔ یہ بالکل لغو و بکواسات ہیں ان میں مشغول نہ ہوں البتہ ایسے مسائل کے متعلق یہ جاننا ضروری ہے کہ اسکے متعلق قرآن وحدیث کیا کہتے ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم جو رسول اللہ ﷺ کے بلا واسطہ شاگرد اور قرآن و حدیث کے عملی نمونے ہیں ان کا اس مسئلہ میں اختلاف تھا یا اتفاق؟ اگر اختلاف ہے تو جو مسئلہ اول سے اختلافی ہو اسکی وجہ سے ایک دوسرے پر طعن اور کفر و شرک اور بدعت کے فتوے جائز نہیں اور اگر وہاں یہ مسئلہ اتفاقی ہے پھر اس میں ایک مسلمان کے لئے اسکے سوا کوئی دوسری راہ نہیں کہ اسے تسلیم کرے، اب اس پوری بحث سے اتنی بات تو کھل گئی کہ رسول اللہ ﷺ کا جسد اطہر نقل وحدیث کی رو سے بالکل صحیح و سالم اور تروتازہ ہے۔

تجربہ شاہد ہے کہ بعض لوگوں کے اجسام مرنے کے بعد صحیح و سالم رہ جاتے ہیں!

اب رہی یہ بات کہ تجربہ اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ جب بھی کوئی گدھا وغیرہ مر جاتا ہے، وہ ہمارے سامنے ہوتا ہے تو چند روز کے بعد وہ ریزہ ریزہ ہو کر ختم ہو جاتا ہے، نیز بعض قبرستانوں میں قبر کھودتے وقت پرانی قبر کھل جاتی ہے تو اس میں بعض انسانوں کی صرف ہڈیاں ملتی ہیں اور بعض کی ہڈیاں بھی ریزہ ریزہ ہو کر مٹی کے ساتھ مل کر مٹی ہو جاتی ہیں، تو اس کا کیا جواب ہے؟

پہلے تو اس کے متعلق اتنی بات کافی ہے کہ ایک مسلمان کے لئے صرف اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی بات کافی ہے وہ جو فرماتے ہیں اس کو بسر و چشم تسلیم کرے، البتہ اگر کوئی آپ ﷺ سے راہ فرار کرنے کے لئے یا شکی مزاج ہونے کی بناء پر یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بات تو تسلیم ہے مگر اس کے ثبوت میں تردد ہے۔ اس لئے پھر تجربہ اور طبعی قوانین کو ترجیح دی جائیگی اور طبعی قانون یہ ہے کہ مرنے کے بعد مردے کا جسم زیادہ دیر تک صحیح و سالم نہیں رہ سکتا۔

## اس کے متعلق چند واقعات!

لیکن اسکے جواب میں یہی کہا جاتا ہے کہ یہاں بھی قوی ثبوت کے ساتھ مشاہدہ اور تجربہ موجود ہے کہ بعض بدنوں کو زمین نہیں کھا سکتی اور نہ اسکو دنیا کی ہوا وغیرہ نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق بہت سے واقعات میں سے صرف چند کو یہاں پیش کرتا ہوں۔

(۱)۔ حضرت سلیمان علیہ السلام جنات سے کام لے رہے تھے اور انہیں خدمت پر لگا رکھا تھا اور وہ مقررہ کاموں میں مصروف و مشغول تھے جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کا وقت آپہنچا تو اللہ تعالیٰ نے ایسی حالت میں ان پر موت طاری کی جب وہ لاٹھی کے سہارے عبادت الہی میں مشغول تھے یا تخت پر بیٹھ کر اپنے عصا کو ٹھوڑی کے نیچے دے کر اس پر ٹیک لگائے تھے اور وہ اسی طرح بدستور عرصہ دراز تک اسی عصا کے سہارے کھڑے یا تخت پر بیٹھے رہے، چہرہ اسی طرح تروتازہ رہا، جسم میں کوئی تغیر نہیں آیا اس لئے جنات اس وقت تک اپنے اپنے کام کرتے رہے جب تک وہ اپنی لاٹھی پر ٹیک لگائے ہوئے تھے لیکن جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو دیمک نے اپنا کام لاٹھی کا چائنا شروع کیا بالآخر خوب کھوٹھی ہو گئی تو حضرت سلیمان علیہ السلام زمین پر آ گئے اور جنات کو اس کے بعد یہ بات معلوم ہوئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کب کے دنیا سے رحلت فرما چکے ہیں اور اس واقعہ کے بعد خود جنات پر بھی اور ان کے معتقد انسانوں پر بھی یہ حقیقت کھلی کہ جنات کو علم غیب حاصل نہیں ورنہ وہ اتنی دراز مدت تک سخت محنت و مزدوری اور مشقت میں مبتلا نہ رہتے۔ قرآن مجید نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں فرمایا ہے:

﴿فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِن سِتْرِهِ فَلَئِمَّا خَرَّتْ بَنَاتُ

الْجِنِّ أَنْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْعَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ ۝﴾

”پھر جب ہم نے (یعنی سلیمان علیہ السلام) پر موت کا فیصلہ کر دیا (اور وہ انتقال کر گئے) تو ان (جنوں) کو موت کا پتہ دینے والی دیمک کے سوا کوئی اور چیز نہ تھی جو ان (یعنی سلیمان علیہ السلام) کے عصا کو کھا رہی تھی پھر جب وہ زمین پر آ گئے تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کو جانتے تو (اتنا طویل عرصہ) رسوا کن عذاب (یعنی سخت محنت و مشقت) میں نہ رہتے۔“ (سبا: آیت ۱۴)

ایک مرے ہوئے جانور کے پاس خشک لکڑی رکھ دو تو چند دن کے بعد وہ جانور گل سر کرمی میں مل جائے گا اور خشک لکڑی پر اسکی بہ نسبت بہت کم اثر ہوگا کیونکہ عادیہ گوشت پوست لکڑی کے مقابلہ میں جلد گل سر جاتا ہے اور

جسم میں بہت جلد ہی تغیرات رونما ہوتے ہیں لیکن قرآن مجید بتلاتا ہے کہ یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے، گوشت پوست کا انسان تو عرصہ دراز تک ہر قسم کے تغیر و تبدل سے محفوظ رہا اور اس کا بدن اور چہرہ بالکل تروتازہ اور ایسا کھل کھلا رہا تھا کہ کسی کو بھی یہ شک نہ ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام دنیا سے رحلت فرما چکے ہیں، جتنی کہ آپ کی وفات صرف اس بات سے معلوم ہوئی کہ آپ کے خشک عصا کو دیمک نے کھا کر ان کے سہارے کو ختم کر دیا اور وہ زمین پر آ رہے تب لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام تو کب کے دنیا سے انتقال کر چکے ہیں۔

(۲)۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ حضرت عبدالرحمن بن قصصہ سے نقل کرتے ہیں کہ ان کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ حضرت عمرو بن جموح اور عبداللہ بن عمرو جو دونوں انصار میں سے تھے ان کی قبر سیل یعنی رُو کے متصل واقع ہوئی تھیں اور سیل یعنی رُو نے قبریں کھود ڈالیں، یہ دونوں انصاری غزوہ احد میں شہید ہوئے تھے اور ان دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا تھا جب دوسری جگہ دفن کرنے کے لئے ان کی قبروں کو پوری طرح کھولا گیا (تو ان کے متعلق راوی کہتے ہیں کہ)

(فَوَجَدْنَاهُمْ يَتَغَيَّرُ كَأَنَّهُمَا مَاتَا بِالْأَمْسِ وَكَانَ أَحَدُهُمَا قَدْ جُرِحَ فَوَضَعَ يَدَهُ جُرْحَهُ فَذَفِنَ فَرَجَعَتْ كَمَا كَانَتْ وَكَانَ بَيْنَ أَحَدٍ وَبَيْنَ يَوْمٍ حُضِرَ عَنْهُمَا سِتُّ وَارْبَعُونَ سَنَةً)

یعنی ”تو ان دونوں کو ایسی حالت میں پایا گیا کہ ذرا بھی تغیر نہ تھا، یوں معلوم ہوتا تھا کہ کل دفن کئے گئے ہیں ان میں سے ایک صاحب جب زخمی ہوئے تھے تو انہوں نے اپنا ہاتھ زخم پر رکھ لیا تھا اور اسی حالت میں ان کو دفن کر دیا گیا تھا قبر سے نکالنے کے بعد ان کا ہاتھ جب زخم سے ہٹا کر چھوڑا جاتا تو وہ ہاتھ اسی طرح زخم پر پھر جا چمٹتا حالانکہ غزوہ احد اور جس دن ان کی قبر کھودی گئی ان کے درمیان چھیالیس سال کی مدت گزر چکی تھی“۔

(موطا امام مالک: ابواب الجہاد)

اور ایک اور روایت میں یہ ہے کہ ان کے چہرے پر جو زخم تھا اس کا ہاتھ اس کے زخم پر رکھا ہوا تھا، لوگوں نے وہاں سے ہاتھ ہٹایا تو تازہ خون بہنے لگا پھر ہاتھ دوبارہ وہاں رکھا گیا تو خون بند ہو گیا۔ (دیکھئے طبقات ابن سعد: ج ۳)

(۳)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایک اجاڑ زمین کھودی گئی تو اس میں عبداللہ بن تامر کی لاش نکالی گئی، انہوں نے اپنے سر (کنپٹی) پر ہاتھ رکھا ہوا تھا جب زخم سے ان کا ہاتھ ہٹا لیا جاتا تھا تو خون بہنے لگتا اور جب اس کو چھوڑ دیا جاتا تو پھر اپنی جگہ پر جا چمٹتا ان کے ہاتھ میں ایک لوہے کی انگوٹھی تھی اس پر ”ربی اللہ“ لکھا ہوا تھا،



جب یہ اطلاع حضرت عمرؓ کو ملی تو انہوں نے یہ لکھ بھیجا کہ تم نے جس حال پر ان کو پایا ہے ان کو اسی حالت میں دفن کر دو۔ (دیکھئے تفسیر خازن ابن کثیر، قرطبی اور مظہری: سورہ بروج)

عبداللہ بن تامرؓ کا عجیب واقعہ سورۃ البروج کی تفسیر میں اصحاب الاخدود کے تحت مفسرین نے نقل کیا ہے۔ یہ حضرت سیدنا محمدؐ کی پیدائش سے قبل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد کسی ولی اللہ کا واقعہ ہے جو یمن کے شہر نجران میں پیش آیا تھا اور عبداللہ بن تامر شہید کو وہاں دفن کیا گیا تھا، یہ ایک طویل واقعہ ہے اسکی تفصیل تفسیر کی کتابوں اور صحیح مسلم کی کتاب التفسیر میں دیکھی جاسکتی ہے۔

(۴) ۱۹۲۹ء کا واقعہ ہے، اس وقت عراق میں بادشاہت تھی، حضرت خذیفہ بن یمان اور حضرت عبداللہ بن جابرؓ کی قبریں اس وقت یہاں (جامع مسجد سلیمانؓ) کے احاطے میں نہیں تھیں، بلکہ یہاں سے کافی فاصلے پر دور دریائے دجلہ اور مسجد کے درمیان کسی جگہ واقع تھیں۔ ۱۹۲۹ء میں بادشاہ وقت نے خواب دیکھا کہ حضرت خذیفہ بن یمان اور حضرت عبداللہ بن جابرؓ فرما رہے ہیں کہ ہماری قبروں میں پانی آرہا ہے، اس کا مناسب انتظام کرو اور یہی خواب بار بار اس نے دیکھا، غالباً اس وقت عراق کے کسی عالم نے بھی بیعینہ یہی خواب دیکھا۔ اس وقت مشورے اور بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ دونوں بزرگوں کی قبروں کو کھول کر دیکھا جائے اگر پانی وغیرہ آ رہا تو ان کے جسموں کو منتقل کیا جائے۔ اس وقت کے علماء نے بھی اس رائے سے اتفاق کر لیا۔ چونکہ قرن اول کے دو عظیم بزرگوں اور صحابہ رسول اللہؐ کی قبروں کو کھولنے کا واقعہ تھا جو کہ بہت اہم تھا اس لئے حکومت عراق نے اس کا بڑا زبردست اہتمام کیا اور اسکے لئے تاریخ مقرر کی تاکہ لوگ اس عمل میں شریک ہو سکیں۔

کہا جاتا ہے کہ مقررہ تاریخ پر نہ صرف اندرون عراق بلکہ دوسرے ملکوں سے بھی لوگوں کا اس قدر اثر ڈھام ہوا کہ حکومت عراق نے سب کو یہ عمل دکھانے کے لئے بڑی بڑی اسکرینیں دوڑتے فٹ کیں تاکہ جو لوگ براہ راست قبروں کے پاس یہ عمل نہ دیکھ سکیں، وہ ان اسکرینوں پر اس کا عکس دیکھ لیں۔ اس طرح یہ مبارک قبور کھولی گئیں اور ہزار ہا افراد کے سمندر نے یہ حیرت انگیز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ تقریباً تیرہ صدیاں گزرنے کے باوجود دونوں بزرگوں کی نعش ہائے مبارکہ صحیح و سالم اور تروتازہ تھیں بلکہ ایک غیر مسلم ماہر امراض چشم وہاں موجود تھا۔ اس نے نعش مبارک کو دیکھ کر بتایا کہ ان کی آنکھوں میں ابھی تک وہ چمک موجود ہے جو کسی مردے کی آنکھوں میں کچھ دیر تک انتقال کے بعد موجود نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ وہ ڈاکٹر یہ منظر دیکھ کر مسلمان ہو گیا، نعش مبارک کو منتقل کرنے کے لئے پہلے حضرت سلمان فارسیؓ کے قریب جگہ تیار کر لی گئی تھی، وہاں تک لے جانے کے لئے نعش مبارک کو



جنازے پر رکھا گیا، اس میں لمبے لمبے بانس باندھے گئے اور ہزار ہا افراد کو کندھا دینے کی سعادت نصیب ہوئی اور اس طرح اب ان دونوں بزرگوں کی قبریں موجودہ جگہ پر بنی ہوئی ہیں۔ حضرت مولانا ظفر احمد انصاری مدظلہم کا بیان ہے کہ ۱۹۲۹ء کا یہ واقعہ مجھے یاد ہے۔ اس زمانے میں اخبارات کے اندر اس کا بڑا چرچا تھا۔ (پوری تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، ماہنامہ البلاغ، محرم الحرام ۱۴۰۶ھ بمطابق ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۵ء، اس امید سے دجلہ تک، پانچویں قسط) یہ چند واقعات بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں لیکن جسموں کا صحیح و سالم ہونا صحابہ کرامؓ اور گذشتہ لوگوں کے ساتھ خاص نہیں بلکہ افغانستان کے جہاد میں بھی بہت سے واقعات ایسے پیش آئے ہیں کہ بہت عرصہ کے بعد شہیدوں کو پایا گیا اور وہ بالکل صحیح و سالم اور تروتازہ تھے، نیز اس کے علاوہ بھی بہت مشاہدات سامنے آئے ہیں، مثلاً خود میرے والد ماجد مدظلہم کو ایک ملنگ نامی افغانی بوڑھے شخص نے ایک واقعہ سنایا، وہ کہتے تھے کہ افغانستان کے جہاد سے قبل ہم ایک عمارت کے لئے مزدوروں کے طور پر کھدائی کرتے تھے جب کھدائی اتنی گہری ہوئی کہ اس میں کھودانی ڈوب جائے تو ایک قبر نکل آئی جس میں ایک حسین و جمیل جوان عورت پڑی تھی، اس کا کفن بالکل گیس کی سفید جھلی کی طرح ہو چکا تھا اس کا چہرہ اور بدن اس قدر تروتازہ تھا کہ معلوم یہ ہوتا تھا کہ گویا ابھی اس کو دفن کیا گیا ہے اور اسی سال بارشوں و سیلابوں میں میانوالی وغیرہ کے قبرستانوں میں سے بعض قبروں سے صحیح و سالم لاشیں برآمد ہوئیں، بعض لاشیں ایسی بھی برآمد ہوئیں جو قریب دو تین سال پہلے دفن کی گئی تھیں اور ان کو ان کے ورثاء، دوست احباب خوب پہچان رہے تھے اور صرف چند روز قبل کے جنگ اخبار میں یہ خبر بھی پڑھ لیجئے۔

### پرانی قبر نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا!

چکوال (نمائندہ جنگ) یہاں سے ۴۵ کلومیٹر دور جھیک (بشارت) کے مقام پر چالیس سال پرانی ایک قبر نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا جبکہ حالیہ مسلسل تیز بارش کی بدولت اس میں بڑی دراڑ پڑ گئی مگر فرمان شاہ نامی شخص جن کا انتقال چالیس سال قبل ہوا تھا کی لاش بمعہ کفن اپنی ساخت برقرار رکھے ہوئے تھی اس معجزے کو دیکھنے کے لئے دور دراز سے لوگ آئے۔ (روزنامہ جنگ)

آپ نے دیکھ لیا کہ نقل و مشاہدہ دونوں اس بات کی پوری پوری تائید و تصدیق کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بعض جسموں کو صحیح و سالم اور تروتازہ رکھتے ہیں اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ جسم کا صحیح و سالم ہونا تو حید کے منافی نہیں ورنہ اللہ تعالیٰ فرعون کے جسم کو تو ضرور مٹی کر کے مٹی میں ملا دیتے کیونکہ اس نے تو خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور اس کی قوم نے اس کو اپنا رب مان لیا تھا لیکن چونکہ جسم کا سالم ہونا تو خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ انسان ہی تو تھا اور ہے، اس لئے

اللہ تعالیٰ نے اس مغرور اور متکبر و سرکش کے ڈھانچے کو بچا لیا تا کہ کوئی کہنے والا یہ نہ کہے کہ فرعون اپنے آپ کو غرق ہونے سے بچا کر آسمان پر چلے گئے ہونگے۔

بعد میں آنے والے لوگ اس سے اور اسکے پورے واقعے سے عبرت اور سبق لے لیں اور سب کو معلوم ہو جائے کہ یہی وہ خدائی کا دعویٰ کرنے والا ہے جو اپنی سرکشی اور نافرمانی کی بنا پر غرق ہو کر آج بھی مصر کے عجائب گھر میں دنیا کے سامنے بے بس پڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

چنانچہ فرعون کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلَفَكَ آيَةً﴾

”پس آج ہم تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں اور ان میں گلنے سڑنے سے) بچائیں گے تاکہ تو بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے (عبرت کی) نشانی بنے۔“ (سورۃ یونس: آیت ۹۲)

دوسروں کی حفاظتِ جسم پر انبیاء علیہم السلام کی حیات اور جسم مبارک کو قیاس نہیں کیا جاسکتا! لیکن یہاں یہ بات یاد رہے کہ بد بطن اور کج فہم یہ نہ سمجھے کہ (العیاذ باللہ) انبیاء علیہم السلام کے جسم مبارک کا صحیح و سالم ہونے کا مطلب بھی دوسروں کی طرح ہوگا اور ان میں کوئی فرق نہ ہوگا حالانکہ ان میں اور دوسروں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

مثلاً خنزیر کا گوشت کھانا حرام ہے اور انسان کا بھی لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ایک نجس ہونے کی بنا پر حرام ہے اور دوسرے کا تکریم اور اعزاز کی بنا پر۔ اسی طرح کتے و بھیڑیے کا گوشت بھی حرام ہے اور حرم کے شکار کبوتر وغیرہ کا گوشت بھی۔ لیکن دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ پہلا اس لئے کہ وہ پلید اور گندہ ہے اور کبوتر وغیرہ کا شکار پاک و صاف ہے لیکن بیت اللہ اور حرم کی عظمت کی وجہ سے حرام ہے۔ نیز قرآن مجید حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام بھی تا قیامت موجود رہے گا اور فرعون اور شیطان کا بھی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تا قیامت مدح، تعریف کی جائے گی اور ان پر سلام بھیجا جائیگا اور دوسرے فریق کی تا قیامت مذمت کی جائیگی اور اس پر لعنت بھیجی جائیگی۔

ان مثالوں کے بعد یہاں بھی اتنی بات سمجھ لیجئے کہ فرعون کی لاش کو سمندر کی موجوں اور سمندر میں گلنے سڑنے سے بچا کر سمندر سے باہر نکالنا اس کو لوگوں کے سامنے منظر عام پر لانا اور پھر انسانوں کے ہاتھوں اس کی لاش کی حفاظت کرنا اس لئے تھا کہ کوئی کہنے والا یہ نہ کہے کہ فرعون اپنی خدائی کا مظاہرہ کر کے آسمان پر چلے گئے نیز

یہ کہ اس کی تحقیر و تذلیل ہو اور آئندہ نسلوں کے لئے سامانِ عبرت ہو۔ رہا انبیاء علیہم السلام کا معاملہ ان کی اجسام کی تو شان ہی اور ہے اور ان کی تو روحانی قوت و تقدس اور عظمت اس قدر ہے کہ زمین دنیا کی آب و ہوا ان میں کوئی تغیر و تبدل پیدا نہیں کر سکتی۔ غیر انبیاء کے وہ پاکیزہ اجسام جو زمین کے اندر سے سالہا سال کے بعد صحیح و سالم برآمد ہو جاتے ہیں ان کو بھی حضرات انبیاء علیہم السلام کے اجسام پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، ان دونوں طبقات کے درمیان جو فرق ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ البتہ انبیاء علیہم السلام کی ارواح کی قوت اور ان کا اعتدال ان کی طہارت و تقدس اور عظمت کو جس قدر برتری اور جس قدر امتیازات دوسروں پر حاصل ہیں اسی قدر امتیازات کے ساتھ ان کی قبر و برزخ کی زندگی ہوگی اور اسی قدر امتیازات کے ساتھ ان کے اجسام مبارک زمین کے اندر باقی رہتے ہوں گے۔

پھر میرے آقا (ﷺ) تمام انبیاء علیہم السلام کے سردار کی حیاتِ قبر اور آپ ﷺ کا جسدِ اطہر کو کس قدر امتیازات حاصل ہونگے۔ جن کے متعلق ساری کائنات اور تمام جہانوں کے پروردگار یہ فرماتے ہیں۔

حضور اقدس ﷺ کی شان!

﴿إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾

”بے شک آپ (ﷺ) اخلاق کے عظیم الشان مرتبہ پر فائز ہیں“۔ (سورۃ القلم)

اور جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ﴾

”اور ہم نے آپ ﷺ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے“۔ (الانبیاء: آیت ۱۰۷)

اور جن کی شان یہ ہے کہ سرکش کفار و مشرکین تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مطالبہ کریں لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف

سے جواب یوں آجائے۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبُهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾

”اور اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرتا کہ آپ ﷺ ان کے درمیان موجود ہوں اور ان کو عذاب میں ڈال دے اور نہ اللہ

تعالیٰ ایسی حالت میں ان پر عذاب نازل کرنے والا ہے جبکہ وہ (اللہ تعالیٰ سے) معافی مانگ رہے

ہوں“۔ (الانفال: آیت ۳۳)

نیز ایسے محبوبِ الہی کی شان کا کون اندازہ کر سکتا ہے جو خود اللہ تعالیٰ کی وحی کے تحت یہ فرماتے ہیں کہ:

(اَنَّا سَيِّدُكَ اَدَمَ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَاَوَّلُ مَنْ يُنْشَقُّ عَنْهُ الْقَبْرُ وَاَوَّلُ شَافِعٍ وَاَوَّلُ مُشَفَّعٍ)  
 ”قیامت کے دن میں تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں گا اور سب سے پہلے قبر سے میں ہی اٹھوں گا، نیز سب سے پہلے میں شفاعت کروں گا اور سب سے پہلے میری شفاعت قبول ہوگی۔“ (مسلم)  
 آخر جس ہستی کی شان و نام کو دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ ہی بلند کرتا ہے اور جس کو آخرت میں اول و آخر کے تمام لوگوں کے سامنے مقامِ محمود پر فائز کیا جاتا ہے۔

﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾

”اور ہم نے آپ (ﷺ) کا ذکر بلند کر دیا۔“ (الم نشرح)

﴿عَسَىٰ اَنْ يَّعْتَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا﴾

”قریب ہے کہ تیرا رب تجھے مقامِ محمود میں پہنچا دے۔“ (الاسراء: آیت ۷۹)

تو ایسی ہستی کی علو شان اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کا مقام یہ ہو اور جس کو اللہ تعالیٰ نے عظمتِ علو شان عطا کی ہو اسکی عظمت کو گھٹانے کی کوشش کرنا اپنی رسوائی اور خسران کے سوا کچھ نہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بے باک اور شتر بے مہار زبان کی غلطی!

مذکورہ بالا پوری بحث کو سامنے رکھ لیں تو ان لوگوں کی غلطی سامنے آئیگی جن کی زبانیں حضور ﷺ کی شان میں اس قدر بے باک ہیں اور ان کی باتیں سن کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گویا بالکل غیر مسلم ہیں۔ کم بخت ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی زندگی پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں، حالانکہ اگر کسی مسئلہ میں اختلاف بھی ہو یا حدود سے تجاوز کرنے والوں کا جواب دینا ہی مقصود ہو جو رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی صفات میں شریک ٹھہرانے کا ارتکاب کرتے ہیں جیسا کہ خود میرے آقا ”فداہ ابی و امی“ نے فرمایا کہ:

(لَا تَطْرُقُوْنِيْ كَمَا طَرَبَتِ النَّصَارَى ابْنِ مَرْيَمَ فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُهُ فَقُوْلُوْا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهُ)

”مجھے حد سے نہ بڑھاؤ جیسے نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم کو حد سے بڑھایا (کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی بیٹا

اور جز قرار دیا) میں اللہ کا بندہ ہوں لہذا مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول (ﷺ) کہو۔“ (بخاری و مسلم)

تو پھر بھی یہ کب جائز ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے رتبہ سے گھٹایا جائے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے بعد مخلوق الہی میں خواہ وہ فرشتے ہوں یا انبیاء علیہم السلام، سب سے اعلیٰ رتبہ اور سب کے سردار آپ ﷺ ہی ہیں اور اس میں کسی کو

اختلاف نہیں۔ آخر تو حید یا لوگوں کو تجاوز سے روکنے کا یہی طریقہ ہے؟ کہ خود بھی اور لوگوں کو بھی تو بین الرسول ﷺ میں مبتلا کر کے خود بھی گمراہ ہو جاؤ اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دو۔

ذرا دیکھو تو سہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں اس قدر تجاوز کیا گیا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا اور جزا قرار دیا گیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ جس کو سب کچھ اختیار حاصل ہے اور فرشتے و انبیاء ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، پھر بھی وہ عیسائیوں کے غلط عقیدہ کی تردید کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان و عظمت کو برقرار رکھتا ہے۔ کبھی قرآن مجید ان کو ”کلمۃ اللہ“ یعنی اللہ کا کلمہ سے تعبیر کرتا ہے اور عیسائیوں کے بدعقیدہ کے باوجود اور ان کے متعلق قرآن مجید میں ان کے معجزات اور عجائب کو بیان فرماتا ہے کہ وہ مٹی سے پرندہ بنا کر ان میں پھونک دیتے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا۔ مردوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندہ کرتے تھے۔ کوڑھیوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے درست کرتے تھے اور لوگ جو کچھ اپنے گھروں میں کھاتے تھے اور جو کچھ ذخیرہ کر لیتے تھے یہ سب کچھ وہ ان کو بتایا کرتے تھے۔ (دیکھئے آل عمران: آیت ۴۹، المائدہ: آیت ۱۱۰)

پھر قرآن مجید عیسائیوں کے اس غلو و تجاوز کے باوجود صرف ان کے کمالات کا ذکر نہیں کرتا بلکہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شان گھٹانے کے لئے جو کچھ کچڑاں پر اور ان کی ماں پر اچھالا تھا اس سے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کی ماں کی پوری برات و پاکیزگی کو پیش کرتا ہے۔

اور اس کے برعکس آج کل ظالموں کی توحید یہ رہ گئی ہے کہ بس سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ اور آپ ﷺ کے دین پر مٹنے والے اولیاء اللہ کی کمزوریوں کو جھوٹ موٹ بنالیا جائے اور پھر ان کو اچھال اچھال کر بیان کیا جائے اور ان کی شانوں کو گھٹا کر امت میں ان کی ناقدری کا ختم بویا جائے حالانکہ یہ ایک ایسی غلطی اور جرم ہے کہ اس کے کنارے کفر سے جالتے ہیں اور یہ ایک ایسا رویہ ہے کہ آج سے پہلے مسلمانوں کے بجائے کفار کا شیوہ تھا، بس رسول اللہ ﷺ کی توہین میں توحید کو ڈھونڈنا سر اسر شرک و کفر ہے اور کسی بھی مخلوق کو خدائی اختیارات کا مالک ماننا خواہ وہ ذاتی ہوں یا عطائی۔ یہ بھی سر اسر گمراہی اور شرک عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ افرات و تفریط سے بچائے، آمین۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی محبت بھی لازمی ہے!

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ محبت اور عداوت دونوں متعدی صفات ہیں، یہ بجلی کا ایسا کرنٹ ہے کہ جس کے ساتھ بھی اس کا تار جوڑا ہوا ہو، وہاں تک بجلی کی لہریں دوڑتی ہیں، اگر اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو لازماً اللہ تعالیٰ کے نام

کے ساتھ وابستہ چیزوں سے بھی محبت ہوگی، رسول اللہ ﷺ سے محبت ہوگی، رسول اللہ ﷺ اور قرآن مجید سے محبت ہے تو لازماً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے محبت ہوگی، اہل بیت پاک سے محبت ہوگی، اسی طرح یہ سلسلہ آخر تک بلکہ تمام امت مسلمہ تک پھیل جاتا ہے اور ایک مسلمان فی الجملہ تمام امت مسلمہ سے محبت کرنے لگتا ہے۔

لہذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اولیاء اللہ دین اسلام کی تعلیمات کے پہنچانے والوں کے ساتھ محبت اور انکے ساتھ وفاداری و خیر خواہی میں کمی تو بہت بڑی بات ہے اگر امت مسلمہ سے بھی محبت، وفاداری اور اسکے لئے خیر خواہی دل میں نہیں تو یہ بھی نفاق کی چھبی ہوئی لہر ہے جو اندر ہی اندر دوڑ رہی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد پاک ہے:

(الَّذِينَ النَّصِيحَةُ لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِإِثْمَةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَتِهِمْ)

”یعنی دین اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ اور مسلمانوں کے پیشواؤں کے ساتھ اور عام مسلمانوں کے ساتھ خلوص اور وفاداری کا نام ہے۔“ (دیکھئے صحیح بخاری اور صحیح مسلم: کتاب الایمان)

یہ بات تو ظاہر ہے کہ کسی کے ساتھ خلوص اور وفاداری اور خیر خواہی اس وقت ہو سکتی ہے جب کہ اس کے ساتھ محبت بھی ہو۔

### صحابی کون ہوتا ہے؟

آپ ﷺ کی زندگی میں جس شخص نے مسلمان ہونے کے بعد بیداری ہوش کی حالت میں آپ ﷺ کی صحبت اختیار کی ہو اور اسی ایمان پر اس کا خاتمہ ہوا تو وہ صحابی ہے۔

اگر آپ ﷺ کے عہد مبارک میں ہی کوئی مسلمان ہوا لیکن آپ ﷺ کے ساتھ صحبت و ملاقات کا شرف حاصل نہیں کیا یا عہد مبارک میں کوئی بچہ مسلمان کے گھر پیدا ہوا اور آپ ﷺ کے ساتھ ان کی ملاقات بھی ہو گئی لیکن وہ اس وقت اس قدر چھوٹا تھا کہ اس کو کوئی تمیز اور ہوش نہ ہو یا کسی شخص نے آپ ﷺ کے زمانے کے بعد کشف یا خواب میں آپ ﷺ کی زیارت کی ہے، بلکہ آپ ﷺ سے کلام کر کے آپ ﷺ سے استفادہ بھی کیا ہو تو ان تمام مذکورہ بالا صورتوں میں وہ درجہ صحابیت کو نہ پاسکے گا۔

موجودہ زمانے میں سلف و صالحین اور صحابیت کے خلاف زہر پھیلانے والے کون ہیں؟

آج کل متعدد تحریکات ایسی پائی جاتی ہیں جنہوں نے مسلم عوام کے دلوں سے سلف و صالحین، ائمہ مجتہدین، فقہائے اسلام اور اولیاء اللہ کا اعتقاد اور اعتماد اٹھا کر ان میں گمراہانہ نظریات کی آبیاری کرنے کی کوشش کی ہیں۔ ان

میں سے اسلام اور صحابیت کے خلاف زہر پھیلانے والے ایک تو یورپ، امریکہ وغیرہ کا طبقہ مستشرقین ہیں جن میں بعض تو ایسے بھی ہیں جنہوں نے اسلام کے ساتھ ہمدردی کا اظہار اور اس کی تعریف و توصیف پر بہت سے صفحات سیاہ کر کے ان میں الحاد، زندقہ اور عداوتِ اسلام کے خبیث جراثیم چھپا دیئے ہیں اور مسلمانوں کو شیرینی میں زہر ملا کر پلایا کرتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو اول سے سبائیت اور خارجیت کے شکار چلے آ رہے ہیں۔

اور تیسرا گروہ خود مسلمانوں کے اندر ایسے لوگوں کا پیدا ہو چکا ہے جن کا خیال یہ ہے کہ وہ صحابہ کرام ؓ کے کمالات کو بہت سطحی نظر سے دیکھتے ہیں اور انکو وہ وزن دینے کے لئے تیار نہیں جس کے وہ مستحق ہیں اور انکی نظر صرف ان چیزوں پر پڑتی ہے جن سے کسی طرح ان کے عیب و نقص کی بات نکل سکتی ہے۔ ایسے بعض لوگ تو اس عظیم جرم کے ارتکاب کے باوجود اپنے نام کو اہل سنت والجماعت سے بھی نہیں کاٹنا چاہتے اور ان کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ وہ جرح و تعدیل کے بغیر لکھ جانے والے تاریخ کے جھوٹے خوابوں سے حضرات صحابہ کرام ؓ کی کچھ لغزشیں اور کوتاہیاں جمع کرتے ہیں اور پھر ان کو تحقیق و اجتہاد کا نام دے کر اپنے گندے اور خبیث تبصرہ کے ذریعہ قرآن و حدیث کا فیصلہ جھٹلا کر اپنے کفر و گمراہی کا سامان کرتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ پہلے تو تاریخی واقعات میں صحابہ کرام ؓ کی بے شمار خوبیوں اور قربانیوں کے سمندر میں جب معمولی سا نقص کا پہلو نکل آتا تھا تو ایک منصف مزاج مورخ اس کے ساتھ یہ بھی وضاحت کرتا تھا کہ تاریخی روایات رطب و یابس کا مجموعہ ہوتا ہے جن میں صحیح بھی ہوتے ہیں اور سقیم بھی۔ لیکن آجکل جوش تحقیق میں مست گمراہ زمان کا مشغلہ ہی صحابہ کرام ؓ پر کیچڑ اچھالنا بن گیا ہے۔ کہ لوگ تاریخ کے انہی جھوٹے خوابوں سے صحابہ کرام ؓ کی کچھ لغزشیں ذہن میں رکھ کر کسی عنوان کو ترتیب دیتے ہیں، پھر مختلف جگہوں سے لغزشوں کو چھانٹ چھانٹ کر اپنے مضمون کا حصہ بنا کر دین کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں اور پھر دانستہ طور پر سبائیوں، رافضیوں، خارجیوں اور دیگر دشمنانِ اسلام کی خدمت سرانجام دیتے ہیں جن کا بنیادی مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ دین حق کی اصلی ہیئت کو لگاڑنے کے لئے قرآن و سنت کو پہنچانے والوں کے اعتماد کو زائل کیا جائے جس کے بعد دین اسلام کا کوئی بھروسہ نہیں رہے گا اور اسکے بعد جو بھی اسلام میں تغیر و تبدل کرنا چاہے آسانی سے کر سکیں گے، بلکہ ایسے لوگوں کا اصل واردانستہ یا نادانستہ طور پر سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر ہی ہے جیسا کہ اس کا بیان عنقریب آجائیگا۔

سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی عظمت و شان گھٹانے کا ایک خبیث قدم صحابیت کو داغ دار کرنا ہے! چنانچہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی عظمت و شان گھٹانے کا ایک خبیث قدم صحابیت کو داغ دار کرنا ہے، یہ اس



لئے کہ کسی ماہر استاد کی قابلیت اس کے شاگردوں میں دیکھی جاسکتی ہے اگر کسی ماہر استاد کا کمال اور مہارت ختم کرنا ہے تو پہلے براہ راست اسکی ذات پر حملہ کیا جاتا ہے، لیکن اگر انکی حالت ایسی ہے کہ ان کے فن مہارت پر نکتہ چینی چاند پر تھوکنے کے مترادف ہو تو پھر ایسی صورت میں اس کا مخالف اور دشمن اس کا بظاہر مداح بن کر اس کے شاگردوں پر کچڑا چھالنے کی کوشش کرتا ہے اور ان کے خلاف افواہیں اڑایا کرتا ہے تاکہ شاگردوں کی بدنامی سے خود بخود استاد کی قابلیت داغدار ہو جائے۔

نیز کسی حکیم و ڈاکٹر کی قابلیت کا اندازہ اس کے سپرد کئے ہوئے مریضوں سے لگایا جاتا ہے، اسی طرح پیغمبروں کے کمالات اور اوصاف اور ان کی تربیت کا صحیح رنگ ان کے صحابہ کرام ؓ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منافقوں اور یہود وغیرہ کا اول سے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں یہ رویہ رہا کہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی عظمت و اہمیت گھٹانے کیلئے جو مختلف طریقے اختیار کرتے تھے ان میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ صحابیت کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے لیکن ان خبیثوں کی خباثت کا اثر ایک عرصہ بہت کم رہا۔ اگرچہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے شروع میں ارتداد اور ادائے زکوٰۃ اور سیدنا حضرت عمر فاروق ؓ کی شہادت میں انہی منافقوں اور یہود کا ہاتھ تھا لیکن پھر بھی یہ اثر ایسا نہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے عقائد، اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی سیاسی قوت و یک جہتی پر اثر انداز ہو سکتا۔

### عبداللہ بن سبا یہودی کی سازش اور یہودیوں کی تحریکِ سبائی!

لیکن سیدنا عثمان ذوالنورین ؓ کے مبارک دورِ خلافت میں چونکہ اسلامی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا اور ایران، مصر وغیرہ ممالک اسلامی پرچم و اقتدار کے تحت اطمینان کے ساتھ رہنے لگے تو ایسی حالت میں اگرچہ مسلمانوں کی نئی نسل کی بہت بڑی تعداد ایسی جوان ہو چکی تھی جنہوں نے صحابہ کرام ؓ کی گود میں پرورش پائی تھی اور تقویٰ، پرہیزگاری کے لباس سے آراستہ اور اسلامی شعور و فراست حاصل کر چکے تھے۔ مگر پھر بھی اس سے کہیں بڑھ کر ایک عظیم تعداد ایسے مسلمانوں اور نو مسلموں کی بھی تھی کہ جنہوں نے صحابہ کرام ؓ سے استفادہ نہیں کیا تھا اور وہ صحابہ کرام ؓ کے تربیت یافتہ نہ تھے بلکہ ایران و مصر وغیرہ میں مفتوحہ ممالک میں نو مسلموں کی بہت بڑی تعداد ایسی پائی جاتی تھی جو مسلمان تو ہو گئے مگر نہ وہ اسلامی تعلیمات سے باخبر تھے اور نہ وہ اسلام کی حقانیت و صداقت سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے بلکہ وہ صرف مسلمانوں کے اخلاق و کردار اور سیاسی برتری سے مرعوب ہو کر مسلمان ہو گئے تھے۔ جس کی وجہ سے دشمنانِ اسلام کو بہت بڑی مقدار میں ایسے کچے اور بے شعور مسلمان مل

گئے جنہیں وہ اپنے ناپاک عزائم کے لئے استعمال کر سکتے تھے، اس لئے دشمنوں نے اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کی تحریک اور تیز کردی۔ اس تحریک کے اصل پیشوا یہود تھے اور انہی کے مشوروں کے تحت بعض نے نفاق کے نقاب چہروں پر ڈال کر اپنے آپ کو مسلمان باور کرایا اور مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہوئے۔ منافقوں کی اس جماعت کا سربراہ ایک یہودی عالم عبد اللہ بن سبا تھا۔ جو بہت زیادہ چالاک اور مکار شخص تھا۔ اس کے سینے میں اسلام دشمنی کے انگارے بھڑکتے تھے، اس نے مسلمانوں کی سیاسی قوت اور دینی سرمایہ کو ختم کرنے کے لئے ایک خفیہ جماعت بنائی۔ اس نے زیادہ تر توجہ اس بات پر مرکوز کی کہ کسی نہ کسی طرح صحابیت کو بدنام کیا جائے، چونکہ یہ کام بہت مشکل تھا، اس وقت چمکتے ہوئے ستاروں کو داغدار ثابت کرنا اور ان پر تھوکنے کے نتیجے اپنی تحقیر و رسوائی کے سوا کچھ نہیں تھا، اس لئے اس نے اسی مقصد کے حصول کے لئے ”تقیہ“ یعنی حصول مقصد کی خاطر ہر قسم کے جھوٹ کو روا رکھا اور ان خبیثوں نے بہ یک وقت دو کام شروع کئے۔ ایک یہ کہ وہ صحابہ کرام ؓ کے خلاف غلط افواہیں پھیلاتے تھے اور دوسرا جھوٹی حدیثیں گھڑ کر انہیں رسول اللہ ؐ کی طرف منسوب کرتے تھے۔

بلاشبہ ان شیطانوں نے ابلیس کے اشاروں پر اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لئے جو صورت تجویز کی تھی، اس خبیث کام کے لئے اس سے بہتر تجویز کوئی نہیں تھی۔ کیونکہ اگر یہ تحریک پوری طرح کامیاب ہو جاتی تو اسکے بعد چند نتائج کا وجود لازمی تھا:

(۱)۔ جھوٹی حدیثوں کی بنیاد پر اسلام کے نام پر اسلام کے خلاف ایک ایسا مذہب وجود میں آ جاتا جو اسلام کی بدنامی اور اسلام و پیغمبر اسلام سے تنفر کا سبب بن جاتا۔

۲۔ صحابیت کی بدنامی سے سیدنا محمد رسول اللہ ؐ کی شان تزکیہ و تربیت مشکوک ہو جاتی اور سیدنا محمد ؐ کی عظمت و شان خود بخود گر جاتی۔ اگر کسی ڈاکٹر کے سپرد کئے ہوئے لاکھوں زکام کے مریضوں میں سوائے چار پانچ کے باقی تمام کے تمام زکام کے بجائے ٹی بی میں مبتلا ہو جائیں تو ایک بچہ بھی اس بات کو سمجھ لے گا کہ یہ ڈاکٹر تو کیا ایک عام انسان سے بھی بدتر ہے کیونکہ اس کے علاج اور مریضوں کا اس کے مشوروں پر چلنے سے تمام مریض بڑھ کر پہلے سے بھی خطرناک مرض میں مبتلا ہو گئے۔ باقی رہا لاکھوں میں سے چار پانچ کا شفا یاب ہو جانا، یہ کوئی کمال نہیں۔ لاکھوں انسانوں کو زہریلی چیز کھلائی جائے تو ضروری نہیں کہ سب کے سب مرجائیں بلکہ ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو یہی زہریلی چیز کھا کر کسی اور بیماری سے نجات بھی پا جائیں۔ غرض یہ کہ صحابیت کو بدنام کرنے کے بعد سیدنا محمد رسول اللہ ؐ کی شان و عظمت اور اس کی قدر و قیمت خود بخود گر کر ختم ہو جاتی اور جس

چیز کے بعد نہ صرف اسلام کی طرف غیر مسلموں کی کشش ختم ہو جاتی بلکہ آئندہ نسل کے مسلمان جنہوں نے نہ رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہو اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان و اخلاق کو، ان کے دلوں میں بھی آپ ﷺ کی عظمت و محبت باقی نہ رہے گی جو کہ دین اسلام کی روح ہے اور جس کے بغیر ایک انسان نام نہاد مسلمان اور منافق تو ہو سکتا ہے لیکن مومن حقیقی مسلمان کبھی نہیں۔

(۳)۔ صحابیت کو بدنام کرنے کے بعد قرآن مجید اور سارا کاسارا دین اسلام خود بخود مشکوک اور مشتبہ ہو جاتا۔ کیونکہ قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور آپ ﷺ کے افعال کو نقل کرنے والے یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔ اگر ان پر اعتماد نہ رہا تو صرف یہی نہ ہوگا کہ مسلمان قرآن و حدیث کے مفہوم کو متعین نہ کر سکیں گے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کا یہ بھی لازمی نتیجہ ہوگا کہ مسلمانوں کے ہاتھ نہ قرآن مجید رہے گا اور نہ ارشادات و افعال رسول اللہ ﷺ کا ذخیرہ، کیونکہ یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن مجید و سنت نبوی ﷺ کی زنجیر کی پہلی مضبوط کڑی ہے جو اسکے بعد آنے والی نسلوں کو قرآن و سنت کے ساتھ وابستہ کر دیتی ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ان شیطانوں نے اس بات کو خوب سمجھ لیا تھا کہ اگر صحابیت کی اس عظیم جوہری قوت پر کاری ضرب لگائی جائے تو اس کے بعد نہ اسلام کی تعلیمات و ہدایات رہ جائیں گی اور نہ مسلمانوں کی سیاسی قوت و اقتدار اور یک جہتی۔ اس لئے ان خبیثوں نے سارا زور اسی کام پر لگا دیا۔

پرہیزگاری کے لباس میں جھوٹی حدیثیں بنا کر آپ ﷺ کی طرف منسوب کرنے لگے اور اہل بیت پاک اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جھوٹی محبت کا اظہار کر کے اس کے پس پردہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف طرح طرح کی افواہیں اور جھوٹے پروپیگنڈے اور واقعات کی باطل اور غلط توجیہات شروع کیں اور جب کبھی ضرورت پڑتی تو انہی میں سے بعض شیطانوں کو اس بات کے لئے چنتے کہ وہ دوسرے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق جھوٹی محبت کا اظہار کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت پاک وغیرہ پر وار کر کے جارحیت کو اختیار کر لے تاکہ پوری صحابیت خواہ وہ اہل بیت پاک کی صورت میں ہو یا غیر اہل بیت کی صورت میں سب کے سب ختم ہو جائیں۔

اور اس سبائی فتنے نے اس قدر سخت سازش کی جس کے نتیجے میں خلیفہ راشد حضرت عثمان ذوالنورین، خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد آپ ﷺ کے نواسے جگر گوشہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادتوں کے عظیم واقعات پیش آئے۔

یہود اور عبد اللہ بن سبا کی سازش اور اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم!

حقیقت یہ ہے کہ یہ یہودی اور سبائی سازش اس قدر طاقتور، خبیث اور خطرناک تھی کہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم

شامل حال نہ ہوتا تو ان یہودیوں نے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کو ساول و پولس کے نظریات و عقائد میں تبدیل کر کے عیسائی مذہب کو بالکل ختم کر دیا تھا، اسی طرح یہ لوگ قرآن مجید اور اسلام میں تحریف و تبدل کر کے اسلام کو پوری طرح سبائیت میں تبدیل کر دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ ہی دین اسلام کا محافظ تھا اور اسی نے اس دین کی حفاظت کی ذمہ داری خود لی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے باشعور اور صحابہ کرام ؓ کے تربیت یافتہ مسلمانوں اور پھر ان کے شاگردوں سے وہ کام لیا اور انہوں نے ایسا انتظام کیا کہ دین اسلام کی تعلیمات کو وہ کوئی نقصان نہ پہنچا سکے اور دین اسلام کی تعلیمات کے معاملہ ان خبیثوں کی ہر کوشش و محنت کو بالکل ناکام بنا دیا، البتہ ان خبیثوں کی وجہ سے مسلمانوں کی سیاسی قوت اور یکجہتی کو وقتی طور پر بہت نقصان پہنچا اور دوسرا نقصان یہ ہوا کہ انہوں نے کچھ کچھ مسلمانوں کو صرف سیاسی طور پر نہیں بلکہ مذہبی طور پر بھی جدا کر کے اپنے باطل مذہب سبائیت و خارجیت کا پیروکار بنالیا۔

اگرچہ خلیفہ راشد حضرت علی ؓ نے اپنے دور خلافت میں جس طرح بہت سے سبائی زندیقوں کو جلا کر رکھ کر دیا اسی طرح خارجی شیطانوں کو بھی قتل کر کے سخت سزائیں دیں لیکن کچھ عرصہ بعد اس سبائی فتنے اور خارجی فتنے کے پروردہ لوگوں نے مذہب سبائیت یعنی مذہب شیعہ اور خارجیت کو قائم کیا اور یہی لوگ اس وقت سے آج تک آستنیوں کے سانپ بنے ہوئے ہیں اور جس قدر نقصان اول سے لیکر آج تک ان خبیثوں نے مسلمانوں کو پہنچایا ہے اس کے مقابلے میں دوسرے غیر مسلموں کا پہنچایا ہوا نقصان شاید ایک فیصد بھی نہ ہوگا۔

نیز ان لوگوں کی جھوٹی افواہیں، پروپیگنڈوں اور واقعات کی غلط توجیہات، صحابہ کرام ؓ و اہل بیت پاک پر جو کچھ کیچڑ اچھالا گیا تھا، سبائی فتنے کے شکار مورخین نے ان سب غلط اور صحیح کو جمع کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیا اور اسکے بعد بھی تقریباً جتنی تاریخ لکھی گئی ان سب نے لوگوں کے سننے سنائے افسانے اور ان ہی تاریخوں کی افواہوں اور غیر مستند روایات کو نقل کیا ہے۔

اگرچہ بعض محققین نے تاریخ کے واقعات کو پرکھنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن سبائیوں اور خارجیوں نے تاریخ میں ایسا زہر ملا دیا ہے کہ اس کا اثر دوسری تاریخ میں آیا ہے وہ اسکے زہر کے ازالے کے لئے ناکافی ہے۔ سبائی افواہوں اور انسانوں کا زہر اس قدر خطرناک ہے کہ اگر کوئی ان کی تاریخ کو پوری طرح قبول کر لے تو صحابہ کرام ؓ بلکہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس کی عقیدت و محبت خطرے میں پڑ جائیگی۔

لیکن الحمد للہ، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مسلمانوں کے پاس قرآن وحدیث موجود ہیں۔ ان کے پاس صحیح

بخاری و مسلم وغیرہ کی ایسی کتابیں ہیں جن میں صحابہ کرام ؓ کی مستند تاریخ اور واقعات کی صحیح صورت حال لکھی گئی ہے اس لئے وہ ہر تاریخی روایت کو آنکھ بند کر کے قبول نہیں کرتے اور نہ وہ تاریخ کی کسی ایسی غیر مستند روایت کو ایک لمحہ کے لئے قبول کر سکتے ہیں جو صحابیت کی شان و عظمت کے منافی ہو۔

کیونکہ ایک مسلمان اس بات کو خوب جانتا ہے کہ صحابہ کرام ؓ کا تقویٰ و پرہیزگاری اور ان کی باہمی محبت و شفقت و ترحم تو اتر اور یقین کے ساتھ ثابت ہے ان کی دیانت و امانت اور خلوص اور باہمی ایثار و محبت اس قدر مسلم ہے کہ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ دشمنان اسلام بھی اسے تسلیم کرتے ہیں۔ آخر جن کی تقدس و پاکیزگی اس قدر یقین کے ساتھ ثابت ہو تو اسکے خلاف تاریخی غیر مستند روایات اور وہ روایات جنہیں سبائیوں اور جھوٹوں نے نقل کیا ہے یا ان کذابوں پر اعتماد کر کے کسی نے نقل کیا ہے اس کی بنیاد پر کسی صحابی ؓ کو مجروح کرنا نہ شریعت کی رو سے جائز ہے اور نہ عقل کی رو سے۔

**صحابہ کرام ؓ قرآن و حدیث کی نظر میں اور صحابہ کرام ؓ کے فضائل!**

علماء اسلام نے صحابہ کرام ؓ کے فضائل اور دین کی خاطر قربانیوں اور ان کی سوانح پر مستقل کتابیں لکھی ہیں اور صحابہ کرام ؓ کے فضائل و محاسن ان کی پوری تفصیل تو انہی کتابوں میں مل سکتی ہے لیکن یہاں قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کے کچھ ارشادات بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ جس کے بعد ایک سلیم الطبع اور منصف مزاج پر خود بخود یہ بات کھل جائیگی کہ تاریخ کی بعض روایات قطعاً جھوٹے یا بہت ہی غلط رنگ میں پیش کی گئی ہیں۔

**صحابہ کرام ؓ کے دلوں میں ایمان و تقویٰ تھا اور وہ کفر و معصیت سے سخت بیزار تھے!**

﴿وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّشِدُونَ ۚ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً ط وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝﴾

”لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان محبوب بنادیا اور اس (ایمان) کو تمہارے دلوں میں سجادیا اور کفر و فسق اور (اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی) نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا، یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے ہدایت یافتہ ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے“۔ (الحجرات: آیت ۷-۸)

اور ایک دوسری جگہ صحابہ کرام ؓ کے متعلق فرماتے ہیں:

﴿فَإِنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَىٰ وَكَانُوا أَحَقَّ

بِهَا وَأَهْلُهَا وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٥٨﴾

”پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (ﷺ) اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی اور تقویٰ کے کلمہ کو ان پر لازم کر دیا۔ وہی اس کے زیادہ حقدار بھی تھے اور اسکے اہل بھی اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔“ (الفتح: آیت ۲۶)

مذکورہ بالا آیتوں کا نزول ہجرت کے بعد ہے جبکہ ہزاروں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسلام لائے تھے، جن میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سر فہرست ہیں اور ان آیت سے یہ چند باتیں ثابت ہوئیں:

(۱) اللہ تعالیٰ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایمان محبوب ہے اور وہ مومن و ایماندار لوگ ہیں۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ایمان سے مزین و منقش کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان و تقویٰ کو ان کے ساتھ لازم و ملزوم کیا تھا اور ان کے دلوں میں خوب پیوست کر دیا اور یہی لوگ کلمہ تقویٰ کے زیادہ حقدار ہیں اور یہی لوگ اسکے اہل تھے۔ اس لئے ان کے دل و دماغ اور رگ و پے میں ایمان و تقویٰ ایسا رچ بس گیا تھا کہ ان کے ایک ایک فعل سے ایمان و تقویٰ کی خوشبو پھلتی تھی اور یہی لوگ اس کلمہ تقویٰ اور انعام و احسان کے مستحق بھی تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان و تقویٰ کا صرف ایک واقعہ جو بظاہر تقویٰ کے خلاف معلوم ہوتا ہے! ان کے تقویٰ کی حالت نیکوں میں ہی نہ دیکھو، ان کی خطائیں بھی ایسی تھیں جن سے ان کے تقویٰ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، پھر اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان ہی کیا ہوگی، عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تقویٰ کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔

حضرت ماعز بن مالک اسلمی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، ”یا رسول اللہ (ﷺ) طہر نسی“ یعنی رسول اللہ ﷺ مجھے پاک کر دیجئے (یعنی مجھ سے جو گناہ سرزد ہو گیا ہے اسکی حد جاری کریں تاکہ وہ میرے گناہ کی معافی کا سبب بن جائے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا ”وَيُحْكُ ارْجَعُ فَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ وَتُبْ إِلَيْهِ“ یعنی تجھ پر ہزار افسوس ہے واپس چلا جا اور (اللہ تعالیٰ سے دل و جان کے ساتھ) بخشش مانگ اور توبہ کر، چنانچہ وہ چلے گئے اور تھوڑی دیر دور جا کر (لیکن خوفِ الہی کی چنگاری بھڑک رہی تھی) پھر واپس آگئے اور عرض کیا، یا رسول اللہ



ﷺ مجھے پاک کر دیجئے، بنی کریم ﷺ نے وہی الفاظ فرمائے جو پہلے فرمائے تھے۔ تین مرتبہ اسی طرح ہوا کہ آپ ﷺ ان کو استغفار و توبہ کی ترغیب دے کر واپس فرماتے لیکن اللہ تعالیٰ کے خوف سے لرزان و ترسان وہ پھر واپس آجاتے اور آپ ﷺ سے پاک کرنے کی درخواست کرتے، چوتھی مرتبہ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ میں تجھے کس چیز اور کس وجہ سے پاک کروں؟ انہوں نے عرض کیا (حد جاری کر کے) زنا سے پاک کر دیجئے، رسول اللہ ﷺ نے (ان کی بات سن کر صحابہ کرام ﷺ سے) فرمایا، کیا یہ دیوانہ ہے؟ (کہ خود اپنے گناہ کا افشاء کر کے اپنے آپ کو سنگسار کرانا چاہتا ہے) تو آپ ﷺ کو جواب دیا گیا کہ دیوانہ نہیں ہے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا، کیا اس نے شراب پی لی ہے؟ (یہ سن کر) ایک شخص کھڑے ہوئے اور اس کا منہ سونگھا لیکن ان کے منہ میں شراب کی بو بھی نہیں پائی گئی تو آپ ﷺ نے پھر ماعز ﷺ سے پوچھا کہ کیا (واقعی) تو نے زنا کیا ہے تو انہوں نے عرض کیا کہ ”ہاں“۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کو سنگسار کئے جانے کا حکم دیا، چنانچہ ان کو سنگسار کر دیا گیا، دو تین دن اسی طرح گزر گئے کہ آپ ﷺ کی مجلس مبارک میں ماعز ﷺ کی سنگساری سے متعلق کوئی بات ہوئی، پھر ایک دن رسول اللہ ﷺ نے (مجلس میں) فرمایا:

(اَسْتَغْفِرُ الْمَاعِزَ بْنَ مَالِكٍ لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ أُمَّةٍ لَوْ سَعَتْهُ)

یعنی ماعز بن مالک ﷺ کے لئے بخشش مانگو یتھیا اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اس (کے ثواب) کو پوری امت پر تقسیم کیا جائے تو وہ سب کے لئے کافی ہو جائے۔ (دیکھئے صحیح بخاری و مسلم وغیرہ)

حضرت ماعز ﷺ کا یہ واقعہ تقریباً حدیث کی تمام کتابوں میں پایا جاتا ہے، اس واقعہ سے حدود کے متعلق جو احکام مستنبط ہو سکتے ہیں وہ کتب فقہ میں موجود ہیں لیکن ایک عام صحابی کے ایمان و تقویٰ اور خشیتِ الہی کا اندازہ لگائیے کہ گواہوں کے نہ ہونے کے باوجود خود آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی غلطی کا اقرار کیا، اس میں انکی عزت کا سوال بھی تھا۔ قوم و قبیلہ اور دوستوں کے سامنے رسوائی کا احساس بھی تھا اور جان چلے جانے کا یقین بھی، پھر سیدنا رسول اللہ ﷺ تفصیل پوچھے بغیر ان کو بار بار واپس کرتے ہیں اور استغفار و توبہ کی ترغیب دے کر گویا ان کو یہ بات بتلاتے ہیں کہ ندامت کے آنسو بہاؤ اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کرو۔ اللہ تعالیٰ مہربان ہے آپ کو معاف کرے گا۔ لیکن ماعز سلمیٰ ﷺ کے دل میں ایمان و تقویٰ اور خشیتِ الہی کی آگ کو دیکھ لیجئے کہ نہ عزت کو دیکھا نہ کسی کے طعن کو اور نہ لوگوں کے سامنے رسوائی اور نہ سنگساری کی سخت تکلیف دہ اور رسوا کن موت کی پروا کی۔ وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے لرز اٹھے تھے اور ان کو یہ احساس تھا کہ میں نے خالق و مالک اپنے رب کی



نافرمانی کی ہے ایک ایسا کام کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے اس نے اسے جرم ٹھہرایا ہے، اللہ تعالیٰ راضی ہو اور یہ کہ میں پاک و صاف ہو کر اللہ تعالیٰ سے قیامت میں ملوں۔ اسی چیز نے دوسری تمام چیزوں سے انھیں بے پرواہ کر دیا تھا۔

اسی ایک واقعہ کو دیکھ لیجئے کہ ایک عام صحابی جس نے خاص اور جلیل القدر صحابہ ؓ کی بہ نسبت رسول اللہ ﷺ کی بہت کم صحبت اٹھائی تھی ان کے ایمان وغیرہ کا یہ حال تھا تو جلیل القدر صحابہ ؓ کے ایمانوں کی کیا حالت ہوگی، پھر خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق و حضرت عمر و حضرت عثمان اور حضرت علی ؓ کے ایمان و تقویٰ کی شان کیا ہوگی۔

آپ اس ایک واقعہ سے ان لوگوں کی کج فہمی کا اندازہ بھی لگائیے کہ وہ صحابہ کرام ؓ کی غلطی بیان کر کے اس کو اپنے اوپر قیاس کر لیتے ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ ان کے دل کی خباثت کی وجہ سے نہیں بلکہ غیر ارادی اور اتفاقی طور پر کوئی غلطی صادر ہوگئی تو بھی انہوں نے توبہ ایسے اعتراف سے کی کہ ان کی یہی غلطی مع توبہ کے ایک ایسی نیکی بن گئی کہ ہماری تمام نیکیاں اس پر قربان ہیں اور وہ اس کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس لئے تو بعض علماء فرماتے ہیں کہ لاکھوں صحابہ کرام ؓ میں سے تین، چار یا کم و بیش صحابہ کرام ؓ سے جو غلطیاں صادر ہونی تھیں جن پر حد شرعی جاری ہو سکتی تھی تو یہ انہوں نے قصداً نہیں کی تھیں بلکہ ان سے تکوینی طور پر کرائی گئی تھیں تاکہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں ہی تمام عملی احکامات اور حدود کا پورا نقشہ سامنے آجائے اور اس پر پوری طرح عمل کر کے دنیا کے سامنے بھی پیش کیا جائے (واللہ اعلم)

صحابہ کرام ؓ سے اللہ راضی ہے اور سب کے سب جنتی ہیں!

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا﴾

”یقیناً (اللہ تعالیٰ) مومنوں سے راضی ہوا جبکہ وہ درخت کے نیچے آپ (ﷺ) سے بیعت کر رہے تھے اور جو (صدق، ایمان اور خلوص) ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو اس نے ان (صحابہ ؓ) پر سکینہ نازل فرمایا اور انہیں فتح قریب عنایت کی۔“ (الفتح: آیت ۱۸)

یہ آیت ہجرت کے بعد صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی اس وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تقریباً پندرہ سو صحابہ ؓ موجود تھے۔ جب حضرت عثمان ؓ کی شہادت کی غلط خبر ملی تو ان سب نے حضرت عثمان ؓ کے خون کا

بدلہ لینے کے لئے اپنی جانیں قربان کر نیکی بیعت کی تھی۔ ان بیعت کرنے والوں میں حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ وغیرہ تو شامل ہی تھے بلکہ حضرت عثمانؓ جن کے لئے بیعت کی جاتی وہ بھی اس مبارک بیعت میں شامل تھے اور ان کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ سیدنا رسول اللہؐ نے اپنے دست مبارک کو ان کا ہاتھ قرار دیا، اپنے دوسرے ہاتھ پر رکھ دیا تاکہ وہ بھی اس فضیلت میں شریک ہو سکیں۔

اس آیت کریمہ سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں:

(۱)۔ صحابہ کرامؓ سچے مومن اور پکے ایماندار لوگ تھے۔

(۲)۔ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کے دلوں کو پرکھ لیا اور ان میں جو صدق و اخلاص اور تقویٰ تھا، اللہ تعالیٰ

نے اس کو خوب جان لیا تھا۔

(۳) اور اللہ تعالیٰ ان تمام لوگوں سے راضی ہوا اور ان پر سیکھنا نازل فرمایا اور انھیں فتحِ قریب عنایت فرمائی۔

(۴) وہ فسق و فجور اور کفر اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی سے سخت متنفر اور بیزار تھے۔

(۵) ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل اور احسان ہے۔

تمام صحابہ کرامؓ جنتی اور بخشے بخشائے گئے ہیں اور ان سے اللہ تعالیٰ راضی ہے!

یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس شخص سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے، اسے اپنی رضا کی جگہ یعنی جنت میں داخل فرما دیتا ہے۔ اس لئے رسول اللہؐ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ: ”لَا يَدْخُلُ النَّارَ أَحَدٌ مِمَّنْ بَايَعَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ“، یعنی ایسا ایک بھی شخص جہنم میں نہیں جائیگا جس نے درخت کے نیچے بیعت کی ہے۔ (مسلم و ابوداؤد وغیرہ)

اور ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ پہلے اور آخر میں مسلمان ہونے والے صحابہ کرامؓ سے راضی ہونے کا اعلان

فرما کر اپنی رضا کی جگہ یعنی جنت کا وعدہ فرماتے ہیں:

﴿وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَجَرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ

وَرَضُوا عَنْهُمْ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾

”اور جن مہاجرین اور انصار نے ایمان لانے میں سبقت کی (یعنی سب سے پہلے ایمان لائے) اور جنہوں

نے اخلاص کے ساتھ انکی اتباع (اور پیروی) کی، اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہے اور اس (اللہ تعالیٰ) سے راضی

ہیں اور اس نے ان کے لئے ایسی جنتیں تیار کی ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ (التوبہ: آیت ۱۰۰)

یہ آیت غزوہ تبوک کے سلسلہ آیات میں نازل ہوئیں اور اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ اس آیت کریمہ سے یہ چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:

- (۱)۔ اللہ تعالیٰ مہاجرین اور انصار سے راضی ہو چکا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے خوش ہو گئے۔
- (۲)۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان سب کے لئے اپنی رضا لازم کر دی ہے اور ان کے لئے پہلے سے جنتیں اور باغات تیار کئے ہیں اور وہ ہمیشہ ان میں رہے گئے۔

(۳)۔ اور یہی مہاجرین اور انصار متبوع ہیں بقیہ امت کے لئے مبتدا ہیں۔ جو لوگ خواہ وہ نو عمر صحابہ رضی اللہ عنہم ہوں یا تابعین ہوں یا بعد میں آنے والی بقیہ امت ہوں اگر وہ اعمالِ حسنہ اور دینی امور میں مہاجرین اور انصار کی محبت و اخلاص کے ساتھ پیروی کریں گے تو ان سے بھی اللہ تعالیٰ راضی ہوگا اور انہیں بھی جنت اور عظیم کامیابی مل جائیگی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی باہمی شفقت و محبت اور ان کا کردار اور ان سے جلنے والے کافر لوگوں کا بیان!

﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ ط وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ط ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْئَهُ فَازْرَأَهُ فَاسْتَغَلَظَ فاسْتَوَىٰ عَلَىٰ سَوْقِهِ يُعْجِبُ الزَّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾

”محمد (ﷺ) اللہ (تعالیٰ) کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں (یعنی آپ ﷺ کے صحبت یافتہ ہیں) وہ کافروں کے مقابلے میں تو بہت سخت ہیں اور آپس میں نہایت مہربان۔ تو جب ان کو دیکھے گا تو وہ رکوع و سجود میں مشغول ہونگے اور (یہ سب کچھ دنیاوی مال و جاہ کے لئے نہیں بلکہ صرف اللہ کا فضل اور اس کی خوشنودی طلب کر رہے ہیں اور ان (کے ایمان و بندگی اور صداقت) کی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے نمایاں ہے ان کے یہ اوصاف تو رات میں (بھی) ہیں اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے (زمین سے پہلے) اپنی سوئی نکالی پھر اسکو قوی کیا پھر وہ کھیتی بتدریج بڑھتی ہوئی خوب موٹی ہوئی تو وہ اپنے نال

پرسیدھی کھڑی ہوئی اور اپنی سرسبزی و شادابی سے کسانوں کو خوش کرنے لگی (اور اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کو بھی اسی طرح بتدریج بڑھا کر ان کو مضبوط ترین جماعت بنادیا) تاکہ کافروں کو (ان کے حسد اور غصہ کی آگ میں) جلانے اور اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔“ (سورۃ الفتح: ۲۹)

اس آیت کریمہ نے چند باتوں کو واضح طور پر بیان فرمایا:

- (۱)۔ صحابہ کرامؓ کفار پر تو سخت اور ان کے مقابلہ میں زبردست اور فولادی چٹان ہیں جن کو کوئی لالچ کوئی تعلق اور رشتہ داری وغیرہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔
- (۲)۔ صحابہ کرامؓ کے سینے آپس کے کینہ اور بغض اور حسد سے بالکل پاک و صاف تھے اور وہ آپس میں ایک دوسرے پر شفقت اور مہربانی کرنے والے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنے فضل و کرم سے حقیقی بھائیوں کی طرح محبت اور الفت ڈال دی تھی جیسا کہ سورۃ آل عمران آیت ۱۰۳ میں اسکی تصریح بھی موجود ہے۔
- (۳)۔ ان میں اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اسکی عبادت و پرستش کرنے کا انتہائی شوق و ذوق اور اس سے انتہائی لگاؤ ہے، اس لئے وہ جب بھی فارغ وقت دیکھتے ہیں تو رکوع و سجود عبادت الہی میں مشغول ہو جاتے ہیں۔
- (۴)۔ یہ سب کچھ محنت و مشقت دنیاوی مال و جاہ کی محبت کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ انہیں اللہ تعالیٰ سے انتہائی محبت ہے اور ہر عمل اور ہر حال میں وہ صرف اسی کے فضل اور خوشنودی کے طالب ہیں۔
- (۵)۔ ان کے چہروں اور پیشانی پر عبادت و بندگی، ایمان اور صداقت کے آثار نمایاں ہیں (اور دیکھنے والے بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ یہ چہرے جھوٹے نہیں ہو سکتے)۔

صحابہ کرامؓ کا اللہ تعالیٰ کے لئے محبت اور اسی کی خاطر بغض، صحابہ کرامؓ کا رسول

اللہ ﷺ کے ساتھ محبت کرنے کی وجہ سے ہے!

- (۶)۔ مذکورہ بالا اوصاف سے صحابہ کرامؓ کی عظیم روحانی قوت اور اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے ساتھ والہانہ محبت خود بخود معلوم ہوگئی، کیونکہ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی خاطر صرف اپنے محبوب کاموں اور انسانوں کو چھوڑا ہی نہیں بلکہ ان سے متنفر ہو گئے اور اپنے محبوب رشتوں جیسے بیٹے اور باپ وغیرہ کے صرف اس لئے مخالف ہو گئے اور صرف اسی وجہ سے ان کے مقابلہ میں آگئے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے

مخالف اور کافر ہیں اور اسکے برعکس ان کو ان چیزوں اور ان انسانوں سے محبت ہوگئی جو پہلے ان کو محبوب اور مرغوب نہ تھیں اور صرف اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کو محبوب ہونے کی وجہ سے محبوب ہو گئیں جس سے بخوبی یہ معلوم ہوا کہ ان حضرات کی محبت کا مرکز صرف و صرف اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ تھے اور اللہ تعالیٰ کے لئے ان کی محبت تھی اور اسی کے لئے ان کا بغض تھا بلکہ ان میں اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی محبت اس قدر رچ بس گئی تھی کہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے ماننے اور ایمان رکھنے والے بھی ان کو اس قدر محبوب ہو گئے کہ وہ ان پر شفقت اور رحم کرنے والے بن گئے۔ اور یہی ایمان کامل اور فرط محبت کی نشانی ہے۔

(۷)۔ یہی بات اس آیت کریمہ سے معلوم ہوگئی کہ صحابہ کرام ﷺ کی جماعت اور ان کے اوصاف و کمالات اور ان کے ایمان افروز مناظر ان لوگوں سے نہیں دیکھے جاتے جو اسلام کے دشمن اور اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے دشمن ہیں اور یہی لوگ صحابیت کی دشمنی اور ان کے بغض اور حسد میں مبتلا ہیں اور ان کی وجہ سے حسد کی آگ میں جل بھن رہے ہیں اور صحابہ کرام ﷺ کے ساتھ بغض، اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے ساتھ بغض ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور اسی حقیقت کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

(اللّٰهُ فِيْ اَصْحَابِيْ لَا تَخْذُلُوْهُمْ مِنْ بَعْدِيْ غَرَضًا فَمَنْ اَحَبَّهُمْ فَيَحِبِّيْ اَحَبَّهُمْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَيَبْغِضِيْ اَبْغَضَهُمْ)

”یعنی اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو! میرے صحابہ ﷺ کے معاملے میں میرے بعد ان کو (تقید و تنقیص کا) نشانہ نہ بناؤ کیونکہ جس شخص نے ان سے محبت کی تو میری محبت کی وجہ سے کی اور جس نے ان سے بغض رکھا تو اس نے میرے ساتھ بغض کی وجہ سے بغض رکھا“۔ (الحديث)

اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ جس نے ان کو ایذا پہنچائی، اس نے مجھے ایذا پہنچائی اور جس نے مجھے ایذا پہنچائی اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچائی اور جو اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچانا چاہے تو عنقریب اللہ تعالیٰ اس کو عذاب میں گرفتار کریگا۔ (دیکھئے سنن ترمذی)

صحابیت اور صحابہ میں ازواجِ مطہرات اور رسول اللہ ﷺ کی بیٹیاں اور نواسے بھی شامل ہیں!

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بیٹیاں اور حضرت حسن اور حضرت حسین ﷺ صرف صحابی نہیں بلکہ وہ اہل بیت ہونے کی وجہ سے اہل بیت کے فضائل میں بھی شریک ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی بیویاں مثلاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا وغیرہ صرف صحابیہ نہیں بلکہ وہ تو آپ

ﷺ کے اہل بیت اور اس پر مزید یہ کہ وہ قرآن مجید کی رو سے تمام امت کی روحانی مائیں بھی ہیں اور یہ روحانی رشتہ اس قدر اعلیٰ اور پاکیزہ ہے کہ نسبی ماؤں سے بھی زیادہ مضبوط اور اعلیٰ ہے۔

لہذا جس طرح صحابہ کرام ﷺ کے ساتھ محبت و عقیدت نہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ سے محبت و عقیدت نہیں ہے اسی طرح اس سے بڑھ کر جس شخص کو اہل بیت پاک یعنی ازواج مطہرات اور آپ ﷺ کی اولاد سے محبت و عقیدت نہ ہو تو بھی محبت الہی اور محبت رسول ﷺ کے لاکھ دعوے کرے پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی محبت سے محروم ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کی محبت آجائیگی تو اسکے رسول ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ ﷺ اور اہل بیت ﷺ

اور آپ ﷺ کی محبت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے اور یہی علاج بتایا!

چنانچہ رسول ﷺ کا ارشاد پاک ہے:

(أَحِبُّوَاللَّهَ لِمَايَعِدُكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ وَاحِبُّوْهُ فِي الْحَبِّ وَاللَّهِ وَاحِبُّوْا هَٰؤُلَاءِ بَنِيَّ لِحُبِّي)

”یعنی تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھو اس لئے کہ وہ تمہیں طرح طرح کی نعمتیں عطا فرماتا ہے اور مجھ سے اللہ تعالیٰ

کی محبت کی وجہ سے محبت رکھو اور میری محبت کی وجہ سے اہل بیت سے محبت رکھو“۔ (ترمذی)

اسی حدیث شریف میں جس طرح ایک حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے اسی طرح ایک علاج بھی بتلایا گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ محبت کا مرکز ہے اور ہونا بھی چاہیے، اور جب اللہ تعالیٰ کی محبت انسان کے دل میں رچ بس جائے تو وہ خود بخود اللہ تعالیٰ کی نامرضیات اور ناپسند چیزوں سے متنفر ہو جائیگا اور اسکی محبوب چیزیں اس کو محبوب ہو جائیگی جیسا کہ اس کا بیان پہلے مفصل گزر چکا ہے تو یہاں بتلایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جائیگی تو رسول اللہ ﷺ کی محبت کا پیدا ہونا لازم ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کا پیغام کا واحد ذریعہ ہیں اور جب رسول اللہ ﷺ کی محبت پیدا ہوگی تو پھر اہل بیت کی محبت کا پیدا ہونا لازم ہے۔ اسی طرح محبت چونکہ متعدی ہے اس لئے صحابہ کرام ﷺ کے ساتھ محبت ہونا اور آپ ﷺ کے طریقوں اور سنتوں سے محبت ہونا اور عربی زبان سے محبت ہونا خود بخود لازم ہوتا چلا جائیگا۔ کیونکہ محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوا کرتا ہے اور اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

صحابہ کرام ﷺ سے اللہ تعالیٰ خوش ہیں انکو جنت ملے گی اور انکے ایمان و محبت کو وقتی ماننا اللہ تعالیٰ

سے (العیاذ باللہ) بھول چوک کے صادر ہونے کا ماننا ہے جو کہ عظیم کفر ہے!

۸۔ مذکورہ بالا آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ صحابہ کرام ؓ کے یہ اوصاف عارضی اور وقتی نہ تھے بلکہ یہ اول سے ان کے لئے مقرر اور مقدر تھے اور صحابہ کرام ؓ کے ان اوصاف کا ذکر پہلی آسمانی کتابوں جیسے تورات اور انجیل میں بھی اللہ تعالیٰ نے وحی فرمایا ہے۔ اور یہ بات معلوم ہے کہ پہلے آسمانی کتابوں میں بہت کچھ مٹایا جو چکا ہے اور اہل کتاب کا یہ طرز عمل اپنے کتابوں کے ساتھ پہلے سے ہے اس لئے رسول اللہ ؐ کے عہد مبارک تک بھی تورات و انجیل میں آپ ؐ اور ان کے صحابہ ؓ کے متعلق واضح علامات اور پیش گوئیاں موجود تھیں، پھر اس کے بعد بھی بہت کچھ تحریف و تبدیل ہو گیا ہے۔ لیکن پھر بھی کہیں کہیں سیدنا رسول اللہ ؐ اور آپ ؐ کے صحابہ ؓ کے متعلق اشارے ملتے ہیں جیسا کہ ان کا مفصل بیان حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ کی کتاب ”اظہار الحق“ جس کا ترجمہ اور اسکی مزید تشریح و تحقیق ”بائبل سے قرآن تک“ میں موجود ہے نیز راقم نے بھی ”دہریت سے اسلام تک“ کے دوسرے حصے میں ان کے متعلق ضروری تفصیل نقل کی ہیں وہ تو وہاں پڑھ لیجئے البتہ یہاں صحابہ کرام ؓ سے متعلق آج کے موجودہ محرف انجیل میں سے کچھ نقل کر دیتا ہوں۔

چنانچہ حضرات صحابہ ؓ کی تمثیل دے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک وعظ میں یوں فرماتے ہیں:

”اور اس نے کہا: خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی آدمی زمین میں بیج ڈالے اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے اور وہ بیج اس طرح اگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے، زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے پہلے پتی، پھر بالیں، پھر بالوں میں تیار دانے، پھر جب انانج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے کیونکہ کانٹے کا وقت آپہنچا۔ پھر اس نے کہا کہ ہم خدا کی بادشاہی کو کس سے تشبیہ دیں۔ کس تمثیل میں اسے بیان کریں؟ وہ رائی کے دانے کی مانند ہے کہ جب زمین میں بویا جاتا ہے تو زمین کے سب بیجوں سے چھوٹا ہوتا ہے، مگر جب بودیا گیا تو اگ کر سب ترکاریوں سے بڑا ہو جاتا ہے اور ایسی بڑی ڈالیاں نکالتا ہے کہ ہوا کے پرندے اس کے سایہ میں بسیرا کرتے ہیں۔“

(مرقس: باب ۴: آیت ۲۶ تا ۳۲)

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد ان کے حواری یوحنا کو جو مکاشفہ ہوا اس میں وہ باتیں بیان کی گئی تھیں جو بعد میں واقع ہونے والی تھیں اس مکاشفہ کے چودھویں باب میں یہ ہے:

”پھر میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بڑے سیون کے پہاڑ پر کھڑا ہے اور اس کے ساتھ ایک لاکھ چوالیس ہزار اشخاص ہیں جن کے ماتھے پر ان کا اور ان کے باپ کا نام لکھا ہے اور مجھے آسمان پر سے ایک ایسی آواز سنائی دی جو



زور کے پانی اور بڑی گرج کی سی آواز تھی اور جو آواز میں نے سنی وہ ایسے تھی جیسے مربوط نواز برابطہ جاتے ہیں۔ وہ تخت کے سامنے اور چاروں جانداروں اور بزرگوں کے آگے گویا ایک نیا گیت گارہے تھے اور ان کے ایک لاکھ چوالیس ہزار اشخاص کے سوا جو دنیا میں سے خریدے گئے تھے، کوئی اس گیت کو نہ سیکھ سکا۔ یہ وہ ہیں جو عورتوں کے ساتھ آلودہ نہیں ہوئے بلکہ کنوارے ہیں، یہ وہ ہیں جو برہ کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں جہاں تک وہ جاتا ہے۔ یہ خدا اور برہ کے لئے پہلے پھل ہونے کے واسطے آدمیوں میں سے خریدے گئے ہیں اور ان کے منہ سے کبھی جھوٹ نہ نکلا تھا، وہ بے عیب ہیں۔

پھر میں نے ایک اور فرشتے کو آسمان کے بیچ میں اڑتے دیکھا جس کے پاس زمین کے رہنے والوں کی ہر قوم اور قبیلہ انوراہل زبان اور امت کے سنانے کے لئے ابدی خوشخبری تھی اور اس نے بڑی آواز سے کہا کہ خدا سے ڈرو اور اس کی تعظیم کرو کیونکہ اسکی عدالت کا وقت آپہنچا ہے اور اسی کی عبادت کرو جس نے آسمان اور زمین اور سمندر اور پانی کے چشمے پیدا کئے ہیں۔ (مکاشفہ: باب ۱۴: آیت ۱ تا ۷)

یہ پیشگوئی اور مکاشفہ رسول اللہ ﷺ کے حج کے متعلق ہے کیونکہ ”برہ“ سے مکاشفات کی اصطلاح میں وہ مقدس مخلوق مراد ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے برتر ہوا اور سیون سے عرفات کا میدان اور کوہ عرفات مراد ہے اور آپ ﷺ کے ساتھ حج میں ایک لاکھ چوالیس ہزار صحابہ ﷺ تھے جن کی پیشانی پر اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت، ایمان و صداقت کے اثرات نمایاں تھے جیسا کہ قرآن مجید میں مذکورہ بالا آیت میں صحابہ کرام ﷺ کے متعلق فرماتا ہے ﴿سِمْاهُمْ فِي وَجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ﴾ (انکی علامت ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے نمایاں ہے) اور صحابہ کرام ﷺ ہی تھے جنکی تسبیح و تحمید اور تہلیل سے میدان عرفات اور اسکے مقدس پہاڑ گونج رہے تھے اور آپ ﷺ کی زبان مبارک سے براہ راست خطبہ سننے کا شرف انہی کو حاصل ہے اور یہی صحابہ کرام ﷺ ہی مومنین کی پہلی جماعت تھی جن کو اللہ تعالیٰ نے جنت کے بدلے خرید لیا تھا جیسا کہ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کے سب سے پہلے امتی اور مومنوں کے متعلق ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾

”بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے انکی جان اور مال قیمت پر خرید لئے ہیں کہ ان کے لئے جنت

ہیں۔“ (التوبہ: آیت ۱۱۱)

اور یہی صحابہ کرام ﷺ ہی تو تھے کہ وہ آپ ﷺ کی سچی اتباع کرنے والے تھے اور آپ ﷺ کے قدم بقدم چلنے

والے تھے، وہ صحابہ کرام ؓ کی پاکیزہ و متقی جماعت ہی تو تھی جو سب کے سب عادل اور ثقہ، جھوٹ سے پرہیز کرنے والے تھے، اسی طرح جو جو اوصاف اس مکاشفہ میں لکھے ہیں وہ سارے کے سارے صحابہ کرام ؓ میں بدرجہ اتم موجود تھے اور مکاشفہ میں ”ابدی خوشخبری“ سے مراد قرآن مجید ہی ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا ہے جو سینوں میں محفوظ ہے، نہ چھینا جاسکتا ہے نہ جلایا جاسکتا ہے، نہ چرایا جاسکتا ہے، نہ تحریف کیا جاسکتا ہے اور آج چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اسی طرح محفوظ ہے اور ابد تک محفوظ رہے گا اور اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے ہی اٹھا رکھا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾

”بے شک ہم نے یہ نصیحت اتاری اور یقیناً ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔“ (الحجر: آیت ۹)

اور یہی قرآن ابدی اور دائمی اور عام خوشخبری ہے جو کسی زمانے یا کسی قوم و قبیلہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام عالم انسان و جنات کے لئے قیامت تک رہنمائی کرتی رہے گی اور اس پر عمل کر کے صحابہ کرام ؓ اور اسکے بعد عرصے دراز تک دنیا نے عدالت اور عدل و قسط کو پالیا تھا اسی طرح آج بھی اسی قرآن و بیان پر عمل کر کے دنیا میں عدالت اور عدل و قسط قائم کیا جاسکتا ہے اس کے بغیر نہ دنیا میں امن و عدالت قائم کیا جاسکتا ہے اور نہ کوئی ابدی نجات پاسکتا ہے۔

بہر حال قرآن مجید بھی گواہی دے دیتا ہے کہ صحابہ کرام ؓ کے اوصاف پچھلی کتابوں میں موجود تھے اور اللہ تعالیٰ بھی قرآن مجید میں جا بجا ان کے اوصاف بیان کرتا ہے اور ان سے راضی ہونے کا اعلان فرماتا ہے اور انکو جنت کی خوشخبری دے دیتا ہے۔

تو یہ ساری چیزیں اس بات کی شہادت و گواہی دیتے ہیں کہ صحابہ کرام ؓ کو اسی کامل و مکمل ایمان اور انہی اخلاق حسنہ، باہمی محبت وغیرہ پر موت آگئی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے رضا کا اعلان فرماتا ہے۔

اگر کوئی اس کا انکار کرتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے علم مبارک پر تنقید کرتا ہے کیونکہ راضی ہونے کا اعلان اور جنت کی بشارت یہ عملی احکامات میں سے نہیں کہ وقت اور شخص کے لحاظ سے بدلتا رہے جیسا کہ اول سے لیکر خاتم الانبیاء و مرسلین سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے فرمانے تک بدلتے رہے، بلکہ اس میں تو اخلاق حسنہ اور ایک حال کی گواہی بھی ہے اور مستقبل اور آئندہ کی خوشخبری بھی اور یہ بات تو واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی شخص سے راضی ہو سکتا ہے جو مستقبل میں بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے اور اللہ تعالیٰ تو اسی شخص کو جنت کی خوشخبری دے گا جس کے

متعلق یہ طے ہو کہ وہ ایسی حالت میں دنیا سے جائیگا کہ اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو۔ غرض یہ کہ صحابہ کرام ؓ کے عمل اور دل کے خلوص و تقویٰ کی شہادت اور ان سے راضی ہونے کا اعلان اور ان کے لئے جنت کا تیار کرنا۔ یہ سب چیزیں اخبار سے تعلق رکھتے ہیں اور خبر میں تبدیلی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ العیاذ باللہ اللہ تعالیٰ کو بھول چوک لاحق ہوئی، آئندہ اور مستقبل پر اللہ تعالیٰ کا علم کامل نہیں، اس لئے انجام سے بے خبری کی وجہ سے دلوں کا خلوص وغیرہ اور رضا اور ان کے لئے جنتی ہونے کے اعلان میں ایسی غلطی کی اور پشیمان ہو گئے اور اس نے پہلی اطلاع و خبر سے رجوع کیا ہے جیسا کہ صحابہ کرام ؓ کے دشمن بعض زندیقوں نے صحابہ کرام ؓ کی دشمنی اور اسی طرح دوسرے اغراض کی خاطر یہ خود ساختہ عقیدہ گھڑ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بھول چوک رائے کی غلطی لاحق ہو سکتی ہے اور یہ ایک کفریہ اور احقانہ عقیدہ ہے جس کا نہ صرف قرآن مجید ہی نہیں انکار کرتا بلکہ عقل سلیم بھی اس بات کو ایک لمحہ کے لئے ماننے کو تیار نہیں۔ بلاشبہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ ازل سے ابد تک تمام مخلوقات اور ان کے تمام اعمال اور ان کی تمام چیزوں و احساسات وغیرہ کا تفصیلی علم رکھتا ہے اور اسی نے صحابہ کرام ؓ کے خلوص، ایمان داری، حسن کردار و اخلاق کی گواہی دی اور اسی نے ان سے راضی ہونے کا اعلان فرمایا، جنتوں کی بشارت دی تو یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ ان کی موت اور انجام بھی اسی حالت پر ہی ہوگا۔

صحابہ کرام ؓ کا ایمان، عقائد اور عمل امت کے لئے نمونہ ہیں اور معیارِ حق ہیں!

چونکہ نبی کریم ﷺ کے بعد قیامت تک نہ کسی نئے نبی اور رسول کی ضرورت ہے اور نہ کوئی آئیگا، شاید اس لئے نہیں بلکہ قرآن مجید اور حدیثوں میں صحابہ کرام ؓ کے فضائل و کمالات تفصیل سے آئے ہیں تاکہ آنے والی دنیا کے لئے کتاب اللہ اور سنت الرسول ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام ؓ کو بطور نمونہ چھوڑا جائے اور انہی کی اقتداء و اتباع کا حکم دیا جائے، کیونکہ یہی وہ لوگ تھے جن کے دل و دماغ میں دین اسلام رچ بس گیا تھا وہ شریعتِ مطہرہ میں فنا ہو چکے تھے اور انہوں نے زندگیوں میں دین اسلام کو اسی طرح اتار لیا تھا کہ وہ ایمان و عمل کے اعتبار سے ٹھیک اس معیار پر پہنچ چکے تھے جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت و مقصد تھا، اس لئے وہ دوسرے تمام لوگوں کے لئے نمونہ اور معیارِ حق بن گئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ دنیا والوں کے لئے صحیح ایمان و عمل کے صحیح معیار کو کتاب اللہ اور سنت الرسول ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام ؓ کو سامنے لایا ہے:

﴿فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ فَقَدْ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ﴾

”پس اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو (پھر) تو وہ ہدایت پالیں گے“

اور اگر وہ روگردانی کریں تو (پھر معلوم ہوا کہ) وہ ضد (اور ہٹ دھرمی) میں پڑ گئے۔ (البقرہ: آیت ۱۳۷)

اس آیت کریمہ میں یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام ﷺ کو بھی ہے اور اس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ صحابہ کرام ﷺ کا ایمان ایک مثالی ایمان اور دوسروں کے لئے نمونہ ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی ایمان و عقیدہ مقبول ہے جو رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ ﷺ نے اختیار کیا اور جو عقیدہ و ایمان اس سے ذرہ برابر بھی خلاف ہو، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مقبول نہیں اور ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ مہاجرین و انصار کے بیان کے بعد فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِينَ اتَّبَعُوا بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ﴾

”اور (بقیہ قیامت تک آنے والی امت میں) جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیروکار ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اس (اللہ) سے راضی ہوئے۔“ (التوبہ: آیت ۱۰۰)

اس آیت کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ

جَهَنَّمَ وَسَاءَ ثَمَرٌ مَصِيرًا﴾

”جو شخص سیدھی راہ معلوم کرنے کے بعد (بھی) رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرے اور مومنوں کے راستے کے خلاف دوسرے راستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے (دنیا میں تو) ادھر ہی چلنے دیں گے اور (آخرت میں) ہم اس کو جہنم میں ڈال دیں گے اور وہ بہت (بہی) بری جگہ ہے۔“ (النساء: آیت ۱۱۵)

اجماع امت اور صحابہ کرام ﷺ کے راستہ کی مخالفت!

اس آیت کریمہ میں دو چیزوں کو عظیم جرم قرار دے کر موجب جہنم بتلایا گیا ہے ایک رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور دوسری مومنوں کی راہ سے ہٹ کر دوسری راہ پر چلنا۔ یعنی مسلمانوں کے عقیدے و عمل کا وہ متفقہ راستہ جس پر امت کا اجماع ہو چکا ہے اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں اور امت مسلمہ کا اجماع کبھی بھی ایسے عمل و عقیدے پر نہیں ہو سکتا اور یہ ممکن ہے کہ وہ کتاب و سنت کو خلاف ہو، لہذا اگر اس آیت کریمہ سے ایک طرف اجماع امت کا ثبوت مل سکتا ہے تو دوسری طرف یہ آیت کریمہ کھل کر اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں اور مومنوں کی سب سے پہلی اور اول جماعت صحابہ کرام ﷺ کے جذبات، انکا ایمان اور انکے اعمال اس قدر ٹھیک ٹھیک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کے مطابق ہو چکے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا راستہ اور صحابہ کرام ﷺ کی راہ دونوں

ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں اس لئے آپ ﷺ کی اتباع صحابہ کرام ﷺ کی اتباع و پیروی ہی میں منحصر ہے اور صحابہ کرام ﷺ کے متفقہ راستے کی مخالفت دراصل رسول اللہ ﷺ کی راہ کی مخالفت و نافرمانی ہے اس لئے جس طرح رسول اللہ ﷺ کی راہ کی مخالفت کرنے والا جہنم میں پھینکا جائیگا، اسی طرح صحابہ کرام ﷺ کے اجماعی عقیدے اور ان کے متفقہ راستے و عمل کا انکار کرنے والا اور اسکے مخالف دوسری راہ کو اختیار کرنے والا بھی جہنم کا ایندھن بنے گا۔

### صحابہ کرام ﷺ کا معیارِ حق ہونے کا مطلب!

اس میں کوئی شک نہیں کہ کتاب و سنت ہی اصل معیارِ حق ہیں، اجتماعی و انفرادی طور پر عمل کو ان پر جانچا جائیگا۔ لیکن چونکہ قرآن و حدیث ضوابطِ حیات ہیں جو عملاً ناطق نہیں۔ سنت کا جو حصہ عملاً ناطق ہے اس کے ناقل اور راوی بھی صحابہ کرام ﷺ ہی ہیں، عملی زندگی میں قرآن و سنت تک رسائی اور انکی صحیح اتباع صحابہ کرام ﷺ کے واسطے سے ہی ہوئی۔ لہذا صحابہ کرام ﷺ کے عقائد اور اعمال ذریعہ اور معیار ہیں کیونکہ صحابہ کرام ﷺ کے ایمان و عقائد اور انکے اعمال اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی شہادت و گواہی سے کتاب اللہ اور سنت نبی کریم ﷺ کے عین مطابق ہیں، لہذا جو شخص صحابہ کرام ﷺ کے ایمان و عمل کو نمونہ بنائے بغیر یا انکی مخالفت براہِ راست قرآن و سنت پر اپنے آپ کو جانچے گا تو غالباً وہ ٹھوکر کھا کر گمراہ ہی ہو جاتا ہے جیسا کہ گمراہ فرقوں کی مثالیں سامنے ہیں اور اس بات کی آپ ﷺ نے ایک پیشگوئی کی صورت میں فرمائی، چنانچہ حضرت عبداللہ بن العاص ﷺ سے روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ بلاشبہ بنی اسرائیل کے بہتر فرقے تھے اور عنقریب میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائیگی جن میں سے ایک گروہ کے سوا باقی سب کے سب جہنم میں جائینگے، صحابہ کرام ﷺ نے عرض کیا، یا رسول اللہ وہ کونسی جماعت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”ما انا علیہ و اصحابی“، یعنی جس راستے پر میں اور میرے صحابہ ﷺ قائم ہیں۔ (ترمذی و مشکوٰۃ) اور یہی نہیں بلکہ صحابہ کرام ﷺ میں سے تو خلفائے راشدین حضرت ابوبکر و حضرت عمر و حضرت عثمان و حضرت علی ﷺ کی توشان ہی اور ہے۔

### خلفائے راشدین کے طریقوں کی اتباع کا حکم!

چنانچہ انکے متعلق تو خصوصی طور پر سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ:

(عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ تَمَسَّكُوا بِهَا وَاعْضُوا عَلَيْهَا بِاللَّوْجِ اجِدُوا يَأْكُمُ وَمُحَدَّثَاتِ الْأُمُورِ فَإِنَّ كُلَّ مُحَدَّثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ)

”اے لوگو! تم پر لازم ہے کہ میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین (ابوبکر و عمر و عثمان و علیؓ) کی سنت کو اختیار کرو، ان کو خوب تھام لو اور ان کو دانتوں سے مضبوط پکڑ لو۔ خبردار (دین میں)! نئی نئی باتوں سے بچنا کیونکہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں (لے جانے والی) ہے۔ (ابوداؤد و ترمذی و نسائی، ابن ماجہ، کذا فی مشکوٰۃ)

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی سنت و طریقہ کی طرح شریعتِ مطہرہ اور رسول اللہ ﷺ کی محبت میں فنا و ہدایت یافتہ لوگوں کے طریقوں کو بھی واجب الاتباع قرار دیا۔

صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد تابعین اور ان کے بعد تبع تابعین امتِ مسلمہ کے بہترین لوگ ہیں!

حضرت عمران حصینؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(خَيْرُ أُمَّتِي قُرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ)

”میری امت کے بہترین لوگ میرے دور کے لوگ (یعنی صحابہ کرامؓ) ہیں پھر وہ جو ان سے متصل (یعنی

تابعی) ہیں اور پھر وہ جو ان سے متصل (یعنی تبع تابعین) ہیں۔“ (صحیح بخاری و صحیح مسلم و مشکوٰۃ)

اور حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(أَكْرَمُ أَصْحَابِي فَأَنْهُمْ خِيَارُكُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ)

”میرے اصحابؓ کی تکریم و تعظیم کرو کیونکہ وہ تمہارے بہترین لوگ (اور بزرگ ترین لوگ) ہیں پھر وہ

لوگ جو ان کے متصل (یعنی تابعین) ہیں اور پھر وہ لوگ جو ان کے متصل (یعنی تبع تابعین) ہیں۔“ (نسائی،

مشکوٰۃ)

مذکورہ بالا حدیثوں اور اسی طرح کی اور احادیث سے نہ صرف صحابہ کرامؓ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے بلکہ

جماعتِ صحابہؓ کے بعد طبقہ تابعین جو صحابہ کرامؓ کے تربیت یافتہ ہیں اور پھر ان کے بعد تبع تابعین جو تابعین

کے تربیت یافتہ ہیں، ان کی فضیلت بھی معلوم ہوگئی اور یہی تین طبقے ہیں جو بتدریج امت کے سب سے بہترین

لوگ ہیں اور ملتِ اسلامیہ کے سردار اور مقتداء ہیں اور یہ تینوں طبقے انتہائی محترم و مکرم ہیں اور باقی امت پر ان کی

تکریم و تعظیم لازم ہے اور پھر ان تینوں میں پہلے طبقے یعنی صحابہ کرامؓ کی عظمت و منزلت کی نشان دہی اور ہے۔

اس مقدس گروہ کا مقام ہی ایسا ہے کہ ان کے بعد اگر کوئی شخص علم و فضل، ذہانت و ذکاوت، تقویٰ و پرہیزگاری اور

عزیمت و استقامت کے کتنے ہی بلند سے بلند درجہ پر پہنچ جائے مگر وہ رسول اللہ ﷺ کے صحابیؓ کے برابر نہیں ہو

سکتا۔ اس کو کبھی بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی صحابی پر تنقید کرے یا اس کے عمل و کردار پر نکتہ چینی کرے، اگر کوئی شخص اس طرح کی جرات کرتا ہے تو اپنے ایمان کو خطرے میں ڈال دیتا ہے اور ایسے باکردار حضرات کے متعلق سب و شتم اور اسی طرح کوئی اور بکواس کرنا تو دین اسلام کے واسطے کی انتہائی ناقدری ہے اور بغضِ صحابہ ﷺ کے پردے میں دین اسلام اور پیغمبر اسلام پر تیر چلانا ہے۔

**صحابہ کرام ﷺ کو برا کہنے والا ملعون ہے!**

ایسے منافقین کی مذمت اور انکے کفر کی وضاحت رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات میں فرمائی ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

(إِذَا رَأَيْتُمُ الَّذِينَ يَسُبُّونَ أَصْحَابِي فَقُولُوا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى شَرِّكُمْ) (ترمذی و مشکوٰۃ)

”جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہ (ﷺ) کو برا کہتے ہیں تو ان سے کہو کہ تمہارے شر (اور بری حرکت پر) اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔“ اور حضرت عویم بن ساعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے (رسالت اور پیغمبری کے لئے) چنا ہے اور میرے لئے میرے اصحاب چنے ہیں پھر انہی میں سے میرے لئے وزیر، داماد، اور میرے معاون بنائے ہیں (آگے آپ ﷺ فرماتے ہیں):

(فَمَنْ سَبَّهُمْ فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ لَا يَقْبَلُ اللَّهُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صَرْفًا وَلَا عَدْلًا)

”پس جو ان کو برا بھلا کہتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے نہ فرض قبول کرے گا اور نہ نفل۔“ (متدرک حاکم طبرانی)

**صحابیت کا ناشکر اور صحابہ کرام ﷺ کو برا کہنے والا مسلمان نہیں ہو سکتا!**

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے تو

آپ ﷺ نے فرمایا:

(يَا عَلِيُّ سَيَكُونُ فِي أُمَّتِي قَوْمٌ يَنْتَحِلُونَ حُبَّ أَهْلِ الْبَيْتِ لَهُمْ نِزْيُ الرَّاغِضَةِ قَاتِلُوهُمْ فَإِنَّهُمْ

مُشْرِكُونَ)

”اے علی رضی اللہ عنہ! میری امت میں ایک گروہ ہوگا جو اہل بیت سے محبت کا دعویٰ کریگا (صحابہ کرام ﷺ پر) طعن



و تشنیع ان کی علامت ہوگی، ان سے جنگ کرنا کیونکہ وہ (نام نہاد مسلمان در پردہ یہود اور) مشرک ہونگے۔“ (رواہ الطبرانی: واسنادہ حسن، مجمع الزوائد: ج ۱۰ ص ۲۱)

اسی طرح بہت سی احادیث میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام ؓ کے صرف فضائل ہی نہیں بیان ہوئے بلکہ ان پر تنقید اور ان پر سب و شتم سے منع فرمایا گیا ہے اور اس حرکت اور جرات کو موجب لعنت فرمایا ہے اور آئندہ قیامت تک آنے والی تمام دنیا کو اس بات سے آگاہ کر دیا ہے کہ جو صحابہ کرام ؓ پر طعن و تشنیع کرتا ہے وہ کبھی دین اسلام اور پیغمبر اسلام کا پیر و کار نہیں ہو سکتا، کیونکہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات پر چلنا اس وقت ممکن ہے جب کہ پیغمبر اسلام کے تربیت یافتہ افراد اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات کے قول و عمل سے نقل کرنے والے طبقہ صحابہ کرام ؓ کے ساتھ محبت و تعلق ہو۔ ان کی تمام باتوں پر اعتماد ہو اور ان کی تعظیم و تکریم ہو، ورنہ صحابہ کرام ؓ خصوصاً خلفائے راشدین و اکابر صحابہ کے ساتھ بغض رکھنے والے کا نہ قرآن مجید پر ایمان ہو سکتا ہے اور نہ پیغمبر و قرآن و اسلام پر۔

صحابہ کرام ؓ کا تقدس و تقویٰ وغیرہ یقین سے ثابت یقینی ہے جس کے مقابلے میں تاریخ جھوٹی روایات کی کوئی حیثیت نہیں!

مذکورہ بالا بحث میں بطور نمونہ چند قرآنی آیات کو اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کو پیش کیا گیا ہے ورنہ قرآن و حدیث میں صحابیت تمام صحابہ کرام ؓ اور اس کے علاوہ خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذوالنورین، حضرت علی، حضرت امیر معاویہ، اہل بیت پاک حضرت حسن و حضرت حسین ؓ و حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا وغیرہ اور دوسرے خاص خاص صحابہ کرام ؓ کے فضائل و مناقب کثرت سے موجود ہیں۔ ان تمام سے صحابہ کرام ؓ کے متعلق انکی پوری زندگی سے یہ یقینی طور سے ثابت ہے کہ وہ انتہائی ایماندار، امانت دار، دیانت دار تھے، سچائی و راستی کے پیکر تھے، وہ سخی، شجاع اور پاکیزہ کردار تھے، نیز انکی باہمی الفت و محبت اور ایک دوسرے پر مہربانی، ایثار و ہمدردی بے مثال ہے، ان کے دل و دماغ اور رگ و پے میں ایمان و تقویٰ، محبت حق اس قدر رچ بس گئے تھے کہ وہ کفر، فسق، نافرمانی، جھوٹ وغیرہ تمام گناہوں سے نہ صرف بچنے کی کوشش کرتے تھے بلکہ ایسی چیزوں سے طبعاً متنفر تھے۔

غرض وہ تمام اچھے اوصاف کے پیکر تھے جو ایک مخلوق کے لئے ممکن ہو سکتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے فکر و عمل کا عکس انہی میں دکھائی دیتا ہے، اس لئے یہ لوگ بحیثیت جماعت کے پوری دنیا کے لئے آپ ﷺ کے بعد عمدہ نمونہ

بن کر رہ گئے تھے اور یقیناً قیامت تک آنے والی نسلوں کو انہی کی اجتماعی فکر و عمل کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے اور اسی میں امت کی نجات ہے۔

اب آپ خود ہی سوچئے کہ صحابہ کرام ؓ کے وہ اوصاف جو یقین کے ساتھ ثابت ہیں اور اسکی گواہی خالق کائنات علام الغیوب اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ دے رہے ہیں تو اب اگر اسکے مقابلے میں کوئی تاریخی روایت اور تاریخی واقعہ ایسا دیکھنے میں آئے جس سے صحابہ کرام ؓ کی سیرت داغدار ہوتی ہے، تو وہ شریعت کی رو سے تو قطعاً مردود ہے، عقل کی رو سے بھی ناقابل قبول ہے کیونکہ عقل بھی اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں کہ ایک یقینی چیز کے ہوتے ہوئے اس کے مقابلے میں مشکوک یا جھوٹی چیز کو مانا جائے۔

مثلاً اگر کسی شخص کے متعلق کوئی ایسی خبر دے جو اسکی ظاہری حالت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی تو ایسی صورت میں عقل انسانی اس وقت تک اس خبر کو قبول نہیں کرتی جب تک اس کے متعلق واضح ثبوت مہیا نہیں ہو جاتا، مثلاً اگر کسی شفیق اور مہربان کے متعلق یہ سنے کہ انہوں نے اپنے اکلوتے اور معصوم بیٹے کو قتل کیا ہے یا کسی مسلمان صالح اور پاکیزہ، حیا دار شخص کے متعلق یہ بات سنے میں آئے کہ وہ کھلے عام شراب پی رہا تھا تو کوئی سمجھ دار شخص ایسی خبروں کو بغیر پکے ثبوت کے قبول نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات تو سچی خبر کی تحقیق و ثبوت کے بعد بھی اس کی تاویل و توجیہ کو تلاش کرتے ہیں مثلاً یہ کہ شاید اس کے بچے کا قتل خطا کی وجہ سے واقع ہوا ہو یا اسی طرح کوئی وجہ اس کے لئے تلاش کرتے ہیں۔

جب یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ جس شخص کی مجموعی زندگی اچھی اور پاکیزہ ہے تو اس پر اگر کسی گناہ کا الزام لگ جاتا ہے تو وہ صرف شریعت کی رو سے نہیں بلکہ عقل و فطرت کی رو سے بھی اس وقت تسلیم نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ وہ مضبوط اور قطعی دلائل سے ثابت نہ ہو تو صحابہ کرام ؓ کا مقام اتنا بلند ہے کہ ان حضرات کے تقدس و عدالت و تقویٰ وغیرہ کی گواہی اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ نے دیدی ہے اور وہ قرآن و سنت متواترہ اور احادیث، صحیحہ سے ثابت ہے اور ان کے متعلق تو امت کا اجماع ہے کہ صحابہ کرام ؓ انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے زیادہ مقدس اور پاکیزہ ہستیاں ہیں اور یقینی دلائل کے سامنے تاریخ کی جھوٹی بے سند اور ضعیف روایتوں کی کوئی حیثیت نہیں اس لئے صحابہ کرام ؓ کا تو مقام یہ ہے کہ ان کے متعلق کوئی ایسی بات نہ مانی جائے جو ان کے اوصاف کے منافی ہو جنہیں قرآن و سنت دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور ایسی بہتان تراشیوں اور دشمنوں کی ملع سازی کے زہر آلود واقعات کو سن کر اللہ تعالیٰ کی اس نصیحت کو خوب یاد رکھو:

﴿لَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ مَا يَكُونُ لَنَا أَنْ نَتَكَلَّمَ بِهَذَا سُبْحَنَكَ هَذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ﴾

”جب تم نے یہ (افواہ) سنی تو تم کیوں نہ بول اٹھے کہ ہمارے لئے ایسی بات زبان سے نکالنا بھی مناسب نہیں (اے اللہ!) تو پاک ہے، یہ تو ایک عظیم بہتان ہے۔ اللہ تعالیٰ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ پھر کبھی ایسا نہ کرنا اگر تم مومن ہو“۔ (النور: آیت ۱۷)

یہاں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک اصول سمجھا دیا ہے کہ جس شخص کی عفت و پاکیزگی مسلم ہو تو ایسے شخص کے متعلق اگر کوئی اپنے بغض و عناد کا اظہار کرتے ہوئے کوئی تہمت تراش لے تو ایک مسلمان کو چاہیے کہ وہ اس قسم کی افواہوں کی بلاتامل تردید کرے اور ان کو نہ زبان پر لائے اور نہ کس طور پر اس پر کان دھرے۔

صحابہ کرام ؓ کے بارے میں عقیدہ!

نبی کریم ؐ کے بعد امت کا مقدس ترین طبقہ آپ ؐ کے بلا واسطہ تربیت یافتہ اور فیض یافتہ صحابہ کرام ؓ ہیں، یہی وہ حضرات ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کی بالکل اسی طرح اطاعت کی جس طرح سیدنا رسول اللہ ؐ نے بتلایا تھا اور عمل کر کے دکھلایا تھا۔ اور یہی حضرات آپ ؐ کی رسالت اور دین اسلام کے اولین مبلغ اور آپ ؐ کے بعد آپ ؐ کے نمائندے اور قرآن و سنت کا صحیح عملی نمونہ تھے وہ سب کے سب پرہیزگار، پاک دل، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور مخلوق الہی خصوصاً انسانیت کے ہمدرد، محسن تھے اور سب کے سب عدول یعنی سچے، امین اور معتبر تھے، وہ سب کے سب سیدھے راستے پر چلنے والے اور دوسروں کو سیدھی راہ پر چلانے والے تھے، اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور وہ اللہ تعالیٰ سے راضی اور خوش تھے۔ اور ان سب کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ کیا ہے۔

تمام صحابی ؓ وصف صحابیت میں برابر ہیں!

تمام صحابی ؓ وصف صحابیت میں برابر ہیں، مگر ان میں بعض لوگوں کے خصوصی فضائل ہیں اور انکی جماعت بھی ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک بہت سے مدارج میں تقسیم ہے جیسا کہ ہر جماعت کے افراد میں یہ تقسیم جاری ہوتی ہے خواہ وہ فرشتوں کی جماعت ہو یا علماء و صلحاء کی جماعت ہو یا اہل حق و ہنر کا گروہ ہو لیکن فرق مراتب اور فرق فضائل و مدارج، مدارج کے باوجود تمام کے تمام محترم اور قابل قدر ہیں، کیونکہ نفس صحابیت میں تو سب برابر ہیں اگرچہ کوئی زیادہ محترم اور کوئی اس سے کم اور صحابہ کرام ؓ کی جماعت انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے زیادہ مقدس اور اعلیٰ صفات اور کمالات اور غیر معمولی امتیازات رکھنے والی جماعت ہے اور اس جماعت کے ادنیٰ صحابی ؓ کا مقام اس قدر بلند ہے

کہ انکے مقام اور درجہ کو پوری امت کے اولیاء بھی نہیں پہنچ سکتے۔

صحابہ کرام ؓ کی مقدس جماعت اگرچہ انتہائی پرہیزگار تھی لیکن وہ انبیاء علیہم السلام کی طرح معصوم نہ تھی۔ اس لئے عام صحابہ ؓ میں سے بعض سے جو لغزش و خطاء کا صدور ہوا وہ اس کے دل کی کسی برائی یا خباثت کی وجہ سے ہرگز نہ تھا اور ان کے اس گناہ کی وجہ سے ان پر کوئی الزام نہیں لگایا جاسکتا اور نہ ان کے تقویٰ پر کوئی داغ اور دھبہ آسکتا ہے کیونکہ اتفاقی لغزش و خطاء ان کے دل کی حالت اور انکی بزرگی پر کوئی اثر نہ کر سکا بلکہ ان کی اس لغزش و خطاء ہی نے دنیا پر ان کے باطنی حسن، خوف و خشیت الہی اور انابت الی اللہ کو ظاہر کیا کہ انہوں نے جان و آبرو سب کے سب کو قربان کر کے ایسی عظیم توبہ کیا کہ اگر اسے پوری امت پر تقسیم کیا جائے تو سب کی مغفرت کے لئے کافی ہو جائے۔

اس لئے علماء امت انہیں غیر معصوم کہنے کے باوجود دین کے بارے میں ان کو نکتہ چینی اور تنقید سے بالاتر سمجھتے ہیں اور بعد کے لوگوں کو یہ حق نہیں کہ ان کو تنقید کا نشانہ بنائیں۔

### صحابہ کرام ؓ کے باہمی مشاجرات کے متعلق!

یہ بھی یاد رکھیں کہ اگر ان کے درمیان آپس میں کہیں مقابلہ اور جنگ کی صورت بھی پیش آئی تو وہ بھی کوئی حق و باطل یا طاعت و معصیت کی جنگ نہ تھی بلکہ خطاء اور صواب کا مقابلہ تھا اور یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ اختلافی مسائل میں اگر مجتہد سے خوب کوشش کے باوجود غلطی ہو بھی جائے تو اس پر بھی ایک ثواب اور اجر ملتا ہے، سزا نہیں ملتی۔ لہذا ان کے باہمی تنازعات اور معاملات جو کہ نیک نیتی اور پاک نفسی پر مبنی تھے، ان کے بارے میں کسی کے متعلق نہ بدگمانی جائز ہے اور نہ بدزبانی اور بے ادبی۔ انکے باہمی تنازعات میں کون حق پر تھا اور کس سے کیا غلطی سرزد ہوئی تو ایسے سوالات کے متعلق صاف راہ یہ ہے کہ ان کے باہمی مشاجرات اور تنازعات پر کوئی کلام نہ کیا جائے اور انکے تمام معاملات اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہیں، ہم سے ان کے متعلق کوئی پوچھ نہ ہوگی اور ایسے سوالات کے بارے میں اللہ تعالیٰ اس نصیحت کو یاد رکھیں:

﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾

”یہ ایک امت تھی جو گزر گئی ان کے اعمال ان کے لئے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لئے ہیں اور تم سے

ان کے کئے ہوئے اعمال کی پوچھ نہ ہوگی“۔ (البقرہ: آیت ۱۳۵)

سچے اور جنتی گروہ اور فرقے و جماعت کی پہچان!

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ کرام ؓ کی جماعت پر ہی ان کے بعد فرقوں، گروہوں اور لوگوں کو پرکھا جائیگا اور انکی برکت ہی سے حق و باطل کا فرق کیا جاسکتا ہے۔ اب اگر کسی فرد یا فرقہ و جماعت کی حقانیت معلوم کرنی ہے تو اسکے متعلق دو چیزوں کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔

۱۔ کہ کیا وہ جماعت و گروہ یا وہ شخص صحابہ کرام ؓ سے بدظن اور انکے متعلق بدگمان تو نہیں ہے؟ کیا صحابہ کرام ؓ کی محبت و عظمت ان کے دل میں ہے یا نہیں؟

۲۔ پھر اگر کوئی شخص یا جماعت و فرقہ صحابہ کرام ؓ سے محبت اور انکی تعظیم و تکریم کا دعویدار ہے تو اس کے بعد اس کے عقائد میں تحقیق کی جائیگی کہ آیا ان کے عقائد بھی صحابہ ؓ کی طرح ہیں کہ نہیں؟

اگر اس فرد یا گروہ کے عقائد صحابہ کرام ؓ کے اجماعی عقائد و اصولوں سے متصادم ہیں تو باوجود لاکھ دعویٰ محبت صحابہ ؓ کے یہ لوگ بھی گمراہی اور باطل پر ہیں، نہ ان میں اخلاص ہوگا اور نہ سچی محبت، کیونکہ صحابہ کرام ؓ کی جماعت بحیثیت مجموعی سیدنا رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ کی جیتی جاگتی تصویر اور آپ ﷺ کی عمدہ نمونہ کی پوری تشریح ہے۔ پس جس جماعت، گروہ یا فرد کے دل میں صحابہ کرام ؓ کا احترام و تعظیم ہو اور وہ صحابہ کرام ؓ کا مداح ہو اور اس کا عقیدہ صحابہ کرام ؓ کے عقیدے کے مطابق ہو تو وہی شخص و فرقہ حق پر ہے۔

### صحابہ کرام ؓ کے متعلق آخری بات!

خلاصہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد افضل ترین لوگ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے صحابہ ؓ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی نیابت کے لئے چن لیا تھا۔ اس مقدس گروہ کا ہر فرد اپنی ذات اور شخصیت کے اعتبار سے متقی و پرہیزگار، صالح و ایماندار اور وفادار ہے اور ہر صحابی ؓ محترم اور بقیہ امت پر اس کا احترام واجب ہے اور ان سے محبت اور عقیدت ایمان کی علامت ہے اور ان سے بغض اور کینہ و دشمنی اللہ تعالیٰ و رسول اللہ ﷺ اور دین اسلام سے دشمنی ہے۔

نیز بحیثیت مجموعی قیامت تک آنے والے انسانوں کی نجات بھی اس جماعت کی اتباع پر منحصر ہے اور من حیث المجموعہ پوری امت کے لئے معیار حق اور نبی کریم ﷺ کے قائم مقام ہیں، اس لئے جس طرح آپ ﷺ کی رسالت و نبوت کا منکر دائرہ اسلام سے خارج ہے، اسی طرح صحابہ کرام ؓ کے اجماع کا منکر بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

صحابہ کرام ؓ کی رسول اللہ ﷺ سے محبت!

صحابہ کرام ؓ کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو شدید ترین محبت تھی وہ تو شاید کسی بھی پڑھے لکھے مسلمان پر پوشیدہ نہیں، لیکن پھر بھی یہاں مختصر طور پر ان کی محبت کے بطور نمونہ چند واقعات پیش کرتے ہیں:

(۱)۔ حضرت علی ؓ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو نبی کریم ﷺ سے کتنی محبت ہے تو انہوں نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کی قسم! حضور ﷺ ہم لوگوں کے نزدیک اپنے مالوں سے، اپنی اولادوں سے، اپنی ماؤں سے اور سخت پیاس کی حالت میں ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب تھے۔ (اشفاء)

(۲)۔ حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ قیامت کب آئیگی تو آپ ﷺ نے فرمایا ”تم نے قیامت کے لئے کیا تیار کر رکھا ہے؟“ تو انہوں نے عرض کیا کہ میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت رکھتا ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”تم اس کے ساتھ ہو گے جس سے تم محبت رکھتے ہو۔“

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ اسلام کے بعد وہ کسی چیز پر اتنے خوش نہیں ہوئے جتنا کہ آپ ﷺ کے اس ارشاد سے خوش ہوئے (کیونکہ صحابہ کرام ؓ کو آپ ﷺ سے والہانہ محبت تھی) اس کے بعد حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور ابوبکر و عمر ؓ سے محبت رکھتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میں اپنی اس محبت کی وجہ سے ان کیساتھ ہونگا، اگرچہ میں نے ان حضرات جیسے (بہت زیادہ اور عمدہ) اعمال نہیں کئے ہیں۔ (صحیح بخاری و مسلم)

(۳)۔ حضرت انس ؓ نے ایک موقع پر آپ ﷺ کو دیکھا کہ وہ کدو کے ٹکڑوں کو تلاش کر کے نوش فرما رہے ہیں تو ان کو اسی دن سے آپ ﷺ کی محبت کی وجہ سے کدو بھی اس قدر محبوب ہو گیا کہ اس دن کے بعد سالن میں اگر کدو ڈال سکتے تھے تو ڈال لیتے تھے۔ (دیکھئے بخاری و مسلم وغیرہ)

(۴)۔ حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ حجام آپ ﷺ کا سر مونڈ رہا ہے، صحابہ کرام ؓ آپ ﷺ کو گھیرے ہوئے بیٹھے ہیں اور مقصد صرف یہ ہے کہ آپ ﷺ کا بال مبارک کسی نہ کسی کے ہاتھ پڑ جائے۔ (دیکھئے مسلم)

(۵)۔ حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبید اللہ ؓ سے عرض کیا کہ ہمارے پاس نبی کریم ﷺ کے کچھ بال مبارک ہیں ہم نے انہیں حضرت انس ؓ سے یا (یہ کہا کہ) حضرت انس ؓ کے گھر والوں کے پاس سے حاصل کیا ہے تو حضرت عبید اللہ ؓ نے فرمایا کہ اگر ان بالوں میں سے ایک بال مجھے بھی مل جائے تو ساری دنیا



سے اور جو اس دنیا میں ہے اس سے وہ مجھ کو زیادہ پیارا ہوگا۔ (صحیح بخاری، کتاب الوضو)

(۶)۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے مولیٰ یسان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس راستے میں دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک طشت ہے اور یہ جو کچھ اس میں تھا، اسے پی رہے ہیں جب حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ وہ کام کر آئے؟ تو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ جی ہاں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا کام؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے انکو اپنے پچھنے کو خون کا غسالہ دیا تھا تا کہ یہ بہادریں۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ قسم اس ذات کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا، اسے تو یہ پی گئے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا تم اسے پی گئے؟ تو انہوں نے کہا کہ جی ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیوں؟ تو انہوں نے عرض کیا مجھے یہ بات پسند آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خون مبارک میرے پیٹ میں ہو۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا تجھے لوگوں سے نقصان پہنچے گا اور لوگوں کو تجھ سے نقصان پہنچے گا یعنی شہید کئے جاؤ گے اور تم سے جنگ کرنے والا مبتلائے عذاب ہوگا، تمہیں جہنم کی آگ نہ پہنچے گی مگر وعدہ الہی ﴿إِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا﴾ کے پورا کرنے کے لئے (جس کے ایفاء کے لئے پل صراط پر سے گزرنا ہوگا)۔ (کنز العمال: ج ۴، ص ۵۶)

(۷)۔ عبداللہ بن عبداللہ بن ابی نے اپنے والد (جو مشہور منافق تھا) کے بارے میں جب یہ سنا کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ لوٹے تو معزز، ذلیل کو نکال دے گا تو وہ مدینہ کے دروازے پر باپ کے مقابلہ پر تلوار لیکر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ کیا تم ہی نے ایسا کہا تھا؟ اللہ کی قسم! ابھی معلوم ہو جائیگا کہ عزت تمہارے لئے ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے۔ تم مدینہ کے سائے میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کی بغیر نہیں جاسکتے، چنانچہ انہوں نے اس وقت تک اسے مدینہ منورہ میں داخلہ کی اجازت نہیں دی جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اجازت نہ دے دی۔ (تفسیر طبری)

(۸)۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جب مکہ مکرمہ کے کفار نے حضرت زید و ثنہ رضی اللہ عنہما کو شہید کرنے کیلئے زمین حرم سے نکالا تو ابوسفیان بن جزنہ ان سے کہا کہ میں تجھے خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ آج تیری جگہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہو اور تم اپنے گھر میں مامون و محفوظ رہو؟ حضرت زید و ثنہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا، یہ تو بہت بڑی بات ہے اللہ تعالیٰ کی قسم! یہ تو بہت بڑی بات ہے، خدا کی قسم میں تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کاٹنا چھو اور میں اپنے گھر میں آرام سے بیٹھا رہوں، اس پر ابوسفیان نے کہا کہ میں نے ساری عمر کسی کو کسی کے ساتھ ایسی محبت کرنے والا نہیں دیکھا جیسا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی محمد رضی اللہ عنہ سے محبت کرتے ہیں۔ (دیکھئے شفاء ابن ہشام)



(۹)۔ بنی دینار کی ایک مسلمان خاتون کے والد، بھائی اور شوہر غزوہ احد میں شریک ہوئے تھے، جب اس کو ہر ایک کے متعلق یہ خبر ملتی رہی کہ وہ شہید ہو گیا تو اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ پڑھتی اور بے قراری سے یہ دریافت کرتی رہی کہ رسول اللہ ﷺ کس حال میں ہیں، لوگوں نے بتایا کہ آپ ﷺ صحیح و سالم ہیں اس پر بھی اطمینان نہ ہوا اور کہنے لگی کہ مجھے بتاؤ تا کہ دیکھ کر یقین کر لوں۔ جب اس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھ لیا تو کہنے لگی، ”کل مصیبة بعدک جلت“، یعنی آپ ﷺ کے ہوتے ہوئے ہر مصیبت پیچ ہے۔ (سیرت ابی ہشام، بیہقی وغیرہ)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ اس قدر شدید ترین محبت کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنی جانیں اور اپنے سر تھیلی پر رکھ کر نکلتے اور اپنے اعضاء و رشتہ داروں اور وطن کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے راستہ میں شہادت ان کو محبوب ہو گئی اور انہوں نے وہ حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیے کہ پوری دنیا اس کی نظیر لانے سے عاجز ہے۔

محبت حقیقی میں ایمان اور تمام دین کی روح اور جان ہے کیونکہ یہ جذبہ ہی اعمالِ صالحہ کا سب سے بڑا محرک ہے اور جب کسی انسان کے دل میں اس جذبہ کہ شمع روشن ہو جاتی ہے تو پھر شریعت کے احکام کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ کسی کے دل میں محبت کا جذبہ حقیقی موجود ہو اور وہ محبوب کے احکام کی پابندی نہ کرے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اسی جذبہ کی آگ جب دل میں بھڑک اٹھتی ہے تو محبوب کے احکام کی تعمیل تو کیا اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے انسان جان تک کی بازی لگانے سے دریغ نہیں کرتا۔ یہی جذبہ نفاق و افتراق کو دور کرتا ہے اور اسی جذبہ کی بدولت انسان کی تسخیری قوتوں میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اس کو دنیا و آخرت میں عظیم الشان کامیابی و سر بلندی نصیب ہوتی ہے، آج امتِ مسلمہ میں شریعتِ مطہرہ پر عمل میں کوتاہی اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری سے غفلت اور نفس پر ہر گراں گزرنے والی چیز مثلاً جہاد سے وحشت، یہ سب کچھ اس عظمت و محبت کا احساس نہ ہونے کا نتیجہ ہے جس پر قرآن و حدیث بہت ہی زور دیتا ہے۔ یہ وہی جذبہ ہے کہ صرف آخرت میں نہیں بلکہ جس طرح اس سے پہلے یہ حیرت انگیز قوت کا سرچشمہ ثابت ہوا، آج بھی اسی جذبہ کو پیدا کیا جائے تو اتفاق و اتحاد باہمی، محبت و ربط اور مسلمان کی قوت اور غلبہ و اقتدار کی وہی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دشمنانِ اسلام اس بات کی سر توڑ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کسی طرح حبِ رسول ﷺ کو ختم کیا جائے خواہ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کیچڑا چھالنے کی صورت میں ہو یا درود شریف کی اہمیت کو کم کرنے کی صورت میں ہو یا کسی دوسری صورت میں ہوتا کہ مسلمانوں کے مرکزِ محبت پر ہی وار کیا جائے جس کے بعد نفاق و افتراق کا آنا لازمی ہے۔

جیسا کہ اس خبیث تحریک کے نتائج سامنے آرہے ہیں کہ محبت کی کمی کی وجہ سے مسلمانوں پر نبی کریم ﷺ کی اتباع بھی گراں گزرنے لگی ہے اور سیاسی لیڈروں اور اپنی اپنی جماعتوں کے مطالبات سے زیادہ دلچسپی ہو گئی اور رسول اللہ ﷺ کی طرف اپنی نسبت اور آپ ﷺ کی غلامی کو شرف سمجھنے سے گریز ہونے لگا ہے، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ پر اتری ہوئی تعلیمات و احکامات سے ہٹ کر اسلامی ممالک بھی قومیت و وطنیت و اشتراکیت، یورپ کے دوسرے جدید فلسفوں اور تہذیبوں کو اپنانے لگے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج امت مسلمہ دنیا میں مسلسل زوال پذیر ہے اور کامیابی کی بجائے گھاٹے میں پڑی ہوئی ہے وہ دنیا میں کوئی عزت نہ حاصل کر سکے بلکہ جب سے اس جذبہ محبت و عظمت رسول ﷺ میں کمی آئی ہے، اس وقت سے مسلمان برابر تنزل کا شکار ہیں اور بالآخر دوسری قوموں پر بھروسہ کر کے اللہ تعالیٰ پر بھروسے و اعتماد کی دولت کو کھو بیٹھے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دینی اور دنیوی دونوں اعتبار سے کمزور ہو گئے اور بالآخر مسلمانوں نے بھی یہ منظر دیکھا کہ وہ حاکم کے بجائے محکوم اور آقا کے بجائے غلام بن گئے۔

وہی انسان جسے سرتاج مخلوقات ہونا تھا

وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

بس امت مسلمہ کو چاہئے کہ دوسری راہوں کے بجائے پھر لوٹ کر سیدھی راہ کی طرف آئیں، اللہ تعالیٰ اور اسکی تمام تعلیمات پر مضبوطی سے قائم رہیں۔

اور مسلمانوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کی محبت و عظمت بٹھانے کی کوشش کریں، اسی میں مسلمانوں کی دنیا و آخرت کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔

حضرت امیر المومنین عمرؓ کے سامنے جب ان کے بعض ساتھیوں نے یہ مشورہ دیا کہ اتنی بڑی بڑی فتوحات اور اسلام کے وسیع اقتدار ہونے کی حیثیت سے انہیں ایک بڑی حکومت کے سربراہ کی شان اختیار کرنی چاہئے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: (اَنْتُمْ كُنْتُمْ اَذِلَّ النَّاسِ فَاعَزَّكُمْ اللَّهُ بِالْإِسْلَامِ فَهَمَّ مَا تَطْلُبُوا الْعَزْلَ لَغَيْرِ يَذُلُّكُمْ اللَّهُ) (البدایہ والنہایہ: ج ۷، ص ۶۰)

یعنی تم سب سے زیادہ ذلیل لوگ (سمجھے جاتے) تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اسلام کے ذریعہ عزت دیدی تو جب بھی تم اسلام کے بغیر (کسی دوسری راہ سے) عزت طلب کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ذلیل کر دے گا۔

تبرک بآثار الصالحین کا بیان!

اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت وہاں نازل ہوتی ہے جہاں خیر و برکت کے قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہو، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو اپنی وحی و رسالت اور نبوت سے نوازا تو پہلے ان کو بہترین صلاحیتوں و قابلیتوں سے نوازا اور ان کی فطرت اور ان کے قلوب کی ہر قسم کے غل و غش اور آلودگیوں سے حفاظت کی اور جب ان کی یہ خداداد صلاحیتیں بار آور ہوئیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر وحی کا نزول شروع ہوا اور یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو تمام انسانوں میں بہترین و افضل ترین لوگ ہوتے ہیں اور ان کے قلوب پر وہ خیر اترتی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی خیر و رحمت و برکت ہو نہیں سکتی اور جو لوگ ان کی تعلیمات سے فیضیاب ہوتے ہیں ان کو دنیا و آخرت کی دائمی عزتیں، کامیابیاں اور رحمتیں مل جاتی ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں، شفقتیں اور عنایتیں نازل ہوتی ہیں اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ جن مقامات پر وحی نازل ہوتی تھی یا جو چیز ان مبارک ہستیوں کے ساتھ لگی ہوئی ہیں یا جہاں انہوں نے نشست و برخاست کی ہے تو انہیں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کا اثر پہنچتا ہے اور جو لوگ ان ہستیوں کے ساتھ محبت رکھتے ہیں تو وہ بھی اپنی محبت کی لہروں اور تاروں میں ان کے فیوض و برکات اپنی اپنی استعداد کے مطابق حاصل کر لیتے ہیں۔ ذیل میں انبیاء علیہم السلام کے آثار، ان کی نشانیوں اور تبرکات کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔

### نشانیوں اور تبرکات کس وقت بابرکت اور رحمت الہی کا ذریعہ بنتے ہیں!

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان کا جس شخص سے محبت و تعلق ہو تو جب وہ شخص غائب ہو جائے تو اس کے آثار و نشانیاں انسان کے دل میں محبت کی آگ کو بھڑکا دیتی ہیں اور انبیاء علیہم السلام اور ان کی سچی اتباع کرنے والوں کے آثار اور نشانیاں بھی ان لوگوں کے دلوں میں عشق و محبت کی آگ بھڑکا دیتے ہیں جن کے دلوں میں ان حضرات کی محبت ہو اور ان سے تعلق ہو اور ان آثار و تبرکات سے ان لوگوں کو دوفائدے حاصل ہوتے ہیں:

(۱) اس کی وجہ سے ایک تو ان کے اندر نشان والے صالح شخص کی یاد اور اس کی محبت جاگ اٹھتی ہے اور پہلے سے زیادہ تیز ہو جاتی ہے جیسا کہ فوت شدہ بیٹے کے لباس کو دیکھ کر بیٹے کی یاد تازہ اور محبت و تعلق اور زیادہ بڑھ جاتا ہے اور صالحین کے ساتھ محبت و تعلق حدود کے اندر شریعت میں مطلوب ہے اور یہی محبت اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سبب بن جاتی ہے۔

(۲) اس کی وجہ سے دوسرا فائدہ انہیں یہ ہوتا ہے کہ انہیں آثار و نشانوں کے ذریعے اس صالح شخص کے فیوض و برکات حاصل ہو جاتے ہیں جیسا کہ پاپ یا نل کے ذریعے ٹنکی سے پانی آتا ہے لیکن یہ فائدہ اس وقت ملتے ہیں کہ جب ان سے عقیدت و محبت بھی ہو ورنہ اگر عقیدت و محبت نہ ہو تو ایسے لوگ خود اپنے اوپر صالحین کے فیوض کے

نلوں کو بند کر دیتے ہیں، بعض منافقین کو ان کے مرنے کے بعد نبی کریم ﷺ نے خود اپنا کرتہ پہنایا لیکن چونکہ منافق تھا، عقیدت و محبت نہیں تھی تو اس مبارک کرتے نے اس کو کوئی نفع نہیں پہنچایا۔

خلاصہ یہ کہ برکت و خیر اور نفع دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور وہ خیر و برکت اسی کو نصیب کرتا ہے کہ جس کے اندر خیر و برکت قبول کرنے کی استعداد ہو۔ اس ضروری تمہید کے بعد اب قرآن مجید اور احادیث مبارکہ سے اس باب کے متعلق کچھ نقل کر دیتے ہیں۔

**اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نیکوکاروں پر اترتی ہیں!**

اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نیکوکاروں پر اترتی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا فَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ٥﴾

”اور اگر بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں (نعمتوں) کے دروازے کھول دیتے لیکن انہوں نے (انبیاء علیہم السلام اور ان پر اتری ہوئی ہدایات و تعلیمات کو) جھٹلایا تو ہم نے ان کو ان کے کرتوتوں کے سبب پکڑ لیا۔“ (الاعراف: آیت ۹۶)

ایمان و تقویٰ کی زندگی کا فائدہ اگرچہ اصلاً آخرت میں ملنے والا ہے لیکن جو لوگ اپنے ایمان و تقویٰ کو ثابت کریں تو ان پر دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمتیں و برکتیں نازل ہوتی ہیں۔

(۲) حضرت نوح علیہ السلام اور جو لوگ اور جو قومیں ان کے ساتھ تھیں، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد

دہے:

﴿قِيلَ يٰ نُوحُ اهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا وَبَرَكَاتٍ عَلَيْنَا وَعَلَىٰ أُمَمٍ مِّمَّنْ مَعَكَ ۖ﴾

”کہا گیا اے نوح اتر و ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اور برکتوں کے ساتھ تم پر اور ان قوموں پر جو تمہارے ساتھ ہیں۔“ (ہود: آیت ۴۸)

اس آیت کریمہ میں حضرت نوح علیہ السلام کو ان قوموں پر جو ان کے ساتھ تھے ان پر مقدم کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں و برکتوں کے نزول کے سب سے زیادہ حقدار حضرت نوح علیہ السلام تھے اور دوسروں پر اللہ تعالیٰ کی یہ سلامتی و برکتیں حضرت نوح علیہ السلام کی اتباع اور راہِ حق میں دوڑ دھوپ کرنے کی وجہ سے نازل ہوتی رہیں۔

(۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گھر والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿رَحِمْتُ اللَّهَ وَبَرَكَتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ إِنَّهُ حَمِيدٌ مَّجِيدٌ﴾

”اے ابراہیمؑ کے گھر والو! تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں ہیں۔“ (ہود: آیت ۷۳)

۴۔ نیز سورہ بقرہ میں صابرین اور صبر و استقامت والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَأُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ﴾

”یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایتیں (مہربانیاں) اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت والے ہیں۔“

(البقرہ: آیت ۱۵۷)

ان چند آیات سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوئی کہ برکات، فیوض اور خیر و بھلائی کا سرچشمہ ان کا لائق و مالک

صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے کہ وہ جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلت دے، جسے چاہے مبارک بنائے

اور جسے چاہے لوگوں کو خیر و برکت پہنچانے کا ذریعہ بنائے اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں و برکتیں نیکوکاروں پر اترتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ بعض مقامات کو مبارک و مقدس بناتا ہے!

جن مقامات میں اللہ تعالیٰ کی یاد ہوتی رہتی ہے جیسا کہ مساجد، یا جن مقامات پر اللہ تعالیٰ کے کسی رسول پر وحی

اتری تھی یا جن مقامات پر انہوں نے نشست و برخاست اور اللہ تعالیٰ کا ذکر اور نماز پڑھی تھی، وہ بھی مقدس اور مبارک ہو

جاتی ہیں۔

مبارک و مقدس مقامات، اوقات اور انسانوں کا ذکر قرآن مجید میں!

مقدس اور مبارک مقامات اور انسانوں کا ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ موجود ہے۔

(۱) چنانچہ بیت اللہ اور مساجد کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ﴾

”بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لئے بناوا وہی ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور سارے جہان والوں کے لئے

ہدایت کا مرکز۔“ (آل عمران: آیت ۹۶)

(۲) بیت المقدس یعنی مسجد اقصیٰ اور اسکے ارد گرد کے مقامات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿سُبْحَنَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا الَّذِي بَرَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنَ الْإِيمَانِ﴾

تَنَاطَلَتْهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝

”پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے (یعنی محمد رسول اللہ ﷺ) کو لے گئی ایک رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے ارد گرد کو ہم نے بابرکت بنایا تاکہ ہم اسکو اپنی کچھ نشانیاں دکھائیں، بے شک وہ سمیع و بصیر ہے“۔ (الاسراء: آیت ۱)

(۳) وادی طوی کے بارے میں ارشاد ہے کہ:

﴿فَلَمَّا تَهَاوَدَىٰ يُمُوسَىٰ ۝ إِنِّي أَنَارْتُكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طَوًى ۝﴾

”پھر جب وہ اس آگ کے پاس آیا تو آواز دی گئی کہ اے موسیٰ! میں ہی تمہارا رب ہوں پس تم اپنے جوتے اتارو کیونکہ تم طوی کی مقدس وادی میں ہو“۔ (طہ: آیت ۱۱-۱۲)

﴿طوی﴾ اس وادی (اور میدان) کا نام ہے جو کوہ طور (کوہ سینا) کے دامن میں واقع ہے۔

ساری زمین اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہے اور جس ٹکڑے کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی خاص نسبت ہو جائے تو اس ٹکڑے کو خاص شرف حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ یہاں اس وادی کو خاص شرف حاصل ہوا کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی تجلی اور اپنے کلام سے نوازا۔ اس وجہ سے اس پہاڑ اور اس وادی کو تقدس کا درجہ حاصل ہو گیا۔

(۴) ایک دوسری جگہ اس مقام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿فَلَمَّا تَهَاوَدَىٰ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْأَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبْرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ أَنْ يُمُوسَىٰ ۝ إِنِّي أَنَا اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝﴾

”پھر جب وہ اس (آگ) کے پاس پہنچے تو وادی کے دائیں کنارے سے برکت والے خطے میں ایک درخت سے ان کو آواز آئی کہ اے موسیٰ! میں اللہ ہوں، سارے جہانوں کا رب“۔ (القصص: آیت ۳۰)

(۵) جس رات قرآن مجید کے نزول کا آغاز ہوا اس رات کے متعلق اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْمُبْرَكَةِ ۝﴾

”بے شک ہم نے اس (قرآن مجید) ایک مبارک رات میں نازل فرمایا“۔ (الدخان: آیت ۳)

مبارک رات سے مراد لیلۃ القدر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝﴾

”بے شک ہم نے اس (قرآن مجید) کو لیلۃ القدر میں نازل کیا“۔ (القدر: آیت ۱)

اور یہ لیلۃ القدر لازماً رمضان المبارک میں ہے جیسا کہ ایک دوسری جگہ ارشاد ہے کہ:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾

”رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا۔“ (البقرہ: آیت ۱۸۵)

(۶) انسانوں کا بابرکت اور مبارک ہونا پہلے بھی گزر چکا ہے یہاں ہم اس سے متعلق صرف ایک ہی آیت

مزید پیش کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ إِنِّي الْكَتَبَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا وَجَعَلَنِي مُبْرَكًا إِنِّي مَا كُنْتُ﴾

”حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب میں (کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب عطا

فرمائی ہے اور مجھے نبی بنایا اور میں جہاں کہیں بھی ہوں اس نے مجھے مبارک (خیر و برکت کا ذریعہ) بنایا ہے۔“

(مریم: آیت ۳۰)

مطلب یہ ہے کہ میں جہاں کہیں بھی ہوں میرا وجود وہاں کے لئے سراپا خیر و برکت ہے۔

بعض انسان، مقامات اور اوقات لوگوں کے لئے خیر و برکت کا ذریعہ ہوتے ہیں!

مذکورہ بالا آیات سے جس طرح یہ بات اچھی طرح ثابت ہوگئی کہ بابرکت انسان و مقامات اور اوقات لوگوں

کے لئے خیر و برکت کے اسباب و ذرائع ہیں اور ان راہوں سے خیر و برکت حاصل ہوتے ہیں بشرطیکہ کوئی اللہ تعالیٰ

سے خیر و برکت کا طالب بنے اور قرآن مجید اور احادیث میں ان انسانوں کے تبرکات کو اہمیت دی گئی ہے۔

مقام ابراہیم علیہ السلام!

چنانچہ مقام ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

﴿وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى﴾

”اور (حکم دیا کہ) مقام ابراہیم کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ۔“ (بقرہ: آیت ۱۲۵)

مقام ابراہیم وہ پتھر ہے کہ جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ (یعنی خانہ کعبہ) کو تعمیر کیا

تھا اور اسی پتھر پر کھڑے ہو کر لوگوں کو حج کی دعوت دی تھی۔ یہ پتھر آج بھی موجود ہے اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام

کے قدموں کے نشان ہیں۔ (دیکھئے صحیح بخاری: ج ۲، کتاب التفسیر)

صحابہ کرام ﷺ کے دلوں میں نبی کریم ﷺ کی جائے نماز کی اہمیت!



(۱) حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ میں مدینہ منورہ میں حاضر ہوا تو حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا کہ میرے گھر چلئے:

(فَاسْقِيكَ فِي قَدَحٍ شَرِبَ فِيهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَتَصَلِّيَ فِي مَسْجِدٍ صَلَّى فِيهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَنْطَلَقْتُ مَعَهُ فَسَقَانِي وَأَطْعَمَنِي تَمَرًا وَصَلَّيْتُ فِي مَسْجِدِهِ)

”میں آپ کو اس پیالہ میں پلاؤں گا جس میں نبی کریمؐ نے پیا ہے اور آپ ایسی مسجد (یعنی جائے نماز) میں نماز پڑھیں جس میں نبی کریمؐ نے نماز پڑھی تو میں ان کے ساتھ گیا تو انہوں نے مجھے پلایا اور کھجوریں کھلائیں اور میں نے نبی کریمؐ کی مسجد (یعنی جائے نماز) میں نماز پڑھی۔“ (بخاری کتاب الاعتصام)

(۲) حضرت انسؓ سے روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے نبی کریمؐ سے درخواست کی کہ وہ ان کے گھر تشریف لائیں ”ف یصلی فتخذه مصلی“ (اور میرے گھر میں کسی جگہ) نماز پڑھئے تاکہ ہم اس جگہ کو جائے نماز بنائیں۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریمؐ ام سلیم رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے اور آپؐ نے وہاں نماز پڑھی اور ہم نے بھی آپؐ کے ساتھ نماز پڑھی۔ (دیکھئے سنن نسائی، جامع الاصول، ج ۶، ص ۳۰۹)

(۳) حضرت محمود بن الرزیقؓ سے روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

”حضرت عتبانؓ نے نبی کریمؐ سے اپنی نظر کی کمزوری کی شکایت کی اور عرض کی میں اپنی قوم کو نماز پڑھاتا ہوں لیکن جب بارش ہو جاتی ہے اور ندی نالے بہہ جاتے ہیں تو میں ان کی مسجد میں نہیں جاسکتا کہ ان کو نماز پڑھاؤں۔“ اس کے بعد انہوں نے عرض کیا کہ ”وَوَدِدْتُ يَارَسُولَ اللَّهِ أَنَّكَ تَأْتِيَنِي فَتُصَلِّيَ فِي بَيْتِي فَاتَّخِذَهُ مُصَلًّى“ یعنی یا رسول اللہؐ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپؐ میرے گھر تشریف لائیں اور میرے گھر میں نماز پڑھیں تاکہ میں اس جگہ کو اپنی جائے نماز بنا لوں۔“ تو آپؐ نے جواب میں فرمایا کہ انشاء اللہ تعالیٰ میں عنقریب یہ کام کروں گا۔

حضرت عتبانؓ کہتے ہیں کہ کل (یعنی دوسرے دن) اشراق کے وقت نبی کریمؐ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ ہمارے گھر تشریف لائے اور بیٹھنے سے پہلے فرمایا کہ ”إِنِّي تَحِبُّ أَنْ أُصَلِّيَ مِنْ بَيْتِكَ“ (تم اپنے گھر میں سے کس جگہ کو پسند کرتے ہو کہ میں اس میں نماز پڑھوں) حضرت عتبانؓ کہتے ہیں کہ میں نے گھر کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا تو آپؐ وہاں کھڑے ہو گئے اور اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کی اور ہم نے بھی آپؐ کے پیچھے صف

باندھ کر نماز پڑھی اور آپ ﷺ نے دو رکعت نماز پڑھ کر سلام پھیر دیا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے بخاری: باب المساجد فی البیوت و صحیح مسلم: باب ترک الجماعۃ بعد ر)

(۴) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما تو ہر اس جگہ نماز پڑھا کرتے تھے کہ جس جگہ نبی کریم ﷺ نے ایک بار بھی نماز پڑھی ہو۔ (دیکھئے صحیح بخاری: باب المساجد التي علی طرق المدینہ والمواقع التي فیما النبی ﷺ صحیح مسلم)

قرآن مجید کی آیات مبارکہ اور یہ احادیث مبارکہ اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ جن مقامات پر نیکوکار لوگ نشست و برخاست کریں اور جہاں وہ نیک کام کریں تو وہ مقامات مبارک ہو جاتے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان جگہوں کو محفوظ بھی کرتے تھے اور ان کے دلوں میں ان مقامات کی قدر اور محبت بھی ہوتی تھی، یہ سب کچھ اس وجہ سے تھا کہ ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور نبی کریم ﷺ کا ادب و احترام و محبت تھی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس مبارک درخت کو کیوں کاٹا جس کے نیچے بیعت رضوان جیسا مبارک عمل وجود میں آیا تھا!

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس درخت کے نیچے بیعت رضوان جیسا مبارک عمل ہوا تھا اور جس کا قرآن مجید میں بھی ذکر موجود ہے، آخر اس مبارک درخت کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیوں کاٹا؟ اس روایت سے بعض لوگوں نے یہ تاثر لیا ہے کہ العیاذ باللہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بلکہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں اس درخت کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی اس لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس درخت کو کاٹ دیا تھا۔ لیکن بندہ کے نزدیک یہ بات قطعاً غلط اور بے سوچائی سمجھی ہے کیونکہ جب قرآن مجید اور صحیح احادیث سے سلف صالحین کے آثار اور نشانیوں کی اہمیت ثابت ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے بھی گزر چکا ہے اور ان شاء اللہ بعد میں بھی آئے گا تو پھر آثار سلف صالحین کے متعلق ایسی بات کہنا قرآن و حدیث سے بے خبری کی علامت ہے۔ اب اسکے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو روایت منقول ہے اس کا جواب پڑھ لیجئے:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا درخت کاٹنے کے واقعے کو ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا ہے اور اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے کہ لوگ اس درخت کے پاس جا جا کر نمازیں پڑھنے لگے تھے تو جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو علم ہوا تو انہوں نے لوگوں کو ڈانٹا اور پھر اس کے کاٹنے کا حکم فرمایا۔ (دیکھئے طبقات ابن سعد: ج ۲، ص ۱۰۰)

صرف اسی ایک روایت سے یہ سمجھنا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک نبی کریم ﷺ کے آثار اور آثار مقدسہ

کی کوئی اہمیت نہ تھی، یہ کئی وجوہ سے باطل ہے۔

(۱) یہ ایک ایسی روایت ہے کہ جس کا وجود صحاح السنۃ میں بھی مذکور نہیں ہے جبکہ اس کے برعکس آثار سلف صالحین کی اہمیت قرآن مجید میں بھی ثابت ہے اور صحیح احادیث میں بھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں ان کی اہمیت اور ان کی قدر دانی بہت سی صحیح حدیثوں سے ثابت ہے تو اس سے یہ استدلال کیسے کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک آثار صالحین کی کوئی وقعت نہیں تھی۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ روایت صحیح بھی ہے تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اس درخت کی تعظیم و احترام میں بہت سے نئے مسلمان جہالت کی بنیاد پر حدود شرعیہ سے تجاوز کر گئے تھے اور اس کو نفع و نقصان کا مالک سمجھنے لگے تھے اور اس کے پاس جمع ہو کر نماز وغیرہ میں اس قدر مشغول ہو گئے تھے کہ گویا بس یہی جائے نماز اور عبادت ہے۔ اس لئے درخت کے کاٹنے کا حکم دیا گیا جیسا کہ اس کی طرف حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اشارہ کیا تو یہاں اس کا کاٹنا اس لیے نہ تھا کہ العیاذ باللہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دل میں مقامات مقدسہ یا آثار سلف صالحین کی اہمیت نہ تھی۔

(۳) بہت زیادہ صحیح روایتوں سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ یا تو وہ درخت کاٹا ہی نہیں گیا تھا، یا اگر کاٹا گیا تھا تو وہ یہ درخت قطعاً نہیں تھا جس کے نیچے بیعت رضوان ہوئی تھی۔ اب اس سے متعلق ہم چند روایات کو اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ جن سے درخت کاٹنے کی روایت کو نقل کیا گیا ہے، وہ خود فرماتے ہیں کہ بیعت رضوان کے کئی سال بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس درخت کو تلاش کیا مگر اسے نہ پہچان سکے اور بات میں اختلاف ہو گیا کہ وہ درخت کون سا تھا۔ (طبقات ابن سعد: ج ۲، ص ۱۰۵)

حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میرے والد بیعت رضوان میں شریک تھے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ دوسرے سال جب ہم لوگ عمرۃ القضاء کے لئے گئے، تو ہم اس درخت کو بھول چکے تھے، تلاش کرنے پر بھی ہم اسے نہ پاسکے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے صحیح بخاری و صحیح مسلم)

بلکہ ایک طرف تو وہ درخت خود ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی گم ہو گیا تھا جو اس مبارک بیعت میں شریک تھے جس کا بیان ان شاء اللہ بعد میں آئے گا دوسری طرف بہت سے جاہل عوام نے از خود اپنی طرف سے ایک درخت کو متعین کیا تھا اور اسے پاس جا کر اس کے تحت بھیڑ لگائی ہوئی تھی اور اس کے نیچے نمازیں پڑھنے لگے تھے جس سے یہ

خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ آگے چل کر لوگ کہیں اس کی پرستش نہ شروع کر دیں اور اس درخت کو قبلہ بنا کر اس کو سجدے کر کے شرک و گمراہی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ جیسا کہ پہلی قوموں کے بارے میں یہ بات معلوم ہے کہ وہ درختوں وغیرہ کی پرستش کرتے تھے۔

اگر حضرت عمر فاروق ؓ کی طرف سے یہ درخت کاٹنے کا واقعہ صحیح ہے تو اس کی یہی توجیہ کی جاسکتی ہے ورنہ اگر حضرت عمر فاروق ؓ کو وہ درخت معلوم تھا اور اسی درخت کے متعلق انہوں نے کاٹنے کا حکم دیا تھا تو پھر اس سے تو بیعت رضوان کی جگہ خوب متعین ہو گئی ہوگی کہ یہی وہ جگہ ہے کہ جہاں بیعت رضوان ہو چکی ہے کیونکہ درخت کے کاٹنے سے جگہ اور مقام تو تبدیل نہیں ہو سکتے مقام اور جگہ تو وہیں کی وہیں رہ جاتی ہیں اور بیت رضوان میں تو اس ”تحت الشجرہ“ یعنی ”درخت کے نیچے جگہ“ کی اہمیت زیادہ ہے اور اس کے مقابلے میں درخت کی اہمیت کم ہے لیکن وہ لوگ درختوں کو سجدے کر کے چلے آئے ہیں اس لئے درخت کو اگر اس وجہ سے کاٹا ہوگا تو یہ بعید نہیں کیونکہ مسلمان شرک کے معاملہ میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں۔

حضرت طارق بن عبد الرحمن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں حج کو گیا اور ایسے لوگوں پر میرا گزر ہوا کہ وہ ایک جگہ نماز پڑھ رہے تھے میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کون سی مسجد ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ وہ درخت ہے کہ جہاں نبی کریم ﷺ نے بیت رضوان لی تھی۔

حضرت طارق بن عبد الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا اور ان کو اپنی آنکھوں دیکھا حال بیان کیا تو حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میرے والد بیعت رضوان میں شریک تھے انہوں نے مجھ سے کہا کہ دوسرے سال جب ہم لوگ عمرۃ القضاء کے لئے گئے تو ہم اس درخت کو بھول گئے، تلاش کرنے کے باوجود بھی ہم اسے نہ پاسکے۔ اسکے بعد حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

(اِنَّ اَصْحَابَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَعْلَمُوْا هَا وَاَعْلَمْتُمْوْهَا اَنْتُمْ فَاَنْتُمْ اَعْلَمُ)

محمد الرسول اللہ ﷺ کے صحابہ ؓ تو اس درخت کو نہ جانتے تھے اور تم جانتے ہو اور تم ان سے اس (درخت) کو زیادہ جاننے والے ہو گئے۔ (صحیح بخاری و مسلم)

اس صحیح حدیث سے ایک تو یہ بات اچھی طرح ثابت ہو گئی کہ صحابہ کرام ؓ کے دلوں میں اس درخت کی اہمیت اور وقعت تھی اس لئے جب وہ دوسرے سال معاہدہ کے مطابق عمرہ کے لئے آئے تو انہوں نے اس درخت کو تلاش کیا

لیکن وہ درخت ان کو ملا نہیں ورنہ اگر اہمیت نہ ہوتی تو صحابہ کرامؓ گزشتہ سال کے قضاء عمرہ کے لئے آرہے ہیں اور خود نبی کریم ﷺ بھی ساتھ موجود ہیں۔ سفر بھی پیادہ ہے اور دور کا ہے اور جس مقام یعنی حدیبیہ میں یہ درخت تھا، وہ مقام بھی ہنوز مشرکین مکہ کے قبضے میں تھا، پھر بھی وہ اس درخت کو تلاش کر رہے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس درخت کی اہمیت اور وقعت ان کے دلوں میں تھی۔

دوسری بات یہ ثابت ہوگئی کہ وہ درخت یا تو خشک ہو کر ختم ہو گیا تھا اور صحابہ کرامؓ کو وہ درخت ملا نہیں یا درخت اس قدر زیادہ تھے کہ وہ درختوں کے جھنڈ میں اسے پہچان نہ سکے نیز حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ تابعی ہیں اور یہ بات وہ اپنے شاگرد سے کرتے ہیں اگر حضرت عمر فاروقؓ نے اس درخت کے کاٹنے کا حکم فرمایا ہوتا تو کیا وہ اس کو نہ کہتے کہ وہ درخت تو حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں کاٹ دیا گیا ہے، اب وہ درخت پھر کہاں سے وجود میں آگیا۔ نیز حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں منقول ہے کہ جب وہ اپنے عہد خلافت میں حدیبیہ کے مقام سے گزرے تو انہوں نے دریافت کیا کہ وہ درخت کہاں ہے کہ جس کے نیچے بیعت ہوئی تھی کسی نے کہا کہ فلاں درخت ہے اور کسی نے کہا کہ فلاں۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا چھوڑ دو، اس تکلیف کی کیا حاجت ہے۔ (تفسیر ابن جریر) اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بیعت رضوان والا درخت تو صحابہ کرامؓ کو بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ یا تو خشک ہو کر ختم ہو گیا تھا اور یا درختوں کے جھنڈ میں گم ہو گیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

### سلف صالحین کی چھوڑی ہوئی چیزیں اور قرآن مجید!

بنی اسرائیل کے پاس ایک صندوق تھا جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی چیزیں مثلاً کپڑے، جوتے، عصا وغیرہ اور تورات کی کچھ تختیاں رکھی ہوئی تھیں، بنی اسرائیل اس صندوق کو بڑا متبرک اور اپنی فتح و نصرت کا سامان سمجھتے تھے اور وہ اس صندوق کو اپنے دشمنوں کے ساتھ لڑائی کے موقع پر ان سے چھین لیا تھا، جب وہ صندوق ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو بنی اسرائیل کی ہمت ٹوٹ گئی اور وہ یہ خیال کرنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہم سے پھر گئی ہے اور اب ہمارے برے دن آگئے ہیں کچھ عرصہ بعد انہوں نے اپنے اس وقت کے پیغمبر حضرت شموئیل علیہ السلام سے درخواست کی کہ کوئی امیر یا سپہ سالار ہمارے لئے مقرر کر دیجئے تاکہ اس کی ماتحتی میں ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کریں۔ بنی اسرائیل کے مطالبہ پر جب حضرت شموئیل علیہ السلام نے ان کے لئے سپہ سالار طالوت نامی شخص کا انتخاب کیا تو بنی اسرائیل نے ان سے طالوت کی اور اس کی حکومت پر اللہ تعالیٰ کی کوئی نشانی اور دلیل مانگی تو اللہ تعالیٰ کی وجی اور حکم سے ان کے لئے اسی صندوق کی آمد کو طالوت کی حکومت کی نشانی ٹھہرا دیا گیا، اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ

کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ط إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُمْ مُّؤْمِنِينَ ٢٢٨﴾

”اور ان کے نبی علیہ السلام نے ان سے کہا کہ اس (طالوت) کے بادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لئے اطمینان و تسکین (کا سامان) ہے اور آل موسیٰ اور آل ہارون کی چھوٹی ہوئی یادگاریں ہیں۔ اس صندوق کو فرشتے لے آئیں گے، اس میں تمہارے لئے بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان رکھنے والے ہو۔“ (البقرة: آیت ۲۲۸)

یہ صندوق انکے پاس کیسے پہنچا اسکے متعلق جو کچھ معلوم ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ دشمن فلسطی اس صندوق کو جس بستی میں رکھتے وہاں وہاں پھوٹ پڑتیں، اس طرح ان کی کئی بستیاں وباؤں کی لپیٹ میں آگئیں اس سے انہوں نے براہنگون لیا اور جب اللہ تعالیٰ کو اس صندوق کا پہنچانا منظور ہوا تو انہوں نے اس صندوق کو ایک بیل گاڑی پر رکھ کر اپنی آبادی سے نکال دیا اور گاڑی کو بغیر کسی گاڑی بان کے بنی اسرائیل کی آبادی کی طرف ہانک دیا پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرشتے اس گاڑی کو سیدھا بنی اسرائیل کی طرف لے آئے اور بیل گاڑی طالوت کے دروازے پر کھڑی ہو گئی۔

اس آیت صندوق سے تبرکات کے متعلق چند باتیں ثابت ہوئیں:

(۱) پہلی بات اس سے یہ ثابت ہوئی کہ سلف صالحین کے آثار اور یادگاریں اگر صحیح عقیدے اور عقیدت کے ساتھ ہوں تو ان لوگوں کے لئے خیر و برکت کا سامان ہوتی ہیں۔

(۲) دوسری بات اس سے یہ ثابت ہوئی کہ ان تبرکات میں اطمینان و تسکین کا سامان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، از خود ان چیزوں میں کوئی نفع و نقصان نہیں ہوتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا ﴿فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَبِّكُمْ﴾ یعنی ”اس (صندوق) میں تمہارے لئے اطمینان و تسکین کا سامان ہے، تمہارے رب کی طرف سے۔“

(۳) تیسری بات اس سے یہ ثابت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ سلف صالحین کے تبرکات سے فائدہ صرف ان لوگوں کو پہنچاتا ہے جو صحیح عقیدہ و عقیدت کے ساتھ پیروکار ہوں۔ دیکھئے اس آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ اس میں تمام لوگوں کے لئے تسکین کا سامان ہے بلکہ فرمایا کہ تمہارے لئے تسکین کا سامان ہے اور بنی اسرائیل ہی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام وغیرہ کے پیروکار بھی تھے اور ان کے ساتھ ان کی عقیدت بھی تھی۔

(۴) چوتھی بات اس سے یہ ثابت ہوئی کہ یہی صندوق جب مخالف دشمن کے ہاتھ میں تھا تو ان کے لئے اس میں



کوئی خیر و برکت نہیں نکلی بلکہ الٹا ان پر وبائیں پڑ گئیں۔ اس سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوئی کہ نفع و نقصان کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اللہ تعالیٰ تبرکات سے خیر و بھلائی صرف ان لوگوں کو نصیب فرماتا ہے جن کا عقیدہ بھی صحیح ہو اور سچی عقیدت و محبت بھی ہو۔

(۵) پانچویں بات اس سے یہ ثابت ہوئی کہ انبیاء علیہم السلام اور سلف صالحین کی یادگاریں دیکھ کر ان کی خداداد صفات اور کمالات اور دینی خدمات سامنے آتی ہیں، ان سے تعلق اور محبت مضبوط تر ہو جاتا ہے اور ان کی سچی اتباع نصیب ہوتی ہے اور یہ وہ کنجی ہے کہ جس سے خیر و بھلائی کے دروازے کھلتے ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نیزہ اور انگوٹھی کی قدر و قیمت!

(۱) سیدنا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے ایک نیزہ لیا تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے تو پھر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے وہ لے لیا، پھر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے وہ نیزہ مانگ لیا پھر جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ دنیا سے رحلت فرما گئے تو پھر وہ نیزہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے واپس لے لیا، پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان سے وہ نیزہ مانگ لیا۔ ان کی شہادت کے بعد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے پھر وہ واپس لے لیا۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے وہ مانگ لیا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے تو اس کے بعد وہ نیزہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آل کے پاس آ گیا۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے پھر واپس مانگ کر لے لیا اور یہ نیزہ ان کی شہادت تک ان کے ساتھ رہا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے صحیح بخاری: کتاب الغازی، باب اشہود للملئکۃ بدرًا)

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوٹھی جس پر لفظ ”محمد رسول اللہ“ نقش تھا، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں رہتی تھی اور ان کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں رہتی تھی اور ان کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں اور ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں رہتی تھی اور ان کے پاس چھ سال رہی، بالآخر وہ ان کے ہاتھ سے بیزار لیس میں گر گئی، انہوں نے اس انگوٹھی کو بہت تلاش کیا، مگر وہ نہ ملی۔ (بخاری، نسائی، ابن سعد وغیرہ دیکھئے، فتح الباری: ج ۱۰، ص ۳۱۳)

ان چیزوں کی قدر و قیمت جن پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونٹ مبارک لگے تھے!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس پیالہ سے پیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس پیالہ کو محفوظ کر لیا اور جس مشکیزے میں سے پانی پیا اس مشکیزے کے منہ کو کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ یہاں اس سلسلہ کی چند روایات کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے:



- (۱) حضرت عبداللہ بن سلام ؓ نے آپ ﷺ کے مبارک پیالے کو محفوظ کر رکھا تھا اور جب ان کے پاس کوئی معزز مہمان آتا تو وہ اس کو اس مبارک پیالے میں پانی پلاتے تھے۔ (بخاری: کتاب الاعتصام)
- (۲) حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے، گھر میں ایک مشکیزہ لٹکا ہوا تھا، آپ ﷺ نے کھڑے کھڑے مشکیزے کے منہ سے پانی پی لیا، حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے مشکیزے کا منہ کاٹ لیا اور وہ (مشکیزے کے منہ کا ٹکڑا اب بھی) ہمارے پاس موجود ہے۔ (دیکھئے الفتح الربانی لترتیب المسند الامام احمد بن حنبل الشیبانی: ج ۲، ص ۷۰)
- (۳) حضرت بحریہ رحمۃ اللہ علیہا کہتی ہیں کہ میرے چچا خدش ؓ نے حضور اکرم ﷺ کو ایک پیالہ میں کھاتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے وہ پیالہ بطور ہدیہ مانگ لیا (حضور ﷺ نے ان کو وہ پیالہ دے دیا) چنانچہ وہ پیالہ ہمارے ہاں رکھا رہتا تھا۔ حضرت عمر ؓ ہم سے فرمایا کرتے تھے کہ وہ پیالہ میرے پاس لاؤ۔ جس وقت وہ ہمارے ہاں آتے تو ہم زمزم کے پانی سے وہ پیالہ بھر کے حضرت عمر ؓ کے پاس لاتے تو حضرت عمر ؓ اس میں کچھ پیتے اور کچھ (برکت کے لئے) اپنے سر اور چہرے پر ڈال لیتے۔ پھر ایک چور نے ہم پر بڑا ظلم کیا کہ وہ ہمارے سامان کے ساتھ اسے بھی چوری کر کے لے گیا۔ پیالے کی چوری کے بعد حضرت عمر ؓ ہمارے پاس آئے اور حسب دستور پیالے کا مطالبہ کیا۔ ہم نے کہا کہ اے امیر المومنین! وہ پیالہ تو ہمارے سامان کے ساتھ چوری ہو گیا۔ حضرت عمر فاروق ؓ نے فرمایا کہ وہ چور تو بڑا سمجھ دار ہے جو حضور ﷺ کا پیالہ چرا کر لے گیا ہے.....
- (ابن سعد وغیرہ دیکھئے، حیاة الصحابة: ج ۲، ص ۶۸۴)
- (۴) حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا (صحابیہ) کہتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ میرے ہاں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے کھڑے کھڑے لٹکے ہوئے مشکیزہ کے منہ سے پانی پی لیا اور میں مشکیزہ کے منہ کی طرف اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کو کاٹ لیا۔ (ترمذی، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

### نبی کریم ﷺ کا جبہ مبارک!

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس نبی کریم ﷺ کا پہنا ہوا ایک جبہ (یعنی پُنجہ) مبارک تھا ان کے انتقال کے بعد یہ جبہ ان کی بہن حضرت اسماء بنت ابی بکر ؓ نے لے لیا، حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ: ”فَنَحْنُ نَغْسِلُهَا لِلْمَرْضَى وَنَسْتَشْفِي بِهَا“، یعنی ہم مریضوں کے لئے اس کو دھوتے ہیں اور (اس کا پانی مریضوں کو پلا کر) اس کے ذریعے شفاء طلب کرتے ہیں۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے صحیح مسلم: کتاب الباس)

## نبی کریم ﷺ کا پسینہ مبارک!

صحیحین کی روایت ہے کہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے پسینہ مبارک کو جمع فرماتیں اور پھر اس کو خوشبو میں ملایا کرتیں اور صحیح مسلم کی روایت میں یہ بھی اضافہ ہے کہ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ اس کو کیا کرتی ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا ”نَرْجُوْا بَرَكَّتْهُ لَصِيْبَانِنَا“، یعنی ”ہم اسے اپنے بچوں کے لئے باعث برکت و تبرک سمجھتے ہیں“۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ”اصْبَتْ“، یعنی ”تم نے ٹھیک کیا“۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

## نبی کریم ﷺ کے خون مبارک کو زمین پر نہ گرنے دینا!

(۱) حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام کیسان رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک طشت ہے اور یہ کہ (جو کچھ اس میں ہے) اسے پی رہے ہیں اتنے میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ وہ کام کرا آئے؟ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا جی ہاں! حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا کام تھا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اس کو اپنے پچھنے کے خون کا غسل دیا تھا تاکہ جو کچھ اس میں ہے یہ اسے بہادیں، حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ”قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اسے تو یہ پی گئے ہیں، آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیا تم اسے پی گئے ہو؟ تو انہوں نے عرض کیا جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا کیوں؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ مجھے یہ بات پسند آئی کہ حضور اکرم ﷺ کا خون مبارک میرے پیٹ میں ہو، یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا کہ تجھے لوگوں سے نقصان پہنچے گا اور لوگوں کو تجھ سے (یعنی تم شہید کئے جاؤ گے اور تم سے جنگ کرنے والوں کا انجام ہلاکت ہوگا) تمہیں جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی، صرف اللہ تعالیٰ کی قسم پوری کرنے کے لئے پل صراط سے گزرنا پڑے گا۔

(اخر جہ ابو یعلیٰ و البیہقی والی کم، والطبرانی و البزار و ابن عساکر، تفصیل کے لئے دیکھئے)

حیاء الصحابہ: ج ۳، ص ۴۲۰ تا ۴۲۱)

(۲) حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پچھنے لگوائے اور مجھے فرمایا کہ اس خون کو درندوں، پرندوں، جانوروں اور انسانوں سے بچا کر کسی جگہ دفن کراؤ تو میں اس کو آپ ﷺ کے پاس سے لے گیا اور چھپ کر اسے پی گیا، پھر واپس آ کر میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ بتایا (کہ میں تو اسے پی گیا ہوں) تو آپ ﷺ ہنس

پڑے۔ (رواہ الطبرانی ورجالہ ثقات کذافی مجمع الزوائد: ج ۸، ص ۲۷۰)

(۳) حضرت ابوسعیدؓ کا بیان ہے کہ جب جنگِ احد کے دن رسول اللہؐ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا تو میرے والد حضرت مالک بن سنانؓ نے حضورؐ کے خون کو چوس کر نگل لیا تو لوگوں نے ان سے کہا کہ کیا تم خون پی رہے ہو؟ تو انہوں نے کہا کہ ہاں میں رسول اللہؐ کا خون مبارک پی رہا ہوں، اس پر نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ان کے خون کے ساتھ میرا خون مل گیا ہے لہذا انہیں جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی۔ (آخرہ الطبرانی کذافی مجمع الزوائد ج ۸، ص ۲۷۰)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ نے نبی کریمؐ کے خون مبارک کو بھی زمین پر نہیں گرنے دیا اور اسے پی لیا اور نبی کریمؐ نے انکے عمل کو سراہا۔ خون مبارک تو بہت بڑی چیز ہے بلکہ صحابہ کرامؓ کو نبی کریمؐ کے ساتھ اس قدر عشق و محبت اور عقیدت تھی کہ نبی کریمؐ کا پیشاب بھی جس کو پیشاب کے برتن میں ملا اس نے اس کو بھی پی لیا۔ (دیکھئے مجمع الزوائد: ج ۸، ص ۲۷۰ تا ۲۷۱)

نبی کریمؐ کے بدن مبارک اور منہ مبارک سے لگے ہوئے پانی کی قدر و قیمت!

نبی کریمؐ کے بدن مبارک اور منہ مبارک سے جو چیز بھی لگ گئی وہ بڑی بابرکت ہے، مبارک وجود کے ساتھ لگی ہوئی چیز مبارک ہی ہوا کرتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نبی کریمؐ کے بدن و منہ مبارک سے لگے ہوئے پانی کو ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس کے متعلق بھی اختصار کے ساتھ چند روایات کو پڑھ لیجئے:

(۱) صحیح بخاری میں ہے کہ نبی کریمؐ وضو فرماتے تھے تو صحابہ کرامؓ آپؐ کے وضو سے بچے ہوئے پانی پر ٹوٹ پڑتے تھے اور ایک صحیح روایت میں ہے کہ وضو سے بچے ہوئے اور وضو میں مستعمل ہو کر بدن سے جدا ہونے والے پانی کو صحابہ کرامؓ اپنے بدنوں پر مل لیتے تھے اگر کسی کے ہاتھ پانی نہ لگتا تو وہ دوسرے کے ہاتھوں میں لگی ہوئی تری کو اپنے ہاتھ سے مل لیتا اور پھر اسے اپنے بدن پر مل لیتا۔ (متفق علیہ دیکھئے مشکوٰۃ: باب السرة)

(۲) امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ طلق بن علیؓ سے روایت کرتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کریمؐ کی خدمت میں ہم وفد بن کر حاضر ہوئے تو ہم نے آپؐ کے دست مبارک پر بیعت کی اور آپؐ کے ساتھ نماز پڑھی اور آپؐ کو خبر دی کہ ہمارے علاقے میں نصاریٰ کی ایک عبادت گاہ (یعنی گرجا) ہے (اس کو ہم کیا کریں؟) ہم نے آپؐ سے آپؐ کے وضو سے بچا ہوا پانی مانگا تو آپؐ نے پانی منگوایا اور وضو فرمایا اور منہ میں پانی ڈال کر کلی کی پھر اس کو ہمارے لئے چھاگل میں ڈال دیا اور ہمیں فرمایا کہ جس وقت اپنے علاقے میں پہنچ جاؤ تو اپنے گرجے کو توڑ دو اور

سکی جگہ پر یہ پانی چھڑکوا اور اس کو مسجد بنادو، ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہمارا شہر دور ہے اور گرمی بھی سخت ہے یہ پانی تو وہاں تک جا کر ختم ہو جائیگا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

(مَدَّوْهُ مِنَ الْمَاءِ فَإِنَّهُ لَا يَزِيدُهُ إِلَّا طَيِّبًا)

یعنی اس میں اور پانی ڈال دو، اس سے اسکی پاکیزگی اور طہارت میں ہی اضافہ ہوگا۔ (نسائی، مشکوٰۃ: باب المساجد)  
(۳) امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک پیالہ منگوا یا جس میں پانی تھا، پہلے آپ ﷺ نے دونوں ہاتھ اور منہ اس میں دھوئے اور اس میں کلی کی، پھر حضرت ابو موسیٰ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما سے فرمایا کہ اس میں سے کچھ پی لو اور کچھ اپنے چہروں پر مل لو۔ (دیکھئے صحیح بخاری: کتاب الوضو)

(۴) صحیح مسلم میں ہے کہ جس وقت آپ ﷺ صبح کی نماز پڑھ لیتے تو مدینہ والوں کے خادم آپ ﷺ کے پاس پانی کا برتن لاتے (تاکہ نبی کریم ﷺ کے ہاتھ مبارک سے یہ پانی لگ جائے) جو برتن وہ لاتے، آپ ﷺ ان میں اپنا ہاتھ مبارک ڈالتے۔ (صحیح مسلم: ج ۲، ص ۲۵۶)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کے تھوک کو بھی زمین پر نہیں گرنے نہیں دیتے تھے!

نبی کریم ﷺ کے وضو وغیرہ سے بچے ہوئے پانی کا بیان تو آپ کے سامنے آیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ اس قدر والہانہ محبت اور عقیدت تھی کہ وہ آپ ﷺ کے تھوک کو بھی زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے۔ (دیکھئے صحیح بخاری: کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نبی کریم ﷺ سے محبت و عقیدت کی ایک جامع روایت!

صلح حدیبیہ کے موقع پر عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے وہ قریش کے سفیر کی حیثیت سے نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ سے طویل گفتگو کرتے رہے اور اپنی نظریں بچا بچا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت معلوم کرتے رہے، واپس جا کر کفار قریش کے سامنے انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عقیدت و محبت ان الفاظ میں بیان کی۔

”اے قریش! میں بڑے بڑے بادشاہوں کے ہاں گیا ہوں، قیصر و کسریٰ و نجاشی کے درباروں اور ان کے آداب بھی دیکھے ہیں۔ خدا کی قسم! میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کی جماعت اس کی ایسی تعظیم کرتی ہو جیسے محمد ﷺ کی جماعت انکی تعظیم کرتی ہے۔ جب وہ وضو کرتے ہیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے بچے ہوئے پانی پر ٹوٹ

پڑتے ہیں اور وہ تھوکتے ہیں تو اس تھوک کو لپک کر لے لیتے ہیں اور جس کے ہاتھ پر پڑ جائے تو اس کو وہ اپنے بدن اور چہرے پر مل لیتا ہے اور جب وہ ان کو کسی بات کا حکم فرماتے ہیں تو وہ ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے سامنے بولتے ہیں تو بہت دبی آواز سے بولتے ہیں ادب کی وجہ سے ان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ اگر ان کے سر یا داڑھی کا کوئی بال گر جائے تو اس کو اٹھا لیتے ہیں۔ غرض میں نے کسی جماعت کو اپنے آقا سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنی محمد ﷺ کی جماعت ان کے ساتھ کرتی ہے۔ تو جس قوم کو اپنے سردار کے ساتھ اس قدر محبت ہو تو اس پر غالب آنا ناممکن ہے۔ (ماخوذ از صحیح بخاری: کتاب الشروط، سیرت ابن ہشام: ج ۲، ص ۲۲۸)

نبی کریم ﷺ کے موئے (یعنی بال) ناخن مبارک کا بطور تبرک رکھنا!

سابقہ روایات سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کے بدن مبارک سے لگی ہوئی چیزوں کو خیر و برکت کا ذریعہ سمجھتے تھے لیکن پھر بھی ذیل میں نبی کریم ﷺ کے موئے (یعنی بال) مبارک اور ناخن مبارک کے بارے میں چند روایات کو مزید نقل کرتا ہوں تاکہ تبرکات کی اہمیت اور ان کی قدر و قیمت کے بارے میں کسی مسلمان کے دل میں کوئی کھٹکانہ نہ رہے۔

(۱) حضرت عثمان بن عبد اللہ بن موہب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے گھر والوں نے مجھے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس پانی کا ایک پیالہ دے کر بھیجا تو وہ چاندی کی ایک ڈبیہ جیسا برتن لے کر تشریف لائیں جس میں نبی کریم ﷺ کے مبارک بالوں میں سے کچھ بال تھے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ: ”وَكَانَ إِذَا أَصَابَ الْإِنْسَانُ عَيْنَ أَوْ شَيْءٍ بَعَثَ إِلَيْهَا مَخْضَبَةً قَالَ فَاطَّلَعْتُ فِي الْجُلُجُلِ فَرَأَيْتُ شَعْرَاتِ حَمْرَاءَ“

”اور جب کسی انسان کو نظر لگ جاتی یا کوئی اور تکلیف ہوتی تو وہ ان (حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا) کے پاس لگن بھیجتا (اور وہ نبی کریم ﷺ کے بالوں والی ڈبیہ کو اس پانی میں ہلا دیتیں پھر وہ اسے پی لیتا) وہ (یعنی حضرت عثمان بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ جب میں نے اس ڈبیہ میں جھانکا تو اس میں چند لال رنگ کے بال دیکھے۔“

(دیکھئے صحیح بخاری: کتاب اللباس، باب ما یذکر فی الشیب)

(۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

(لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْحَلَّاقُ يَحْلِقُهُ وَأَطَافَ بِهِ أَصْحَابُهُ فَمَا يُرِيدُونَ أَنْ

تَقَعَ شَعْرَةٌ فِي بَدْرُجُلٍ)

”میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسے حال میں دیکھا کہ جام آپ ﷺ کی حجامت کر رہا تھا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

(پروانوں کی طرح) آپ ﷺ کے ارد گرد چکر لگاتے تھے، وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ان کے ہاتھ نبی کریم ﷺ کا کوئی بال مبارک آجائے۔ (دیکھئے صحیح مسلم: کتاب الفضائل، باب قربہ ﷺ وتبرکھم ج ۲، ص ۲۵۶)

(۳) حضرت جعفر بن حکم ﷺ سے روایت ہے کہ حضرت خالد بن ولید ﷺ سے جنگ یرموک کے موقعہ پر اپنی ٹوپی گم ہو گئی تھی، آپ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اس کو تلاش کرو، تلاش کرنے کے باوجود نہ ملی۔ آپ ﷺ نے دوبارہ حکم فرمایا کہ اس کو تلاش کرو۔ بالآخر وہ ٹوپی مل گئی تو دیکھا کہ وہ پرانی سی ٹوپی تھی، حضرت خالد بن ولید ﷺ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے عمرہ ادا کیا اور اپنا سر مبارک منڈوا یا تو لوگ آپ ﷺ کے موئے مبارک کی طرف لپکے۔ میں لوگوں سے آگے بڑھ گیا اور میں نے آپ ﷺ کی پیشانی مبارک کے بال مبارک لے لئے اور ان کو اس کلاہ اور ٹوپی میں رکھ لیا ہے، جب میں کسی لڑائی میں حاضر ہوتا ہوں اور یہ ٹوپی میرے ساتھ ہوتی ہے تو مجھے اللہ تعالیٰ فتح دیتا ہے۔ (ابویعلیٰ، الطبرانی، حاکم وغیرہ دیکھئے حیاۃ الصحابہ: ج ۳، ص ۷۷۵)

غور کیجئے کہ حضرت خالد بن ولید ﷺ کو موئے مبارک سے کس قدر محبت اور عقیدت تھی کہ ان کو کلاہ اور ٹوپی میں محفوظ رکھا ہوا تھا اور سر کے اوپر رکھتے تھے اور ساتھ ساتھ عقیدہ بھی کس قدر صاف ہے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ نفع و نقصان کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اس لئے فرماتے ہیں کہ جب یہ ٹوپی میرے ساتھ ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے فتح دیتا ہے۔

(۴) نبی کریم ﷺ نے خود اپنے بال مبارک عبداللہ بن زید ﷺ اور دوسرے لوگوں پر تقسیم کئے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے الفتح الربانی لترتیب مسند الامام احمد الشیبانی: ج ۲۲، ص ۷۰)

(۵) نبی کریم ﷺ نے اپنے ناخن مبارک کٹوائے اور عبداللہ بن زید ﷺ کے ساتھی کو دیئے۔ (الفتح الربانی

ج ۲۲، ص ۷۰)

(۶) حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبید رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ ہمارے پاس نبی کریم ﷺ کے کچھ بال مبارک ہیں ہم نے انہیں حضرت انس ﷺ سے یا (یہ کہا کہ) حضرت انس ﷺ کے گھر والوں سے حاصل کیا ہے تو حضرت عبید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر ان بالوں میں سے ایک بال بھی مجھے مل جائے تو ساری دنیا اور جو کچھ اس میں ہے وہ مجھے اس سے زیادہ پیارا ہوگا۔ (صحیح بخاری: کتاب الوضوء، جلد اول ص ۹۶)

(۷) حضرت انس ﷺ کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ منیٰ میں آنے کے بعد جمرہ عقبہ کے پاس تشریف لائے اور وہاں کنکریاں ماریں پھر منیٰ میں اپنی قیام گاہ میں تشریف لائے اور اپنی قربانی کے جانور کو ذبح کیا۔ اس کے بعد حجام کو بلایا اور اپنے سر کا دایاں حصہ اس کے سامنے کیا (کہ پہلے یہاں سے شروع کرو) چنانچہ اس نے آپ ﷺ کے



اس (دائیں) حصے کو مونڈ دیا۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت ابو طلحہ انصاریؓ کو بلایا اور ان کو وہ بال مبارک دے دیئے، اسکے بعد آپ ﷺ نے اپنے سر مبارک کا بالیاں حصہ حجام کی طرف کر کے فرمایا کہ اب اسے مونڈو، چنانچہ اس نے اسے بھی مونڈ دیا۔ یہ بال بھی آپ ﷺ نے حضرت طلحہ انصاریؓ کو دیئے اور فرمایا ”اقسمہ بین الناس“ یعنی ”یہ بال لوگوں میں تقسیم کرو“۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم دیکھئے مشکوٰۃ: کتاب الحج، باب الحلق)

تبرکات کے بارے میں اور بھی بہت سی روایات و واقعات احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں لیکن مسئلہ کے ثبوت کے لئے یہی روایات کافی و شافی ہیں۔

سلف صالحین کی یادگاروں اور تبرکات کے بارے میں نصوص کا خلاصہ!

مذکورہ بالا قرآن مجید کی آیات اور احادیث کی رو سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوگئی کہ سلف صالحین کی یادگاروں اور ان کے تبرکات کو بڑی اہمیت حاصل ہے ان کو فدائین کے لئے طمانیت و تسکین اور برکت کا سامان بتلایا گیا ہے اور صحابہ کرامؓ ان جگہوں میں نماز پڑھتے تھے جہاں نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھی ہو اور ان پیالوں میں پانی پیتے اور پلاتے تھے جن میں آپ ﷺ نے پیا تھا اور آپ ﷺ کے جبہ اور موئے مبارک کا پانی مریضوں کو پلاتے تھے اور خود نبی کریم ﷺ اپنے وضو کا پانی لوگوں کو دیتے تھے تاکہ وہ اس کو پیئیں اور اپنے بدنوں پر مل لیں اور صحابہ کرامؓ نبی کریم ﷺ سے بچے ہوئے پانی اور آپ ﷺ کے بال مبارک کو حاصل کرنے میں اس قدر حریص تھے کہ وہ ان پر ٹوٹ پڑتے بلکہ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ان پر لڑ پڑتے تھے اور خود صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ کے ایک ایک بال اور ناخن مبارک کو محفوظ کر لیا اور وہ بال مبارک وغیرہ ان کے نزدیک آسمان وزمین کے برابر سونے و چاندی سے زیادہ محبوب تھے اور نبی کریم ﷺ خود اپنے فدائین پر اپنے بال و ناخن مبارک تقسیم فرماتے تھے۔ تو قرآن مجید کی آیتوں اور اس قدر زیادہ صحیح حدیثوں کے باوجود بھی اگر کوئی مسلمان یہ کہتا ہے کہ سلف صالحین کی یادگاروں اور ان کے تبرکات کی کوئی اہمیت نہیں ہے تو ایسا شخص قرآن و حدیث سے بے خبر ہے اس لئے صرف ایک بے سوچے سمجھی اور سنی سنائی بات کہہ رہا ہے یا پھر وہ یہودیوں کی اس تحریک سے جو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلمانوں کے دلوں سے نبی کریم ﷺ اور اسلاف کی محبت کو نکالنے کی کوشش میں مصروف ہیں اور یہودیوں کی اس تحریک نے مسلمانوں کے اندر خود ایسے لوگ بلکہ معتقد جماعتیں پیدا کی ہیں جو اسلام کے نام پر لوگوں کے دلوں سے نبی کریم ﷺ و صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کی محبت و عقیدت کو ختم کر رہی ہیں۔



### یہودیوں اور دشمنانِ اسلام کے حربے!

یہودی اور دشمنانِ اسلام مسلمانوں کے خلاف سخت سازشیں کرتے رہتے ہیں اور اس کے لئے انہوں نے باقاعدہ ادارے اور تنظیمیں بنائی ہوئی ہیں جن کے ذریعے وہ اسلام اور مسلمانوں کو پوری طرح ختم کرنا چاہتے ہیں، ان تنظیموں اور اداروں میں سے بعض تنظیمیں اس کام کے لئے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح وہ مسلمانوں کے دلوں سے نبی کریم ﷺ کی محبت کو نکالیں اور جن اسباب سے نبی کریم ﷺ کی محبت سینوں میں بھڑک سکتی ہے ان اسباب ہی کو ختم کیا جائے اور یہ تو ایک مسلم حقیقت ہے کہ جس قوم کے دل میں اپنے پیغمبر کی والہانہ محبت و عقیدت نہ ہو تو وہ کبھی بھی اپنی مذہبی حیثیت سے دوسری قوموں پر غالب نہیں آسکتی اور اس حقیقت سے دشمنانِ اسلام خوب واقف ہیں۔ اس لئے وہ مختلف طریقوں سے اس محبت کو جڑوں سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی طرح نبی کریم ﷺ کی یادگاروں، تبرکات اور مبارک مقامات کو سرے سے ختم کیا جائے اور اس کام کے لئے وہ مسلمان قوم اور مسلمانوں میں سے ہی اپنے کام کے لوگ چن لیتے ہیں اور ان کی بالواسطہ یا بلاواسطہ تربیت کر کے مسلمانوں کے اندر چھوڑ دیتے ہیں اور توحید و غیرہ کے خوشنام الفاظ کے نام پر مسلمانوں کے دلوں سے نبی کریم ﷺ کی محبت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت اور ائمہ مجتہدین اور سلف صالحین کی محبت نکالتے ہیں، ان پر سے اعتماد ختم کر دیتے ہیں اور ان کے ذریعے مسلمانوں کے اندر اختلافات اور دنگا فساد برپا کر دیتے ہیں۔ (تفصیل کے لئے بندہ کی کتاب ”مسلمانوں میں باہمی اختلافات اور ان میں راہِ محبت“ کو پڑھ لیجئے)

### تبرکات اور محبت و عقیدت کے نام پر شرک سے بچئے!

یہاں اس بات کی نشاندہی بھی ضروری ہے کہ اسلام توحید کا علمبردار ہے۔ شرک اور شرکیہ اعمال بلکہ شرکیہ الفاظ اور جہاں شرک کا شائبہ بھی ہو اسلام اس کو برداشت نہیں کرتا جیسا کہ اس کا پورا بیان ”بیان شرک“ میں گزر چکا ہے۔ لہذا مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح وہ ان تمام مخالف اسباب اور محرکات سے بچے اور محتاط رہے جو محبت اور عقیدت میں کمزوری کے باعث ہوتے ہیں اسی طرح وہ اس بات کے بارے میں چوکنا اور ہوشیار رہے کہ کسی طرح بھی عقیدہ توحید کو داغدار نہ کرے اور کبھی بھی عقیدت و محبت کے پردے میں شرک یا شرکیہ افعال کے بدبودار گھرے کے قریب بھی نہ جائے۔

یادگاروں کے دیکھنے اور تبرکات سے فائدہ کیسے حاصل ہوتا ہے!

تبرکات کے بارے میں چند ہدایات!

بجائے شرک و بدعت کا ذریعہ نہ بنایا جائے

(۱) تبرکات میں از خود کوئی نفع نہیں!

تبرکات میں از خود کوئی نفع نہیں ہوتا بلکہ ان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و برکت اور اطمینان و تسکین نازل ہوتی ہے۔ غور کیجئے قرآن مجید کی جس آیت میں تبرکات والے صندوق کا بیان آیا ہے جس کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فرمایا کہ اس میں تمہارے لئے تمہارے رب کی طرف سے تسکین کا سامان ہے وہی تبرکات

والا صندوق موجود تھا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو فتح و نصرت دیتا تھا لیکن پھر جب بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ اور اس کی ہدایت سے پھر گئے تو اس مبارک صندوق کے باوجود بدترین شکست کھا گئے اور وہ تبرکات والا صندوق بھی دشمن لے گیا اور اس صندوق نے ان کو ذرہ برابر بھی نفع نہ دیا اور جب یہی تبرکات والا صندوق دشمن لے گیا اور چونکہ یہ دشمن بھی اللہ تعالیٰ سے پھرے ہوئے مشرک لوگ تھے اور ان کو ان پیغمبروں سے کوئی عقیدت و محبت نہ تھی جن کے یہ تبرکات تھے تو ان کو بھی ان تبرکات سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکا بلکہ جب اللہ تعالیٰ نے چاہا تو یہی صندوق ان کے لئے بلاؤں اور مصیبتوں کا ذریعہ بن گیا۔ اسی طرح آج بھی تبرکات تو کیا خود بزرگان دین، انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کی قبریں موجود ہیں جن میں ان کے مبارک جسم مدفون ہیں لیکن جب مسلمان اللہ تعالیٰ سے پھر گئے تو ان مبارک مقامات پر دشمنان اسلام کا تسلط اور غلبہ آ گیا ہے اور مسلمان قسم قسم کی آفتوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

لہذا نفع و نقصان کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اسی کے ساتھ لوگائے رکھے۔ البتہ جن لوگوں کے دلوں میں نیکو کاروں کی محبت اور ان سے عقیدت ہو تو ان تبرکات کو دیکھ کر ان کے اندر اللہ والوں کا عشق و محبت بھڑک اٹھتا ہے اور اس کے کارنامے سامنے آ جاتے ہیں اس کی پیروی کا جذبہ بڑھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمتیں اور برکتیں نازل ہو جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی برکت اور رحمت نیکوکاروں پر ہی برتی ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

### (۲) تبرکات اور یادگاروں پر عرس نہ کریں!

ان تبرکات اور یادگاروں کے متعلق اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ ان پر عرس نہ کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان تبرکات کے لئے سال بھر میں یا کسی خاص موسم میں کوئی خاص وقت متعین اور مقرر نہ کیا جائے اور نہ یادگاروں کے لئے ملکی و علاقائی سطح پر کوئی خاص وقت متعین کریں کہ بس اس دن لوگ ان یادگاروں کی زیارت کریں۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی قبر مبارک کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ:

(وَلَا تَجْعَلُوا قَبْرِي عِيدًا)

”اور میری قبر کو عید (کی طرح میلہ) مقرر نہ کرو۔“ (نسائی، مشکوٰۃ: باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ)

عید کی اصل عود تھی چونکہ یہ خوشی کا دن ہر سال لوٹ کر آتا ہے اس لئے اس کو عید کہا جاتا ہے۔ اس حدیث شریف کے اس جز کا مفہوم یہ ہے کہ میری قبر پر تم عید اور میلہ مقرر نہ کرو کہ سال یا ماہ میں کسی خاص دن میری قبر پر

اس طرح جمع ہو جس طرح عید گاہ میں یا جائے میلہ میں لوگ سال یا ماہ کے خاص دن میں جمع ہوتے ہیں۔  
تو جب نبی کریم ﷺ کی قبر اطہر جس میں خود نبی کریم ﷺ کا بدن مبارک مدفون ہے، اس پر میلہ اور عرس جائز نہیں تو کسی دوسرے کی قبر پر عرس کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے اور یہی حکم دوسری یادگاروں اور تبرکات کا بھی ہے کہ ان کے لئے سال بھر یا مہینہ میں کوئی خاص دن نہ مقرر کیا جائے تاکہ لوگ ان تبرکات اور یادگاروں پر سالانہ یا ماہواری عید یا میلہ نہ منائیں اور یہی میلے اور دلچسپ اجتماعات بالآخر شرک کا دروازہ کھول دیتے ہیں اور لوگ اللہ تعالیٰ کی پرستش کے بجائے مخلوق پرستی کے بدترین مرض اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

### (۳) یادگاروں اور تبرکات کی زیارت میں شرعی حدود سے تجاوز نہ کریں!

یادگاروں اور تبرکات کی زیارت میں شریعت کی حدود کا خیال رکھیں۔ مثلاً انکو سجدہ و رکوع نہ کریں، یا ان کے گرد طواف نہ کریں اور ان پر نذر و نیاز نہ چڑھائیں۔

### (۴) یادگاروں اور مبارک مقامات کی زیارت کو حج کا جز نہ قرار دیا جائے!

یادگاروں اور مبارک مقامات کی زیارت کو حج کا جز اور حصہ نہ قرار دیا جائے کہ عوام یہ خیال کرنے لگیں کہ گویا جس نے ان یادگاروں کی زیارت نہیں کی اس کا حج یا عمرہ ادا ہی نہیں ہوا یا جس نے یہ زیارتیں نہ کیں تو گویا اس کا حج یا عمرہ ناقص رہا بلکہ ان یادگاروں کی زیارت کو عشق و محبت کے تقاضوں کی حد تک محدود رکھا جائے، عشق و محبت کا تقاضا یہی ہے کہ ایک سچا عاشق اور محبت جب اپنے غائب محبوب کے دیار میں جاتا ہے تو وہ محبوب کی یادگاروں سے عشق و محبت کی آگ بھڑکاتا ہے اور اس عشق کی آگ کی بھاپ سے آنسوؤں کی بارش کر کے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کرتا ہے۔ اسی طرح ایک حاجی جب اپنا فریضہ حج ادا کرنے کے لئے حج کو جاتا ہے تو وہ ان یادگاروں کی زیارت کو حج کا جز نہ قرار دے بلکہ ان یادگاروں کی زیارت صرف اس کی محبت و عقیدت کا تقاضا ہو کہ جب آہی گیا ہوں تو ان مقامات کی زیارت بھی کر لوں کہ جہاں جہاں تاریخی واقعات کا صدور ہوا ہے۔

### (۵) یادگاروں میں نماز اور نوافل کو ضروری قرار نہ دیا جائے!

جن مقامات کے بارے میں نماز و نوافل کی فضیلت شریعت میں منقول نہیں ہے وہاں نماز و نوافل کا اس طرح اہتمام نہ کیا جائے کہ لوگ وہاں نماز و نوافل پڑھنا ضروری سمجھیں کہ جس نے وہاں نفل نماز ادا نہ کی تو گویا اس نے اس جگہ کی زیارت ہی نہیں کی جس کی وجہ سے وہ عظیم ثواب سے محروم ہو گیا۔

(۶) یادگاروں کی زیارت نہ کرنے والوں پر نکیر نہ کریں!

جو لوگ یادگاروں کی زیارت نہ کرتے ہوں، ان میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے، ان پر نکیر نہ کی جائے اور نہ ان لوگوں کو برا بھلا کہا جائے اور نہ ان کو اس وجہ سے بدعقیدہ اور گنہگار سمجھا جائے اور نہ ان پر کسی قسم کے فقرے چسپاں کئے جائیں۔

(۷) تبرکات کو نمائش اور کمائی کا ذریعہ نہ بنایا جائے!

جس کے پاس نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کوئی تبرک مثلاً موئے مبارک ہوں تو وہ اس کو نمائش اور کمائی کا ذریعہ نہ بنائے کہ لوگوں سے اسکی زیارت کرانے پر مال و دولت کا مطالبہ کرے یا کسی بھی صورت میں اس کو مال کمانے کا ذریعہ بنائے۔

اللہ تعالیٰ کی محبت و عظمت کی علامت؛ شعائر اللہ کی تعظیم اور ان سے محبت ہے!

مذکورہ بالا پوری بحث سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ انسان کی محبت کا اصل محور و مرکز اللہ تعالیٰ کی محبت ہی ہونی چاہیے اور یہی دین و ایمان کی روح ہے لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی اسکو اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کے ساتھ محبت لازم ہوگی، رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم، نیک اور پرہیزگاروں اور اولیاء اللہ سے محبت ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی محبت اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل اور اس کے شعائر اور اس کے نامزد اشیاء ہی میں دیکھی جاسکتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے محبت اور اسکی عظمت ایمان کی علامت شعائر اللہ کی محبت اور انکی تعظیم اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل ہی ہے۔

اس لئے ایک مومن لازماً رسول اللہ ﷺ پر فدا ہوگا انکی سنتوں کا شیدائی ہوگا، نیکوکاروں سے اس کو محبت ہوگی، جن راستوں سے دین اسلام ملا ہے ان راستوں کی قدر دانی، ان کی عظمت اس کے دل میں ہوگی، شعائر اللہ کی تکریم و تعظیم اور اس سے محبت کی ادائیں اس سے ٹپکتی ہوگی۔ فسق و فجور اور دشمنان اسلام سے اس کو نفرت ہوگی اگرچہ وہ اس کا باپ، بیٹا اور قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، چونکہ اسکی محبت اور دشمنی صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی خاطر ہوتی ہے اس لئے وہ مومن سے محبت کرتا ہوگا اور دین اسلام کے دشمنوں سے دشمنی کرتا ہوگا۔ وہ اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرتے ہوئے انتہائی بہادری اور بے جگری سے لڑے گا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان کیلئے کافروں کے ساتھ ہمیشہ برسر پیکار رہنا لازمی ہے بلکہ اسلام تو اشخاص و افراد کے لئے سلامتی کا پیغام ہے مگر کفر اور غیر اسلامی ظالمانہ قانون کے ساتھ وہ کسی علاقہ اور تعلق کا روادار نہیں۔

لہذا جو شخص اللہ تعالیٰ کی محبت کا مدعی ہے مگر رسول اللہ ﷺ کی عظمت و محبت یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت، عظمت

یا اللہ تعالیٰ کے شعائر کی عظمت و محبت اسکے دل میں نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کی نامزد اشیاء کی تعظیم و تکریم پوری طرح نہیں کرتا یا رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور شعائر اللہ کی تعظیم اور محبت کا دم نہیں بھرتا ہے، آپ ﷺ کی نافرمانی کرتا ہے اور اطاعت سے روگردانی کرتا ہے تو اس طرح کے تمام لوگ سراسر دھوکے میں پڑے ہیں۔

نیز یہ بھی یاد رہے کہ شعائر اللہ کی تعظیم و محبت کی حدود شریعت مطہرہ میں مقرر ہیں اگر کوئی محبت و عقیدت کے پردے میں ان حدود سے تجاوز کریگا اور تعظیم و تکریم و محبت کو عبادت کی حدود میں داخل کریگا تو ایسا شخص شرک ارتکاب کرے گا۔ اللہ تعالیٰ افراط و تفریط سے بچائیں۔ یاد رہے کہ اسی کتاب جواہر الاسلام میں عبادت کی وضاحت بھی موجود ہے جس سے عبادت اور تعظیم و تکریم اور مخلوق کیلئے جائز و ناجائز تعظیم کی حدود کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

www.daruleeman.com

## عدل و انصاف!

عدل عربی میں سیدھا کرنے برابر کرنے موازنہ کرنے صحیح توازن و تناسب کو کہتے ہیں تو نظام کائنات میں عدل کا مطلب یہ ہے کہ اشیاء کی مقدار اور کیفیت میں صحیح تناسب و توازن قائم ہو ایک جز کا دوسرے سے مقدار یا کیفیت میں مناسب اور توازن قائم ہو عالم انسانی میں عدل کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے تمام عقائد و اعمال معاملات اور باہمی حقوق اور جزئیات میں صحیح توازن اور تناسب ہو اور اس کی ادائیگی بھی اعتدال و حق کے ترازو میں ایسی تلے کہ افراط اور تفریط سے کوئی پلڑا جھکنے یا اٹھنے نہ پائے۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کے اس پورے نظام کو عدل پر قائم کیا ہے اس کا رخانہ ہستی میں بناؤ، سنگھار، جمال، کمال اور حسن و خوبی جو کچھ ہے یہ سب کچھ عدل اور صحیح توازن و تناسب کی وجہ سے ہے۔ مثلاً جسمانی صحت کو دیکھ لیجئے یہ ایک خاص اعتدالی حالت سے نکل جائے تو جسم کی شکل و صورت بگڑ جائے صحت اور تندرستی نیز حسن، جمال یہ بھی اسی اعتدال کی وجہ سے ہے جس شخص کے اعضاء، جوارح یا رنگ وغیرہ میں جس قدر اعتدال و توازن ہو اسی قدر وہ حسین و جمیل نظر آتا ہے۔

اشعار وغیرہ کی حلاوت بھی اسی وجہ سے ہے کہ مصرعوں کی ترکیب میں تناسب و اعتدال ہے اگر ایک مصرع بھی بے جوڑ ہو تو شعر کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اس زمین پر عرصہ دراز سے ہوا پانی اور خشکی میں جو مخلوقات موجود پائی جاتی ہیں انہیں کو دیکھ لیجئے ان کی زندگی اس لئے تو برقرار ہے کہ ان کے اسباب میں پورا پورا عدل و توازن اور تناسب پایا جاتا ہے ورنہ ان سب اسباب میں ذرہ برابر بھی بے اعتدالی پیدا ہو جائیں تو زندگی کا نام و نشان تک باقی نہ رہے گا۔

یہ بے حد و حساب ستارے و سیارے جو فضا میں گھوم رہے ہیں یہ عظیم الشان قوتیں جو عالم میں کام کر رہی ہیں یہ بے شمار مخلوقات اور اشیاء جو اس جہاں میں پائی جاتی ہیں ان سب میں یہی عدالت اور موزونیت کا قانون کارفرما ہے جس نے سب کو ایک خاص نظم کے ساتھ جکڑ کر بند کر رکھا ہے۔ نظام شمسی کا ہر کڑہ اپنے اپنے دائروں میں حرکت کر رہا ہے کوئی ایک بھی ذرہ برابر اس سے نہ ہٹ سکتا ہے اور نہ انحراف و میلان کرتا ہے اگر ان کے درمیان یہ کمال درجہ کا تناسب و توازن قائم نہ ہو تو یہ نظام ایک لمحہ کے لئے بھی نہ چل سکے گا اگر نظام کا کڑہ بھی اس قانون عدالت سے ہٹ جائے تو فوراً دوسرے کڑوں سے ٹکرا جائے گا اور تمام نظام شمسی بگڑ جائے گا۔

اس کی کچھ مثالیں: کتاب ”دھرتی سے اسلام تک“ باب سوئم سائنسی دلائل میں ملاحظہ فرمائیں۔



غرض دنیا کا تمام نظام عدل و توازن پر قائم ہے اگر ایک لمحہ کے لئے یہ حقیقت نہ رہے تو تمام نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف جگہ جگہ اشارے کئے ہیں چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے کہ:

﴿وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۚ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۚ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا

الْمِيزَانَ ۝﴾

اس (اللہ تعالیٰ) نے آسمان کو (پیدا کر کے) بلند کیا اور (اجرام سماویہ وغیرہ کے لئے قانون عدالت) میزان رکھ دیا (تو اس کا تقاضا یہ ہے) کہ میزان (اور عدالت میں) خلل نہ ڈالو۔ (سورہ الرحمن: ۸-۹)

مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین، آفتاب و مہتاب تمام کائنات کے سارے نظام کو حق و عدل کی بنیاد پر اعلیٰ درجہ کے توازن و تناسب کے ساتھ قائم کیا ہے اور وہ اپنی حدود و نظام عدل سے تجاوز نہیں کرتے اسی طرح تم بھی راہ حق اور عدل و انصاف پر قائم رہو ہر بات میں حق کہو اور حق پر عمل کرو، عقائد و عبادات، معاملات اور خالق کائنات اللہ رب العالمین کے حقوق سے لے کر مخلوقات کے حقوق بلکہ اپنے نفس کے حقوق کی پوری رعایت اور اس میں عدل اور انصاف کا پورا اہتمام کرو۔

بات چیت چکھنے پھرنے سونے جاگنے وغیرہ غرض دنیاوی اور دنیوی سب امور میں حق پر قائم رہو۔

اس آیت کریمہ میں دو حقیقتیں بیان ہوئیں:

ایک حقیقت یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات میں عدل و قسط کو قائم رکھنے والا ہے اور ان دو حقیقتوں پر تین قسم کی گواہیاں پیش کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی گواہی، فرشتوں کی گواہی اور اہل علم کی گواہی اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو جس طرح بنایا ہے اور جس طرح اس نظام کو چلا رہا ہے اس سے صاف یہ شہادت مل رہی ہے کہ وہ ایک ہی ہے جس کا کوئی شریک و حصہ دار نہیں اور پوری کائنات میں صرف اسی کا تصرف و اختیار چلتا ہے پھر نظام کائنات میں غور و فکر کریں تو یہی نظر آئے گا کہ کائنات کی ہر چیز آسمان وزمین سورج چاند ستاروں، ہواؤں اور پانی وغیرہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک میزان و عدل و قسط کا قانون رکھا ہے مجال نہیں کہ کوئی چیز بھی اپنی مقررہ حدود سے اور معین محور اور مدار سے ایک ذرہ بھی ادھر ادھر ہو سکے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین اور تمام کائنات کو ایسا بنایا ہے اور اس کے نظام کو اس طرح چلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فعل خود اس بات کی شہادت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس میں کوئی شریک نہیں اور نہ اس کے سوا



کوئی معبود بنائے جانے کے لائق ہے اور یہ کہ وہ پوری کائنات میں عدل و قسط کو قائم رکھنے والا ہے۔

نیز سورہ آل عمران کی ایت شہادت میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ أُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ ط لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

۵ إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ﴿﴾

”اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور اہل علم کی گواہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں (اور اللہ تعالیٰ کی فرشتوں کی اور اہل علم کی یہ بھی گواہی ہے کہ) وہ (پوری کائنات میں) عدل و انصاف (یعنی صحیح توازن و تناسب و نظام عدالت) کا قائم رکھنے والا ہے (اور پھر کہا جاتا ہے کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔“ (آل عمران: ۱۸)

اس آیت کریمہ کی تیسری گواہی اہل علم کی ہے۔ اہل علم سے عالم حقیقی کے تمام حاملین انبیاء علیہم السلام اور ان کے سچے وارث مراد ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک ان سے کی متفقہ شہادت یہی رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ وہ عدل و قسط کو قائم رکھنے والا ہے۔

تو حیدر عدل و قسط پر مبنی عقیدہ ہے اور شرک عدل سے ہٹی ہوئی بات اور ظلم عظیم ہے!

یاد رکھیں کہ تو حیدر یعنی صرف ایک اللہ تعالیٰ کو معبود بنانا اور اس کے سوا کسی بندگی کو نہ ماننا اور نہ اختیار کرنا ہی عدل و قسط پر مبنی عقیدہ ہے اور اس کی کائنات میں کسی دوسرے کو حصہ دار یا شریک یا نفع نقصان کا مالک ماننا اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو اس کی عبادت اور بندگی میں شریک کرنا عدل و انصاف سے ہٹی ہوئی بات اور بہت بڑا ظلم ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ:

﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾

”بے شک شرک ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ (لقمان: ۱۳)

مجھے یہاں صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ تو حیدر اور دین تو حیدر اسر عدل و انصاف ہے اور جو چیز جس قدر

تو حیدر اور دین تو حیدر سے ہٹی ہوئی ہو وہ اسی قدر ظلم ہوگا۔

مذکورہ بالا دو حقیقتوں پر یہ تو اللہ تعالیٰ کی وہ شہادت ہوئی جو کائنات کی فعلی کتاب کے ایک ایک ذرے

سے ایسا واضح اور ثابت ہے جس سے کوئی صاحب عقل سلیم انکار نہیں کر سکتا اور اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے اپنی

تو حیدر و شرک کا پورا بیان جو اہل اسلام کتاب العقائد میں پڑھ لیجئے۔

کتابوں میں توحید و عدل کو یوں مدلل ثابت فرمایا ہے کہ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس آیت میں دوسری گواہی فرشتوں کی ہے۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کے خاص کارندے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ارادوں کے اجراء و نفاذ کا ذریعہ ہیں اس وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے عدل و قسط پر قائم ہونے کے اول گواہ اور عینی شاہد ہیں نیز وہ اپنے عمل اور کارگردگی اور اللہ تعالیٰ کی نہایت فرمانبرداری سے عملاً یہ شہادت دے رہے ہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے حکم میں سرگرداں ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی مالک اور معبود نہیں مانتے اور اللہ تعالیٰ کے یہ انتظامی اہل کار و کارندے کائنات کو اللہ تعالیٰ کے حکم اور منشاء کے مطابق جس عدل و قسط سے چلا رہے ہیں تو یہ سب کچھ فرشتوں کی توحید و عدل کی وہ گواہی ہے جو وہ اپنے عمل و کارکردگی سے بندوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو اللہ تعالیٰ کی وحی پہنچانے کا واسطہ یہی فرشتے ہوتے ہیں اور یہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عدل و قسط پر مبنی دین اور دستور زندگی کو پیغمبروں کے پاس لے آتے ہیں۔ ۱۔

### اللہ تعالیٰ کو عدل پسند ہے!

خلاصہ یہ ہوا کہ یہ بات کئی شہادتوں اور مضبوط دلائل سے ثابت ہے اس نے پوری کائنات کے ہر گوشے اور ہر ذرے میں عدل و قسط کا میزان رکھا ہے اور اس عدل و قسط کے میزان پر ساری کائنات قائم ہے اگر یہ نہ ہو تو آسمان وزمین درہم برہم ہو جائے تو اس سے خالق کائنات اللہ تعالیٰ کا ذوق اور رویہ معلوم ہوا کہ وہ بے حد عدل والا اور عدل پسند ہے۔ آخر جب اللہ تعالیٰ اپنی وسیع تر کائنات میں مسلسل عدل و قسط کو قائم کرتے ہیں تو وہ انسان کے معاملہ میں خلاف عدل و قسط سے کیسے راضی ہو جائے گا۔ لہذا وہ انسان سے بھی یہی مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے دائرہ اختیار میں اسی طرح عدل و انصاف اور توازن و قسط کو ملحوظ رکھے اور وہ عدل و قسط کے اس میزان میں کوئی دھاندلی اور خرابی پیدا نہ کرے ورنہ انسان کے سارے نظام معاش و معیشت میں فساد پھیل جائے گا جس کی وجہ سے اس کی دنیا و آخرت تباہ و برباد ہو جائے گی اب سوال یہ ہے کہ وہ عدل و قسط کا میزان کون سا ہے جس کے مطابق وہ اپنی اختیاری زندگی گزارے تو اس کا جواب بھی اسی آیت شہادت کے بعد متصل دوسری آیت میں موجود ہے وہ یہ کہ:

﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾

”بے شک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔“

۱۔ فرشتوں کا پورا بیان جو اہل اسلام کتاب العقائد میں پڑھ لیجئے۔

مطلب یہ ہے کہ معبود حقیقی وحدہ لا شریک عدل والے اور عدل کو قائم رکھنے والے عزیز حکیم اللہ رب العالمین نے بندوں کی ہدایت اور ان کو عدل و قسط پر قائم کرنے اور رکھنے کے لئے عدل و قسط پر مبنی دین اور طریقہ زندگی عطا فرمایا ہے وہ دین اسلام ہے۔ یہی دین اللہ تعالیٰ کا حقیقی دین ہے اور یہی دین اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے اپنے بندوں کو بھیجا ہے۔

### آیت شہادت کی تفسیر!

اس آیت شہادت کی تفسیر میں علماء اسلام نے بہت کچھ لکھا ہے یہاں اسکے متعلق مولانا امین احسن صلاحی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سے چند اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔

وہ اپنی تفسیر تدریجاً قرآن میں لکھتے ہیں کہ:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت اور قائم بالقسط ہونے پر اپنی، اپنے فرشتوں اور اہل علم کی شہادت کا حوالہ دیا ہے۔ یہ شہادت تین مختلف پہلوؤں سے ہے۔

ایک تو آفاق کی شہادت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کائنات کے خالق نے اس کو جس طرح بنایا ہے اور جس طرح اس کے نظام کو چلا رہا ہے اس سے اس بات کی صاف شہادت مل رہی ہے کہ وہ ایک ہی ہے، کوئی اس کا سا جہی نہیں ہے۔ قرآن نے اس شہادت کو توحید کی دلیل کے عنوان سے اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کے ہر گوشے میں اس کائنات کے خالق نے ایک میزان رکھی ہے مجال نہیں کہ کوئی شے اپنے معین محور و مدار سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہو سکے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس کا خالق و فاطر عدل و قسط کو پسند کرتا ہے، یہ نہیں چاہتا ہے کہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز اس عدل و قسط سے بال برابر بھی انحراف کرے۔ اسی آفاقی شہادت کے ذیل میں قوموں کی تاریخ بھی آتی ہے۔ قرآن نے قوموں کی تاریخ بھی پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے بلکہ اس کا خالق و مالک اس کو ایک نظام عدل و قسط کے تحت چلا رہا ہے۔ اس کے اسٹیج پر یکے بعد دیگرے وہ مختلف قوموں کو بھیجتا ہے اور ان کا امتحان کرتا ہے کہ وہ خدا کے قانون عدل و قسط کے اندر اپنے اختیار اور اپنی قوتوں کو استعمال کرتی ہیں یا اس سے بغاوت اور سرکشی کی راہ اختیار کرتی ہیں۔ جب تک کوئی قوم خدا کے حدود کے اندر رہ کر اپنی صلاحیتوں کی استعمال کرتی ہے، وہ اس کو برومند کرتا اور پروان چڑھاتا ہے جب وہ اس راہ سے ہٹ کر سرکشی کی راہ اختیار کر لیتی ہے تو ایک خاص حد تک مہلت دے چکنے کے بعد وہ اس کو فنا کر دیتا ہے۔

۱۔ اسلام کیا ہے؟ اس کے معنی و مطلب جو اہل اسلام کے باب عقائد میں پڑھ لیجئے۔

اور دوسری قوم کو اس کی وارث بناتا ہے۔ قرآن نے اس سنت کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

دوسری شہادت انفس کی شہادت ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ وہ خود تو حید کی اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دے رہی ہے۔ اس شہادت کے دلائل ہم اپنی اس کتاب میں بھی جگہ جگہ بیان کر رہے ہیں اور خاص موضوع پر ہم نے حقیقت شرک اور حقیقت توحید کے نام سے دو کتابیں بھی لکھی ہیں۔ تفصیل کے طلاب ان کو پڑھیں۔ انسانی فطرت کی یہی توحید پسندی ہے جس کے سبب سے قرآن نے توحید کو دین فطرت قرار دیا ہے: ﴿فَطَرَهُ اللَّهُ الَّذِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ (اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا) اور یہی عدل پسندی ہے جس کی بنا پر جزا و سزا کے منکرین سے قرآن یہ سوال کرتا ہے: ﴿أَفَجَعَلَ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ۚ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۚ﴾ (قلم: ۳۴-۳۵) ”کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے، تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کیسا فیصلہ کریتے ہو؟“

تیسری شہادت وحی کی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی پسندنا پسند اور اپنے اوامر و نواہی سے بندوں کو آگاہ کرنے کے لئے اپنے بے شمار نبی اور رسول بھیجے اور ان سب پر اپنی توحید اور اپنے قائم بالقسط ہونے کی شہادت عی اور ان نبیوں اور رسولوں نے یہ شہادت اپنی اپنی امتوں کو پہنچائی۔ اس شہادت کے آثار و نشانات آج بھی ان امتوں کی روایات اور ان کے صحیفوں کی تعلیمات میں موجود ہیں لیکن انہوں نے ان آثار و روایات کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو ایسے نظریات و عقائد میں مبتلا کر لیا جو توحید کے بھی منافی ہیں اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کے بھی، لیکن ان امتوں کی اس غلط روش کی وجہ سے وہ اپنی ان اعلیٰ صفات سے دستبردار نہیں ہو گیا ہے بلکہ وہ بدستور ان سے متصف ہے اور ہمیشہ متصف رہے گا۔ چنانچہ انہیں صفات کا یہ تقاضا ہے کہ اس نے قرآن کو، جیسا کہ اوپر کی تمہید میں گزرا، حق و باطل کے درمیان فرقان بنا کر آتارنا کہ حق و عدل کی صراط مستقیم پھر واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے اور باطل پر جے رہنے کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ خدا کی وحدانیت اور اس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت کسی ایک ہی پہلو سے نہیں مل رہی ہے بلکہ تین مختلف پہلوؤں سے مل رہی ہے۔ اس کی بنائی ہوئی کائنات کا نظام اور اس کی تاریخ اس کی شہادت دے رہی ہے، اس کی پیدا کی ہوئی فطرت اس پر گواہ ہے اور اس کے پیغمبروں نے ہمیشہ اس حقیقت کی منادی کی ہے۔ اس آیت میں یہ بات نہایت اجمال کے ساتھ بیان ہوئی ہے لیکن قرآن کے تیس پاروں میں اس اجمال کی تفصیلات پھیلی ہوئی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی شہادت کے ساتھ یہاں ملائکہ کی شہادت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ یہ ایک امر واقعی کا اظہار و بیان ہے۔ کائنات میں خدا کے ارادوں کے نفاذ کا ذریعہ اور خدا کے پیغمبروں تک اس کی وحی پہنچانے کا واسطہ ملائکہ ہی بنتے ہیں اس وجہ سے خدا کی توحید اور اس کے قائم بالقسط ہونے کے اسکی مخلوقات میں شہاد اول وہی ہیں۔ ان کی گواہی ایک امر واقعی ہونے سے قطع نظر اس پہلو سے بھی خاص طور پر بیان ہوئی کہ نادانوں نے ان کو خدا کا شریک اور شفاعتِ باطل کا واسطہ قرار دے کر توحید کی بھی نفی کی اور کدا کے قائم بالقسط کی بھی۔ اس لئے کہ جب تصور یہ ہو کہ سفارش حق کو باطل اور باطل کو حق بنادے سکتی ہے تو پھر خدا قائم بالقسط کہاں رہا؟ فرشتوں کے متعلق اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے قرآن نے خود ان کی زبان سے بھی جگہ جگہ ان کے اعترافات کا حوالہ دیا ہے ہم بخیاں اختصار صرف ایک مثال نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ ۚ وَإِنَّا لَنَحْنُ الصَّافُّونَ ۚ وَإِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُونَ ۝﴾

”اور ہم میں سے ہر ایک کے لئے بس ایک متعین مقام ہے اور ہم تو صوفیوں باندھ کر حاضر رہنے والے ہیں اور ہم تو اس کی تسبیح کرنے والے ہیں۔“ (صفافات: ۱۶۴-۱۶۶)

ملائکہ کے بعد اولو العلم کی شہادت کا ذکر ہے۔ العلم قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد وہ علم حقیقی ہوتا ہے جو نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے دنیا کو ملا ہے۔ اس علم کے حاملین نے ہر دور میں کدا کی توحید اور اس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دی ہے یہ مصلحین و مجددین کے گروہ کی طرف اشارہ ہے جو ہر دور میں پیدا ہوئے ہیں اور جنہوں نے اللہ کے دین کو بدعات و آمیزشوں سے پاک کر کے عقائد کو توحید خالص کی بنیاد پر اور شرائع و قوانین اور اعمال و اخلاق کو حق و عدل کی اساس پر استوار کرنے کی جدوجہد کی ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کی طرف آگے کی آیت میں ﴿یامرون بالقسط﴾ کے لفظ سے اشارہ ہوا ہے اور جن کے متعلق فرمایا ہے کہ اہل کتاب ان کو قتل کرتے رہے ہیں۔

حکمتِ دین کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کے ساتھ حاملینِ علم کا حوالہ ہے اور توحید کے ساتھ عدل و قسط کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں اہل علم کا کیا مقام ہے اور خدائی شریعت کے نظام میں عدل و قسط کا کیا درجہ و مرتبہ ہے۔ علم حقیقی کے حاملین ملائکہ کے زمرہ سے نسبت رکھنے والے ہیں اور عدل و قسط کا درجہ صفاتِ الہی میں اتنا بلند و ارفع ہے کہ توحید کے بعد سب سے پہلے جس کا ذکر ہو سکتا ہے وہ یہی ہے۔

﴿قَائِمًا بِالْقِسْطِ﴾ ترکیب کے لحاظ سے ہمارے نزدیک ”انہ“ کی ضمیر سے حال پڑا ہوا ہے۔ مطلب

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد و یکتا ہے کوئی اس کا سا جی نہیں، تمام اختیار و تصرف تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس اختیار و تصرف کو ٹھیک ٹھیک عدل و قسط کے مطابق استعمال کر رہا ہے۔

﴿قسط﴾ کا مفہوم وہی ہے جو ہم عام بول چال میں حق و عدل انصاف وغیرہ کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔ اس کی ضد ظلم، جور اور سامعنی کے دوسرے الفاظ ہیں۔ فکر، عمل، قول، اخلاق، کردار مظاہر اور اشکال غرض ظاہر و باطن کے ہر گوشے میں ایک نقطہ تو وہ ہے جو ہر چیز کے خالق و فاطر کی بنائی ہوئی فطرت اور اس کے مقرر کئے ہوئے حدود و قیود کے اندر ہے، اس کو نقطہ اعتدال یا بالفاظ دیگر مرجع عدل و قسط سمجھئے۔ اگر کسی گوشے میں اس نقطہ سے شوشے کے برابر بھی انحراف واقع ہو جائے تو یہ بات عدل و قسط کے منافی ہوگی۔ اوتبارات اور نسبتوں کی تبدیلی سے تعبیرات بدل بدل جائیں گی کسی دائرے میں ہم اس انحراف کو ظلم و جور سے تعبیر کریں گے، کسی گوشے میں بد صورتی اور بدینتی سے ساری طرح کسی پہلو میں اس اعتدال کو حق و عدل سے تعبیر کریں گے، کسی محل میں حس و جمال سے لیکن اصل حقیقت ہر جگہ ایک ہی ہوگی۔ وہ یہ کہ ایک شے اپنے اصل فطری مقام سے ہٹ گئی تو بگاڑ پیدا ہو گیا اور اگر اپنے جوڑ سے پیوست ہو گئی تو بناؤ نمودار ہو گیا۔

خالق کائنات چونکہ اس دنیا کا خالق و مالک ہے اس وجہ سے اس کو اس کا بگاڑ نہیں بلکہ بناؤ مطلوب ہے، اس کے نظام تکوینی کی اس نے اس طرح چول سے چول بٹھائی ہے کہ مجال نہیں کہ کہیں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے اور اگر اس کی قدرت ہی کی کسی معجز نمائی سے کہیں کوئی رخنہ پیدا ہوتا نظر آتا ہے تو دفعۃً اسی کے کارفرما تھ اس کو درست کرنے کے لئے نمودار ہو جاتے ہیں تاکہ جس توازن پر یہ کارخانہ قائم ہے اس میں کوئی خلل نہ پیدا ہونے پائے۔ اس کی یہی توازن پسندی ہماری زندگی کے اس دائرے کے لئے بھی ہے جس دائرے میں اس نے ہمیں محدود قسم کی آزادی دی ہے جب ہم اپنے اختیار کو غلط استعمال کر کے اپنے اخلاق و عمل کے کسی گوشے میں فساد پیدا کر لیتے ہیں تو وہ ہمیں ڈھیل تو دیتا ہے لیکن یہ ڈھیل بس ایک خاص حد تک ہی ہوتی ہے، اس کی عدل پسندی یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ ہمیں ہماری خواہشات کی پیروی کے لئے آزاد اور اس کے نتیجے میں اپنی خلق کو تاراج و پامال ہونے کے لئے چھوڑ دے بلکہ وہ اس ڈھیل پر گرفت کرتا ہے اور ہمارے پیدا کئے ہوئے بگاڑ کو از سر نو درست کر دیتا ہے اس لئے کہ وہ قائم بالقسط ہے۔

اس قیام بالقسط ہی کے لئے اس نے مکافات عمل کا قانون رکھا، اسی کے لئے اس نے انبیاء و شرائع کے بھیجے کا سلسلہ جاری کیا، اسی کے لئے اس نے یہ اہتمام فرمایا کہ جب شریعت میں تحریفات و بدعات سے فساد پیدا



ہو جائے تو مجددین و مصلحین اس کی اصلاح و تجدید کے لئے سردھڑکی بازیاں لگائیں اسی کی خاطر اس نے قوموں کے عروج و زوال کو ان کے اخلاقی عروج و زوال کے تابع کیا اور پھر سب سے بڑھ کر اس عدل و قسط ہی کے کامل ظہور کے لئے اس نے ایک ایسا دن مقرر کیا ہے جس میں اس کی میزان عدل نصب ہوگی اور وہ تول کر بتائے گی کہ کس کا کون سا عمل ترازو میں پورا ہے، کون سا نہیں اور پھر اسی کے مطابق جزا و سزا ہوگی۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ ایک ہی آیت میں دو مرتبہ کلمہ توحید کا اعادہ ہے اور دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی دو الگ الگ صفتوں کا حوالہ ہے پہلے فرمایا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ قائم بالقسط ہے پھر فرمایا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہو عزیز و حکیم ہے۔ اس اسلوب میں مخاطب۔ اہل کتاب کے لئے سخت تنبیہ ہے مطلب یہ ہے کہ خدا، فرشتوں اور تمام حاملین علم کی شہادت یہی ہے کہ خدا کے سوا کوئی الہ نہیں اور وہ الہ امور دنیا سے بے تعلق نہیں ہے کہ لوگوں کو ان کی خواہشات کی چراگاہ میں شتر بے مہار کی طرح چھوڑے رکھے وہ دندنا تے پھریں اور وہ حق و قیوم ہونے کے باوجود ان کا کوئی نوٹس نہ لے بلکہ وہ تمہاری خواہشوں کے الرغم اپنے نظام عدل و قسط کو ضرور قائم کرے گا اور کوئی اس کا ہاتھ نہ پکڑ سکے۔ پھر فرمایا کہ وہ ایسا کوئی نہ کرے گا جب کہ وہ وحدہ لا شریک بھی ہے اور عزیز و حکیم بھی۔ اس کی عزت اور رحمت دونوں کا تقاضا ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ یا تو وہ بے بس اور حق کے لئے غیرت سے خالی ہے یا وہ ایک کھنڈر ہے جس نے دنیا کو محض ایک کھیل تماشا بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی عظیم ہستی کے متعلق اس قسم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامَ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَكْفُرْ بَايَتَ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ﴾

”الدین“ سے مراد دین حقیقی، یعنی وہ دین جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے اس پر الف لام اسی طرح کا ہے جس طرح کا ”الکتاب“ پر ہے۔

”العلم“ سے مراد علم حق ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق کو واضح کرنے اور اختلاف کو دور کر دینے کے لئے نازل ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ عدل و قسط کو قائم کرنے والا ہے اس وجہ سے اس نے بندوں کو صحیح زندگی گزارنے کا طریقہ بتانے کے لئے ایک دین عطا فرمایا جس کا نام اسلام ہے۔ یہی دین اللہ کا دین ہے۔ یہ دین عدل و قسط کی میزان ہے۔ یہی دین اس کائنات کے تمام نظام تکوینی میں نافذ ہے۔ اسی دین پر فطرت انسانی کی تخلیق

یوئی ہے۔ یہی دین اس نے ابتداء سے تمام نبیوں اور رسولوں پر اتارا۔ اس سے الگ اس نے کسی کو کوئی اور دین نہیں دیا لیکن یہود نصاریٰ نے باہمی اختلاف و عناد اور ضد ضد کی وجہ سے اس میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیے اور یہودیت و نصرانیت کے ناموں سے اپنے الگ الگ دین کھرے کر لئے۔ ان کا یہ اختلاف کسی بے خبری پر مبنی نہیں تھا بلکہ حق واضح ہو جانے کے باوجود محض شرارت نفس، باہمی عناد اور اپنی اپنی بدعات کی کچ میں تھا۔ اس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت پا کر ضائع کر دی۔ اللہ تعالیٰ چونکہ حق و قیوم اور قائم بالقسط ہے اس وجہ سے اس نے اس نظام عدل و قسط یعنی اسلام کو از سر نو تازہ اور مکمل صورت میں نازل فرمایا تاکہ لوگ ہدایت کی صراط مستقیم پائیں اور دنیا و آخرت دونوں کی فلاح حاصل کریں۔ اب بھی اگر انہوں نے وہی روش اختیار کیے رکھی جو اس سے پہلے اختیار کی اور خدا کی آیتوں کا انکار کرتے رہے تو یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا حساب بہت جلد چکا دینے والا ہے۔ یعنی یہ مہلت جو انہیں ملی ہوئی ہے اس کو بہت طویل نہ سمجھیں بلکہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ درختوں کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے۔ (ماخوذ تہذیب قرآن: ۲/۴۷-۵۲)

انسان کے لئے ضروری ہے کہ عدل و قسط کے ساتھ پوری زندگی گزارے!

جب یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ہم ایک متوازی کائنات میں رہتے ہیں جس کا سارا نظام عدل و اعتدال پر قائم ہے اور پھر بھی یہ بھی معلوم ہو کہ آسمان و زمین میں جتنی چیزیں ہیں یہ انسان کے لئے بنائی گئیں اور تمام چیزوں سے انسان ہی بالواسطہ یا بالواسطہ فائدہ اٹھا رہا ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ عدل و قسط اور اعتدال کا قانون انسان کے لئے بنائی ہوئی دنیا کی ہر ایک چیز میں تو نافذ ہو اور پھر اس عدل اور اعتدال کے قانون کو انسان کے افکار اور اس کے اعمال کے لئے بے اثر مانا جائے۔

بلاشبہ انسان کے لئے از حد ضروری ہے کہ وہ بھی عدل و انصاف پر قائم رہے اور جس جس دائرہ میں اس کو اختیار دیا گیا ہے اس میں اگر وہ نا انصافی کرے گا اور جن حق داروں کے حقوق ان کے ذمے ہیں اگر وہ ان کی حق تلفی کرے گا تو یہ فطرت کائنات سے اس کی بغاوت اور ٹکر ہوگی اور کائنات کی فطرت ظلم، بے انصافی اور حق تلفی کو قبول نہیں کرتی یہاں ایک بڑا ظلم تو درکنار اگر کوئی شخص کسی دوسرے کا بہت ہی معمولی حق بھی مار لیتا ہے تو اس کو اس بے اعتدالی اور ظلم کی سزا بھگتنا پڑے گی۔

### ظلم بغیر اثر کیے نہیں رہتا!

اگرچہ فی الحال اس ظلم کا اثر معلوم نہ ہو لیکن ظلم بغیر اثر کئے نہیں رہتا جس طرح مادیات میں ہی حالت بتدریج نشوونما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لئے ایک خاص مقدار ایک خاص مدت اور وقت مقرر کر دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح انسانی اعمال کے نتائج کے لئے بھی مقدار و اوقات کے احکام مقرر ہیں۔

مثلاً شکر اور چینی کا اثر یہ ہے کہ وہ اشیاء کو میٹھا کر دیتی ہیں اب اگر دس سیر پانی میں چینی کا ایک دانہ ڈال دیں تو اس کا اثر معلوم نہ ہوگا لیکن اثر اس نے ضرور کیا ہے کیونکہ اگر اسی طرح اس پانی میں ایک ایک دانہ ڈالتے جائیں تو ایک خاص مقدار کو پہنچ کر اور خاص وقت میں حل ہو کر اس کے بعد پانی میں اس کی مٹھاس محسوس ہونے لگے گی پھر جتنے جتنے چینی کے دانے ڈالتے جائیں گے پانی کی مٹھاس میں اضافہ ہوتا جائے گا تو اس سے ثابت ہوا کہ پہلے دانے نے ضرور اثر کیا ہے ورنہ دوسرے تیسرے وغیرہ کا اثر کیسے نمایاں ہوا؟

اسی طرح آگ کا اثر گرم کرنا ہے اگر پانی آگ پر رکھا جائے تو وہ گرم ہو کر کھولنے لگے گا۔ لیکن پانی کے گرم ہونے اور بالآخر کھولنے کے لئے حرارت کی ایک خاص مقدار ضروری ہے اور اس کے ظہور کی تکمیل کے لئے کہ ایک مقرر وقت تک انتظار کیا جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ چولہے پر ایک دیگ رکھ دی جائے تو فوراً کھولنے لگے۔ وہ یقیناً کھولنے لگی گی لیکن اس وقت جب حرارت کی مقررہ مقدار بتدریج تکمیل کو پہنچ جائے گی ٹھیک اسی طرح انسانی اعمال کے نتائج بھی اپنے مقررہ اوقات ہی میں ظہور پذیر ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے کسی ظالم شخص یا ظالم معاشرہ کے ظاہری خوشحالی سے دھوکا نہ کھائیں بلکہ اگر وہ سرکشی اور ظلم سے باز آ کر توبہ نہ کر لیں تو ان کی ہلاکت اور تباہی اپنے وقت مقررہ پر یقینی ہے۔

### انسان کو عدل اختیار کرنے کا حکم!

جب یہ بات معلوم ہوئی کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے ذرہ برابر ظلم بھی اثر کئے بغیر نہیں رہتا تو ضروری یہ ہوا کہ ہم اپنے قول و عمل میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھیں اور مخلوقات کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کریں اور کسی ادنیٰ یا اعلیٰ معاملہ میں کسی سے خیانت نہ کریں سب لوگوں کے لئے اپنے آپ سے انصاف کا مطالبہ کریں کسی انسان کو قول و عمل سے ظاہراً و باطناً کوئی ایذا و تکلیف نہ پہنچائیں جب دو فریق اپنے کسی معاملے کا محاکمہ آپ کے پاس لائیں تو فیصلہ میں کسی کی طرف میلان کے بغیر حق کے مطابق فیصلہ کریں اور ہر معاملہ میں خواہ عقائد

ہوں یا اعمال ہوں یا اخلاق ہوں

غرض ہر چیز میں افراط و تفریط کے راستوں کو چھوڑ کر میانہ روی اختیار کریں اللہ تعالیٰ نے ہمیں عدل و انصاف کے اپنانے کا حکم اور بار بار تاکید فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ:

﴿ان الله يامر بالعدل والاحسان وايتاي ذى القربى وينهى عن الفحشاء والمنكر والبغى﴾  
یعنی ”(اللہ تعالیٰ) عدل اور احسان و صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بری بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم سبق سیکھ لو۔“ (نحل: ۹۰)  
ایک دوسری جگہ ارشاد ہے کہ:

﴿يا ايها الذين امنوا كونوا قوامين بالقسط شهداء لله ولو على انفسكم او الوالدين والاقربين وان يكن غنياً فقيراً فالله اولى بها فلا تتبعوا الهوى ان تعدلو...﴾  
”اے ایمان والو! انصاف پر مضبوطی سے قائم رہو اور محض اللہ کے لئے گواہ بنو اگرچہ انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات ہو یا تمہارے والدین اور قریبی رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو (فریق معاملہ) خواہ دولت مند ہو یا فقیر۔ اللہ تم سے زیادہ ان دونوں کا خیر خواہ ہے (تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ مالدار کی دولت کے لالچ میں یا محتاج کی محتاجی پر ترس کھا کر سچی بات کہنے سے جھجکو) لہذا اپنی خواہش کی پیروی میں حق اور عدل سے نہ ہٹو۔“

انسان اپنی پوری زندگی میں عدل کو کیسے قائم کر سکتا ہے؟

اب رہی یہ بات کہ ہم اپنی فکر و عمل، معاملات وغیرہ میں کیسے اعتدال کو قائم رکھیں اور وہ کون سا قانون اور لائحہ عمل ہے جو ہر قوم و طبقہ اور چھوٹے بڑے فقیر و امیر حاکم اور محکوم ساری انسانیت کے لئے مبنی بر انصاف ہو۔

انسان کے زندگی کو افراط و تفریط سے بچانے والا قانون میزان شریعت!

تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس عظیم ذات اللہ تعالیٰ نے بے ارادہ اور بے اختیار دنیا کے ذرہ ذرہ اور اس کی ایک ایک حرکت و سکون کے لئے عدل و توازن کا حیرت انگیز نظام بنایا ہے اسی وجہ سے کارخانہ کائنات برقرار اور بدستور حسن و خوبی سے چل رہا ہے جس کو قانون فطرت یا میزان فطرت بھی کہا جاتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی فکر و ادان کی ایک ایک حرکت اور ہر ایک کام کے لئے ایک قانون بنایا

ہے جس کو قانون شریعت یا میزان شریعت کہا جاتا ہے۔ تاکہ اس کی روشنی میں انسان زندگی بسر کر کے کامیاب ہو جائے تو اسی قانون عدل کے لئے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو خلیفۃ اللہ بنا کر بھیجا اور پھر ان کے بعد دوسرے انبیاء علیہم السلام کو یکے بعد دیگرے بحیثیت خلیفۃ اللہ بھیجے اور ان کے پاس کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے تاکہ ان تعلیمات کی وجہ سے انسان کے اعمال و افکار میں اعتدال و عدالت قائم ہو جائے اور دنیا میں اسی قانون کے ذریعے امن و امان قائم ہو اور ہر فرد انسانی اپنے اپنے دائرہ اختیار میں اسی راہ اعتدال اور انصاف کو اپنا شعار بنالے۔

اور جو سرکش لوگ وعظ و نصیحت اور تعلیم و تبلیغ کے ذریعے عدل و انصاف پر نہ آئیں اور اپنی سرکشی پر اڑے رہیں ان کو قانون سیاست اور تعزیر و سزا کے ذریعے انصاف پر قائم رہنے کے لئے مجبور کیا جائے اور اسی حقیقت کو قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَأَنْزَلْنَا

الحديد فيه باس شديد ومنافع للناس﴾

”ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیاں اور ہدایات دے کر مبعوث فرمایا اور ان کے ساتھ کتاب اور (عدالت و اعتدال) کے ترازو کو نازل فرمایا تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے اتار لوہا اس میں سخت جنگ ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں۔ (الحديد: ۲۵)

اس کا یہ مطلب ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بھیجے اور کتابوں کے نازل کرنے کا سارا نظام انسانوں اور جنوں کے افکار اور اعمال میں صحیح توازن و تناسب اور اعتدال ان کے درمیان عدل و انصاف کے لئے قائم کر دیا گیا ہے۔ رسولوں کی بعثت اور کتابوں کا نازل کرنا اسی مقصد کے لئے عمل میں آیا تاکہ انسانیت اپنے تمام افکار اور اعمال میں عدل و قسط پر قائم ہو کر اپنی دنیا و آخرت کو سنوارے اور دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران ہو جائے۔

اور اسی میں اللہ تعالیٰ نے اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ سب لوگوں کو انصاف اور عدل پر لانے اور اس پر قائم رکھنے کے لئے صرف وعظ و نصیحت ہی کافی نہ ہوگی بلکہ کچھ شریر اور ظالم لوگ ایسے بھی ہیں جن کو لوہے کی زنجیروں اور دوسرے ہتھیاروں سے مرغوب اور مغلوب کر کے انصاف پر قائم کیا جائے یا ان شریروں اور فتنہ انگیزوں اور فاسد مادہ کو جڑ سے کاٹ کر باہر پھینک دیا جائے تاکہ صاف ستھرا معاشرہ باقی رہ جائے۔

غرض عالم انسانی میں اعتدال و عدالت اور مبنی بر انصاف صرف اللہ تعالیٰ کا قانون ہے جو اللہ تعالیٰ اور انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے نوع انسان کو پہنچایا یہی قانون اور تعلیمات فطری دین ہے اور یہی دین القیم یعنی

سیدھا اور درست دین ہے جس میں کسی طرح کی کجی اور خامی نہیں اور یہی وہ قانون اور تعلیمات ہیں جسے اللہ تعالیٰ لوگوں کی ترمیم و تحریف اور تبدیلی سے پاک اور مکمل کر کے اپنے آخری پیغمبر محمد ﷺ پر نازل فرمایا اور اس کی حفاظت خود اپنے ذمہ لے کر آئندہ کے لئے قیامت تک نئے نبی و رسول کے آنے کا دروازہ بند کیا اس کے بعد جو کوئی کجی نبوت کا دعویٰ کر کے اٹھے گا وہ کذاب و دجال ہوگا۔

بس نجات اور حسن صرف اور صرف اعتدال میں ہے اور جو انسان دل و جان سے اسلام کے سانچے میں جس قدر ڈھلا ہوا ہوگا وہ اسی قدر معتدل اور عادل ہوگا اور اسی قدر وہ دنیا میں مطمئن پر سکون زندگی گزارے گا اور موت کے بعد برزخ اور قبر میں اور اسکے بعد آخرت کی دائمی زندگی میں خوش و خرم اور اعلیٰ درجات پائے گا اور جو شخص جس قدر اس میں نقصان کرے گا اسی قدر بے اعتدالی اور ظلم کا مرتکب اور ظالم ہوگا۔

### عدل و اعتدال کے چند اہم اجزاء یہ ہیں!

اب عدل اور اعتدال کے چند موٹے موٹے اجزاء کو بیان کرتے ہیں تاکہ ان کو عمل کے لئے یاد کرنے میں آسانی ہو۔

(۱)؛ عقائد اور عبادات میں عدل کرنا یعنی اس کو شریعت مطہرہ کے مطابق نماز، روزہ وغیرہ ادا کرنا اور اپنے عقائد کو بھی قرآنی تعلیمات کے مطابق بنانا۔

(۲)؛ معاملات جیسے خرید و فروخت، نکاح، طلاق وغیرہ میں عدل و انصاف اور شریعت مطہرہ کی پوری رعایت کرنا۔

(۳)؛ مخلوق اور پر بندے کو اس کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کرنا اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور اس کے بندوں کے مقررہ حقوق میں ذرہ برابر کمی نہ کرنا۔

(۴)؛ قوتِ شہوت، قوتِ غضب، قوتِ رحم کو اعتدال پر لانا ان قوتوں کے اعتدال سے انسان کی سیرت اور اچھے اخلاق بنتے ہیں۔

(۵)؛ محاکم یعنی فریقین میں فیصلہ کرتے وقت عدل و انصاف کی پوری رعایت کرنا اور اس میں رشتہ داری اور مسلک وغیرہ کا کوئی لحاظ نہ کرنا جس کا جو حق بنتا ہے اس کو دے دینا۔

(۶)؛ اپنے ظاہر و باطن کو یکساں کرنا۔

(۷)؛ سخت سے سخت کے ساتھ بھی کوئی معاملہ کرے تو حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے یعنی اگر

کسی سے بدلہ لینا ہے تو حق و انصاف کے ساتھ بدلہ لیں اگر کفار سے مقابلہ ہو تو اس میں بھی تعلیمات اسلام کی پوری رعایت کریں اسی طرح اگر بہت زیادہ خطرناک اور غلط شخص ہے جو امت مسلمہ کے عقائد اور اعمال کو خراب کرتا ہو تو اس کے بھی عقائد اور اعمال اور غلطیاں جو اشکارا ہیں میں بھی بے انصافی نہ کریں اسی طرح بلکہ اس کے بھی صرف اتنی غلطی بیان کریں جو واقعہً اس میں ہوں اور جو غلطیاں اس میں نہیں تو اس کی غلطی کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے سے پرہیز کریں اور اس پر مزید غلطیاں تھوپنے سے بچا جائے ورنہ بے اعتدالی کے اس رویہ سے دین اسلام کو فائدہ کے بجائے بالآخر نقصان ہوگا اور غلط نتائج و اثرات مرتب ہوں گے نیز یہ شخص خود بھی اس بے اعتدالی کی وجہ سے ظلم اور بہتان میں مبتلا ہوگا یعنی جسے اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اور مسلمانوں کو فائدے کے بجائے نقصان ہوگا اور یہ بظاہر دین کی خدمت کرنے والے خود بھی ظالم اور بہتان میں مبتلا ہو کر معصیت اور نافرمانی کے مرتکب ہونگے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاَنُ قَوْمٍ عَلَىٰ الْآلَا

تَعْدِلُوا إِعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ (المائدہ: ۸)

”اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے لئے راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو اور ہرگز کسی قوم کی دشمنی تم کو اس بات پر نہ اکسائے کہ تم عدل سے پھر جاؤ۔“

یہاں چند موٹے اور اہم اجزاء بیان کئے گئے دین اسلام میں ان سب کے لئے تفصیلی احکامات موجود ہیں (جن میں سے اہم مسائل ”مسائل اعمال“ میں آچکے ہیں) اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ پورے دین اسلام پر دل و جان سے پوری طرح عمل کرنا عدل و انصاف کا تقاضہ بھی ہے اور عین بندگی اور شریعت میں مطلوب ہے اور ان اعمال میں جس قدر کوئی کوتاہی برتے گا وہ اسی قدر ظلم کا مرتکب ہوگا۔

**عدل اور راہِ اعتدال سے ہٹانے والی چیزیں!**

آخر میں چند ان چیزوں کی نشان دہی بھی خلاصہ کے طور پر کی جاتی ہے جن ک ذکر سورہ نساء کی آیت ۱۳۵، سورہ مائدہ کی آیت ۸ میں کیا گیا ہے اور ان دونوں آیتوں کو لکھا بھی گیا ہے اور یہ وہ اسباب ہیں جو عدل اور راہِ اعتدال سے انسان کو ہٹاتی ہیں اس لئے ان چیزوں سے پوری طرح خبردار ہونا چاہئے۔

(۱): نفسیاتی خواہش اور یہی چیز انسان کو عموماً راہِ اعتدال اور عدل سے ہٹاتی ہے۔

(۲): رشتہ داری۔ کسی کا ہم مسلک ہونا یا ہم مذہب ہونا اسی طرح اپنی ہی جماعت والے کے ساتھ جب



کسی غیر شخص یا کسی غیر شخص یا کسی غیر مسلک غیر مذہب اور غیر جماعت والے کا کوئی معاملہ آ جاتا ہے تو ایسی حالت میں میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ رشتہ داری اور ہم مسلکی اور ہم جماعتی کا لحاظ کیا جاتا ہے اور انسان عدل اور حق سے ہٹ جاتا ہے۔

(۳): مسئلہ اور معاملہ کے ہر پہلو اور اس کے متعلق تمام دلائل اور پہلوؤں پر نظر وغور نہ کرنے کی وجہ سے انسان عدل اور حق کو قائم کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔

(۴): حکم اور فیصلہ کا مدار ارتکاب کے اسباب پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے انسان عدل سے ہٹ جاتا ہے۔ مثلاً کوئی باپ بیٹے کو اس لئے پیٹتا ہے تاکہ وہ غلط کاموں سے باز آ جائے یا اپنے دفاع کی خاطر دوسرے کو مارا جیسا کہ کوئی ڈاکوؤں سے اپنی جان و مال بچانے اور ان کے ساتھ لڑنے کی خاطر ڈاکوؤں کو مار ڈالے وغیرہ تو ایسی صورتوں میں اگر ان اسباب پر پوری طرح نظر نہ کی جائے تو بلا وجہ باپ اور ڈاکوؤں کے قتل کرنے والے کو سزا دی جائے گی البتہ جس قدر زیادتی ہو چکی ہے اس کی سزا دے دینی چاہئے۔